شعر العجم

حصّہ اوّل

عباس مروزی سے نظامی تک

مادۂ تاریخ آغاز تصنیف
تاریخ عجم
۱۳۲۴ھ

مادۂ تاریخ اختتام تصنیف
تذکرہ
۱۳۲۵ھ

مؤلفہ

مولانا شبلی نعمانی مرحوم

بفرمائش

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام حافظ محمد عالم چھپا

۱۹۳۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرم جویاں، درے رامے پرستند | فقیہاں، دفترے رامے پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد | کہ یاراں دیگرے رامے پرستند

وَالصَّلوٰةُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

اسلام ایک ابرِ کرم تھا اور سطحِ خاک کے ایک ایک چپّہ پر برسا۔ لیکن فیض بقدر استعداد پہنچا، جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیّت تھی اسی قدر زیادہ فیضیاب ہوئی۔ عرب، ایران، افغانستان، ہند، ترکستان، تاتار، مصر، شام، روم سب اس کے حلقہ میں آئے لیکن قبول اثر میں سب یکساں نہ تھے، فرقِ مراتب، اور فرقِ مراتب کی حیثیتیں بھی مختلف تھیں، جس قوم میں جس قسم کی قابلیّت تھی، اسلام نے اس کو اور چمکایا، ترک شجاع تھے شجاع تر ہو گئے، ایرانی ہمیشہ سے تہذیب، معاشرت اور علوم و فنون میں ممتاز تھے۔ اسلام نے ان کو ممتاز تر کر دیا، بو علی سینا، غزالی، رازی، طوسی، امام بخاری، مسلم، سیبویہ، جوہری،

سب ایران ہی کی خاک سے اُٹھے تھے، آج تمام اسلامی دُنیا میں ایران ہی کی تہذیب و معاشرت جاری ہے، ترکوں نے بڑی بڑی پُر زور سلطنتیں قائم کیں، لیکن دفتر کی زبان، اور دربار کے دستور اور آئین سب فارسی ہی رہے۔

ایران کی خاک فنونِ لطیفہ کی قابلیت میں بھی سب سے ممتاز تھی اور بالخصوص **شاعری** اس کا خمیر تھا، اسلام نے اس خاص جوہر کو زیادہ چمکایا اور اس حد تک پہنچایا کہ تمام دُنیا کی شاعری ایک طرف اور صرف ایران کی شاعری ایک طرف، لیکن افسوس یہ ہے کہ آج تک کسی اسلامی زبان میں ایران کی شاعری کی کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی گئی جس سے ظاہر ہوتا کہ شاعری کب شروع ہوئی، کن اسباب سے شروع ہوئی؟ کس طرح عہد بہ عہد بڑھی؟ کیا کیا انداز قائم ہوئے؟ کیا کیا صورتیں بدلیں، ملکی اور قومی حالتوں نے اس پر کیا کیا اثر کئے، خود اس نے ملک اور قوم پر کیا اثر ڈالا؟

شعراء کے تذکرے بہت ہیں، لیکن وہ درحقیقت بیاض اشعار ہیں جن میں شعراء کے عمدہ اشعار انتخاب کر کے لکھ دیئے ہیں، شعراء کے حالات اور واقعات کم اور نہایت کم ہیں اور شاعری کے عہد بہ عہد کے انقلابات اور اُن کے اسباب کا تو مطلق ذکر نہیں، مَیں اسی کمی کو مدت سے محسوس کر رہا تھا، اور اکثر اس ادھیڑ بن میں رہتا تھا، مئی ۱۸۹۴ء میں میرے معزز دوست اور اُستاد مسٹر آرنلڈ نے مجھ کو اطلاع دی کہ جرمن کے ایک پروفیسر جیمس ڈارمسٹیٹر نے اس موضوع پر فرنچ میں ایک کتاب لکھی ہے، مَیں اس زمانے میں فرنچ زبان سیکھ رہا تھا۔ بڑے شوق سے کتاب منگوائی لیکن وہ ۸۸ صفحوں کا ایک رسالہ تھا جس میں شعراء کے نہایت معمولی حالات تھے۔ ایک مدت کے بعد اس مصنّف کی ایک اور ضخیم کتاب شائع ہوئی، جو تحقیق و تدقیق کے لحاظ سے نہایت حیرت انگیز تھی لیکن وہ زبان کی تاریخ ہے جس میں ژند، پہلوی وغیرہ زبانوں پر نہایت محققانہ بحث کی ہے۔ اور اسلام کی قبل کی تصنیفات کا سراغ لگایا ہے، شاعری کی تاریخ سے اس کو

لگاؤ نہیں۔

اس اثنا میں، میں سررشتہ علوم و فنون حیدرآباد کے تعلق سے **سلسلۂ کلامیہ** کی طرف متوجہ ہوا، اور چند کتابیں لکھیں جو چھپ کر شائع ہوئیں، اس سلسلہ سے فی الجملہ فراغت ہوئی تو پچھلے سال پُرانا خیال پھر تازہ ہوا۔ اور ۶ مارچ ۱۹۰۶ء کو میں نے اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ لیکن بیچ بیچ میں **موازنۂ انیس** اور **الندوہ** سدراہ ہوتے رہے۔ جب موازنہ سے بالکل فارغ ہو کر ہمہ تن اس کام میں مصروف ہوا اور **فردوسی** کے حال تک پہنچا تو ۷ امئی ۱۹۰۷ء کو صدمہ پا کا واقعہ پیش آیا یعنی اتفاق سے میرے پاؤں میں گولی لگی اور پاؤں کاٹ ڈالا گیا۔ یہ[1] بھی فردوسی کی کرامت تھی۔ کہ واقعہ سے ذرا پہلے **شاہنامہ** کا یہ مصرع دریدو برید و شکست و بہ بست، قلم کی زبان پر تھا، اس حادثہ نے تین چار ہفتہ لکھنے سے معذور رکھا، پھر وہ سلسلہ شروع ہوا اور باوجود درد اور تکلیف کے کچھ نہ کچھ کام ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ستمبر ۱۹۰۷ء کی چھٹی تاریخ کو دور اوّل کا پہلا حصّہ انجام پذیر ہوا۔

کتاب کی اجمالی ترتیب یہ ہے کہ قدما، متوسطین، متاخرین کے تین دور ہیں، پہلا دور **حنظلہ** سے شروع ہو کر نظامی پر تمام ہوتا ہے، دوسرا کمال اسمٰعیل سے جامی تک اور تیسرا فغانی سے ابوطالب کلیم تک، کلیم کے بعد شاعری، شاعری نہیں رہی بلکہ چیستان گوئی بن گئی، اُن دوروں کے لحاظ سے کتاب تین حصوں پر منقسم ہے، چوتھے حصہ میں شاعری پر عام ریویو ہے اور یہی حصہ گویا کتاب کی جان، اور اُس کی روح و رواں ہے، اس کتاب کی ترتیب میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے، اگرچہ بہت ہیں۔ لیکن خاص طرح پر جو ذکر کے قابل ہیں حسب ذیل ہیں۔

---

[1] شبلی نامہ سیہ را بہ جز اسے عملش ــــ پا برید ندو صدا خاست کہ سرے بالست

نام کتاب	نام مصنّف	کیفیّت
لب اللباب	عوفی یزدی	سب سے پہلا تذکرہ ہے، مصنّف ساتویں صدی ہجری میں تھا اور اپنے عہد تک کے حالات لکھے ہیں، پروفیسر براؤن نے تصحیح و تحشیہ کرکے شائع کیا ہے۔
چہار مقالہ	نظامی عروضی سمرقندی	مصنّف نظامی گنجوی کا ہمعصر تھا۔ گو مختصر سا رسالہ ہے لیکن نہایت مفید باتیں لکھی ہیں، خود بھی باکمال شاعر تھا۔
تذکرہ دولت شاہ سمرقندی		مشہور تذکرہ ہے اور گو اکثر جگہ غلطیاں کی ہیں تاہم دلچسپ اور مفید ہے۔
تاریخ آل غزنین	بیہقی	مصنف مسعود بن سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں تھا، ضمناً شعرائے عصر کا تذکرہ کیا ہے۔
عرفات	اوحدی	عرفی وغیرہ کا ہم صحبت تھا، یہ تذکرہ ضخیم دو جلدوں میں ہے، حالات بھی کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں۔
مے خانہ	عبدالنبی فخر الزمانی	جہانگیر کے زمانہ میں تھا، صرف اُن شعراء کا حال لکھا ہے جنھوں نے ساقی نامے لکھے، تمام تذکروں کی نسبت زیادہ مفصّل ہے اور اپنے ہمعصروں کا حال نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔

نام کتاب	نام مصنّف	کیفیّت
تذکرۃ الشعراء	میرزا طاہر نصیر آبادی	سنہ ۱۰۸۳ھ کی تصنیف ہے۔
مآثر رحیمی	عبدالباقی نہاوندی	مصنّف خان خاناں عبدالرحیم کا درباری تھا، کتاب اصل میں خان خاناں کی سوانح عمری ہے، ضمن میں تمام شعرائے خان خانانی کے حالات بھی لکھے ہیں اور تمام تذکروں کی نسبت زیادہ مفصل اور صحیح لکھے ہیں۔
مرآۃ الخیال	شیر خاں لودی	چھپ گیا ہے
ہفت اقلیم	امین رازی	جہانگیر کے عہد میں لکھا گیا مستند اور معتبر ہے،
تذکرہ میر تقی کاشی		سنہ ۹۹۳ھ کی تصنیف ہے،
تذکرہ سامی	سام میرزا صفوی	خاندان صفویہ کا شہزادہ اور جہانگیر کا معاصر تھا۔
حبیب السّیر		معتبر کتاب ہے، مصنّف جہانگیر کے عہد میں تھا۔
ریاض الشعراء	والہ داغستانی	
سرو آزاد	مولوی غلام علی آزاد	شعرائے عہد تیموریہ کا تذکرہ ہے،
ید بیضا	؍؍	عام تذکرہ ہے،
خزانۂ عامرہ	؍؍	صرف اُن شعراء کا حال ہے جن کو مدح کے معاوضہ میں صلہ ملا۔
مجمع النفائس	خان آرزو	
مجمع الفصحا	ہدایت قلی خان	حال کی تصنیف ہے، شعراء کا کلام نہایت کثرت سے جمع کیا ہے۔

شعراء کے کلیات اور دیوان جس قدر نظر سے گزرے ان کی فہرست اس قدر لمبی ہے کہ کتنی ورق صرف ہوں گے اس لئے قلم انداز کرتا ہوں۔

عجیب بات یہ ہے کہ **یورپ** نے فارسی زبان کے ساتھ مسلمانوں سے زیادہ اعتنا کیا، مسلمانوں کو اسلام سے قبل فارسی زبان کی ایک تصنیف کا بھی پتہ معلوم نہ تھا، لیکن **یورپ** نے ان تصنیفات کا اس قدر سرمایہ جمع کر لیا کہ **زردشت** سے لیکر نوشیروان کے عہد تک زبان کی پوری تاریخ مرتب ہوگئی۔

پروفیسر دارمسٹیٹر جرمنی نے فرنچ زبان میں ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں کیومرث سے لے کر اسلام کے عہد تک چار دور قائم کئے اور ہر دور کی زبان کی نحو و صرف، لغات، الفاظ و تغیرات پر مفصل ریویو لکھا (یہ کتاب ہماری نظر سے گزری ہے) **یورپ** کے اور محققین نے خاص خاص زبانوں پر مستقل تصنیفات لکھیں، خصوصاً اوستا اور ژند کی زبان کے متعلق اس قدر کثرت سے معلومات مہیا کئے کہ نکتہ نکتہ حل ہوگیا۔ اکثر اساتذہ کے دیوان، جو نایاب تھے اُن کو بڑی کوشش اور تلاش سے بہم پہنچا کر تصحیح و تحشیہ کے ساتھ چھاپا۔ **منوچہری** کے قصائد ایران میں نہایت ناتمام اور غلط سلط چھپے تھے لیکن فرانس میں اس اہتمام سے چھاپا کہ دیکھ کر آنکھیں روشن ہوتی ہیں، اس کے ساتھ فرنچ میں اس کا ترجمہ بھی چھاپا، اور لغات و اصطلاحات کی علیحدہ فرہنگ لکھی۔ اسی طرح روس کے **پروفیسر والن ٹن ژدکوسکی** نے **انوری** کے قصائد چھاپے، اور دیباچہ میں انوری کی سوانح اور کلام پر ریویو لکھا۔ پروفیسر **نولدیکی** نے خاص شاہنامہ کے تاریخی ماخذوں پر ایک مستقل کتاب جرمنی زبان میں لکھی، شعراء کے بہت سے تذکرے لکھے گئے جن میں سے **سر گور اوسلی** کا تذکرہ عام طور پر مشہور ہے۔ سب سے زیادہ مکمل اور جامع کتاب پروفیسر **براؤن** نے لکھی جو کیمبرج کالج کے فارسی لکچرار ہیں، اس کتاب[1] کے دو

---

[1] اس کتاب کا نام لٹریری ہسٹری آف پرشیا ہے اور لندن میں سنہ ۱۹۰۲ء میں چھاپی گئی ہے۔

دو حصّے شائع ہو چکے ہیں،

ان کوششوں کے علاوہ قدیم فارسی زبان کی اصل کتابیں بہم پہنچائیں اور چھاپ کر شائع کیں۔ آج مسلمانوں کے پاس پہلوی زبان کا ایک حرف موجود نہیں۔ لیکن یورپ نے پہلوی زبان کی بہت سی تصنیفات شائع کیں جن میں سے ایک کتاب یاتْ زریران حضرت عیسیٰؑ سے پانچ سو برس قبل کی تاریخ ہے۔

ان تصنیفات میں سے بعض بعض میری نظر سے گزریں، اور جن سے فائدہ اٹھا سکنا ممکن تھا میں نے فائدہ اٹھایا، لیکن ان تمام باتوں پر بھی یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ کتاب کے لکھنے کا جو حق تھا پورا ہوا۔ قدیم واقعہ نگاروں اور تذکرہ نویسوں نے جو کمی کی وہ آج کیونکر پوری ہو سکتی ہے ؎

گیرم کہ مرا طرز نوشتن نشد از یاد پیداست کہ با ایں سر و ساماں چہ نویسیم

شعر کی حقیقت

چونکہ ایک مدّت سے علم کی کمی اور طبیعتوں کی بدمذاقی نے شعر کی حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے، اس لئے ضرور ہے کہ پہلے شعر کی حقیقت سے بحث کی جائے تاکہ ایک صحیح معیار قائم ہو۔ جس سے ایران کی شاعری کا اندازہ کیا جائے[1]۔

شاعری کی حقیقت اور اس کی ماہیت پر سب سے پہلے ارسطو نے بحث کی، چنانچہ اس نے خاص اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی، جس کا نام بوطیقا (پوئٹیری) ہے، اس کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا اور ابن رشد نے اس کی تلخیص کی، اس تلخیص کے

---

[1] شاعری کی حقیقت پر ہم نے جو کچھ لکھا ہے نہایت اجمالی لکھا ہے۔ اس کے متعلق اس قدر مواد موجود ہے کہ ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

جستہ جستہ حصّے پروفیسر شیخو لیس نے اپنی کتاب علم الادب میں جو بیروت میں چھپ گئی ہے شامل کئے ہیں، افسوس ہے کہ چونکہ مسلمانوں نے ارسطو کی ادبی تصنیفات کی طرف التفات نہیں کیا اس لئے شاعری کے متعلق ارسطو کے جو خیالات تھے وہ مسلمانوں میں بالکل پھیل نہ سکے۔

شعر کی عام تعریف

کتب ادبیہ میں شاعری کی جو تعریف کی گئی ہے، اور وہی عام و خاص کی زبانوں پر جاری ہے یہ ہے کہ "کلام موزوں ہو، اور متکلم نے یہ ارادہ موزوں کیا ہو" لیکن یہ تعریف درحقیقت عامیانہ تعریف ہے، آج تو یہ مسئلہ بالکل فیصل ہو چکا ہے، لیکن قدمائے کے کلام میں بھی اس کے اشارے بلکہ تصریحات پائی جاتی ہیں کہ شاعری صرف وزن و قافیہ کا نام نہیں،

شعر صرف وزن و قافیہ کا نام نہیں

کتب ادبیہ میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ حضرت حسان بن ثابت کے صغیر السن بچے کو بھڑ نے کاٹ کھایا، وہ حسان کے سامنے روتا ہوا آیا کہ مجھ کو ایک جانور نے کاٹ کھایا ہے۔ حسان نے جانور کا نام پوچھا، وہ نام سے واقف نہ تھا، حسان نے کہا اچھا اس کی صورت کیا تھی؟ بچّے نے کہا "کانّہٗ مُلتفٌ ببردَی حِبرۃ" گویا یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مخطط چادروں میں لپٹا ہوا ہے۔" چونکہ بھڑ کے پروں پر رنگین دھاریاں ہوتی ہیں، اس لئے اس نے مخطط چادر سے تشبیہ دی۔ حسان اچھل پڑے۔ اور خوشی کے جوش میں کہا۔ کہ "واللہ صار ابنی الشاعر" یعنی خدا کی قسم میرا بیٹا شاعر ہوگیا، فقرہ موزوں نہ تھا، لیکن چونکہ نہایت عمدہ تشبیہ تھی، حسان نے سمجھا کہ بچّے میں شاعری کی قابلیّت موجود ہے اس لئے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل عرب کے نزدیک شعر کی اصلی حقیقت کیا تھی؟ ابن رشیق قیروانی نے عرب کی شعر و شاعری پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ اس میں شعرا اور علمائے ادب کے جو اقوال نقل کئے ہیں ان سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔

شعرائے فارس کے نزدیک بھی شاعری دراصل تخیّل کا نام تھا، نظامی عروضی سمرقندی جو خود بہت بڑا شاعر اور نظامی گنجوی کا معاصر تھا اپنی کتاب **چہار مقالہ**

میں لکھتا ہے۔

"شاعری صناعتے است کہ شاعر بداں صنعت اتساق مقدمات موہومہ کند و التیام قیاس نتیجہ برآں وجہ کہ معنی خرد را بزرگ کند، و بزرگ را خرد، نیکو را در لباس زشت و زشت را در حلیہ نیکو جلوہ دہد، و با ایہام قوت غضبانی و شہوانی برانگیزد تابداں ایہام طبائع را انبساطے و انقباضے بود و امور عظام را در نظام عالم سبب گردد۔"

اس تعریف کا ماحصل یہ ہے کہ شاعری اس کا نام ہے کہ مقدمات موہومہ کی ترتیب سے اچھی چیز بدنما اور بُری چیز خوش نما ثابت کی جائے جس سے محبت یا غضب کی قوتیں مشتعل ہوجائیں۔

یہ قدما کے اقوال و خیالات تھے **یورپ** کے نکتہ سنجوں نے اس مسئلہ پر نہایت دقیق بحثیں کی ہیں اور عجیب عجیب نکتے پیدا کئے ہیں۔ مِل نے اس پر ایک نہایت مفصل اور بسیط مضمون لکھا ہے جس کا نہایت مختصر خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"انسان کے مدرکات میں سے بعض ایسے ہیں جن سے جذبات انسانی کو کچھ تعلق نہیں، مثلاً اگر ہم اقلیدس کا کوئی مسئلہ حل کریں تو اس سے ہم کو غصہ یا جوش یا رنج نہیں پیدا ہوگا۔ لیکن اگر ہمارے سامنے کسی شخص کی مصیبت کا حال، درد انگیز لفظوں میں بیان کیا جائے تو اس واقعہ کے ادراک کے ساتھ ہم پر ایک اثر طاری ہوگا۔ اس قسم کے اثروں کا نام جذبات یا احساسات ہے اور جو چیز ان جذبات یا احساسات کو برانگیختہ کر سکتی ہے وہی شاعری ہے، اس تعریف کی بنا پر **تصویر۔ تقریر۔ وعظ** بھی شعر میں داخل ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں بھی جذبات انسانی کو برانگیختہ کرسکتی ہیں اسی بنا پر بعضوں نے ان چیزوں کو بھی شاعری میں داخل کرلیا ہے۔ لیکن مل صاحب کے نزدیک یہ چیزیں شاعری کے دائرہ سے باہر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "انسان جو کلام کرتا ہے اس کی غرض کبھی تو دوسروں پر اثر ڈالنا ہوتا ہے۔ مثلاً اسپیچ۔ لکچر وغیرہ کہ ان سب کا

مقصد دوسروں کا متاثر کرنا ہوتا ہے، کبھی دوسروں سے مطلق غرض نہیں ہوتی بلکہ انسان محض اپنے آپ سے خطاب کرتا ہے اور اپنا آپ ہی مخاطب ہوتا ہے، مثلاً اگر کسی شخص کا بیٹا مر جائے تو اس حالت میں اس کی زبان سے جو الفاظ نکلیں گے، اس کی غرض کسی شخص یا گروہ کو مخاطب کرنا نہ ہوگا۔ بلکہ وہ اپنا آپ مخاطب ہوگا۔ فرض کرو وہاں کوئی شخص موجود نہ ہو تب بھی وہی الفاظ اُس کی زبان سے نکلیں گے۔ شاعری اسی قسم کے کلام کا نام ہے۔" اِس بنا پر شاعری کی تعریف منطقی طور پر کرنا چاہیں تو یوں کہیں گے کہ "جو کلام اس قسم کا ہو کہ اُس سے جذبات انسانی برانگیختہ ہوں، اور اس کا مخاطب حاضرین نہ ہوں بلکہ انسان خود اپنا آپ مخاطب ہو اُس کا نام شاعری ہے۔"

مِل صاحب کی یہ تعریف اگرچہ نہایت باریک بینی پر مبنی ہے لیکن اس سے شاعری کا دائرہ نہایت تنگ ہو جاتا ہے اور اگر اسی کو معیار قرار دیا جائے تو فارسی اور اُردو کا دفترِ بے پایاں بالکل بیکار ہو جائیگا۔

حقیقت یہ ہے کہ شعر کا دائرہ نہ اس قدر تنگ ہے جیسا مِل صاحب کرنا چاہتے ہیں اور نہ اس قدر وسیع جتنا ہمارے علمائے ادب نے کیا ہے۔

شاعری کی حقیقت

شعر (جیسا ارسطو کا مذہب ہے) ایک قسم کی مصوری یا نقالی ہے، فرق یہ ہے کہ مصور صرف مادی اشیاء کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ بخلاف اس کے شاعر ہر قسم کے خیالات، جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔

ایک شخص کا عزیز دوست جُدا ہو رہا ہے، اس حالت میں جو اس پر صدمے گزرتے ہیں، اور دل دوز خیالات کا جو طوفان اُس کے دل میں اُٹھتا ہے شاعر اس کی تصویر اس طرح کھینچ سکتا ہے کہ اگر رنج و غم مادی چیزیں ہوتیں اور ان کی تصویر کھینچی جاتی، تو وہی ہوتی جو شاعر نے الفاظ کے ذریعہ سے کھینچی تھی۔

اس بنا پر کسی چیز کا بیان جب اس طرح کیا جائے کہ اُس شے کی اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے، تو اُس پر شعر کی تعریف صادق آئے گی، دریا کی روانی، جنگل کا سنّاٹا، باغ کی شادابی، سبزہ کی لہک، خوشبو کی لپیٹ، نسیم کے جھونکے، دھوپ کی شدت، گرمی کی تپش، جاڑوں کی ٹھنڈ، صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی، یا رنج، غم، غیظ، غضب۔ جوش۔ محبت۔ افسوس، حسرت، خوشی، ان اشیاء کا اس طرح بیان کرنا کہ اُن کی صورت آنکھوں میں پھر جائے یا وہی اثر دل پر طاری ہو جائے یہی شاعری ہے۔

ایک اور پیرایہ میں شاعری کی تعریف کی جاسکتی ہے۔

دُنیا میں جس قدر قدرت کے مظاہر ہیں، خواہ مادی ہوں مثلاً پہاڑ، بیابان، باغ، دریا وغیرہ خواہ غیر مادی مثلاً وصل، ہجر، تحسین، نفرین، ان سب سے دل پر اثر پڑتا ہے، اور ہر شخص کے دل پر پڑتا ہے، لیکن اثر کے مراتب متفاوت ہیں۔ بعض اشخاص پر کم بعض پر زیادہ اور بعض پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جو شخص ان مظاہر قدرت سے عام لوگوں کی نسبت زیادہ متاثر ہو اور بعینہٖ اس اثر کو الفاظ سے ادا بھی کرسکتا ہو وہی شاعر ہے۔

شاعر کے جذبات اور احساسات فطرتاً نہایت نازک، لطیف اور سریع الاشتعال ہوتے ہیں، دوست کی جُدائی ہر شخص کے دل پر اثر کرتی ہے۔ لیکن شاعر اس موقع پر بالکل بیتاب ہو جاتا ہے، دریا کی روانی سے ہر شخص محظوظ ہوتا ہے، لیکن شاعر پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، سبزہ کے دیکھنے سے ہر شخص کو فرحت ہوتی ہے۔ لیکن شاعر جھومنے لگتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس درجہ کی کیفیت دوسروں پر بھی طاری ہو لیکن وہ لوگ اس کیفیت کو الفاظ کے ذریعہ سے اس طرح ادا نہیں کرسکتے جس طرح شاعر کرسکتا ہے، حاصل یہ کہ جو شخص واقعات اور مظاہر قدرت سے

اور لوگوں کی بہ نسبت زیادہ متاثر ہو اور اُس اثر کو الفاظ کے ذریعہ سے پورا پورا ظاہر کرسکتا ہو وہی **شاعر** ہے۔

برادرِ عزیز مولوی **حمید الدین** نے جمہرۃ البلاغت فن بلاغت میں ایک نادر کتاب لکھی ہے۔ اس میں شعر کی حقیقت نہایت نکتہ سنجی سے بیان کی ہے۔ اس کا خلاصہ ذیل میں ہے۔

"شاعر کے لفظی معنے صاحبِ شعور کے ہیں۔ شعور اصل میں احساس (**فیلنگ**) کو کہتے ہیں یعنی شاعر وہ شخص ہے جس کا احساس قوی ہو، انسان پر خاص خاص حالتیں طاری ہوتی ہیں۔ مثلاً رونا، ہنسنا، انگڑائی لینا۔ یہ حالتیں جب انسان پر غالب ہوتی ہیں تو اُس سے خاص خاص حرکات صادر ہوتی ہیں، رونے کے وقت آنسو جاری ہوجاتے ہیں ہنسی کے وقت ایک خاص آواز پیدا ہوجاتی ہے، انگڑائی میں اعضا تن جاتے ہیں، اسی طرح شعر بھی ایک خاص حالت کا نام ہے شاعر کی طبیعت پر رنج، یا خوشی، یا غُصّہ، یا استعجاب کے طاری ہونے کے وقت ایک خاص اثر پڑتا ہے۔ اور یہ اثر موزوں الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اسی کا نام **شاعری** ہے۔

حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو مختلف قسم کی آوازوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً شیر کی گونج، طاؤس کی جھنکار، کوئل کی کوک، بُلبل کا ترانہ، اسی طرح انسان پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو الفاظ کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اور جس طرح حیوانات کے جذبات کبھی حرکات کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، مثلاً ناچنے لگتا ہے، سانپ جھومتا اور لہراتا ہے، اسی طرح انسان کو چونکہ نطق کے ساتھ، نغمہ کا ملکہ بھی عطا ہوا ہے اس لئے موزوں الفاظ مُنہ سے نکلتے ہیں، اور ساتھ ہی انسان گنگنانے بھی لگتا ہے، اور جب یہ جذبہ زیادہ تیز ہوجاتا ہے تو انسان ناچنے

لگتا ہے، یہ سب باتیں جمع ہو جائیں تو یہی اصلی شعر ہے، اس بیان سے ظاہر ہو گا کہ شعر الفاظ، وزن، نغمہ اور رقص کے مجموعے کا نام ہے۔

لیکن چونکہ یہ تمام چیزیں جذبات کی کمال شدت کے وقت پیدا ہوتی ہیں اس لئے ہر شعر میں ان تمام چیزوں کا پایا جانا ضرور نہیں تاہم کوئی شعر راگ سے خالی نہیں ہو سکتا، وزن جو شعر کا ایک ضروری جزو ہے۔ راگ کی ایک قسم ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہل عرب ہمیشہ اشعار کو گا کر پڑھتے تھے، شعر کے پڑھنے کو جو اہل عرب **انشاد** کہتے ہیں، اس کی یہی وجہ ہے۔ کیونکہ انشاد کے اصلی معنے گانے کے ہیں۔

ارسطو نے اس بحث میں سخت غلطی کی ہے وہ کہتا ہے کہ شاعری کے جذبے کے وقت انسان جو گانے یا ناچنے لگتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نغمہ اور رقص، ایک قسم کی مصوّری ہے یعنی انسان کے دل میں جو جذبات پیدا ہوتے ہیں، آواز اور حرکات کے ذریعہ سے اُن کی تصویر کھینچتا ہے۔ چنانچہ رقاص جو کچھ گاتے ہیں، حرکات رقص کے ذریعہ سے اس کو بتاتے جاتے ہیں۔

لیکن ارسطو کا یہ خیال غلط ہے۔ اصل یہ ہے کہ جذبات انسانی مثلاً رنج، خوشی وغیرہ انسان کے دل میں نہایت پُر زور حرکت پیدا کر دیتے ہیں، یہی حرکت آواز، یا راگ، یا رقص، یا تڑپ بن جاتی ہے۔ مثلاً انسان کو جب ہنسی آتی ہے تو دل میں ایک حرکت پیدا ہوتی ہے، اور یہی حرکت ہنسی بن جاتی ہے، اور چونکہ یہ آثار، حرکات نفسانی کے مشابہ ہوتے ہیں اس لئے وہ حرکات نفسانی پر اسی طرح دلالت کرتے ہیں، جس طرح الفاظ، معانی پر دلالت کرتے ہیں، غرض جس طرح نطق، ایک فطری چیز ہے، اسی طرح یہ اشارات و حرکات بھی خود بخود سرزد ہوتے ہیں۔ وہ نقالی اور محاکات کی غرض سے نہیں کئے جاتے، گو یہ ممکن ہے کہ محاکات کا مقصد اس سے حاصل ہو جائے۔

ان تمام خیالات سے تم کو شاعری کی حقیقت کا کچھ اندازہ ہوا ہوگا، اور معلوم ہوگا کہ آج کل جس چیز کا نام شاعری ہے اُس کو شاعری سے کچھ تعلق نہیں۔

فارسی شاعری کی ابتدا

اس قدر عموماً مسلّم ہے کہ اسلامی دور میں، شاعری تیسری صدی سے شروع ہوتی ہے۔ ابو العباس مروزی کے اشعار جن کا ذکر آگے چل کر کہیں آئے گا اگر روایتاً ثابت بھی ہوں تو وہ ایک اتفاقیہ تفریح خاطر تھی، جو سلسلۂ تاریخی کی کوئی کڑی نہیں بن سکتی۔

شروع اسلام سے کئی سو برس تک فارسی شاعری کیوں وجود میں نہیں آئی؟

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے، کہ دو سو برس تک شاعری کی زبان کیوں بند رہی، فارسی تذکرہ نویسوں نے اس کے اسباب یہ بتائے ہیں "ظاہر است کہ اشعار قدیم، شعرائے عجم بسبب غلبۂ عرب از میان رفتہ، چنانکہ مشہور ست کہ تمام کتب و تواریخ عجمیاں را عرب سوختند، از کتب قدیمہ چیزے بر جا نگذاشتند الا قلیلے کہ پنہاں داشتند، چوں مردم را فذغن بلیغ نمودند قاعدہ سخن فارسی و شعر متروک شد، تا مدتے گذشت و اوضاع بنوع دیگر گشت۔"

یہ مجمع الفصحاء کی عبارت تھی، جو زمانہ حال کا سب سے بڑا مستند تذکرہ ہے، اور ناصر الدین قاچار مغفور کے عہد میں ۱۲۸۴ھ میں تصنیف ہوا ہے، یہ خیال اصل میں دولت شاہ کے تذکرے سے ماخوذ ہے، اُس نے یہ روایت نقل کی ہے کہ "عبداللہ بن طاہر نے حکم دیا تھا کہ ایران کی تمام کتابیں برباد کر دی جائیں اس بنا پر، آل سامان کے زمانے تک، فارسی شاعری نے ظہور نہیں کیا۔"

ان بزرگوں کی تاریخ دانی کی داد دینے کا یہ موقع نہیں، اس کے لئے ہمارے مضمون تراجم کو دیکھنا چاہئے جو رسائل شبلی کے ساتھ چھپ کر شائع ہوا ہے، لیکن استدلال

کس قدر لطیف ہے، یعنی چونکہ ایران کی قدیم کتابیں برباد کردی گئیں، اس لئے اہلِ عجم فارسی میں شعر بھی نہ کہہ سکے" اسلام نے ملکی زبان سے کچھ بھی تعرض نہیں کیا، حضرت عمرؓ کے عہد سے حجاج بن یوسف کے زمانہ تک تمام دفاتر فارسی زبان میں تھے، حجاج کے زمانے سے عربی میں ہوگئے، لیکن ملک کی اصلی زبان وہی رہی، رفتہ رفتہ فارسی عربی مخلوط ہوکر اُردو کی طرح ایک جدید زبان پیدا ہوگئی، اور وہ گویا خاص اسلامی زبان تھی، جب خود فارسی زبان سے کسی قسم کے تعصب کا اظہار نہیں کیا گیا، تو فارسی شاعری نے کیا گناہ کیا تھا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ اسلام جس قوم میں پھیلتا تھا، اُس کو مذہبی اثر سے اس قدر لبریز کردیتا تھا کہ اُس کو سوائے مذہب کے دُنیا کی کسی چیز سے سروکار نہیں رہتا تھا، خود عرب کو دیکھو، وہ ملک جس کے در و دیوار سے شاعری کی آواز آتی تھی، اسلام کے آتے ہی دفعتہً چاروں طرف سناٹا چھا گیا، ولید کے زمانہ سے جب شاہانہ دربار قائم ہوا تو لوازم سلطنت کی حیثیت سے شاعری نے دوبارہ جنم لیا لیکن تخت کی زبان عربی تھی، اس لئے شاعری بھی عربی ہی رہی شعراء جو مدحیہ قصائد کے ذریعہ سے زندگی بسر کرتے تھے فارسی میں شاعری کرتے تو ممدوح ان کی زبان کیونکر سمجھتا، اور نہ سمجھتا تو ان کی داد کیا دے سکتا، اتنے سے سہارے سے کہ مامون الرشید ایک مدت تک خراسان میں رہا تھا اور غالباً فارسی سے حرف آشنا ہوگیا تھا، عباس مروزی نے ایک قصیدہ فارسی میں لکھا، اور مامون الرشید نے اُس کے صلے میں ہزار دینار سالانہ مقرر کردیئے، اربابِ تذکرہ لکھتے ہیں، کہ اسلامی عہد میں فارسی شاعری کا یہ پہلا حرفِ تہجی تھا، اس سے پہلے اگر بر استے نام کچھ پتہ چلتا ہے تو ابو حفص حکیم سعدی کا شعر ہے جو پہلی صدی ہجری میں موجود تھا، شعر یہ ہے ؎

آہوے کوہی در دشت چگونہ دودا — ندارد یار، بے یار چگونہ بودا

ایک اور بڑا سبب یہ ہوا کہ چند ہی روز میں اسلام نے اپنے خاص علوم و فنون ادب و انشاء کا سرمایہ اس قدر وسیع کر لیا تھا، اور ہر شاخ میں وہ اختراعات اور جدتیں پیدا کی تھیں کہ اس کے سامنے تمام قوموں کو اپنا قدیم لٹریچر ہیچ اور بے وقعت نظر آتا تھا۔ دوسری تیسری صدی ہجری میں اسلام کی جہاں جہاں حکومتیں قائم ہوئیں، یعنی ایران، مصر، شام، اندلس ان تمام ممالک اسلامی علوم و فنون نے مفتوحہ قوموں کے علوم و فنون کو بالکل ماند کر دیا، اس لئے عرب کی شاعری کے آگے دوسری قوموں کو اپنی زبان میں شاعری کرتے شرم آتی تھی، خراسان، مصر و شام وغیرہ میں سینکڑوں ہزاروں شعرا پیدا ہو گئے تھے لیکن جو کچھ کہتے تھے عربی ہی میں کہتے تھے، چنانچہ ثعلبی نے یتیمۃ الدہر میں ان عربی شعرا کا مفصل تذکرہ لکھا ہے۔

تیسری صدی ہجری میں دولت عباسیہ کا آفتاب اقبال ڈھلنا شروع ہوا اور بڑے بڑے صوبے خود مختار ہو کر نئی نئی حکومتیں قائم ہونے لگیں، اس قسم کی سب سے پہلی سلطنت جو قائم ہوئی وہ خاندان طاہریہ تھا، جو مامون الرشید کے مشہور سپہ سالار طاہر ذوالیمنین کی طرف منسوب ہے، یہ خاندان ۵۴ برس حکمران رہا اور ۲۵۹ھ میں اس کا خاتمہ ہو گیا، اگرچہ یہ خود مختاری کا مدعی نہ تھا، لیکن خراسان میں اس کا اس قدر زور اور اقتدار ہو گیا ہو گیا تھا کہ خود مختاری کے تمام سر و سامان پائے جاتے تھے، دربار میں شعرا کا ہونا بھی ضرور تھا، اس لئے باوجود اس کے کہ یہ خاندان فارسی زبان سے بہت کم آشنا تھا تاہم بہت سے شعرا پیدا ہو گئے، منوچہری دامغانی نے ایک قصیدے میں متقدمین شعراء کا ذکر کیا ہے ۔

آنکہ آمد از نواحی آں کہ آمد از ہری	بوالعلا و بوالعباس و بوسلیک و بوالمثل
بوشکور بلخی و بوالفتح بستی ہکذی	از حکیمانِ خراساں کو شہید و رودکی

ان شعروں میں جن شعرا کے نام آئے ہیں، ان میں طاہریہ شعرا بھی ہیں، یعنی حنظلہ

بادغیسی، محمود ورّاق، فیروز مشرقی،

حنظلہ بادغیسی، یہ سب سے پہلا شخص ہے، جس نے باقاعدہ شاعری اختیار کی ۲۱۹ھ میں انتقال کیا، عروضی سمرقندی کی تصریح[1] سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ صاحبِ دیوان تھا، چند اشعار یہ ہیں،

یارم سپند گرچہ بر آتش ہمے فگند ۔۔۔ از بہر چشم تا نرسد مرورا گزند

او را سپند و مجمرہ ناید ہمے بکار ۔۔۔ باروے ہمچو آتش وباخال چوں سپند

یعنی میرا معشوق نظر بد سے بچنے کے لئے، آگ پر سپند جلاتا ہے، لیکن اس کو اس کی کیا حاجت ہے، اس کا چہرہ خود آگ، اور اس کا تل خود سپند ہے۔ حنظلہ نے ۲۱۹ھ میں وفات پائی۔

محمود ورّاق، محمد بن طاہر جو خاندانِ طاہر کا سب سے اخیر فرمانروا تھا یہ اس کے زمانے میں تھا، مجمع الفصحا میں اس کے یہ دو شعر نقل کئے ہیں ؎

نگارینا بنقد جانت ندہم ۔۔۔ گرانی در بہا، ارزانت ندہم

گرفتم بہ جان، دامانِ وصلت ۔۔۔ نہم جان از کف و دامانت ندہم

فیروز مشرقی، اصل میں یمن کا رہنے والا تھا، ۲۸۳ھ میں وفات پائی۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

مرغی است خدنگ او عجب دیدی ۔۔۔ مرغے کہ شکار او ہمہ جانا

دادہ پُر خویش کرگس ہدیہ ۔۔۔ تا بچہ اش را برد بہ مہمانا

خاندانِ طاہریہ کے اخیر فرمانروا محمد بن طاہر کو ۲۵۹ھ میں یعقوب صفار نے گرفتار کر لیا اور اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔[2]

---

[1] چہار مقالہ صفحہ ۲۷،

[2] یہ تمام حالات اور اشعار مجمع الفصحا سے ماخوذ ہیں۔

خاندانِ صفاریہ کا عہد

یعقوب صفار ذات کا ٹھٹیرا تھا، لیکن شاہانہ دل و دماغ رکھتا تھا، یہاں تک کہ خلافتِ عباسیہ کے زمانے میں اس نے عَلَمِ بغاوت بلند کیا، اور خراسان و فارس پر قابض ہو گیا۔ سنہ ۲۶۵ھ میں وفات پائی اس کے بعد اس کا بھائی عمرو بن لیث اور اس کے بعد اس کا پوتا طاہر بن محمد چند روز حکمران رہ کر سنہ ۲۹۰ھ میں گرفتار ہوا اور اس سلسلہ کا خاتمہ ہوا۔ اس چند روزہ خاندان نے بھی متعدد شعرا پیدا کئے جن میں سے **ابوسلیک گرگانی** زیادہ ممتاز ہے منوچہری دامغانی نے اس کو قدمائے شعرا میں شمار کیا ہے۔ مجمع الفصحا میں اس کے یہ اشعار نقل کئے ہیں ؎

بہ مژہ دل ز من بدزدیدی	اے بلب قاضی و بہ مژگان دزد
مزد خواہی کہ دل ز من بُردی	اے شگفتا کہ دیدہ دزدی و مزد

شاعری کے متعلق اس خاندان کا بڑا احسان یہ ہے کہ **رباعی** کی ایجاد اسی زمانے میں ہوئی، یعقوب صفار کا ایک کم سن بچّہ ایک دن اخروٹوں سے کھیل رہا تھا، ایک اخروٹ لُڑھکتے لُڑھکتے ایک گڑھے میں جا گرا، بچّہ کی زبان سے بیساختہ یہ مصرع نکلا ع
غلطاں غلطاں ہمے رود تا لبِ گو، یعقوب بھی موجود تھا اس کو بچّہ کی زبان سے یہ موزوں کلام بہت پسند آیا، لیکن چونکہ اس وقت تک اس بحر میں اشعار نہیں کہے جاتے تھے شعرا کو بُلا کر کہا کہ یہ کیا بحر ہے اُنھوں نے کہا، ہزج ہے، پھر تین مصرع اور لگا کر رباعی کر دیا، اور **دوبیتی** نام رکھا، مدت تک یہی نام رہا، پھر دوبیتی کے بجائے رباعی کہنے لگے[1] لیکن یہ تعجب ہے کہ عربی زبان میں آج بھی دوبیتی کہتے ہیں جس سے اہلِ عرب کی دیانت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

---

[1] تذکرہ دولت شاہ سمرقندی۔

خاندان سامانیہ

خاندان سامانیہ

اس وقت تک جو کچھ ہوا وہ شاعری کی ابجد تھی۔ لیکن خاندان سامانیہ نے دفعتہً اس زمین کو آسمان بنادیا۔ **رودکی** جو فارسی شاعری کا **ابوالآباء** سمجھا جاتا ہے اسی دربار کا دست پرور تھا **شاہنامہ** جو عجم کا صحیفۂ آسمانی ہے اُس کا عنصر اسی عہد میں تیار ہوا۔ اس خاندان کا سلسلہ نسب بہرام چوبیں تک پہنچتا ہے اس لئے اس خاندان میں حکومت کا آنا جم وکسریٰ کا دوبارہ عالم وجود میں آنا تھا، عدل و انصاف، جاہ و جلال، شان وشوکت تربیتِ علم وفن، کسی بات میں، وہ اپنے اسلاف سے کم نہ تھا۔

اس سلسلہ کے قائم ہونے کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ مامون الرشید کی جہاں اور شاہانہ فیاضیاں تھیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ قدیم خاندانوں کی تربیت کا خیال رکھتا تھا جس زمانے وہ مرو میں تھا، اس سلسلہ کا مورث اوّل اسد بن سامان دربار میں پہنچا اور مامون نے اس کو پایۂ قرب میں جگہ دی، جب مرو سے بغداد روانہ ہوا تو وہاں کے گورنر کو تاکید کرتا آیا کہ اسد کی اولاد کو معزز عہدے دیئے جائیں۔ اسد کے چار فرزند تھے، نوح، احمد، یحییٰ، الیاس، چنانچہ وہ سمرقند، فرغانہ، اشناس، ہرات کے گورنر مقرر کئے گئے، نوح کی وفات کے بعد اس کا بیٹا احمد سمرقند کا حاکم مقرر ہوا لیکن چند روز کے بعد اپنے بیٹے **نصر** کو اپنا قائم مقام کرکے خود گوشہ نشین ہوگیا ۲۶۱ھ میں خلیفہ معتضد باللہ نے نصر کو ماوراء النہر کی حکومت دی، اس نے اپنی طرف سے **اسمٰعیل** کو بخارا کا حاکم مقرر کیا، چند روز کے بعد درانداز وں نے دونوں بھائیوں کو باہم لڑادیا، یہاں تک کہ نصر میدانِ جنگ میں گرفتار ہوکر اسمٰعیل کے دربار میں آیا لیکن اسمٰعیل نے حوصلۂ شاہانہ سے کام لیا اور بھائی کو قید سے آزاد کرکے تخت پر بٹھایا آپ دست بستہ اُس کے سامنے کھڑے ہوکر آدابِ دست بوس کی رسمیں ادا کیں اور

عرض کیا کہ میں وہی آپ کا ماتحت صوبہ دار ہوں، نصر نے ۲۷۹ھ میں انتقال کیا اور سمرقند کا صوبہ بھی اسمٰعیل کے ہاتھ آگیا۔

سلسلہ سامانیہ کی مستقل حکومت اسی تاریخ سے شروع ہوتی ہے چنانچہ اس سلسلہ کا پہلا فرماں روا یہی اسمٰعیل تھا۔ یہ خاندان ایک سو تیس برس تک قائم رہا، اسمٰعیل نے ۲۹۵ھ میں وفات پائی، اسمٰعیل کے بعد احمد بن اسمٰعیل اور اس کے بعد نصر بن احمد تخت نشین ہوا۔ اور یہی وہ تاجدار ہے جس کے دربار کا ملک الشعراء رودکی تھا، جو فارسی شاعری کا بانی اول کہا جاتا ہے، وہ نہایت فیاض عادل اور قدردانِ علم و فن تھا، تیس برس کی حکمرانی کے بعد ۳۳۱ھ میں وفات پائی، اس کے بعد اس کا بیٹا نوح فرمانروا ہوا، وہ بھی باپ کی طرح مربی علم و فن تھا، فلسفہ و حکمت اور دیگر علوم و فنون کا جو کتب خانہ اس نے مرتب کیا تھا، اُس کی نسبت علامہ ابن خلکان نے بوعلی سینا کے حالات کے ذیل میں لکھا ہے:۔

كانت عديم المثل فيها من كل فن من الكتب المشهورة بايدی الناس وغيرهم ما لا يوجد فی سواها ولا سمع باسمه فضلا عن معرفته

یہ کتب خانہ بینظیر تھا، اس میں متداول اور مشہور کتابوں کے علاوہ وہ کتابیں تھیں جو اس کتاب خانہ کے سوا اور کہیں نصیب نہیں ہو سکتی تھیں، اور جن کا جاننا تو درکنار کسی نے ان کا نام بھی نہیں سُنا تھا۔

فلسفہ یونان کی بے شمار تصنیفات خلفائے عباسیہ کی بدولت عربی میں ترجمہ ہو چکی

ل؎ اس کتب خانہ کا حال خود بوعلی سینا کی زبانی طبقات الاطبا میں نقل کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ بہت بڑا کتب خانہ تھا، ہر علم و فن کے لئے الگ الگ مکان تھے، اور اس میں صرف اسی فن کی کتابیں تھیں کتابیں اُوپر تلے بہ ترتیب صندوقوں میں رکھی ہوئی تھیں، بوعلی سینا کا بیان ہے کہ میں نے قدما کی کتابوں کی فہرست دیکھی اور اپنی پسند کے موافق کتابیں نکلوا کر دیکھیں، اُن میں اکثر ایسی کتابیں تھیں جن کے نام بھی کسی کو معلوم نہ تھے اور خود میں نے بھی کبھی اُن کو نہیں دیکھا تھا۔

تھیں لیکن اکثر ترجمے نامفہوم اور مشتبہ تھے، اور جن کتابوں کے متعدد ترجمے ہوتے تھے وہ باہم مختلف تھے نوح بن نصر نے حکیم ابو نصر فارابی کو بُلا کر فرمایش کی کہ ان تمام تراجم کو سامنے رکھ کر ایک صحیح اور جامع ترجمہ تیار کر دے، چنانچہ فارابی نے اس فرمایش کی تعمیل کی اور اس کتاب کا نام تعلیم الثانی رکھا، اس واقعہ کو تاریخی حیثیت سے یاد رکھنا چاہیے۔ کہ حکمائے اسلام میں فارابی نے معلم ثانی کا جو لقب حاصل کیا ہے وہ اسی کتاب کی بدولت تھا، افسوس ہے کہ یہ کتب خانہ جل گیا، اور چونکہ اس کتاب کا اصل مسودہ فارابی کے ہاتھ کا ضائع ہو گیا، اس لئے آج یہ بے نظیر کتاب ناپید ہے۔[1]

نوح نے ۳۴۳ھ میں وفات پائی، اس کے بعد عبدالملک اور عبدالملک کے بعد منصور بن نوح تخت نشین ہوا، اس کے دربار کا وزیر ابو علی بن محمد تھا، جس نے تاریخ طبری کا عربی زبان سے فارسی میں ترجمہ کیا، منصور نے ۳۶۵ھ میں وفات پائی، اس کے بعد نوح بن منصور ثانی فرمانروا ہوا، دقیقی مشہور شاعر اسی کے دربار کا شاعر تھا، نوح کے بعد منصور بن نوح؛ اس کے بعد عبدالملک، اور اس کے بعد اسمٰعیل بن عبدالملک تخت نشین ہوا اور اسی پر اس خاندان کا خاتمہ ہوا، جس کی تاریخ ۳۹۵ھ ہے۔

شعرائے سامانیہ

سلسلہ سامانیہ سے پہلے جو خاندان گزرے وہ طاہریہ اور صفاریہ تھے، طاہریہ

[1] یہ واقعہ اکثر کتابوں میں ہے کشف الظنون (باب الحکمۃ) میں اس تمام واقعہ کو منصور بن نوح کے عہد سے منسوب کیا ہے، اور مورخوں کو بھی یہ دھوکا ہوا ہے لیکن یہ صریح غلطی ہے اس لئے فارابی نے ۳۳۹ھ میں انتقال کیا ہے اور منصور ۳۵۰ھ میں تخت نشین ہوا ہے۔

عربی النسل خاندان تھا اس لئے فارسی شاعری کو اُس کے زمانے عروج نہیں ہو سکتا
تھا، صفاریہ نودولت اور کم اصل تھے اور ان کی حیثیت ایک فتنہ جو باغی سے بڑھ کر
نہ تھی، لیکن **سامانی** خاندان، نسل کیان کا یادگار تھا، ان کی سلطنت نے ایک سو
دس برس کی عمر پائی، قدردان علم و فن ہونے کے ساتھ وہ خود بھی صاحب کمال اور
سخن سنج تھے وہ دیکھتے تھے کہ اہل عجم اپنے لٹریچر اور ملکی خصوصیات سے بالکل
الگ ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ اُن کی شاعرانہ قوتیں بالکل ایک غیر زبان (عربی)
پر صرف ہو رہی ہیں، خراسان و بخارا میں سینکڑوں ہزاروں شعرا موجود ہیں جو نسلاً عجم
ہیں لیکن دار الخلافہ بغداد کے اثر سے جو کچھ کہتے ہیں عربی میں کہتے ہیں، ان اسباب
سے اس خاندان نے اپنی قومی اور ملکی زبان کی ترقی پر شاہانہ توجہ کی، شعرا کی بیش قرار
تنخواہیں مقرر کیں، خاص خاص مضامین پر اشعار لکھوائے۔ **کلیلہ دمنہ** سنسکرت
سے اولاً فارسی میں ترجمہ کی گئی تھی لیکن جب عبداللہ بن المقفع نے اس ترجمہ کو عربی میں
منتقل کیا تو فارسی نسخہ بالکل گمنام ہو گیا۔ نصر بن احمد سامانی نے **رودکی** کو حکم دیا
کہ اس کو فارسی میں نظم کر دے، عجم کی تاریخ اب تک نامرتب اور پریشان تھی،
اس لئے **دقیقی** کو اس کام پر مامور کیا چنانچہ اس نے ہزار شعر لکھے اور یہ **شاہنامہ**
کا پہلا سنگ بنیاد تھا، تفصیل ان واقعات کی آگے آتی ہے۔

خاندان سامانیہ کے شعرا

شعرائے سامانیہ کی تعداد اگرچہ سینکڑوں تک پہنچتی ہے، لیکن عروضی سمرقندی
وغیرہ نے جن لوگوں کا نام خصوصیت سے لیا ہے وہ یہ ہیں، ابو العباس، ابو المثل،
ابو اسحاق جوئباری، ابو الحسن، جنازی نیشاپوری، ابو الحسن کسائی، شہید بلخی، ابو المؤید
عبداللہ فرالاوی رودکی، دقیقی، رابعہ فرداری، ابوذر، معمر جرجانی، ابو المظفر نصر بن
محمد نیشاپوری، عمارہ مروزی، طخاری، مرادی،

یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ اس دور کا پہلا شاعر کون ہے؟ لیکن جہاں تک قرائن

سے پتہ چلتا ہے ابو عبداللہ فرالادی، مرآدی، شہید، ابوشکور بلخی، اس قافلہ کے پیشرو ہیں، رودکی کا ایک شعر ہے ؎

شاعر شہید و شہرہ فرالادی — وین دیگراں بہ جملہ ہمہ رادی

یعنی شاعر اصل میں شہید ہے لیکن فرالادی مشہور زیادہ ہوگیا ہے، باقی اور شعرا انہیں دونوں کے رواۃ ہیں، رودکی نے شہید کا مرثیہ بھی لکھا ہے، چنانچہ کہتا ہے۔

کاروانِ شہید رفت از پیش — واں مارفتہ گیر و ئ اندیش

از شمار دو چشم یک تن کم — وز شمار خرد ہزاراں بیش

رابعہ

اس دور کی یہ خصوصیت یادگار ہے کہ شعر و شاعری کا مذاق عورتوں میں بھی پھیل گیا تھا۔ رابعہ فرداری بلخی، جو رودکی کی ہمعصر تھی اعلیٰ درجہ کی شاعر تھی اس کا باپ کعب، اعراب میں سے تھا۔ لیکن رابعہ عجم میں پیدا ہوئی اور اس وجہ سے عربی فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتی تھی، نہایت حسین اور صاحب فضل و کمال تھی، بکتاش نام ایک غلام سے اُس کو عشق تھا لیکن پھر مجازی سے گزر کر عشق حقیقی کی نوبت پہنچی چنانچہ اس کا شمار صوفیہ میں کیا جاتا ہے۔ تاہم چونکہ عورت کا کسی اجنبی مرد سے محبت کرنا اسلامی جماعت میں معیوب تھا اس لئے لوگوں نے اس کو قتل کر ڈالا، مجمع الفصحا میں اس کے بہت سے شعر نقل کئے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں ؎

دعوتِ من بر تو آں شد کا یزدت عاشق کناد — بر یکے سنگیں دلے نامہرباں چوں خویشتن

تابدانی درد عشق و داغ ہجر و غم کشی — چوں بہ ہجر اندر بہ پیچی پس بدانی قدر من

ل مجمع الفصحا۔ تذکرۂ ابو عبداللہ فرالادی۔

رودکی

اس دور کا مشہور شاعر ہے تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ سب سے پہلے جس
نے فارسی زبان میں دیوان مرتب کیا وہ رودکی تھا۔

سامانیوں کے دور میں سینکڑوں شعرا تھے جن میں سے بعض کا تذکرہ آگے آئے گا۔
لیکن آج تک سامانیوں کا نام جس کی بدولت زندہ ہے وہ رودکی ہے، شریف گرگانی
نے سچ کہا ۱؎

ازاں چندیں نعیم جاودانی — کہ ماند از آل ساسان و آل سامان

ثنائے رودکی ماندست و مدحش — نوائے باربد ماندست دستاں

رودکی کا اصل نام محمد یا جعفر ہے، رودک، نخشب، کے ضلع میں جس کو نسف بھی
کہتے ہیں ایک گاؤں کا نام ہے، رودکی اسی گاؤں کی طرف منسوب ہے، بعضوں کا
بیان ہے کہ رودکی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ رود (ایک باجے کا نام ہے) اچھا
بجاتا تھا۔

یورپ اور ایشیا کا یہ عجیب اتفاقی توافق ہے کہ رودکی بھی ہومر کی طرح مادرزاد
اندھا تھا، آٹھ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا، پھر علم قرأت کی تکمیل کی، اسی سن میں
شعر کہنا شروع کر دیا، شاعری کے مشغلہ کے ساتھ تمام متداول علوم و فنون حاصل کئے،
خوش قسمتی سے نہایت خوش آواز اور طبیعت بذلہ سنج واقع ہوئی تھی، سلاطین وامرا
کے دربار میں ایک بڑی خدمت ندیمی کی تھی، تقرب و اثر کے لحاظ سے ندیم کا رتبہ
وزرا سے بھی بالاتر ہوتا تھا اس عہدہ کے لئے بذلہ سنجی، لطیف الطبعی، حاضر جوابی،
ظرافت، وسعت معلومات ضروری شرطیں تھیں، رودکی میں یہ سب شرطیں جمع تھیں،

۱؎ بہارستان جامی۔

اس بنا پر نصر بن احمد سامانی کے دربار میں اس کو رسائی حاصل ہوئی، نصر نے اس کی تربیت پر خاص توجہ مبذول کی، تمام ارباب تذکرہ کا بیان ہے کہ رودکی کو اس قدر جاہ و دولت حاصل ہوئی کہ دربار کے بڑے بڑے امراء کو بھی نصیب نہ ہوئی، جب اس کی سواری نکلتی تو دو سو زرّیں کمر غلام، رکاب کے ساتھ ساتھ چلتے، سفر میں اس کا اسباب چار سو اونٹوں پر بار کیا جاتا تھا۔

یہ عموماً مسلّم ہے کہ فارسی شاعری عربی کے نمونے پر قائم ہوئی تھی لیکن اس زمانہ میں عربی شاعری واقعیت اور حقیقت سے دُور ہو کر، ستائشگری اور مداحی کے سوا اور کسی کام کی نہیں رہی تھی، متبنی، ابو تمام، بحتری، جو اس دور کے پیغمبرانِ سخن ہیں، ان کا تمام تر کارنامہ یہی خوشامد اور ثنا گستری تھا، خلفاء اور امراء شاعری کو صرف تفریح طبع کا ایک مشغلہ سمجھتے تھے، لیکن خاندان سامانیہ نے شاعری سے اصلی کام لئے، چنانچہ رودکی کو کلیلہ دمنہ کے نظم کی خدمت دی اور اس کے صلے میں چالیس ہزار درہم عطا کئے، عنصری ایک قصیدہ میں کہتا ہے ؎

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش عطا گرفت بہ نظمِ کلیلہ در کشور

رودکی کی شاعری کا عام انداز
رودکی کی شاعری کا عام انداز واقعہ گوئی، پند و موعظت اور حسن تاثیر ہے۔ عرب جاہلیۃ کی شاعری کا اصلی جوہر یہ تھا کہ اس سے بڑے بڑے قومی اور ملکی انقلابات پیدا کر دیتے تھے، فارسی شاعری تفریح طبع کے سوا اور کسی کام کی نہ تھی، یعنے اس سے کبھی کوئی تاریخی واقعہ وجود میں نہیں آیا، لیکن رودکی اس عام اعتراض سے مستثنیٰ ہے۔

نصر بن سامانی نے ایک دفعہ ہرات کا سفر کیا، اور بادغیس میں جو ہرات کا مشہور نزہت گاہ ہے، پڑاؤ ڈالا، بہار کے دن تھے، اور تمام دشت و صحرا چمن زار بن گیا تھا، نصر ان دلفریبیوں میں ایسا محو ہوا کہ ساری بہار یہیں گذر گئی، جاڑے

آئے تو میووں کی بہتات ہوئی، ان اطراف میں ایک سو بیس قسم کے انگور ہوتے ہیں۔ جن میں تربیاں اور کلنجدی نہایت خوش مزہ شاداب، اور نرم ہوتے ہیں، نصر صحرا سے اُٹھ کر آبادی میں آیا اور درِوانہ میں جو ایک مشہور مقام ہے قیام کیا، یہ مقامات نہایت آباد اور معمور تھے، ہر طرف عالی شان قصر و ایوان اور ہر ایوان کے ساتھ خانہ باغ اور پائین باغ ہوتا تھا، اسی زمانے میں سیستان اور مازندران کے میوہ جات کی آمد ہوئی، نصر نے جاڑے بھی یہیں گزارے، ہر دفعہ قصد کرتا تھا کہ اب کی بہار گزرنے پر روانہ ہو جاؤں گا۔ لیکن جب ایک موسم گزر جاتا تھا تو دوسرا زنجیرِ پا بن جاتا تھا اسی طرح پورے چار برس گزر گئے، امرا۔ اور فوج کے لوگ تنگ آ گئے، ہم بادشاہ سے کچھ کہنے کی جُرات نہیں کر سکتے تھے۔ آخر رودکی کے پاس گئے اور پانچ ہزار اشرفیاں اس شرط پر دینی منظور کیں کہ بادشاہ یہاں سے بخارا کو واپس جائے۔ اگلے دن رودکی دربار میں گیا، نصر شراب پی رہا تھا، رودکی نے ساز کے ساتھ عشّاق کی دُھن میں یہ اشعار گائے۔

بوے جوے مولیاں آید ہمے — یاد یار مہرباں آید ہمے
ریگ آموی و دُرشتیہاے او — زیر پایم پرنیاں آید ہمے
آبِ جیحوں[1] با ہمہ پہناوری — خنگ مارا تا میاں آید ہمے
اے بخارا شاد باش و شاد زی — شاہ سویت میہماں آید ہمے
شاہ سرو است و بخارا بوستاں — سرو سوے بوستاں آید ہمے
شاہ ماہ است و بخارا آسماں — ماہ سوے آسماں آید ہمے

نصر کا یہ حال ہوا کہ پاؤں میں موزے تک نہ پہنے اور اسی وقت سوار ہو کر بگٹٹ دوڑاتا ہوا پوری ایک منزل پر جا کر دم لیا، سمرقندی نے یہ واقعہ لکھ کر حیرت ظاہر کی ہے

---

[1] یعنی دریاے جیحون،

مگر یہ ایک سیدھی سادھی نظم ہے، نہ کوئی صنعت ہے نہ مضمون بندی ہے اس کا اس قدر اثر کیونکر ہو سکتا تھا" دولت شاہ کے زمانے میں شاعری کی اصلی اور فطری حالت بدل چکی تھی، اس لیے لوگوں کو واقعیت اور اظہار فطرت میں مزہ نہیں آتا تھا لیکن جب تک قوم میں صحیح مذاق باقی رہا شعرا ان اشعار پر سر دھنتے تھے۔ عروضی سمرقندی جو خود بہت بڑا شاعر تھا چار مقالہ میں لکھتا ہے۔

"ہنوز ایں قصیدہ را کسے جواب نگفتہ است کہ مجال آں ندیدہ اند کہ ازیں مضایق بیروں روند"

سلطان سنجر کے ملک الشعرا امیر معزی سے فرمایش کی گئی تھی کہ اس قصیدے کا جواب لکھے، چنانچہ اُس نے جو قصیدہ لکھا اُس کا مطلع یہ ہے۔

رستم[1] از مازندراں آید ہمے | زیں ملک از اصفہاں آید ہمے

امیر معزی مشہور اور کامل الفن شعرا میں سے ہے لیکن رودکی کے کلام کے سامنے اس کے شعر کا جو رتبہ ہے محتاج اظہار نہیں، رودکی نہایت پُر گو تھا، رشیدی[2] سمرقندی نے اس کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ بتائی ہے، چنانچہ کہتا ہے

---

[1] جس زمانے میں مَیں علی گڑھ کالج میں پروفیسر تھا، آسمان جاہ (وزیر ریاست حیدر آباد دکن) علی گڑھ میں آئے سر سید مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ سپاسنامہ کے بجائے کالج کی طرف سے قصیدہ پیش کیا جائے گا وہ تم لکھ دو، مَیں نے ایک خاص مناسبت سے اسی قصیدہ کو پیش نظر رکھا، ابتدا میں یہ تمہید تھی کہ لوگوں میں آسمان جاہ کی آمد کا چرچا ہے، پھر یہ اشعار تھے۔

ہمناں باشیم گرم گفتگو | قاصد از در ناگہاں آید ہمے

انگلند شور مبارک باد وپس | ایں حدیثش بر زباں آید ہمے

آسماں جاہ از سوے ملک دکن | جانبِ ہندوستاں آید ہمے

[2] مجمع الفصحا، ذکر رودکی۔

شعراو ابر شمر دم سبزده ره صد ہزار	ہم فزوں نیز آید، ار چناں کہ باید بشمری
میں نے اسکے اشعار تیرہ دفعہ گنے تو ایک لاکھ ٹھرے	اور اچھی طرح گنے جاتیں تو اس سے بھی زیادہ نکلیں گے

اصناف سخن میں رودکی کے ہاں، قصیدہ، رباعی، قطعہ، غزل، مرثیہ، سب کچھ موجود ہے۔ مثنوی کا کوئی نمونہ موجود نہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ کلیلہ دمنہ جو اُس نے لکھی ہے مثنوی ہی ہوگی، کیونکہ مسلسل واقعات مثنوی کے سوا اور کسی طرح ادا نہیں ہو سکتے،

رودکی کی شاعری کی وسعت

مضامین کے لحاظ سے بھی اس کی شاعری کا دائرہ نہایت وسیع ہے یعنے واقعہ نگاری، خیال بندی، موعظت و نصیحت، عشق و محبت، مدح و ثنا، صنائع و بدائع سب چیزیں پائی جاتی ہیں، اور درجۂ کمال پر پائی جاتی ہیں، ہم مختصراً ہر ایک کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

اخلاق و موعظت - اخلاق و موعظت میں حُسن ادا کے ساتھ، اس نے دقیق نکتے بھی بیان کئے ہیں، مثلاً اس کو یہ کہنا ہے کہ تم کو اوروں کی خوشحالی پر رشک و حسد نہیں کرنا چاہیے اس کو وہ اس طرح دلنشیں کرتا ہے۔

زمانہ پندے آزادہ وار، داد مرا	زمانہ را چو نکو بنگری ہمہ پند است
بروز نیک کساں گفت غم مخور زنہار	بسا کساں کہ بروز تو آرزومند است

یعنی جس طرح تم اوروں کی خوش قسمتی پر رشک کرتے ہو اسی طرح دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو تمہاری حالت پر رشک کرتے ہیں، اس لئے تم کو شکایت کا کوئی موقع نہیں۔

اکثر آدمی لوگوں کی بخالت کی شکایت کرتے ہیں۔ لیکن اُن کو یہ خیال نہیں آتا کہ کسی شخص کی بخالت اور سخاوت پر توجہ کرنا گداطبعی اور طماعی کی دلیل ہے رودکی اس نکتہ کو یوں ادا کرتا ہے

تاکہ گوئی کہ اہل گیتی	در ہستی و نیستی لئیمند
چوں تو طمع از جہاں بریدی	دانی کہ ہمہ جہاں کریمند

زمانہ کی بے ثباتی کو اس طرح ادا کرتا ہے۔

زندگانی چہ کوتہ و چہ دراز　　نہ بہ آخر بمرد باید باز
ہم بہ چنبر گزار خواہد بود　　این رسن را اگر چہ ہست دراز
خواہی اندر عنا و محنت زی　　خواہی اندر نشاط و نعمت و ناز
خواہی اندک تر از جہان بپذیر　　خواہی از رے بگیر تا بہ حجاز
این ہمہ بود و باد تو خواب است　　خواب را حکم نے مگر بہ مجاز
این ہمہ روز مرگ اگر بینی　　نشناسی ز یکدگر شان باز

اپیکورس اور عمر خیام کے فلسفہ کو غالباً فارسی میں اوّل اسی نے روشناس کیا ہے چنانچہ کہتا ہے۔

شاد زی، با سیاہ چشمان شاد　　کہ جہان نیست جز فسانہ و باد
ز آمدہ شادمان نہ باید بود　　وز گزشتہ نکرد باید یاد
نیک بخت آں کسے کہ داد و بخورد　　شور بخت آں کہ او نخورد و نہ داد
باد و ابر است، این جہاں افسوس　　بادہ پیش آر ہر چہ بادا باد

خواجہ حافظ رح کا سارا دیوان اسی متن کی شرح ہے۔

روے بہ محراب نہادن چہ سود　　دل بہ بخارا و بتان طراز
ایزد تا وسوسۂ عاشقے　　از تو پذیرد، نہ پذیرد نماز

واقعہ نگاری- یعنی کسی واقعہ یا حالت کی تصویر کھینچنا شاعری کا ایک عنصر ہے رودکی کے کلام میں یہ عنصر ہر جگہ نظر آتا ہے۔ ایک قصیدہ میں اس نے جوانی اور بڑھاپے کی کیفیت بیان کی ہے، اس کے چند اشعار یہ ہیں

مرا بسود و فرو ریخت ہر چہ دندان بود　　نہ بود دندان، لا بل، چراغ خندان بود
یکے نماند کنوں، بل ہمہ بسود و بریخت　　چہ نحس بود ہمانا کہ نحس کیوان بود

نہ نحس کیوان بود، و نہ روزگار دراز — چہ بود؟ راست بگویم، قضائے یزدان بود

ہمے ندانی اے ماہروئے غالیہ موئے — کہ حالِ بندہ ازیں پیش بر چہ ساماں بود

بہ زلف چوگان نازش، ہمیکنی تو بہ دِہ — ندیدی اورا آنگہ کہ زلف چوگان بود

شد آں زمانہ کہ رویش بسان دیبا بود — شد آں زمانہ کہ مویش بسان قطرانِ بود
سیاہ[۱۲]

شد آں زمانہ کہ او شاد بود و خرّم بود — نشاط او بہ فزوں بود و غم بہ نقصان بود

ہمیشہ دستش زی زلفگان خوشبو بود — ہمیشہ گوششں زی مردمِ سخنداں بود

ہمیشہ شاد ندانستمے[۱۲] کہ غم چہ بود — دلم نشاط طرب را فراخ میدان بود

عیال نہ، زن و فرزند نہ، مئونت نہ — ازیں ہمہ تنم آسودہ بود و آسان بود

ہمے خرید و ہمے ریخت بیشمار درم — بہ شہر ہر چہ ہمے ترکِ نار پستان[۱] بود

بسا کنیزک نیکو کہ میل داشت بدو — بشب زیارت او نزد او بہ پنہان بود

شد آں زمانہ کہ شعر و را جہاں بنوشت — شد آں زمانہ کہ او شاعر خراسان بود

تو رودکی را اے ماہرو کنوں بینی — بداں زمانہ ندیدی کہ در خراسان بود

بداں زمانہ ندیدی کہ در چمن رفتے — سرود گویاں گوئی ہزار دستان بود

کرا بزرگی و نعمت، ازیں و آں بودے — ورا بزرگی و نعمت ز آل ساماں بود

بداد میرِ خراسانش چل ہزار درم — از و فزونی یک پنج، میرِ ماکان بود

کنوں زمانہ دگر گشت، و من دگر گشتم — عصا بیار کہ وقتِ عصا و انبان بود

مدحیہ۔ مدحیہ شاعری کے جو نمونے پائے جاتے ہیں، اعلیٰ درجہ کے ہیں، اور اُن میں خیال آفرینی بھی پائی جاتی ہے۔

شاہے کہ بروز رزم از رادی — زرّین نہد بہ تیر در پیکان

تا کشتۂ او ازاں کفن سازد — تا خستۂ او، ازاں کند درمان

---

[۱] غنیمت ہے کہ ایرانی شاعر ہو کر مرد کے بجائے عورت کا نام لیتا ہے۔

یعنی "بادشاہ اس درجہ کا سخی ہے کہ لڑائی میں تیر جو استعمال کرتا ہے اُن کی پیکان سونے کی ہوتی ہے، جس سے یہ مقصود ہے کہ اگر کوئی شخص زخمی ہو تو پیکان کو بیچ کر اپنا علاج کر سکے، اور مر جائے تو تجہیز و تکفین کے کام آئے۔"

مرثیہ۔ مرثیے متعدد ہیں، اور سب میں مرثیہ کی خاص شان پائی جاتی ہے، ایک مرثیہ میں جو وزیر اعظم کے بیٹے کی وفات پر لکھا ہے، حکیمانہ انداز میں وزیر کو صبر کی تلقین کی ہے۔

اے آنکہ غمگینی و سزا داری — و اندر نہاں سرشک ہمے باری

اے وہ کہ غمزدہ ہے اور غمزدہ ہونا زیبا بھی ہے — اے وہ کہ چپکے چپکے آنسو بہاتا ہے

رفت آنکہ رفت، آمد آنکہ آمد — بود آنچہ بود، خیرہ چہ غم داری

جو گیا، گیا، جو آیا، آیا — جو ہونا تھا ہوا، اب فضول کیوں غم کرتے ہو

ہموار کرد خواہی گیتی را؟ — گیتی است پزیرد ہمواری

کیا تم زمانہ کو ہموار کرنا چاہتے ہو — یہ زمانہ ہے، بھلا وہ کب ہموار ہوسکتا ہے

مستی مکن، نشنود او مستی — زاری مکن، کہ نشنود او زاری

جوش ظاہر نہ کرو، وہ جوش کا لحاظ نہیں کرتا — فریاد نہ کرو، وہ فریاد نہیں سنتا

شو تا قیامت زاری کن — کے رفتہ را بہ زاری باز آری

اچھا جاؤ قیامت تک روتے رہو — لیکن جو شخص چلا گیا، کیا وہ رونے سے واپس آجائیگا

شہید بلخی اور مُرادی، جو اس کے زمانہ کے مشہور شاعر تھے، اُن کا مرثیہ بھی لکھا ہے، جو مجمع الفصحاء وغیرہ میں منقول ہے۔

غزل۔ غزل نے اس وقت تک مستقل حیثیت اختیار نہیں کی تھی، قصائد کی ابتداء میں جو تشبیب کرتے تھے یہی اُس زمانہ کی غزل تھی، اُس کا نمونہ یہ ہے۔

اے جان من از آرزوی تو پژمان — بنمائے یکے روے بہ بخشائے بریں جان

دشوار نمائی رخ و دشوار دہی بوس — آسان بربائی دل و آسان ببری جاں
نزدیک من آسانی تو باشد دشوار — نزدیکِ تو دشواری من باشد آساں
مشوش است دلم از کرشمۂ سلمےٰ — چناں کہ خاطرِ مجنوں زطرۂ لیلےٰ
چو گل شکر دہیم، درد دل شود تسکین — چو ترش روئے شوی وارہانی از صفرا
ببروہ نرگس تو آب جادوئے بابل — کشادہ غنچۂ تو بابِ معجزِ عیسےٰ

والہ داغستانی نے رودکی کی ایک غزل کی نقل کی ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

زہے فزودہ جمال تو زیب آرا را — شکستہ سنبل زلفِ تو مشک سارا را

لیکن اس زمانہ کا یہ انداز نہیں ہے، اس کے علاوہ اس غزل کے مقطع میں تخلص بھی مذکور ہے حالانکہ اس زمانہ تک غزلوں میں تخلص نہیں لاتے تھے۔

رودکی کے ان اشعار کا جو رتبہ ہے ظاہر ہے تاہم عنصری کہتا ہے۔

غزل رودکی وار نیکو بود — غزل ہائے من رودکی وار نیست

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عنصری، رودکی کو غزل گوئی میں اُستاد مانتا تھا، اس لئے یا تو ماننا چاہیے کہ رودکی کی عمدہ غزلیں جاتی رہیں، یا یہ کہ عنصریِ غزل گوئی میں رودکی سے بھی کم تھا۔

قصیدہ۔ قصیدہ کا جو طریقہ رودکی نے قائم کیا، آج تک قائم ہے، یعنی ابتدا میں تشبیب، یا بہاریہ وغیرہ پھر بادشاہ کی مدح کی طرف گریز، جود وسخا، عدل و انصاف، شجاعت و دلیری کا ذکر، پھر دعائیہ، صنائع شاعری میں ایک صنعت ہے جس کو ترصیع کہتے ہیں، یعنی دونوں مصرعوں میں ہم وزن الفاظ لاتے ہیں، مثلاً

عرفی
رماد را اثرِ قہر او کند شنجرف — جماد را اثر لطف کند شمشاد

یہ صنعت رودکی کے تمام قصیدوں میں پائی جاتی ہے، اور چھٹی صدی تک تمام شعراء کا یہ عام انداز رہا۔

قصیدہ میں اگرچہ صرف مداحی ہی مداحی ہوتی ہے، لیکن رودکی نے جابجا نیچرل سین بھی دکھلائے ہیں۔

بہار

از بنفشہ مرزہا گستردہ دیباہا بہ چین
وز شگوفہ شاخہا بربستہ بُسّدِ شاہوار

با ہواے اوست گفتی ہرچہ گفتی در نسیم
بر زمینِ اوست گفتی ہرچہ در عالم بہار

از میانِ جوے آں آبے رواں ہمچو گلاب
شاخہاے گُل شگفتہ بر کنارِ جویبار

بود ہرجا بہر نزہت گاہ بار، نقل و مُل
گلستاں در گلستان و میوہ اندر میوہ زار

خزاں

کوہ دیگر گوہ سیمین گشت و زرین شد چمن
آب دیگر بارہ روشن گشت و تیرہ شد ہوا

گشت خامش فاختہ، تا شد چمن پرداختہ
گشت بلبل بے نوا تا بوستاں شد بے نوا

نار چوں برحقہ زریں نگین ہاے عقیق
سیب چوں بر چہرۂ سیمیں نشانہاے بکا

بادِ سرد آمد چو آہِ عاشقاں ہنگامِ صبح
بانگِ زاغ آمد چو از معشوق پیغامِ جفا

بدانگہے کہ دو لشکر بروے یکدیگر
گراں کنند رکاب و سبک کنند عناں

زگردِ اسپاں تیرہ شود رخِ خورشید
زبانگِ مرداں خیرہ شود دلِ کیواں

یکے کشیدہ سنان و یکے کشادہ حسام
یکے کشادہ کمند و یکے کشیدہ کماں

قصیدہ کے حسن کا بڑا معیار گریز ہے، یعنی تشبیب کہتے کہتے ممدوح کا ذکر اس طرح چھڑ جائے جس طرح بات میں سے بات پیدا ہو جاتی ہے، یہ بالکل نہ معلوم ہو کہ بہ قصد و ارادہ ممدوح کی مدح شروع کی ہے، رودکی کی اکثر گریزیں اسی قسم کی ہیں مثلاً ایک قصیدہ میں خزاں کا حال لکھتے لکھتے کہتا ہے ؎

باد خوارزمے کنارِ باغ پُر دینار کرد
چوں کنار زائراں را کرد دستِ بادشا

یا مثلاً باغ کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہے ؎

یارِ من گفتا بہشت است اے شگفت!! ایں باغ نیست
گفتمش ایں باغ نیست خرم چوں بہشت کردگار

آں بہشت ناپدید است، ایں بہشت استے عیاں
ایں بہ نقد است آں بہ نسیہ آں نہاں ایں آشکار
آں مکافات نماز است ایں مکافات مدیح
آں عطاے کردگار است، ایں عطاے شہریار

یعنی معشوق نے باغ کو دیکھ کر کہا کہ یہ تو بہشت ہے، مَیں نے کہا بہشت نہیں باغ ہے، لیکن خدا کی بہشت کے ہم پلّہ ہے، فرق یہ ہے کہ خدا کی بہشت کا پتہ نہیں، اور یہ علانیہ موجود ہے، یہ نقد ہے وہ اُدھار، یہ ظاہر ہے وہ مخفی، وہ نماز پڑھنے سے ہاتھ آتی ہے اور یہ مدح کرنے سے، وہ خدا کا عطیہ ہے اور یہ بادشاہ کا۔

بعض بعض قصیدوں میں ایسی باتوں کا التزام کیا ہے جس کی تقلید کسی نے نہیں کی، مثلاً ایک قصیدہ تینتیس [۳۳] شعروں کا کہا ہے جس میں صرف مطلع ہیں پہلا مطلع یہ ہے۔

نہ دانی در دہجر اے بت، مرازاں زار گردانی ۔۔۔ دگر زارم نگہ دانی بہ داغ ہجر گردانی

ہجو یا شکایت: ہجو فارسی شاعری کے چہرہ کا نہایت بد نما داغ ہے، لیکن فرخی کی ہجو میں بھی متانت اور واقعیت پائی جاتی ہے،

زہے سوار و جوان و توانگر از در دور ۔۔۔ بخدمت آید نیکو سگال نیک اندیش
پسند آید مر خواجہ را پس از دہ سال ۔۔۔ کہ باز گردو پیر و پیادہ و دل ریش

ممدوح سے کہتا ہے کہ کیا یہ مناسب ہے کہ جو لوگ آپ کے دربار میں جوان، دولتمند اور سواریوں پر آئیں، وہ اس قدر آپ کے ہاں امیدواری میں پڑے جھولا کریں، کہ جب واپس جانے لگیں تو دولتمند غریب، اور سوار پیادہ، اور جوان بوڑھا ہو کر جائے۔

جدّت مضامین عام قاعدہ یہ ہے کہ ابتدائے شاعری میں مضمون بندی بالکل [ابتد]ائی ہوتی، لیکن یہ حیرت انگیز بات ہے کہ رودکی نے کثرت سے نئے نئے [مض]امین پیدا کئے مثلاً

آفتابیکہ ز جہا یک قدی	بر سر ذرہ نماید جولان	گھوڑے کی تعریف
رودکی چند بر گرفت و نواخت	بادہ انداز، کو سرود انداخت	شراب کی تعریف
آں عقیقین مے کہ ہر کہ بدید	از عقیق گداختہ نشناخت	
ہر دو یک گوہرند، ایک بطبع	ایں بیفسرد، آں دگر بگداخت	تشبیہ

یعنی شراب اور عقیق، دونوں ایک ہی چیز ہیں، فرق یہ ہے کہ ایک سیّال [ع]قیق ہے، اور دوسری منجمد شراب کے رنگ، اور نشہ کی یہ کیفیت [ہ]ے کہ بے چھوئے ہوئے ہات رنگین ہو جاتے ہیں، اور بے چکھے ہوئے دماغ [م]یں نشہ دوڑ جاتی ہے۔

[بن]فشہائے طرب خیل خیل سر برکرد	چو آتشے کہ بگوگرد بر دوید کبود
[بی]ار دہان بدہ آں آفتاب کش بخوری	زلب فرو شود و از دہان بر آرد دود

[یع]نی بنفشہ دستہ دستہ اُگ رہا ہے، جس طرح گندھک سے جلانے کے وقت، [نی]ل کا شعلہ اُٹھتا ہے، اب وہ آفتاب لاؤ (یعنی شراب) کہ ادھر ہونٹوں سے [ات]رے اور اُدھر منہ سے دھواں اُٹھنے لگے۔

[تی]ر او مانندۂ روزی کہ رسے مردم رسد	تیر دشمن باز گردد سوئے دشمن چوں صدا

یعنی ممدوح کا تیر، اس طرح نشانے پہ لگتا ہے جس طرح انسان کا مقدر، اور [دشم]ن کا تیر اس طرح دشمن ہی کی طرف پلٹ جاتا ہے جس طرح آواز،

ہر آنچہ بست میان ارم بہم شدّاد	ہر آنچہ کرد بزیر زمیں نہاں قارون
سرشک ابر پراگندہ کرد در بستاں	نسیم باد پدیدار کرد در ہامون

یعنی باغِ ارم میں شدّاد نے جو چیزیں فراہم کی تھیں، بادل کے آنسوؤں نے وہ سب باغ میں پھیلا دیں، اور قارون نے زمین کے اندر جو چیزیں چھپا رکھی تھیں، نسیم نے وہ سب میدان میں کھول کر دکھا دیں۔

مہ نیساں، شبیخوں کرد، اکنوں بر مہ کانوں
کہ گردوں گشت از و پُر گرد، وصحرا گشت از و پُر خوں
اگر خواہی نشانِ خوں، نگہ کن لالہ بر صحرا
اگر خواہی نشانِ گرد بنگر ابر بر گردوں

یعنی بہار کے مہینے نے خزاں کے مہینے پر شبخون مارا جس کی وجہ سے صحرا پُر خون ہوگیا، اور آسمان میں گرد بھر گئی، صحرا میں جو لالہ نظر آتا ہے یہ وہی خون ہے۔

نگارینا شنیدستم کہ گاہِ محنت و راحت — سہ پیراہن سلب بودہ است یوسف را بعمراندر
یکے از کید شد پُر خوں، دوم شد چاک از تہمت — سوم یعقوب را از بوسے روشن کرد چشم تر
رخم ماند بداں اوّل، دلم ماند بداں دوم — نصیب من شود در وصل آں پیراہن دیگر

یعنی اے معشوق! میں نے سُنا ہے کہ حضرت یوسفؑ کے تین پیراہن تھے، ایک خون سے رنگین ہوا، دوسرا زلیخا نے چاک کیا، تیسرے نے حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں روشن کیں، میرا چہرہ پہلے پیراہن کے مشابہ ہے، اور میرا دل دوسرا پیراہن ہے، باقی تیسرا، وہ خدا وصل میں نصیب کرے۔

زلف ترا جیم کہ کرد، آں کہ او — خال ترا نقطہ آں جیم کرد
از دہنِ تنگ تو گویا کسے — دانگکے نار بدو نیم کرد

یعنی تیرا دہن ایسا چھوٹا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے انار کے دانہ کے دو حصے کر دیے ہیں۔

رباعیاں | رباعیاں معمولی ہیں مجمع الفصحا میں ایک رباعی نقل کی ہے۔

چوں کاردلم ز زلف او ماند گرہ — در ہر رگِ جاں صد آرزو ماند گرہ

امید زگریہ بود، افسوس افسوس — کانہم شب وصل در گلو ماندہ گرہ

لیکن یہ ہرگز رودکی کے زمانہ کا کلام نہیں ہوسکتا۔

قبولیت عام اور اعتراف شعرا | رودکی کے کمال شاعری کو تمام شعرانے تسلیم کیا ہے، خود اس کا معاصر اور ہم فن اور ہم پایہ شہید کہتا ہے۔

بسخن ماند شعر شعرا — رودکی را سخنش تلو نبا است

شاعران راخہ واحسنت، مدیح — رودکی راخہ واحسنت ہجاست

عنصری کہتا ہے

غزل رودکی وار، نیکو بود — غزل ہائے من رودکی وار نیست

اگرچہ بکوشم بہ باریک وہم — دریں پردہ اندر مرا بار نیست

معروف بلخی کہتا ہے،

از رودکی شنیدم سلطان شاعران

دقیقی کہتا ہے۔

کرا رودکی گفتہ باشد مدیح — امام فنون و سخنور بود

دقیقی مدیح آورد نزد او — چو خرما بسوے ہجیور بود

نظامی سمرقندی کے زمانہ میں کسی نے رودکی کی شاعری پر اعتراض کیا تھا نظامی نے اُس کے جواب میں لکھا ہے۔

اے آنکہ طعن کردی در شعر رودکی — ایں طعن کردنِ تو از جہل و کودکی است

کانکس کہ شعر داند، داند کہ در جہاں — صاحب قران شاعری، اُستاد رودکی است

رودکی نے ۳۲۹ھ میں وفات پائی۔ اس کا دیوان ایران میں چھپ گیا ہے۔

دقیقی

سلسلۂ سامانیہ کے ہر فرمانروا کا عہد، اگرچہ بام ترقی کا ایک نیا پایہ ہے، لیکن نوح بن منصور کا زمانہ آخرالمنازل ہے، یہ فخر اسی دور کو حاصل ہے، کہ عجم کا سرمایۂ فخر و ناز یعنی "شاہنامہ" جس کو ابن الاثیر، قرآن العجم کہتا ہے، اس کا ابتدائی خاکہ اسی عہد میں قائم ہوا، اور اگر ایک اتفاقی واقعہ نہ پیش آجاتا، تو سلطان محمود کے کارناموں کی فہرست شاہنامہ کے نام سے خالی رہ جاتی۔

سامانی خاندان، ابتدا سے اس بات کا خواہشمند تھا کہ ان کے اسلاف کی داستان نثر سے نظم ہو کر عام زبانوں پر چڑھ جائے، لیکن ابھی شاعری نے اس قدر ترقی نہیں کی تھی کہ ایک عظیم الشان تاریخی سلسلہ، شعر کے قالب میں آجائے، نوح بن منصور جب ۳۶۵ھ میں تخت نشین ہوا، تو پایۂ تخت یعنی بخارا میں بڑے بڑے شعرا موجود تھے، ان میں دقیقی خاص پایہ تخت کا رہنے والا تھا، اس کا اصلی نام منصور بن احمد ہے ابتدائی تربیت امراء چغانیہ یعنی ابوالمظفر نے کی تھی، لیکن جب اس کا کمال مشہور ہوا تو نوح نے دربار میں بلا کر شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت[1] سپرد کی، دقیقی اپنے زور بازو کا اندازہ کر چکا تھا، اس نے یہ خدمت قبول کی، اور کم و بیش بیس ہزار شعر لکھے، بعضوں کا بیان ہے، کہ صرف ایک ہزار شعر تھے جو آج شاہنامہ میں شامل ہیں، فردوسی نے شاہنامہ کی تاریخ کے بیان میں ان واقعات کو اس طرح اجمالاً لکھا ہے۔

جوانے بیامد کشادہ زباں	سخنگوی و خوش طبع و روشن رواں
بہ شعر آرم ایں نامہ را گفت من	ازو شادماں شد دل انجمن

---

[1] تذکرۂ ہفت اقلیم و مجمع الفصحاء، روایت اخیر۔

زگشتاسپ وارجاسپ بیتے ہزار | بگفت و سر آمد ورا روزگار

کیا عجیب بات ہے کہ اتنے بڑے کامل الفن کا دامن عزت ایک اخلاقی دھبے سے داغدار ہے، دقیقی کا ایک خوشرو غلام تھا، جس سے اس کو عاشقانہ محبت تھی، لیکن افسوس ہے کہ اس محبت میں ہوس کا شائبہ تھا، غلام نہایت غیور تھا، اس نے ننگ کو گوارا نہ کیا اور دقیقی کا خاتمہ کر دیا، فردوسی نے اس ناگوار واقعہ کو ابہام کے پردہ میں ادا کیا ہے۔

جوانیش را خوے بدیار بود | ابا بد ہمیشہ بہ پیکار بود
یکایک ازو بخت برگشتہ شد | بدست یکے بندہ کشتہ شد

فردوسی نے فیاض دلی سے اس کے اشعار شاہنامہ میں شامل کر لیے، جس کی بدولت آج اس کا نام زندہ رہ گیا، چنانچہ خود کہتا ہے۔

کنوں راز ہا باز جویم ترا | حدیث دقیقی بگویم ترا
چناں دید گوینده یک شب بخواب | کہ یک جام میداشتے چوں گلاب
دقیقی زجائے پدید آمدے | بداں جام مے داستانہا زدے
بہ فردوسی آواز دادے کہ مے | مخور جز بہ آئین کاؤس کے
کہ شاہے گزیدے زگیتی کہ تخت | بنازد بدو تاج و شمشیر و بخت
شہنشاہ محمود گیرندہ شہر | زشادی بہر کس رسانندہ بہر
بدیں نامہ گر چند بشتافتے | کنوں ہر چہ جستی ہمہ یافتے
از اندازہ من بیش گفتم سخن | اگر باز یابی بخیلی مکن
زگشتاسپ وارجاسپ بیتے ہزار | بگفتم سر آمد مرا روزگار
گراں مایہ نزد شہنشہ رسد | رواں من از خاک بر مہ رسد
بداند کہ بیش از تو آخر کسے | دریں داستاں رنج برد ش بسے

بہ زیر غمم و داشتم زو سپاس	مرا در دل آمد ز ہر سو ہراس
کہ روزے مرا ہم بباید گزشت	زگفتار او در نشاید گزشت
زگفتار او بشنو، اکنوں سخن	کہ گفت است ایں داستانِ کہن

ان اشعار کا حاصل یہ ہے کہ ایک دن میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے ہاتھ میں جام شراب ہے، دقیقی کہیں سے آنکلا اور اُس نے کہا کہ شراب، کیانی طریقہ سے پیو، تم کو ایسا بادشاہ ہاتھ آگیا ہے جس پر سلطنت کو ناز ہے، تم نے **شاہنامہ** کے لئے بہت تگ و دو کی، جو تم چاہتے تھے وہ تم کو مل گیا، مَیں نے بھی گشتاسپ و ارجاسپ کے واقعہ میں ہزار شعر لکھے تھے تم کو اگر یہ اشعار مل جائیں تو اپنی کتاب میں شامل کر دینا کہ بادشاہ تک پہنچ جائیں، اور لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ اور بھی کسی نے کچھ محنت اُٹھائی تھی۔

یہ سُن کر میرا دل کانپ اُٹھا کہ مجھ کو بھی ایک دن مرنا ہے، اس لئے اس کی خواہش پوری کرنی چاہئے، اب تم اس کے اشعار سُنو،

فردوسی نے دقیقی کے ساتھ جس ہمدردی اور مُردہ پرستی کا اظہار کیا ہے، قدر کے قابل ہے۔ لیکن داستان کے ختم ہوتے ہوتے نیت بدل جاتی ہے، دقیقی کے اشعار کے بعد کہتا ہے،

نگہ کردم ایں نظم سست آمدم	ہمہ بیتہا نادرست آمدم
من ایں زاں نوشتم کہ تا شہریار	بداند سخن گفتنِ نابکار
دہاں گر بماند ز خوردن تہی	ازاں بہ کہ ناساز خوانے نہی
دو گوہر نمودم بہ گوہر فروش	کنوں شاہ دارد بہ گفتار گوش
سخن چوں بدینگونہ بایدت گفت	مگو و مکن رنج با طبع جفت
چو طبعت نباشد چو آبِ رواں	مبر دست، زی نامۂ خسرواں

یعنی جب میں نے دقیقی کی یہ نظم دیکھی تو تمام اشعار مجھ کو سُست اور غلط نظر آئے میں نے یہ اشعار اس لئے نقل کر دیئے کہ بادشاہ ان اشعار کی لغویت سے واقف ہو جائے، اگر آدمی کو کھانا نہ دیا جائے تو اس سے بہتر ہے کہ اس کے سامنے بدمزہ کھانے لائے جائیں، میں نے گوہر فروش کے سامنے دو موتی رکھ دیئے ہیں، اب بادشاہ خود تمیز کر لے، جب تم کو اس طرح کا شعر کہنا آتا ہے تو اس سے تو نہ کہنا ہی اچھا ہے، جب تمہاری طبیعت میں روانی نہیں ہے، تو سلاطین کی تاریخ پر کیوں ہاتھ ڈالتے ہو۔

اگر دقیقی کا کلام نقل کرنے سے اپنے اشعار کا چمکانا مقصود تھا تو اُس غریب پر احسان رکھنے کی کیا ضرورت تھی، اس لئے اندازہ کرنا چاہیئے کہ سلطان محمود کی ہجو میں کس حد تک واقعیت کا پہلو ہوگا۔

فردوسی خدائے سخن ہے، اس کے آگے بندوں کو زبان کھولنے کی کیا جرأت ہو سکتی ہے؟ لیکن ع۔ انصاف شیوہ ایست کہ بالائے طاعت است، ہم سرسری طور پر یہاں دقیقی کے چند اشعار بغیر کسی انتخاب کے نقل کرتے ہیں، جس سے دقیقی کے رتبۂ کلام کا اندازہ ہو سکے گا، وہ معرکہ آرائی کا سماں اس طرح کھینچتا ہے۔

دقیقی کا انداز کلام

زبس بانگ اسپاں و جوش و خروش — ہمے نالۂ کوس نشنیدہ گوش
درفشان بسیار افراشتہ — سر نیزہا، ز ابر بگذاشتہ
چو رستہ [علم ۱۲] درخت از بر کوہسار — چو بیشۂ نیستاں بوقت بہار
زتاریکی گرد و بانگ سپاہ — کسے روز روشن، نمے دید راہ
بگردند یک تیرباران نخست — بسان تگرگ بہاراں درست
بپوشیدہ شد چشمۂ آفتاب — ز پیکانہائے درخشاں چو آب

تو گفتی ہوا ابر آرد ہمے | وزاں ابر الماس بارد ہمے
ہوا زیں جہاں بود شبگوں شدہ | زمیں سر بسر پاک در خوں شدہ
در و دشتہا شد ہمہ لالہ گون | بہ دشت و بیاباں ہمے ریخت خون
چناں شد زبس کشتہ آں رزمگاہ | کہ بر وے نہ تانیست (نتوانست ۱۲) رفتن نگاہ

فردوسی کے کلام کا جو اصلی جوہر ہے یہی ہے کہ جس واقعہ کو بیان کرتا ہے، اس کی تصویر کھینچ دیتا ہے، انصاف سے کہو، کیا ان اشعار میں یہ بات نہیں؟ بے شبہ فردوسی نے اس وصف کو کمال تک پہنچا دیا۔ لیکن یہ صاف نظر آتا ہے کہ وہی شراب ہے جو دوبارہ کھینچ کر تیز ہو گئی ہے۔ دقیقی کے زمانہ تک فارسی زبان میں عربی الفاظ اس طرح مخلوط تھے کہ دونوں سے مل کر گویا ایک نئی زبان پیدا ہو گئی تھی، عباس مروزی کے کل چار شعر ہیں، لیکن عربی الفاظ، فارسی سے زیادہ ہیں، رودکی و شہید بلخی وغیرہ کا کلام بھی اسی کے قریب قریب ہے۔ سب سے پہلے جس نے فارسی زبان کو اس آمیزش سے پاک کر کے مستقل زبان کی حیثیت قائم کی ہے، وہ دقیقی ہی ہے، اس کے سینکڑوں شعر پڑھتے چلے جاؤ، عربی کا ایک لفظ نہیں آتا۔ دقیقی کی بدقسمتی دیکھو کہ اس فخر کا تاج، شہرت کے ہاتھوں نے اس سے چھین کر فردوسی کے سر پر رکھ دیا، دقیقی نے زبان کو جس طرح صاف کیا اس کا نمونہ یہ ہے۔

چو گشتاسپ را داد لہراسپ تخت | فرود آمد از تخت و بر بست رخت
بہ بلخ گزیں شد بداں نوبہار | ق کہ یزداں پرستان آں روزگار
مر آں خانہ را داشتندے چناں | کہ مر مکہ را تازیاں (اہل عرب ۱۲) ایں زماں
بداں خانہ شد شاہ یزداں پرست | فرود آمد آں جا و ہیکل ببست
ببست آں درِ آفریں خانہ (عبادت گاہ ۱۲) را | دراں خانہ نگزاشت بیگانہ را
بپوشید جامہ پرستش، پلاس (بکسر اضافت گزی) | خدا را چنیں داشت باید سپاس

بیفگند پارہ، فروہشت موے سوے روشن دادگر کرد روے
نیایش ہمے کرد خورشید را چناں بردہ بُد راہ جمشید را
چو گشتاسپ بر شد بہ تخت پدر کہ فرّ پدر داشت بخت پدر
بسر بر نہاد آں پدر دادہ تاج کہ زیبندہ باشد بر آزادہ تاج
منم گفت یزداں پرستندہ شاہ مرا ایزد پاک داد ایں کلاہ
بداں داد ما را کلاہِ بزرگ کہ بیروں کنم از رمہ میش گرگ
سوے راہ دزداں نیاریم چنگ بر آزادہ گیتی نداریم تنگ
پس از دفتر نامور قیصرا کہ ناہید بُد نام آں دخترا
کتایونش خواندی گرانمایہ شاہ دو فرزندش آمد چو خورشید و ماہ
یکے نامور فرخ اسفندیا شہے کارزاری، نبردہ سوار
پشوتن دگر گرد شمشیر زن شہے نامبردار لشکرشکن
چو یک چند گاہے برآمد بریں درختے پدید آمد اندر زمیں
از ایوان گشتاسپ بمیان کاخ درختے گشن برگ و بسیار شاخ
ہمہ برگ او پند، بارش خرد کسے کو چنو بر خورد کے مرد
خجستہ پئے نام او زردہشت کہ اہریمن بدکنش را بکُشت

ان اشعار میں جا بجا فکِّ اضافت اور الف اشباع ہے جو آج کل متروک ومعیوب ہے، لیکن قدما کے ہاں اس کا عام رواج تھا، فردوسی بے تکلف ان چیزوں کو برتتا ہے۔

دقیقی نے مثنوی کے ساتھ، قصیدہ اور غزل کو بھی ترقی دی، یہ دو شعر جو نامعلوم طور پر لوگوں کی زبانوں پر جاری ہیں، اسی کی غزل کے ہیں۔

گویند صبر کن کہ ترا صبر بر دہد آرے دہد ولیک بہ عمر دگر دہد

من عمر خویشتن بہ صبوری گذاشتم　　عمر دگر بباید تا صبر بر دہد

اس نے بعض غزلیں مسلسل لکھی ہیں، اور یہ اُس زمانہ کے لحاظ سے بالکل نئی بات ہے۔ اس کی شاعری کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ رزم و بزم اور عشق و عاشقی کے دائرہ میں محدود نہیں، آج جس چیز کو لوگ نیچرل شاعری کہتے ہیں فارسی میں غالباً سب سے پہلے اسی نے اس کی بنیاد قائم کی، ایک قصیدہ میں بہار کا سماں دکھایا ہے، اس میں خوش رنگ اور رنگ برنگ پھولوں کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے۔

نیچرل شاعری

سحر گاہاں کہ باد نرم جنبد　　بجنباند درخت سرخ و اصفر (زرد)
تو پنداری کہ از گردوں ستارہ　　ہمے بارید بر دیبائے اخضر (کمخاب)
نگار اندر نگار و لون در لون　　ہزاراں درشدہ پیکر بہ پیکر

ایک مسلسل غزل بہار کی رنگینی اور مے و معشوق پر لکھی ہے،

غزل مسلسل

در افگند اے صنم ابر بہشتی　　زمیں را خلعت اُردے بہشتی
زمیں بر ساں خون آلودہ دیبا　　ہوا بر ساں مشک اندودہ دشتی
بداں ماند کہ گوئی از مے و مشک　　مثال (تصویر) دوست بر صحرا نوشتی
بتے رخسار او ہمرنگ یاقوت　　مے بر گونۂ جامہ کنشی
جہاں طاؤس گونہ گشت گوئی　　بجائے نرمی و جائے درشتی
زگل بوئے گلاب آید بہ انساں　　کہ پنداری گل اندر گل سرشتی
دقیقی چار خصلت برگزیداست　　بہ گیتی از ہمہ خوبی و زشتی
لب یاقوت رنگ و نالۂ چنگ　　مئے خوں رنگ و کیش زردہشتی[1]

---

[1] یعنی۔۔ دشتی، کیونکہ زردشت کے مذہب میں شراب حلال ہے۔

شہید بلخی

اس دور کا مشہور شاعر ہے، مختصر تذکرہ اس کا اُوپر گذر چکا، اشعار کا نمونہ یہ ہے۔

زمانہ کی ناقدردانی کی شکایت

دانش و خواستہ است نرگس و گل — کہ بہ یکجائے نشگفتند بہم
ہر کرا دانش است خواستہ نیست — ہر کرا خواستہ است دانش کم
اگر غم را چو آتش دود بودے — جہاں تاریک بودے جاودانہ
دریں گیتی سراسر گر بگردی — خردمندے نیابی شادمانہ
بر فلک ہر دو شخص پیشہ ورند — ایں یکے درزی، ان دیگر جولاہ
ایں نہ دوزد مگر کلاہِ ملوک — واں نہ بافد مگر پلاسِ سپاہ

تشبیہات

ابر ہمے گرید چوں عاشقاں — باغ ہمے خندد معشوق وار
رعد ہمے نالد مانند من — چوں کہ بنالم بہ سحرگاہ زار
پرن چلیپائے روم زاں شد باغ — کاب ریزے است باغ از جلی
ابر چوں چشم ہند بن عتبہ است — برق مانندِ ذوالفقارِ علی

موعظت ونصیحت

عیب باشد بہ کارِ نیک درنگ — گر شتاب آید اے رفیق ملام
عاقبت را ہم از نخستیں بیں — تا بہ غفلت گلو نہ گیرہ دوام

ابو شکور بلخی

۳۳۶ھ میں تھا، اس کا کلام بہت کم ملتا ہے جس قدر موجود ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاعری کا ہر قدم آگے بڑھ رہا ہے، سقراط سے کسی نے پوچھا تھا کہ آپ کو اس قدر تحقیقات و تدقیقات کے بعد کیا معلوم ہوا؟ اس

نے کہا "یہ معلوم ہوا کہ کچھ نہیں معلوم ہوا" اس فلسفیانہ خیال کو کس قدر عمدہ اور شاعرانہ انداز میں ادا کیا ہے۔

تا بہ آنجا رسیدہ دانشِ من — کہ بدانم ہمے کہ نادانم

یعنی میرا علم اس حد تک ترقی کر گیا کہ میں نے اب جان لیا کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ اس کی مثنوی کے چند اشعار جو منقول ہیں اُن میں صاف شاہنامہ کا رنگ نظر آتا ہے۔

بہ دشمن برت مہربانی مباد — کہ دشمن درختے است تلخ از نہاد
درختے کہ تلخش بود گوہرا — اگر چرب و شیریں دہد مر ورا
ہماں میوۂ تلخت آرد پدید — ازو چرب و شیریں نخواہی مزید

اسی مضمون کو فردوسی نے زیادہ بلند کر دیا ہے

درختے کہ تلخ است و برا سرشت — گرش بر نشانی بہ باغ بہشت
ور از جوے خلدش بہنگام آب — بہ بیخ انگبین ریزی و شہد ناب
سر انجام گوہر بہ کار آورد — ہماں میوۂ تلخ بار آورد

خبازی نیشاپوری

دولت سامانیہ کا نامور شاعر ہے ۳۴۲ھ میں وفات پائی، اس کا کلام بالکل نایاب ہے، ایک قصیدہ کی گریز کے دو شعر مشہور ہیں جن میں متاخرین کی جدت مضمون کے ساتھ، نیچرل رنگ بھی موجود ہے۔

مے بینی آں دو زلف کہ بادش ہمے برد — گوئی کہ عاشقے است کہ ہیچش قرار نیست
یا نہ کہ دست حاجب سالار لشکر است — کز دور مے نماید کامروز بار نیست

یعنی معشوق کی زلف جو ہوا سے ہل رہی ہے گویا ایک بے چین عاشق ہے

یا شاہی نقیب کا ہاتھ ہے۔ جو دور سے اشارہ کر رہا ہے، کہ آج دربار نہ ہوگا۔

عمارہ مروزی

مرو کا رہنے والا تھا، ۳۶۵ھ میں انتقال کیا، کلام کا نمونہ یہ ہے۔

آتش اگر ندیدی با آب ممتزج — اینک نگاہ کن تو بدین جام و این شراب
جام بلور و لعل مے صاف اندرو — گوئیکہ آتشے ست بر آمیختہ بہ آب

ان شعراء کے علاوہ اس دور میں اور بہت سے خوش گو اور خوش فکر تھے۔ مثلاً آجمی، طخاری، ابو العباس زنجی، ابو المثل بخاری، ابو سلمہ وغیرہ لیکن چونکہ اُن کے حالات اور اشعار بہت کم ملتے ہیں اس لئے ہم ان کے نام قلم انداز کرتے ہیں۔

غزنویہ

شاعری اگرچہ ابتدائے ظہور سے روز افزوں ترقی کرتی جاتی تھی لیکن غزنویہ دور میں انتہائے کمال تک پہنچ گئی، فردوسی، اسدی، طوسی، عنصری، فرخی، حکیم سنائی، منوچہری، دامغانی، جن میں ہر شخص اقلیم سخن کا صاحب تاج و تخت ہے، اسی عہد کی یادگار ہیں۔

غزنوی خاندان کا اجمالی تذکرہ

سلسلہ غزنویہ، حقیقت میں سامانی حکومت کی ایک شاخ ہے، عبد الملک بن نوح سامانی المتوفی ۳۵۰ھ کے زمانہ میں الپتگین جو اسی خاندان کا غلام تھا، ترقی کر کے امارت کے درجہ تک پہنچ گیا، عبد الملک نے اس کو خراسان کا حاکم مقرر کر دیا، عبد الملک کے بعد جب اُس کا بیٹا منصور تخت نشین ہوا تو الپتگین، خراسان چھوڑ کر غزنین چلا گیا اور یہاں ۱۶ برس حکومت کر کے وفات پائی، اس کے بعد اس کا بیٹا ابو اسحٰق

قائم مقام ہوا، لیکن چند روز کے بعد مر گیا، الپتگین کا ایک غلام سبکتگین تھا، اس نے الپتگین کے عہد میں ایسی قابلیت کے جوہر دکھائے کہ ابو اسحٰق کے بعد لوگوں نے ۳۶۵ھ میں اسی کو غزنین کا حاکم مقرر کر دیا، یہی غلام (در غلام) سلطنت غزنویہ کا بانی اوّل ہے اور سلطان محمود فاتح ہندوستان اسی نامور کا فرزند ہے سبکتگین پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان کو تسخیر کی نگاہ سے دیکھا، اور جیپال کو بار بار سخت شکستیں دیں، سامانی دربار سے اس کو ناصر الدین کا خطاب ملا ۳۸۳ھ میں وفات پائی، اس کے بعد اس کا بیٹا اسمٰعیل جو الپتگین کی دختر کے بطن سے تھا، بلخ میں تخت نشین ہوا محمود غزنین میں تھا، اس نے بھائی کو لکھا، کہ آپ بلخ میں حکومت کیجئے، لیکن غزنین میرے قبضہ میں رہنے دیجئے۔ اس نے نہ مانا، اس پر جنگ ہوئی اور اسمٰعیل نے شکست کھائی، محمود باپ کی زندگی ہی میں نوح سامانی کے دربار سے سیف الدولہ کا خطاب حاصل کر چکا تھا، تخت نشینی کے بعد اس کو بغداد کے دربار سے یمین الدولہ کا لقب ملا۔

محمود کی شاہانہ فتوحات اور معرکہ آرائیاں ایک دلچسپ داستان ہے، جس کی آواز بازگشت آج بھی ہندوستان کے در و دیوار سے آ رہی ہے، لیکن شعر العجم کی زبان سے اس کے ملکی فتوحات کے بجائے، علمی فتوحات کا ترانہ زیادہ موزوں ہوگا۔

سلطان محمود کے علمی کارنامے

محمود جس طرح فاتح و کشورستان تھا، اسی طرح علم و فضل میں بھی کمال رکھتا تھا، جواہر مضیئہ جو فضلائے حنفیہ کے حالات میں ایک نہایت مستند کتاب ہے اس میں اس کو فقہا میں شمار کیا ہے، فقہ میں خود اس کی ایک مبسوط تصنیف موجود ہے، غزنین میں اس نے ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا تھا جس کے ساتھ ایک عجائب خانہ بھی تھا جس میں تمام دنیا کے نوادر موجود تھے[1] ملک میں جو بڑے بڑے مشاہیر فن تھے

---

[1] تاریخ فرشتہ

اکثروں کو بُلا کر دربار میں جگہ دی تھی، ان میں سے ایک ابوریحان بیرونی بھی تھا جو متعدد فنوں میں بوعلی سینا کا ہمپایہ وہمسر تھا بوعلی کو بھی اس نے خوان کرم پر دعوت دی تھی، لیکن اس کو کچھ وہم پیدا ہوا اور نہ آیا۔

شاعری پر اس نے حوصلۂ شاہانہ سے توجہ کی، ایک مستقل محکمہ قائم کیا اور عنصری کو ملک الشعراء کا خطاب دے کر اس کا افسر مقرر کیا، تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ محمود کے خوانِ کرم سے چار سو شاعر بہرہ یاب تھے، جن کو حکم تھا کہ جو کچھ کہیں پہلے عنصری کو دکھلا کر پھر دربار میں لائیں، ایک موقع پر جب شہزادہ مسعود خراسان سے غزنین میں آیا، اور شعراء نے دربارِ عام میں قصائد پیش کیے تو ایک ایک شاعر کو بیس بیس ہزار اور زینتی اور عنصری کو پچاس پچاس ہزار درہم عطا کیے[1]، غضائری کو دو شعروں پر دو توڑے دیئے چنانچہ غضائری خود کہتا ہے۔

مرا دو بیت بفرمود شہریار جہاں | بران صنوبرِ عنبر عذار مشکیں خال
دو بدرہ زر ابفرستاد و دو ہزار درم | بر غم حاسد و ننیار بد سگال نکال

عنصری کو ایک رباعی پر حکم دیا کہ اُس کا مُنہ جواہرات سے بھر دیا جائے۔

ان واقعات کو ایک نکتہ بین محمود کے فضائل کے بجائے، اس کے معائب کے دفتر میں لکھے گا، اور واقعی، مداحوں اور خوشامد گویوں کی ایک فوج کثیر بہم پہنچانا اور ان پر زر و جواہر کا مینہ برسانا، فیاضی نہیں، بلکہ اسراف اور سبک سری ہے، لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ محمود کی یہ فیاضیاں مدح پسندی کی غرض سے نہیں بلکہ فن ادب و تاریخ کی ترقی کی غرض سے تھیں، اس نے فردوسی سے شاہنامہ لکھوا کر عجم پر یہ احسان کیا کہ عجم گو خود مٹ گیا، لیکن اس کے کارنامے آج تک نہ مٹ سکے، اسلامی فتوحات، مسلمانوں کے مذہبی ترانے ہیں، لیکن مسلمان خالدؓ و ضرارؓ کے بجائے رستم و

[1] مجمع الفصحاء تذکرۂ زینتی

سہراب کے نام سے زیادہ آشنا ہیں، عبد الملک، ولید، مقتدر، معتضد، معتصم، مستعصم کو کتنے آدمی جانتے ہیں؟ لیکن جم و کیخسرو، کیکاؤس و فریدوں، افراسیاب و اسفندیار کو بچّہ بچّہ جانتا ہے۔

عنصری نے ۱۸۰ اشعار کا قصیدہ لکھا جس میں محمود کی تمام لڑائیاں نہایت تفصیل سے بیان کیں[۵]، بدایعی بلخی نے نوشیرواں کا نصیحت نامہ نظم کیا، اسدی طوسی نے لغات فارسی کی تدوین کی اور بدائع و صنائع فارسی پر ایک کتاب لکھی، تاریخ و اخلاق کے علاوہ محمودی شعراء نے اصل فن کو ترقی دی اور شاعری کو اس قابل کر دیا کہ جس قسم کے مطالب چاہیں ادا کر سکیں، واقعہ نگاری، معاملہ بندی، اظہار جذبات، قدرتی مناظر کی تصویر، غرض شاعری کے جتنے انواع ہیں، سب ان کے ہاں پائے جاتے ہیں، غزل البتہ رہ گئی، لیکن ابھی اسلام کی ترقی کا شباب تھا، ابھی سے اس فتنۂ خوابیدہ کے جگانے کی کیا ضرورت تھی۔

محمودی شعراء اگرچہ بیشمار ہیں، لیکن جن ناموروں کو محمود نے ندما میں داخل کر لیا تھا اور جو آسمانِ سخن کے سبعہ سیارہ تھے یہ ہیں، عنصری، فردوسی، اسدی، عسجدی، غضایری، فرخی، منوچہری،

عنصری

حسن بن احمد نام، ابوالقاسم کنیت، عنصری تخلص، بلخ کا رہنے والا تھا، آغاز شباب میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا، چونکہ آبائی پیشہ تجارت تھا، خود بھی تجارت شروع کی، ایک دفعہ اسی ضرورت سے سفر کو نکلا، راہ میں ڈاکہ پڑا اور جو کچھ کائنات تھی سب جاتی رہی،

---

[۵] تذکرہ دولت شاہ سمرقندی

عنصری نے تجارت کا خیال چھوڑ کر علم کی طرف توجہ کی، اس زمانہ میں تحصیل علم کے لئے فیس وغیرہ کا کچھ جھگڑا نہ تھا، ہر جگہ، ہر طرف بڑی بڑی درسگاہیں کھلی ہوئی تھیں، اور جو شخص جس آزادی سے پڑھنا چاہتا تھا، پڑھ سکتا تھا، عنصری نے تمام متداول علوم وفنون حاصل کئے، لیکن طبیعت کو قدرتی لگاؤ شاعری سے تھا، اس لئے شاعری کو اپنا فن قرار دیا اور اسی ذریعہ سے سلطان محمود کے چھوٹے بھائی نصر بن سبکتگین کے دربار میں پہنچا، نصر نے جوہر قابل دیکھ کر محمود کے دربار میں تقریب کی، رفتہ رفتہ **ملک الشعراء** کا خطاب ملا، سلطان محمود نے حکم دیا کہ دربار کے تمام شعرا جن کی، تعداد چار سو تھی، اپنا کلام عنصری کو اصلاح کی غرض سے دکھائیں، اور جس کا کلام پیش ہو عنصری کی اصلاح کے بعد پیش ہو، بڑے بڑے نامور شعراء عنصری کی مدح میں قصائد لکھ کر پیش کرتے تھے اور گراں بہا صلے پاتے تھے، محمود کی شاہانہ فیاضیوں نے عنصری کو دولت ومال سے اس قدر مالا مال کر دیا کہ چار سو زریں کمر غلام، رکاب میں ساتھ چلتے تھے، اور جب سفر کرتا تو اس کا سازوسامان جو عموماً طلائی و نقرئی ہوتا تھا چار سو اونٹوں پر بار کیا جاتا تھا، انتہا یہ کہ دیگیں بھی طلائی اور نقرئی ہوتی تھیں[۱]، اکثر شعراء نے عنصری کی دولتمندی کا ذکر حسرت ورشک کے ساتھ کیا ہے، خاقانی کہتا ہے ؎

شنیدم کہ از نقرہ زد دیگدان ز زر ساخت آلات خوان عنصری

محمود کے دربار میں چار سو شعرا تھے جن میں فرخی، عسجدی، غضائری، منوچہری جیسے قادر الکلام بھی شامل ہیں۔ لیکن یہ بات اسی کو حاصل ہوئی کہ سلطان محمود کا بقائے نام اسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے نظامی سمرقندی کہتا ہے۔

---

[۱] عنصری کے حالات زیادہ تر مجمع الفصحاء و تذکرہ دولت شاہ سمرقندی سے لئے گئے ہیں۔

بسا کاخا کہ محمود شس بنا کرد | کہ از رفعت ہمی با مہ نداکرد
نہ بینی زاں ہمہ یک خشت برپائے | مدیح عنصری ماندا ست برجائے

عنصری نے سلطان محمود کی وفات کے تقریباً دس برس بعد ۳۱؁ھ میں وفات پائی، اس کے اشعار کی تعداد ۳۰ ہزار بیان کی جاتی ہے جن میں اب صرف تین ہزار موجود ہیں۔ قصائد کے سوا متورد مثنویاں بھی لکھی تھیں مثلاً وامق وعذرا، سرخ بت و خنگ، شہروعین، لیکن آج بالکل ناپید ہیں، اس زمانہ تک شاعری کا بڑا لازمہ ندیمی یعنی فن مجلس تھا، جو شاعر جس قدر زیادہ اس فن میں کمال رکھتا تھا، اسی قدر زیادہ کامیاب ہوتا تھا، اس کے لئے سب سے مقدم چیز بدیہہ گوئی تھی عنصری اس وصف میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا، وہ نہایت پرگو اور برجستہ کہتا تھا، آتشکدہ میں لکھا ہے کہ ایک موقع پر رات بھر میں ہزار شعر کہہ ڈالے۔ اس کی بدیہہ گوئی کے واقعات تذکروں میں کثرت سے ملتے ہیں۔

سلطان محمود کو ایاز سے جو محبت تھی اگرچہ حد سے متجاوز تھی لیکن ہوس کا شائبہ نہ تھا، ایک دن بزم عیش میں بادہ وجام کا دور تھا محمود خلاف عادت معمول سے زیادہ پیکر بدمست ہوگیا، اسی حالت میں ایاز پر نظر پڑی، اس کی شکن در شکن زلفیں چہرہ پر بکھری ہوئی تھیں، محمود نے بے اختیار اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔ لیکن فوراً سنبھل گیا اور جوش تقویٰ میں آکر ایاز کو حکم دیا کہ زلفیں کاٹ کر رکھ دے، ایاز نے فوراً حکم کی تعمیل کی[۱]، صبح کو جب محمود سو کر اٹھا تو ایاز کی صورت دیکھ کر سخت مکدر ہوا، بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا، ندما اور مقربین دم بخود تھے، آخر علی قریب نے جو حاجب خاص تھا، عنصری کو بلا کر صورت واقعہ بیان کی

---

[۱] شعراء نے اس واقعہ سے مضامین پیدا کئے، مرزا صائب کہتے ہیں
پا از گلیم خویش نبباید دراز کرد | تیغ ستم بہ بیں چہ بزلف ایاز کرد

عنصری نے محمود کے سامنے جا کر یہ رباعی پڑھی۔

گر عیب سرِ زلف بت، از کاستن است | نہ جائے بغم نشستن و خاستن است
وقت طرب و نشاط، و مے خواستن است | کاراستن سرو ز پیراستن است

یعنی اگر معشوق کی زلفیں ترش گئیں تو یہ رنج و غم کی کیا بات ہے، یہ تو اور خوشی کا موقع ہے اس لئے کہ سرو جب چھانٹ دیا جاتا ہے تو اور زیادہ وہ موزوں ہو جاتا ہے محمود نے حکم دیا کہ عنصری کا منہ جواہرات سے بھر دیا جائے۔ چنانچہ تین دفعہ ایسا کیا گیا، **چہار مقالہ** میں لکھا ہے کہ مُنہ کے بجائے دامن بھر اگیا تھا، فیاضی کے مبالغہ کے لحاظ سے شاید یہی روایت صحیح ہو، لیکن مُنہ بھرنے میں جو بات ہے وہ دامن میں نہیں،

ایک دفعہ سلطان نے فصد لی، عنصری نے برجستہ کہا۔

آمد آں رگ زنِ مسیح پرست | نیش الماس گوں گرفتہ بدست
طشتِ زرّیں و آبدستاں خواست | بازوے شہر یار را بر بست
نیش بگرفت و گفت عز علیک | ایں چنیں دست را کہ یارد خست
سر فرو بُرد و بوسہ بر داد | وز سمن شاخ ارغواں بر جست

پہلے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ اوج ترقی کے زمانہ میں بھی جرّاحی و فصّادی کا کام عیسائی کرتے تھے ایک دفعہ محمود، چوگان کھیلنے میں گھوڑے سے گر پڑا، خفیف سا زخم آیا، عنصری نے فی البدیہہ کہا۔

شاہا! ادبے کن فلک بدخو را | کاسیب رسانید رخ نیکو را
گر گوی خطا رفت بہ چوگانش زن | ور اسپ غلط کرد، بمن بخش اورا

اخیر مصرع دو پہلو رکھتا ہے، ایک یہ کہ گھوڑے نے اگر غلطی کی تو میری خاطر اُس کو بخش دیجئے۔ دوسرے یہ کہ گھوڑا اگر غلط رَو ہے تو مجھے دے ڈالئے،

محمود نے اس حسن طلب کے صلہ میں گھوڑا عنصری کو دے دیا۔ عنصری نے ایک اور رباعی گھوڑے کی طرف سے معذرت میں لکھی،

رفتم بر اسپ تا بزارش بکشم | گفتا کہ نخست بشنو ایں عذر خوشم
نے گاو زمینم کہ جہاں برگیرم | نے چرخ چہارمم کہ خورشید کشم

یعنی میں نے گھوڑے کو سزا دینے کا قصد کیا، گھوڑے نے کہا پہلے میرا عذر تو سُن لیجئے، کچھ میں گاؤ زمین تو نہیں ہوں کہ عالم کا بار اُٹھالوں، نہ چوتھا آسمان ہوں کہ آفتاب کو لئے پھروں۔

شاعری کے متعلق عنصری نے جو کام کیے اُن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) **قصیدہ** میں مخلص اور گریز سب سے زیادہ مہتم بالشان چیز سمجھی جاتی ہے یعنی غزلیہ مضامین کہتے کہتے بادشاہ کی مدح کی طرف کیونکر رجوع کریں، متاخرین کو ناز ہے کہ یہ نکتہ آفرینیاں اُنہیں کے ساتھ مخصوص ہیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ عنصری کے مخالص بھی متاخرین سے کم نہیں، ایک قصیدہ میں ابتدا سے انتہا تک دو دو چیزوں کا مقابلہ کیا ہے، اُس میں لکھتا ہے،

عنصری کی شاعری کی خصوصیات

غنودستند آں ماہِ منوّر | خط، زلفین آں، مہ روے دلبر
یکے را سنبل نورستہ بالین | یکے را لالۂ خود روے بستر
بہ روے و موے او بنگر کہ بینی | بے آذر (آگ)، ہر دو آں را فعلِ آذر
یکے بے دود سال و ماہ و تیرہ | یکے بے نور روز و شب منوّر
مرا بہرہ دو چیز آمد ز گیتی | دلِ پاک و زبانِ مدح گستر
یکے بر مہر جاناں وقف کردم | یکے بر مدح **شاہنشاہ** کشور

ایک اور قصیدہ ہے۔

گہ آں آراستہ زلفش گرہ گرہ دہ، گہے چنبر | کہ آں پیراستہ جعدش ببارد مشک، گہ عنبر

شگفتہ لالہ رخسارہ۔ حجابِ لالہ چرا رہ   بر از عاج و دل از خارہ، تن از شیر و لب از شکر
سمن بوئے، شبہ موئے، بلا جوئے، جفا گوئے   پری زادے، پری روئے، پری چہرے، پری پیکر
بپرواز ِ دل از روئے، کہ گاہ آمد کہ حق جوئے   غزل چندیں چرا گوئی ز عشق آں بتِ دلبر
ثنا جوئے از غزل بہ پاسخ، کیت ایں ہر دو بود فرخ   غزل بر ماہِ زیبا رخ، ثنا بر شاہ نیک اختر

ایک **قصیدہ** سوال و جواب سے شروع کیا ہے اور اخیر تک یہ اندازہ قائم رکھا ہے اُس میں نہایت خوبی سے مدح کی طرف رجوع کی ہے۔

ہر سوالے کزاں گل سیراب   دوش کردم مرا بداد جواب
گفتم آتش براں رخت کہ فروخت   گفت آں کہ دل تو کرد کباب
گفتم اندر عذابِ عشق تو ام   گفت عاشق نکو بود بہ عذاب
گفتم از چیست روئے راحتِ من   گفت ہر دم، ز رُدی خسرو شاب
گفتم آں میر **نصر** ناصر دیں   گفت آں مالکِ قلوب، و رقاب
گفتم اندر جہاں چو او دیدی   گفت نے، و نخواندہ ام بکتاب
گفتم اعداے او دروغ زن اند   گفت ہمچوں، مسیلمہ کذاب
گفتم از مدح او نیاسایم   گفت زنیساں کنند اولوالالباب
گفتم او را چہ خواہم از ایزد   گفت عمرِ دراز و دولت شاب

ایک **قصیدہ** کو تشبیب سے شروع کیا ہے، معشوق کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہے۔

او، دمن ہر دو ہمے نازیم، و نازمن بہ است   کو بہ حسنِ خویش نازد من بہ مدح **شہریار**

ایک قصیدہ زلف کی تعریف سے شروع کیا ہے۔

اے شکستہ زلفِ یار، از بسکہ تو دستاں کنی   دست، دستِ تست، گر با ساحراں یکساں کنی
ہم زرہ پوشی و ہم چوگاں زنی بر ارغواں   خویشتن را گہ زرہ سازی و گہ چوگاں کنی

نیستی دیوانہ ، بر آتش چرا غلطی ہے؟ — نیستی پروانہ ، گرد شمع چوں جولاں کنی؟

زلف سے خطاب کرتے کرتے ، اپنے آپ سے خطاب کرتا ہے۔

دل تنگ دار اے تن ازدرش کہ دل باید ترا — تا تناسے کہ خداے کشور ایراں کنی!

(۲) **قصیدہ** اگرچہ مدّاحی اور بھٹی کے لئے مخصوص ہو گیا تھا ، اسی بنا پر عرفی نے کہا ہے ،

قصیدہ کار ہوس پیشگان بود عرفی

ایک اور شاعر کہتا ہے۔

گر نگویم قصیدہ باکے نیست — من خوشامد نے توانم گفت

لیکن **عنصری** نے اکثر قصائد سے واقعہ نگاری کا کام لیا ہے ، اس نے اکثر قصیدوں میں محمود کی لڑائیاں اور فتوحات نظم کی ہیں ، ایک قصیدہ میں جو ۷۲ شعروں کا ہے محمود کے تمام معرکے اجمالاً لکھے ہیں[1] - اس کے چند اشعار یہ ہیں۔

شنیدۂ خبر شاہ ہندواں **جیپال** — کہ بر سپہر بلندش ہے بسود افسر

بداں صفت سپہے چوں شب سیاہ بزرگ — بدست ایشاں شمشیر ہائے ہمچو سحر

چو دود تیرہ ، در و آتشے زبانہ زناں — تو گفتۂ کہ پراگندہ شد بدشت سقر

خدایگان خراساں بدست **پیشاور** — بہ حملۂ بپراگند آں ہمہ لشکر

حکایت سفر **مولتان** ہے دانی — دگر ندانی **تاج الفتوح** پیش آور

اگر زدجلہ **فریدوں** گزشت بے کشتی — بہ **شاہنامہ** برآں بر حکایت است سمر

اناں سپس کہ در وہ ہم را نشد پایاب — وزاں سپس کہ براں باد را نبود عبر

بہ **مولتان** شد و در رہ دو بست قلعہ گشاد — کہ ہر یکے را صد بندہ بود چوں خیبر

بلاد و بت کدہ شاں کشاد و سوخت ہمہ — ببرد باد ہمہ تودہ ہاے خاکستر

[1] تذکرۂ دولت شاہ میں لکھا ہے کہ اس قصیدہ میں ۱۸۰ شعر ہیں ، لیکن دیوان مروجہ میں اس سے کم ہیں۔

چو بازگشت بہ یک تاختن بہ میمنہ شد   ازاں کہ بود خراساں، ز رنجہا مضطر

خوارزم کی فتح میں لکھتا ہے

بوقت آں کہ زمین تفتہ بُد ز باد سموم   ہوا چو آتش و گرد اندرو، بجائے شرار

فرو گذشت بآمویہ (دریائے جیحون ۱۲) شہریار جہان   بہ فال اخترِ نیک و بہ نصرتِ دادار

ہمہ زمین شدہ از روے بندگان کشمیر   ہمہ ہوا شدہ از عکس چاؤشان فرخار

در آب در ہمہ غرقہ شدند چوں فرعون   چو بر گزشت برآں آب، شاہ، موسیٰ وار

فراخ جیحوں چوں کوہ شد ز بسکہ درو   کلاہ و ترکش و زین بود و جامہ و دستار

کسے کہ زندہ بماند است ازاں ہزیمتیاں   اگرچہ تنش درست است، ہست چوں بیمار

بہ مغزش اندر، تیغ است، اگر بود خفتہ   بہ چشمش اندر تیر است اگر بود بیدار

اگر بہ جنبد، بند قبائے او از باد   گمان کند کہ ہمے بر جگر خورد مسمار

اگر سوال کند، گوید اے سوار مزن   دگر جواب دہد، گوید، اے ملک زنہار

اخیر شعروں میں شکست یافتہ فوجوں کی بدحواسی اور خوف زدگی کی تصویر کس خوبی سے کھینچی ہے، کہتا ہے کہ جب یہ سوتے ہیں تو خواب میں ان کو ہر طرف تلواریں نظر آتی ہیں، اور آنکھ کھلتی ہے تو تیر ہی تیر دکھائی دیتے ہیں، قبا کا بند اگر ہوا سے جنبش کرتا ہے تو گمان کرتا ہے کہ کوئی شخص کلیجے میں کیل ٹھوک رہا ہے اگر کچھ درخواست کرتا ہے تو یہ کہ میاں سوار! اب نہ مارنا، اور کچھ جواب دیتا ہے تو یہ کہ اے بادشاہ، پناہ دے۔"

(۳) مناظرِ قدرت، اور خاص خاص چیزوں کے اوصاف بھی اُس نے نہایت خوبی سے لکھے ہیں۔

بہار

ابر نوروزی، ہمے دُر بار دوبت گر شود   تا ز صنعش ہر درختے لعبتے دیگر شود

باغ ہمچو کلبۂ بزّاز پُر دیبا شود   باد ہمچوں طبلۂ عطار پُر عنبر شود

روے بندِ[1] ہر زمینے حُلۂ چینی شود — گوشوارِ ہر درختے رشتۂ گوہر شود

زمین کا ہر تختہ چینی کپڑے کی نقاب پہن لیتا ہے — درخت کانوں میں سونے کے بُندے ڈال لیتے ہیں۔

چوں حجابِ لعبتاں خورشید را بینی کہ باز — گہ بروں آید ز میغ، وگہ بہ میغ اندر شود

آفتاب، بھان متی کی پتلی بن گیا ہے — کہ کبھی بادل سے نکل آتا ہے اور کبھی بادلوں میں گھس جاتا ہے

افسرِ سیمیں فروگیرد، ز سر کوہِ بلند — باز، مینا چشم، و دیبا روے و مشکیں سر شود

پہاڑ نے چاندی کا تاج (برف) سر سے اُتار کر رکھ دیا ہے — اور اُس کی آنکھیں سبز، چہرہ پُرنگار اور سر مشکیں ہو گیا

مقصد یہ کہ پہاڑ پر سبزہ، بنفشہ اور طرح طرح کے پھول پیدا ہو گئے۔

درخت نارنج، از خامہ گوئیا شنگرف — بریخت است کسے مُشت مشت و زرنگار

ز برگ و بار ہمہ طوطیان پرّانند — کہ برگ شان ہمہ پرّ است و بارِ شان منقار

نہر کی تعریف

مجرّہ وار[کہکشاں] یکے جوے اندرو گزرد — بر آبِ خضر بتہ کردہ، آب او بازار

اگر بجنبد گوئی ہمے بجنبد جاں — دگر بہ پیچد گوئی ہمے بہ پیچد مار

بسان قارون گاہے فرو شود بزمیں — گہے شود بہ ہوا بر چو جعفر رضؓ طیّار

ہاتھی کی تعریف

نہ چرخ اند، لیکن ہمہ چرخ گردش — نہ کوہ اند، لیکن ہمہ کوہ پیکر

چو اندر ہوا، کوہ بر قوم موسےٰ — چو بر قوم عاد آیت بادِ صرصر

چناں گردد، از عرض شاں دست گوئی — بہ موج اندر آید ہمے بحرِ اخضر

تنک راہ گیرند، بر آب و آتش — بدنداں بدّرند پولاد و مرمر

زمیں[سبک ۱۲] کوہ باشد چو آیند پیدا — چو اندر گزشتند، چاہ مقعّر

صنائع و بدائع | یہ بدعت عنصری سے پہلے شروع ہو چکی تھی، لیکن خال خال تھی اور اس قدر نمایاں نہ تھی کہ لوگوں کا خیال اُس طرف رجوع ہوتا، عنصری نے اکثر صنعتیں مثلاً لف و نشر، ترصیع، تقسیم، سوال و جواب، کثرت سے برتیں، اور چونکہ بعض

---

[1] نقاب کو کہتے ہیں۔

صنعتیں نہایت خوبی سے استعمال کیں، اور شعراء نے بھی تقلید کی، اور ایک عام شاہراہ پیدا ہوگئی، چنانچہ **ترصیع** یعنی دونوں مصرعوں میں تمام الفاظ کا باہم مساوی الوزن ہونا یا ہم قافیہ ہونا اس قدر عام ہوا کہ قدمائے کے اخیر دور یعنی ساتویں صدی تک تمام قصائد اسی انداز پر لکھے جاتے تھے۔ اور فیصدی ۸۰ شعروں میں یہ صنعت پائی جاتی تھی۔ لف و نشر، تقسیم سیاقۃ الاعداد، کو بھی رواج ہوا لیکن نہ اس قدر قصائد کہ گلے کا ہار بن جائیں، عنصری نے جس طرح ان صنعتوں کو برتا، اُن کی مثالیں درج ذیل ہیں۔

ترصیع شراب

درختے است گویا بہ مینا منقش — پرندے ست گویا بہ لولو مشجر
رونده است و رفتنش در مغز شیراں — خورنده است و خوردنش از مغز کافر
نہ وہم است و گشتنش چوں وہم بر دل — نہ مغز است و بودنش چوں مغز در سر

گہ آں آراستہ زلفش گرہ گرہ دو گیسے چنبر — گہ آں پیراستہ جعدش ببارد شک گہ عنبر
رُخ چوں تو شگفتہ گل، ہمہ گلبن برنگ مُل — ہمہ شمشاد، پُر سنبل، ہمہ بیجادہ پر شکر
بہ رواز نیکوے معنی، بہ غمز از جادوے دعوے — بہ چہرہ حجت مانی، بہ خوبی حاجت آذر
سمن بوے، شبہ موے، بلا جوے، جفا گوے — پریزادے، پریروئے، پری چہرے، پری پیکر
دل آرامی، دل آرائے، غم انجامے، غم افزاے — نکوروے، نکورائے، بہ حسن اندر جہاں سرور

تمام قصیدہ اسی صنعت میں ہے، اور اس قدر مقبول ہوا کہ تمام شعرائے مابعد نے التزاماً اسکے تتبع میں قصائد لکھے، **سلیمان ساوجی، امیر خسرو اور قاآنی** نے بعض اور خوبیاں اس میں اضافہ کیں، اور زیادہ حسن پیدا کر دیا، مثلاً قاآنی کہتا ہے۔

کنوں کہ شنبلید و ارغوان و یاسمن دارد — چمن تزئین، و من تمکیں، زمین آئین زماں زیور
بہ صحن باغ و طرف راغ، و زیر سرو، و پائے جو — بزن گام و بجو کام، و بدہ جام، و بکش ساغر

لف ونشر اور تقسیم کو اگرچہ عنصری نے بہت کم برتا ہے، لیکن نہایت خوبی اور سادگی سے برتا ہے۔

یا بہ بندد، یا کشاید، یا ستاند یا دہد　　تا جہاں باشد ہمے مر شاہ را این یادگار

آنچہ بستاند ولایت، آنچہ بدہد خواستہ　　آنچہ بندد دست دشمن، آنچہ بکشاید حصار

مبالغہ، اس میں بھی عنصری نے کچھ کمی نہیں کی، لیکن اس وقت تک، تکلف اور بناوٹ کو اس قدر ترقی نہیں ہوئی تھی، اس لئے متاخرین کے مقابلہ میں اس کے مبالغے پھیکے معلوم ہوتے ہیں مثلاً وہ گھوڑے کی تعریف میں کہتا ہے۔

شگفت آید از مرکب تو خرد را　　کش از باد طبع ست و از خاک منظر

بہ گام پسین بر رود گر برانے　　بہ تقریبش از باختر تا بہ خاور

بہ جستن کند کم زور یا بہ دریا　　نہ منزل کند کم، ز کشور بہ کشور

مضمون آفرینی

بہ نور و ظلمت ماند، زمین و ابر ہمے　　بہ دُرّ و مینا ماند سرشک ابر و گیا

فریفتہ است زمین ابر تیرہ را کہ ازو　　ہمے ستاند دُرّ و ہمے دہد مینا

یعنی زمین اور بادل نور و ظلمت کے مشابہ ہیں، اور قطرۂ باراں اور گھاس، گویا موتی اور سبز شیشے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ بادل زمین کے قریب ہیں آ گئے ہیں، کیونکہ زمین سبز شیشہ دے کر اس کے عوض بادلوں سے موتی لیتی ہے۔

گھاس ۱۲　قطرہ باراں ۱۲

ہمانا کہ خورشید رنگ، رخش را　　بدزدد کہ بخشد بہ یاقوت احمر

عام خیال یہ ہے کہ آفتاب، جب کسی پتھر پر چالیس برس تک متصل طلوع ہوتا رہتا ہے تو وہ یاقوت بن جاتا ہے، عنصری کہتا ہے، کہ آفتاب در اصل معشوق کے چہرے کا رنگ، چراتا ہے، اور یاقوت کو پناہ دے دیتا ہے۔

گھوڑے کی تعریف

زمان گزشتہ است کش در نیابی　　چو بگزشت از پیش چشم تو دیگر

بہ رجعت بہ آں گونہ باشد کہ گوئی　　ہمے باز گردد زمانہ مکرر

یعنی جب یہ گھوڑا سامنے سے نکل جاتا ہے تو گویا گزرا ہوا زمانہ ہے جس کو تم پا نہیں سکتے، اور جب چکّر لگا کر آجاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ نے پلٹا لیا۔

فرّخی

علیؔ نام، ابوالحسن کنیت، فرّخی تخلص، سیستانؔ وطن، باپ کا نام قلوعؔ تھا، جو امیر خلفؔ بن احمد حاکم سیستان کے دربار میں ملازم تھا، بچپن میں ادب اور موسیقی کی تعلیم پائی، چنانچہ چنگ بجانے میں کمال پیدا کیا، معاش کی یہ صورت تھی کہ ایک زمیندار کی ملازمت کرتا تھا جس کے معاوضہ میں سالانہ دو سو کیل غلّہ اور سو درہم مقرر تھے، یہ مختصر سی آمدنی اس کی سادہ زندگی کے لئے کافی تھی، لیکن چند روز کے بعد اُس نے **امیر خلف** کی ایک لونڈی سے شادی کی جس کی وجہ سے خرچ بڑھ گیا، آقا سے تحریری درخواست کی کہ تنخواہ میں ٥٠ درم کا اضافہ کر دے، اور غلّہ کی مقدار دو سو کیل کی بجائے تین سو کر دی جائے، آقا نے عرضی کی پشت پر لکھ دیا کہ اس قدر حاضر ہے اور اس سے زیادہ کا مجھ کو مقدور نہیں۔

فرّخی کو شعر و شاعری کا بچپن سے ذوق تھا اور اب اس نے اس فن میں کافی ترقی کر لی تھی، شاعری کی قدردانی کے قصّے ہر جگہ مشہور تھے اس لئے اس کو خیال ہوا کہ اس ذریعہ سے یہ مشکل حل ہو گئی۔ چنانچہ لوگوں سے پوچھتا رہتا تھا کہ اس فن کا کون بڑا قدردان ہے۔

ابوالمظفر چغانی، اس زمانہ میں سلطان محمود کی طرف سے بلخ کا گورنر تھا، اور نہایت فیاض طبع اور قدردانِ سخن تھا، فرّخی اس کی فیاضی اور قدردانی کا شہرہ سُن کر چغان میں آیا، چنانچہ ایک قصیدہ کی ابتدا اس واقعہ سے کی ہے۔

باکاروانِ حلّہ برفتم زسیستان   باحُلّہ تنیدہ زدل، بافتہ زجان

ابوالمظفر کو گھوڑوں سے بہت شوق تھا، اور بڑے اہتمام سے ان کی پرداخت و تربیت کرتا تھا، اٹھارہ ہزار گھوڑیاں اور بچھیرے ہمیشہ چراگاہ میں رہتے تھے۔ سال میں ایک دفعہ ان بچھیروں کا جائزہ لیتا تھا اور اُن کو داغ کرتا تھا، فرخی جب بلخ پہنچا تو معلوم ہوا کہ ابوالمظفر داغ گاہ میں گیا ہے، لیکن خوش قسمی سے عمید اسعد جو ابوالمظفر کا مختارِ کل تھا، موجود تھا، فرخی اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ شاعر ہوں، عمید نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو فرخی کے چہرہ مہرہ ہیئت، وضع قطع، کسی چیز کو شاعری سے مناسبت نہ تھی، بھدّا ڈیل ڈول، ڈھیلا ڈھالا کرتہ، جس کے دونوں طرف چاک، سر پر بڑا سا پگّڑ، سخت متعجب ہوا، تاہم حسنِ اخلاق کے لحاظ سے کہا کہ مَیں تم کو امیر کے دربار میں لے چلوں گا، لیکن پہلے داغ گاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھ لاؤ، اس کے ساتھ، داغ گاہ کی صورت کا نقشہ کھینچ کر دکھایا کہ کوسوں تک سبزہ زار ہوتا ہے، جابجا چشمے بہتے ہیں، بے تکلّف احباب مل بیٹھتے ہیں، گاتے بجاتے ہیں، شراب پیتے جاتے ہیں، بادشاہ ایک ہاتھ میں پیالہ دوسرے میں کمند لے کر بیٹھتا ہے، شراب پیتا جاتا ہے، اور لوگوں کو گھوڑے انعام دیتا جاتا ہے۔

فرخی نے رات بھر میں قصیدہ طیار کر کے صبح کو عمید کے سامنے پڑھا۔

چوں پرند نیلگوں، بر روے پوشد مرغزار   پرنیانِ ہفت رنگ، اندر سر آرد کوہسار
خاک راچوں نافِ آہو مشک زاید بیقیاس   بید راچوں پرِّ طوطی برگ روید بے شمار
دوش وقتِ نیم شب بوے بہار آورد باد   حبّذا باد شمال و فرّخا بوے بہار
باد گوئی مشک سودہ دارد اندر آستین   باغ گوئی لعبتانِ جلوہ دارد در کنار
نسترن لولوے بیضا دارد اندر مرسلہ   ارغواں لعلِ بدخشاں دارد اندر گوشوار

باغ بوقلموں لباس و شاخ بوقلموں نمائے ... آب مروارید گوں، و ابر مروارید بار
داغگاہ شہریار اکنوں چناں خرّم شود ... کاندرو از خرّمی خیرہ بماند روزگار
سبزہ اندر سبزہ بینی۔ چوں سپہر اندر سپہر ... خیمہ اندر خیمہ بینی۔ چوں حصار اندر حصار
ہر کجا خیمہ است، خفتہ عاشقے با دوست مست، ... ہر کجا سبزہ است، شاداں یارے از دیدارِ یار
سبزہا بہ بانگ چنگ مطرباں چرب دست ... خیمہا بر بانگ نوش ساقیان مے گسار
عاشقاں بوس و کنار، و نیکواں ناز و عتاب ... مطرباں رود و سرود و خفتگاں خواب و خمار
بر درِ پردہ سرائے خسروِ پیروز بخت ... از پئے داغ آتشے افروختہ خورشید وار
داغہا چوں شاخہائے بسدّ یاقوت رنگ ... ہر یکے چوں ناردانہ گشتہ اندر زیر نار
ریدکان خواب نادیدہ مصاف اندر مصاف ... مرکبانِ داغ ناکردہ قطار اندر قطار
روئے ہاموں، سبزہ چوں گردون ناپیدا کراں ... روئے صحرا، سادہ چوں دریائے ناپیدا کنار
اندراں دریا سماری، واں سماری جانور ... اندریں گردوں ستارہ، واں ستارہ بیمدار
خسروِ فرخ سیر، بر بارہ، دریا گزر ... با کمند اندر میانِ دشت چوں اسفندیار
گردنِ ہر مرکبے چوں گردنِ قمری بہ طوق ... از کمند شہریارِ شہرگیرِ شہروار
ہر کرا اندر کمند شصت بازی، در فگند ... گشت نامش بر سُرین و شانہ درویش نگار
روز یک نیمہ، کمند و مرکبان تیز تگ ... نیم دیگر مطربان و بادۂ نوشیں گوار

عمید نے فرخی کو ساتھ لیا، اور ابوالمظفر کے پاس جا کر اس ترکیب سے پیش کیا کہ دقیقی کے بعد، آج تک اس پایہ کا شاعر نہیں پیدا ہوا۔ یہ کہہ کر سارا واقعہ بیان کیا۔ ابوالمظفر نے فرخی کو دربار میں مناسب موقع پر جگہ دی، شراب کا دور چل رہا تھا۔ دو تین دور ہو چکے تو فرخی اُٹھا اور درد آمیز لہجہ میں یہ قصیدہ پڑھا
ع با کاروان حلّہ برفتم ز سیستان۔ ابوالمظفر خود شاعر تھا، حد سے زیادہ مسرور ہوا، اور فرخی سے کہا کہ ہزار کمیت بچھیرے سامنے ہیں جس قدر تم سے پکڑے جا سکیں

سب تمہارے ہیں، فرخی شراب سے بدمست تھا، فوراً اٹھا دستار سر سے پھینک بچھیروں کی قطار میں گھس گیا، وہ بھاگ کر اِدھر اُدھر پھیل گئے، فرخی، ہر طرف پیچھے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا، تھک کر چور ہو گیا، اور وہیں زمین پر پڑ کر سو رہا، صبح کو دن چڑھے اُٹھا، ابوالمظفر نے صبح کی نماز سے فارغ ہو کر، فرخی کو دربار میں طلب کیا، اور اسپ خاصہ، ایک خیمہ، تین شتر، پانچ غلام، اور پہننے کے کپڑے انعام دیئے، دریافت سے معلوم ہوا کہ فرخی نے جس گلہ پر ہاتھ ڈالا تھا، اس میں بیالیس[۴۲] بچھیرے تھے، ابوالمظفر نے وہ بھی انعام میں دیدیئے۔ چند روز کے بعد فرخی بڑے سر و سامان سے **سلطان محمود** کے دربار میں پہنچا، سلطان نے نہایت قدردانی کی اور شعرائے خاص میں داخل کیا[۱]، ایک موقع پر اسپ خاصہ عنایت کیا تو فرخی نے یہ اشعار شکرگزاری میں لکھے۔

اسپے کہ چناں شاہ دہد اسپ نباشد | تا جے بود آراستہ از لولوے شہوار
دشمن کہ بریں ابلق رہوار مرا دید | بے صبر شد و کرد غم خویشش پدیدار

اس وقت باوجود تقرب اور منصب ندامت کے **فرخی** کو دربار میں کمربند باندھنے کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ یہ لباس امرائے فوج کے ساتھ مخصوص تھا، فرخی نے نہایت خوبی سے اس قصیدہ میں اس عہدہ کی آرزو کی ہے،

گفتا کہ بہ میراں و بہ سرہنگان مانی | امروز کلاہ و کمرت باید ناچار
گفتم کہ چہ دانی کہ شب تیرہ چہ زاید | بشکیب و صبوری کن تا شب بہ نہد بار
من تنگدلی پیشہ نگیرم کہ بزرگاں | کس را بہ بزرگی نرسانند بیک بار

یعنی دشمن نے مجھ سے کہا کہ اب تو تمہارا ٹھاٹھ امراء کا سا ہے، اب کمربند

---

[۱] یہ تمام واقعہ اگرچہ تمام تذکروں میں منقول ہے لیکن سب سے زیادہ تفصیل چار مقالہ میں ہے، اور میں نے گویا اسی کا لفظی ترجمہ کیا ہے۔

وکلاہ بھی ملنا چاہیئے، میں نے کہا تجھ کو کیا خبر ہے کہ کل کیا ہوگا؟ جس نے مجھ کو اسپ خاصہ کے قابل سمجھا، وہ اس کا مستحق بھی سمجھے گا، میں دل گرفتہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ سلاطین کا یہ دستور نہیں کہ کسی کو ایک دم سے بڑے رتبہ پر پہنچادیں، بالآخر فرخی کی دولت و جاہ کی یہ نوبت پہنچی کہ جب اس کی سواری نکلتی تھی تو بیس زرّیں کمر غلام رکاب میں چلتے تھے۔

ایّاز جو سلطان محمود کا محبوب خاص تھا، فرخی کا نہایت قدردان تھا اور اس سے نہایت خلوص رکھتا تھا۔ ربط زیادہ بڑھا تو محمود کو رشک ہوا یہاں تک کہ فرخی کا دربار بند کر دیا۔ فرخی نے متعدد قصیدے معذرت میں لکھے۔ بالآخر سلطان صاف ہوگیا، اور فرخی بدستور دربار میں آنے جانے لگا۔[1]

اس زمانہ کے تمدن اور معاشرت پر تعجب ہوتا ہے کہ شعراء محمود کی مدح میں جو قصیدے لکھتے تھے، اس میں علانیہ ایّاز کے حسن و معشوقی کا ذکر کرتے تھے، اور محمود اس سے خوش ہوتا تھا، فرخی ایک قصیدہ میں لکھتا ہے۔

امیر جنگجو ایّاز اویماق — دل و بازوے خسرو روز پیکار
زنانِ پارسا از شوق گردند — بہ کابین کردنی او را خریدار
نہ برخیرہ بدو دل داد محمود — دل محمود را بازی مپندار
جز او در پیش سلطاں نیز کس بود — جز او سلطاں غلاماں داشت بسیار
اگر چوں تیر یک تن بود آنجا — نہ چندیں بد سراء را گرم بازار

غضاری نے محمود کی فرمایش سے ایاز کی تعریف میں دو شعر لکھ کر پیش کئے تو محمود نے دو ہزار اشرفیاں انعام میں دلوائیں چنانچہ غضاری ایک قصیدہ میں کہتا ہے۔

---

[1] مجمع الفصحاء

مرا دو بیت بفرمود شہریار جہاں — براں صنوبر عنبر عذار مشکیں خال
دو بدرہ زر بفرستاد و دو ہزار درم — برغمِ حاسدِ تیمار بد سگال نکال

فرخی نے صنائع وبدائع شعری میں ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام ترجمان البلاغۃ ہے رشید الدین وطواط نے حدائق السحر میں اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "لغو کتاب ہے"، بظاہر تعجب ہوتا ہے کہ ایران کے شعراء ابتدا ہی سے صنائع وبدائع کی طرف کیونکر مائل ہوئے، لیکن حقیقت میں یہ تعجب کی بات نہیں، شاعری کا جو نمونہ فارسی شعراء کے پیش نظر تھا وہ عربی شاعری تھی، عرب میں خود اس زمانہ میں صنائع وبدائع کی بدعت ایجاد ہو چکی تھی اور عبداللہ بن معتز کی کتاب البدیع جو اس فن کی پہلی کتاب تھی گھر گھر پھیلی ہوئی تھی، تاہم فرخی کی سلامت روی دیکھو کہ اُس نے صنائع وبدائع پر کتاب لکھی، لیکن خود ان تکلفات سے آزاد ہے، فرخی نے ۴۲۹ھ میں وفات پائی۔

کلام پر رائے | فرخی کے کلام کا عام جوہر زبان کی صفائی، اور سلاست وروانی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس ابتدائی زمانہ میں اُس نے زبان کو اس قدر صاف کر دیا کہ ہزار برس گزر چکے لیکن آج کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ قاآنی کا بڑا اعجاز یہی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ قصائد میں ہر قسم کے واقعات اس طرح بے تکلف ادا کرتا جاتا ہے گویا دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہیں، فرخی سے اس کا موازنہ کرو، صاف نظر آئے گا جو بات قاآنی کو ہزار برس کے بعد حاصل ہوئی، فرخی کو اس وقت حاصل تھی، رمضان اور عید کے ذکر میں قاآنی کا ایک مشہور قصیدہ ہے۔

دلکا! ہیچ خبر داری کان ترک پسر — با من از ناز دگر بار چہ آورد بسر
بلب نوشیں آمد شب دوشیں بسرائے — حلقہ بدر زد و برجستم و بکشودم در
گفت قاآنیکا! تاکے خُسپی بسرائے — خیز کز روزہ شد اضلاع زبر و زبر

غالباً مست چناں خفتۂ اندر رمضان
کز مہ روزہ و از روزہ ترا نیست خبر

گفتم اے تُرکِ دلارام مگر باز آمد
رمضاں آں مہ شاہد کُش و زاہد پرور

گفتم آرے رمضان آمد و گوید کہ بہ خلق
رقمم از بار خدا دارم و از پیغمبر

وقت آں آمد۔ کاں واعظک از بعد نماز
ہمچو بوزینہ بہ یکبار جہد از منبر

اسی بحر و قافیہ میں فرخی کا قصیدہ دیکھو،

رمضان رفت، درہے دور گرفت اندر بر
خنک آں کس رمضان را بہ سزا بُرد بسر

بس گرامی بود ایں ماہ ولیکن چہ کنم
رفتنی رفتہ بہ، ور دے نہادہ بہ سفر

رمضان گر بشد از راہ فراز آمد عید
عید فرخندہ ز ماہ رمضان نیکوتر

گاہ آں آمد کز شادی پر گردد دل
وقت آں آمد کز بادہ گراں گردد سر

بادہ روشن و آسودہ و صافی چو گلاب
ساقی دلبر و شائستہ و شیریں چو شکر

مطربا! آں غزل نغز دلاویز بیار
ورنہ دانی بشنو تا غزلے گویم تر

اے دریغا دل من کاں صنم سیمیں بر
دل من بُرد و مرا از دل او نیست خبر

او ولے داشت گرامی و دلِ دیگر یافت
کاشکے من و لکے یافتمے نیز دگر

اسی بحر اور قافیہ میں اس کا ایک اور قصیدہ ہے، جو سراپا محاورہ اور روزمرّہ ہے۔

ترک بُت روے من، از خواب گراں دارد سر
میرا پری چہرہ معشوق نیند سے سرگراں ہے

دوش مے دادہ است از اول شب تا بسحر
کل شام سے صبح تک شراب پلاتا رہا ہے

من بچشم او را دو بار نمودم کہ بخسپ
میں نے دو دفعہ آنکھ سے اشارہ کیا کہ سو رہو

او ہمے گفت بسر تا برم ایں دور بسر
لیکن وہ یہی کہتا رہا کہ یہ دور تو ختم ہو لے

شب بسر برد بہ مے دادن و ننشست و نخفت
ساری رات شراب پلانے میں گزاری، نہ بیٹھا نہ سویا

دل من جُست کہ ننشست و نخفت آں دلبر
یہ میری خاطرداری تھی کہ سویا نہیں اور کھڑا رہا

حیلہ سازد کہ مے افزوں خورد از نوبتِ خویش | در تواند بخورد نوبت یاران دگر
چالاکی کر کے چاہتا ہے کہ اپنے حصہ سے زیادہ پی لے | اور اُس کے امکان میں ہو تو اوروں کا حصہ بھی اُڑا لے
کیست آں کو؟ نہ ہد دل بچنیں خدمت دوست | کیست آں کو؟ نہ کشد بار چنیں خدمت گر

مدح کے تشبیب میں فتوحات کا ذکر آتا ہے۔

خسروِ ما بہ شکار ملکاں تاختہ بود | ما ز اندیشۂ او خستہ دل و خستہ جگر
خسرو از راہ دراز آمد با نہمت و کام | ملک از جنگ عراق آمد با فتح و ظفر
قلعہ ہا کندہ و بنشاندہ بہر شہر سپاہ | جنگہا کردہ و بنمودہ بہر جائے ہنر
اے پسر! اگر دلِ من کرد ہمے خواہی شاد | دیگر از پس بادہ بمن بوسہ ہمے باید داد
نقل یا بوسہ بود، بادہ دہی نقل بدہ | دیر گاہ است کہ ایں رسم نہاد آں کہ نہاد
گرہمے گوئی بوس از دگرے نیز بخواہ | تو مرا از دگراں پردہ اے حور نژاد

یہ بھی فرخی کے خصوصیات میں سے ہے کہ جب کسی چیز کی تعریف یا کسی واقعہ کی حالت اور کیفیت بیان کرتا ہے تو اُس کا اصلی سماں آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے، ایک قصیدہ میں مجلس عیش کی خیالی تصویر کھینچی ہے۔

سرو ساقی و ماہِ رود نواز (باجا) | پردہ بستہ در رہ شہناز (یعنی "شہناز" ایک راگنی کا نام ہے)
زخمہ رود زن نہ پست و نہ تیز (یعنی مضراب نہ بہت اونچے نہ بہت نیچے) | زلف ساقی نہ کوتہ و نہ دراز
مجلسے خوب خسروانی دار (بادشاہانہ) | از سخن چیں، تہی و از غمّاز
بوستانے زلالہ و سوسن | ہمچو روئے تدرود سینۂ باز
دوستان مساعد و یک دل | کہ تواں گفت پیش ایشاں راز
ماہ روئے نشاند اندر پیش | خوش زبان و موافق و دمساز
جعد او بر پرند گشتی گیر (جعد: زلف؛ پرند: یعنی چہرہ) | زلفِ او بر حریر چوگاں باز

بادہ چوں گلاب روشن و تلخ — ماندہ در خُم ز گاہِ آدم باز
از چنیں مجلس و چنیں بادہ — ہیچ زاہد مرا ندارد باز

سلطان محمود نے ایک باغ بڑے سروسامان سے تیار کرایا تھا، گلہائے رنگ رنگ کے تختہ زار، جا بجا جدولیں، دو طرفہ سرو شمشاد، ایک طرف مصنوعی خوشنما جھیل اُس میں رنگ برنگ کی مچھلیاں کانوں میں موتی کے آویزے پہنے تیرتی پھرتی تھیں، تصویر خانہ میں محمود کی مجسم تصویریں، کہیں برچھا ہاتھ میں لئے ہوئے شکار کھیل رہا ہے، کہیں بزم عیش میں بیٹھا ہے اور شراب کا دَور چل رہا ہے۔ فرخی اس باغ کا نقشہ دکھاتا ہے۔

بہ فرخندہ فال و بہ فرخندہ اختر — زنو باغ میخواست شاہِ مظفر
درو مسکنِ ماہرویانِ مجلس — درو خانۂ شیر گیرانِ لشکر
کُجا جائے بزم است گلہائے بیحد — کجا جائے صید است مرغانِ بیمر
رواں گردِ بر گردِ رعنا درختاں — تدروان، آموختہ مادہ و نر
یکے کاخ شاہانہ اندر میانش — سر کنگرہ بر کنار دو پیکر
بہ کاخ اندروں صُفّہائے مصفّا — درِ صُفّہا ساختہ سوئے منظر
یکے ہمچو دیبائے چینی منقّش — یکے ہمچو ارژنگ مانی مصوّر
نگاریدہ در چند جا مر مصوّر — شہ شرق را اندراں کاخ پیکر
بہ یکجائے در صید، در دست ژوبین — بہ یک جائے در بزم بر دست ساغر
ازاں کاخ فرخ چو اندر گزشتی — یکے رود، آب اندرو ہمچو شکر
نہ چرخ است و اجزائے او چوں ستارہ — نہ ابر است و آوائے او ہمچو تندر
اگر بگذرد بر سرش مرغ موحش — بیالاید اندر ہوا مرغ را پر
بدنیساں بہ باغ اندراں تند رودنے — یکے ژرف دریا مر آں را برابر

بدو اندراں ماہیاں چوں عروساں ۔۔۔ بگوش اندروں پُر گہر حلقۂ زر

مکانے بر آوردہ پہلوے دریا ۔۔۔ بداں تا براں مے خورد شاہ صفدر

یمینِ دول شاہ محمود غازی ۔۔۔ امینِ ملل خسروِ بندہ پرور

ابوالمظفر چغانی کے دربار میں جب اس نے جانا چاہا ہے تو راہ میں بہت صعوبتیں پیش آئیں، قصیدہ میں تمام حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں، اور دیکھو مدح کی تمہید کا پہلو کس خوبصورتی سے پیدا کیا ہے۔

رہے صعب، و شبے تاریک (و) تیرہ ۔۔۔ ہوا چوں قیر و زد ہاموں مُقیّر

ہو اندودہ رخسارہ بدر دہ ۔۔۔ سپہر آراستہ چہرہ بہ گوہر

گماں بُردی کہ باد اندر پراگند ۔۔۔ بروے سبز دریا برگ عبہر

(کہکشاں) مجرّہ چوں بدریا راہ موسےٰ ۔۔۔ (یعنی آسمان) کہ اندر قعرِ او (یعنی ستارے) بگزشت لشکر

زمانے رفت و سر برزد مہ از کوہ (رودِ نیل) ۔۔۔ برنگ روے حجیران مزعفر

بہ ریگ اندر ہمے شد بادہ نازاں ۔۔۔ چو در غرقاب مردِ آشنا (تیراک) در

شکم مالاں (گھونگا) بہ ہاموں درہمے رفت ۔۔۔ سشدہ ہاموں بزیرِ آں مقعّر

دمندہ اژدہاے پیشم آمد ۔۔۔ خروشاں و لبے آرام (ساحل) و زیں در

گرفتہ دامن خاور (یعنی دریا) بدنبال ۔۔۔ نہادہ برکرانِ باختر (پچھم) سر

بہ بارانِ بہاراں (مشرق) گشتہ فربہ ۔۔۔ بگرما ے حزیراں گشتہ لاغر

مدیح شاہ بر جیحوں بخواندم ۔۔۔ بر آمد بانگ (صبغۃ کا ہم) از آب اللہ اکبر

کہ من شاگرد کفِّ را دادیم ۔۔۔ کہ تو مدحش ہمے بر خوانی از بر

بفرِ شاہ (فیاض) از جیحوں گزشتم ۔۔۔ یکے موے از تنِ من ناشدہ تر

وزاں جا تا بدیں درگاہ گفتی ۔۔۔ کشادستند مرفردوس را در

---

[1] بے کبھی ظاہر نہیں ہوتی۔ اور یہ قدما کی زبان ہے۔

ہمہ بالا (بلند) پُر از دیبائے رومی — ہمہ پستی پُر از کالائے شُشتر (نام شہر ۱۲)

تو گفتی ہیکل زردست گشتہ است — زبس لالہ ہمہ صحرا سراسر

فرخی نے واقعہ نگاری کو بہت ترقی دی، اس سے پہلے بھی یہ صنعت موجود تھی لیکن سینکڑوں گوناگوں واقعات کو نہایت بے تکلفی اور برجستگی سے ادا کرکے اس نے واقعہ نگاری کی ایک شاہراہ قائم کردی، اور آیندہ نسلوں کے لئے راستہ صاف کردیا، اکثر قصیدوں میں فتوحات کے حالات لکھتا ہے اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک مورخ بے کم و کاست ٹھیک ٹھیک حالات لکھتا جاتا ہے۔ **سومنات** کی فتح میں جو قصیدہ لکھا ہے، اس میں ایک ایک مقام کا نام اور اُس کا حال بیان کیا ہے۔

گمان کہ برد؟ کہ ہرگز کسے زراہ طراز — بہ سومنات برد لشکرے چنیں لشکر

یہ کس کو خیال تھا کہ کوئی شخص طراز کی راہ سے — سومنات پر فوج لیجا سکتا ہے اور فوج بھی ایسی فوج

ہوائے آں دژم و باد آں چو دود جحیم — زمین آں سیہ و خاک آں چو خاکستر

راستے میں ہوا ایسی خراب جیسے دوزخ کا دھواں — زمین بالکل سیاہ اور خاک جیسے راکھ

ہمہ درخت، و میانِ درخت خارکش — نہ خار بلکہ سنان خلندہ و خنجر

تمام جھاڑیاں اور جھاڑیوں کے کانٹے — کانٹے نہیں بلکہ چبھنے والی برچھیاں اور خنجر

نہ مرد را سرآں کاندراں نہادے پے — نہ مرغ را دلِ آں و ازاں کشادے پر

نہ آدمی کو یہ جُرأت ہوتی تھی کہ قدم رکھے — نہ پرند کو یہ ہمت ہوتی تھی کہ اُڑ سکے

عجب تر اینکہ ملک را ہمے چنیں گفتند — کہ اندریں رہ مار دو سر بود بیمر

سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ کہ لوگوں نے بادشاہ سے کہا تھا — کہ اس راہ میں دو مونہے سانپ بے شمار ہیں

بہ شب چو خفتہ بود مرد سر برآرد مار — ہمے کشد نفس خفتہ تا برآید خور

آدمی جب رات کو سو جاتا ہے تو یہ سانپ نکلتے ہیں — اور دُھوپ نکلنے تک پھنکار مارتے ہیں

چو خور بر آمد و گرمی بہ مردِ خفتہ رسد
جب آفتاب نکل آتا ہے اور آدمی کے بدن کو گرمی پہنچتی ہے

سبک نہ گردد ازاں خواب تاگہ محشر
تو آدمی ٹھنڈا ہو کر رہ جاتا ہے اور قیامت تک اُٹھ نہیں سکتا

بدیں درشتی و زشتی رہے کہ کردم یاد
ایسے سخت اور خراب راستہ سے جس کا میں نے بیان کیا

گزشت شاہ بتوفیق خالق اکبر
بادشاہ خدا کی توفیق سے گزر گیا

بنہ و بہر پس ماندگاں و گم شدگاں
پیچھے رہ جانے والوں کے لئے

میان بادیہ ہا حوضہا ے چوں کوثر
جنگل میں حوض تیار کرا دیئے تھے

بداں رہ اندر چندیں حصار و شہر بزرگ
سینکڑوں قلعے اور شہر جو راہ میں پڑے

خراب کرد، و بکند اصل ہر یک ادبن و بر
برباد کر دیئے اور ان کی جڑ کھود کے پھینک دی

نخست لاردہ کز روے برج و بارۂ او
پہلا قلعہ لاردہ تھا، جس کے برج اور دیوار سے

چو کوہ کوہ فرو ریخت آہن و مرمر
پہاڑوں کے برابر لوہا اور پتھر برستا تھا

چہ مندھیر کہ در مندھیر حوضے بود
اور مندھیر کا کیا کہنا، جس میں ایک ایسا حوض تھا

چنانکہ خیرہ شدے اندرو دو چشم فکر
جس کو دیکھ کر عقل کی آنکھوں کو چکا چوند لگ جاتی تھی

فراخ پہنا حوضے بہ صد ہزار عمل
نہایت چوڑا حوض جس میں ہزاروں کاریگریاں کام میں آئیں

ہزار بتکدۂ خرد کرد حوض اندر
ایک ہزار چھوٹے چھوٹے بتخانے اُس کے اندر تھے

یکے حصار قوی بر کرانِ شہر و درو
شہر کے کنارے پر ایک قلعہ تھا،

ز بت پرستاں گرد آمدہ یکے محشر
جس میں بت پرست ٹھٹ کے ٹھٹ اکٹھے تھے

فریضہ ہر روز آں سنگ را بشستندے
اُس بت کو لازمی طور پر ہر روز

بہ آب گنگ و بہ شیر و بز عفران و شکر
گنگ کے پانی اور دودھ اور زعفران اور شکر سے دھوتے تھے

شکار میں قمرغہ کا طریقہ ایک مدت سے چلا آتا ہے، یعنی کسی بڑے جنگل میں جہاں کثرت سے شکاری جانور ہوتے تھے، چاروں طرف آدمیوں کی صفوں کو پھیلا کر ایک بڑا حلقہ قائم کر لیتے تھے، پھر حلقہ کو بتدریج چھوٹا کرتے جاتے تھے

یہاں تک کہ دو چار میل کی وسعت رہ جاتی تھی، اور تمام جانور سمٹ کر اتنے ہی دور میں آجاتے تھے۔ پھر ہر طرف سے اس پر حملے ہوتے تھے، اکثر مارے جاتے، بہت سے زندہ بھی گرفتار ہوتے، سلطان محمود بھی اس طریقے سے اکثر شکار کھیلا کرتا تھا، فرخی نے ایک قصیدہ میں اس کاسماں دکھایا ہے۔

اے زجنگ آمدہ و روے نہادہ بہ شکار ـــ تیغ و تیر تو ہمے سیر نگردیدہ زکار
ہرچہ در ایران پرندہ، دو دوامی بود ـــ ہمہ را گرد بہم کردۂ دریک دیوار
گرد ایشاں پرہ برلبستی مانند عقاب (زلف ۱۲) ـــ زاں بروں رفت ندانست، یاک ازہیچ کنار (زمین ۱۲)
در دو بدند سوے تو بہ قطار از سر کوہ ـــ بازگستردے در دامن کہ شاں بہ قطار
بامداداں ہمہ کہسار پُر از وحشی بود ـــ شامگاہاں ہمہ پرداختہ (خالی ۱۲) بود از کہسار
در زمانے، ہمہ آں دشت زخونِ دد و دام ـــ لعل کردے چو گلستانے ہنگامِ بہار
خواہی من کہ بجا یستے (زندہ ہونا) بہرام امروز ـــ تابدیدے و بیاموختے از شاہ شکار

واقعہ نگاری کا انداز فرخی پر اس قدر غالب ہے کہ قصاید کی تشبیب میں جو دراصل غزل ہوتی ہے، یہ انداز قائم رہتا ہے۔ مثلاً ایک قصیدہ کی تشبیب میں لکھتا ہے۔

دوش متوار (چھپ کر) یک بہ وقت سحر ـــ اندر آمد بہ خیمہ آں دلبر
چنگ در بر گرفت و خوش بنواخت ـــ واز دو بُسّد (یاقوت) فرو فشاند شکر
پنج شش جام خورد و پر گل گشت ـــ روے آں روے نیکواں یکسر (افسر ۱۲) (خوبصورت ۱۲)
مست گشت و از بہرِ خفتن ساخت ـــ خویشتن را کنار من بستر
زلف مشکیں بروے در پوشید ـــ دستِ من زیر کرد، و زلف زبر
زلف اورا بدست بگرفتم ـــ زِنخ گرداُد بہ دستت دگر
راست گفتی، اگر فتہ بُد چاکر ـــ گوی و چوگاں شہ بدستت اندر

دیکھو تشبیب سے مدح کی تمہید کس خوبی سے پیدا کی ہے۔

فرخی سے پہلے مرثیہ کے اشعار بہت کم پائے جاتے ہیں، اور جس قدر ہیں معمولی درجہ کے ہیں، لیکن فرخی نے سلطان محمود کا جو مرثیہ لکھا، وہ نہ صرف پُر درد اور پُر تاثیر ہے بلکہ اس فن کے تمام اصول اور آئین اس سے قائم ہو سکتے ہیں،

مرثیہ گوئی کے بڑے اصول تین ہیں۔

۱۔ ممدوح کی عظمت و شان کا ذکر کیا جائے تاکہ اُس سے عبرت کا سبق حاصل ہو کہ اس پایہ کا شخص اُٹھ گیا۔

۲۔ اس کے مرنے سے ملک میں جو رنج و ماتم برپا ہے، اس کا ذکر کیا جائے۔

۳۔ اُس کو مخاطب کر کے ایسے خیالات ظاہر کئے جائیں جس سے یہ ثابت ہو کہ انتہاے وارفتگی اور مدہوشی کی وجہ سے مرثیہ کہنے والے کو اُس کے مرنے کی بھی خبر نہیں، اور وہ اب تک اُس کو اسی طرح مخاطب کر کے باتیں کرتا ہے جس طرح زندگی میں کرتا تھا۔

فرخی کے مرثیہ میں یہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں، اس کے ساتھ الفاظ بندش اور طرزِ ادا اس قدر موثر ہے کہ پتھر کا دل بھی پانی ہو جاتا ہے۔

شہر غزنین نہ ہمان است کہ من دیدم پار
غزنین، اب وہ نہیں ہے جو میں نے پار سال دیکھا تھا

چہ فتاد ست کہ امسال دگرگوں شد کار
اس سال کیا پیش آیا کہ وہ حالت بالکل بدل گئی

کو یہا بینم پر شورش و تا سر تا سر کوے
دیکھتا ہوں کہ تمام گلیوں میں شور برپا ہے اور ایسے سرے سے اس سرے تک

ہمہ پُر جوشن و جوشن درہ و پُر خیل و سوار
جوشن پوش گھوڑوں اور سواروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ ہیں،

مہتراں بینم بر روے زناں ہمچو زناں

چشمہا کمدہ ز خون نابہ برنگ گلنار

بڑے بڑے سردار عورتوں کی طرح مُنہ پیٹ رہے ہیں
اور ان کی آنکھیں خون سے رنگین ہو گئی ہیں

ملک امسال دگر باز نیامد ز غزا
دشمنے روے نہادست دریں شہر و دیار

شاید اس سال بادشاہ جہاد سے واپس نہیں آیا
اس وجہ سے ملک میں کوئی دشمن آ پہنچا ہے

سیر مے خوردہ نگردی کہ بخفتہ ست امروز
دیر تا خاستہ مگر رنج رسیدش ز خمار

غالباً رات بہت شراب پی گیا اس لئے اب تک سو رہا تھا
چونکہ خمار کی تکلیف ہے اس لئے آج دیر میں اُٹھے گا

خیز شاہا! کہ رسولان شہاں آمدہ اند
ہدیہا دارند آوردہ فراداں و نثار

اے بادشاہ اُٹھ! بادشاہوں کے قاصد آتے ہیں
جو کثرت سے ہر قسم کے ہدیے اور تحفے لاتے ہیں

کہ تواند؟ کہ برانگیزد ازیں خواب ترا
خفتنی خفتنی۔ کز خواب نگردی بیدار

کس کی طاقت ہے کہ تجھ کو اس نیند سے جگا سکے
تو ایسی نیند سویا کہ اب پھر نہ جاگے گا

خفتنِ بسیار اے خواجہ خوے تو نبود
ہیچ کس خفتہ ندیدہ است ترا زیں کردار

اے آقا! دیر تک سونا تو تیری عادت نہ تھی
کسی نے اس طرح تجھ کو سوتے نہیں دیکھا تھا

یکدمک بارے در خانہ بالیست نشست
تا بدیدندے روئے تو عزیزاں و تبار

ذرا دیر تو تجھ کو دربار میں آکر بیٹھنا چاہیئے تھا
کہ عزیز اور قریب تیرا چہرہ دیکھ لیتے

بہ حصار از فزع و بیم تو رفتند شہاں
تو شہا از فزع و بیم کہ رفتی بہ حصار؟

تیرے ڈر سے تو تمام سلاطین قلعوں میں بھاگ کر چھپ گئے
تو کس کے ڈر سے قلعہ میں بھاگ کر چھپتا ہے

شعرا را بہ تو بازار برافروختہ بود
رفتی و با تو بہ یکبارہ برفت آں بازار

تیرے دم سے شاعروں کا بازار گرم تھا
تو گیا، اور وہ بازار بھی جاتا رہا

صنائع شاعری میں ایک چیز **تلمیح** یعنی کسی قصّہ طلب واقعہ سے مضمون پیدا کرنا ایک لطیف صنعت ہے، **فرّخی** اس صنعت کا استعمال نہایت خوبی سے کرتا ہے۔

مشہور ہے کہ حضرت آدمؑ نے جب بہشت میں گیہوں کھا لیا تو اُن کے

بدن کے کپڑے خود بخود اُتر گئے اور وہ بالکل برہنہ رہ گئے، فرخی نے اس واقعہ سے خزاں کی تعریف میں مضمون پیدا کیا۔

مگر درخت شگوفہ گناہِ آدم کرد — کہ ازلباس چو آدم ہمے شود عریاں

نوشیرواں نے زنجیرِ عدل قائم کی تھی یعنی ایوان شاہی میں ایک زنجیر لٹکا دی تھی کہ جس کسی کو شکایت ہو وہ زنجیر آکر ہلادے، زنجیر کے ہلنے کے ساتھ وہ کیسی حالت میں ہوتا، باہر نکل آتا تھا، دیکھو فرخی اس سے مضمون پیدا کرتا ہے۔

من چو مظلوماں، از سلسلۂ نوشیرواں — اندر آویختہ زاں سلسلۂ زلفِ دراز

مشہور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السّلام ہوا کے تخت پر بیٹھ کر سیر کیا کرتے تھے۔ فرخی نے اس سے تشبیہ کا کام لیا۔

پے بازیٔ گوے شد خسرو — بر یکے تازی اسپ کہ پیکر
راست گفتی بہ بادِ برجم بود — گر بود باد را ستام بہ زر

حضرت موسیٰ جب رود نیل پر پہنچے تو دریا بیچ میں سے پھٹ کر سیدھی سڑک نکل آئی جس سے تمام بنی اسرائیل پار اُتر گئے، **فرخی** کہکشاں کی تعریف میں کہتا ہے۔

مجرّہ چوں بدریا راہ موسےٰ — کہ اندر قعر او بگزشت لشکر

صنائع و بدائع، عارض سخن کے داغ ہیں تاہم چونکہ اس زمانہ میں اس کا رواج عام ہو چکا تھا، فرخی کے کلام میں بھی یہ داغ پائے جاتے ہیں لیکن چنداں بدنما نہیں معلوم ہوتے، لف ونشر، اور صنعتِ تقسیم کو ایک قصیدہ میں جمع کیا ہے۔

دررگ و اندر تن و اندر دل و اندر دو چشم
خواب و صبر و روح و خوں رااے مہ افتاد انقلاب

---

[1] یعنی برباد۔

رنج دارد جاے خون و درد دارد جاے روح
عشق دارد جاے صبر و آب دارد جاے خواب
ہشت چیز او برد از ہشت مایہ ہشت چیز
سال و مہ این ہشت چیزش را ہمیں است اکتساب
حلم او سنگ زمین و طبع او لطف ہوا
روے او دیدار ماہ و دست او جودِ سحاب
رسم او حسنِ بہار و لفظ او قدرِ شکر
خلق او بازار مشک و خوے او بوے گلاب
ہشت چیزش را برابر یافتم با ہشت چیز
ہر یکے زاں ہشت سوے فضل او دارد مآب
تیغ او را با قضا و تیرِ او را با قدر
اسپ او را با سپہر و خشتِ او را با شہاب
حزمِ او را با امان و عزمِ او را با ظفر •
لفظ او را با قرآن و حفظ او را با کتاب

صنعتِ سوال و جواب،

بریخت کہ ؟ گل سوری، چہ ریخت ؟ برگ، چرا؟
زہجر لالہ کجا رفت لالہ ؟ شد پنہاں
ازاں چہ خیزد ؟ دُرّ و ازیں چہ خیزد ؟ زر
سخا کہ درزد ؟ این و عطا کہ بخشد ؟ آں

فردوسی

حسن بن اسحاق بن شرف نام، اور فردوسی[۱] تخلص تھا، دولت شاہ کا بیان ہے کہ کہیں کہیں وہ اپنا تخلص ابن شرف شاہ بھی لاتا ہے، مجالس المومنین میں بعض مورخوں کے حوالہ سے اس کے باپ کا نام منصور بن فخر الدین احمد بن مولانا فرخ بیان کیا ہے۔ وطن میں بھی اختلاف ہے، چہار مقالہ میں ہے کہ طبرستان کی نواحی میں باژ نام ایک گاؤں تھا فردوسی یہیں کا رہنے والا تھا، دیباچہ شاہنامہ میں گاؤں کا نام شاداب لکھا ہے، بہر حال اس قدر عموماً مسلّم ہے کہ فردوسی کا وطن طوس کے اضلاع میں تھا، اور یہ وہی مردم خیز صوبہ ہے جس کی خاک نے امام غزالی اور محقق طوسی پیدا کئے۔

فردوسی کا وطن

سنہ ولادت معلوم نہیں، البتہ سال وفات ۴۱۱ھ ہے، اور چونکہ عمر کم ازکم ۸۰ برس کی تھی جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے۔

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد امیدم بہ یکبارہ برباد شد

اس لئے سال ولادت تقریباً ۳۲۹ھ سمجھنا چاہیئے۔

فردوسی کی ولادت

فردوسی جب پیدا ہوا تو اس کے باپ نے خواب میں دیکھا کہ نوزائیدہ بچّے نے

---

[۱] فردوسی کا حال تمام تذکروں میں بہ تفصیل مذکور ہے لیکن سب میں باہم سخت اختلاف ہے ان میں سب سے زیادہ قابلِ اعتبار چہار مقالہ ہے، جس کا مصنّف خود نامور شاعر اور فردوسی سے قریب العہد ہے، تاہم اس میں بھی سخت غلطیاں ہیں، تیمور کے پوتے بای سنقر نے فضلا سے شاہنامہ پر جو دیباچہ لکھوایا تھا، اُس میں فردوسی کی مفصل سوانحعمری ہے لیکن بعض واقعات ایسے لغو لکھے ہیں کہ اعتبار اُٹھ جاتا ہے، دولت شاہ سمرقندی نے بھی کسی قدر تفصیل سے حالات لکھے ہیں اور وہ بھی غلطیوں سے خالی نہیں۔ عربی مصنّفین میں سے صرف قزوینی نے آثار البلاد میں اس کا حال لکھا ہے۔ مَیں نے ان سب میں سے واقعات لئے ہیں، لیکن جابجا اُن کی غلطیوں کی بھی تصریح کر دی ہے۔

کوٹھے پر چڑھ کر نعرہ مارا، اور ہر طرف سے لبیک کی صدائیں آئیں، صبح کو جا کر نجیب الدین سے جو اُس زمانہ کے مشہور معبّر تھے، تعبیر پوچھی، اُنھوں نے کہا "یہ لڑکا شاعر ہوگا اور اس کی شاعری کا غلغلہ تمام عالم میں پھیلے گا، سن رشد کو پہنچ کر تحصیل علوم میں مشغول ہوا اور تمام درسی علوم حاصل کئے، چونکہ آبائی پیشہ زمینداری تھا اور جس گاؤں میں سکونت تھی خود اس کی ملک میں تھا، اس لئے معاش کی طرف سے فارغ البال تھا[1]، وہ اطمینان کے ساتھ علمی مشغلوں میں بسر کرتا تھا اور کتب بینی کیا کرتا تھا۔

شاہنامہ کی ابتدا اور دربار میں رسائی۔ یہ واقعہ جس قدر قطعی ہے اُسی قدر اُس کی تفصیل میں اختلاف ہے عام روایت یہ ہے کہ فردوسی داد رسی کے لئے محمود کے دربار میں گیا، یہاں اُس کی شاعری کا جوہر کھلا، اور **شاہنامہ** کی تصنیف پر مامور ہوا، لیکن یہ قطعاً غلط ہے، فردوسی نے خود بیان کیا ہے کہ شاہنامہ کی تصنیف میں ۳۵ برس صرف ہوئے۔

سی و پنج سال از سرائے سپنج	بسے رنج بردم بہ امید گنج
چو بر باد دادند گنج مرا	نبُد حاصلے سی و پنج مرا

اور سلطان محمود کی کل مدت سلطنت ۳۱ برس ہے۔

شاہنامہ کے دیباچہ میں فردوسی نے خود جو سبب تصنیف بیان کیا ہے اس سے بھی اس روایت کی تکذیب ہوتی ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محمود کے دربار میں پہنچنے سے بہت پہلے وہ شاہنامہ شروع کر چکا تھا تفصیل ان واقعات کی، شاہنامہ کے سبب تصنیف میں آگے آئیگی۔

بہر حال اس قدر یقینی ہے کہ فردوسی نے وطن ہی میں شاہنامہ کی ابتدا کی، اور

[1] چہار مقالہ صفحہ ۶۰

ابومنصور نے جو طوس کا صوبہ دار تھا، اس کی سرپرستی کی، ابومنصور کے مرنے کے بعد طوس کا عامل سلاں خاں مقرر ہوا چونکہ شاہنامہ کا اب ہر جگہ چرچا پھیلتا جاتا تھا سلطان محمود کو بھی خبر ہوئی، سلاں خاں کے نام حکم پہنچا کہ فردوسی کو دربار میں بھیج دو۔ فردوسی نے پہلے تو انکار کیا، لیکن پھر شیخ معشوق کی پیشین گوئی یاد آئی اس لئے راضی ہوگیا، اور طوس سے چل کر ہرات میں آیا لیکن ادھر دراندازیاں شروع ہوگئیں، دربار کا میر منشی بدیع الدین دبیر تھا، اسی نے عنصری سے کہا کہ بادشاہ کو مدت سے شاہنامہ کی تصنیف کا خیال تھا! لیکن دربار کے شعراء میں سے کسی نے اس کی ہامی نہیں بھری اب اگر فردوسی سے یہ کام بن آیا تو تمام شعرائے دربار کی آبرو خاک میں مل جائے گی۔ عنصری نے کہا بادشاہ سے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ فردوسی کو اُلٹا پھیر دیجئے، لیکن اس کی اور تدبیر کرنی چاہئے، چنانچہ فردوسی کے پاس ایک قاصد بھیجا[1] کہ یہاں کا قصد بے فائدہ ہے سلطان کو یونہی ایک خیال پیدا ہوا تھا جس کی بنا پر آپ کی طلبی کا حکم صادر ہوا۔ لیکن اس دن سے آج تک پھر کبھی ذکر تک نہیں آیا، اس لئے حقیقت واقعہ سے آپ کو اطلاع دی گئی، **فردوسی** نے ہرات سے واپس جانا چاہا لیکن ساتھ ہی خیال پیدا ہوا کہ شاید اس میں کچھ بھید ہو۔ اتفاق سے عنصری اور بدیع الدین دبیر میں شکر رنجی پیدا ہوئی، عنصری نے فردوسی کو جو خط لکھا تھا بدیع الدین ہی کے مشورہ سے لکھا تھا، اب بدیع الدین نے فردوسی کے پاس قاصد بھیجا کہ فوراً ادھر کا عزم کیجئے۔ عنصری نے جو لکھا خود غرضی سے لکھا تھا۔ فردوسی نے خط کے جواب میں لکھ بھیجا کہ میں آتا ہوں۔ یہ اشعار بھی خط میں درج کئے۔

---

[1] دیباچہ نویسوں نے عنصری کے ساتھ رودکی کا نام بھی لکھا ہے، لیکن رودکی اس سے پہلے ۳۰۴ھ میں مرچکا تھا۔

بگوش از سروشم بسے مژدہاست ‏ ‏ دلم گنج گوہر زبان اژدہاست
چہ سنجد بہ میزانِ من عنصری ‏ ‏ گیا چوں کشد پیش گلبن سرے

غرض ہرات سے چل کر غزنین میں آیا اور ایک باغ کے قریب ٹھہرا، وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھی، شہر میں جن لوگوں سے راہ و رسم تھی اُن کو اپنے آنے کی اطلاع دی، چلتا پھرتا باغ میں جا نکلا، حسن اتفاق سے دربار کے ممتاز شعرا، یعنی عنصری، فرخی، عسجدی باغ میں سیر کو آئے تھے، اور بادہ جام کا دور چل رہا تھا، فردوسی ادھر جا نکلا، حریفوں نے اس کو مخل صحبت سمجھ کر روکنا چاہا، ایک نے کہا کہ اس کو چھیڑا جائے تو خود تنگ آکر چلا جائے گا، عنصری نے کہا یہ تہذیب اور آدمیت کے خلاف ہے، آخر رائے قرار پائی کہ رباعی کا ایک مصرع طرح کیا جائے سب اس پر طبع آزمائی کریں اگر یہ بھی مصرع لگائے، تو شریکِ صحبت کر لیا جائے ورنہ خود شرمندہ ہو کر اُٹھ جائے گا۔

عنصری نے ابتدا کی اور کہا ع۔ چوں عارض تو ماہ نباشد روشن۔

فرخی نے کہا۔ مانند رخت گل نبود در گلشن۔

عسجدی نے کہا، مژگانت ہمے گزر کند از جوشن۔

قافیوں میں شین کا التزام تھا اور اس التزام کے ساتھ کوئی شگفتہ، قافیہ باقی نہیں رہا تھا، فردوسی نے برجستہ کہا ع۔ مانند سناں گیو در جنگ پشن

شعرا کا معرکہ

سب نے گیو اور پشن کی تلمیح پوچھی، فردوسی نے تفصیل بیان کی، اُس وقت تو سب نے اس کو شریکِ صحبت کر لیا، لیکن رشک اور حسد ایشیائی قوموں کا خاصہ ہے، سب نے سازش کی کہ فردوسی دربار تک نہ پہنچنے پائے[1]

---

[1] یہ دیباچہ شاہنامہ کی روایت ہے دولت شاہ کا بیان ہے اس امتحان کے بعد عنصری نے فردوسی کی تحسین کی اور خود دربار شاہی میں اس کو لیجا کر پیش کیا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ یہ مشاعرہ خود سلطان محمود کے دربار میں ہوا تھا،
سلطان محمود کے ندیموں میں ماہک نام ایک شخص صاحب مذاق تھا، اُس سے
یہیں باغ میں ملاقات ہو گئی تھی، فردوسی کی شیریں زبانی اور قابلیت دیکھ کر گرویدہ
ہوا اور اپنے گھر میں لا کر رکھا، کھانے کے بعد فردوسی سے اس کا حال دریافت
کیا، اُس نے اپنی ساری داستان بیان کی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطان نے **شاہنامہ** کی تصنیف کا حکم دیا تھا اور سات
شاعر یعنی عنصری، فرخی، زینی، عسجدی، مجنیک چنگ زن خرمی، ابوبکر، اسکاف
ترمذی اس کام کے لئے انتخاب ہوتے تھے۔

ماہک نے فردوسی سے شاہنامہ کی تصنیف، اور شعرا کے انتخاب کا ذکر کیا،
فردوسی نے کہا، میں بھی شعر کہتا ہوں، موقع ہو تو دربار میں میرا بھی ذکر کر دینا۔
ماہک نے اسی دن دربار میں جا کر فردوسی کی تقریب کرنی چاہی لیکن موقع نہ ملا، اس
طرح ایک ہفتہ گزر گیا، ایک دن **ماہک** نے دربار سے آکر بیان کیا کہ
آج تمام شعرا دربار میں حاضر تھے اور شاہنامہ کی مختلف داستانیں سنائی جا رہی
تھیں، **عنصری** نے رستم و سہراب کی داستان نظم کی تھی، جب یہ
دو شعر پڑھے۔

دربار میں پہنچنے کی تقریب

ہر آنگہ کہ تشنہ شدی تو بخوں — بیالودی ایں خنجرِ آب گوں
زمانہ بخونِ تو تشنہ شود — بہ اندامِ تو موئے دشنہ شود

تو سلطان محمود نے نہایت پسند کیا اور حکم دیا کہ **عنصری** ہی اس خدمت کے لئے مقرر
کیا جائے، فردوسی اُس وقت چپکا ہو رہا اور خود یہ داستان نظم کرنی شروع کی، رات کو
جب معمول کے موافق کھانے پر بیٹھے تو فردوسی نے کہا عنصری سے پہلے شعراء نے
رستم و سہراب کی داستان نظم کی ہے چنانچہ خود میرے پاس ایک نظم موجود ہے جس کے

آگے عنصری کے اشعار کی کچھ حقیقت نہیں، یہ کہہ کر نظم حوالہ کی، سرنامہ تھا۔

کنوں خورد باید مئے خوشگوار — کہ مے بوئے مشک آرد از جوئبار

ہوا پُر خروش و زمین پُر ز جوش — خنک آنکہ دل شاد دارد بہ نوش

ہمہ بوستاں زیر برگ گل است — ہمہ کوہ پُر لالہ و سنبل است

ماہک نے سلطان محمود کی خدمت میں جاکر تمہید کے ساتھ پیش کی محمود نے پوچھا کہ یہ جواہر کہاں سے ہاتھ آئے۔ ماہک نے فردوسی کا نام لیا، اُسی وقت طلبی ہوئی محمود نے نام و نشان پوچھا، فردوسی نے کہا طوس کا باشندہ ہوں محمود نے اس کے حالات پوچھے، اور اسی سلسلہ میں پوچھا کہ طوس کب سے آباد ہے اور کس نے آباد کیا، فردوسی نے تفصیل سے تمام واقعات بیان کئے، محمود نے شعرائے سبعہ کو بلوایا اور فردوسی کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ رستم و سہراب کی داستان اسی نے نظم کی ہے۔ فردوسی نے اس کے اشعار سنائے تو سب حیرت زدہ رہ گئے۔ محمود نے خلعت عطا کیا، شعرا نے تحسین کی صدا بلند کی، عنصری نے بڑھ کر فردوسی کے ہاتھ چوم لئے، اس زمانہ میں امرد پرستی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا، محمود نے فردوسی سے فرمائش کی کہ ایاز کے سبزہ خط کی تعریف میں کچھ کہے، فردوسی نے برجستہ کہا۔

بدیہہ گوئی کا امتحان

مست است بتا! چشم تو و تیر بہ دست — بس کس کہ ز تیر چشم مست تو بخست

گر پوشد عارضت زرہ، عذرش است — کز تیر بترسد ہمہ کس خاصہ ز مست

یعنی معشوق کی آنکھیں مست اور تیر بکف ہیں، اُن تیروں نے ہزاروں کے دل چھلنی کر دیئے ہیں۔ اس لئے اُن سے بچنے کے لئے رخساروں نے زرہ پہن لی ہے (خط کو زرہ سے تشبیہ دی ہے) کیونکہ مست سے سبھی ڈرتے ہیں، خصوصاً جب اُس کے ہاتھوں میں تیر ہو۔

شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت سپرد ہوئی

محمود نہایت محظوظ ہوا اور شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت سپرد کی، ساتھ ہی

یہ بھی حکم ہوا کہ فردوسی کو ایوان شاہی کے قریب ایک مکان دیا جائے جو تمام ضروری ساز و سامان سے آراستہ ہو، اور آلات جنگ، اسلحۂ حرب، شاہان عجم اور بہادروں اور پہلوانوں کے مرقعوں اور تصویروں سے سجا دیا جائے، ایک ایک شعر پر ایک ایک اشرفی صلہ مقرر ہوا اور حکم ہوا کہ جب ہزار شعر تک نوبت پہنچ جائے تو ہزار اشرفیاں دیدی جایا کریں، لیکن فردوسی نے متفرق رقم سے انکار کیا، اور کہا کہ جب کتاب پوری ہو جائیگی تو ایک ساتھ لونگا۔

فردوسی جب وطن میں تھا تو اکثر ایک چشمہ کے کنارے بیٹھا کرتا، اور آبِ رواں کی سیر سے لطف اُٹھاتا، چشمہ کے اُوپر بند تھا جو برسات کے زمانہ میں ٹوٹ جاتا تھا اور اس وجہ سے پانی گدلا ہو جاتا تھا، فردوسی کی طبیعت اس سے مکدر ہوتی تھی، قصد کیا کہ بند کو پختہ کرا دے، لیکن اتنا مقدور نہ تھا، شاہنامہ لکھنا شروع کیا تو نیت کی کہ جو کچھ صلہ ملے گا بند کی تیاری میں صرف کروں گا، یہ وجہ تھی کہ اُس نے شاہنامہ کا صلہ متفرق طور پر لینا پسند نہ کیا۔

فردوسی نے متصل چار سال تک غزنیں میں قیام کیا، اور شاہنامہ کی تصنیف میں مصروف رہا، پھر وطن گیا اور کئی برس رہ کر واپس آیا، اس اثنا میں جو حصہ طیار ہو چکا تھا، محمود کے حضور میں پیش کیا اور تحسین و آفرین کے صلے حاصل کئے۔

شاہنامہ کی تصنیف کے بیسویں سال جبکہ اس کی عمر ۶۵ برس کی تھی، اس کے جوان بیٹے کا انتقال ہو گیا، فردوسی کو سخت رنج ہوا، چنانچہ اس واقعہ کا ذکر شہنامہ میں کیا ہے۔

ملے دولت شاہ

اثنائے تصنیف میں بیٹے کا انتقال

مگر بہرہ گیرم از بند خویش — براندیشم از مرگ فرزند خویش

زبدہا تو بودی مرا دستگیر — چرا راہ جستی ز ہمراہ پیر

مگر ہمرہان جواں یافتی — کہ از پیش من تیز بشتافتی

جواں را چو شد سال برسی و ہفت[۳۷] — نہ بر آرزو یافت گیتی ورفت

ہمے بود ہموارہ با من درشت — برآشفت ویکبار بنمود پشت

مرا شصت و پنج و ورا سی و ہفت[۶۵] — نپرسید ازیں پیر و تنہا برفت

علمی تاریخ کا یہ نہایت ناگوار واقعہ ہے کہ فردوسی کو اُس کی اعجاز بیانی کی داد نہیں ملی یعنی جب شاہنامہ تیار ہوا تو اُس کو اشرفیوں کے بجائے روپے دلوائے گئے۔

فردوسی کی ناکامی اور اس کا سبب

یہ واقعہ عموماً مسلّم ہے، لیکن اسباب مختلف بیان کئے گئے ہیں اور سب باہم متناقض ہیں۔

دولت شاہ نے لکھا ہے کہ چونکہ فردوسی نے ایاز کی طرف کبھی رُخ نہیں کیا، اس لئے اُس نے دراندازی کی اور محمود کو یقین دلایا کہ فردوسی رافضی ہے۔ نظامی عروضی کا بیان ہے کہ دربار کا بڑا گروہ وزیر اعظم حسن میمندی کا مخالف تھا، اور چونکہ فردوسی کا مربّی اور سرپرست وہی تھا، اس لئے اس کی ضد پر اس گروہ نے محمود کے کان بھرے اور فردوسی کو معتزلی اور رافضی ثابت کیا، دیباچہ میں ہے کہ فردوسی کو خود حسن میمندی نے تباہ کیا، جس کی وجہ یہ تھی کہ غزنین اور اطراف وجوانب کے امرا فردوسی کو طرح طرح کے تحفے بھیجتے تھے، فردوسی بھی اشعار کے ذریعہ سے اُن کا شکریہ ادا کرتا تھا، حسن کو یہ ناگوار معلوم ہوتا تھا، لیکن فردوسی کچھ پروا نہیں کرتا تھا، اور کہتا تھا،

من بندہ کز مبادی فطرت نبودہ ام — مائل بہ مال ہرگز و طامع بجاہ نیز

سوے درِ وزیر چرا ملتفت شوم ۔۔۔۔ چوں فارغم زبارگہ بادشاہ نیز

حسن میمندی مذہباً خارجی تھا اور فردوسی شیعہ، اس لئے بھی اس نے فردوسی کی مخالفت کی، ان متناقض روایتوں میں سے کس پر اعتبار کیا جائے۔

دیباچہ نویسوں نے ایک اور نکتہ بیان کیا ہے اور اس پر ان کو ناز ہے، وہ یہ کہ فردوسی نے شاہنامہ میں جا بجا شرافتِ نسب کو بڑی آب و تاب سے لکھا ہے، اور یہ سلطان محمود کو اس وجہ سے ناگوار ہوتا تھا کہ وہ غلام زادہ تھا، اس لئے شرافت کی خوبی پر زور دینا گویا در پردہ اس پر چوٹ تھی۔

تذکرہ نویسوں کا فیصلہ یہ ہے کہ محمود نے فردوسی کے شیعہ پن کی وجہ سے اس کی قدردانی میں کمی کی، لیکن اولاً تو محمود کے دربار میں بہت سے شیعی علما و فضلا تھے جو نہایت قدر و عزت سے بسر کرتے تھے، ابوریحان بیرونی جو علانیہ شیعہ تھا محمود نے خود فرمان بھیج کر اس کو بلایا تھا اور نہایت قدردانی کرتا تھا، دربار میں

---

۱۵ سلطان محمود کی مدتِ حکومت میں تین شخصوں کو وزارت کا رتبہ ملا، سب سے پہلے فضل بن احمد اس منصب پر ممتاز ہوا، وہ ابتدا میں سامانی خاندان کا نائب میر منشی تھا، پھر سبکتگین کے دربار میں وزارت کے رتبہ پر پہنچا، سبکتگین کے بعد سلطان محمود نے اس کا عہدہ بحال رکھا، علم و فن سے عاری تھا لیکن مہماتِ سلطنت کے انتظام میں خداداد ملکہ رکھتا تھا، دس برس وزارت کرنے کے بعد سلطان محمود نے رقابت کی بنا پر معزول کر دیا، اس کے بعد حسن میمندی وزیر مقرر ہوا، اٹھارہ سال کے بعد وہ بھی معزول ہوا اور حسن بن محمد کو وزارت[۱۶] کی سند ملی، فردوسی نے فضل بن احمد کی مدح شاہنامہ میں لکھی ہے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ محمد کے دربار میں اسی نے فردوسی کی تقریب کی ہوگی، اور بالآخر جس نے محمود کو فردوسی کی ناکامی پر متوجہ کیا، وہ حسن بن محمد ہوگا،

---

۱۶ حبیب السیر میں ان وزراء کے حالات کسی قدر تفصیل سے مذکور ہیں،

ہندو، عیسائی، یہودی، ہر مذہب وملت کے اہل کمال تھے، فردوسی نے کیا قصور کیا تھا،
دیباچہ میں ایک اور وجہ بیان کی ہے، اور وہ قرین قیاس ہے،
سلطان محمود کو دیلمی خاندان سے سخت عداوت تھی، جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ متعصب شیعہ تھے، (دیباچہ میں رافضی کا لفظ تھا جس کو، ہم نے بدل دیا) اس خاندان کا تاجدار فخر الدولہ تھا، وہ فردوسی کا نہایت قدردان تھا، جب فردوسی نے رستم واسفندیار کی داستان نظم کی تو اس نے صلہ کے طور پر ہزار اشرفیاں بھیجیں اور لکھا کہ اگر آپ یہاں تشریف لائیں تو نہایت اعزاز و احترام کیا جائیگا، یہ خبر تمام غزنین میں پھیل گئی، محمود نے سنا تو اس کو ناگوار گزرا،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سلاطین دیلم عموماً سخت متعصب شیعہ تھے، ۳۵۱ھ میں معز الدولہ دیلمی کے حکم سے بغداد کی تمام مسجدوں کی دیواروں پر یہ عبارت لکھی گئی، "امیر معاویہ اور غاصب فدک پر لعنت ہے" رات کو لوگوں نے یہ عبارت مٹادی، معز الدولہ نے دوبارہ لکھنے کا حکم دیا، لیکن وزیر مہلبی نے رائے دی کہ صرف اس قدر لکھوا دیا جائے، "ظالمین آل محمد پر لعنت ہے" البتہ معاویہ کا نام بہ تصریح لکھا جائے، چنانچہ اس حکم کی تعمیل ہوئی[1]، یہ تعصب روز بروز بڑھتا گیا، سیوطی ۳۶۰ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں:-

وفی هذه السنة وبعدها غلا الرفض وفار بمصر والشام والمغرب	اس سنہ میں اور اس کے بعد مصر، شام اور شرق ومغرب میں رفض ابل پڑا،

تاریخ الخلفاء

فرقۂ باطنیہ جو مسلمانوں کو چھپ چھپ کر قتل کرتا رہتا تھا، اُن کی بڑی جمعیت دیلمیوں ہی کے زیر حمایت تھی، چنانچہ جب ۴۲۰ھ میں سلطان محمود نے مجد الدولہ دیلمی کو گرفتار کیا تو باطنیوں کا ایک گروہ عظیم اس کے ساتھ تھا، ان اسباب سے محمود کو دیلمیوں کے ساتھ نہ صرف مذہبی بلکہ پولیٹیکل دشمنی تھی، اس لئے وہ فردوسی کے ساتھ

[1] ابن الاثیر واقعات ۳۵۱ھ

فخر الدولہ دیلمی کی خط و کتابت کو مصالح ملکی کے لحاظ سے بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا[1]،

بہر حال وجہ کچھ ہو، واقعہ یہ ہے کہ محمود نے فردوسی کی قدر دانی کا حق ادا نہ کیا، فردوسی حمام میں نہا رہا تھا کہ شاہنامہ کا صلہ پہنچا، فردوسی حمام سے نکلا تو ایاز نے روپئے کی تھیلیاں پیش کیں، فردوسی نے بڑی بیتابی سے دستِ شوق بڑھایا، لیکن سونے کے پھل کے بجائے چاندی کے پھول تھے، فردوسی کے دل سے بیساختہ آہ نکلی، تھیلیاں کھڑے کھڑے لٹا دیں، اور ایاز سے کہا کہ بادشاہ سے کہنا کہ میں نے یہ خونِ جگران سفید دانوں کے لئے نہیں کھایا تھا، ایاز نے محمود سے ساری کیفیت بیان کی، محمود نے حسن میمندی کو بلا کر ناراضی ظاہر کی، اور کہا کہ تیری دراندازی نے مجھ کو بدنام کر دیا، میمندی نے کہا کہ حضور خاک کی ایک چٹکی بھیج دیتے تب بھی فردوسی کو آنکھوں سے لگانا تھا، انعام شاہی کا رد کرنا بڑی گستاخی ہے، اس چبھتے ہوئے فقرہ نے محمود کے دل میں بھی اثر کیا، اور برہم ہو کر کہا کہ کل میں اس قرمطی کو اس گستاخی کا مزہ چکھاؤں گا، فردوسی کو خبر ہوئی تو سخت پریشان ہوا، صبح کو محمود باغ میں آیا تو فردوسی نے دوڑ کر پاؤں پر سر رکھ دیا اور بدیہہ یہ اشعار پڑھے،

چو در ملک سلطاں کہ چرخش ستود — بسے ہست ترسا و گبر و یہود
گرفتند در ظلِ عدلش قرار — شہ ایمن از گردشِ روزگار
چہ باشد کہ سلطان گردوں شکوہ — رہی را شمارد یکے زاں گروہ

سلطان محمود کو رحم آیا، اور اس کی تقصیر معاف کی،

غزنین سے چلتے وقت فردوسی نے ایاز کو ایک لفافہ سر بمہر دیا اور کہا کہ میرے جانے کے ۲۰ دن بعد بادشاہ کو دینا، فردوسی ہرات کو روانہ ہوا، محمود نے لفافہ کی مہر کھولی تو ہجو کے اشعار تھے،

---

[1] ایضاً واقعات سنہ ۴۰۲ھ،

بسی بندگی کردم اے شہریار | که ماند ز تو در جہاں یادگار
پے افگندم از نظم کاخِ بلند | که از باد و باراں نیابد گزند
بسے رنج بردم دریں سال سی | عجم زنده کردم بدیں پارسی
چو بر باد دادند گنجِ مرا، | نبد حاصلے سی و پنج مرا
اگر شاه را شاه بودے پدر | بسر بر نہادے مرا تاجِ زر
وگر مادرِ شاه بانو بُدے، | مرا سیم و زر تا بزانو بُدے،
پرستارزاده نیاید بکار | وگر چند دارد پدر شہریار
سرِ ناسزایاں برافراشتن | وزیشاں اُمیدِ بہی داشتن
سرِ رشتۂ خویش گم کردن است | بجیب اندروں مار پروردن است
درختے که تلخ است ویرا سرشت | گرش برنشانی بباغِ بہشت
ور از جوی خلدش بہنگامِ آب | به بیخ انگبیں ریزی و شہدِ ناب
سرانجام گوہر بکار آورد | ہماں میوۂ تلخ بار آورد
ز بداصل چشمِ بہی داشتن | بود خاک در دیده انباشتن
ازاں گفتم ایں بیتہاے بلند | که تا شاه گیرد ازیں کار پند
که شاعر چو رنجد بگوید ہجا | بماند ہجا تا قیامت بجا

کلام کی جہانگیری دیکھو، محمود نے دُنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں مٹا دیں، مُلک کے مُلک غارت کر دیئے، عالم کو زیر و زبر کر دیا، لیکن فردوسی کی زبان سے جو بول نکل گئے آج تک قائم ہیں، اور قیامت تک نہیں مٹ سکتے،

فردوسی غزنین سے نکلا تو اس بے سرو سامانی سے نکلا کہ ایک چادر اور عصا کے سوا، کچھ پاس نہ تھا، احباب اور قدردانوں کی کمی نہ تھی لیکن معتوبِ شاہی کو کون پناہ دے سکتا تھا، تاہم ایاز نے یہ جرأت کی کہ جب فردوسی شہر سے باہر نکل گیا تو مخفی [illegible]

کچھ نقدی اور سامانِ سفر بھجوا دیا، فردوسی ہرات میں آیا اور اسمٰعیل وراق کے ہاں مہمان ہوا، چونکہ سلطان محمود نے ہر طرف فرمان بھیج دیئے تھے کہ فردوسی جہاں ہاتھ آئے گرفتار کر کے بھیج دیا جائے چھ مہینے تک روپوش رہا، شاہی جاسوس ہرات میں آئے، لیکن فردوسی کا پتہ نہ لگا سکے، اب اُس نے ہرات سے طوس کا رُخ کیا، طوس سے قہستان گیا، ناصر لک یہاں کا حاکم تھا، اس کو خبر ہوئی تو ندیمانِ خاص کو استقبال کے لئے بھیجا اور نہایت اخلاص کے ساتھ پیش آیا، فردوسی نے ایک مثنوی لکھنی شروع کی تھی، جس میں حاسدوں کی دراندازی، اپنی مظلومی اور سلطان محمود کی بدعہدی وناقدردانی کا ذکر تھا،

بہ غزنیں مرا گرچہ خوں شد جگر	ز بیدادِ آں شاہِ بیداد گر
کزاں ہیچ شد رنج سی سالہ ام	شنید از زمین آسمان نالہ ام
ہمی خواستم تا فغانہا کنم	بہ گیتی از و داستانہا کنم
بگویم ز مادرش و ہم ز پدرش	نہ ترسم بغیر از خداوندِ عرش
چو دشمن نیندازد و دست باز	بہ تیغ زبانش کنم پوست باز
ولیکن ز فرمودۂ محتشم	ندانم گزیں بیش چوں سر کشم
فرستادم از گفتۂ داستم	بہ نزدیکِ خود ہیچ نگذاشتم
اگر باشد ایں گفتہا نا صواب	بسوزاں در آتش بشو آں در آب
گزشتم ایا سرورِ نیک رائے	ازیں داوری تا بدیگر سرائے
رسد لطفِ یزداں بفریادِ من	ستاند بہ محشر از و دادِ من

فردوسی نے مثنوی کے اشعار ناصر لک کو سنائے تو اُس نے سمجھایا کہ بدگوئی اہل کمال کی شان نہیں، ہیں لاکھ روپیے ان اشعار کے معاوضہ میں دیتا ہوں، اشعار کہیں

سلہ چہار مقالہ۔

ظاہر نہ ہونے پائیں، فردوسی نے منظور کیا، ناصر لک نے سلطان محمود کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ فردوسی کے حق میں بڑا ظلم ہوا،

فردوسی جب غزنین سے روانہ ہوا تھا تو جامع مسجد کی دیوار پر یہ اشعار لکھ آیا تھا،

خجستہ درگہ محمود غزنوی دریاست — چگونہ دریا کآں را کرانہ پیدا نیست
چہ غوطہا زدم و اندرو ندیدم دُر — گناہ بخت من ست ایں گناہ دریا نیست

اتفاق یہ کہ جس دن ناصر لک کا عریضہ پہنچا، سلطان نماز جمعہ پڑھنے کے لیے جامع مسجد میں آیا تھا، اتفاق سے ان اشعار پر نظر پڑی، نہایت متاسف ہوا، مسجد سے آکر ناصر لک کا عریضہ دیکھا اور بھی مکدر ہوا، جن لوگوں نے فردوسی کے حق میں کانٹے بوئے تھے اُن کو بلا کر سخت توبیخ کی کہ تم نے دُنیا میں مجھ کو بدنام کر دیا،

ناصر لک نے گو فردوسی کی بہت کچھ خاطر مدارات کی، تاہم سلطان محمود کے ڈر سے اپنے پاس نہ ٹھہرا سکا، فردوسی یہاں سے بھی نکلا اور ماژندران میں آیا، یہاں وہ شاہنامہ کی نظر ثانی میں مشغول ہوا،

ماژندران کی حکومت قابوس بن وشمگیر کے خاندان میں چلی آتی تھی اور اس زمانہ میں سپہبد فرماں روا تھا، اس کو فردوسی کے آنے کی خبر ہوئی تو نہایت مسرت ظاہر کی اور فردوسی کو دربار میں بلایا، فردوسی نے مدحیہ اشعار اضافہ کرکے شاہنامہ پیش کیا، سپہبد نے چاہا کہ فردوسی کو دربار سے نہ جانے دے، لیکن پھر سلطان محمود کا خیال آیا، ایک گراں بہا صلہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ محمود آپ سے ناراض ہے، اس لئے

---

[۱] یہ دیباچہ کی روایت ہے، چہار مقالہ میں قہستان کے بجائے طبرستان اور ناصر لک کے بجائے سپہبد شیرزاد کا نام ہے، دولت شاہ نے طبرستان کے بجائے رستمدار لکھا ہے، طبرستان اور رستمدار در اصل ایک ہی ہیں، لیکن سپہبد اور ناصر لک دو شخص ہیں، دولت شاہ نے ان میں سے ایک کو چھوڑ دیا ہے۔

آپ کو ٹھہرا نہیں سکتا، آپ اور کہیں تشریف لے جائیے،

دیباچہ نویسوں نے لکھا ہے کہ "فردوسی یہاں سے بغداد گیا، خلیفہ عباسی نے اس کی بڑی قدر کی، فردوسی نے عربی میں قصیدے لکھ کر پیش کئے اور اہلِ بغداد کی فرمایش سے یوسف زلیخا لکھی، سلطان محمود کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو خلیفہ عباسی کو تہدید کا خط لکھا، کہ فردوسی کو فوراً یہاں بھیج دیجئے، ورنہ بغداد ہاتھیوں کے پاؤں کے نیچے ہوگا، وہاں سے تین حرف الف لام میم لکھ کر آئے کہ سورۂ الم ترکیف کی طرف اشارہ تھا" لیکن یہ تمام بے سر و پا مزخرفات ہیں،

ایک دفعہ سلطان محمود [illegible] ستان کی مہم سے واپس آرہا تھا، راستہ میں دشمن کا قلعہ تھا، وہیں ٹھہر گیا، اور قاصد بھیجا کہ حاضرِ خدمت ہو کر اطاعت بجا لائے، دوسرے دن قاصد جواب لایا، لیکن ابھی کچھ کہنے نہیں پایا تھا کہ محمود نے وزیر اعظم سے کہا کہ دیکھ کیا جواب لایا ہے،

وزیر نے برجستہ کہا،

اگر جز بکامِ من آمد جواب — من و گرز و میدان و افراسیاب

محمود پھڑک اٹھا اور پوچھا کس کا شعر ہے؟ وزیر نے کہا اس بدقسمت کا جس نے ۳۵ برس خونِ جگر پیا اور کچھ نہ حاصل ہوا، محمود نے کہا مجھ کو سخت ندامت ہے، غزنین پہنچ کر یاد دلانا، غرض پایۂ تخت میں پہنچ کر ساٹھ ہزار اشرفیاں فردوسی کے پاس روانہ کیں، لیکن تقدیر پر کس کا زور ہے، ادھر شہر کے ایک دروازہ سے جس کا نام رودبار تھا صلہ پہنچا، ادھر دوسرے دروازہ سے فردوسی کا جنازہ نکل رہا

...لطان محمود نے
...ی مافات کا
...کیا

لہ یہ واقعہ مختلف طریقوں سے مروی ہے، میں نے جو روایت لکھی ہے، نظامی سمرقندی سے مروی ہے اور اس لئے زیادہ معتبر ہے کہ اس نے ۵۱۰ھ میں امیر معزی (ملک الشعرا سلطان سنجر) سے سنی تھی اور امیر معزی سے امیر عبدالرزاق نے بیان کی تھی، (دیکھو چہار مقالہ واقعات فردوسی)

تھا۔

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میرؔ — یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

طوس میں ایک واعظ صاحب تھے اُنھوں نے فتویٰ دیا کہ چونکہ فردوسی رافضی تھا، اس کا جنازہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہو سکتا، ہر چند لوگوں نے منت سماجت کی، لیکن بدنفس واعظ نے ایک نہ مانی، مجبوراً شہر کے باہر ایک باغ میں کہ فردوسی کی ملک تھا، دفن کیا، سلطان محمود کو یہ خبر گزری تو حکم دیا کہ واعظ شہر سے نکال دیا جائے[۵]۔

فردوسی نے اولاد ذکور نہیں چھوڑی تھی، صرف ایک لڑکی تھی، شاہی صلہ اس کی خدمت میں پیش کیا گیا، لیکن اُس کی بلند ہمتی نے گوارا نہ کیا کہ باپ جس چیز کی حسرت میں مر گیا اولاد اس سے تمتع اُٹھائے، سلطان محمود کو اس کی اطلاع دی گئی، حکم ہوا کہ اشرفیاں امام ابوبکر اسحٰق کے حوالہ کی جائیں کہ اس سے فردوسی کے نام پر ایک کاروان سرائے بنا دی جائے، ناصر خسرو نے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ سنہ ۴۳۷ھ میں جب میں طوس میں پہنچا تو ایک بڑی کارواں سرا دیکھی، لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ فردوسی کے صلہ سے تعمیر ہوئی ہے، فرہنگ رشیدی اور چہار مقالہ میں لکھا ہے، کہ اس کا نام چاہ ہے، اور مرو اور نیشاپور کے راستہ میں ہے،

عام تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ فردوسی نے سنہ ۴۱۱ھ میں وفات پائی؛ لیکن فردوسی نے شاہنامہ کے خاتمہ میں تصریح کی ہے، کہ شاہنامہ سنہ ۴۰۰ھ میں انجام کو پہنچا،

ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار — کہ گفتم من ایں نامۂ شہریار

اس کے ساتھ یہ بھی تصریح کی ہے کہ اس وقت اس کی عمر اسی برس کی تھی؛

---

[۵] چہار مقالہ۔

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد امیدم بہ یکبارہ بر باد شد

شاہنامہ کے ختم ہونے کے بعد، وہ دو چار برس سے زیادہ زندہ نہیں رہا، اس لئے اس کی وفات ۴۱۱ھ سے چند برس پہلے ہوئی ہو گی،

فردوسی کا مزار مدت تک آباد اور بوسہ گاہ عالم رہا، نظامی سمرقندی نے ۵۱۰ھ میں اس کی زیارت کی تھی، دولت شاہ نے لکھا ہے کہ آج اس کا مزار مرجع عام ہے، قاضی نور اللہ شوستری مجالس المومنین میں لکھتے ہیں کہ عبداللہ خاں ازبک کی توجہ سے فردوسی کا مقبرہ معمور اور پُر رونق ہے، عام لوگ عموماً اور شیعہ خصوصاً زیارت کو جاتے ہیں، میں نے بھی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے"۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

شاہنامہ

سنہ تصنیف

سبب تصنیف

کیا عجیب بات ہے، جو واقعہ جس قدر زیادہ مشہور ہوتا ہے اسی قدر اکثر غلط اور بے سرو پا ہوتا ہے، عام طور پر مشہور ہے کہ فردوسی نے سلطان محمود کے دربار میں پہنچ کر اس کے حکم سے شاہنامہ لکھنا شروع کیا، اکثر تذکروں میں بھی یہی لکھا ہے، لیکن یہ غلط اور محض غلط ہے،

فردوسی نے خاتمہ میں خود تصریح کی ہے کہ یہ کتاب ۴۰۰ھ میں تمام ہوئی،

ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار[1] کہ گفتم من ایں نامۂ شہریار

اس کے ساتھ یہ بھی تصریح کی ہے کہ پینتیس برس کتاب کی تصنیف میں صرف ہوئے

سی و پنج سال از سرائے سپنج بسے رنج بردم بامید گنج

اس بنا پر تصنیف کا آغاز ۳۶۵ھ سمجھنا چاہئے، اور چونکہ سلطان محمود ۳۸۹ھ

---

[1] پانچ کو اسی میں ضرب دیں تو چار سو ہوتے ہیں +

میں تخت نشین ہوا، اس لئے اس کی تخت نشینی سے مدتوں پہلے شاہنامہ کی ابتدا ہو چکی تھی،

عام خیال یہ ہے کہ شاہنامہ سلطان محمود کی فرمائش سے لکھا گیا، لیکن یہ بھی محض غلط ہے، فردوسی نے خود سبب تالیف لکھا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو صرف اپنے اسلاف کا نام زندہ کرنا مقصود تھا،

همی خواهم از دادگر یک خدای که چندان بمانم بگیتی بجای
که این نامهٔ شهریاران پیش بپیوندم از خوب گفتار خویش
بسی رنج بردم درین سال سی عجم زنده کردم بدین پارسی
همه مرده از روزگار دراز شد از گفت من نام شان زنده باز
چو عیسیٰ من این مردگان را تمام سراسر همه زنده کردم بنام
پی افگندم از نظم کاخ بلند که از باد و باران نیابد گزند

تیسرے دفتر میں جہاں دقیقی کے اشعار نقل کئے ہیں، خاتمہ پر لکھتا ہے،

من این نامه فرخ گرفتم بفال همی رنج بردم به بسیار سال
ندیدم سرافراز بخشندهٔ بگاه کیان بر نشینندهٔ
سخن را نگهداشتم سال بیست بدان تا سزاوار این گنج کیست
جهاندار محمود با فر و جود که او را کند ماه و کیوان سجود

ان اشعار میں صاف تصریح ہے کہ سلطان محمود کے دربار میں پہنچنے سے بیس سال پہلے شاہنامہ شروع ہو چکا تھا،

دیباچہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آغاز کتاب اس نے خود اپنے شوق سے کیا، قرائن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، فردوسی فطرۃً شاعر تھا، اس کے ساتھ نسل کا مجوسی یعنی شاہان ایران کا ہم قوم تھا، دقیقی نے شاہنامہ کی جو بنیاد ڈالی تھی اور

جس قدر شعر لکھ لئے تھے، اس کے چرچے ہر جگہ پھیل گئے تھے اور اس سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ اس کتاب میں قبولیّت کا کس قدر مادہ ہے، یہ اسباب اس بات کے لئے کافی تھے کہ فردِوسی نے خود اپنے شوق سے شاہنامہ لکھنے کا ارادہ کیا، لیکن چونکہ ایک عظیم الشان کام تھا، اور اعانت کے بغیر انجام نہیں پا سکتا تھا، سب سے زیادہ اِس بات کی ضرورت تھی کہ تاریخ کا مستند سرمایہ ہاتھ آئے، حسنِ اتّفاق یہ کہ فردوسی کے وطن ہی میں ایک شخص کے پاس یہ سرمایہ موجود تھا، اور وہ فردوسی کا مخلص دوست تھا، اس کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے یہ کتاب لاکر فردوسی کو دی، چنانچہ فردوسی دیباچہ میں لکھتا ہے:-

به شهرم یکے مہرباں دوست بود　　　تو گفتی که با من بیک پوست بود
مرا گفت خوب آمد این رائے تو　　　به نیکی خرامد مگر پائے تو
نوشته من این نامۂ پہلوی　　　به پیش تو آرم مگر نغنوی
شو، این نامۂ خسرواں باز گوے　　　بدیں جوے نزد مہاں آبروے
چو آورد این نامہ نزدیک من　　　برافروخت این جانِ تاریک من

فردوسی اگرچہ جیسا کہ نظامی سمرقندی نے لکھا ہے "رئیس زادہ اور خوش حال تھا" تاہم جب اس نے شاہنامہ لکھنا شروع کیا تو علم دوست امراء نے قدر دانی کا اظہار کرنا چاہا، لیکن منصور بن محمد نے جو طوس کا حاکم تھا ایسی فیاضی کا اظہار کیا، کہ فردوسی تمام لوگوں سے بے نیاز ہو گیا،

بدیں نامہ چوں دست کردم دراز　　　یکے مہترے بود گردن فراز
جواں بود از گوہر پہلواں　　　[illegible] بیدار و روشن رواں
مرا گفت کز من چہ آید ہمے　　　کہ جانت سخن برگراید ہمے
بچیزے کہ باشد مرا دست رس　　　بکوشم، نیازت نہ آرم بکس

شاہنامہ کے قدردان

افسوس کہ منصور چند روز کے بعد مر گیا، فردوسی نے اس کا بہت پُر زور مرثیہ لکھا،
حسین قتیب، علی دیلم، بودلف اور فضل بن احمد کا نام بھی فردوسی کے قدردانوں
کی فہرست میں داخل ہے، نظامی سمرقندی نے لکھا ہے کہ "حسین قتیب طوس کا عامل
تھا" (غالباً منصور کے مرنے کے بعد مقرر ہوا ہوگا) اس نے فردوسی کے دیہات
کی مالگذاری معاف کر دی تھی[۵۱]،

فضل بن احمد سلطان محمود کا وزیر تھا، جس کے مرنے کے بعد حسن میمندی اس
منصب پر ممتاز ہوا، فضل کا تذکرہ بھی فردوسی نے شاہنامہ میں کیا ہے؛

نظامی عروضی کا بیان ہے کہ علی دیلمی شاہنامہ کا مسودہ صاف کیا کرتا تھا،
اور بودلف راوی تھا، یعنی شاہنامہ حفظ یاد رکھتا تھا، اور جلسوں اور صحبتوں میں لوگوں کو
سُناتا تھا، لیکن شاہنامہ میں فردوسی نے ان دونوں کا نام اس انداز سے لیا ہے
جس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ فردوسی کے سرپرست اور مربی تھے، کاتب اور راوی نہ تھے،

ازاں نامور نامداران شہر علی دیلم و بودلف راست بہر

بودلف کی نسبت قاضی نوراللہ شوستری کا قیاس ہے کہ یہ وہ بودلف ہے
جو ایک محتشم رئیس تھا، جس کے نام پر اسدی طوسی نے گرشاسپ نامہ لکھا ہے،
اور دیباچہ میں اس کی مدح و ثنا کی ہے،

ملک بودلف شہر یار زمین جہاندار آزادی پاک دین
بزرگی کہ با آسمان ہمسر است نسب برابرهیم پیغمبر است

خوش اعتقاد دیباچہ نویسوں نے لکھا ہے، کہ فردوسی نے جب شاہنامہ لکھنے کا
ارادہ کیا تو شیخ محمد معشوق طوسی کی خدمت میں جو ایک مشہور صاحب دل تھے،
حاضر ہوا، اور ان سے اپنا خیال ظاہر کیا، انھوں نے کہا تم اس کام کو شروع

[۵۱] چہار مقالہ، نظامی سمرقندی؛

کرو، خدا تم کو کامیاب کرے گا، فردوسی تو کامیاب نہیں ہوا، لیکن شاہنامہ کی کامیابی میں کسی کو شک ہو سکتا ہے،

شاہنامہ کا ماخذ

شاہنامہ کا تاریخی مواد

سرجان مالکم[1] صاحب اپنی تاریخ صفحہ ۶۵ میں لکھتے ہیں،

"قرنِ اول کے تمام مورخین لکھتے ہیں کہ چونکہ ایرانیوں نے عرب کے حملے کے روکنے میں نہایت پامردی دکھائی تھی، اس لئے پیروانِ اسلام اس قدر برافروختہ تھے کہ انہوں نے ایران کی تمام قومی یادگاروں کو برباد کر دیا، شہروں کو آگ لگا دی، آتشکدے برباد کر دیئے، موبدوں کو قتل کرا دیا، ہر قسم کی کتابیں عموماً برباد کر دیں، کتب خانوں کے مالکوں کو قتل کرا دیا، یہ متعصب عرب قرآن کے سوا کچھ نہیں جانتے تھے اور نہ جاننا چاہتے تھے، موبدوں کو مجوس کہتے تھے اور ان کو جادوگر سمجھتے تھے، یونان اور روم کی کتابوں سے قیاس ہو سکتا ہے کہ اس طوفان میں ایران کی کس قدر کتابیں بہی ہوں گی، قریباً چار سو برس گزر گئے اور کسی نے ایرانیوں کی تاریخ لکھنے پر توجہ نہیں کی، سب سے پہلی کوشش اس کے متعلق جو کی گئی وہ سامانیوں کی، مورخین کو اس میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ منصور ثانی نے ابتدا کی، بعض کہتے ہیں کہ دقیقی نے شاہنامہ لکھنا اسمٰعیل کے زمانہ میں شروع کیا جو سلسلۂ سامانیہ کا پہلا تاجدار تھا، غرض چونکہ سلاطین سامانی اپنے آپ کو بہرام چوبیں کے خاندان سے سمجھتے تھے، اس لئے انہوں نے اپنے اسلاف کا نام زندہ کرنا چاہا"۔

---

[1] سر جان مالکم صاحب ایک مدت تک ایران میں انگریزی سرکار کی طرف سے سفیر تھے انہوں نے ایران کی تاریخ قدیم و جدید پر ایک کتاب انگریزی میں لکھی، مرزا حیرت ایرانی نے اس کا ترجمہ کیا جو بمبئی میں ۱۸۷۶ء میں چھاپا گیا۔

مالکم صاحب کی متعصبانہ رائے

مالکم صاحب ایک مدت تک ایران میں رہے ہیں، فارسی زبان میں اُن کو پوری مہارت تھی، اسلامی تاریخ کی طرف خاص توجہ تھی، ان سب باتوں کے ساتھ ان کی تحقیقات کا یہ عالم ہے کہ اتنی لمبی چوڑی عبارت میں ایک حرف بھی صحیح زبان سے نہ نکلا،

مالکم صاحب کے تعصب کے جواب دینے کا یہ موقع نہیں، البتہ تاریخی حیثیت سے یہ امر قابل بحث ہے کہ فردوسی نے جب شاہنامہ لکھنا چاہا تو ایران کا تاریخی ذخیرہ کس قدر موجود تھا، عام خیال یہ ہے کہ مسلمانوں میں علوم و فنون کی تدوین ۱۴۳ھ سے شروع ہوئی اور درحقیقت اسلامی علوم و فنون کے متعلق اس سے پہلے کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ غیر قوموں کے علوم و فنون کا ترجمہ اس سے پہلے شروع ہو چکا تھا، ہشام بن عبد الملک جو ۱۰۵ھ میں تخت نشین ہوا، اور جو سلاطین بنی امیہ کا گل سرسبد تھا، سب سے پہلے اس نے غیر قوموں کی تاریخ کی طرف توجہ کی، اس کا میر منشی جبلہ بن سالم تھا، اس نے فارسی زبان کی بہت سی کتابیں ترجمہ کیں جن میں سے جنگ رستم و اسفندیار اور داستان بہرام چوبین بھی تھی[1]، شاہان عجم کے علمی ذخیرے جو فتوحات میں ہاتھ آئے تھے، اُن میں ایک کتاب تاریخ تھی، یہ ایران کی نہایت مفصل اور مبسوط تاریخ تھی، جس میں سلطنتوں کے حالات کے ساتھ حکومت کے قواعد اور آئین، عہد بعہد کے علوم و فنون، تعمیرات وغیرہ کے مفصل حالات تھے ایک خاص جدت یہ تھی کہ تمام سلاطین کی تصویریں بھی تھیں اور تصویروں میں اُن کی خاص وضع قطع، لباس، زیورات اور تمام خصوصیات کو بعینہٖ دکھایا تھا، ہشام نے اس کتاب کا ترجمہ کرایا، چنانچہ ۱۱۳ھ میں یہ ترجمہ طیار ہوا، مورخ مسعودی نے کتاب الاشراف[2] میں لکھا ہے کہ میں نے ۳۰۳ھ میں بمقام اصطخر یہ کتاب دیکھی،

ایران کی قدیم تاریخ کا ترجمہ عربی میں ۱۱۳ھ میں ہوا،

---

[1] کتاب الفہرست ص۱۱۱ [2] کتاب مذکور مطبوعہ یورپ ص۱۰۶ ،

سلطنت فارس کے متعلق جس قدر کتابیں فارسی میں موجود ہیں یہ سب سے زیادہ مفصل ہے، دولتِ عباسیہ نے آغاز ہی سے ایران کے علوم و فنون کے ترجمہ کی طرف توجہ کی، ان میں سے تاریخی کتابیں حسب ذیل ہیں :-

خدائی نامہ[1]، یہ نہایت مفصّل تاریخ تھی اور اس قدر مقبولِ عام تھی کہ بہرام بن مردان شاہ نے جو دولت عباسیہ کا مترجم تھا، جب اس کتاب کو بہم پہنچانا چاہا تو بیس مختلف نسخے اس کو ہاتھ آئے، عبداللہ بن المقفع نے اس کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں کیا اور اس کا نام تاریخ ملوک الفرس رکھا،

آئین نامہ، یہ بھی نہایت مفصل کتاب ہے، علامہ مسعودی نے کتاب التنبیہ والاشراف (صفحہ ایں) لکھا ہے، کہ یہ بہت ضخیم کتاب اور کئی ہزار صفحوں میں ہے، عبداللہ ابن المقفع نے اس کا ترجمہ کیا،

سیر ملوک الفرس	مترجمۂ عبداللہ بن المقفع،
سیر ملوک الفرس	مترجمۂ محمد جہم البرمکی
سیر ملوک الفرس	مترجمۂ زادویہ بن شاہویہ الاصفہانی
سیر ملوک الفرس[2]	مترجمہ محمد بن بہرام الاصفہانی،

سگیراں، پہلوی زبان میں تھی، مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ اہل عجم اس کتاب کی نہایت عزت کرتے تھے، عبداللہ بن المقفع نے اس کا ترجمہ کیا،

تاریخ دولت ساسانی	مترجمہ ہشام بن قاسم الاصفہانی

اصلاح تاریخ [3] داوہ بہرام بن مردان شاہ موبد شاپور،

---

[1] خدائی نامہ کا ذکر تاریخ حمزہ اصفہانی مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۶، ۲۰، ۲۴ اور کتاب الفہرست صفحہ ۱۱۸ میں ہے۔

[2] ان چاروں کتابوں کا ذکر تاریخ حمزہ اصفہانی صفحہ ۸ میں ہے

[3] ان دونوں کتابوں کا ذکر تاریخ حمزہ اصفہانی صفحہ ۹ میں ہے،

کارنامہ نوشیرواں

شہرزاد و پرویز

کارنامہ اردشیر بن بابک — اردشیر نے اپنے حالات اور واقعات خود لکھے تھے

کتاب التاج

بہرام و نرسی نامہ

کارنامہ — نوشیرواں کے حالات،

مزدک نامہ

ان کتابوں کے علاوہ سلاطینِ ایران کے عہد نامے، توقیعات اور فرامین مہیا کیے گئے اور ان کا ترجمہ کیا گیا، مثلاً وصیت نامۂ نوشیرواں بنام ہرمز، عہد نامہ اردشیر بابکاں بنام شاپور، کسریٰ و مرزبان کا مکالمہ، نوشیرواں کا خط سردارانِ فوج کے نام، نوشیرواں اور جواسپ کے مراسلات[1]۔

جب تاریخ ایران کا اس قدر ذخیرہ فراہم ہو چکا تو مورخینِ اسلام نے ان کی مدد سے خود مستقل تصنیفیں کیں، چنانچہ محدث طبری، علامہ مسعودی، ابو حنیفہ دینوری، یعقوبی، حمزہ اصفہانی وغیرہ نے ایران کی مبسوط اور مفصل تاریخیں لکھیں جو یورپ کی بدولت آج چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، یہ تمام کتابیں فردوسی کے زمانہ سے پہلے تصنیف ہو چکی تھیں، ان واقعات کے بعد مالکم صاحب کی رائے کو پڑھو کہ "مسلمان ہمارے سو برس تک ایران کی تاریخ سے ناواقف تھے، اور سب سے پہلی کوشش سامانیوں کے دور میں ہوئی"۔

یہ تمام کتابیں عربی زبان میں تھیں، فارسی میں اس وقت تک ترجمہ کے سوا

[1] مروج الذہب مسعودی مطبوعہ یورپ، ص ۱۶۲، جلد اول،

[2] ان چاروں کتابوں کا ذکر فہرست ابن الندیم ص ۳۰۵ میں ہے،

کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی گئی تھی، غالباً سب سے پہلی کتاب جو تاریخ ایران پر لکھی گئی، وہ ابو علی محمد بن احمد البلخی کی تصنیف تھی جس کا نام اس نے شاہنامہ رکھا تھا، اسی بنا پر کشف الظنون میں اس کو شاہنامۂ قدیم لکھا ہے،

ابو ریحان بیرونی نے آثار الباقیہ میں لکھا ہے کہ مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے اس کتاب کا سرمایہ کتب مندرجۂ ذیل سے فراہم کیا، سیر الملوک عبد اللہ ابن المقفع، سیر الملوک محمد بن جہم البرمکی، سیر الملوک ہشام بن القاسم، سیر الملوک بہرام شاہ بن مردان شاہ، سیر الملوک بہرام اصفہانی، تصانیف بہرام مجوسی،

غرض جب دقیقی نے شاہنامہ لکھنے کا ارادہ کیا تو تاریخ عجم کا بہت بڑا ذخیرہ عربی و فارسی میں تیار ہو چکا تھا، دقیقی نے سامانیوں کی فرمایش سے یہ کام شروع کیا تھا، سامانیوں کا کتب خانہ اس زمانہ میں تمام عالم میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا، شیخ بوعلی سینا جب اول اول اس کتب خانہ میں داخل ہوا تو اس پر حیرت چھاگئی، چنانچہ اس نے اقرار کیا ہے کہ میں نے اتنا نادر اور عظیم الشان کتب خانہ نہ اس سے پہلے کبھی دیکھا تھا نہ اس کے بعد دیکھا، دقیقی کے لئے یہ تمام تاریخی ذخیرہ مہیا کیا گیا ہوگا، اور چونکہ سلطان محمود غزنوی سامانیوں ہی کا دست پرورد اور ان کو مٹا کر ان کا جانشین بنا تھا اس لئے ہر طرح قرین قیاس ہے کہ وہ سب سامان محمود کو ہاتھ آیا ہوگا اور فردوسی کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا ہوگا، یہ محض قیاس نہیں بلکہ مورخین کی تصریح سے اس کی تائید ہوتی ہے، کشف الظنون میں ہے،

تاریخ الفرس لبعض قدماء اهل فارس	تاریخ ایران بعض قدمائے ایران کی تصنیف ہے،
وقد کان معظما عند العجم لما فیه	عجمی اس کتاب کی اس لئے بہت عزت کرتے تھے
من اخبار سلاطینهم و ملوکهم وهو	کہ اسمیں انکے باواجداد اور سلاطین کے حالات

لہ دیکھو کتاب مذکور مطبوعۂ یورپ ص۹۹،

الی الشهنامه وغیرها ونقله ابن المقفع من الفهلویة الی العربیة

تھے اور یہی کتاب شاہنامہ وغیرہ کا ماخذ ہے ابن المقفع نے اسکو پہلوی زبان سے ترجمہ کیا

غالباً یہ وہی خدائی نامہ ہے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا،

صاحب مجمع الفصحاء لکھتے ہیں،

"ازجملہ نامہائے قدیم جاسپ نہاد، کتاب است کہ در ذکر خسروان ایران بودہ دیگر آئین بہمن است، در احوال بہمن، دیگر داراب نامہ است، دیگر دانش افزائے نوشیروانی کہ جامع آں بزرگ مہر حکیم بودہ، وباستان نامہ ودانشور نامہ وخرد نامہ وحکیم ابوالقاسم محمد بن منصور فردوسی آثار افعال ملوک عجم را ازان نامہا بدست آوردہ"

ان تمام قرائن اور تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ فردوسی کا ماخذ زیادہ تر ایران کی وہ تاریخیں ہیں جو عربی میں ترجمہ ہو گئی تھیں، لیکن فردوسی کا قومی غرور عرب کے احسان کو گوارا نہیں کرتا، فردوسی کا دعویٰ ہے کہ قدیم زمانہ کی ایک نہایت مبسوط تاریخ ایران کی موجود تھی لیکن مرتب ومدوّن نہ تھی، موبدوں یعنی مذہبی پیشواؤں کے پاس اس کے مختلف اجزاء تھے، ایک رئیس دہقان نے ہر جگہ سے بڈھے بڈھے پرانے موبد جمع کئے اور اُن پراگندہ اجزاء کو زبانی روایتوں کی مدد سے ترتیب دے کر ایک مکمل کتاب تیار کرائی،

شاہنامہ کے ماخذ کے متعلق خود فردوسی کا بیان

یکے نامہ بُد از گہ باستاں فراواں بدو اندراں داستاں
پراگندہ در دست ہر موبدے ازو بہرۂ بردہ ہر بخردے
یکے پہلواں بود دہقاں نژاد دلیر و بزرگ و خرد مند و راد
ز ہر کشورے موبدے سالخورد بیاورد و ایں نامہ را گرد کرد
بپرسید شاں از نژاد کیاں وزاں نامداراں فرخ گواں

بگفتند پیشش یکایک مہاں | سخنہاے شاہان و گشت جہاں
چو بشنید ازیشاں سپہبد سخن | یکے نامور نامہ افگند بن

فردوسی کا بیان ہے کہ اسی کتاب کو دقیقی نے نظم کرنا شروع کیا تھا لیکن چونکہ ناتمام چھوڑ گیا میں نے اس کی تکمیل کی،

فردوسی کے بیان کے مطابق شاہنامہ کی اصلی بنیاد اسی کتاب پر قائم کی گئی لیکن جستہ جستہ داستانیں اور ذریعوں سے بھی فراہم ہوئیں، رستم و شغاد کا قصہ جہاں شروع کیا ہے، تمہید میں لکھا ہے کہ احمد بن سہل کے دربار میں ایک بڈھا تھا جو سام و نریمان کی اولاد سے تھا، اس کے پاس سلاطینِ ایران کی تاریخ تھی، اور رستم کی اکثر داستانیں اس کو زبانی یاد تھیں، شغاد کا قصہ میں نے اس سے لے کر نظم کیا،

یکے پیر بد نامش آزاد سرو | کہ با احمد سہل بودے بمرو
کجا نامۂ خسرواں داشتے | تن و پیکر پہلواں داشتے
بسام نریماں کشیدش نژاد | بسے داشتے رزم رستم بیاد
بگویم سخن آنچہ زو یافتم | سخن را یک اندر دگر بافتم

فردوسی کا دعویٰ ہے ہم کو انکار کی کوئی وجہ نہیں، لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ فردوسی نے خود تیسری جلد میں دقیقی کے اشعار کے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے،

یکے نامہ دیدم پر از داستاں | سخنہاے آں پر منش راستاں
فسانہ کہن بود و منثور بود | طبائع ز پیوند او دور بود
گذشتہ برو سالیاں دو ہزار | گر ایدوں کہ برتر نیاید شمار
گرفتم بگوینده بر آفریں | کہ پیوند را راه داد اندریں

تیسرے شعر میں صاف تصریح ہے کہ کتاب مذکور دو ہزار برس کی تصنیف تھی، یہ ظاہر ہے کہ دو ہزار برس پہلے ایران کی جو زبان تھی وہ فردوسی کے زمانہ کی

زبان نہ تھی بلکہ ژندی یا اس کے قریب قریب ہوگی جو سنسکرت سے ملتی جلتی ہے، اور جو پہلوی زبان سے بھی بہت مختلف ہے، اِس لئے یہ بات ثابت ہوتا ضرور ہے کہ فردوسی اس زبان سے واقف تھا یا کوئی شخص ترجمہ کرتا جاتا تھا، لیکن تذکروں اور خود فردوسی کے بیان میں اس کی کوئی شہادت موجود نہیں ہ

شاہ نامہ کے ماخذ کے متعلق دیباچہ میں اور چند روایتیں مذکور ہیں، واقعہ نگاری کے فرض کے لحاظ سے ہم اُن کو بھی نقل کرتے ہیں، لیکن جہاں ان میں بدیہی غلطی ہے، ہم اس کی تغلیط کر دیں گے،

سامانیوں کو ایران کی تاریخ کے مرتب کرنے کا ہمیشہ خیال رہا، ان میں سے نوشیرواں کو سخت شغف تھا، چنانچہ تمام دیار و اطراف میں قاصد بھیج کر ہر جگہ سے تاریخی ذخیرے جمع کئے، یزدگرد نے اپنے زمانہ میں ان سب کو دانشور دہقاں کے حوالہ کیا کہ کیومرث سے لے کر خسرو پرویز کے زمانہ تک مکمل اور مرتب تاریخ تیار کرے، دانشور مذکور مدائن کے رؤساء میں تھا اور نہایت صاحب حوصلہ اور فاضل شخص تھا، اس نے ان تمام ذخیروں کو عمدگی سے ترتیب دے کر ایک مبسوط اور جامع تاریخ تیار کی،

عربوں کے حملہ میں یہ کتاب حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کی گئی آپ نے اس کا ترجمہ سُنا اور فرمایا کہ یہ مزخرفات کا مجموعہ دیکھنے کے قابل نہیں، غرض یہ کتاب لُوٹ میں تقسیم ہو کر حبش پہنچی، بادشاہِ حبش نے اس کا ترجمہ کرایا، وہاں سے ہندوستان پہنچی، یعقوب لیث نے اپنے زمانۂ حکومت میں اس کو ہندوستان سے منگوا کر ابو منصور عبدالرزاق بن عبداللہ فرخ کو حکم دیا کہ اس کا ترجمہ کیا جائے، چنانچہ تاج بن خراسانی ہروی، یزدان داد شار سیستانی، ماہوی بن خورشید نیشاپوری، سلیمان طوسی، ان سب نے مل کر ۳۶۰ھ میں اس کا ترجمہ کیا، یہی کتاب سامانیوں کو ہاتھ آئی، اور

ان کے حکم سے دقیقی نے اس کو نظم کرنا شروع کیا،

اس روایت کا یہ حصہ کہ کتاب حبش گئی، وہاں ترجمہ ہو کر پھر ہندوستان پہنچی، ہندوستان سے ایران میں آئی، صریح غلط اور بیہودہ ہے، باقی واقعات صحیح ہوں تو عجب نہیں، یعنی ایران کی کوئی قدیم تاریخ جو یزدگرد کے عہد میں تیار ہوئی تھی، یعقوب لیث کے زمانہ میں پہلوی سے فارسی میں ترجمہ کی گئی ہو،

دیباچہ کی دوسری روایت یہ ہے کہ نوشیرواں کے خاندان کا ایک شخص سلطان محمود کے زمانہ میں تھا، اس کا نام خور فیروز تھا، اور فارس میں سکونت رکھتا تھا، زمانہ کے انقلاب سے آوارہ وطن ہو کر، غزنین پہنچا، یہاں آکر چرچا سنا کہ سلطان محمود تاریخ عجم کا شیفتہ و دلدادہ ہے، اس کے وطن میں یہ کتاب موجود تھی، چنانچہ وہاں سے منگوا کر سلطان کی خدمت میں پیش کی، اور مورد انعام ہوا،

تیسری روایت یہ ہے کہ جب تمام ملک میں سلطان محمود کے شوق کے چرچے پھیلے تو بادشاہ کرمان نے ایک شخص کو جس کا نام آذر برزین تھا، اور شاپور ذوالاکتاف کے خاندان سے تھا، اور اس وجہ سے تاریخ ایران کا بڑا سرمایہ اس کے پاس تھا، اس کو سلطان محمود کی خدمت میں بھیجا،

شاہنامہ کی وقعت تاریخ کے لحاظ سے | اگرچہ اس میں شک نہیں کہ شاعرانہ رنگ آمیزیوں نے شاہنامہ کو عام نظروں میں تاریخی درجہ سے گرا دیا ہے، تاہم ایران کی کوئی مفصل قدیم تاریخ اس سے زیادہ صحیح نہیں مل سکتی۔۔

ملکم صاحب بھی تاریخ ایران میں اعتراف کرتے ہیں،

"کتاب فردوسی اگرچہ افسانہ و خیالات شاعری بسیار دارد، لکن تقریباً جمیع اخبارے کہ در تاریخ قدیم ایران و توران در ملک آسیا (ایشیا) یافت می شود دراں مندرج است"

مالکم صاحب نے نہایت تفصیل کے ساتھ شاہنامہ کے واقعات کا یونانی مورخین کے بیان سے مقابلہ کیا ہے، اور اکثر جگہ دونوں میں تطبیق دی ہے۔ علامۂ ثعلبی نے جو سلطان محمود کا معاصر تھا، ایران کی قدیم تاریخ پر ایک مبسوط کتاب لکھی ہے، اس نے بھی جا بجا شاہنامہ کا حوالہ دیا ہے، تاریخی حیثیت سے شاہنامہ کے متعلق مفصل بحث کرنا ہمارا موضوع نہیں، البتہ اس قدر جتانا ضروری ہے کہ شاہنامہ کی بے اعتباری کی بڑی وجہ جو آج کل خیال کی جاتی ہے، وہ اس کے دوراز کار افسانے ہیں، مثلاً دیو سفید، مار ضحاک، ہام کیخسرو وغیرہ وغیرہ، لیکن اولاً تو چند واقعات کی بنا پر تمام کتاب کو غلط نہیں کہہ سکتے، ہیروڈوٹس کو تمام یورپ تاریخ کا آدم مانتا ہے، لیکن اس کی تاریخ میں ہزاروں واقعات فرضی اور وہمی ہیں، اور خود یورپ کو اس کا اعتراف ہے، دوسرے ایرانیوں کی قدیم تاریخ میں واقعات اسی طرح مذکور تھے، اس لئے فردوسی کا صرف یہی فرض تھا کہ ان واقعات کو بعینہ نقل کر دے، علامہ ثعلبی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ یہ تمام افسانے بالکل بے سر و پا اور خلاف عقل ہیں، لیکن چونکہ ایران کی تاریخ میں بتواتر بیان ہوتے چلے آتے ہیں، اس لئے ہمارا صرف اس قدر فرض ہے کہ جوں کا توں ان کو نقل کر دیا جائے، علامۂ موصوف کے یہ الفاظ ہیں، (ذکر قصۂ زال و سیمرغ)

وانا ابرء من عهدة هذه الحكاية ولولا شهرتها بكل مكان وفي زمان وعلى كل لسان وجريها مجرى ما يستطاب ويلهي به الملوك عند الارق لما كتبتها وقد كانت العجائب كثيرة في ذالك الزمان الاول كبلوغ عمر الواحد من اهلها الف سنة وكطاعة الجن والشياطين للملوك ... وغيرها مما يطول ذكره (جلد اول ص مطبوعہ یورپ)

اسی طرح ہفت خوان رستم کے ذکر میں لکھا ہے، کہ یہ سب لغویات ہیں،

ابوریحان بیرونی آثار الباقیہ[۱] میں لکھتا ہے،

[۱] مطبوعہ یورپ ص۱۱،

وبهم فی التواریخ القدیمة الاولی
اعمار الملوک واقاصیصهم المشهورة
منهم ما به تنفر عن استماعه القلوب
وتمجه الاذان لا تقبله العقول

ایرانیوں نے پہلے زمانہ کی تاریخ لکھی ہے انہیں
سلاطین کی عمروں اور انکے کارناموں کے متعلق ایسی باتیں
بیان کرتے ہیں جنکے سننے سے دل اچٹتا ہے کان
انکو برداشت نہیں کر سکتے، عقل انکو قبول نہیں کرتی

بعض یوروپین مورخین کے نزدیک شاہنامہ کی بے اعتباری کی وجہ یہ ہے کہ اس کے واقعات یونانیوں کی تاریخ سے اکثر جگہ مخالف ہیں، لیکن اس عقدہ کو علامہ ثعلبی نے بہت پہلے حل کر دیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ "ہمارے پاس ایران کی تاریخ کے متعلق دو ماخذ ہیں، ایرانی اور یونانی، ہم جانتے ہیں کہ دونوں میں اختلاف ہے، لیکن یہ مسلم مسئلہ ہے کہ گھر کا حال گھر والا خوب جانتا ہے، اس لئے ہم نے یونانیوں کے مقابلہ میں ایرانیوں کا زیادہ اعتبار کیا"

محققین یورپ کی رائے یورپ نے نہایت جد وجہد سے اسلام کے قبل کی ایرانی تصنیفات کثرت سے ڈھونڈ نکالیں، اور اُن میں سے اکثر کو چھاپ کر شائع کیا، چنانچہ پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب کی پہلی جلد میں ایک خاص عنوان قائم کیا ہے "پہلوی لٹریچر" اس کے ذیل میں اُن تمام کتابوں کی فہرست اور اُن کے حالات لکھے ہیں، ان میں بعض کتابیں اسلام سے پانچ پانچ سو، چھ چھ سو برس پہلے کی تصنیف ہیں، ان میں سے جو کتابیں شاہان عجم کی تاریخ ہیں، اُن کا بیان حرف بحرف فردوسی سے مطابق ہے، انہی میں ایک کتاب کارنامک ارتخشتر ہے جو پہلوی زبان میں ہے، اور سنہ ۶۰۰ء یعنی زمانۂ اسلام سے کسی قدر پہلے کی تصنیف ہے، یہ کتاب اصل پہلوی زبان میں مع جرمنی ترجمہ کے شائع کی گئی ہے، اس کی نسبت براؤن صاحب لکھتے ہیں،

"جب اس کتاب کا شاہنامہ سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ

فردوسی نے بڑی ایمانداری برتی ہے، اور ہماری نظر میں اس کی وقعت یہ دیکھ کر اور بڑھ جاتی ہے کہ جن کتابوں سے اس نے شاہنامہ لکھا ہے، اُن سے ترتیب وار مطابقت پائی جاتی ہے،، جرمن کے مشہور فاضل پروفیسر نولدکی نے شاہنامہ کے ماخذ اور اس کی تاریخی حیثیت پر ایک مستقل کتاب جرمن زبان میں لکھی ہے، اس کے اقتباسات کا ترجمہ مسٹر براؤن نے انگریزی میں کیا ہے، اور اپنی کتاب کی جلد اوّل میں شامل کیا ہے،، ہم اس کے بعض ضروری مقامات کا ترجمہ نقل کرتے ہیں،

تاریخ وقدامت اوستا میں شاہنامہ کی فصلوں کا اتنا ذکر آچکا ہے کہ اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب اوستا تصنیف ہوئی تو اُس زمانہ میں اُن قومی فسانوں کی بڑی بڑی باتیں لوگوں کو معلوم تھیں، ان کی قدامت کا صرف یہی ایک ثبوت نہیں ہے کیونکہ نولدکی نے دکھلایا ہے کہ یونانی مصنّفوں کی کتابوں میں بھی جو انہوں نے شاہان ایران کے بارہ میں لکھی ہیں، ان بہادروں کا تذکرہ موجود ہے، خاص کر ڈی سی، ایش[۱] کی کتاب میں جو پانسو برس قبل حضرت مسیح، آرٹا زرکسٹ[۲] نیمن[۳] کا طبیب دربار تھا، اور اُس نے اپنی کتاب ایرانی تصانیف کی مدد سے لکھی ہے، یہ واقعات بار بار بیان ہوئے ہیں، بلکہ کبھی ایک خاندان سے منسوب ہوئے ہیں کبھی دوسرے سے، مثلاً سائرس[۴]، املی می نین[۵] کے پہلے بادشاہ کو جو واقعات میڈیا والوں سے لڑنے میں پیش آئے وہ اردشیر ساسانی اور اُس کی پارتھیوں[۶] کی جنگ کے حالات سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں، اسی طرح عقاب، سیمرغ اور ہما شاہ پسند پرندوں کا

---

۱ Achaememes ۲ Zariatrs ۳ Hystespes
۴ adatis ۵ Athessaeus ۶ Charas
۷ Yatkar-i-taniran

اسے کی می یتر زال[۱] اور اردوشیر کا محافظ ہونا، اسی طور پر تودیر گیانی اور ہیروز ساسانی کو تورانی دشمنوں سے قارین کے خاندان کے دو شخصوں کا بچانا اور ساسی قبیل سے دارا اور پیروز کی ملتی جلتی سرگذشتیں ہیں جو قابل غور ہیں،

یات کار زریراں | زریا ورپس[۱] برادر ہس ٹاس[۲] پیس اور شاہزادی اوڈ[۳] اتس کا قصہ ہم تک نے تھینس[۴] سے پہنچا ہے، یہ قصہ اس نے سکندر کی اس تاریخ سے لکھا ہے جو اس کے دیوان[۵] چارین نے تصنیف کی تھی، یہی داستان سب میں پرانی پہلوی کتاب یات کار زریراں[۶] میں بیان ہوئی ہے، جو پانسو برس قبل حضرت عیسیٰؑ کے لکھی گئی تھی، یہ چھوٹی مگر ضروری کتاب سب میں قدیم فارسی کتاب ہے جس میں بہادری کے قصے درج ہیں، گو اس میں ایک ہی قصہ ہے، مگر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے ان کل کہانیوں پر عبور ہے، اسی کتاب کو شاہنامہ گشتاسپ یا پہلوی شاہنامہ کہتے ہیں"

نولدکی کہتا ہے کہ" اگر ہم کو سراسر دھوکا نہ ہوا ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قصہ میں وہ رُوح موجود ہے جس کا وجود کئی اور قوموں کے بہادرانہ قصوں میں موجود ہے، خلاصۂ حال سب کو معلوم ہے، اس کے خاص خاص حصوں کو کوشش کر کے زینت دی گئی ہے، اور اس ڈھانچ میں تھوڑی سی کمی بیشی اور ترتیب سے کم وبیش ایک مسلسل اور پوری داستان تیار ہو سکتی ہے، اس قصے کے ضروری اجزا عربی کے اس مختصر ترجمہ میں موجود ہیں جو طبری نے کیا ہے، اور جو شاہنامہ کے بیان سے بالکل مطابق ہے، بعض جگہ تو لفظ بہ لفظ وہی ہے، اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اُسی عام قدیمی روایت سے لیا گیا ہے، جو شاہنامہ کا ماخذ ہے"

ف۱ Ctesias ف۲ Artaxerxes ف۳ Mnemon
ف۴ Cyrus ف۵ Achaemenian ف۶ Medes
ف۷ Parthians

اس نئی ترتیب سے جس کی طرف نولدکی نے اشارہ کیا ہے، وہ اضافہ اور اصلاح مراد ہے، جس سے مختلف حصّے ایک دُوسرے کا پیوند ہوکر ایک دلکش داستان بن جائیں اور کمی سے یہ غرض ہے کہ وہ باتیں اور الفاظ جو مسلمانوں کو ناگوار ہیں نہ آنے پائیں، جیسا فردوسی اور اوروں نے کیا ہے،

شاہنامہ کے ساسانی حصّہ کے متعلق ہمارے پاس ایک پہلوی کتاب کارنامک ارتخشتر پاپکاں اصل پہلوی اور جرمن میں موجود ہے، جب اس کتاب کا شاہنامہ سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی نے بڑی ایمانداری برتی ہے، اور ہماری نظر میں اس کی وقعت یہ دیکھ کر اور بڑھ جاتی ہے کہ جن کتابوں سے اس نے شاہنامہ لکھا ہے، اُن سے ترتیب وار مطابقت پائی جاتی ہے، کارنامک غالباً ۶۰۰ء میں تصنیف ہوئی اور اگاتھی اس کا جو ۵۸۰ء میں تھا شاہانِ ایران کی تاریخوں کا ساسان پاپک اور اردشیر کے حالات میں حوالہ دینا، اس بات کا زائد ثبوت ہے، کہ شاہنامہ کے مختلف قصّے اس زمانہ کی پہلوی کتابوں میں پائے جاتے تھے،

فردوسی کے شاہنامہ پر جو دیباچہ تیمور کے پوتے بایسنقر کے حکم سے ۱۴۲۵ء میں لکھ کر لگایا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دہقان دانشور کا پورا صحیح نسخہ اس ساری داستان کا کیومرث سے لے کر خسرو پرویز یعنی ۶۲۷ء تک کا یزدجرد ثانی آخری ساسانی فرماں روا کے عہد میں تیار ہوچکا تھا، اس پر نولدکی لکھتا ہے، کہ "یہ کتاب خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو، مگر عرب مورخوں کے ترجموں کا، فردوسی سے خسرو پرویز کی وفات تک مطابق ہوتا اور بعد کو مختلف، اس بارۂ خاص میں اُس کی صداقت کا ثبوت ہے، اور اُس کی انتہا درجہ کی ہمدردانہ کوشش اور حق پسندی سے پایا جاتا ہے، کہ وہ بادشاہ کی سرپرستی اور نگرانی میں تصنیف ہوئی تھی":

اس پہلوی خدائی نامہ کا جس کا حمزہ اور مصنفِ فہرست وغیرہ اور دیگر عرب مؤرخوں نے ذکر کیا ہے، ابن المقفع نے آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں عربی میں ترجمہ کیا اور اس ذریعہ سے تمام عربی دانوں کو اس کا حال معلوم ہو گیا، مگر نہایت افسوس ہے کہ یہ ترجمہ ضائع ہو گیا، اسی طرح وہ فارسی نظم کا ترجمہ جو ۹۵۷ء میں ابو المنصور المعمری کے حکم سے ہوا تھا، اور ہرات، سیستان، شاہ پور اور طوس کے چار پارسیوں نے، ابو منصور ابن عبد الرزاق حاکم طوس کے لئے کیا تھا، جیسا کہ البیرونی اور نولدکی نے لکھا ہے، اسی کی بنا پر دقیقی نے ایک شاہ نامہ نوح ابن منصور سامانی بادشاہ کے لیئے جو ۹۷-۹۶ء تک رہا، فارسی نظم میں لکھنا شروع کیا تھا، مگر سلطنت گشتاسپ اور زردشت کی آمد کے متعلق چند ہی ہزار شعر لکھنے پایا تھا کہ اُسے ایک تُرکی غلام نے مار ڈالا، یہ فردوسی ہی کا حصہ تھا کہ چند سال بعد اس نے قومی فسانے کو جو دقیقی نے شروع کیا تھا، ساٹھ ہزار اشعار میں جس میں دقیقی کے اشعار بھی شامل ہیں تکمیل کو پہنچایا، اتنا کہنا یہاں اور ضروری ہے کہ شاہنامہ قوم کا پورا پورا فسانہ ہے۔

داستان اردشیر | اس داستان کی جتنی کہانیاں، شاہنامہ اور کارنامک پہلوی میں پائی جاتی ہیں حسب تفصیل ذیل ہیں:-

(۱) ساسان جو بہمن دراز دست کی پانچویں پشت میں تھا، پاپک شاہِ فارس کے ہاں مویشی چرانے پر نوکر ہے، پاپک خواب دیکھتا ہے کہ ساسان نسلِ شاہی سے ہے، اُس سے بلطف و خوشی پیش آتا ہے، اپنی بیٹی کی اُس سے شادی کرتا ہے اور اردشیر اُس کے بطن سے پیدا ہوتا ہے،

(۲) پاپک اردشیر کو متبنی کرتا ہے، اس کے جوان ہونے پر اس کی دلاوری، عقلمندی اور شاہانہ خوبیوں کا تذکرہ اردوان (آخری بادشاہ آشکانی) تک پہنچتا ہے

وہ اردشیر کو طلب کرتا ہے، خاطر و مدارات سے پیش آتا ہے، ایک روز اردوان کے بیٹے کے ساتھ شکار کو جاتا ہے، اور وہ اردشیر کے مارے ہوئے شکار کو اپنا بتلاتا ہے، اس پر بے قدر ہو کر میر آخور اصطبل شاہی مقرر ہوتا ہے،

(۳) اردوان کی ایک معتمد ہوشیار اور نازنین پرستار اردشیر پر ترس کھاتی ہے اور دو تیز رفتار گھوڑے مہیا کر کے اس کے ساتھ فارس کو بھاگ جاتی ہے اردوان تعاقب کرتا ہے، مگر یہ سن کر کہ شوکتِ خسروی ایک خوبصورت مینڈھے کی شکل میں اردشیر تک پہنچ گئی ہے واپس آتا ہے،

(۴) اردشیر آشکانیوں وغیرہ سے لڑتا ہے، اردوان اور اس کے بیٹے کو شکست دیتا ہے اور خود کُردوں سے زک اُٹھاتا ہے،

(۵) داستان ہفتان بوخت (ہفتواد) اور کرم کرمانی مع جنگ مترک (مسرک)

(۶) اردوان اپنی بیٹی (اردشیر کی زوجہ) کو موت کا حکم سناتا ہے، ایک موبد جس کا نام ابرسام ہے اس کی جان بچاتا ہے، اسی کے پیٹ سے شاپور پیدا ہوتا ہے، اور باپ اس بچہ کو لے جاتا ہے،

(۷) اردشیر ہندوستان کے حاکم کید یا کیت سے یہ سن کر کہ ایران کی بادشاہت اس کے یا اس کے دشمن مترک کے گھرانے میں جائے گی، مترک کا استیصال کرتا ہے، اس کی ایک لڑکی قتل عام سے بچ کر کسانوں میں پرورش پاتی ہے، شاپور اسے دیکھ کر اس پر عاشق ہوتا ہے، اپنی شادی اور اپنے بیٹے ہرمزد کی پیدائش کو اپنے باپ اردشیر سے چھپاتا ہے، اور ہرمزد کو سات برس کی عمر میں چوگان کے میدان کی بہادری دیکھ کر اردشیر پہچان لیتا ہے،

ہر متنفس جس نے کارنامک اور شاہنامہ کا یہ حصہ ساتھ ساتھ پڑھا ہے اس بات کا اقرار کرے گا کہ شاہنامہ پورا چربہ کارنامک کا ہے، اس لئے کہ جزئیات

میں بھی اختلاف نہیں ہے، ہمارے اس خیال کو کہ فردوسی نے جن قدیم کتابوں سے شاہنامہ لکھا ہے اُن سے الگ نہیں کیا، پہلوی کے قصّہ زریر اور شاہنامہ کے مقابلہ سے اور بھی تقویت ہو جاتی ہے، یہ امر اتّفاقی ہے کہ ان حصّوں کا ہم اصل کتابوں سے مقابلہ کر سکے، مگر ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اَور مقامات پر بھی جہاں ہم کو جانچ پڑتال کے ذریعے حاصل نہیں ہیں وہاں بھی فردوسی نے ادنیٰ بات بھی قدیم ماخذوں کے خلاف نہیں لکھی ہوگی، یہاں ہم داستانِ اردشیر کی دونوں روایتوں میں سے صرف دو ایک باتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں، زیادہ گنجایش نہیں ہے، اوّل ہم اُس کی پیدایش کا ذکر کرتے ہیں ؛

کارنامک

سکندر رومی کی وفات پر ایران میں ۲۴۰ مختلف گروہوں کے لوگ حکمراں تھے ؛ اردوان ان سب میں سر برآوردہ تھا اور اصفہان، فارس اور قرب و جوار کے حصّہ پر قابض تھا، پاپک محافظ سرحد اور اردوان کی طرف سے فارس کا گورنر تھا اور اصطخر میں رہتا تھا، اس کے کوئی بیٹا نہ تھا، جس سے اس کا نام چلتا، ساسان پاپک کا گوالا تھا اور ہمیشہ اپنے گلّوں میں رہتا تھا، مگر وہ دارا ابن دارا کی اولاد میں تھا اور سکندر کے بُرے زمانہ میں وہ بھاگ کر گڈریوں میں جا ملا تھا، پاپک کو یہ بات معلوم نہ تھی، ایک رات اُس نے خواب میں دیکھا کہ ساسان کے سر سے سورج نکلا ہے، اور اس نے تمام عالم کو منوّر کر دیا ہے۔ دوسری رات دیکھا کہ ساسان ایک سپید ہاتھی پر جس پر قیمتی جھول پڑی ہوئی ہے، سوار جا رہا ہے اور تمام "کشور" کے لوگ اس کے ارد گرد ہیں، اس کی اطاعت کرتے ہیں اور دُعائیں دیتے ہیں، تیسری رات

سلہ شاہنامہ میں اسطرح لکھا ہوا ہے ؛

اس نے دیکھا کہ آتش فروبہ گشپ اور متھر، ساسان کے گھر میں روشن ہے اور ساری دُنیا میں اُجالا پھیلا ہوا ہے، ان خوابوں سے گھبرا کر اُس نے تعبیر دینے والوں اور دانشمندوں کو بُلایا اور اُن سے تینوں خواب بیان کئے، معبروں نے کہا یا تو وہ شخص جس کو آپ نے خواب میں دیکھا ہے یا اس کی اولاد میں سے کوئی شخص تمام دُنیا کا بادشاہ ہوگا، کیونکہ سُورج اور قیمتی جھول والا ہاتھی، زور، طاقت اور فتح کی علامت ہیں، آتش فروبہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو مذہب سے خوب واقف ہیں اور اپنے ہمسروں میں ممتاز ہیں، آتش گشپ سے جنگجو اور جنگوں کے سردار اور آتش برزین مہر سے دُنیا کے کاشتکار مراد ہیں، پس بادشاہت اُسے یا اُس کی اولاد کو ملے گی۔" پاپک نے یہ تقریر سُن کر سب کو رخصت کیا اور ساسان کو بُلا کر اس سے پُوچھا "تم کس خاندان اور نسل سے ہو تمہارے بزرگوں اور بڑکھوں میں سے کوئی بادشاہ ہوا ہے؟" ساسان نے کہا کہ اگر جان بخشی ہو تو عرض کروں، پاپک نے اجازت دی، ساسان نے اپنا راز فاش کر دیا اور سارا حال بتلا دیا، پاپک یہ سُن کر خوش ہوا اور کہا کہ میں تمہاری حالت بہتر کر دونگا، اور اس کے حکم دیتے ہی پُورا لباس شاہی آیا اور ساسان کو عطا ہوا، جب ساسان نے کہا پہنو، اُس نے پہن لیا، وہ پاپک کے حکم سے چند روز عمدہ غذائیں کھاتا رہا جس سے اس کے جسم میں طاقت آگئی، پاپک نے پھر اپنی لڑکی سے اس کی شادی کر دی، اور قسمت کی یاوری سے وہ حاملہ ہو گئی اور اس سے اردشیر پیدا ہوا،

فروبہ، فرہ باگ یا فرن باگ کی جگہ فردوسی نے خرید لکھا ہے، کارنامک کی عبارت جہاں ساسان کی آمد کا ذکر ہے، بڑی رُوکھی پھیکی ہے، فردوسی نے اپنے زورِ قلم سے اس میں جان ڈال دی ہے، اور یہ منجملہ اُن مقامات کے ہے جو فردوسی نے نہایت دلکش پیرایہ میں لکھے ہیں،

اشعار فارسی متعلّق قصہ بابک و ساسان

چو دارا به رزم اندروں کشته شد ——— همه دودہ را روز برگشته شد
پسر بد مر او را یکے شاد کام ——— خردمند و جنگی و ساساں به نام
ازاں لشکر روم بگریخت اوی ——— بدام بلا در نیا میخت اوی
به ہندوستاں در بزاری بمرد ——— ز ساساں یکے کودکے ماند خرد
بریں ہم نشاں تا چہارم پسر ——— ہمے نام ساسانش کردے پدر
چو کہتر پسر سوے بابک رسید ——— بدشت آمد و سرشباں را بدید
بدو گفت مزدورت آید بکار ——— کہ ایدر گزارد بہ بد روزگار
بہ پذرفت بدبخت را سرشباں ——— ہمی داشت با رنج روز و شباں
شبے خفته بد بابک روز یاب ——— چناں دید روشن روانش بخواب
کہ ساساں بہ پیل ژیاں بر نشست ——— گرفته یکے تیغ ہندی بہ دست
بہ دیگر شب اندر چو بابک بخفت ——— ہمی بود با لغرش اندیشه جفت
چناں دید در خواب کاتش پرست ——— سه آتش فروزاں به برّے بدست
چو آذر گشسپ و چو خرّاد و مہر ——— فروزاں چو بہرام و ناہید و مہر
ہمه پیش ساساں فروزاں بدے ——— بہر آتشے عود سوزاں بدے
سر بابک از خواب بیدار شد ——— روان و دلش پر ز تیمار شد
کسانیکہ در خواب دانا بدند ——— بداں دانش اندر توانا بدند
بہ ایوان بابک شدند انجمن ——— بزرگان فرزانه و رائے زن
چو بابک سخن برکشاد از نہفت ——— ہمه خواب یکسر بدیشاں بگفت
پر اندیشه شد زاں سخن رہنمائے ——— نہادہ بدو گوش پاسخ سرائے

سرانجام گفت اے سرافراز شاہ   بہ تاویل ایں کرد باید نگاہ
کسے را کہ بینی تو زینساں بخواب   بہ شاہی برآرد سر از آفتاب
گر ایدوں کہ ایں خواب ازو بگذرد   پسر باشدش کز جہاں برخورد
چو بابک شنید ایں سخن گشت شاد   براندازہ شاں یک بیک ہدیہ داد
بفرمود تا سرشباں از رمہ   بر بابک آمد بروز دمہ
بیامد دماں پیش او با گلیم   پُر از برف، پشمین و دل پُر ز بیم
بپرداخت بابک ز بیگانہ جائے   پدر شد پرستندہ و رہنمائے
ز ساسان بپرسید و بنواختش   بر خویش، نزدیک بنشاختش
بپرسیدش از گوہر و از نژاد   شباں زو بترسید و پاسخ نداد
ازاں پس بدو گفت کاے شہریار   شباں را بجاں گر دہی زینہار
بگویم ز گوہر ہمہ ہر چہ ہست   چو دستم بہ پیماں بگیری بدست؛
چو بشنید بابک زباں برکشاد   ز یزدان نیکی دہش کرد یاد
بہ بابک چنیں گفت ازاں پس جواں   کہ من پور ساسانم اے پہلواں
چو بشنید بابک فرو ریخت آب   ازاں چشم روشن کہ او دید خواب
بیاورد پس جامہ پہلوے   یکے اسپ با آلتِ خسروے
یکے کاخ پُر مایہ و را بساخت   ازاں سر شبانی سرش بر نواخت
بدو داد پس دُختر خویش را   پسندیدہ و افسر خویش را

کارنامک پہلوی اور شاہنامہ کے بیان میں بہت خفیف فرق ہے جو عموماً تاریخی واقعات میں ہوتا ہے،

مسٹر براؤن نے اور بھی چند داستانیں کارنامک اور شاہنامہ کی مطابقت دکھانے کے لئے درج کی ہیں، لیکن ہم نے طول کے لحاظ سے قلم انداز کیا۔

فردوسی کی وقعت شاعری کی حیثیت سے

عام اتفاق ہے کہ ایران میں اس درجہ کا کوئی شاعر آج تک نہیں پیدا ہوا، انوری اُن شعراء میں ہے، جن کو لوگوں نے فردوسی کا ہمسر قرار دیا ہے، چنانچہ مشہور ہے،

در شعر سہ تن پیمبرانند　　ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را　　فردوسی و انوری و سعدی

لیکن خود انوری کہتا ہے کہ فردوسی ہمارا خداوند ہے، اور ہم اُس کے بندے ہیں،

آفریں بر روانِ فردوسی　　آں ہمایوں نژاد فرخندہ
آں نہ اُستاد بود و ما شاگرد　　آں خداوند بود و ما بندہ

نظامی کہتے ہیں،

سخن گوی پیشینہ دانای طوس　　کہ آراست زُلفِ سخن چوں عروس

علامہ ابن الاثیر نے مثل السائر کے خاتمہ میں لکھا ہے، کہ "عربی زبان با وجود اس وسعت و کثرتِ الفاظ کے شاہنامہ کا جواب پیش نہیں کر سکتی، اور درحقیقت یہ کتاب عجم کا قرآن ہے"

یورپ کے فضلا بھی جو زبان فارسی سے واقف ہیں عموماً فردوسی کے کمالِ شاعری کے معترف ہیں، سرگور اوسلی نے "تذکرۃ الشعراء" میں فردوسی کو ہومر سے تشبیہ دی ہے، اگرچہ ساتھ ہی یہ نا توان بینی بھی ظاہر کی ہے کہ "وہ اگرچہ دراصل ہومر کا ہمسر نہیں ہو سکتا، لیکن ایشیا میں اگر کوئی ہومر ہو سکتا ہے تو وہی ہے"

لیکن تعجب اور سخت تعجب ہے کہ مسٹر براؤن جو آج کل فارسی دانانِ یورپ میں سب سے ممتاز ہیں، فردوسی کے کمالِ شاعری کے منکر ہیں، وہ اپنی کتاب لٹریری ہسٹری

آف پرشیا میں لکھتے ہیں کہ فردوسی کے بعد جو شعراء پیدا ہوئے وہ شاعرانہ خیالات اور شوکتِ الفاظ دونوں حیثیت سے فردوسی سے بالاتر ہیں، شاہنامہ سبعہ معلقہ کی بھی برابری نہیں کر سکتا" صاحب موصوف کو اس پر حیرت کہ شاہنامہ تمام اسلامی دُنیا میں اس قدر کیوں مشہور عام ہوگیا، پھر خود اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ شاہنامہ میں مسلمانوں کے اسلاف کی فخریہ داستانیں ہیں، اس لئے جب قوم نے اس کا سکہ جما دیا"

ہم ان سب باتوں کے جواب میں صرف یہ کہتے ہیں،

حریفِ کاوشِ مژگانِ خوں ریزش نۂ زاہد — بدست آور رگ جانی و نشتر را تماشا کُن

اب ہم شاہنامہ کے اوصاف کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں،

شاہنامہ کی خصوصیات

۱۔ اسلام کا خاصہ ہے کہ جہاں جہاں گیا مُلک کی زبان سرے سے بدل دی یا اس قدر اس کو مغلوب کر لیا کہ وہ مستقل اور آزاد زبان نہیں رہی، اسلام سے پہلے مصر و شام میں قبطی اور سریانی بولی جاتی تھی، اسلام کے ساتھ تمام مُلک کی زبان عربی ہوگئی یہاں تک کہ آج عیسائی یہودی وغیرہ بھی عربی زبان کے سوا اور کوئی زبان نہیں بول سکتے، ایشیائے کوچک اور قسطنطنیہ میں ترک گئے تو مُلکی زبان ترکی ہوگئی، کابل اور قندھار کی اصلی زبان پشتو ہے، لیکن خواص فارسی بولتے ہیں، جو اسلامی حکمرانوں کی زبان تھی، ایران اور ہندوستان سخت جان تھے، جہاں مُلک کی اصلی زبان قائم رہی لیکن عربی الفاظ اس کثرت سے داخل ہوگئے کہ ان کی آمیزش کے بغیر فارسی یا اُردو لکھنا چاہیں تو لزوم مالا یلزم کی محنت اُٹھانی پڑتی ہے،

پہلی خصوصیت

ایران میں ابتدا ہی سے عربی نہایت شدت سے مخلوط ہوگئی تھی، عباس مروزی نے مامون الرشید کی مدح میں جو قصیدہ لکھا، اس کے چار شعر آج موجود ہیں، جن میں نصف سے زیادہ عربی الفاظ ہیں، رودکی اور ابوشکور بلخی وغیرہ کا کلام عربی الفاظ سے

بھرا پڑا ہے، سلطان محمود کے زمانہ میں ایک فاضل نے شاہنامہ کے جواب میں عمر نامہ ایک کتاب نثر میں لکھی تھی، وہ ہماری نظر سے گزری ہے، اس کا بھی یہی حال ہے، اسی زمانہ میں شیخ بو علی سینا نے حکمت علائیہ فارسی زبان میں لکھی اور قصد کیا کہ خالص فارسی میں لکھی جائے، لیکن عہدہ برآ نہ ہوسکا، فردوسی کی قدرت زبان دیکھو کہ ساٹھ ہزار شعر لکھ کر ڈال دیئے، اور عربی الفاظ اس قدر کم ہیں کہ گویا نہیں ہیں، اگرچہ اس خصوصیت کا موجد دقیقی ہے، لیکن کل ہزار شعر اور صرف چند معمولی واقعات ہیں، بخلاف اس کے فردوسی نے ہر قسم اور ہر طرح کے سینکڑوں گوناگوں مطالب ادا کئے اور زبان کے خالص ہونے میں فرق نہ آنے پایا، عربی کے جو الفاظ خال خال آئے ہیں اکثر وہ ہیں جو خاص مصطلح الفاظ ہیں، مثلاً دین، میمنہ، میسرہ، قلب، سلاح، عناں وغیرہ وغیرہ، یہ الفاظ اس طرح اس زبان میں شائع تھے، جس طرح آج کل اردو میں جج، کلکٹر، ٹکٹ، اسٹیشن وغیرہ ہیں کہ ان کے بجائے اگر کوئی شخص اور الفاظ استعمال کرے تو ناموزوں معلوم ہوں گے،

حیرت وہاں ہوتی ہے جہاں فلسفیانہ اصطلاحیں آتی ہیں اور وہ اس بے تکلفی سے سادی فارسی میں ان کو اس طرح ادا کرتا ہے، کہ گویا روزمرہ کی باتیں ہیں، بوعلی سینا نے بھی حکمت علائیہ میں یہ کوشش کی، لیکن اس کا نمونہ دیکھو، ابطال غیر متناہی کے استدلال میں لکھتا ہے،

"پیشی و پسی بالطبع است چنانکہ اندر شمار ست ما بہ عرض چنانکہ اندر اندازہ است کہ از ہر کدام سو کہ خواہی آغاز کنی و ہر چہ اندر وے پیشی و پسی است بالطبع باشے مقداری ست کہ او را بہرہ ہا بہر جا کہ بوند ہمہ بیک جاے حاصل و موجود بود شے متناہی است"

غور کرو اس کوشش کے ساتھ کس قدر عربی الفاظ اب بھی باقی رہ گئے اور جن عربی

الفاظ کا فارسی میں ترجمہ کیا وہ اس قدر نامانوس اور بیگانہ ہیں، کہ عبارت معمّا ہو کر رہ گئی،

عبارت کا مطلب یہ ہے کہ دو چیزوں میں جب تقدّم و تاخر ہوتا ہے تو دو طریقہ سے ہوتا ہے، بلا واسطہ جس طرح ایک عدد دو پر مقدم ہے، یا بواسطہ جس طرح مسافت میں آگا پیچھا ہوتا ہے کہ گو ایک حصہ کو مقدم اور دوسرے حصہ کو موخر کہتے ہیں، لیکن جہاں سے چاہیں مسافت کو شروع کر سکتے ہیں، اب قاعدہ یہ ہے کہ کسی چیز میں بالطبع تقدم و تاخر ہوگا، ضرور ہے، کہ اس میں مقدار ہو اور مقدار کے تمام اجزاء مرتب ہوں، یہ بھی ضرور ہے، کہ ایسی چیز متناہی ہو،

غور کرو، بوعلی سینا کی عبارت سے کیا کوئی شخص یہ مطلب سمجھ سکتا ہے؟

فردوسی نے آغاز کتاب میں مخلوقات کی پیدائش کی ابتداء عناصر کا وجود، اور ان کی ترتیب اور انقلابات لکھے ہیں،

از آغاز باید کہ دانی درست　　سرمایۂ گوہراں از نخست،

کہ یزداں ز ناچیز چیز آفرید　　بداں تا توانائی آمد پدید،

وز و مایۂ گوہر آمد چہار　　برآوردہ بے رنج و بے روزگار

نخستیں کہ آتش ز جنبش دمید　　ز گرمیش پس خشکی آمد پدید

وزاں پس ز آرام سردی نمود　　ز سردی، ہاں باز تری فزود

چو ایں چار گوہر بجائے آمدند　　ز بہر سپنجی سرائے آمدند

گیا رست، با چند گونہ درخت　　بزیر اندر آمد سراں شان رحت

ببالد ندارد جزیں نیروے　　نہ پوید چو پویندگاں ہر سوے

نگہ کن بریں گنبد تیز گرد　　کہ درماں ازوی است وزوی است درد

نہ گشت زمانہ بفرسایدش،　　نہ ایں رنج و تیمار بگزایدش

نہ از گردش آرام گیرد ہمی　　نہ چوں ما تباہی پذیرد ہمی

یونانیوں کے نزدیک آفرینش کی ابتدا اور اس کی تاریخ یہ ہے کہ خدا نے مادہ پیدا کیا، مادّہ سے عناصر پیدا ہوئے، حرکت سے آگ پیدا ہوئی، آگ کی گرمی نے یبوست پیدا کی جس سے خاک کا وجود ہوا، پھر سکون کی وجہ سے رطوبت پیدا ہوئی، رطوبت نے پانی پیدا کیا، اِس طرح چار عنصر پیدا ہوئے، پھر نباتات کا وجود ہوا، جن میں صرف نمو کی قوت ہے، متحرک بالارادہ نہیں،

آسمان کی نسبت یونانیوں کا خیال تھا کہ وہ ابدی ہیں، اور امتدادِ زمانہ سے ان میں تغیّر اور زوال نہیں ہو سکتا، فردوسی نے ان مسائل کو ایسے سادہ اور صاف الفاظ میں ادا کیا ہے کہ معمولی باتیں معلوم ہوتی ہیں، اور یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ ان میں فلسفیانہ اصطلاحیں ہیں، لیکن درحقیقت سب فلسفہ کے خاص الفاظ ہیں، ان کے مقابل کے عربی الفاظ دیکھو،

سرمایہ	مادّہ	توانائی	وجود
گوہر	عنصر	جُنبش	حرکت
آرام	سکون	پوینده	متحرک بالارادہ
گشتن	دوران	فرسودن	تغیّر
تباہی	فنا		

اِس طرح اور بہت سے الفاظ ہیں، ہم نے صرف نمونہ دکھایا ہے،

دوسری خصوصیت

۲- ایشیائی تاریخوں کے متعلق عام شکایت ہے کہ ان میں بجز جنگ و خونریزی کے اور کچھ نہیں ہوتا، یعنی وہ حالات بالکل نہیں ہوتے جن سے اس زمانہ کے ملکی معاملات اور قوم کی تہذیب و معاشرت کا حال کھُل سکے، یہ شکایت بہت کچھ صحیح ہے لیکن شاہنامہ اس سے مستثنیٰ ہے، شاہنامہ اگرچہ بظاہر صرف رزمیہ نظم معلوم ہوتی ہے، لیکن عام واقعات کے بیان میں اس تفصیل سے ہر قسم کے حالات آتے

جاتے ہیں کہ اگر کوئی شخص چاہے تو صرف شاہ نامہ کی مدد سے اُس زمانہ کی تہذیب و تمدّن کا پُورا پتہ لگا سکتا ہے، بادشاہ کیونکر دربار کرتا تھا، امراء کس ترتیب سے کھڑے ہوتے تھے، عرض معروض کرنے کے کیا آداب تھے، انعام و اکرام کا طریقہ کیا تھا، بادشاہ اور امراء کا درباری لباس کیا ہوتا تھا؟ فرامین اور توقیعات کیونکر اور کس چیز پر لکھے جاتے تھے، نامہ و پیام کا کیا انداز تھا، مُجرموں کو کیونکر سزائیں دی جاتی تھیں، بادشاہی احکام پر کیونکر نکتہ چینی کی جاتی تھی، وغیرہ وغیرہ،

شادیوں کے کیا مراسم تھے، جہیز میں کیا دیا جاتا تھا، عروسی کی کیا کیا رسمیں تھیں، دُولھا اور دلھن کا کیا لباس ہوتا تھا، پیش خدمت، غلام اور لونڈیوں کی وضع اور انداز کیا تھا،

خط کتابت کا کیا طریقہ تھا، کس چیز سے ابتدا کرتے تھے، خاتمہ کی عبارت کیا ہوتی تھی، خطوط کس چیز پر لکھے جاتے تھے، ان کو کیونکر بند کرتے تھے، کس چیز کی مُہر لگاتے تھے،

مالگزاری کے ادا کرنے کا کیا دستور تھا، زمینوں کی کیا تقسیم تھی، مالگذاری کی مختلف شرحیں کیا تھیں، ٹیکس کیا کیا تھے، کون کون لوگ ٹیکس سے معاف ہوتے تھے،

یہ تمام باتیں شاہنامہ سے بہ تفصیل معلوم ہوتی ہیں، نمونہ کے طور پر ہم چند مثالیں نقل کرتے ہیں،

(۱) بیژن کی مہم میں کیخسرو نے رستم کو زابل سے بلایا ہے، اور اُس کے لئے باغ میں دربار کیا ہے، دربار میں تختِ زریں بچھایا گیا ہے، اس پر ایک مصنوعی درخت نصب ہے، جس کا سایہ بادشاہ پر پڑتا ہے، درخت چاندی کا ہے، یاقوت کی شاخیں ہیں، موتیوں کے خوشے دانے ہیں، زریں ترنج اور سیب پھلے ہوئے ہیں،

جو مجوف ہیں، اور اُن کے اندر مشک کا برادہ ہے، ہوا جب چلتی ہے تو مشک جھڑتی ہے، اسی کے قریب قریب وہ فرش تھا جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایران کی فتح میں آیا تھا) ان تمام باتوں کو فردوسی نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے،

در باغ بگشادہ سالار بار ۔ نشستگہے ساخت بس شاہوار
بفرمود تا تاج زرین و تخت ۔ نہادند زیر گل افشاں درخت
درختے زدند از بر گاہ شاہ ۔ کجا سایہ گستر و بر تاج و گاہ
تنش سیم و شاخش ز یاقوت زر ۔ برو گونہ گوں خوشہ ہائے گہر
عقیق و زبرجد، ہمہ برگ و بار ۔ فروہشتہ از شاخ چوں گوشوار
ہمہ بار زریں ترنج و بہی ۔ میان ترنج و بہی بُد تہی
بدو اندروں مشک سودہ بمے ۔ ہمہ پیکرش سفتہ برسان نے
کرا شاہ بر گاہ بنشاندے ۔ برو باد زاں مشک بفشاندے
بیامد نشست او بہ زرینہ تخت ۔ پس بر برش ریزندہ مشک از درخت
ہمہ مے گساراں بہ پیش اندرا ۔ ہمہ بر سراں افسر از گوہرا
ہمہ طوق بر سینہ و گوشوار ۔ ہمہ بر ہمہ جامۂ زرنگار

(۲) افراسیاب نے جب اپنی بیٹی فرنگیس کی شادی سیاوش سے کی ہے، اور فرنگیس سیاوش کے گھر آئی ہے، تو اُس کی مہمانی اور عروسی کے ساز و سامان کو اس طرح بیان کیا ہے،

بہ گنج آنچہ بد اندروں نامدار ۔ گزیدند زربفت چینی ہزار
زبرجد طبقہا و فیروزہ جام ۔ پُر از نافۂ مشک پُر عود خام
دو افسر پُر از گوہر و گوشوار ۔ دو یارہ، یکی طوق و دو گوشوار
ز گسترد نیہا شتر وار سی ۔ ز زربفت پوشیدنیہا سہ دست

یکے تخت زرّیں دکُرسی چہار　　سہ نعلین زرّیں زبرجد نگار

پرستندہ سی صد بہ زرّیں کلاہ　　زخویشان نزدیک صد نیک خواہ

پرستار با جام زرّیں دویست　　تو گفتی بایوان دروں جائے نیست

ہمی صد طبق مشک صد زعفران　　ہمی رفت گل شہر با خواہران

اسفندیار کا تابوت رُستم نے روانہ کیا تھا، تابوت کے مراسم دیکھو،

یکے نغز تابوت کرد آہنیں　　بگسترد فرشے ز دیبائے چین

در اندر دو یک رویۂ آہن بہ قیر　　پراگند بر قیر مشک و عبیر

وزاں پس کہ پوشید روشن برش　　ز پیروزہ بر سر نہاد افسرش

چہل اُشتر آورد رستم گزیں　　ز بالا فروہشتہ دیبائے چین

یکے اُشترے زیر تابوت شاہ　　چپ و راست اُشتر پس اندر سپاہ

پشوتن، ہمی رفت پیش سپاہ،　　بریدہ فش و دم اسپ سیاہ

برو بر نہادہ نگونسار زین،　　ز زیں اندر آویختہ گرز کیں

ہماں نامور خود و خُفتان اوے　　ہماں ترکش و مغفر جنگجوے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں کسی امیر کا جنازہ نکلتا تھا تو لوہے کے تابُوت میں رکھ کرلے جاتے تھے، تابُوت کے ایک رُخ کو سیاہ رنگ سے رنگ دیتے تھے، پھراس پر مشک و عنبر چھڑکتے تھے، میّت کو کپڑے پہناتے تھے اور سر پر تاج رکھتے تھے، تابُوت کو اُونٹ پر محمل میں رکھتے تھے، اور اس کے دائیں بائیں اور بہت سے اُونٹ ساتھ ساتھ چلتے تھے، پیچھے فوج ہوتی تھی، میّت کی سواری کا گھوڑا ساتھ ہوتا تھا، اس کی یال اور دُم کاٹ دیتے تھے، زین اُلٹ کر رکھتے تھے، میّت کے اسلحۂ جنگ زین پر لٹکتے چلتے تھے،

تیسری خصوصیت

(۳) ایشیائی شعرا کا عام قاعدہ ہے کہ کسی داستان کے بیان کرنے میں حسن و عشق کا

کہیں اتفاقی موقع آجاتا ہے، تو اس قدر پھیلتے ہیں، کہ تہذیب و متانت کی حد سے کوسوں آگے نکل جاتے ہیں، نظامی اور جامی جیسے مقدس لوگ اس حمام میں آکر ننگے ہو جاتے ہیں، لیکن فردوسی باوجود اس کے کہ اس کو تقدس کا دعویٰ نہیں ایسے موقعوں پر آنکھ نیچی کئے ہوئے آتا ہے، اور صرف واقعہ نگاری کے فرض کے لحاظ سے ایک سرسری غلط انداز نگاہ ڈالتا ہوا گزر جاتا ہے، بیژن اور منیژہ کی صحبت عیش کو جہاں لکھا ہے، لکھتا ہے،

نشستند گردو دمی ساختند ۔۔۔ ز بیگانہ خرگہ بپرداختند
پرستندگاں ایستادہ بہ پاے ۔۔۔ ابا بربط و چنگ و رامش سراے
بہ دیبا زمیں کردہ طاؤس رنگ ۔۔۔ ز دینار و دیبا چو پشت پلنگ
چہ از مشک و عنبر چہ یاقوت و زر ۔۔۔ سرا پردہ آراستہ سر بسر
مے سالخوردہ بہ جام بلور ۔۔۔ بر آوردہ با بیژن گیو زور،
سہ روز و سہ شب شاد بودہ بہم ۔۔۔ گرفتہ بر او خواب مستی ستم

زال اور رودابہ کے عاشقانہ اختلاط میں زیادہ پھیلا ہے، پھر بھی یہ رنگ ہے،

گرفت آں زماں دست دستاں بدست ۔۔۔ برفتند ہر دو بکردار مست
سوئے خانۂ زرنگار آمدند ۔۔۔ بداں مجلس شاہوار آمدند
شگفت اندراں ماہ بد زال زر ۔۔۔ بداں روئے و بالاوآں موی و فر
دو رخسارہ چوں لالہ اندر چمن ۔۔۔ سر جعد زلفش شکن در شکن
ز دیدنش رودابہ می نارمید ۔۔۔ بدزدیدہ در وے ہمی بنگرید
ہمی بود بوس و کنار و نبید، ۔۔۔ مگر شیر کو گور را نشکرید[۱]

۴۔ عام خیال ہے کہ فردوسی بزم اچھی نہیں لکھتا، بے شبہہ یوسف زلیخا میں اس کی

بزم کی خصوصیت

۱؎ یعنی، دیکھو شیر نے گور خر کو پا کر شکار نہیں کیا،

شاعری کا رُتبہ بہت گھٹ گیا ہے، لیکن یہ اس کے رنج و غم اور دل شکستگی کا زمانہ تھا، جب اس کے تمام جذبات افسردہ ہو چکے تھے، یوسف زلیخا لکھنے سے اس کا مقصد صرف مذہبی جماعت کو خوش کرنا تھا، جو اتنی بات پر فردوسی سے ناراض تھے کہ اس نے مجوسیوں کی مدح و ثنا میں کیوں اس قدر اوقات صرف کی، لیکن شاہنامہ میں جہاں جہاں بزم کا موقع آیا ہے، شاعری کا چمن زار نظر آتا ہے،

زال رودابہ پر عاشق ہوا ہے، اس کے شوق میں گھر سے نکلا ہے، اس کو خبر ہوتی ہے وہ لب بام آ کر کھڑی ہوتی ہے، زال کوٹھے کے برابر آ کر اوپر جانے کی تدبیریں سوچتا ہے، رودابہ اپنی چوٹی کھول کر لٹکا دیتی ہے کہ اس کے سہارے چڑھ آئے، زال زلف کو بوسہ دیتا ہے، اور کمند ڈال کر کوٹھے پر اُترتا ہے، دونوں مل جل کر بیٹھتے ہیں، لطف و محبت کی باتیں ہوتی ہیں، شراب کا دور چلتا ہے، یہ سماں دیکھو کس طرح دکھایا ہے،

سپہبد سوے کاخ بنہاد روے ـ چناں چوں بود مردم جفت جوے
برآمد سیہ چشم گل رخ بہ بام ـ چو سرو سہی بر سرش ماہ تام
چو از دور دستان سام سوار ـ پدید آمد آں دختر نامدار
دو بیجادہ بکشاد و آواز داد ـ کہ شاد آمدی اے جواں مرد شاد
پریروے گفت و سپہد شنود ـ ز سر شعر گلنار بکشاد زود
کمندی گشاد او ز سرو بلند ـ کس از مشک زاں ساں نہ پیچد کمند
خم اندر خم و مار بر مار بود ـ براں عنبریں تار بر تار بود
فروہشت گیسو ازاں کنگرہ ـ کہ باز ید و شد تا بہ بن یکسرہ
پس از بارہ رودابہ آواز داد ـ کہ اے پہلواں بچۂ گرد زاد
بگیر ایں سر گیسو از یک سویم ـ ز بہر تو باید ہمے گیسویم

بداں پروردایندم ایں تار را — کہ تا دستگیری کند یار را
نگہ کرد زال اندراں ماہروے — (تعجب) شگفتی بماند اندراں روو موئے
بسائید مشکیں کمندش بہ بوس — کہ بشنید آواز بوسش عروس
چنیں داد پاسخ کہ ایں نیست داد — چنیں روز خورشید روشن مباد
کمند از رہے بند و داد خم — بیفگند بالا، نزد ہیچ دم
بہ حلقہ در آمد سر کنگرہ — بر آمد ز بُن تا بسر یکسرہ
چو بر بام آں بارہ بنشست باز — بیامد پری روے و برد ش نماز

(آگے کے اشعار اوپر گذر چکے)

تم کہوگے کہ رودابہ نے زال کو کہیں جواں مرد، کہیں پہلوان بچہ کہہ کے خطاب کیا ہے، اور خود فردوسی رودابہ کی تعریف میں بالا اور فر وغیرہ الفاظ استعمال کرتا ہے، حالانکہ بزم کی لطافت اور نزاکت ان الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتی، لیکن یہ فردوسی کی نکتہ سنجی اور بلاغت شعاری کی دلیل ہے، اس کو معلوم ہے کہ وہ کابل و زابلستاں کے محبوب کا ذکر کر رہا ہے، لکھنؤ کا نہیں، وہاں کے لوگ آج بھی اپنے پیارے اور چہیتے کی نسبت یہی الفاظ بولتے ہیں، کابل کا معشوق لکھنؤ کی طرح دھان پان نہیں ہوتا، بلکہ بالیدہ قامت، پُر اندام، اور تنومند ہوتا ہے، اس لئے بالا اور فر کا لفظ وہاں کے معشوق کی اصلی تصویر ہے،

بیژن جب افراسیاب کی سرحد میں پہنچتا ہے، تو گرگیں نے اس سے بیان کیا کہ یہاں سے پاس ایک مرغزار ہے، جہاں سال میں ایک دفعہ افراسیاب کی بیٹی منیژہ سہیلیوں کے ساتھ سیر کو آتی ہے، اور ہفتوں رہتی ہے، دیکھو فردوسی نے اس موقع پر مرغزار کی بہار اور پریرویوں کے جھرمٹ کی تصویر کس طرح کھینچی ہے،

ہمہ بیشہ و باغ و آبِ رواں — یکے جایگاہ از درِ پہلواں

زمیں پرنیان و ہوا مشک بوے — گلابست گوئی مگر آب جوی
خم آوردہ از بار شاخ سمن — منم شد گل و گشت بلبل شمن
خراماں بہ گرد گلاں بر تدرو — خروشیدنِ بلبل از شاخِ سرو
پری چہرہ بینی ہمہ دشت و کوہ — بہر سو بہ شادی نشستہ گروہ
ہمہ دخت ترکانِ پوشیدہ روئے — ہمہ سرو قد و ہمہ مشک بوے
ہمہ رُخ پُر از گل، ہمہ چشم خواب — ہمہ لب پُر از مے بہ بوی گلاب

اخیر شعر پر غور کرو "ہمہ چشم خواب" کے مبالغہ اور بیساختگی پر متاخرین کے ہزاروں تکلفات اور مضمون آفرینیاں نثار ہیں،

ایک اور موقع پر ایک پری چہرہ کی تصویر کھینچتا ہے،

دو ابرو کمان و دو گیسو کمند — بہ بالا بہ کردار سرو بلند
دو برگِ گلش سوسن می سرشت — دو شمشاد عنبر فروش از بہشت [بگوش]
بناگوش تابندہ خورشید وار — فروہشتہ زو حلقۂ گوشوار
لباں از طبرزد زباں از شکر [مصری] — دہانش مکلل بہ در و گہر،

ان سادہ اور فطری مبالغوں کو دیکھو "لبان از طبرزد زباں از شکر"

لیکن یہ نہ سمجھنا کہ وہ مضمون آفرینی اور خیال بندی کے تکلفات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، اس انداز میں بھی وہ کسی سے کم نہیں،

بہ دنبالِ چشمش یکے خال بود — کہ چشم خودش، ہم بدنبال بود

سہراب نے جب ایران کی سرحد میں پہنچ کر قلعہ سپید کا محاصرہ کیا ہے تو قلعہ سے ایک عورت مردانہ لباس پہن کر نکلی ہے، اور سہراب سے جنگ آزما ہوئی ہے، دیر تک رد و بدل کے بعد سہراب نے اس کو گرفتار کیا، خلم[1] چہرے سے ہٹی تو معلوم ہوا کہ

---

[1] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پردہ کی رسم ایرانیوں میں بھی قدیم سے ہے،

عورت ہے، سہراب فریفتہ ہوگیا، لیکن عورت فریب دے کر نکل گئی، سہراب، اب سپہگری چھوڑ کر عشق کا دم بھرنے لگا، دیکھو فردوسی اُس کے نالۂ وزاری کو کس طرح ادا کرتا ہے،

ہمی گفت ازاں پس دریغا دریغ — کہ شد ماہ تابندہ در زیر میغ

غریب آہوئے آمدم در کمند — کہ از بند جست و مرا کرد بند

عجب ہرن میری کمند میں آیا — کہ خود چھوٹ کر نکل گیا اور مجھ کو قید میں ڈال گیا

زہی چشم بندے کہ آں پُر فسوں — بہ تیغم نہ خست و مرا ریخت خوں

اس شعبدہ کو دیکھو کہ اس جادوگر نے — مجھ کو تلوار نہیں ماری لیکن میں قتل ہوگیا

ندانم چہ کرد آں فسوں گر بہ من — کہ نا گہ مرا بست راہِ سخن

بہ زاری مرا خود بباید گریست — کہ دلدار خود را ندانم کہ کیست

ہمی گفت و میسوخت از غم بسے — نمی خواست رازش بداند کسے

ولے عشق پنہاں نماند کہ راز — بر مردم نماید، ہمی اشک باز

غم جاں برآرد خروش از دروں — اگر چند عاشق بود ذو فنوں

اِن شعروں میں عشقیہ شاعری کی تمام ادائیں موجود ہیں، استعارات اور تشبیہات کا بھی ہلکا سا رنگ ہے، شاعرانہ ترکیبیں بھی ہیں، ع کہ از بند جست و مرا کرد بند، ع بہ تیغم نہ خست و مرا ریخت خوں، یہ سب کچھ ہے، لیکن فردوسی اس بات کو نہیں بھولا کہ وہ سہراب کی داستان لکھ رہا ہے، محمد شاہ و واجد علی شاہ کی نہیں، اِس لئے فوراً سہراب کو ہومان کی زبان سے نصیحت کرتا ہے، اور دیکھو ایک حوصلہ مند فاتح کی نصیحت کا کیا انداز ہے،

ازاں کار ہومان بنوشس خبر — کہ سہراب را ہست خوں در جگر

ولے زو فراست بدل نقش بست — کہ او را پریشانیے داد دست

بدامِ کسے پاے بند آمدہ است — ز زُلفِ بُتے در کمند آمدہ است

نہاں میکند درد و غمگین دل است ۔۔۔ ہوس میرود راہ و پا در گل است
یکے فرصتے جست و گفتش براز ۔۔۔ کہ اے شیر دل گرد گردن فراز
فریب پری پیکران جوان ۔۔۔ نخواہد کسے کو بود پہلوان
نہ رسم جہانگیری و سروری است ۔۔۔ کہ از مہر ماہے بباید گریست
ز توران بہ کارے بروں آمدیم ۔۔۔ شناور بدریائے خوں آمدیم
اگرچند ایں کار باشد بہ کام ۔۔۔ و لے ہست در پیش رنجے تمام
بباید شہنشاہ کاؤس و طوس ۔۔۔ چو رستم کہ بر شیر دارد فسوس

پھر بہت سے ایرانی پہلوانوں کے نام گنا کر کہتا ہے،

توئی مرد میدان ایں سروران ۔۔۔ چہ کارت بہ عشق پری پیکران
تو کارے کہ داری نہ بردی بسر ۔۔۔ چرا دست بازی بہ کار دگر
بہ نیروی مردی جہاں را بگیر ۔۔۔ ز شاہاں بدست آر تاج و سریر
چو کشور بدست تو آید فراز ۔۔۔ بہر جائے خوباں برندت نماز
ازاں گفتہ سہراب بیدار شد ۔۔۔ دلش بستۂ بند پیکار شد
بگفت اے سر نامداران چنین ۔۔۔ بگفتار خوبت ہزار آفریں
شد ایں گفت تو داروی جان من ۔۔۔ کنوں با تو نو گشت پیمان من
جہاں را سراسر چہ خشک و چہ آب ۔۔۔ در آرم بفرمان افراسیاب
بگفت ایں و دل راز دلبر بکند ۔۔۔ بر آمد برا فراز تختے بلند

دیکھو شجاع دام عشق میں اتفاقاً پھنس بھی جاتا ہے تو کس طرح جلد چھوٹ کر نکل جاتا ہے، فردوسی نے موقع پاکر عشقیہ شاعری کا کمال بھی دکھلا دیا، اور پھر متانت اور شایستگی کا سر رشتہ کہیں ہاتھ سے نہ چھوٹا، متاخرین بلکہ نظامی و سعدی کو بھی اتنا سہارا ہاتھ آجاتا تو خدا جانے کہاں سے کہاں نکل جاتے،

پانچویں خصوصیت

(۵) شاعری کا اصل کمال واقعہ نگاری اور جذبات انسانی کا اظہار ہے، ان دونوں باتوں میں وہ تمام شعراء کا پیشرو اور امام ہے، وہ جس واقعہ کو لکھتا ہے، اس کے تمام جزئیات اور گردوپیش کے ہر قسم کے حالات اور واقعات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پیدا کرتا ہے، پھر ان کو اس خوبی کے ساتھ ہو بہو ادا کرتا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اور شعرا یا تو واقعہ کے متعلق چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر ڈالنا ضروری نہیں سمجھتے یا سمجھتے ہیں لیکن طبیعت فطرت شناس نہیں ہوتی، اس لئے باریک باتوں پر نظر نہیں پڑتی، یا پڑتی ہے، لیکن زبان پر قدرت نہیں کہ جُوں کا تُوں ادا کر دیں، اس لئے یا بات کو بدل کر کہتے ہیں یا استعارات و تشبیہات کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، تم دیکھتے ہو کہ فردوسی استعارہ کے پاس ہو کر نہیں نکلتا، تشبیہیں وہی پاس پاس کی لیتا ہے، مجاز کو بہت کم ہاتھ لگاتا ہے، اس کی یہ وجہ نہیں کہ وہ ان باتوں میں قاصر ہے، بلکہ وہ جانتا ہے کہ یہ چیزیں واقعہ کے چہرہ پر نقاب ڈال دیتی ہیں، اور اس کا اصلی خط و خال نظر نہیں آتا، غور کرو، یہ لکھنا مقصود ہے کہ خاقان چین ہاتھی پر ہے، رستم نے کمند پھینکی اور اس کو گرفتار کر کے ہاتھی سے ٹپک دیا، فردوسی اس کو اس طرح ادا کرتا ہے،

چو از دست رستم رہا شد کمند   سر شہر یار اندر آمد بہ بند
زپیل اندر آورد و زد بر زمیں   بربستند بازوے خاقان چین

نظامی کو اسی قسم کا موقع پیش آتا ہے وہ کہتے ہیں،

کمند عدو بند را شہر یار   بینداخت چوں چنبر روزگار

بے شبہ عدو بند کے لفظ سے جملہ کی ترکیب چست ہوگئی "چنبر روزگار" کی تشبیہ نے بھی ندرت پیدا کی، یہ سب کچھ ہوا لیکن سننے والے پر یہ اثر ہوا کہ اصل واقعہ کے بجائے اس کی توجہ الفاظ اور تشبیہ کی طرف متوجہ ہوگئی، اور کمند میں گرفتار ہونے کی اصلی حالت سامنے نہ آسکی، یہی نکتہ ہے کہ فردوسی واقعات اور جذبات کے بیان کرنے میں استعارات

اور تشبیہات وغیرہ سے بہت کم کام لیتا ہے، اور جب اس کو طباعی اور انشاپردازی کا زور دکھانا ہوتا ہے، تو دوسرے موقعے تلاش کرتا ہے، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آتی ہے،

واقعہ نگاری کے دقیق نکتوں پر اس کی نظر جس طرح پڑتی ہے، اس کی ایک دو مثالیں ہم لکھتے ہیں،

'پہلوان جب جوشِ شجاعت میں لبریز ہوتا ہے تو اکثر یہ ہوتا ہے کہ لڑائی بھڑائی کچھ نہیں، تنہا بیٹھا ہے، لیکن آپ ہی آپ بھرا پڑتا ہے؛ اور جوش میں آپے سے باہر ہوا جاتا ہے، سہراب جب ایرانی فوج کے ایک ایک سردار پر نظر ڈال کر، ہجیر سے ان کا نام ونشان پوچھتا ہے تو اس کی نظر رستم پر پڑتی ہے، اور ہجیر سے کہتا ہے، یہ کون شخص ہے، جس کی یہ حالت ہے کہ

بخود ہر زماں بر خروشد ہمے	تو گوئی کہ دریا بجوشد ہمے
آپ ہی آپ بپھر رہا ہے	اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا دریا جوش مارتا ہے

ایک جسیم اور تناور پہلوان کبھی تخت پر بیٹھا ہوتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سارے تخت پر چھایا جاتا ہے، اس حالت کو فردوسی نے اُس موقع پہ جب رستم سہراب کے دیکھنے کو گیا ہے اور سہراب تخت پر بیٹھا ہوا اپنے پہلوانوں سے باتیں کر رہا ہے، اس طرح ادا کیا ہے، ؎ تو گفتی ہمہ تخت سہراب بود

سہراب نے کیکاؤس کے خیمہ کے پاس جا کر، برچھی سے خیمہ کی میخیں اُکھاڑ کر پھینک دی ہیں، فردوسی اس واقعہ کو اس طرح ادا کرتا ہے:

ازاں پس بجنبید از جائے خویش	بہ نیزہ دیکھ پردہ سرا رفت پیش
خم آورد پشت وسنان یتیغ	بزد تند و برکند ہفتاد میخ،
سراپردہ یک بہرہ آمد زپاے	زہر سو برآمد دم کرہ نامے

عام شعراء اگر اس واقعہ کو لکھتے تو صرف اس پر قناعت کرتے کہ سہراب نے میخیں
اُکھاڑ کر پھینک دیں، لیکن یہ خصوصیات کہ " وہ جھکا، جُھک کر زور سے نیزہ مارا،
ستر میخیں اُکھاڑ کر پھینک دیں خیمہ کا ایک حصّہ گر پڑا " نظر انداز کر جاتے، حالانکہ واقعہ
کی تصویر کھینچنے کے لئے ان تمام باتوں کا ادا کرنا ضروری ہے،

اسی تفصیلی واقعہ نگاری کی بدولت ہم کو بہت سے ایسے محاوروں تک رسائی ہوتی ہے
جو یوں کبھی عام طریقۂ بیان میں نہیں آسکتے تھے،

مثلاً سہراب نے جب رستم کو گُرز مارا ہے تو رستم تلملا جاتا ہے، مگر ضبط سے کام
لیتا ہے اور سہراب پر ظاہر نہیں ہونے دیتا، اس واقعہ کو اُردو کا محاورہ داں صرف
اس لفظ سے ادا کرے گا کہ " پی گیا " فردوسی نے بھی صرف محاوروں سے کام لیا، چنانچہ
کہتا ہے، ع - بہ پیچید و درد از دلیری بخورد، رستم ایک معرکہ میں صرف کمند ہاتھ میں لے کر
گیا ہے، حریف سے سوال جواب ہوئے تو اس نے طنز سے کہا کہ " اس دھاگے کے
بل پر نہ اتراؤ " فردوسی اس طنزیہ محاورہ کو بعینہٖ اسی طرح ادا کرتا ہے،

بدو گفت ہوماں کہ چندیں مدم
بہ نیروے ایں رشتہ شصت خم

واقعہ نگاری کی مثالوں سے تمام شاہنامہ بھرا پڑا ہے، ہم نمونہ کے طور پر ایک
مختصر لیکن مسلسل داستان یہاں نقل کرتے ہیں۔

یہ وہ موقع ہے کہ سہراب ایک ایرانی پہلوان کو لے کر کیکاؤس کے لشکرگاہ کو دیکھنے
چلا ہے، فوجیں اپنے اپنے افسروں کے ساتھ الگ الگ ساز و سامان سے آراستہ ہیں
سہراب ایک ایک پر نگاہ ڈالتا جاتا ہے اور ہر ایک کا نام و نشان پوچھتا ہے، ایرانی
پہلوان جواب دیتا ہے،

بدو گفت کز تو بپرسم ہمہ
ز گردن کشان و ز شاہ و رمہ

سراپردۂ دیبۂ رنگ رنگ
بدو اندروں خیمہا سے پلنگ

(حاشیہ: رمہ — فوج؛ دیبۂ — کمخواب)

به پیش اندرون بسته صد ژنده پیل / یکے تخت پیروزه برسان نیل

یکے زرد خورشید پیکر[۵۱] درفش / سرش ماه زرین، غلافش بنفش

به قلب سپاه اندرون جاے کیست / ز گردان ایران ورا نام چیست

بدو گفت کاں شاه ایران بود / که بر درگهش پیل و شیراں بود

وزاں پس بدو گفت کز میمنه / سواران بسیار و پیل و بنه

سراپردهٔ برکشیده سیاه / زده گردش اندر ستاده سپاه

بگرد اندرش خیمه زاندازه بیش / پس پشت پیلان و شیران به پیش

زده پیش او پیل پیکر درفش / به نوبتش سواران زرینه کفش

چه باشد ز ایرانیاں نام اوے / بگو تا کجا باشد آرام اوے

چنیں گفت کاں طوس نوذر بود / درفشش کجا پیل پیکر بود

بپرسید کاں سرخ پرده سراے / یکے لشکرے گشن پیشش بپاے

یکے شیر پیکر درفشش بنفش / درفشان گهر در میان درفش

پس پشتش اندر سپاهی گراں / همه نیزه داران جوشن وراں

چنیں گفت کاں فر آزادگاں / سپهدار گودرز کشوادگاں

سپه کش بود گاه کینه دلیر / شه چل پسر دار چو پیل و چو شیر

اب رستم کی باری آتی ہے،

دگر گفت کاں سبز پرده سرائے / بزرگان ایراں بپیشش بپاے

یکے تخت پرمایه اندر میاں / زده پیش او اختر کاویاں

برو بر نشسته یکے پهلواں / ابا فر و با سفت و یال گواں

ازاں کس که برپاے پیشش بپاست / نشسته بیک سر ز بر ترست

جو شخص سامنے کھڑا ہے / رستم کا قد اس سے بیٹھنے کی حالت میں بھی نکلا ہوا ہے

۵۱ خورشید پیکر یعنی آفتاب کی صورت کا،

بہ ایراں نہ مردے بہ بالائے او — کمندے فروہشتہ تا پائے او

درفشش ببیں اژدہا پیکر است — براں نیزہ بر شیر زرّیں سر است

بخود ہر زماں بر خروشد ہمے — تو گوئی کہ دریا بجوشد ہمے

کہ باشد؟ بنام آں سوار دلیر — کہ ہر دم ہمی بر خروشد چو شیر

ہجیر نے رستم کا نام بدل کر بتایا، سہراب اب اور افسروں کا حال پوچھتا ہے،

وزاں پس بپرسید کز مہتراں — کشیدہ سراپردۂ بر کراں

سواران بسیار و پیلاں بپائے — برآید ہمے نالۂ کرّ نائے

میانِ سراپردہ تختے زدہ — ستادہ غلاماں بہ پیشش رَدہ

ز ایراں بگو نام آں مرد چیست — کجا جائے دارو نژادش ز کیست

چنیں گفت کاں پور گودرز گیو — کہ خوانند گرداں ورا گیو نیو

ز گودرزیاں بہتر و مہتر است — بہ ایراں سپہ بر دو بہرہ سر است

بدو گفت زاں سو کہ تابندہ شید — برآید یکے پردہ بینم سپید

زدیبائے رومی بہ پیشش سوار — ردہ برکشیدہ فزوں از ہزار

پیادہ سپردار و نیزہ وراں — شدہ انجمن لشکرے بیکراں

زدیبا فروہشتہ زیبا جلیل — غلام ایستادہ ردہ خیل خیل

نشستہ سپہدار بر تخت عاج — نہادہ براں عاج کرسئ ساج

چہ نام است او را ز نام آوراں — سپہد نژاد است یا سروراں

بدو گفت کورا فرابرز خواں — کہ فرزند شاہ است و تاج گواں

بدو گفت سہراب کیں درخور است — کہ فرزند شاہ است و با افسر است

واقعہ نگاری جب اس حد تک پہنچ جاتی ہے تو اس کو مرقع نگاری یعنی آج کل کے محاورہ میں سین دکھانا کہتے ہیں،

چھٹی خصوصیت

جذبات | رزمیہ میں درد و غم کے اظہار کا کم موقع پیش آتا ہے، اور آئے بھی تو بلاغت یہ ہے کہ اس کو زیادہ پھیلایا نہ جائے، تاہم کہیں کہیں اس کا موقع پیش آگیا ہے تو فردوسی نے اس میں بھی کمال دکھایا ہے۔ سہراب کے مرنے کی خبر سُن کر اس کی ماں کی جو حالت ہوئی ہے، اور جس طرح اُس نے نالۂ وزاری کی ہے، اس کو اس طرح ادا کرتا ہے،

خروشید و جوشید و جامہ درید ・ بہ زاری براں کودک نارسید

برآورد بانگ غریو و خروش ・ زماں تا زماں زو ہمی رفت ہوش

فرو برد ناخن دو دیدہ بکند ・ برآورد و بالا در آتش فگند

مرآں زلف چوں تاب دادہ کمند ・ بہ انگشت پیچید و از بن بکند

بسر بر فگند آتش و بر فروخت ・ ہمہ موی مشکیں بہ آتش بسوخت

ہمی گفت کاے جان مادر اکنوں ・ کجائی سرشتہ بخاک و بخوں

دو چشمم برہ بود گفتم مگر ・ ز سہراب و رستم بیابم خبر

چہ دانستم اے پور کاید خبر ・ کہ رستم بخنجر دریدت جگر

دریغش نیامد ازاں روے تو ・ ازاں برز و بالاؤ بازوے تو

بپروردہ بودم تنش را بناز ・ بروز درخشندہ و شبہاں دراز

کنوں آں بخوں اندروں غرقہ گشت ・ کفن بر تن پاک او خرقہ گشت

کنوں من کرا گیرم اندر کنار ・ کہ خواہد بدن مر مرا غمگسار

پدر جستی اے گرد لشکر پناہ ・ بجاے پدر گورت آمد براہ

چرا نامدم با تو اندر سفر ・ کہ گشتی بگردان گیتی سمر

مرا رستم از دور بشناختے ・ ترا امن اے پور بنواختے

بینداختے تیغ آں سرفراز ・ نکردے جگرگاہت اے پور باز

ہمی گفت و می خست و می کند موے ・ ہمیزد کف دست بر خوبروے

زخونِ او ہمی کرد لعل آب را ۔ بہ پیش آورید اسپ سہراب را

سر اسپ او بہ بر در گرفت ۔ بماندہ جہانے در او در شگفت (متعجب)

گہے بوسہ زد بر سرش گہ بروے ۔ زخون زیر سمش ہمی راند جوے

بیاورد آں جامۂ شاہوار ۔ گرفتش چو فرزند اندر کنار

بیاورد خفتان و درع و کمان ۔ ہماں نیزۂ و تیغ و گرزِ گراں

بسر بر ہمی زد گراں گرز را ۔ ہمے یاد کرد آں بر و برز را

بیاورد زین و لگام و سپر ۔ لگام و سپر را ہمی زد بہ سر

سہراب کی ماں نے جو کچھ کہا ہے کس قدر سچ اور کس قدر پُر تاثیر ہے، سہراب نے گھوڑے کو گود میں لینا، اس کے ہاتھ پانوں چُومنا، سہراب کے کپڑوں کو بچہ کی طرح آغوش میں لینا، ہتھیاروں کو سر پر مارنا، کس قدر اصلی حالت کی سچی تصویر ہے،

بیژن ایرانی پہلوان تھا، افراسیاب کی لڑکی منیزہ اس پر عاشق ہو گئی اور چوری سے لے جا کر گھر میں رکھا، جب افراسیاب کو خبر ہوئی تو اُس نے بیژن کو ایک کنوئیں میں قید کر دیا، اور منیزہ کو گھر سے نکال دیا، منیزہ بیژن کی تیمار داری اور خبر گیری کرتی تھی، رستم بیژن کے چھڑانے کو سوداگر بن کر گیا، اور توران پہنچ کر تجارت کے سامان پھیلائے، منیزہ کو خبر ہوئی، دوڑی ہوئی آئی اور رستم سے بیژن کے حالات بیان کئے، رستم نے اس خیال سے کہ راز فاش نہ ہو جائے، منیزہ کو جھڑک دیا کہ میں بیژن و بیژن کو کچھ نہیں جانتا، منیزہ دل شکستہ ہو کر کہتی ہے،

بہ رستم نگہ کرد و بگریست زار ۔ زخواری بہارید خوں در کنار

بدو گفت کاے مہترِ پر خرد ۔ ز تو سرد گفتن نہ اندر خورد
رستم سے کہا کہ اے سردار ۔ اسطرح روکھائی سے جواب دینا آپکے شایاں نہیں

سخن گر نہ گوئی مرانم ز پیش ۔ کہ من خود دلے دارم از درد ریش
اگر بات نہیں کرتے تو نہ کرو لیکن مجھکو کہدیڑتے کیوں ہو ۔ میرا دل تو خود مصیبت سے زخمی ہو رہا ہے

چنیں باشد آئین ایراں مگر — کہ درویش را کس نہ گیرد خبر،

کیا ایران کا یہی دستور ہے — کہ لوگ غریبوں سے بات نہیں کرتے

زہی بانگ بر من چو جنگ آوراں — نہ ترسی تو از داور داوراں

مجھ کو پہلوانوں کی طرح ڈانٹ بتاتے ہو — تم کو بادشاہوں کے بادشاہ (خدا) کا کچھ ڈر نہیں

منیژہ منم دخت افراسیاب — برہنہ ندیدہ تنم آفتاب

کنوں دیدہ پُرخون و دل پر ز درد — ازیں در بداں در دو رخسارہ زرد

برائے یکے بیژن شوربخت — فتادم ز تاج و فتادم ز تخت

اختصار اور زور

بلاغت کے نکتہ شناس جانتے ہیں، کہ کسی واقعہ کے بیان کرنے میں جب حد سے زیادہ زور دینا مقصود ہوتا ہے، تو لمبی چوڑی تمہید اور تفصیل وہ کام نہیں دیتی جو ایک پُرزور مختصر جملہ کام دیتا ہے، قرآن مجید میں فاوحیٰ الی عبدہ ما اوحیٰ غشیھم من الیم ماغشیھم میں جو بات ہے وہ سینکڑوں جملوں سے ادا نہیں ہو سکتی، روم کے فاتح کا مشہور جملہ تم نے سُنا ہوگا "میں آیا، میں نے دیکھا، میں نے فتح کیا،، شاہنامہ میں اس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں، سہراب کی پُر درد داستان اس شعر سے شروع کی ہے،

کنوں جنگ سہراب و رستم شنو — دگرہا شنیدستی ایں، ہم شنو

صرف "ایں ہم" نے جو بات پیدا کی ہے ہزاروں تمہید سے نہیں پیدا ہو سکتی تھی، رستم افراسیاب کو ایک خط لکھتا ہے اور تہدید کے وسیع مضمون کو ایک مصرع میں ادا کرتا ہے،

وگرنہ بکام من آمد جواب — من و گرز و میدان و افراسیاب

نظامی نے اپنے تحریر میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں، لیکن فردوسی کے دو مصرع سب پر بھاری ہیں،

بسے رنج بردم دریں سال سی | عجم زندہ کردم دریں پارسی

رستم کی مار دھاڑ، ہنگامہ آرائی اور قتال و جدال کا سماں صرف چار مصرعوں میں دکھایا ہے،

بروز نبرد آں یل ارجمند | بہ شمشیر و خنجر بہ گرز و کمند
درید و برید و شکست و ببست | یلاں را سر و سینہ و پا و دست

علاج و مشورہ کے لئے لوگ جمع ہوئے ہیں، اسی میں کھانا بھی سامنے آگیا ہے، لوگ کھاپی کر، اٹھ کھڑے ہوئے، اس کو اس طرح ادا کرتا ہے،

پے مشورہ مجلس آراستند | نشستند و گفتند و برخاستند

آٹھویں خصوصیت

۸۔ صنائع بدائع، شاعری کے زوال کا پیش خیمہ ہیں، اس لئے فردوسی کے کلام یا اس کو ڈھونڈھنا نہیں چاہیئے، لیکن جو محاسن شاعری ضمناً کسی صنعت میں آجاتے ہیں، اس کے کلام میں پائے جاتے ہیں، اور اعلیٰ درجہ پہ پائے جاتے ہیں، مثلاً

لف و نشر مرتب

بروز نبرد آں یل ارجمند | بہ شمشیر و خنجر بگرز و کمند
درید و برید و شکست و ببست | یلاں را سر و سینہ و پا و دست

لف و نشر مع طباق و مقابلہ،

فرو شد بہ ماہی و بر شد بہ ماہ | بن نیزۂ و قبۂ بارگاہ
مبالغہ | زمیں گرد میداں کہ بر شد بہ دشت | زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

رزمیہ شاعری | رزمیہ شاعری جس کو انگریزی میں ایپک پوئم کہتے ہیں، شاعری کے انواع میں سے بہترین انواع ہے، یورپ کے نزدیک دُنیا کا سب سے بڑا شاعر ہومر ہے، اس کا کارنامۂ فخر یہی رزمیہ شاعری ہے۔ مہابھارت جس کو ہندو آسمانی کتاب سمجھتے ہیں وہ بھی ایک رزمیہ نظم ہے، اور اگر ان دونوں کے پہلو میں کسی کو جگہ

دی جا سکتی ہے تو وہ شاہنامہ ہے،

رزمیہ شاعری کے کمال کے چند شرائط ہیں، واقعہ ایسا مہتم بالشان ہو جس نے دنیا کی ہمچل میں کوئی انقلاب پیدا کر دیا ہو، لڑائی کے ہنگامہ کا بیان اس زور شور اور پُر رعب طریقے سے کیا جائے کہ دل دہل جائیں معرکۂ جنگ کے تمام ساز و سامان اور آلات و اسلحۂ جنگ تفصیل سے بیان کئے جائیں، سالار فوج اور مشہور بہادروں کی لڑائی کے بیان میں لڑائی کے تمام داؤں پیچ ایک ایک کرکے دکھائے جائیں، شاہنامہ میں یہ تمام باتیں اعلیٰ درجہ پر پائی جاتی ہیں،

ہنگامۂ جنگ اور مجلس،

ز لشکر برآمد سراسر خروش — زمیں پُر خروش و ہوا پُر خروش
جہاں لرز لرزاں شد و دشت و کوہ — زمیں شد ز نعل ستوراں ستوہ
درفش از درفش و گروہ از گروہ — گسستہ نشد شب برآمد ز کوہ
درخشیدن تیغہائے بنفش — ازاں سایۂ کاویانی درفش
تو گفتی کہ اندر شب تیرہ چہر — ستارہ ہمے برفشاند سپہر
زمیں گشت جنباں چو ابر سیاہ — تو گفتی ہمے بر نتابد سپاہ،
بلند آسماں چوں زمیں شد ز خاک — ز ہر سو ہمی بر شدہ چاک چاک
دل کوہ گفتی بدرد ہمے — زمیں با سواراں بپرد ہمے
ز بس نعرۂ نالۂ کرنائے — ہمے آسماں اندر آمد ز جائے
جہاں تیرہ شد رستے گیتی ز گرد — تو گفتی کہ خورشید شد لاجورد،
بز دمہرہ بر کوہۂ ژندہ پیل — زمیں جنب جنباں چو دریائے نیل
ز گرد سواراں ہوا بست میغ — چو برق درخشندہ پولاد تیغ
ز جوش سواراں و آواز کوس — ہوا قیر گوں شد زمیں آبنوس
تو گفتی زمیں موج خواہد زدن — وزاں موج بالا موج خواہد زدن

زبس گرد میداں کہ برشد بدشت | زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت
زبس نیزہ و گرز و گوپال و تیغ | تو گفتی ہوا ژالہ بارد ز میغ
ز گشتہ ہمہ دشت آوردگاہ | تن بی سر و بود و ترگ و کلاہ
بجوشید دشت و بتوفید کوہ | ز جوش سواران ہر دو گروہ
تو گفتی کہ روی زمین آہن است | ز نیزہ ہوا نیز در جوشن است

شاہنامہ میں لڑائی کے سامان اور اسلحۂ جنگ کی اس قدر تفصیل پائی جاتی ہے، کہ ہم بہ تفصیل بتا سکتے ہیں، کہ آج سے دو ہزار برس پہلے آلاتِ جنگ کیا کیا تھے، پہلوان اور بہادر کیا کیا ہتھیار لگاتے تھے، لباسِ جنگ کیا کیا تھے، مثلاً لڑائی کے وقت جو باجے استعمال ہوتے تھے، اُن کے یہ نام ہیں، تبیرہ، گاؤ دم، خرمہرہ، کوس، طبل، نقارہ، کرنا، سرغین،

اسلحۂ جنگ یہ تھے:- زرہ، جوشن، خود، مغفر، چار آئینہ، خفتان، ترگ، ببر بیان، برگستوان،

آلات اور سامانِ جنگ یہ تھے: گوپال، گرز، تیغ، سپر، درفہ، خنجر، ژوپین، ناوک، خشت، تیر، خدنگ، کمند، سناں، نیزہ، ژوپین، پرتاب، تبرزین، دبوس، قاروره، شراع، عرادہ، رایت، علم، درفش، اختر، سراپردہ،

اقسامِ فوج، قلب، میمنہ، میسرہ، طلایہ، ساقہ- و مدار،

اُس زمانہ میں مجموعی فوج کے لڑانے کا فن نہ تھا، اس لئے یہ پتہ نہیں لگتا کہ سپہ سالار کس طریقہ سے فوج کو لڑاتے تھے، رستم اگرچہ سپہ سالار تھا اور شاہنامہ سرتاپا گویا اسی کی داستان ہے، تاہم کہیں یہ پتہ نہیں لگتا: کہ اس نے فوج کو کیونکر لڑایا، طریقہ جنگ یہ تھا کہ ایک ایک پہلوان میدان میں آتا تھا، اور معرکہ آرا ہوتا تھا، ان معرکہ آرائیوں

فردوسی اس تفصیل سے بیان کرتا ہے کہ سماں باندھ دیتا ہے،

لڑائی کے جتنے طریقے تھے، یعنی کشتی لڑنا، تلوار چلانا، تیر مارنا، کمند پھینکنا، برچھی چلانا وغیرہ وغیرہ شاہنامہ میں سب بہ تفصیل پائے جاتے ہیں، اور جس چیز کو جہاں لکھا ہے، اس طرح لکھا ہے کہ اس کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے،

کمند اندازی

تہمتن بہ الوای شد دردمند — زفتراک بکشاد پیچاں کمند
چو آہنگ رزم یلاں داشتے — کمندے وگرزے گراں داشتے
بیامد بغرید چوں پیل مست — کمندے بہ بازو وگرزے بدست
بدو گفت کاموس چندیں مدم — بہ نیروئے ایں رشتۂ شصت خم
برانگیخت کاموس جنگی نبرد — ہم آورد را دید بازور و برد
بینداخت تیغ پرند آورش — ہمی خواست از تن گسستن سرش
سر تیغ بر گردن رخش خورد — ببرید برگستوان نبرد،
نیامد تن رخش را زاں گزند — گو پیلتن (بتوان)، حلقہ کرد آں کمند
بینداخت وافگندش اندرمیاں — برانگیخت از جائے رخش دماں
بہ راں اندر آورد و کردش دوال — عقابے شدہ رخش با پر و بال
برای و دلیری نہ شمشیر وراں — گراں شد رکیب و سبک شد عناں
ہمی خواست آں خام خم کمند — بہ نیروی تن بگسلاند ز بند
شد از ہوش کاموس وبگسست خام — گو پیلتن رخش را کرد رام
عناں را بہ پیچید و او را ززیں — نگوں اندر آورد و بزد بر زمیں
دو دست از پس پشت بستش چو سنگ — بہ خم کمند اندر آورد چنگ،

تیر اندازی

تہمتن بہ بند کمر برد چنگ — گزیں کرد یک چوبہ تیر خدنگ
خدنگی بر آورد پیکاں چو آب — نہادہ برو چار پر عقاب

بمالید چاچی کمان را بدست — بہ چرم گوزنان اندر آمد شکست
ستون کرد چپ را و خم کرد راست — خروش از خم چرخ چاچی بخاست
چو سوفارش آمد بہ پہنای گوش — ز چرم گوزنان برآمد خروش
چو پیکان ببوسید انگشت او — گذر کرد از مہرۂ پشت او
چو زد تیر بر سینۂ اشکبوس — سپہر آن زمان دست او داد بوس
قضا گفت گیر و قدر گفت دہ — فلک گفت احسن، ملک گفت زہ

نیزہ بازی

برآشفت سہراب شد چون پلنگ — چو بدخواہ دچار و چو شد بہ جنگ
عنان برگرائید و برداشت اسپ — بیامد بہ کردار آذرگشسپ
چو آشفتہ شد شیر، تندی نمود — سر نیزہ را سوی او کرد زود
بدست اندرون نیزۂ جانستان — پس پشت خود گردش آنگہ سنان
بزد بر کمر بند گرد آفرید — زرہ بر تنش یک بیک بندید
ززین برگرفتش بہ کردار گوی — کہ چوگان ز باد اندر آید بروی

کشتی گیری

گرفت از آن پس دوال کمر — دو اسپ تگاور برآوردہ بر
یکے بد بدست یل اسفندیار — بدست دگر رستم نامدار
بہ نیرو کشیدند زی خویشتن — دو گرد سرافراز دو پیلتن
ہمی زور کرد این بر آن آن برین — نجنبید یک مرد بر پشت زین
کف اندر دہانشان شدہ خون و خاک — ہمہ گبر و برگستوان چاک چاک
چو رستم ورا دید بفشرد ران — بگردن برآورد گرز گران
چو تنگ اندر آورد با او ہمیں — فرو کرد گرز گران را بہ زیں

شاہنامہ کا اثر | شاہنامہ کے مقبولِ عام ہونے کے مخالف بہت سے اسباب جمع تھے، سب سے مقدم یہ کہ وہ سرتا پا غیر قوموں کا کارنامہ تھا اور مسلمانوں کا جہاں جہاں

ذکر آگیا تھا نہایت حقارت سے ان کو یاد کیا تھا،

زشیر شتر خوردن و سوسمار | عرب را بجائے رسیداست کار
کہ تختِ کیاں را کنند آرزو | تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

قادسیہ کے معرکہ میں مسلمانوں نے بے نظیر شجاعت کے جوہر دکھائے تھے، فردوسی نے اس کو بھی مدہم کرکے دکھایا تھا، اِس بات پر مذہبی گروہ میں عام ناراضی پھیلی، چنانچہ اسی زمانہ میں عمر نامہ[1] ایک کتاب لکھی گئی، جس کے دیباچہ میں سببِ تالیف یہ بیان کیا ہے کہ چونکہ فردوسی نے ایرانیوں کے جھوٹ سچ قصے لکھ کر ملک میں مشہور کردیئے، اِس لئے یہ کتاب حضرت عمر فاروقؓ کے حالات میں لکھی گئی، کہ لوگوں کی توجہ اُدھر سے ہٹ جائے،

چونکہ فردوسی نے سلطان محمود کی ہجو لکھ کر شاہنامہ میں اس کو منضم کردیا تھا، اس لئے لوگ شاہنامہ کو ہاتھ لگاتے ڈرتے تھے، فردوسی چونکہ معتوبِ شاہی تھا، اس لئے بھی اس کی تصنیف مقبولِ عام نہ ہوسکی ہوگی،

یہ سب تھا، لیکن نتیجہ یہ ہُوا کہ خراسان سے لے کر بغداد تک در و دیوار سے شاہنامہ کی صدا آنے لگی، تقریر و تحریر، تصنیف و تالیف، خلوت و جلوت، کُوچہ و بازار، اس کی آوازِ بازگشت سے گونج اُٹھے، لوگ جب کام سے فارغ ہوکر بیٹھتے تو کوئی خوش لہجہ شخص حفظ شاہنامہ کے اشعار پڑھتا، اور شجاعت و جانبازی، دلیری، حُبِ وطن کا اثر تمام مجلس پر چھا جاتا،

سیکڑوں برس تک، سلاطین و امراء کی باہمی خط و کتابت میں شاہنامہ کے اشعار جا بجا درج ہوتے تھے اور دلیری اور بہادری کے موقعوں پر بے ساختہ اس کے اشعار زبان سے نکل جاتے تھے، میدانِ جنگ میں رجز کے بجائے

---

[1] یہ کتاب میری نظر سے گُذری ہے،

شاہنامہ کے اشعار پڑھے جاتے تھے، سلجوقیوں کے اخیر فرماں روا طغرل ارسلان نے میدان جنگ میں لڑ کر جان دی تو شاہنامہ کے یہ اشعار زبان پر تھے،

من آن گرز یک زخم بر داشتم سپہ را ہماں جاے بگذاشتم

چناں برخروشیدم از پشتِ زیں کہ چوں آسیا شد، پریشان زمیں

شاہنامہ ہی کے اثر نے سیکڑوں برس تک، ایران کی شاعری کو غزل سے پاک رکھا، امتداد زمانہ سے جب اس کا اثر گھٹا اور عشق و عاشقی کے خیالات قوم میں پھیلنے لگے، تو دفعۃً تاتاریوں کے طوفان نے مسلمانوں کی خاک تک اڑا دی،

شاہنامہ کی زبان — شاہنامہ کی زبان، آج کی زبان سے اس قدر مختلف ہے کہ گویا دو زبانیں الگ الگ ہیں، اور یہ شاہنامہ کی تخصیص نہیں، اُس زمانہ کے شعراء کی عام زبان یہی تھی، لیکن چونکہ اور کسی شاعر نے اس قدر الفاظ استعمال نہیں کئے اس لئے فردوسی کی زبان بہ نسبت اور شعراء کے زیادہ بیگانہ اور غیر مانوس معلوم ہوتی ہے،

شاہ نامہ کی زبان کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

۱- ضمیروں کی ترکیب، مثلاً،

ع "زشادی رخاں شاں چو گل بر دمید"

اب یُوں کہیں گے رُخ ہاے ایشاں،

۲- غیر جاندار چیزوں کی جمع الف و نُون سے، مثلاً

اگر عُمر باشد مرا سالیاں، یعنی سالہا،

۳- اسم اور فعل کے آخر میں الف زائد مثلاً

ع سیامک بر آمد برہنہ تنا، یعنی تن،

ع بہ سی روز گیتی بہ پیمایدا

۴- فارسی الفاظ پر تشدید مثلاً خوشّی، زرّ، پرّ- ہمّ، مژّہ، زرّ بفت،

کژدی،

۵۔ بعض زائد حرف، مثلاً چناں کے بجائے چوناں، اشیا کے بجائے اشیواء
چنیں کے بجائے چونیں، فرشتہ کے بجائے فریشتہ،

۶۔ در کے بجائے اندرون، مثلاً
بہ جنگ اندروں گرزہ گاؤ رنگ،

۷۔ متحرک بجائے ساکن، اور ساکن بجائے متحرک، مثلاً،
ع بگویم ز مادرش و، ہم از پدرش ع نیامدت از شیر واز دیو باک،
ع بہ شادی ہمہ جاں برا فشاندند،

۸۔ بے کے پہلے الف زائد،
ع ابے او بناشیم در جنگ شاد،

۹۔ دیا بجائے یا،
دیا بارۂ رستم جنگجوے بہ آخر نہد بے خداوند روے،

۱۰۔ کجا بہ معنی کہ
ع در فشش کجا پیل پیکر بود،

۱۱۔ از بر بمعنی بر،
ع نشست از بر کوہۂ ژندہ پیل، یعنی بر کوہ،

۱۲۔ ایچ۔ معنی ہیچ،
ع زپیکاں نبود ایچ پیدا سرش،

۱۳۔ تاے خطاب کا استعمال، مثلاً
ع ہزارانت کودک وہم نوش لب، یعنی ہزاراں ترا،
چو آئی خیال رکت مراد و ہوا است، یعنی کہ ترا

۱۴۔ ورا بمعنی او را،

چو رستم ورا دید خیرہ بماند، یعنی چو رستم او را دید،

۱۵۔ ازو کے بجاے ازوی،

برمادر آمد بہ پرسید ازوے — بدو گفت گستاخ با من بگوی

۱۶۔ ازیرا بجاے ازیں رو،

ع ازیراسرت ز آسماں برتر است، یعنی ازیں رو،

۱۷۔ آزمایش کے بجائے آزموں،

نہادی برو دست را آزموں — شکم بر زمیں بر نہادی ہیوں،

۱۸۔ میم متکلم کا حذف،

اگرمن نہ سفتے بہ ما ثر ندراں — یعنی اگر من نہ رفتمے،

ان تصرفات کے علاوہ سیکڑوں الفاظ ہیں جو بالکل متروک ہیں، یا ان کی صورتیں بدل گئیں، یا ان کے بجاے اور اور الفاظ استعمال میں ہیں، مختصراً چند الفاظ ذیل میں درج ہیں،

لفظ	معنی	لفظ	معنی
ویژہ	خاص	تال ومال	ریزہ ریزہ
مر	شمار	تخش	تیر
ایدوں	حالا	ترک	کلاہ آہنی
ایدر	اینجا	ترنگ	صداے کماں
آخر	اصطبل	تلاش	پراگندہ
آذین	زینت وآرایش	تنگ آمدن	نزدیک آمدن

لفظ	معنی	لفظ	معنی
آذرگشسپ	برق	جوال	ظرفیست کہ از پشم بافند
آستی	آستیں	چاک	سفیدۂ صبح
برسان	بساں	چاک چاک	صدائے زدن شمشیر
آغاز	ارادہ	چرنگیدن	آواز گرز
افسوس	ظلم وستم	چک	قبالہ اور دستاویز
اند	چند، یا اندک	سہ دیگر	سیوم
اندرخور	لائق	شارستان	شہر و شہرستان
انوشہ	آفریں	شبگیر	صبح
بادسر	مغرور	شخودن	خراشیدن
بارگی و بارہ	اسپ	شکردن	پارہ کردن
باژ	خراج	غرم	میش کوہی
بخش	حصہ	غرچہ	مخنث و نامرد
برتر	بلندی	غو	خروش
بسندہ	کافی	گو	پہلوان
پسیچ	قصد و کارسازی	فرو ریختن از اسپ	فرود آمدن
بگماز	شراب	فزونی	فضیلت و بزرگی
پاژہر	تریاک	فسیلہ	گلہ اسپ
پذیرہ	استقبال کردن	فش	دم دیال اسپ
پدرام	آراستہ	قارورہ	آلہ ایست از آلاتِ جنگ
پہلوانی	زبان پہلوی	خشت	نیزہ کوچک

لفظ	معنی	لفظ	معنی
در	دره. کوه و مرتبه	دبوس	گرز
ع بگفتش برازاین سخن دربدر		درع	پیراهن زنان
درخت	دارا یساسته	سبز در سبز	نام سبزےست
درقه	سپر چرمین	ستاده	خیمه
دستار	دستر خوان	ستاره	مسهری
دست بند	زنان رقاص	ستودان	دخمه
دست جامه	جامه سروپا	ستیخ	راست وبلند
دست راست	وزیر اعظم	سرسری	فرومایه
دستوار	عصا	سرون	شاخ گاؤ
دفتر شکستن	دفتر ساختن	سفت	دوش
دمدار	ساقه لشکر	شیب	دنباله تازیانه
دوارج	لحاف	ماروچ	رنج
دیدار	چشم و رخ و پدیدار گشتن	صلاب	اصطرلاب
رده	صف	طبرخون	بید سرخ
رزمه	بقچه	طغرل	نوعی از مرغ شکاری
رسته	صف زده	قرطه	کرُته
رفت آوری	آمد و رفت کردن	کاتوزی	زاہد
رنج	رنگ	کالوشه	دیگچه
روزبان	دربان	کشکین	نان جوین
روسپی	فاحشه	کفج	آب دہن

لفظ	معنی	لفظ	معنی
ریدک	غلام وامرد	کلک	کمان
ریمن	مکار	کنارنگ	بزرگ قوم
زحیر	پیچ و تاب	کندآور	پہلوان
زخم	عمارت	کوہسر	کوہسار
زمزم	کلمات مغاں که وقت	گردگاه	تہی گاه وکمر
	پرستش گویند	گردگاه	مرہون
زمی	زمیں	گریغ	گریز
زنہار خوردن	عہد شکستن	گشن	بسیار
زوار	خادم زندان خانه	ماہار	مہار شُتر
ژکیدن	آہسته زیر لب گفتن	مزیج	طعنه وظرافت
سان	عرض لشکر	منجوق	ماہیچه علم
سہت	سنگین وگراں	دبله	نعره
تاباک	بے باک	ہرکاره	دیگ سنگی
لخ	صفِ لشکر	ہرزماں	ہر زماں
نوژ	ہنوز	ہمانند	مانند
نیو	پہلوان	ہوش	جان
دان	نگہبان	یشک	چہار دنداں پیشیں
ویر	یاد و فہم		جانور درنده

اسدی طوسی

اقلیمِ سُخن (رزم) کا یہ دُوسرا تاجدار ہے، صاحب آتشکدہ نے اس کو سلطان محمود کے سبعہ سیارہ میں شمار کیا ہے،

اسدی کا نام علی بن احمد اور کنیت ابونصر ہے، سلسلۂ نسب شاہانِ عجم سے ملتا ہے تحصیل علوم کے بعد عراق کا سفر کیا، اور دیلمیوں کے دربار میں رسائی حاصل کی، عراق سے آذربایجان آیا، یہاں کا رئیس ابودلف کرکری تھا، اس کا وزیر نہایت قدردان علم و فن تھا، اُس نے اسدی سے کہا کہ فردوسی نے شاہنامہ لکھ کر عجم کو زندہ کیا، تم اسی کے ہموطن اور ہم فن ہو تم بھی کچھ یادگار چھوڑ جاؤ، اسدی نے گرشاسپ نامہ لکھ کر ہم فنی کا حق ادا کیا، چنانچہ ان تمام واقعات کو خود دیباچہ میں لکھا ہے،

یکے بود سردار مُہبا و ہیں	گراں مایہ دستور شاہ زمین
بہ من گفت فردوسی پاک مغز	بداد ست داد سخنہائے نغز
بہ شہنامہ گیتی بیاراستہ است	وزاں نامہ نام نکو خواستہ است
تو ہم شہری او را وہم پیشۂ	ہم او در سخن چابک اندیشۂ
ازاں ہمرہاں نامۂ باستاں	بہ نظم آر خرم یکے داستاں

دولت شاہ نے لکھا ہے، اور اور تذکرہ نویسوں نے بھی اس کی تقلید کی ہے کہ فردوسی جب غزنیں سے بھاگ کر مختلف شہروں سے گزرتا ہوا، وطن میں آیا، اور زندگی کے دن قریب آگئے تو اسدی کو بلا کر کہا کہ شاہنامہ کا کچھ حصہ ناتمام رہ گیا ہے

میرے بعد کون اس کو پورا کر سکے گا، اسدی نے کہا، جہان استاد! کچھ اندیشہ کی بات نہیں، میں اس خدمت کو انجام دونگا، چنانچہ ایک رات دن میں چار ہزار شعر لکھ کر فردوسی کو سُنائے، فردوسی نہایت خوش ہوا اور وہ اشعار شاہنامہ میں داخل کر لئے، یہ وہ اشعار ہیں جہاں عربوں کے حملے اور ایران کی شکست کا ذکر ہے،

لیکن ہمارے نزدیک یہ روایت محض فرضی اور غلط ہے، نہ شاہنامہ ناتمام رہا تھا نہ اسدی فردوسی کا اُستاد تھا،[۵۱] نہ فردوسی، اسدی سے ایسی فرمایش کر سکتا تھا، نہ ایک رات دن میں اسدی سے چار ہزار شعر لکھے جا سکتے تھے، ان سب پر مستزاد یہ کہ اسدی کے انداز سے، ان اشعار کو مطلقاً مناسبت نہیں،

شاعری پر اسدی کا ایک احسان یہ ہے کہ قصائد میں جدت کا راستہ نکالا، اکثر قصائد میں مناظرات لکھے ہیں، اور یہ اس کی خاص ایجاد ہے وہ دو چیزوں کو لے کر باہم مناظرہ کراتا ہے، ہر ایک کی طرف سے ترجیح کے دلائل پیش کرتا ہے، اور بالآخر بادشاہ کی مدح کی طرف گریز کرتا ہے، چنانچہ رات دن، زمین آسمان، گبر و مسلم، قوس و رمح، شب و روز کا مناظرہ، مجمع الفصحا میں نقل کیا ہے،

اسدی سب سے پہلا شخص ہے جس نے مصطلحات فارسی پر کتاب لکھی، چنانچہ اس کے خاص ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ویانا کے کتب خانہ میں موجود ہے، تسلگمین نے اس کتاب کو چھاپ کر شائع بھی کیا ہے،[۵۲]

کلام پر رائے | اسدی اگرچہ فردوسی وغیرہ کا ہمعصر ہے، لیکن تشبیہات اور مضمون بندی کے

[۵۱] اسدی نے گرشاسپ نامہ میں فردوسی کا نام جس طرح لیا ہے، اس سے قطعی ثابت ہوتا ہے کہ فردوسی اس کا شاگرد نہ تھا، یہ شعر ملاحظہ ہو،

به شهنامه فردوسئ نغز گوے ... چو از پیش گویندگان برد گوے

[۵۲] مسٹر براؤن کی کتاب جلد دوم تذکرہ اسدی،

لحاظ سے، نظامی سے دوش بدوش ہے، ایک جنگل کی تعریف میں لکھتا ہے،

چناں تنگ و درہم یکے بیشہ بود | کہ رفتن دراں کار اندیشہ بود
اس طرح کا گھنا جنگل تھا | کہ اس میں صرف خیال چل سکتا تھا
درختانش سر درکشیدہ بسر | چو خطِ دبیراں یک اندر دگر
اس کے درخت اس طرح پاس پاس تھے | جس طرح خوشنویسوں کی سطریں ہوتی ہیں
ہمہ شاخہا تا بہ چرخِ کبود | بہم در شدہ تنگ چوں تار و پود
تمام شاخیں آسمان تک | اس طرح لپٹی ہوئی تھیں جس طرح کپڑے میں تانا بانا ہوتا ہے
تو گفتی سپاہے ست در جنگ سخت | ز دہشت گروہ دگر ہر درخت
یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فوج لڑائی میں مصروف ہے | ہر درخت پہلوان ہے،
کمان شاخہا شاں، ہمہ گرز بار | سپر برگہا و سناں نوک خار
شاخیں کمان تھیں، گرز پھل تھے | پتے سپر، اور کانٹے برچھیاں تھیں
نتابید اندروے ز چرخ ہور | ز تنگی رہ ہش پوست رفتے ز مور
آفتاب کبھی اس میں چمکا نہیں تھا | اسقدر گھنا تھا کہ چیونٹی اس میں چلتی تو اسکی کھال اُتر جاتی

اِس قسم کی تشبیہات اور اس قسم کا مبالغہ، متوسطین بلکہ متاخرین کا انداز ہے باایں‌ہمہ واقعہ نگاری اور صورتِ حال کے منظر دکھانے میں اسدی کو فردوسی سے کم مایہ نہیں کہہ سکتے، گرشاسپ نے جہاں اژدہا کو مارا ہے، اس موقع پر اژدہا کی تصویر دیکھو کس طرح کھینچی ہے، اگلے زمانہ میں اژدہا کی تصویر جو لوگوں کے ذہن میں تھی یہ تھی کہ بیس تیس گز کا لمبا ہوتا ہے، آگے دو بڑے بڑے دانت ہاتھی کی طرح نکلے ہوتے ہیں، سانس لیتا ہے تو مُنہ سے شُعلے نکلتے ہیں، سر پر کانٹے کی طرح بال ہوتے ہیں، جسم پر ہاتھی کے کان کے برابر چھلے ہوتے ہیں، جن کو کبھی سمیٹ لیتا ہے اور کبھی پھیلا دیتا ہے، آنکھیں ستارہ کی طرح دُور سے چمکتی ہیں،

شد اندر دره هر سوے بنگرید / بناگاه آں اژدر آمد پدید

بران پشته او، سینه سایان بکین / ز پیچیدنش جنبش اندر زمیں

چو تاریک غارے دہن کرده باز / دو ششکش چو شاخ گوزنان دراز

دہان و نفس دود و آتش بہم / دہان کورۂ آہن و شعله دم

ز تف دہانش دل خاره موم / ز زہر دمش باد گیتی سموم

به دو دو نفس ہر دو چشمش ز نور / درخشاں چو در شب ستاره ز دور

گره در گره خم و دم تا به پشت / ہمه سرش چوں خاره موہا درشت

پشیزه پشیزه تن از رنگ نیل / ازاں ہر پشیزه، مه از گوش فیل

گہے چوں سپر بر فگندیش باز / گہے ہمچو جوشن کشیدی دراز

چو بر کوه سودے، تن سنگ رنگ / بفرسنگ رفتے چکاکاک سنگ

غرض شاہنامہ اور سکندر نامہ کی بیچ کی کڑی گرشاسپ نامہ ہے، نظامی نے غالباً گرشاسپ نامہ کو سامنے رکھ کر سکندر نامہ لکھا ہے*

منوچہری

دامغان وطن، ابوالنجم کنیت، احمد نام، شصت کلہ لقب اور منوچہری تخلّص تھا، دولت شاہ نے اس کو بلخی لکھا ہے، چونکہ نہایت دولت مند تھا، اس لئے شصت کلہ کے لقب سے پکارا جاتا تھا، امیر منوچہری بن شمس المعالی امیر قابوس بن وشمگیر جو مشہور رئیس اور جرجان کا فرماں روا تھا اور سنہ ۴۰۳ھ میں تخت نشین تھا، یہ اس کے دربار میں ملازم تھا، اس مناسبت سے منوچہری تخلّص کیا تھا، سنہ ۴۳۲ھ میں منوچہری نے انتقال کیا تو یہ غزنین میں آیا، اور عنصری کی مدح میں قصیدہ لکھا، جو اس کے دیوان میں موجود ہے، مدح کے چند شعر یہ ہیں،

اوستادِ اوستادانِ زمانہ عنصری — عنصرش بے عیب و دل بے غش و دینش بے فتن
شعر او چوں طبع او ہم بے تکلّف ہم بدیع — طبع او چوں شعر او ہم با ملاحت ہم حسن
گو جریر و گو فرزدق گو ولید و گو لبید — روبہ و عجاج و دیک الجن و سیف ذو یزن
گو فراز آیند و شعر اوستادم بشنوند — تا عزیزی روضہ بینند و طبیعی نسترن
شعر او فردوس را ماند کہ اندر شعر او — ہرچہ در فردوس مارا وعدہ کردہ ذوالمنن
کوثر است الفاظ عذب او و معنی سلسبیل — لفظ او انہار خمر و وزنش انہار لبن

تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ اس نے عنصری کی شاگردی بھی اختیار کی، لیکن یہ بھی خوشامد کا ایک پہلو تھا، جس طرح قلعہ میں لوگ بہادر شاہ سے گلستاں پڑھنے جایا کرتے تھے، بہر حال عنصری نے اس کو دربار شاہی میں پہنچایا، اور سلطان محمد بن محمود کے

حضور میں ترخانی کا منصب ملا، یعنی جب چاہتا دربار میں چلا جاتا، کچھ روک ٹوک نہ تھی، محمد چند[۵۱] روز کی سلطنت کے بعد یعنی ۴۲۱ھ میں گرفتار ہو کر قید ہوا، اور اسکے بھائی سلطان مسعود نے تخت سلطنت پر جلوس کیا، منوچہری کے اکثر قصائد مسعود ہی کی مدح میں ہیں، مسعود بھی اس کا نہایت قدردان تھا، یہاں تک کہ دربار کے شعراء اس پر رشک کرتے تھے، ایک قصیدہ میں منوچہری نے فخر کے لہجہ میں اس کا ذکر کیا ہے، تقی کاشی نے خلاصۃ الافکار میں لکھا ہے کہ منوچہری، عنصری عسجدی کا ہمعصر تھا، اور دربار میں عنصری کے سوا اور تمام شعراء یہاں تک کہ فردوسی اور فرخی تک اس سے نیچے بیٹھتے تھے لیکن منوچہری کے دیوان میں سلطان محمود کی شان میں کوئی قصیدہ نہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے، کہ وہ سلطان محمود کے مرنے کے بعد غزنیں میں آیا ہے، اور اس لئے فردوسی کا ہم بزم نہیں ہو سکتا تھا،

منوچہری فطرۃً شاعر تھا، نہایت کمسنی میں لوگ مشکل مشکل طرحیں دیتے تھے، اور وہ برجستہ ان طرحوں میں قصیدے اور غزل کہتا تھا[۵۲]،

دیوان جو آج موجود ہے، اس میں تین ہزار شعر ہیں، علی قلی خاں ہدایت نے بڑی تلاش سے بہم پہنچایا اور شائع کیا، فرانس میں اس کا دیوان نہایت اہتمام اور تکلف سے چھپا ہے، فرہنگ بھی ہے اور تمام مشکل اشعار کو حل کیا ہے، یہ نسخہ میری نظر سے گزرا ہے، اور میں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے، منوچہری نے ۴۳۲ھ میں انتقال کیا،

کلام کی خصوصیات | منوچہری کے کلام میں اکثر ایسے خصوصیات ہیں جن سے اس کے معاصروں کا کلام بالکل خالی ہے، بلکہ مابعد کے شعراء میں بھی ان کے نمونے خال خال پائے جاتے ہیں،

---

۵۱ مجمع الفصحاء، ۵۲ ایضاً بحوالہ لب الالباب عوفی یزدی،

(۱) سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شعرائے عرب کی زیادہ تر تقلید کرتا ہے، اس نے متعدد قصیدے عربی قصائد کے بحر اور قافیہ میں لکھے ہیں، ابوالشیص کا ایک قصیدہ ہے،

سالقاک والليل ملقی الجران — غراب ينوح علی غصن بان

منوچہری اس کے جواب میں لکھتا ہے،

جہانا چہ بد مہر و بدخو جہانی — چو آشفتہ بازار بازارگانی

مزہ وہاں آتا ہے، جہاں چند شعرائے عرب کے نام لے کر کہتا ہے کہ فلاں شاعر نے خلیفہ اور امیر کی مدح میں زور کے قصیدے لکھے اور ایسے بڑے بڑے صلے حاصل کئے، میں بھی اسی طرح تیرے دربار میں آیا ہوں،

شنیدم کہ اعشی بشہر یمن شد — سوے ہوذۃ بن علی الیمانی

بر خواند شعرے بالفاظ تازی — بشیریں معانی و شیریں زبانی

یکے کاروان اشتر کشن دادش — ہر اشتر بسان کہے از کلانی

سوے تاج عمرانیان ہم بدینساں — بیامد منوچہری دامغانی

دیکھو تخلص کس لطف سے کھپایا ہے،

آخر میں تصریح کی ہے کہ یہ قصیدہ میں نے ابوالشیص کے جواب میں لکھا ہے، ساتھ ہی قصیدہ کا مطلع بھی تضمین کیا ہے،

بدان وزن این شعر گفتم کہ گفتہ است — ابوالشیص اعرابی باستانی

سالقاکُ اللیل ملقی الجران — غراب ينوح علی غصن بان

ابن المعتز کا ایک قصیدہ سادات علوی کے معارضہ میں ہے،

ونحن بنوا العم اولی بھا،

اس قصیدہ پر منوچہری نے قصیدہ لکھا ہے، اور لطف یہ کیا ہے کہ عربی ضمیر کی

جو تھی اس سے فارسی میں جمع کا کام لیا ہے،

چو از زلف شب باز شد تابہا — فرو مرد قندیل محرابہا،
سپیدہ دم از بیم سرمای سخت — بپوشید بر کوہ سنجابہا،
بمیخوارگان ساقی آواز داد — فگندہ بہ زلف اندروں تابہا
بہ بانگِ نخستین ازین خواب خوش — بجستیم ما ہمچو طبطابہا
منجم ببام آمد از نو رمے — گرفت ارتفاع سطرلابہا

فارسی کے اور شعرا کے برخلاف منوچہری کو شعرائے عرب کے اکثر دیوان حفظ یاد تھے اور اس پر فخر کرتا تھا، ایک قصیدہ میں حاسد کو خطاب کر کے لکھتا ہے،

من بسے دیوان شعر تازیاں دارم زبر — تو ندانی خواند الاھبی بصحنک فاصبحین
یعنی مجکو عرب کے بیسیوں دیوان ازبر ہیں — اور سبعہ معلقہ کا یہ قصیدہ بھی نہیں پڑھ سکتا
الاھبی بصحنک فاصبحینا — ولا تبقی خمور الاندرینا

عربی پر اس کو یہ قدرت حاصل تھی کہ اپنے کلام میں عربی قصائد کی طرف اشارے کرتا ہے اور ان کے وہ ٹکڑے جن کے نام سے وہ قصیدے مشہور ہیں، بے تکلف تضمین کرتا جاتا ہے، ایک قصیدہ میں لکھتا ہے،

امرء القیس و لبید و اخطل و اعشیٰ و قیس — بر طلل ہا نوحہ کردندے و بر رسم تلی،
شاعری عباس کرد و حمزہ کرد و طلحہ کرد — جعفر و سعد و سعید و سید ام القری
آنکہ گفتست اذنتنا آنکہ گفت الاھبی — آنکہ گفت السیف اصدق آنکہ گفت ابلی الہوی

اس شعر میں چار قصیدوں کے مطلعوں کی طرف اشارہ ہے، یعنی

اذنتنا ببینہا اسماء — (سبعہ معلقہ کا قصیدہ ہے)
الاھبی بصحنک فاصبحینا — سبعہ معلقہ
السیف اصدق انباء من الکتب — ابوتمام کا مشہور قصیدہ ہے جو معتصم کی مدح میں عموریہ کی فتح کی تقریب پر لکھا گیا تھا،

(متنبی کا قصیدہ ہے)

ابی المهدی،

اس کے کلام میں اکثر عربی تلمیحات ہیں یہاں تک کہ محض فارسی داں اس کے کلام سے پورا لطف نہیں اٹھا سکتے، ایک قصیدہ کا مطلع ہے،

نوروز بر نگاشت بصحرا و مشک و مے ۔۔۔ تمثال ہائے عزہ و تصویرہائے مے

عرب میں لیلیٰ و شیریں کے بجائے جن معشوقوں کا نام آتا ہے لیلیٰ، اسمٰی، رباب، عزۃ، میہ، ثبینہ وغیرہ ہیں، عزۃ، کثیر کی معشوق تھی، جو بنی امیہ کے زمانہ کا مشہور شاعر تھا، میہ ذوالرمہ کی معشوق تھی، اسی میۃ کو منوچہری نے قافیہ کی ضرورت سے مے کہہ دیا ہے،

ایک اور قصیدہ میں لکھتا ہے،

باد برین صناعت مانی کند ہمے ۔۔۔ مرغ حزیں روایت معبد کند ہمے

معبد بنو امیہ کے زمانہ کا مشہور مغنی تھا،

روایت کردن کے معنی گانے کے ہیں، مرغ حزیں سے بلبل مراد ہے، یعنی بلبل معبد کے راگ گاتی ہے،

زمیں محراب داؤدست از بس سبزہ پنداری ۔۔۔ گشادہ مرغکاں بر شاخ چوں داؤد حنجرہا

با نظم ابن رومی و با نثر اصمعے ۔۔۔ با شرح ابن جنی و با نحو سیبویے

آں جایگاہ کانجمن سرکشاں بود ۔۔۔ تو، لو فلانی آں دگراں ابنہ دنی

(۲) اس کے کلام کی بڑی خصوصیت برجستگی، روانی اور شستگی ہے، یہ جوہر اگرچہ اس کا عام خاصہ ہے، لیکن اس کے ساتھ اور مختلف باتیں جمع ہو گئی ہیں، جن سے اور زیادہ شیرینی اور دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے، وہ اکثر شگفتہ ردیفیں پیدا کرتا ہے، کہیں کہیں ممدوح کے نام کو ردیف کرتا ہے، اور وہاں گریز کے موقع پر ممدوح کے نام سے خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، بعض جگہ کئی کئی شعر تنسیق الصفات[1] کی

[1] تنسیق الصفات کی مثال گھوڑے کی تعریف میں آئیگی،

صنعت میں لکھتا جاتا ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریشم پر موتی ڈھلکتے چلے آتے ہیں،

ماہ رمضان رفت و مرا رفتن آں بہ — عید رمضاں آمد والمنة اللہ

برآمدن عید بہ از رفتن روزہ — ساقی بدہ ہم بادہ بر باغ و بہ سبزہ

برنہ بکف دستم آں جام چو کوثر — جام دگر آور بکف دست دگر نہ

من می نخورم تا نبود بر دو کفم جام — یا ساتگنی بر سر خوانم نہ نہی سہ

چوں می بدہی نوش ہمی گوئی ہمی باش — چوں می بخورم جام ہمی گیرد ہمی چہ

دلم اندر دست تو دانی کہ ہوائے تو کند — لب من خدمت خاک کف پائے تو کند

رائگاں مشک فروشی نکند ہیچ کسے — ور کند ہیچ کسے زلف دوتائے تو کند

چہ دعا کردی جاناں کہ چنیں خوب شدی — تا چو تو چاکر تو تیر دعائے تو کند

از لطیفی کہ توئی اے بت و از شیرینی — ملک مشرق ہمہ بایست کہ رائے تو کند

یعنی تیری رائے میں آجائے

ایں جہاں کرد برائے تو خداوند جہاں — واں جہان نیز برآنم کہ برائے تو کند

صنما! از تو دلم ہیچ شکیبا نہ شود — اگر امروز شود بیشک فردا نہ شود

تجربت کردم و دانا شدم از کار تو من — تا مجرب نہ شود، مردم دانا نہ شود

نہ کشم ناز ترا و نہ دہم دل بہ تو ہم — تا مرا آشتی و مہر تو پیدا نہ شود

گوئی از دو لب من بوسہ تقاضا چہ کنی — وام خواہی نہ بود کو بتقاضا نہ شود

بہ مدارا دل تو نرم کنم، و آخر کار — بہ درم نرم کنم گر بہ مدارا نہ شود

وگر ایں عاشق نومید شود از در تو — از در خسرو شاہنشہ دنیا نہ شود

صنما گرد سرم چند ہمے گردانی — زشتی از روئے نکو زشت بود گردانی

یا بکن آنکہ شب و روز ہمی وعدہ دہی — یا مکن وعدہ ہر آں چیز کہ می نتوانی

دل من بردی و از خویشتنم دور کنی — بر نیاید صنما! کار بدیں آسانی

مہربانی نہ کنی بر من و مہرم طلبی — نہ دہی داد من و داد ز من بستانی

بیوفائی کُنی وناداں سازی تن خویش — نیستی اے بُتِ یکبارہ بدیں نادانی
از تو مارا نہ کنارہ نہ پیام ونہ سلام — مکن اے دوست کہ کیفر بری و رمانی
مکن اے دوست کہ بیداد نشانی نگذاشت
عدل بازآمدہ بابوالحسن عمرانی

نوروز روز گار و نشاط است وایمنی — پوشیدہ ابر دشت بہ دیبائے ارمنی
خیل بہار خیمہ بصحرا بروں زند — واجب کند کہ خیمہ بصحرا بروں زنی
برگل ہمی نشینی و برگل ہمیخوری — برخم ہمی خرامی و برپائے دن ہمی دنی
درّ است ناخریدہ و شک است رائیگاں — ہر چند برفشانی و ہر چند برچنی
شاخ بنفشہ بر سر زانو نہادہ سر — مانندہ مخالفِ بوسہل زوزنی
باد نوروزی ہمی در بوستاں ساحر شود — تا بہ سحرش دیدۂ ہر گلبنے ناظر شود
باد ہچوں زرگرے ہر سوئے زیبا بے — بوستاں آراستہ چوں کلبۂ تاجر شود
نوبہار انج جامہ صد رنگ پوشد تا اگر — دوستاں دوستاں خواجہ بوطاہر شود

منوچہری مناظرِ قدرت کا نقشہ نہایت خوبی سے کھینچتا ہے، صحرا، سبزہ، بادل، سیلاب، ہوا، وغیرہ وغیرہ کے اوصاف اکثر قصائد کی تمہید میں لکھے ہیں اور اس خوبی سے لکھے ہیں کہ اگر اس قسم کے اشعار الگ جمع کر دیئے جائیں تو نیچرل شاعری کا ایک عمدہ مجموعہ تیار ہو جائیگا،

ایک قصیدہ میں سفر کا حال لکھتے لکھتے آب و ہوا کے طوفان کا حال لکھا ہے، اس موقع پر ہوا کے جھونکے، بجلی کی چمک، بادلوں کی گرج، پانی کے سیلاب کا نقشہ دیکھو کس طرح کھینچا ہے،

برآمد بادے از اقصائے بابل — ہبوبش خارہ در و پارہ افگن

ل دن یعنی خم شراب دنی، دیندن سے مشتق ہے، جس کے معنی اکڑ کر چلنے کے ہیں،

توگفتی کز ستیغ کوہ سیلی ۔۔۔ فرو بارد ہمے احجار صدمن
زروے بادیہ برخاست گرشے ۔۔۔ کہ گیتی کردہ ہمچوں خز ادکن
چناں کز روے دریا بامداداں ۔۔۔ بخار آب خیزد ماہ بہمن
برآمد زاغ رنگ و مار پیکر ۔۔۔ یکے میغ از ستیغ کوہ قارن
چناں چوں صدہزاراں خرمن تر ۔۔۔ کہ عمداً در زنی آتش بہ خرمن
بجستے ہر زماں از تیغ برقی ۔۔۔ کہ کردے گیتی تاریک روشن
خروشی برکشیدے تنار تندر ۔۔۔ کہ موے مردماں کردے چو سوزن
توگفتی نامے رومی ہر زمانے ۔۔۔ بگوش اندر دمیدے یک دمیدن
بلرزیدے زمیں زلزلہ سخت ۔۔۔ کہ کوہ اندر فتادے زو بگردن
توگفتی ہر زمانے ژندہ پیلے ۔۔۔ بلرزاند ز رنج پشگان تن
فروبارید بارانے زگردوں ۔۔۔ چناں چوں برگ گل بارد زگلشن
دیا اندر تموزی مہ ببارد ۔۔۔ جراد منتشر بربام و برزن
زصحرا سیلہا برخاست ہرسو ۔۔۔ دراز آہنگ و پیچاں و زمیں کن
چو ہنگام عزائم زی معزم ۔۔۔ بتگ خیزند ثعبانان ریمن
نماز شامگاہاں گشت صافی ۔۔۔ زروے آسماں ابر معکن

بہار کی تعریف شعراے ایران کا ایک عام موضوع ہے جس پر ابتدا سے آج تک سب طبع آزمائیاں کرتے آئے ہیں، لیکن قدماء اور متاخرین میں سے کسی نے منوچہری کی طرح نیچر کی تصویر نہیں کھینچی، اس نے سیکڑوں جگہ بہار کا نقشہ دکھایا ہے، اور ہر جگہ گویا فطرت کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے، وہ اور شعرا کی طرح صرف گل و بلبل پر قناعت نہیں کرتا، بلکہ ایک ایک پتے، پھول پھل، شاخ، درخت، اور ان سب سے بڑھ کر جانوروں اور پرندوں کی صورت اور حالت دکھاتا ہے،

پرندوں کی حالت،

کبکانِ بے آزار کہ بر کوہ بلند اند ——— بے قہقہہ یکبار ندیدم کہ بخندند

جز خارِ[1] بناں جائیگہ خود نہ پسندند ——— بر پہلو ازیں نیمہ بداں نیمہ بدندند[2]

هر ساعتگی سینہ بمنقار بپرند نار،

چوں جرغ[3] بر و سینہ و چوں لبسد منقار

شب گیر زگل فاختگاں بانگ برآرند ——— گوئی کہ سحرگاہ ہمی خواب گزارند

ماہ سہ شنبہ[4] از بر گردن بنگارند ——— از غالیہ بے آنکہ ہمی غالیہ دارند

صد بار بروزی در پرہا بشمارند[5]

چوں نیم دبیری کہ غلط کردہ با شمار[6]

هر ساعتگی بط سخنے چند بگوید ——— در آب جہد جامہ دگر بار بشوید

در آب کند گردن و در آب بپوید ——— گوئی کہ مگر چیزے در آب بجوید

چوں سینہ بجنباند و یک لخت بپوید

از ہر سر پرش بجہد صد در شہوار

آمد نوروز وہم از بامداد ——— آمدنش فرخ و فرخندہ باد

باز جہاں خرم و خوب ایستاد ——— مرد زمستاں و بہاراں بزاد

ز ابر سیہ روے سمن بوے دار

گیتی گردید چو دار القرار

---

[1] خار بناں، خار زار و مست [2] بدندند، منحرا مند،

[3] جزع مہرہ سلیمانی کہ سفید و سیاہ باشد [4] بسد، یاقوت، [5] کہتا ہے کہ قمریاں اس طرح بار بار اپنے پروں کو گنتی ہیں (کھولتی ہیں) جس طرح کہ نو آموز حساب داں بار بار حساب بھول جاتا ہے اور ہر کاغذ کو الٹتا ہے [6] اشمار، شمار،

روے گُل سُرخ بیاراستند   زلفکِ شمشاد بہ پیراستند
کبکاں بر کوہ تبک خواستند   فاختگاں ہمبر بنشاستند
بلبلکاں زیر (زیر و بم) ستا خواستند،
نالے زناں بر سرِ شاخ چنار،
طوطیکاں برگلکاں تاختند   آہوکاں گوشش برافراختند
گورخراں میمنہا ساختند   زاغان گلزار بہ پرداختند
بے دلکاں (عاشق) در پے دل تاختند
با ترکاں چگل و قندھار
مُرغ نہ بینی کہ چہ خواندہمے   میغ نہ بینی چہ ستاندہمے
دشت نہ بینی بچہ ماندہمے   دوست نہ بینی چہ ستاندہمے
باغ بُتاں زبنشاندہمے
بر سمن و نسترن و لالہ زار

کردہ گلو پُر ز باد قمری سنجاب پوش   کبک فروریختہ مشک بسوراخ گوش
بلبلکاں بانشاط قمریکاں باخروش   در دہن لالہ مشک در دہن نحل نوش
سوسن کافور بوی گُلبنِ گوہر فروش
از مہ اردی بہشت دہر بہشت بریں
چوک (نام مرغے است) ز شاخ درخت خویشتن آویختہ   زاغ سیہ پر و بال غالیہ آمیختہ
ابر بہاری ز دور اسپ برانگیختہ   وز سم اسپ سیاہ لولو تر ریختہ
در دہن لالہ باد ریختہ و بیختہ
ریختہ مشک سیاہ بیختہ در ثمیں

سرو سماطی کشید بر دو لب جوئبار | چون دو رده چتر سبز در دو صف کارزار
مرغ نهاد آشیان بر سر شاخ چنار | چون سپر خیزران بر سر مرد سوار

گشت نگارین تذرو پنهان در کشت زار
ہمچو عروسی غریق در بن دریاے چین

گوئی بط سفید جامه بصابون زدہ است | کبک دری ساق پاے در قدح خون زدہ است
بر گل تر عندلیب گنج فریدوں زدہ است | لشکر چین در بہار در کہ ہاموں زدہ است

لالہ بسوے جوئبار خرگہ بیروں زدہ است
خرگہ او سبز گوں خیمہ او آتشین

بادل جب برستے ہیں تو کبھی قطرہ افشانی ہوتی ہے، کبھی ننھی ننھی پھوار پڑتی ہے، کبھی جھڑی لگ جاتی ہے، سبزہ پر، مختلف قسم کے پھولوں پر، تالاب کی سطح پر، بوندوں کے پڑنے سے طرح طرح کی صورتیں پیدا ہو کر ہر ایک کا الگ الگ سماں نظر آتا ہے منوچہری نے ایک موقع پر تشبیہات کے پیرایہ میں اس کی تصویر کھینچی ہے،

آں قطرۂ باراں بیں از ابر چکیدہ | گشتہ سر برگ از اں قطرہ بہ آثار
آویختہ چوں ریشہ و دستارچۂ سبز | سیمیں گرہے بر سر ہر ریشہ و دستار
یا ہمچو زبرجد گوں یک دستہ سوسن | اندر سر ہر سوزن یک لولوِ شہوار
واں قطرۂ باراں کہ فرو بارد شب گیر | بر طرف چمن بر دو رخ سرخ گلنار
گوئی بہ مثل بیضۂ کافور ریاحی | بر بیرم حمرا بہ پراگندش عطار
واں قطرۂ باراں کہ فرو آید از شاخ | بر تازہ بنفشہ نہ بہ تعجیل بہ ادرار
گوئی کہ مشاطہ ز بر فرق عروساں | یاورد ہمے ریزد بار یک بمقدار
واں قطرۂ باراں کہ چکد از بر لالہ | گرد طرف لالہ از اں باراں بنگار
پنداری تبخالہ خرد کہ بدمید است | بر گرد عقیقین دو لب دلبر عیار

وان قطرهٔ باران کہ برافتد بہ سر خوید — چون قطرهٔ سیماب بر افتادہ بہ زنگار
وان دائرہ ہا بنگر اندر شمر آب (تالاب) — ہر گہ کہ دران آب چکد قطرهٔ امطار
چون مرکز پرکار است آن قطرهٔ باران — وان دائرہ آب بسان خط پرکار
ہر گہ کہ ازان دائرہ انگیزد باران — وز باد در و چین و شکن خیزد ہر بار
گوئی علمی از سقلاطون پیدا است — وز باد جہندہ متحرک شدہ بسیار
وانگہ کہ فرو بارد باران بہ قوت (اطلس) — گیرد شکن آب دگر صورت و آثار
گرد شمر اید ون چو یکے دام کبوتر — دیدار زیک حلقہ پسے ہمیں منقار (یعنی نظر آتاہے)

حلیہ نگاری یعنی کسی خاص چیز کا سراپا لکھنا اور اس کے تمام اوصاف کا بیان کرنا منوچہری
اس کا گویا موجد ہے، قصائد میں شعراء بادشاہ کی مدح کے ساتھ تلوار گھوڑے وغیرہ کی
تعریف بھی کرتے ہیں، عبد الواسع جبلی اور عرفی شیرازی اس میدان میں سب سے آگے
ہیں، لیکن ان کے ہاں محض خیالی باتیں ہیں، بخلاف اس کے منوچہری نے تصویر کھینچ کر
رکھ دی ہے، اس کے ساتھ اکثر صنعت تنسیق الصفات کا التزام کیا ہے، اور یہاں
اس کی قدرت زبان کا اندازہ ہوتا ہے، کہ بے تکلف موزوں اور متناسب الفاظ کا انبار
لگاتا چلا جاتا ہے،

سراپا نگاری

جندا سپے محجل مرکبے تازی نژاد (گھوڑا) — نعل او پروین نشان و سم او خارا شکن
رام زین و کش خرام و خوش عنان و تیز گام — شخ نورد و بارہ جوی و سیل بر و کوہ کن
پشت او ی دست او ی گوش او ی و گردنش (خوش خرام) — چون کمان و چون سلاح و چون سنان و چون مجن (زمین سخت)
گاہ شیب اندر شیب تازم گاہ تازم بر فراز — چون کسی کو گاہ بازی بر نشیند بر رسن (سپر)

گھوڑا

زیر خواہم زود خیزد و تیز سیر و دور بین — خوش عنان و کش خرام و پاک زاد و نیک خوی
سخت پلے و فخم ران و راست دست دگر دسم — تیز گوش و پہن پشت و نرم چرم و خورد موی (خوش خرام)

ابر سیر و باد گرد و رعد بانگ و برق جہ — کوہ کوب و سیل بر و شیخ نورد وارہ جوی
گورساق و شیر زہرہ یوز تازہ و عزم تگ — پیل گام و گرگ سینہ رنگ تاز و گرگ پوی
تیز چشم آہن جگر فولاد دل کمیخت لب — سیم دندان چاہ بینی ناوہ کام و لوح روی
نیزہ و گرز و کمند و ناچخ و تیر و کمان — گردن و گوش و دم و سم و دہان و ساق اوی

ببرچہ، بادگزر، یوزدو، وکوہ قرار — شیر تگ، پیل قدم، گوردو آہو پرواز
گوش و پہلو و میان و کتف و جبہہ و ساق — تیز فربی و نزار و قوی و پہن و دراز
رہ برد شیخ شکن و شیر دل و ببر عنان — خوش ز و و سخت سم و پاک تن و جنگ آغاز

منوچہری نے اگرچہ کوئی مثنوی نہیں لکھی جس سے واقعہ نگاری کی ترقی کا قدم آگے بڑھتا، لیکن اکثر قصائد کی تمہید میں وہ واقعہ نگاری کا پیرایہ ڈھونڈھ لیتا ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مسلسل داستان لکھ رہا ہے، ان موقعوں پر اس کی قوت بیان کا اندازہ ہوتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے، کہ وہ محض مداحی کے لئے قصیدہ نہیں کہتا، بلکہ زبان کی ترقی دینے کو پیش نظر رکھتا ہے، ایک قصیدہ میں عرب کے انداز پر قافلہ کی روانگی، محبوب کی رخصت اور سفر کے حالات لکھے ہیں،

الا یا خیمگی خیمہ فرو ہل — کہ پیش آہنگ بیروں شد ز منزل
تبیرہ زن بزد طبل نخستیں — شتربانان ہمے بندند محمل
نماز شام نزدیک است امشب — مہ و خورشید را بینم مقابل
ولیکن ماہ دارد قصد بالا — فرو شد آفتاب از کوہ بابل
چناں دو کفۂ زریں ترازو — کہ ایں کفہ شود زاں کفہ مائل
نگار من چو حال من چناں دید — بباریداز مژہ باران وابل
بیامد او فتاں خیزاں بر من — چو آں مرغے کہ باشد نیم بسمل

دو ساعد را حمائل کرد بر من — فرو آویخت از من چوں حمائل
چو برگشت از من آں معشوق ممشوق — نہادم صابری را سنگ بر دل
نگہ کردم بہ گردِ کارواں گاہ — بہ جائے خیمہ و جائے رواحل
نہ وحشی دیدم آنجا و نہ انسے — نہ راکب دیدم آنجا و نہ راجل (کجاوہ) (پیادہ)
نجیبِ خویش را دیدم بیکسو — چو دیوے درّت و پا اندر سلاسل
کشادم (گھوڑا) ہر دو زانو بندش از بند — چو مرغے کش کشاید از حبایل
بر آوردم زمامش از بنا گوش — فرو ہشتم ہویدش تا بہ کاہل
چو مسّاحی کہ پیماید زمیں را (باگ) — بہ پیمودم بپائے او مراحل
ہمی رفتم شتاباں در بیاباں — ہمے کردم بیک منزل دو منزل
ہمی بگداخت برف اندر بیاباں — تو گوئی دار دش بیماری سل
چو پاسے از شب دیرندہ بگزشت — بر آمد شعریاں از کوہ موصل
رسیدم من فرازِ کارواں تنگ (قریب) — چو کشتی کو رسد نزدیک ساحل
جرس دستاں گوناگوں ہمی زد — بسانِ عندلیبے از عنادل
ز نوک نیزہ ہائے نیزہ داراں — شدہ وادی چو اطراف سنابل
نجیب خویش را گفتم بسکتر — الا یا دستگیر مرد فاضل،
بحرکت عنبریں بادا چراگاہ — بجسم کت آہنیں بادا مفاصل
بیاباں در نورد و کوہ بگذار — منازلہا بکوب و راہ بگسل
فرود آور بدرگاہ وزیرم، — فرود آوردن اعشی بہ ناہل

اقسامِ سخن میں سے منوچہری کے مسمطات مشہور ہیں، وہ درحقیقت اس طرز کا موجد ہے: اور خود بھی اس کو اس پر ناز ہے، چنانچہ کہتا ہے،

---

[1] مسمط میں چھ مصرعے ہوتے ہیں جن میں سے پانچ مصرعوں کے قافیے متحد ہوتے ہیں،

طاؤس مدیح عنصری خواند   دراج مسمطِ منوچہری

ان مسمطات میں اکثر جگہ واقعہ نگاری کے نئے نئے اسلوب اختیار کئے ہیں، ایک مسمط میں انگوروں کے پھلنے اور ان سے شراب کھینچنے کو ایک حکایت کے پیرایہ میں ادا کیا ہے، یعنی انگور ایک عورت ہے، اس نے لڑکیاں جنی ہیں، انگور والا خوش ہے کہ یہ میری لڑکیاں ہے، اکثر آ آ کر دیکھتا ہے، اور خوش ہوتا ہے، اتفاق سے اسے باہر جانا پڑا آ کر دیکھا تو بچوں کے سُرخ سفید، چہرے سیاہ ہو گئے ہیں، اور اُن کے پیٹ نکل آئے ہیں، اس کو سخت رنج ہُوا کہ یہ لڑکیاں بدکار نکلیں، لڑکیوں نے عُذر خواہی کی لیکن اُس نے نہ مانا اور اُن کے گلے کاٹ ڈالے، اسی طرح شراب پینے کی اخیر حالت تک حکایت کے پیرایہ میں بیان کی ہے،

شاخِ انگور کہن دخترکانِ زاد بسے   کہ نہ از درد بنالید نہ بزد نفسے
ہمہ را زاد بیک دفعہ نہ پیش نہ پسے   نہ ورا قابلۂ بود نہ فریاد رسے
این چنین آسان فرزند ندیدست کسے
کہ نہ ور دسے بگرفتش متواتر نہ تبے

چون نگہ کرد بران دخترکان مادر پیر   سر بود ندیکایک چہ صغیر و چہ کبیر
کردشان مادر بستر ہمہ از سبز حریر   نہ خورش داد مران بچگان ہیچ و نہ شیر
نہ شغب کردند آن بچگان نیز نہ ہیچ نفیر
بچۂ گرسنہ دیدی کہ ندارد شغبے

بچگانش بنہادند تنِ خویش بر آب   نہ جہیدند و نہ جستند ازان بسترِ خواب
گرد کرد ندسرین محکم کردند رتاب   رُبیہا کبستر کردند بہ نگار خضاب
دادشان زبان پیوستہ شراب و چو گلاب
نشد از جانب شان غائب روز و نہ شبے

گفت پندارم کین دخترکان آن من اند | چون دل و چون جگر و چون تن و چون جان من اند
تا بباشند درین زود مهمان من اند | رزه فردوس من است ایشان رضوان من اند

تا درین باغ و درین خانه و درین مان من اند
دارم اندر سر شان سبز کشیده شطبے،

در چه بگشاد بدان دخترکان کرد نگاه | دید چون زنگی هر یک را دو رخ سیاه
جای جای بچه تابان چون زهره و ماه | بچۂ سرخ چو خون و بچۂ زرد چو کاه

سرنگونسار ز شرم و رخ تیره زگناه
هر یکے با شکم حاملۂ و بانا زبیے،

رز بان را بدو ابروی در افتاده گره | گفت لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللہ
این بلاے بچگان در حق من آمده زه | همه آبستن گشتند بیک شب که بیه

نیست یک تن بمیان همگان ایدر به
این چنین زانیه باشد بچۂ هر عنبے،

دختران رز گویند که ما بے گنهیم | ما تن خویش بدست بنی آدم نه دهیم
ما همه سر بسر آبستن خورشید و مهیم | ما توانیم که از خلق جهان دور جهیم

نتوانیم که از ماه و ستاره برهیم
ز آفتاب و مه مان سود ندارد هربے

روز هر روزی خورشید بتابد بر ما | خویشتن در فگند بر تن ما و سر ما
چون شب آید برود خورشید از محضر ما | ماهتاب آید و برچسپد در پیکر ما

وین دو تن دور نه گردند ز بام و در ما
نکند هیچ کس این بسا دبان را ادبے

منوچہری کی خصوصیات میں ایک بڑی چیز تشبیہ کی صنعت ہے، جہاں کسی منظر یا

حالت کا بیان کرتا ہے، سیکڑوں نئی تشبیہیں پیدا کرتا جاتا ہے، اور یہ اُس کا خاص انداز ہے، اس بہتات کے ساتھ کوئی تشبیہ جدت سے خالی نہیں ہوتی، اس زمانہ تک خیالی اور فرضی تشبیہیں پیدا نہیں ہوئی تھیں، اِس لئے عموماً تمام شعرا محسوسات اور مادیات سے تشبیہ دیتے تھے، لیکن وہی چند مفرد تشبیہیں تھیں جو بار بار ادا ہو کر مبتذل ہو گئی تھیں، منوچہری کی اکثر تشبیہیں مرکب ہیں اور اس کے ساتھ خاص جدت ہے، مثالیں ملاحظہ ہوں،

آفتاب کا صبح کے وقت بتدریج طلوع ہونا،

بکردار چراغ نیم مُردہ   کہ ہر ساعت فزوں گردش روغن

یعنی آفتاب کی روشنی اس طرح آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہے، کہ جس طرح ایک چراغ جو بجھ چلا تھا، اس میں کوئی شخص بتدریج تیل ڈالتا جاتا ہے،

زمین کا بھونچال سے لرزنا،

تو گفتی ہر زمانے ژندہ پیلے   بلرزاند ز رنج پشہ گان تن

یعنی زمین بھونچال سے اِس طرح جُنبش میں ہے، جس طرح ہاتھی مچھروں کے اذیت دینے سے جُھرجُھریاں لیتا ہے،

ہلال

چناں چون دو سر از ہم باز کردہ   ز زرِ سرخ یک دست آورنجن

یعنی پہلی رات کا چاند اس طرح نظر آتا ہے کہ گویا کسی نے طلائی کڑے کے دونوں سرے کھول دیئے ہیں،

بید کے پتے

واں برگہائے بید تو گوئی کسی بقصد   پیکانہائے ز مرد زبرجد کند ہمے

بید کے پتے ایسے معلوم ہوتے ہیں، کہ گویا کسی نے دانستہ زمرد کے پیکان جوڑے بنائے ہیں،

ہُدہُد اور اسکی کلغی

بوبویک پیکے نامہ زدہ اندر سر خویش   نامہ گہ باز کند گہ شکند بر شکنا

ہُدہُد گویا نامہ بر ہے جس نے خط کو اپنی پگڑی میں کھونس لیا ہے، کبھی اس کو کھولتا ہے،

کبھی تہ کرکے لپیٹ لیتا ہے،

ہُدہُد اکثر اپنی کلغی کو پھیلا دیتا ہے، اور پھر سمیٹ لیتا ہے،

مناظرِ قدرت کے اشعار جو اُوپر گزرے ہیں، ان میں بھی اکثر تشبیہات ہیں، ان کو بھی سامنے رکھنا چاہیئے،

پانچویں اور چھٹی صدی

پانچویں صدی کے آغاز میں اگرچہ شاعری کی ترقی کی رفتار گھٹ گئی جس کی وجہ یہ تھی کہ اس صدی کے وسط میں غزنوی حکومت کا زوال شروع ہو چلا تھا، اور نئی طاقتیں ابھی شباب تک نہیں پہنچی تھیں، لیکن صدی کے ختم ہوتے ہوتے جبکہ غزنوی سلطنت کا زور سلجوقیہ کی طرف منتقل ہو گیا، دفعتہً بحرِ سخن میں طوفان آگیا، سلجوقیہ کا پہلا فرماں روا رکن الدین طغرل بک تھا جو محرم ۴۲۹ھ میں بمقام نیشاپور مسند نشین ہوا، اس سلسلہ نے اگرچہ صرف ۱۶۳ برس کی عمر پائی، لیکن اتنی ہی تھوڑی مدت میں جو باتیں اس نے حاصل کیں، تاریخ اسلام کو اس سے گوناگوں اور وسیع تعلقات ہیں، اوّل تو اس سلطنت نے جو وسعت پیدا کی، ابتدائے اسلام سے آج تک کبھی کسی عہد میں نہیں ہوئی تھی، اسی کے ساتھ عدل و انصاف اور امن و امان کا یہ حال تھا کہ خراسان سے شام تک ایک بڑھیا تن تنہا سونا اچھالتا جاتا تھا، اور کوئی خبر نہیں ہوتا تھا، ایک عجیب بات یہ ہے کہ ایران، عراق، روم میں جو بڑی بڑی پُرزور سلطنتیں قائم ہوئیں، سب کی سب اسی سلسلہ کی شاخیں تھیں، ترکوں سے پہلے جو سلاطین شاہان روم کہلاتے تھے، اسی خاندان کی ایک شاخ تھے، سلاطین خوارزم شاہیہ جن کی شوکت و شان محتاجِ بیان نہیں، ان کا مورث اوّل یعنی نوشتگین اسی خاندان کا غلام در غلام تھا، اتابکوں کے متعدد خاندان جن میں سے نور الدین زنگی سلطان صلاح الدین کا آقا، قزل ارسلان ظہیر فاریابی کا ممدوح اور اتابک ابوبکر ابن سعد زنگی شیخ سعدی کا مربّی اور سرپرست تھا، سب اسی خاندان کے غلام یا خانہ زاد تھے،

سلجوقیہ کے اوجِ شباب کا زمانہ ملک شاہ اور سنجر کا زمانہ ہے، اور یہی دَور فارسی شاعری کا معراجِ شباب ہے، سلجوقی شعراء کی فہرست نہایت وسیع ہے جن میں سے چند نام یہ ہیں،

امیر معزی، ازرقی، لامعی، فخر الدین اسعد، شہابی خراسانی، عبد الواسع جبلی، انوری، حسن غزنوی، رضی الدین نیشاپوری، ادیب صابر، علی باخرزی، فتوحی مروزی، فرقدی، کافی ہمدانی، نظامی عروضی، نظامی گنجوی، شمس الدین خراسانی، سوزنی، ابو المعالی، (مجمع الفصحاء کے دیباچہ میں اور بہت سے نام لکھے ہیں)

اس دَور کی چند خصوصیات لحاظ کے قابل ہیں،

اس عہد تک شاعری نے اگرچہ بے انتہا ترقی کرلی تھی، لیکن یہ ترقی صرف مضمون اور فن کی حیثیت سے تھی، شاعری کی زبان اب تک ٹکسالی نہ تھی، شاعری کی بنیاد سامانی حکومت میں قائم ہوئی، اور غزنویہ کے عہد میں اوجِ ترقی تک پہنچی، ان خاندانوں کے پایہ تخت بخارا اور غزنین تھے، جہاں کی مادری زبان ترکی یا افغانی تھی، شعراء جس قدر تھے من حیث الاغلب سب کے سب انہی مقامات کے رہنے والے تھے جو ایران اصلی مرکز یعنی شیراز اصفہان و نیشاپور سے دُور تھے، فرخی، سیستانی تھا، عنصری بلخ کا رہنے والا تھا، منوچہری دامغان سے تعلق رکھتا تھا، عسجدی اور دقیقی مرو کے رہنے والے تھے، سلجوقیہ نے نیشاپور کو پائے تخت قرار دیا، اس تعلق سے ان لوگوں میں شاعری پھیلی جو ایران کی زبان کے اصلی مالک تھے، اسی کا اثر ہے کہ اس عہد کے شعرا کی زبان زیادہ لطیف، شیریں اور محاورات اور مصطلحات سے لبریز ہے،

اس عہد میں فارسی زبان کی ترقی کی ایک اور وجہ یہ ہوئی کہ اب تک تمام اسلامی

[1] ملک شاہ ۴۶۵ھ میں تخت نشین ہوا، ۴۸۵ھ میں وفات پائی، اسکے بعد سنجر نے اپنے بھائیوں کی طرف سے نیابت بیس برس تک اور پھر مستقل حکومت کی اور ۵۵۲ھ میں انتقال کیا،

سلطنتوں کی علمی اور دفتری زبان عربی تھی، سُلطان محمود اپنے مُلکی اور قومی خصوصیات کا بہت دلدادہ تھا تاہم دفتر کی زبان اس کے عہد میں بھی عربی ہی رہی، فرامین اور توقیعات تک اسی زبان میں لکھے جاتے تھے، لیکن الپ ارسلاں سلجوقی جب تخت نشین ہوا تو اس نے حکم دیا کہ دفتر کی زبان فارسی کردی جائے، چنانچہ دولت شاہ سلجوقی نے طبقہ اول کے شعراء کا جہاں ذکر شروع کیا ہے تفصیل سے اس واقعہ کو لکھا ہے، یہ ظاہر ہے کہ فارسی زبان جس کے عنصر میں ترقی کا مادہ مَوجُود تھا، سلطنت کی زبان بن کر کس قدر ترقی کر گئی ہوگی،

سلطان سنجر کی قدردانی اور حاتمانہ فیاضی نے پھر وہی محمودی دربار قائم کر دیا، میر معزی کو ملک الشعراء کا خطاب ملا اور بڑے بڑے شعرا پایۂ تخت کے شاعر قرار پائے دولت شاہ لکھتا ہے،

اما از شعراے بزرگ کہ در دور سُلطان سنجر بودہ اند، و مدح سُلطان گفتہ اند وصلہ و تربیت یافتہ، ادیب صابر ارت و رشید وطواط و عبدالواسع جبلی و فرید کاتب و انوری خاوری و ملک عمادی و سوزنی و سید حسن غزنوی و مہستی و بیرہ کہ مجیب سلطان وظریفہ روزگار بودہ [۵]،

سنجر کی شاعرانہ مذاق اور قدردانی کی داستانیں اکثر تذکروں میں مذکور ہیں، اُن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شاعری کی قدر و قیمت اس کے دربار میں کیا تھی،

ایک دفعہ ارکانِ دولت کے ساتھ عید کا چاند دیکھنے نکلا، سب سے پہلے ہلال پر اسی کی نظر پڑی، خوشی سے اُچھل پڑا، سب کو اُنگلی کے اشارے سے بتایا، ساتھ ہی حکم دیا کہ کوئی شاعر فی البدیہہ ہلال کی تعریف میں شعر سنائے، معزی اس وقت تک دربار میں امیدواری کرتا تھا، موقع پا کر اس نے برجستہ کہا،

اے ماہ چو ابروان یاری گوئی یا ہمچو کمان شہریاری گوئی

---

۵ دولت شاہ ذکر عمق بخاری،

نعلے زدہ از زر عیاری گوئی   در گوش سپہر گوشواری گوئی،

یعنی اے چاند تو ابروے معشوق ہے، یا بادشاہ کی کمان، یا سونے کا نعل یا آسمان کے کان کا آویزہ!!

سنجر نے اسپ خاصہ اور پانچہزار درہم عطا کئے، معزی نے پھر برجستہ کہا،

چوں آتش خاطر مرا شاہ بدید؟   از خاک مرا بر زبر ماہ کشید

چوں آب یکے ترانہ از من بشنید   چوں باد یکے مرکب خاصم بخشید

سنجر نے ہزار دینار کے عطیہ کے ساتھ حکم دیا کہ شاہی لقب اس کے خطاب میں شامل کیا جائے،

چونکہ سنجر کا لقب معزالدین تھا، اس لئے معزی لقب پڑا جو آج تخلص ہوکر مشہور ہے،

ایک دفعہ سلطان سنجر گیند کھیل رہا تھا، اتفاق سے گھوڑے نے شوخی کی، اور سنجر گھوڑے سے گر گیا، معزی نے برجستہ یہ رباعی پڑھی،

شاہا ادبے کن، فلک بدخو را   کو چشم رسانید رُخ نیکو را

گر گوے خطا کرد بہ چوگانش زن   ور اسپ خطا کرد بمن بخش اورا

یعنی اے بادشاہ! آسمان کو ذرا تنبیہ کر دیجئے، اُس نے آپ کو نظر لگادی، اگر گیند کی خطا ہے تو چوگان سے اُس کو ماریئے، اور گھوڑے کا قصور ہے تو میرے حوالہ فرمائیے، اخیر کا مصرع دو پہلو رکھتا ہے، سنجر نے گھوڑا معزی کو عنایت کیا، معزی نے دوبارہ رباعی پیش کی،

رفتم بر اسپ تا بہ جرمش بکشم   گفتا کہ نخست بشنو این عذر خوشم

نے گاؤ زمینم کہ جہاں برگیرم   نے چرخ چہارمیں کہ خورشید کشم

یعنی میں نے گھوڑے کو سزا دینی چاہی، اس نے کہا کہ پہلے میرا عذر تو سُن لیجئے، میں

سے مجمع الفصحاء اور تذکرہ دولت شاہ وغیرہ،

کچھ گاوِ زمیں تو نہیں کہ عالم کا بار اُٹھالوں، نہ چوتھا آسمان ہوں کہ آفتاب کو لئے پھروں،
مطلب یہ کہ سلطان سنجر کا بار اُٹھانا گاؤ زمین اور آفتاب کا کام ہے،

مہستی ایک مشہور شاعرہ تھی، جس کی حاضر جوابیاں اور ظریفانہ فقرے مشہور عالم ہیں،
سنجر کی شاعرانہ صحبتوں میں وہ بھی شریک ہوا کرتی تھی، ایک دفعہ مجلسِ عیش قائم تھی،
مہستی بھی موجود تھی، کسی کام سے باہر نکلی تو دیکھا برف پڑ رہی ہے، واپس آئی،
سنجر نے پُوچھا ہوا کا کیا رنگ ہے، مہستی نے فی البدیہہ رباعی پڑھی،

شاہا فلکت اسپ سعادت زیں کرد | وز جملہ خسرواں ترا تحسیں کرد
تا در حرکت، سمند زریں نعلت | بر گِل نہ نہد پاے زمیں سیمیں کرد

یعنی آسمان نے اس غرض سے کہ آپ کے گھوڑے کے پاؤں خاک پر پڑنے نہ پائیں
زمین پر چاندی بچھادی، سنجر نہایت محظوظ ہوا، اور اسی دن سے مہستی سنجر
کے مقربین میں داخل ہوگئی،

غزنوی خاندان نے بھی اس عہد میں سنبھالا لیا، بہرام شاہ جو سلطان محمود کی
چوتھی پُشت میں تھا، اور ۵۱۲ھ میں تخت نشین ہُوا تھا، نہایت شان و شوکت کا بادشاہ
اور نہایت علم دوست اور مربیِّ فن تھا، تاریخ فرشتہ میں اس کا تذکرہ اِن لفظوں سے
شروع کیا گیا ہے،

"او بادشاہے بود ذی شوکت و صاحب حشمت، با علما و فضلا بسیار نشستے و صحبت ایشاں
دوست داشتے، و ہر کسے را بقدر علمش رعایت کردے، لہٰذا فضلاے آں روزگار
باسم شریفش کتب ساختہ اند و تصنیفات پرداختہ اند"

کلیلہ و دمنہ جس کا ترجمہ پہلوی زبان سے عبد اللہ بن المقفع نے عربی میں کیا تھا بہرام شاہ
کے حکم سے فارسی زبان میں ترجمہ کی گئی، اور یہ پہلا دن تھا کہ ایران اور ہندوستان میں
اس کا عام رواج ہوا، بہرام شاہ ہی کو یہ فخر نصیب ہوا کہ حکیم سنائی نے جو تعلقات

دُنیوی سے آزاد ہو چکے تھے، اپنی کتاب حدیقہ اس کے نام پر لکھی، (بہرام شاہ نے ۵۴۷ھ میں وفات پائی)

ان سلاطین کے علاوہ اور بڑے بڑے دربار تھے، جہاں شاعری کی تربیت کی جاتی تھی، ان میں سب سے زیادہ علم دوست طغان شاہ سلجوقی تھا، چہار مقالہ میں لکھا ہے،

"آلِ سلجوق ہمہ شعر دوست بودند، اما ہیچکس شعر دوست تراز طغان شاہ الپ ارسلان نبود، محاورت و معاشرتِ او ہمہ باشعرا بود و ندیمان او ہمہ شعرا بودند، چوں امیر عبداللہ قریشی و ابوبکر ازرقی، و ابو منصور یُوسف و شجاعی قوی و احمد بدیہی و حقیقی و نسیمی اینہا مرتب خدمت بودند و آیندو روند بسیار بودند"

اسی طرح شروان شاہ کے دربار کا ملک الشعرا خاقانی اور خوارزم شاہ کا رشید الدین وطواط تھا،

صوفیانہ شاعری

بہرام شاہ کے عہد کا یہ کارنامہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ تصوّف اور اخلاقی شاعری کا سنگِ بُنیاد اسی عہد میں رکھا گیا، اور صدی کے ختم ہونے سے پہلے پہلے، یہ عمارت گویا انجام کو پہنچ گئی، چنانچہ اس کی تفصیل حکیم سنائی، اوحدی اور خواجہ فرید الدین عطار کے حالات میں آئے گی،

فلسفیانہ شاعری

فلسفیانہ شاعری بھی اسی دَور کی یادگار ہے، فلسفہ کے خیالات سب سے پہلے حکیم ناصر خسرو نے اشعار میں ادا کئے، لیکن وہ محض فلسفہ ہی فلسفہ تھا، شاعری نہ تھی، برخلاف اس کے اِس عہد میں عمر خیام نے فلسفیانہ مسائل اور خیالات کو اس انداز سے ادا کیا کہ ظاہر بین آدمی کو اس میں صرف شاعری نظر آتی ہے، حالانکہ وہ فلسفیانہ نازک مسائل ہیں جو دلکش اور دلفریب پیرایہ میں ادا کر دیئے گئے ہیں،

اِس عہد تک شاعری میں عشق و عاشقی کی رُوح نہ تھی، مثنوی رزم پر محدود تھی، قصائد کا مقصود مداحی تھا، تشبیب میں معشوق کا جو ذکر کرتے تھے، وہ صرف عرب کے قصائد کا

اتباع تھا، ساقی اور حسین بچوں کا ذکر کرتے تھے تو اس سے محض تفریح مقصود ہوتی تھی، جس طرح امرا کے ہاں تازگی نظر کے لئے پیش خدمت اور غلام، حسین اور خوبرو رکھے جاتے تھے، اس عہد میں نظامی نے عشقیہ شاعری کی جداگانہ صنف قائم کر دی، عرب و عجم میں عاشقی میں جو نامور تھے یعنی مجنوں و فرہاد، ان کے حالات میں مثنویاں لکھیں، صرف عاشقانہ جذبات اور خیالات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بزم اور عاشقانہ خیالات کے اظہار کے لئے مستقل لٹریچر پیدا کر دیا، جس پر آگے چل کر متاخرین نے بڑی بڑی عمارتیں قائم کیں، غزل گوئی کی ایجاد گو سعدی سے منسوب ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ اس صنمکدہ کے آذر نظامی ہی ہیں،

قصائد کی صنف کو چنداں ترقی نہیں ہوئی، مضامین میں تو کسی قسم کی جدّت پیدا نہیں ہوئی، مداحی، خوشامد، مبالغہ پہلے سے بھی بڑھ گیا، البتہ لفظی صناعیاں کمال کے درجہ کو پہنچ گئیں، عبد الواسع جبلی اور رشید الدین وطواط نے الفاظ پر اس قدر قابو پیدا کر لیا، کہ جس نوع، جس ترکیب، جس انداز کے الفاظ چاہتے ہیں، ان کا انبار لگا دیتے ہیں، قصیدے کے قصیدے ہیں، جن میں، تمام الفاظ ایک دوسرے کے متضاد ہیں، جس کو اصطلاح میں صنعت طباق کہتے ہیں، بعض قصیدوں میں التزام کر لیا ہے کہ الف کا حرف جو سب سے عام حرف ہے، نہ آنے پائے، باوجود اس کے یہ قصائد ایسے برجستہ اور رواں ہیں کہ جب تک بتا نہ دیا جائے کہ اس میں اس صنعت کا التزام کیا گیا ہے اس طرف خیال بھی منتقل نہیں ہو سکتا، اکثر قصیدوں میں یہ التزام ہے کہ ہر مصرع میں پانچ پانچ چھ چھ الفاظ ہیں، اور پہلے مصرع میں جس قدر الفاظ آئے ہیں دوسرے مصرع کے تمام الفاظ بھی انہی الفاظ کے ہموزن، بلکہ ہم قافیہ ہیں، باوجود اس کے کسی قسم کا تکلف نہیں معلوم ہوتا،

عبد الواسع جبلی نے سجع کو ۹ قافیوں تک پہنچایا، جس سے یہ صورت پیدا ہو گئی، جس کو

عوام بحر طویل کہتے ہیں مثلاً

یا صاحبِ ایش الجبر، زاں سرو قد سیمبر، کز عشق او گشتم سمر، تشنہ لب و خستہ جگر، بر کندہ جان، افگندہ سر، با کامِ خشک و چشمِ تر، کردہ زغم زیر و زبر، دنیا و دین و جان و تن، یہ ایک مصرع ہے،

یہ قاعدہ ہے کہ جب بارش اچھی ہوتی ہے، تو جَو اور گیہوں کے ساتھ مختلف قسم کی زہریلی گھانس اور خاردار درخت اور بُوٹے بھی پیدا ہو جاتے ہیں، چنانچہ شاعری کے چمن میں ہجو کا خارزار اسی عہد کی یادگار ہے، جس کے چمن آرا انوری اور سوزنی ہیں،
ہم اس دَور کے چند مشہور شعراء کا تذکرہ لکھتے ہیں ۔

حکیم سنائی

محدود نام، ابوالمجد کنیت، سنائی تخلص، غزنین وطن تھا، ابتداء میں شاعری کا پیشہ کرتے تھے، چنانچہ بہرام شاہ کی مدح میں بہت سے قصائد لکھے جو دیوان میں موجود ہیں، لیکن پھر خدا نے توفیق دی اور توبہ کی، توبہ کا سبب ایک دلچسپ قصہ ہے،
بہرام شاہ ہندوستان کی مہم پر جا رہا تھا، حکیم سنائی نے چاہا کہ اس تقریب سے قصیدۂ مدحیہ لکھ کر پیش کریں قصیدہ تیار کر کے، دربار کے قصد سے چلے، راہ میں ایک حمام تھا، یہاں ایک پاگل رہا کرتا تھا، اس کا معمول تھا کہ شراب خانوں سے شراب کی تلچھٹ مانگ لایا کرتا اور پی کر مست پڑا رہتا، اسی لئے اس کو لاے خوار کہتے تھے،
حکیم سنائی حمام کے برابر سے نکلے، تو غنغلانے کی آواز سنی، ٹھہر گئے، دیکھا تو لای خوار ساقی سے کہہ رہا ہے کہ ابراہیم شاہ کے اندھے پن کے صدقے میں ایک پیالہ دینا، ساقی نے کہا کیا لغو بکتے ہو، ابراہیم شاہ نہایت عادل بادشاہ ہے، پاگل نے کہا، ابھی غزنین کے انتظام سے عہدہ برآ نہیں ہُوا، دُوسرے ملک کا ارادہ کرتا ہے، اس سے

بڑھ کر کیا حماقت ہوگی،

یہ کہہ کر پیالہ اُٹھایا اور پی گیا، پھر ساقی سے کہا کہ سنائی کے اندھے پن کے صدقہ میں ایک پیالہ اور لانا، ساقی نے کہا، سنائی نہایت خوش فکر اور خوش طبع شاعر ہے اُسکی بُرائی کیوں کرتے ہو؟ پاگل نے کہا اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہوگی کہ دو چار جھوٹ سچ باتیں جوڑ کر کسی بیوقوف رئیس کے پاس جاتا ہے، ادب سے دست بستہ کھڑا ہوتا ہے اور اس کو سُناتا ہے، قیامت میں اگر سوال ہُوا کہ دربار میں کیا لایا ہے، تو کیا جواب دے گا،[1]

حکیم سنائی پر یہ اثر ہوا کہ اُسی وقت سب چھوڑ چھاڑ گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گئے، اور یہ رُتبہ حاصل کیا کہ یا تو بہرام شاہ کے دربار میں بھٹئی کرتے تھے، یا بہرام شاہ نے اپنی بہن کو ان کے عقدِ نکاح میں دینا چاہا اور انہوں نے انکار کیا، چنانچہ بہرام شاہ کو جواب میں لکھا،

من نہ مردِ زن و زر و جاہم — بخدا اگر کنم و گر خواہم
گر تو تاجم دہی زاحسانم — بہ سرِ تو کہ تاج نہ ستانم

ید بیضا میں لکھا ہے کہ سروپا برہنہ حج کو گئے، وہاں سے واپس آکر غزنین میں گوشہ نشینی اختیار کی، ننگے پاؤں غزنین کے گلی کوچہ میں پھرا کرتے تھے، ان کے عزیزوں کو رحم آتا، ان کو اس حالت میں دیکھتے تو بے اختیار رو دیتے، یہ ان کو سمجھاتے کہ میری حالت پر رونا نہیں، بلکہ خوشی کرنی چاہیئے، ایک دن لوگوں نے جوتی لاکر پیش کی، اُن کی خاطر سے پہن لی، لیکن اتنا تعلق بھی ان کی حالت میں خلل انداز ہُوا، چنانچہ دوسرے دن جوتی اُتار کر پھینک دی اور کہا کہ جو بات مجھ میں کل تھی آج نہیں، امیر خسرو نے اسی

---

[1] نفحات الانس میں بہرام شاہ کے بجائے سلطان محمود کا نام لکھا ہے، اسی بنا پر تاریخ فرشتہ میں اس واقعہ سے انکار کیا ہے،

واقعہ کی طرف ایک قصیدہ میں اشارہ کیا ہے[1]،

نیست مدبرآن ترک از خود بدار و کفش از انک — ہر شگاف از پاشنایش دین و دولت او را ست

ایک رئیس نے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا، ان کو خبر ہوئی، اسی وقت رئیس کو خط لکھا کہ

ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا، گوشۂ دل این گوشہ گرفتہ را بتفقد ستایش خود خراب نہ کند جسم حقیر این بندہ نہ سزائے خشم خداوندی است[2]؛

اِس زمانہ میں شیخ ابو یوسف ہمدانی مشہور مشائخ میں سے تھے، حکیم سنائیؒ نے اُن سے بیعت کی، شیخ ابو یوسف، ابو علی فارمدی کے مرید تھے، جو امام غزالی کے پیر ہیں، اس رشتہ سے حکیم سنائی، امام غزالیؒ کے برادر زادہ ہیں،

حکیم سنائی نے جب حدیقہ تصنیف کی، تو چونکہ اس میں ایسی باتیں بھی ہیں جو عام عقائد کے خلاف ہیں۔ اس لئے علماء نے سخت مخالفت کی، یہاں تک کہ بہرام شاہ تک شکایت پہنچی، بہرام شاہ نے دار الخلافۃ بغداد سے استفتا طلب کیا، وہاں کے علماء نے لکھا کہ یہ مسائل قابلِ اعتراض نہیں، حکیم سنائیؒ نے اپنی براءت کے متعلق ایک خط بھی بہرام شاہ کے نام لکھا، عبد القادر بدایونی نے اِس خط کو پورا نقل کیا ہے، اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس بات پر ناراض تھے کہ حکیم سنائیؒ نے حدیقہ میں بنی امیہ کی نہایت بُرائی لکھی تھی، اور اہل بیت کی مدح میں مبالغہ کیا تھا، حکیم سنائیؒ نے ان دونوں باتوں کو تسلیم کیا اور لکھا کہ آلِ مروان کی بُرائی خود احادیث میں آئی ہے، لیکن حکیم صاحب محدث نہ تھے ورنہ اُن کو معلوم ہوتا کہ گو آلِ مروان کی بُرائی میں شک نہیں، لیکن حدیثیں جو اُن کی شان میں مذکور ہیں، سب وضعی اور جعلی ہیں،

حکیم سنائی کی وفات میں سخت اختلاف ہے، تاریخ فرشتہ میں تاریخ گزیدہ کے

---

[1] یہ تمام تفصیل دولت شاہ میں ہے [2] نفحات،

حوالہ سے لکھا ہے کہ بہرام شاہ کے زمانہ میں وفات پائی، اسی تاریخ میں بعض فضلا کا قول نقل کیا ہے کہ ۵۲۵ھ میں انتقال ہوا، اور اسی سنہ میں حدیقہ بھی تمام ہوئی تھی دولت شاہ نے ۵۷۶ھ میں لکھا ہے، ریاض العارفین میں ۵۴۶ھ ہے،

تصنیفات

نفحات میں لکھا ہے کہ مرتے وقت یہ شعر زبان پر تھا،

بازگشتم زانچہ گفتم زاں کہ نیست ۔۔۔ در سخن معنے و در معنی سخن

حکیم سنائی کی تصنیفات میں ایک کلّیات ہے جس میں تیس ہزار شعر ہیں، سات مثنویاں ہیں، حدیقہ، سیر العباد، کارنامہ بلخ، طریق التحقیق، عشق نامہ، عقل نامہ، بہروز بہرام، حدیقہ چھپ گئی ہے، اور ہر جگہ ملتی ہے، باقی مثنویاں ناپید ہیں، البتہ سیر العباد کے بہت سے اشعار مجمع الفصحاء میں نقل کئے ہیں، حدیقہ کی بحر اور وہی انداز ہے،

کلیات میں قصائد، قطعے، غزلیں، رباعیاں سب کچھ ہے، اور افسوس یہ ہے کہ ان پھولوں میں ہجو کے کانٹے بھی ہیں،

حکیم سنائی کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں :-

۱۔ تشبیب اور قصائد میں اُنہوں نے گو اپنے اور تمام معاصرین کی طرح کوئی جدت نہیں پیدا کی، لیکن پختگی، برجستگی، اور صفائی میں ان کا کلام تمام معاصرین سے ممتاز ہے اور قدما بھی، فرخی کے سوا، اس خصوصیت میں کوئی ان کا ہمسر نہیں، فرخی کے قصیدہ کا جو جواب لکھا ہے، اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

دوش سرمست نگارین من آں طرفہ پسر ۔۔۔ یا یکے پیرہنے با کلہے طرفہ بسر
از سر کوچہ فرود آمد متواری دار ۔۔۔ کردہ از غایت دلتنگی صد گونہ طرز
نرم نرمک ہمی آں نرگس پُر خواب کشاد ۔۔۔ ژالہ ژالہ عرق از عارض او کردہ اثر
بوسہ بردہ ولب من واو ہمی از پے عذر ۔۔۔ اینت شوریدہ نگارا نیت شکر بوسہ بسر
شادماں گشتم ازیں کار و گرفتمش کنار ۔۔۔ ہمچو تنگ شکر و خرمن گل تنگ ببر

او شدہ خواب و من از بوسہ زدن بر دو رخش ۔۔۔ با دو چشم و دو رخش تا بہ سحر جفت سہر
خود کہ داند؟ کہ دراں نیم شب از مستی او ۔۔۔ تا چہ بر داشتم از بوسہ و ہر چیز دگر

یہی مضمون ہے جس کو قاآنی نے زیادہ لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے،

مست در بستر من خفتہ و رنداں دانند ۔۔۔ حالتِ مست کہ در بسترِ ہشیار افتد

خیالات اور طرز ادا میں کہیں کہیں جدت بھی پائی جاتی ہے، مثلاً کمر بر و شجر بر کی طرح میں جو قصیدہ کہا ہے اس میں ایک قطعہ بند ہے،

در زینت و در رنگ کلاہ و کمر خویش ۔۔۔ زحمت چہ کشی در طلب گوہر و زر بر
ایں اشک من و رنگ رخ من ببرائے شوخ ۔ ق ۔ ایں را بہ کلہ بر زن و آں را بہ کمر بر

یعنی اے معشوق اپنے کمر بند، اور کلاہ کی زینت میں اس قدر زحمت کیوں اٹھاتا ہے، میرا آنسو اور میرے چہرہ کا رنگ لے کر کلاہ اور کمر پر لگالے کہ زر و گوہر کا کام دینگے، آنسو گوہر اور چہرہ کا رنگ زردی کی وجہ سے زر کے مشابہ ہے،

۲۔ حکیم سنائی پہلے شخص ہیں جس نے تصوف کو شاعری سے روشناس کیا، اس سے پہلے حضرت ابو سعید ابو الخیر کی چند رباعیاں تصوف میں پائی جاتی ہیں لیکن اُن میں صرف جوشِ عشق کو پُرزور طریقہ سے ادا کیا ہے، تصوف کے مسائل، اسرار اور معارف نہیں، بخلاف اس کے حکیم سنائی کی تصنیفات تصوف کی مستقل تصنیفیں ہیں، خود حکیم صاحب کو بھی اس کا دعویٰ ہے، چنانچہ حدیقہ میں کہتے ہیں،

کس نہ گفت ایں چنیں سخن بجہاں ۔۔۔ ور کسی گفت، گو بیار و بخواں
زیں نمط ہر چہ در جہاں سخن است ۔۔۔ گر یکے ور ہزار، آنِ من است
چوں ز قرآں گذشتی و ز اخبار ۔۔۔ نیست کس را ازیں نمط گفتار

اس دعویٰ کو اکابر صوفیہ بھی تسلیم کرتے ہیں، مولانا روم فرماتے ہیں،

ترک جوشے کردہ ام نیم خام ۔۔۔ از حکیم غزنوی بشنو تمام

عطار رُوح بود و سنائی دو چشم او　　　　ما از پیِ سنائی و عطار آمدیم

حدیقہ میں تصوف کے تمام مقامات کو الگ الگ عنوان سے لکھا ہے، اور نہایت خوبی سے ادا کیا ہے، اِس کتاب کے چوتھے حصّہ میں جہاں صوفیانہ شاعری پر ریویو ہو گا حدیقہ کے انتخابات درج کئے جائیں گے،

۳ - قدماء کی شاعری اگرچہ نیچرل شاعری تھی، لیکن طرزِ ادا شاعرانہ نہ تھا، جس بات کو کہنا چاہتے تھے، صاف، بے تکلف، سیدھے سادھے طور پر کہہ دیتے تھے، معمولی بات کو انوکھے پیرایہ میں ادا کرنا، یا ایک معمولی واقعہ سے منطقیانہ استدلال پیدا کرنا، متوسطین اور متاخرین کا جوہر ہے، لیکن اس کے موجد حکیم سنائی ہیں، اس اجمال کی تفصیلی آگے آتی ہے،

۴ - اخلاقی شاعری کی بُنیاد بھی حکیم سنائی نے قائم کی، اور آگے چل کر اس صنف کو بہت وسعت ہوئی، لیکن اصول اور آئین حکیم سنائی نے قائم کر دیئے تھے،

اخلاقی شاعری کی سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ جو بات کہی جائے اس کے لئے پیرایۂ بیان ایسا ڈھونڈھا جائے کہ سُننے والے کو معلوم ہو کہ اس سے پہلے کسی نے اس کی اصلی حقیقت نہیں ظاہر کی تھی، اور یہ کہ وہ جس کام کو معمولی بات سمجھتا تھا، وہ نہایت نفرت انگیز اور بدترین افعال ہے، اس کے لئے شاعر کو ضرور ہے کہ وہ سامنے کی باتوں سے ایسے نتائج پیدا کرے جو بظاہر بالکل اچھوتے معلوم ہوں، اور جس کی طرف خیال نہ گیا ہو،

مثلاً یہ بات عام ہے کہ طبیب جس چیز کو منع کر دیتا ہے، لوگ اس سے پرہیز کرتے ہیں، لیکن شریعت کے احکام کی پابندی نہیں کرتے، اب دیکھو حکیم سنائی اس واقعہ سے نصیحت کا کیا پہلو پیدا کرتے ہیں، اُنہوں نے دیکھا کہ طبیب اکثر پارسی، عیسائی، یہودی ہوتے ہیں، یہ بھی دیکھا کہ جن چیزوں کو طبیب منع کر دیتا ہے، اکثر حلال ہوتی ہیں،

مثلاً حلوا مٹھائی وغیرہ، اور شریعت جن چیزوں کو منع کرتی ہے وہ مضر اور ناجائز ہوتی ہیں، ان باتوں سے اُنہوں نے اس طرح کام لیا،

ترا یزداں ہمے گوید کہ در دُنیا مخور بادہ — ترا ترسا ہمے گوید کہ در صفرا مخور حلوا

ز بہر دین تو نگذاری حرام از حُرمت یزداں — ولیک از بہر تن مانی، حلال از گفتۂ ترسا

یعنی خدا نے حکم دیا کہ شراب نہ پیئو، اور عیسائی (طبیب) کہتا ہے کہ حلوا نہ کھاؤ، حلوا حلال چیز تھی، اس کو تو تم نے ایک عیسائی کے کہنے سے چھوڑ دیا، اور شراب جس کو تم خود بھی ناجائز سمجھتے ہو، خدا کے کہنے سے بھی نہیں چھوڑتے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تم خدا کے حُکم کو ایک عیسائی کی بات کے برابر بھی نہیں سمجھتے،

اِس قدر ہر شخص جانتا ہے کہ انسان مر کر تمام جھگڑوں سے چُھوٹ جاتا ہے، اس سے حکیم سنائی نے نصیحت کا یہ پیرایہ پیدا کیا ہے،

با ہمہ خلق جہاں گرچہ ازاں — بیشتر گمرہ و کمتر بُردہ اند،

آں چناں زی کہ چو میری برہی — نہ چناں زی کہ چو میری برہند

یعنی لوگوں کے ساتھ اس طرح پیش آؤ کہ جب مرو تو تم جھگڑوں سے چھوٹ جاؤ، نہ یہ کہ جب تم مرو تو لوگ جھگڑے سے چھوٹیں، یعنی تمہارے افعال سے ہر شخص تنگ آ رہا تھا، اِس لئے جب تم مروگے تو لوگوں کو نجات ہوگی،

شراب کی بُرائی کا یہ پہلو ہر شخص جانتا ہے کہ نشہ میں انسان بیہودہ بکتا ہے، گالیاں دیتا ہے، لڑتا ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ انسان نشہ کی حالت میں فیاض اور کرم گستر بن جاتا ہے اور یہ تعریف کا پہلو ہے، اب دیکھو شاعر اس تعریفی پہلو سے کیونکر شراب کی بُرائی کا یقین دلاتا ہے،

نکند عاقل مستی، نخورد دانا مے — نہ نہد مرد ہشیار سوی مستی پے

گر کنی بخشش گویند کہ مے کرد نہ او — ور نہ کنی عربدہ گویند کہ او کرد نہ مے

یعنی شراب ایسی چیز ہے کہ انسان اگر سخاوت بھی کرتا ہے تو لوگ اس کی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ یہ شراب کا فیض ہے،

از پے رد و قبول عامہ خود را خر مکن — زاں کہ نبود کار عامہ، خرخری یا فرفری

گاؤ را دارند باور در خدائی عامیاں — نوح را باور ندارند از پے پیغمبری

اِس قدر سب جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کی قوم نے گوسالہ کی پرستش کی تھی، اور آج بھی ہندوؤں کے نزدیک گائے نہایت مقدس چیز ہے، یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت نوحؑ کو ان کی اُمّت نے پیغمبر تسلیم نہیں کیا، ان دونوں باتوں سے شاعر نے یہ نتیجہ نکالا کہ عوام کا ردّ و قبول کس قدر نا قابلِ اعتبار ہے، ماننے پر آئے تو گائے کے بچھڑے کو خدا بنا دیا، اور انکار کی طرف جھکے تو حضرت نوحؑ کو پیغمبر بھی تسلیم نہیں کرتے،

اختلاط اور صحبت میں خُوبیاں بھی ہیں اور بُرائیاں بھی، اس لئے ارباب حال دونوں طرف گئے ہیں، لیکن اس نکتہ کی طرف کسی کا ذہن نہیں گیا کہ خوبی کا جو پہلو ہے وہ بھی زحمت سے خالی نہیں،

کسے کش خرد رہمنون است ہرگز — بہ گیتی رہ و رسم اُلفت نورزد

کہ صحبت نفاقی است یا اتفاقی — دل مرد دانا ازیں ہر دو لرزد

اگر خود نفاقی است جاں را بکاہد — وگر اتفاقی است ہجراں نیرزد

یعنی اگر صحبت منافقوں کے ساتھ ہے تو ظاہر ہے کہ سوہانِ روح ہے، اور اگر خاص احباب کے ساتھ ہے، تب بھی اس لئے بُری ہے کہ اِس حالت میں جُدائی کا صدمہ جاں گزا ہوگا،

بہ حرص ارشربتے خوردم مگیر از من کہ بد کردم — بیاباں بود و تابستان و آب سرد و استسقا

پھر ان تو تندی پیر بلندی مجو، — کاں کہ ز تو زاد، بلند آں شود

ط گناہ کی معذرت ط بوڑھے جواں کا مقابلہ نہیں کرسکتے ✦

روز نہ بینی کہ بہ پایاں رسد　　　سایۂ ہر چیز دو چنداں شود

زشت باشد روئے[۵۱] نازیبا و ناز　　　سخت باشد چشمِ نابینا و درد

باشد[۵۲] قبلہ در رہ توحید نتواں رفت راست　　　یا رضای دوست باید یا رضای خویشتن

سوئے[۵۳] آں حضرت نپوید ہیچ دل با آرزو　　　با چنیں گُل رُخ نخسپد ہیچ کس با پیرہن

ایں[۵۴] جہاں بر مثال مردار یست　　　کرکساں گرد او ہزار ہزار

ایں مر آں را ہمی کشد مخلب　　　آں مر آں را ہمے زند منقار

آخر الامر بر پرند ہمہ (چنگل)　　　وز ہمہ باز ماند ایں مردار

۵۔ جوش اور سرمستی جو حقیقی شاعری ہے، ایشیا کے شعرا میں بہت کم پائی جاتی ہے، فارسی شعراء میں مولانا روم پر یہ نشہ چھایا ہوا ہے، خواجہ حافظ بھی کبھی کبھی بدمست ہو جاتے ہیں، لیکن حکیم سنائی ان سب کے پیشرو ہیں، اشعارِ ذیل کو پڑھو، اور ان کے الفاظ ترکیب، اندازِ بیان، مضمون، ایک ایک چیز کو دیکھو کس طرح جوش سے لبریز ہیں،

یا برو ہمچوں زناں رنگے و بوی پیش گیر　　　یا چو مرداں اندر آے گوی در میداں فگن

چوں دو عالم زیر پایت قطع شد پاے بکوب　　　چوں دو کون اندر دو دستت جمع شد دستی بزن

سر برآر از گلشنِ توحید تا در کوی دیں　　　کشتگانِ زندہ بینی انجمن در انجمن

دی ز دل تنگی زمانے طوف کردم در چمن　　　یک جہان جان دیدم آنجا جستہ از زندانِ تن،

بے طرب خرم شدہ دل طیور و بے طالب جنباں صبا　　　بے دہاں خنداں درختے بے زباں گویا چمن

طلب اے عاشقانِ خوش رفتار　　　طرب اے شاہدانِ شیریں کار

تا کے از خانہ ہاں رہِ صحرا　　　تا کے از کعبہ ہیں درِ خمّار

در جہاں شاہدے و ما فارغ!　　　در قدح جرعۂ و ما ہشیار

---

۵۱ بدلیاقت آدمی کو غرور برا اور زیادہ بدنما ہے ۔ ۵۲ یکسوئی ۔

۵۳ مقام وصال میں ترکِ آرزو ۔ ۵۴ دنیا اور طالبانِ دنیا ۔

بسکہ شنیدی صفتِ روم و چیں　　　خیز و بیا ملک سنائی بہ بیں
تا ہمہ دل بینی بے حرص و بخل　　　تا ہمہ جاں بینی بے کبر و کیں
پای نہ و چرخ بزیرِ قدم　　　دست نہ، و ملک بزیر نگیں
رستہ ز ترکیب زمان و مکاں　　　جستہ ز ترتیب شہور و سنیں
رُوح امیں دادہ بدہنش ہمانکہ　　　دادہ بہ مریم زرہ آستیں

۶۔ شاعری کے اجزاء میں ایک بڑا ضروری جزو تمثیل اور تشبیہ ہے، شاعر کبھی کوئی اخلاقی دعویٰ کرتا ہے تو دلیل میں اس کو تمثیل پیش کرنی پڑتی ہے، کبھی کسی چیز کی اچھائی یا بُرائی ثابت کرنا، یا کسی چیز کی تصویر اور ہیئت کھینچنا چاہتا ہے تو تشبیہ اور تمثیل کے بغیر چارہ نہیں ہوتا، اسی بناء پر اکثر بڑے بڑے شاعر مثلاً سعدی، صائب، کلیم وغیرہ تمثیل میں کمال رکھتے تھے، شاعری کی اس صنف کے موجد بھی حکیم سنائی ہی ہیں، ذیل کی مثالوں سے معلوم ہوگا کہ ان کی تمثیلیں کس قدر نادر اور موثر ہوتی ہیں،

حصول مقصد کے لیے صبر اور استقلال شرط ہے، اور جو مقصد جس قدر اہم ہوگا اسی قدر زیادہ دیر ہوگی،

ہر خسے از رنگ و رفتارے بدیں رتبے رسد　　　درد باید صبر سوز و مرد باید گام زن
ہفتہا باید کہ تا یک پنبہ دانہ ز آب و گل　　　شاہدے را حلہ گردد یا شہیدے را کفن
ماہہا باید کہ تا یک مشت پشم از پُشتِ میش　　　صوفئے را خرقہ گردد یا حمارے را رسن
سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب　　　لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن
ساعت بسیاری باید کشیدن انتظار　　　تا کہ در جوفِ صدف باراں شود دُر عدن
قرنہا باید کہ تا یک کودکے از لُطفِ طبع　　　عالمے گویا شود یا فاضلے صاحب سُخن
صدق و اخلاص و درستی باید و عمر دراز　　　تا قرین حق شود صاحبقرانے در قرن

تو علم[1] آموختی از حرص اینک ترس کاندر شب　　　چو دُزدے با چراغ آید گزیدہ تر برد کالا

[1] علم زیادہ پُرخطر گناہوں کا سبب ہو سکتا ہے،

چو حق جاں را مزین کن بہ علم دیں کہ زشت آید ۔۔۔ درون سو شاہ عریاں و بروں سو کوشک دیبا

اب حکیم سنائی کے بعض قطعات و قصائد کے اشعار یکجا لکھتے ہیں، جس سے ان کی عام شاعری کا اندازہ ہو سکے گا،

بہر چہ از راہ باز افتی چہ کفر آں حرف چہ ایماں ۔۔۔ بہر چہ از دوست وامانی چہ زشت آں نقش چہ زیبا

چو ملت ہست خدمت کن محبے علماں گر زشت آید ۔۔۔ گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا

مرا بارے بحمد اللہ ز راہ حکمت و ہمت ۔۔۔ بسوئے خط وحدت برد عقل از خطہ اشیا

نخواہم لاجرم نعمت نہ در دنیا نہ در جنت ۔۔۔ ہمے گویم بہر ساعت چہ در ضرا چہ در سرا

کہ یا رب مر سنائی را سنائی دہ تو در حکمت ۔۔۔ چناں کز وی بہ رشک آید روان بو علی سینا

مگرداں عمر من چوں گل کہ در طفلی شوم کشتہ ۔۔۔ مگرداں حرص من چوں مل کہ در پیری شوم برنا

بہر چہ از اولیا گفتند ارنی قنی و دقفنے ۔۔۔ بہر چہ از انبیا گفتند آمنا وصدقنا

پردہ دار عشق داں رسم ملامت بر فقیر ۔۔۔ پاسبان ور شناس این آب تلخ اندر بحار

اے بسا غبنا کہ اندر حشر خواہد بد ازاں کہ ۔۔۔ ہست ناقد بس بصیر و لقد ہا بس کم عیار

عقل جزوی کے تواند گشت بر گیہاں محیط ۔۔۔ عنکبوتے کے تواند کرد سیمرغے شکار

کے شود ملک و عالم تا تو باشی ملک آں ۔۔۔ کے بود اہل نثار آں کس کہ ہر چند نثار

باش تا کل یابی آنہا را کہ امروز ند جزو ۔۔۔ باش تا گل یابی آنہا را کہ امروز ند خار

گوئی کہ بعد ما چہ کنند و کجا روند ۔۔۔ فرزندگان و دخترگان یتیم ما؛

خود یاد ناوری کہ چہ کردند و چوں شدند ۔۔۔ آں مادران و آں پدران قدیم ما

آدمی را دو بلا کرد رہے، ۔۔۔ داند از ہر دو بلا، رہ و رہی،

یا کند پر شکم خویش زناں ۔۔۔ یا کند پشت خود از آب تہی،

---

۵ صفائی ظاہری کے ساتھ صفائی باطن بھی مشروط ہے،

عمرِ خیام بن ابراہیم نیشاپوری

عمرِ نام، خیام لقب، نیشاپور وطن، غالباً آبائی پیشہ خیمہ دوزی تھا، جس کی وجہ سے خیام کا لقب ملا، عمرِ نے جب تحصیل شروع کی تو دو شخص اس کے ہم سبق تھے، ان میں رابطۂ محبت اس قدر بڑھا کہ سب نے عہد کیا کہ ہم میں سے جب کوئی شخص بڑے منصب پر پہنچے گا تو اپنے ساتھیوں کو بھی اپنا ہمسر بنائے گا، اس وقت دُنیا کو کیا معلوم تھا کہ یہ مکتب کے لونڈے جو اس وقت ایک خیالی منصوبہ باندھتے ہیں، آگے چل کر دُنیا کی تاریخ بدل دیں گے، ان میں سے ایک کا نام حسن ابن علی اور دوسرے کا حسن تھا، حسن بن علی نے رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کی کہ الپ ارسلاں نے وفات پائی، اور ملک شاہ سلجوقی مسند آرا ہوا تو وہ کُل سیاہ و سفید کا مالک تھا، یہی حسن ہے، جو آج نظام الملک (بانی نظامیہ بغداد) کے نام سے مشہور ہے، عمرِ خیام کو جب معلوم ہُوا کہ میرا ہم سبق تاج و تخت کا مالک ہے تو اصفہان میں نظام الملک کے پاس آیا، نظام الملک نے بڑے احترام سے خیر مقدم کیا، نظام الملک کو اپنا عہد یاد تھا، خود پُوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں، خیام جو کچھ چاہتا، اس کو مل سکتا تھا، لیکن ملکِ قناعت کے شہنشاہ نے صرف معمولی وجہ معاش کی درخواست کی، نظام الملک نے خیام کے وطن نیشاپور میں کم و بیش بارہ سو روپیے سالانہ کی جاگیر مقرر کر دی[1]، خیام نے اگرچہ صرف معمولی جاگیر پر قناعت کی لیکن سلاطین و امراء اس سے برابری کا برتاؤ کرتے تھے، شمس الملوک خاقان بخاری

---

[1] دولت شاہ، لیکن جاگیر کی آمدنی کی تعیین اور کتابوں سے ماخوذ ہے،

اس کو تخت پر اپنے برابر بٹھاتا تھا، ملک شاہ سلجوقی جو دُنیائے اسلام کا شہنشاہِ اعظم تھا، اس سے ندیمانہ تعلقات رکھتا تھا، دولت شاہ سمرقندی نے لکھا ہے کہ سلطان سنجر بھی اس کو اپنے برابر تخت پر بٹھاتا تھا، لیکن شہرزوری کی تاریخ الحکما سے معلوم ہوتا ہے کہ سنجر کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے نہ تھے، شہرزوری نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ جس زمانہ میں سنجر شاہزادہ تھا، اس کو چیچک نکلی، خیام معالجہ کے لئے طلب ہوا، وزیر نے خیام سے پُوچھا کہ بیمار کی کیا حالت ہے، خیام نے کہا آثار اچھے نہیں، یہ خبر کسی نے سنجر کو پہنچائی، اس کو نہایت رنج ہوا، اور یہ رنج ہمیشہ قائم رہا،

۴۶۷ھ میں ملک شاہ نے ایک عظیم الشان رصد خانہ قائم کرنے کا ارادہ کیا، دُور دُور سے بڑے بڑے ہیئت دان اور منجم بلوائے، ان میں ابوالمظفر اسفرازی، میمون بن نجیب واسطی، اور ہمارا نامور خیام بھی تھا، ابن الاثیر نے جہاں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ اس رصد خانہ پر بیشمار دولت صرف ہوئی، اس رصد سے جو زیچ تیار ہوئی وہ خاص خیام کی تیار کردہ تھی، چنانچہ کشف الظنون زیچ ملک شاہی کے ذکر میں صاف تصریح ہے

خیام زیادہ تر فلسفۂ یونان کا درس دیتا تھا، اور اسی قسم کے خیالات رکھتا تھا، یہ خیالات جب زیادہ پھیلے تو عوام میں سخت برہمی پیدا ہوئی یہاں تک کہ لوگوں نے اس کو بے دین قرار دے کر قتل کر دینا چاہا، مجبوراً اس نے حج کا ارادہ کیا کہ حرم میں کوئی کسی کو ستا نہیں سکتا، حج سے فارغ ہو کر بغداد میں آیا، یہاں لوگوں نے نام سُنا تو ہر طرف سے ٹوٹ پڑے کہ علومِ فلسفیہ سیکھیں، لیکن اس نے انکار کیا، اور بغداد سے چل کر وطن میں آیا،

---

۵۱ تاریخ الحکماء شہرزوری،

۵۲ تاریخ الحکماء جمال الدین قفطی،

وفات | اس کی وفات کا دلچسپ قصہ ہے، ایک دن بوعلی سینا کی کتاب الشفا مطالعہ کر رہا تھا، جب وحدت و کثرت کی بحث آئی تو اُٹھ کھڑا ہوا، عادت تھی کہ ہر وقت خلال پاس رکھتا تھا، اس کو ورق میں رکھ کر اُٹھا، نماز پڑھی، وصیت کی، شام تک کچھ نہ کھایا، نمازِ عشا پڑھ کر سجدہ کیا اور کہا اے خدا جہاں تک میرے امکان میں تھا میں نے تجھ کو پہچانا، اِس لئے مجھ کو بخش دے، یہی کہتے کہتے جان نکل گئی، مجمع الفصحا میں ہے کہ ۵۱۷ھ میں وفات پائی،

دفن کا قصہ اس سے بھی عجیب تر ہے، نظامی عروضی اس زمانہ کا مشہور شاعر ہے، جس کی کتاب چہار مقالہ چھپ کر شائع ہو چکی ہے، اس کا بیان ہے کہ ۵۰۶ھ ہجری میں میں بلخ گیا، معلوم ہوا کہ خیام آجکل یہیں امیر ابوسعید کے مکان پر مقیم ہے، میں خدمت میں حاضر ہوا، باتوں باتوں میں خیام نے کہا کہ میری قبر ایسے مقام میں بنے گی کہ ہر سال دو دفعہ درخت اس پر پھول برسائیں گے، مجھ کو تعجب ہوا، ساتھ ہی خیال آیا کہ ایسا بڑا شخص لغو گو نہیں ہو سکتا، ۵۳۰ھ میں جب نیشاپور پہنچا تو حکیم موصوف کا چند برس پہلے انتقال ہو چکا تھا، چونکہ مجھ پر شاگردی کا حق تھا، ایک آدمی کو ساتھ لیا کہ قبر کا پتہ بتائے، وہ قبرستان حیرہ میں لے گیا، دیکھا تو باغ کی دیوار کے نیچے قبر ہے، سرہانے امرود اور زرد آلو کے درخت ہیں، شگوفہ جھڑ کر اس قدر ڈھیر ہو گئے ہیں، کہ قبر ڈھک گئی ہے، مجھ کو حکیم موصوف کا قول یاد آگیا، اور بے اختیار آنسو نکل پڑے[1]،

فضل و کمال | خیام کو آج زمانہ شاعری کی حیثیت سے جانتا ہے، لیکن وہ فلسفہ میں بوعلی سینا کا ہمسر اور مذہبی علوم اور فن ادب و تاریخ میں امام فن تھا، جمال الدین قفطی نے تاریخ الحکما میں اس کا نام ان القاب سے شروع کیا ہے، "امام خراسان و علامۃ الزمان، شہزوری تاریخ الحکما میں لکھتے ہیں، کان تلو ابی علی فی اجزاء علوم الحکمۃ

---

[1] چہار مقالہ نظامی عروضی (مجمع ماہر)

وکان عالما باللغۃ والفقہ والتواریخ، حافظہ کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ اصفہان میں ایک کتاب نظر سے گزری، سات دفعہ اس کا مطالعہ کیا، نیشاپور میں واپس آیا تو ساری کتاب زبانی لکھوا دی، اصل سے مقابلہ کیا گیا تو خفیف فرق نکلا[۵۳]

ایک دفعہ وزیر عبدالرزاق کے ہاں علمی صحبت تھی، ابوالحسن غزالی جو اس زمانہ میں فن قرأت کے امام تھے وہ بھی موجود تھے، اتفاق سے خیام بھی آ نکلا، عبدالرزاق نے خیام کو آتا دیکھ کر کہا علی الخبیر سقطنا، یعنی واقف کار آ گیا، مسئلہ زیر بحث کو خیام کے آگے پیش کیا، اس نے ساتوں قرأتیں، شاذ روایتیں، اور ان کے دلائل اور وجوہ بیان کر کے ایک قرأت کو ترجیح دی، غزالی بے اختیار بول اُٹھے کہ حکما کا کیا ذکر خود قرائین سے کسی کی یہ معلومات نہیں ہو سکتیں[۵۴]

قاضی عبدالرشید کا بیان ہے کہ ایک دفعہ خیام سے میں مرو کے حمام میں ملا، اور سورۂ معوذتین کے معنی دریافت کئے، یہ بھی پوچھا کہ ان سورتوں میں بعض الفاظ بار بار کیوں آئے ہیں، خیام نے برجستہ جواب دینا شروع کیا، مفسرین کے اقوال، اُن کے دلائل اور شواہد اس تفصیل اور وسعت سے بیان کئے کہ اگر ساری تقریر قلمبند کی جاتی تو اچھی خاصی کتاب بن جاتی[۵۵]

فلسفیانہ خیالات کی وجہ سے مذہبی علماء اس سے مخالفت رکھتے تھے، اس زمانہ میں مذہبی گروہ کے پیشرو امام غزالی تھے، جنہوں نے تہافۃ الفلاسفہ لکھ کر فلسفہ کا ابطال کیا تھا، وہ مناظرہ کے لئے خیام کے پاس گئے، اور پوچھا کہ آسمان کے تمام اجزا باہم متشابہ اور متحد الحقیقۃ ہیں، پھر بعض اجزاء میں کیا خصوصیت تھی کہ قطبین قرار پائے، خیام مسائل فلسفیہ کے بیان کرنے میں نہایت بُخل کرتا تھا، اس نے پہلے تو یہ کہہ کر ٹالا کہ میں اس مسئلہ کو اپنی کتاب عرائس النفائس میں تفصیل لکھ چکا ہوں، پھر جواب دیا تو اس طرح کہ پہلے ابتدائی

---

[۵۳] شہرزوری

مراتب بیان کئے، چنانچہ اس مسئلہ سے ابتدا کی کہ "حرکت کس مقولہ سے ہے"، پھر اس کو اس قدر پھیلایا کہ یہ مسئلہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ ظہر کی اذان کی آواز آئی، امام غزالی یہ کہہ کر اُٹھ گئے، جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقاؔ

نجوم کا فن اگرچہ مہمل چیز ہے، لیکن یونانی حکما عموماً اس کے قائل تھے، وہی خیالات مسلمانوں میں بھی منتقل ہوئے، خیام اس فن میں کمال رکھتا تھا، اور اس لئے منجم کہلاتا تھا، ۵۰۸ھ میں بادشاہ وقت نے خواجہ بزرگ صدر الدین محمد بن المظفر کے پاس آدمی بھیجا کہ میں شکار کو جانا چاہتا ہوں، خیام سے کہدو کہ اعمال نجوم کے ذریعہ سے ایسی تاریخ مقرر کرے کہ برف و بارش سے محفوظ ہو، خیام نے دو دن کے غور و فکر کے بعد ایک دن معین کیا، بادشاہ اسی دن سوار ہوا، کوس دو کوس گیا ہوگا کہ بڑے زور کا بادل اُٹھا اور چاروں طرف برف بچھ گئی، لوگوں نے خیام کی ہنسی اُڑائی، بادشاہ نے چاہا کہ وہیں سے پلٹ جائے، خیام نے کہا ابھی بادل پھٹے جاتے ہیں، اور پانچ دن تک زمین نم بھی نہ ہوگی، اتفاق یہ کہ خیام کی پیشین گوئی پوری اُتری،"

تصنیفات | تصنیفات بہت کم ہیں، زیچ جو تیار کی تھی، اس کا ہمارے اسلامی ملکوں میں تو پتہ نہیں لیکن یورپ نے چھاپ کر شائع کی ہے، باقی چند رسالے ذیل میں درج ہیں جن کا ذکر شہر زوری نے کیا ہے،

طبعیات میں ایک مختصر رسالہ،

وجود کی حقیقت پر ایک رسالہ،

کون اور مشارِ تکلیف پر ایک رسالہ، (یہ رسالہ آج کل مصر میں چھاپا گیا ہے)

عربی میں بہت سے شعر لکھے ہیں، چند ذیل میں درج ہیں (از شہر زوری)،

یل ہی الدنیا بل السبعۃ العلی	بل الافق الاعلی اذا جاش خاطری

سلہ شہر زوری ۵۲ تاریخ الحکما،

وصوم على الفحشاء جهرا وخفية ... عفافا وافطاري تبتل بين خاطري
وكم عصبة ضلت عن الحق فاهتدت ... لطرق الهدى من فيضي المتقاطر
فان صراط المستقيم بصائر ... نصبن على وادي العمى كالقناطر

اذا قنعت نفسي بميسور بلغة ... يحصلها بالكد كفي وساعدي
امنت تصاريف الحوادث كلها ... فكن يا زماني موعدي او مساعدي
وهبني اتخذت الشعر بين منازلي ... وفوق مناط الفرقدين مصاعدي
اليس قضي الرحمن في حاكم بان ... يعيد الى نحس جميع المساعد
متى باعدت دينا لك ان مصيبة ... فوا عجبا من ذا القريب المباعد
اذا كان محصول الحياة منية ... فسيان حالا كل ساع وقاعد

رضيت دهرا طويلا في التماس اخ ... يرعى ادى اذا ذو خلة خانا
فكم الفت وكم اخيت غير اخ ... وكم تبدلت بالاخوان اخوانا
وقلت للنفس لما عز مطلبها ... بالله لا تالفي ما عشت انسانا

رباعیات | عجیب بات ہے، خیام فلسفہ میں، نجوم میں، فقہ میں، ادب میں، تاریخ میں کمال رکھتا تھا، لیکن اتنے ستاروں کے ساتھ اس کا افقِ شہرت بالکل تاریک ہے، جس چیز نے آٹھ سو برس تک اس کے نام کو زندہ رکھا، وہ چند فارسی رباعیاں ہیں، اور یہی اس کی شہرت کے بال پرواز ہیں، ان رُباعیوں کے ساتھ مسلمانوں نے جس قدر اعتنا کیا اس سے ہزاروں درجہ بڑھ کر یورپ نے کیا،

ہماری کتاب کا اصلی موضوع شاعری ہے، اس لئے سب سے پہلے ان رُباعیونکی تنقید میں ہم کو شاعری کا پہلو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے، اگر ان رباعیوں میں کوئی فلسفہ نہیں ہے، کوئی اخلاقی تعلیم نہیں ہے، کوئی دقیق نکتہ نہیں ہے تو نہ ہو، بحث صرف یہ ہے کہ شاعری اور شاعری کے ساتھ زبان کی خُوبی اور صفائی ہے یا نہیں؟ یعنی خیام اگر

حکیم نہ ہوتا تو کم از کم شاعر ہو سکتا تھا یا نہیں ؟

شاعری کی بڑی ضروری شرط اسلوب بیان کی جدت اور دلآویزی ہے، شاعر ایک معمولی بات کو لیتا ہے اور ایسے دلکشا اور ندرت آمیز اسلوب سے ادا کرتا ہے کہ سب وجد کرنے لگتے ہیں، اسلوب بیان کی دلآویزی کے مختلف اسباب ہوتے ہیں، کبھی صرف زبان کی بے تکلفی، روانی اور شستگی یہ کام دیتی ہے، کبھی عام طریقہ کے بدل دینے سے یہ بات پیدا ہوتی ہے، کبھی شاعرانہ طرز استدلال سے، کبھی شوخی و ظرافت سے کبھی استعارہ و تشبیہ کی ندرت سے، اور سچ یہ ہے کہ اس کی تمام ادائیں متعین اور مشخص نہیں ہو سکتیں، سُننے والے کو اتنا محسوس ہوتا ہے کہ کسی چیز نے دل میں چٹکی لے لی، کس نے لی، کیوں لی، یہ کچھ نہیں معلوم،

خوبی ہمیں کرشمۂ و ناز خرام نیست   بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

خیام کی رباعیاں اگرچہ سینکڑوں ہزاروں ہیں، لیکن سب کا قدر مشترک صرف چند مضامین ہیں، دُنیا کی بے ثباتی، خوش دلی کی ترغیب، شراب کی تعریف، مسئلۂ خیر، توبہ و استغفار، ان میں سے ایک ایک مضمون کو وہ سَو سَو دفعہ کہتا ہے، لیکن ہر دفعہ اس طرح بدل کر کہتا ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی نئی چیز ہے،

دُنیا کی بے ثباتی اور اس سے عبرت کا مضمون نہایت پامال مضمون ہے، لیکن خیام ہر بار ایک ایسا نیا اسلوب ڈھونڈھ لاتا ہے کہ نیا اثر پیدا ہوتا ہے،

توبہ و استغفار بھی ایک فرسودہ مضمون ہے، لیکن جس طرح خیام اس کو ادا کرتا ہے سُننے والے کی آنکھ سے آنسو نکل پڑتے ہیں، بعض جگہ رقت انگیز طریقہ کو چھوڑ کر استدلال کا طریقہ اختیار کرتا ہے، اور وہ بظاہر ایسا قوی ہوتا ہے کہ گویا اس کا جواب نہیں ہو سکتا، اشعارِ ذیل کو دیکھو،

رباعی

بر سینۂ غم پذیرِ من رحمت کن　　بر جانِ دلِ اسیرِ من رحمت کن
بر پائے خراباتِ روِ من بخشائے　　بر دستِ پیالہ گیرِ من رحمت کن

مغفرت کی دعا مانگتا ہے، لیکن اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں یعنی ہاتھ اور پاؤں کے لئے (گو وہ اسی کے ہاتھ پاؤں ہیں)، اس طریقہ سے دعا کا اثر بڑھتا ہے، کیونکہ اپنے لئے دعا مانگنا پھر بھی ایک قسم کی ذاتی غرض ہے، اس کے ساتھ نکتہ یہ ہے کہ اعضا کی برأت آسانی سے ثابت ہوتی ہے، کیونکہ ان کا کیا قصور ہے، وہ اپنے اختیار سے کوئی کام نہیں کرسکتے،

ہاتھ اور پاؤں کے مقابلہ میں صنعتِ طباق ہے، اور اس سے بھی ایک لطف پیدا ہوگیا ہے،

در ملکِ تو از طاعتِ ما ہیچ فزود؟　　وز معصیتے کہ ہست نقصانے بود؟
بگذار و بگیر از آں کہ معلومم شد　　گیرندۂ دیری و گذارندۂ زود؟

خدا سے خطاب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے خدا اگر میں نے اطاعت کی تو کیا تیری سلطنت کو کچھ ترقی ہوگئی؟ اور اگر گناہ کیا تو کیا کچھ تیرا نقصان ہوگیا، اے خدا مجھ کو چھوڑ دے، اور گرفت نہ کر، مجھ کو معلوم ہوگیا ہے کہ تو دیر کے بعد پکڑتا ہے اور جلد چھوڑ دیتا ہے،

من بندۂ عاصیم رضائے تو کجا است　　تاریک دلم نورِ صفائے تو کجا است
ما را تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی　　آں بیع بود لطفِ عطای تو کجا است

کس شاعرانہ انداز سے مغفرت کرنے پر مجبور کرنا چاہتا ہے، کہتا ہے کہ اے خدا اگر تو بہشت طاعت کے معاوضہ میں دے گا تو یہ تو خرید و فروخت ٹھہری (جو سوداگروں کا کام ہے نہ شاہوں اور شہنشاہوں کا) وہ لطف وہ عطا جس کے قصے سنا کرتے تھے، وہ کہاں ہے، یہی مضمون ہے، جس کو شیخ سعدی نے گلستاں میں ادا کیا ہے، اور وہ گلستاں کے

خاص محاسن میں شمار کیا جاتا ہے، "بدریوزہ گری آمدہ ام نہ بہ تجارت"؛

آنم کہ پدید گشتم از قدرت تو　　صد سالہ شدم بنازو نعمت تو
صد سال بہ امتحاں گنہ خواہم کرد　　تا جرم من است بیش یا رحمت تو

دیکھو کس ادا سے مغفرت چاہتا ہے، کہتا ہے کہ میں سینکڑوں برس دانستہ گناہ کروں گا، مجھ کو یہ امتحان کرنا ہے کہ میرا جرم زیادہ ہے، یا تیری رحمت، یعنی دیکھوں ان دونوں میں کون غالب آتا ہے؛

فریاد کہ عمر رفت بہ بیہودہ　　ہم لقمہ حرام ہم نفس آلودہ
فرمودۂ ناکردہ سیہ رویم کرد　　فریاد زکردہاے نافرمودہ

فرائض کو فرمودۂ ناکردہ، اور گناہوں کو کردہاے نافرمودہ سے تعبیر کیا ہے؛

مشہور ہے کہ ایک دفعہ خیام کی صراحی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اور ٹوٹ گئی، اس پر اس نے رباعی لکھی،

ابریق می مرا شکستی ربا　　بر من در عیش را بہ بستی ربا
بر خاک بریختی مے لعل مرا　　خاکم بدہن کہ سخت مستی ربا

کہتے ہیں کہ اس گستاخی پر خدا نے اس کو سزا دی اور اس کی گردن کج ہو گئی، اس پر اس نے برجستہ کہا،

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو　　واں کس کہ گنہ نکرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی　　پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

یعنی میں نے برائی کی، اب تو اس کی سزا بھی ویسی ہی بری دیتا ہے، تو مجھ میں اور تجھ میں کیا فرق رہ گیا،

طلبِ مغفرت کا مضمون اکثر شعراء نے باندھا ہے، نظامی کہتے ہیں،

گناہ من ار نامدے در شمار　　ترا نام کے بودے آمرزگار

اُردو کا ایک شاعر کہتا ہے،

عوض نہ لے مرے جُرم و گُناہ بیحد کا | الٰہی تجھ کو غفور الرّحیم کہتے ہیں
کہیں کہیں نہ عدو دیکھ کر مجھے محتاج | یہ اُن کے بندے ہیں جن کو کریم کہتے ہیں

لیکن خیام کا طرزِ ادا اور استدلال سب سے اچھوتا ہے، وہ شاعرانہ استدلال سے سزا پانے کی حالت میں مُجرم اور آقا کی مساوات ثابت کرتا ہے، اور پھر اس کو جملۂ خبریہ کے ذریعے سے نہیں بلکہ استفہام کے طریقہ سے ادا کرتا ہے، جو نہایت موثر اور لاجواب کر دینے والا ہوتا ہے،

شوخی و ظرافت | خیام باوجود حکیم ہونے کے نہایت شوخ اور ظریف الطبع تھا، اس لئے اکثر مضامین کو ظرافت اور شوخی کے پیرایہ میں ادا کرتا ہے، مثلاً

اے چرخ ز گردش تو خرسند نیم | آزادکنم کہ لائق بند نیم
گر میل تو با بے خرد و نااہل است | من نیز چناں اہل و خرد مند نیم

ایشیا کا عام خیال ہے کہ آسمان اربابِ خرد کو آرام اور چین نہیں دیتا، خیام آسمان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میں تیری چالوں سے بہت تنگ آ گیا ہوں، اگر تو احمقوں اور نااہلوں ہی سے محبّت رکھتا ہے تو مَیں بھی کچھ بہت اہل اور عاقل نہیں ہوں،

در مسجد اگر بہر نیاز آمدہ ام | باللہ کہ نہ از بہر نماز آمدہ ام
یک روز اینجا سجادہ دُزدیدم | آں گم شدہ است ازاں باز آمدہ ام

گویند کہ مے مخور کہ شعبان نہ رواست | نہ نیز رجب کہ آں مہ خاص خداست
شعبان و رجب مہ خدا اند و رسولؐ | ما مے رمضاں خوریم کاں خاصۂ ماست

ایران میں اکثر مہینوں کے خاص خاص لقب ہیں، مثلاً شعبان کو رسول کا مہینہ اور رجب کو خدا کا مہینہ کہتے ہیں، خیام کہتا ہے کہ لوگ ان مہینوں میں شراب پینے سے منع کرتے ہیں کہ یہ خدا اور رسولؐ کے مہینے ہیں اور واقعی ان کی یہ ہدایت بجا ہے، اس بنا پر میں رمضان میں

شراب پیتا ہوں، کہ یہ خاص ہم لوگوں کا مہینہ ہے،

گویند کہ آں کساں کہ با پرہیز اند | زاں ساں کہ میرند بداں ساں خیزند
ما با مے و معشوق ازانیم مقیم | تا بو کہ بحشر آں چناں انگیزند

مشہور ہے کہ انسان جس حالت میں مرتا ہے، اسی حالت میں قیامت میں اُٹھے گا، خیام کہتا ہے، اسی لئے تو میں رات دن شراب اور معشوق کے ساتھ بسر کرتا ہوں کہ قیامت میں بھی اسی حالت میں اُٹھوں،

گویند کہ ماہ روزہ نزدیک رسید | من بعد بگرد بادہ نتواں گردید
در آخر شعبان بخورم چنداں مے | کاندر رمضاں مست بخسپم تا عید

ایران میں جتنے شراب خوار ہیں رمضان میں شراب خواری چھوڑ دیتے ہیں، خیام کہتا ہے کہ میں شعبان کے اخیر میں اتنی پی کر سوؤں گا، کہ عید کے بعد نشہ اُترے، قاآنی نے اسی مضمون کو نیچرل بنا دیا ہے،

مے خوردن ایں ماہ روا نیست ولیکن | مستانہ تواں خورد بہ شب یک دو ساغر
یا خوردن بداں گونہ ہمی باید کز مستی | تا شام دگر نتواں خاست ز بستر

لیکن ایک اور شاعر نے سب سے لطیف پیرایہ اختیار کیا ہے، ایک غزل میں جس کی ردیف "نمی دانستم" ہے، کہتا ہے،

قرب یک ماہ بہ میخانہ اقامت کردم | اتفاقاً رمضاں بود نمی دانستم

ہر گہ کہ طلوع صبح ازرق باشد | باید کہ بکف جام مروّق باشد
گویند بہ افواہ کہ مے تلخ بود | شاید کہ بہر حال کہ مے حق باشد

عربی کا فقرہ ہے، "الحق مُرّ" یعنی حق بات تلخ ہوتی ہے، خیام کہتا ہے کہ شراب کا مزہ تلخ ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب حق ہے، مرزا غالب نے اسی سے ایک اور مضمون پیدا کیا ہے،

نگفتۂ کہ بہ تلخی بساز و پند پذیر　　برو کہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پنداست

یعنی تم یہی ہدایت کرتے ہو نہ کہ انسان کو تلخی گوارا کرنی چاہیئے اور نصیحت سُننی چاہیئے، تو ہماری شراب تمہاری نصیحت سے زیادہ تلخ ہے، ہم کو دوسری تلخی کی کیا ضرورت ہے،

دستے چو منے کہ جام و ساغر گیرد　　حیف است کہ آں دفتر و منبر گیرد
تو زاہد خشکی و منم فاسق تر　　آتش شنیدۂ کہ در تر گیرد

من در رمضاں روزہ اگر میخوردم　　تا ظن نبری کہ بے خبر میخوردم
از محنت روزہ روز من چوں شب شد　　پنداشتہ بودم کہ سحر میخوردم

طبعم بہ نماز و روزہ چوں مائل شد　　گفتم کہ مرادِ کلیمؔ حاصل شد
افسوس کہ ایں وضو بہ بادے بشکست　　واں روزہ بہ نیم جرعہ باطل شد

اس میں ظرافت کے ساتھ اس بات کا بھی اشارہ ہے، کہ جو لوگ ظاہری نماز روزہ ادا کرتے ہیں، ان کی عبادت کی ہستی بس اسی قدر ہے،

گویند کہ فردوس برین خواہد بود　　آں جا مے ناب و حور خواہد بود
گر ما مے و معشوق گزیدیم چہ باک　　چوں عاقبت کار چنیں خواہد بود

جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ بہشت میں بھی جسمانی آرام و عیش ہوگا اور شراب اور حوریں ملیں گی، ظریفانہ پیرایہ میں ان کا رد کرتا ہے کہ اگر وہاں بھی یہی سب ہوگا تو اگر ہم نے دُنیا ہی میں ان چیزوں کو پیشگی اختیار کر لیا تو کیا بُرا کیا،

زاہد گوید بہشت با حُور خوش است　　من میگویم شراب انگور خوش است
ایں نقد بگیر و دست ازاں نسیہ بدار　　آواز دہل شنیدن از دور خوش است

مارا گویند دوزخی باشد مست　　قولی است خلاف دل در و نتواں بست
گر عاشق و مست دوزخی خواہد بود　　فردا بینی بہشت را چوں کف دست

یعنی اگر یہ صحیح ہے کہ عاشق اور مست بہشت میں نہ جانے پائیں گے تو دیکھ لینا بہشت چٹیل

میدان کی طرح خالی پڑی ہوگی، یعنی عشق اور مستی لازمۂ انسانی ہے، اس سے کون شخص خالی ہو سکتا ہے،

گویند بہشت و حور و کوثر باشد | جوے مئے و شہد و شیر و شکر باشد
یک جام بدہ ز بادہ ام اے ساقی | نقدے ز ہزار نسیہ بہتر باشد

از ہرچہ خورد مرا شراب اولیٰ تر | با سبز خطاں بادۂ ناب اولیٰ تر
عالم ہمہ سر بسر باطلی ست خراب | در جاے خراب ہم خراب اولیٰ تر

ما ئیم خریدار می کہنۂ و نو | وانگاہ فروشندۂ عالم بہ دو جو
گفتی کہ پس از مرگ کجا خواہم رفت | مے پیش من آرو ہر کجا خواہی رو

آں بادۂ خوشگوار بر دستم نہ | آں ساغر چوں نگار بر دستم نہ
آں مے کہ چو زنجیر بہ پیچد بر خود | دیوانہ شدم بیار بر دستم نہ

نہ لائق مسجدم نہ در خور کنشت | ایزد داند گل مرا از چہ سرشت
نہ دین و دنیا و نہ امید بہشت | چوں کافر درویشم و چوں قحبہ زشت

دین دُنیا دونوں سے محروم ہونے کی اس سے اچھی کوئی تمثیل نہیں مل سکتی، کافر، فقیر اور بدصورت قحبہ، یہ دونوں دین و دُنیا کسی سے بہرہ یاب نہیں،

دُنیا کی بے ثباتی اور عبرت انگیزی دُنیا کی بے ثباتی اور عبرت زا ہونا بزرگ پایہ شعرا کا سب سے بڑا موضوع ہے، سعدی، حافظ، ابن یمین، ناصر خسرو۔ سحابی نجفی کی تمام کائنات یہی ہے، اس مضمون کی ابتدا در حقیقت خیام نے کی اور اس درجہ تک اس کو پہنچا دیا کہ سعدی اور حافظ جیسے بلند پایہ شاعر گویا اُسی کی سکھائی ہوئی چالیں چلتے ہیں، نصیحت سے قطع نظر خیام کے زور شاعری کا بھی اس سے اندازہ ہو سکتا ہے، اس نے سو سو دفعہ اس مضمون کو باندھا ہے، لیکن قوت تخیل سے ہر دفعہ ایک نیا پیرایہ پیدا کر دیتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی اور خنجر ہے جو دل پر چرکے لگا رہا ہے،

خاکے کہ بزیرپائے ہر حیوانے است ... زُلفِ صنمے و عارضِ جانانے است
ہر خشت کہ بر کنگرۂ ایوانے است ... انگشتِ وزیرے و سرِ سلطانی است

شیخ سعدی نے اس مضمون کے لئے فرضی حکایتیں لکھی ہیں، مثلاً کہتے ہیں،

شنیدم کہ یک بار در دجلہ ... سخن گفت با عابدے کلّہ
کہ من فر فرماندہی داشتم ... بہ سر بر کلاہ مہی داشتم الخ

ایک اور شعر میں نہایت درد انگیز طریقہ سے اس کو ادا کیا ہے،

زدم تیشہ یک روز بر تلِ خاک ... بگوشِ آمدم نالۂ دردناک
کہ زنہار اگر مردے آہستہ تر ... کہ چشم و بناگوش و روی است و سر

یعنی میں نے ایک دن مٹّی کے ایک تودے پر پھاوڑا مارا، میرے کان میں دردناک آواز آئی کہ میاں ذرا آہستہ، یہاں آنکھیں ہیں، کان ہیں، چہرہ ہے، سر ہے (ان کو چوٹ نہ لگ جائے) لیکن سعدی کی یہ تمام نقش آرائیاں، خیام ہی کے مرقع کا عکس ہیں، ملاحظہ ہو،

دی کوزہ گرے بدیدم اندر بازار ... بر تازہ گلے لگد ہمی زد بسیار
واں گل بزبانِ حال با او می گفت ... من ہمچو تو بودہ ام مرا نیکو دار

سعدی کے شعر میں اگرچہ "آہستہ تر" اور اعضا کے مفرد ناموں نے ایک خاص اثر پیدا کیا ہے، لیکن طالبِ رحم کی علت خیام کے ہاں زیادہ قوی ہے، یعنی یہ کہ میں بھی تمہاری ہی طرح تھا، اس لئے مجھ سے یہ سلوک نہ کرو، اس سے بھی زیادہ موثر طریقہ میں اسی مضمون کو ادا کیا ہے،

پیش از من و تو لیل و نہارے بودہ است ... گردندہ فلک نیز بکارے بودہ است
زنہار قدم بخاک آہستہ بنہ ... کیں مردمکِ چشمِ نگارے بودہ است

اسی مضمون کے اور پیرایے دیکھو،

ایں کہنہ رباط را کہ عالم نام است ... آرامگہِ ابلقِ صبح و شام است

برزمے است کہ واماندۂ صد جمشید است — قصرے است کہ تکیہ گاہِ صد بہرام است

خوش باش کہ غصہ بیکراں خواہد بود — بر چرخ قران اختراں خواہد بود

خشتے کہ ز قالب تو خواہند زدن — ایوان و سرائے دیگراں خواہد بود

اے کوزہ گر آب نوش اگر ہشیاری — تا چند کنی بر گل آدم خواری

انگشت فریدون و کف کیخسرو — بر چرخ نہادۂ چہ می پنداری

یعنی اے کمہار کچھ جانتا ہے تُو نے چاک پر کیا چڑھا رکھا ہے، فریدون کی اُنگلی اور کیخسرو کی ہتھیلی،

جامے است کہ عقل آفریں میزندش — صد بوسۂ مہر بر جبیں میزندش

ایں کوزہ گر دہر چنیں جام لطیف — می سازد و باز بر زمیں میزندش

بر سنگ زدم دوش سبوی کاشی[۱] — سرخوش بودم کہ کردم ایں اوباشی

با من بزبانِ حال می گفت سبو — من چوں تو بدم تو نیز چوں من باشی

ایں کوزہ چو من عاشق زاری بودہ است — واندر طلب شے نگارے بودہ است

ایں دست کہ برگردنِ او می بینی — دستے است کہ در گردن یارے بودہ است

خمریات | جس طرح عربی زبان میں ابونواس شراب کا جاندادہ ہے، فارسی میں خیام دورِ جام کا ستم زدہ ہے، وہ جس شغف، جس شوق، جس بیخودی، جس بے اختیاری جوش سے شراب کا نام لیتا ہے، اس سے صاف ثابت ہوتا ہے، کہ وہ درحقیقت شراب پیتا تھا، اور یہی ظاہری شراب پیتا تھا، افسوس ہے کہ وہ فلسفی اور حکیم تھا، صوفی نہ تھا، ورنہ حافظ کی طرح یہی شراب شرابِ معرفت بن جاتی،

خیام کا آدھا کلام شراب ہی کے ذکر میں ہے، اکثر مضامین اور خیالات جو اُس نے شراب کے متعلق ظاہر کئے ہیں، خواجہ حافظ نے اُن ہی کو لے کر زیادہ شوخ کر دیا

---

[۱] یعنی شہر کاشی کا بنا ہوا گھڑا،

ہے، تاہم کہیں کہیں جو بدمستی اور بیخودی اس کے کلام میں پائی جاتی ہے، خواجہ حافظ اب بھی اس حد تک نہیں پہنچتے،

من بے مے ناب زیستن نتوانم | بے جام کشیدہ بارِ تن نتوانم
من بندۂ آں دم کہ ساقی گوید | یک جام دگر بگیر و من نتوانم

مائیم خریدارِ مے کہنۂ و نو | وانگاہ فروشندۂ عالم بدو جو
گفتی کہ پس از مرگ کجا خواہم رفت | مے پیش من آرد ہر کجا خواہی رو

اس سرمستی اور بے اعتنائی کو دیکھو، ایک شخص مذہبی خیالات میں ڈوبا ہوا قیامت کے حالات کا متجسس ہے، خیام کے پاس آتا ہے، اور نہایت تردد اور تفحص کے لہجہ میں پوچھتا ہے کہ مرنے کے بعد کہاں جانا ہوگا؟ وہ کس بے تکلفی سے جواب دیتا ہے کہ میاں شراب لاکر میرے سامنے رکھ دو اور جہاں جی چاہے جاؤ (مجھ کو کیا غرض)

بااینہمہ زیادہ تحقیق و تلاش سے معلوم ہوتا ہے کہ خیام اگر شراب پیتا بھی تھا، تو رندانہ نہیں بلکہ حکیمانہ پیتا تھا، اگرچہ شرعاً یہ بھی ممنوع اور حرام ہے، خیام کہتا ہے کہ شراب پینے میں ان باتوں کا لحاظ شرط ہے، کس کو پینی چاہیئے؟ کتنی پینی چاہیئے؟ کن لوگوں کی صحبت میں پینی چاہیئے؟ ان شرطوں کا لحاظ رکھا جائے، تو ثابت ہوگا کہ عقلمند کے سوا اور کوئی شراب پی نہیں سکتا، اس لئے کہ عقلمند ہی ان شرائط کا لحاظ رکھ سکتا ہے،

مے گرچہ حرام است ولے تا کہ خورد | آنگا چہ مقدار؟ و دیگر با کہ خورد؟
ہر گاہ کہ ایں چہار شرط آید جمع | پس مے نخورد مردم دانا کہ خورد

پھر صاف صاف بتاتا ہے کہ کس طرح پینی چاہیئے،

کم کم خور و گہ گہ خور و تنہا مے خور

چوں ہشیارم، طرب زمن پنہان است | ور مست شوم، در خردم نقصان است
حالے است میانِ مستی و ہشیاری | من بندۂ آنکہ زندگانی آن است

یعنی شراب کی نہ وہ حالت پسندیدہ ہے، جب انسان مست ہو جائے نہ یہ کہ مطلق اثر نہ پڑے، مستی اور ہشیاری کے بیچ میں ایک حالت ہے، اور میں اسی کا غلام ہوں،

چوں بادہ خوری ز عقل بیگانہ مشو ٭ مدہوش مباش، و جہل را خانہ مشو
خواہی کہ مے لعل حلالت باشد ٭ آزار کسے مجوے دیوانہ مشو

گر بادہ نمی خورم نشان خامی است ٭ ور بیر مدام میخورم بدنامی است
مے شاہ و حکیم و رند باید کہ خورد ٭ ورزیں سہ نہ، مخور کہ دشمن کامی است

اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ شراب پینی گو اعتدال ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو، ہر حال میں حرام ہے، اور جو شخص جائز کا فتویٰ دیتا ہے، سخت اخلاقی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، لیکن اگر تمہارے سامنے دو شخص آئیں، ایک نیک طینت، بے ریا، سچا، دیانت دار ہے، لیکن شراب پیتا ہے، دوسرا شراب نہیں پیتا، نماز و روزہ بھی ادا کرتا ہے، لیکن رات دن تکفیر، بدگوئی اور غیبت میں مصروف رہتا ہے، وقف کے مال پر شرعی حیلوں سے تصرف کرتا ہے، احکام شرعیہ کو اپنی خواہش کے موافق ڈھالتا رہتا ہے تو تم ان دونوں میں سے کس کو پسند کرو گے؟ غور کرو جو لوگ شراب نہیں پیتے وہ شراب سے زیادہ گناہ کس بیباکی سے کرتے ہیں، خیام ان لوگوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے،

تو فخر ہمی کنی کہ مے می نہ خوری ٭ صد کار کنی کہ مے غلام است اورا

خواجہ حافظ نے اسی نکتہ کو نہایت بلیغ پیرایہ میں ادا کیا ہے،

فقیہ مدرسہ دی مست بود و فتویٰ داد ٭ کہ مے حرام ولے بہ ز مال اوقاف است

فلسفہ | فلسفہ کیا چیز ہے؟ "حقائق اشیا کا ادراک"، ہمارے گرد و پیش جو کچھ نظر آتا ہے اُن پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں، تو خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ چیزیں ہیں، کیونکر وجود میں آئیں، کس چیز سے حاصل ہوئیں؟ مفرد ہیں یا مرکب، ان کے ذاتیات کیا ہیں؟ خواص کیا ہیں؟ لوازم کیا ہیں؟ پھر ہم چند چیزوں کو ساتھ ساتھ یا آگے پیچھے

وجود میں آتا دیکھتے ہیں اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان میں کوئی باہم خاص تعلق ہے؟ یا اتفاقیہ ان کا ساتھ ہو گیا ہے؟ تعلق ہے تو کس قسم کا ہے؟ کیا نوعیت ہے؟ کیوں ہے؟ غرض یہ اور اس قسم کے جتنے سوالات ہیں فلسفہ کا مایۂ خمیر ہیں، اور ان کا جواب دینا فلسفہ کا فرض ہے، لیکن ان سب سوالوں سے مقدم یہ سوال ہے کہ کیا ہم اشیاء کی حقیقت کو جان سکتے ہیں؟ عموماً تمام حکما اس کا جواب اثبات کی صورت میں دیتے ہیں، لیکن ہر زمانہ میں ایسے حکما بھی ہوتے آئے ہیں، اور اب بھی ہیں، جن کی رائے ہے کہ کسی چیز کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی، ہربرٹ اسپنسر نے تمام اشیاء کی دو قسمیں کی ہیں، وہ چیزیں جو فوق الادراک ہیں، اور انسان کے دائرۂ علم میں نہیں آسکتیں، وہ چیزیں جو تحت ادراک ہیں پہلی قسم پر اُس نے ایک خاص رسالہ لکھا ہے، اور بتادیا ہے کہ ان کے متعلق کسی قسم کی تحقیقات کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے، شاپن ہور (جرمن کا فلسفی) سرے سے انکار کرتا ہے، یعنی کسی چیز کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی، خیام کا بھی یہی مذہب ہے، غور کرو، اور خوب غور کرو، جن چیزوں کی نسبت ہم کو یقین ہے کہ ہم جانتے ہیں، ان کو بھی ہم کیا جانتے ہیں، سب سے زیادہ محسوس، بدیہی، اور نمایاں مادہ یا جسم ہے، لیکن غور سے دیکھو، مادہ کو ہم کس حد تک جانتے ہیں، ہم مادّہ کے چند خواص جانتے ہیں، ہم جانتے ہیں، کہ مادہ تحلیل ہوتے ہوتے، ایسے چھوٹے چھوٹے اجزا تک منتہی ہوتا ہے، جو پھر تحلیل نہیں ہو سکتے، اور ان کو اجزاے دیمقراطیسی کہتے ہیں، ان اجزاء میں حرکت، وزن، کشش اتصالی، کشش ثقل اور چند خواص پائے جاتے ہیں، لیکن یہ اجزا کے خواص اور اعراض ہیں، ان کی اصلی حقیقت کیا ہے؟ کیونکر وجود میں آئے کہاں سے آئے؟ یہ چیزیں بالکل غیر معلوم ہیں، اس سے بھی زیادہ صاف مثال میں سمجھو، ہم نے ایک سیب ہاتھ میں لیا، ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اس کو جانتے ہیں، اور بداہتہً جانتے ہیں، لیکن غور کرو، ہم کیا جانتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک خاص مقدار رکھتا ہے، اس میں خوشبو ہے،

رنگ ہے، مزہ ہے، لیکن ساخت، خوشبو، رنگ، مزہ یہ سب تو اوصاف ہیں جن کو قدیم فلسفہ کی زبان میں عرض کہتے ہیں، ان میں سے کوئی چیز جوہر قائم بالذات نہیں، حالانکہ سیب قائم بالذات چیز ہے، اس لئے ہم کو سیب کی اصلی حقیقت کچھ بھی نہیں معلوم ہوئی، علت و معلول کا سلسلہ جو ہم کسی چیز میں قائم کرتے ہیں، جس قدر تحقیقات بڑھتی جاتی ہے، یہ سلسلہ نا قابلِ اعتبار ثابت ہوتا جاتا ہے، اور پھر اصلی علۃ کا پتہ نہیں لگتا، اُوپر سے جو چیز گرتی ہے، زمین پر آتی ہے، یونانی حکماء کی حقیقت کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی کہ ان چیزوں کا مرکز زمین ہے، اور ہر چیز مرکز کی طرف کھنچتی ہے، لیکن نیوٹن نے اس کی غلطی ثابت کی، اور بتایا کہ تمام اجسام میں جذب کی خاصیت ہے، اور چونکہ زمین بڑا جسم ہے، اس لئے وہ اپنے سے چھوٹے تمام اجسام کو اپنی طرف جذب کرتا ہے، لیکن اس سے اصل مسئلہ کیا حل ہوا، اِس قدر بے شبہہ معلوم ہوا کہ اُوپر سے گرنے کی علّت تجاذب اجسام ہے، لیکن تجاذبِ اجسام کی کیا علّت ہے، یعنی اجسام میں جذب کی خاصیت کیوں ہے؛ یہ مسئلہ اب بھی اسی طرح لاینحل ہے، غرض اسی طرح درمیانی باتیں معلوم ہوتی ہیں، لیکن اُوپر چل کر، پھر وہی لاعلمی پیش آتی ہے، ایک راز کُھلتا ہے تو دُوسرا راز پیدا ہوتا ہے، ایک گرہ کُھلتی ہے، تو دوسری گرہیں پڑ جاتی ہیں،

فلسفی سرِ حقیقت نتوانست کشود   گشت رازِ دگر آں راز کہ افشا می کرد

اسی بنا پر دقیق النظر حکماء کا یہی مذہب ہے، کہ ہم کو کچھ معلوم نہیں" سقراط نے تمام عمر کی تحقیقات کے بعد یہی کہا" معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد" خیام کا بھی یہی مذہب ہے، خیام نے اِس رائے کو نہایت صراحت اور نہایت کثرت سے بیان کیا ہے،

کس مشکل اسرار فلک را نکشاد   کس یک قدم از نہاد بیروں ننہاد
چوں بنگرم از مبتدی تا اُستاد   عجز است بدست ہر کہ از مادر زاد

آنہا کہ محیطِ فضل و آداب شدند   در کشفِ دقیقہ شمعِ اصحاب شدند

رہ زیں شب تاریک نبردند بروں | گفتند فسانۂ و در خواب شدند

آنہا کہ جہاں زیر قدم فرسودند | واندر طلبش ہر دو جہاں پیمودند
آگاہ نمی شوم کہ ایشاں ہرگز | زیں حال چناں کہ ہست آگہ بودند

جمعے متفکرند در مذہب و دیں | جمعے متحیرند در شک و یقین
ناگاہ منادے برآید ز کمیں | کاے بیخبراں راہ نہ آنست و نہ ایں

افسوس کہ سرمایہ ز کف بیروں شد | در دست اجل بسے جگرہا خوں شد
کس نامد ازاں جہاں کہ تا پُرسم ازو | کاحوال مسافران عالم چوں شد

ہر چند کہ رنگ و بوی زیباست مرا | چُوں لالہ رُخ و چو سرو بالاست مرا
معلوم نہ شد کہ در طرب خانۂ خاک | نقاش من از بہر چہ آراست مرا

کس را پس پردۂ قضا راہ نہ شد | وز سرِّ خدا ہیچ کس آگاہ نہ شد
ہر کس ز قیاس خویش چیزے گفتند | معلوم نگشت و قصہ کوتاہ نہ شد

دل سرّ حیات را کماہی دانست | در موت ہم اسرار الٰہی دانست
امروز کہ با خودی ندانستی ہیچ | فردا کہ ز خود روی چہ خواہی دانست

تم کو خیال ہوگا کہ اگر لاعلمی ہی خیام کا فلسفہ ہے، تو جتنے جاہل ہیں، سب فلسفی ہیں، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، سقراط سے لوگوں نے کہا کہ جب تم بھی کچھ نہیں جانتے اور ہم بھی نہیں جانتے تو، ہم میں تم میں کیا فرق ہے، اس نے کہا صرف یہ کہ مَیں یہ جانتا ہُوں کہ مَیں نہیں جانتا اور تم یہ بھی نہیں جانتے کہ تم نہیں جانتے۔

علم عموماً دو قسم کا ہوتا ہے، عالمانہ اور جاہلانہ، زمین، آفتاب، ماہتاب، ان سب چیزوں کو ایک گنوار بھی جانتا ہے، لیکن جاہلانہ جانتا ہے، ایک کسان بھی جانتا ہے، کہ ایک زمین میں ایک وقت دو اناج پیدا نہیں ہو سکتے، اسی کو علم نباتات کا ایک عالم بھی جانتا ہے، لیکن دونوں کے جاننے میں کس قدر فرق ہے، لاعلمی کا بھی یہی حال ہے

ایک فلسفی بھی جانتا ہے، کہ وہ خدا کی حقیقت کو نہیں جان سکتا، ایک جاہل بھی اس کا اقرار کرتا ہے، لیکن دونوں میں کس قدر فرق ہے،

خیام کو اس لاعلمی پر ناز ہے، اور کہتا ہے کہ ہر شخص اس لاعلمی کے رُتبہ تک نہیں پہنچ سکتا،

تو بے خبری بے خبری کار تو نیست ہر بے خبرے را نہ رسد بے خبری

اسی کو ایک اور شاعر نے شاعرانہ انداز میں ادا کیا ہے،

تا بجائے رسیدہ دانشِ من کہ بدانم ہمے کہ نا دانم،

یعنی میرا علم اب اس درجہ پہنچ گیا ہے، کہ یہ جانتا ہوں کہ میں نہیں جانتا،

ایک اور موقع پر خیام کس ادعا سے کہتا ہے،

رندے دیدم نشستہ بر سنگِ زمیں نہ کفر نہ اسلام نہ دُنیا و نہ دیں
نے حق، نہ حقیقت، نہ شریعت، نہ یقیں اندر دو جہاں کرا بود زہرۂ ایں

لاعلمی کا فلسفہ صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن دیکھو اس کا اثر کیا ہے،

ہر قسم کی تحقیقات، انکشافات، جدید اطلاعات کا سرچشمہ، یہی لاعلمی کا فلسفہ ہے، اگر ہم کو یقین ہو جائے کہ ہم سب کچھ جانتے ہیں، یا جس چیز کو جانتے ہیں، اس کی تہ تک پہنچ گئے ہیں، تو علمی تجسس کے لئے کیا رہ جاتا ہے،؟ آیندہ ہم کو کیوں تلاش ہو گی، ہم کیوں جد و جہد میں مصروف ہوں گے؟ لاعلمی کا فلسفہ ہمارا شمع راہ ہے، وہ ہم کو ہر قدم پر آگے بڑھاتا ہے، ہم جس قدر جانتے جاتے ہیں، اس کو نہ جاننا کہتے ہیں، اور آگے بڑھتے ہیں، خیام گو یہ فلسفہ سکھاتا ہے کہ تم کو کچھ معلوم نہیں، لیکن معلوم کرنے کی خواہش کی ترغیب دلاتا ہے،

گر از پے شہوت و ہوا خواہی رفت از من خبرت کہ بے نوا خواہی رفت،
بنگر چہ کسی؟ و از کجا آمدہ؟ می داں کہ چہ میکنی؟ کجا خواہی رفت

تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ کہاں جاؤ گے؟ خیام ان سوالوں کی تحقیقات کرنے کی تلقین کرتا ہے، ان سے بڑھ کر فلسفہ کے اور کیا مسائل ہو سکتے ہیں،

ایک اور نکتہ نہایت غور کے قابل ہے، اسلامی بے شمار فرقوں کو دیکھو، ان کے باہمی مسائل مختلفہ کیا ہیں؟ خدا فاعل بالایجاد ہے، یا بالارادہ؟ خدا کے صفات عین ذات ہیں یا خارج؟ قدیم ہیں یا حادث؟ خدا کا کلام نفسی ہے یا لفظی؟ یہ مسائل کس قدر فوق الادراک ہیں، جب خدا کی حقیقت ہی معلوم نہیں تو یہ کیا معلوم کہ اس کے اوصاف کیا ہیں، بااین ہمہ ہر فرقہ کو قطعی یقین ہے کہ اس کو جو کچھ معلوم ہے قطعی ہے، اور اس قدر قطعی ہے، کہ جو شخص اس کے خلاف کہتا ہے وہ گمراہ ہے، جاہل ہے، کور باطن ہے، مرتد ہے، کافر ہے، ملعون ہے، معتزلہ، قدریہ، اشعریہ، حنابلہ۔ شیعہ، سنی، سب ایک دوسرے کو کافر اور گمراہ کہتے ہیں، یہاں تک کہ جنگ و جدل تک نوبت پہنچتی ہے اور بغداد کے گلی کوچے، مسلمانوں کے خون سے رنگین نظر آتے ہیں،

اگر ان بزرگوں کا خیام کے فلسفہ پر عمل ہوتا، یعنی یہ کہ یہ مسائل فوق الادراک ہیں، ہم جس قدر جانتے ہیں، نہ جاننے کے برابر ہے، مذہبی حیثیت سے ہمارا اسی قدر فرض ہے کہ اجمالی ایمان لائیں، یعنی یہ کہ خدا ہے، جانتا ہے، دیکھتا ہے، سنتا ہے، بولتا ہے، باقی یہ تدقیقات کہ ان اوصاف کی حقیقت کیا ہے، اس کی ہم کو شارع نے تکلیف نہیں دی، تو آج بارہ سو برس سے مسلمانوں کے فرقوں میں جو نزاعیں جنگ و جدل، معرکہ آرائیاں، اور خونریزیاں ہوتی رہیں کیوں ہوتیں،

ہاتفِ شیراز نے کیا خوب کہا ہے،

یکے از کفر لا فد و گر طامات می بافد　　　بیا کایں داوریہا را بہ پیشِ داور اندازیم

جبر یعنی انسان کا مجبور ہونا، جبر ایک نہایت دقیق مسئلہ ہے اور گو بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے، لیکن اس سے کوئی مفر نہیں، قدریہ کا تمامتر زورِ استدلال ارادہ پر ہے یعنی یہ کہ

انسان کا ارادہ اُس کے اختیار میں ہے، اس لئے انسان مختار ہے، لیکن زیادہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا ارادہ بھی اس کی اختیاری چیز نہیں، ارادہ کے جب تمام اسباب جمع ہو جائیں گے، ارادہ خواہ مخواہ پیدا ہو گا، اس کا روکنا یا نہ پیدا ہونے دینا انسان کے اختیار میں نہیں،

عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ جبر کے نام سے بھاگتے ہیں، اور جبریہ کو کافر بتاتے ہیں خود جبریہ ہیں، لیکن مُنہ سے اقرار نہیں کرتے، اشاعرہ جبر کے قائل نہیں، بلکہ کہتے ہیں کہ "انسان کو اپنے افعال پر قُدرت ہے" لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں، کہ "یہ قدرت مطلقاً کچھ اثر نہیں رکھتی، تو پھر ایسی قُدرت سے کیا فائدہ؟ اسی بنا پر مسلم الثبوت میں لکھا ہے کہ "اشاعرہ کا کسب، اور جبریہ کا جبر دونوں توام بھائی ہیں" بہرحال، ہم اس بحث کا فیصلہ نہیں کرتے، جبر صحیح ہو یا غلط خیام جبر کا قائل اور معتقد تھا،

ایزد چو نہ خواست آنچہ من خواستہ ام	کے گردد راست آنچہ من خواستہ ام
گر ہست صواب آنچہ او خواستہ است	پس جملہ خطا است آنچہ من خواستہ ام
نقشے است کہ بر وجود ما ریختۂ	صد بوالعجبی ز ما بر انگیختۂ
من زاں بہ ازیں نمی توانم بودن	کز بوتہ چنیں مرا فرو ریختۂ
از آب و گلم سرشتہ من چہ کنم	ویں پشم قصب تو رشتہ من چہ کنم
ہر نیک و بدی کہ از من آید بوجود	تو بر سر من نوشتہ من چہ کنم
سازندۂ کار مردہ و زندہ توئی	دارندۂ ایں چرخ پراگندہ توئی
من گرچہ بدم صاحب ایں بندہ توئی	کس را چہ گنہ چو آفرینندہ توئی

انہی خیالات کو خواجہ حافظ نے عجیب عجیب پیرایوں میں ادا کیا ہے،

برو اے زاہد، و دعوت نکنم سوے بہشت	کہ خدا در ازل از بہر بہشتم نہ سرشت

فلسفۂ زندگی | خیام کا فلسفۂ زندگی بظاہر اپیکورس کی آواز بازگشت ہے، یعنی یہ کہ

گزشتہ اور آیندہ سے کچھ بحث نہیں، جو کچھ ہے حال ہے، اس میں کھاؤ پیو خوش رہو، دگر ہیچ مصرعہ "چنیں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند۔"

در وقتِ بہار اگر بتے حور سرشت — پر مے قدحے دہد مرا بر لب کشت
گرچہ بر ہر کس ایں سخن باشد زشت — سگ بہ زمن ار دگر برم نام بہشت

یک شیشہ شراب و لب یار و لب کشت — ایں جملہ مرا نقد و ترا نسیہ بہشت
قومے بہ بہشت و دوزخ اندر گروند — کہ رفت بدوزخ؟ و کہ آمد؟ ز بہشت

روزے کہ گذشتہ است ازو یاد مکن — فردا کہ نیامدہ است فریاد مکن
بر نامدہ و گذشتہ بنیاد مکن — حالے خوش باش و عمر بر باد مکن

از درس علوم جملہ بگریزی بہ — واندر سر زلف دلبر آویزی بہ
زاں پیش کہ روزگار خونت ریزد — تو خون پیالہ در قدح ریزی بہ

زاں پیش کہ بر سرت شبیخوں آرند — فرمائی کہ تا بادۂ گلگوں آرند
تو زر نۂ اے غافلِ ناداں کہ ترا — در بوتہ نہند و باز بیروں آرند

ایں عقل کہ در راہ سعادت پوید — روزے صد بار خود ترا می گوید
دریاب تو ایں یکدمہ فرصت کہ نۂ — آں ترہ کہ بدروند و آخر روید

دریاب کہ از روح جدا خواہی رفت — در پردۂ اسرارِ فنا خواہی رفت
مے نوش ندانی از کجا آمدۂ — خوش باش ندانی کہ کجا خواہی رفت

ماییم خریدار مے کہنہ و نو — وانگاہ فروشندۂ عالم بدو جو
گفتی کہ پس از مرگ کجا خواہی رفت — مے پیشِ من آر و ہر کجا خواہی رو

یہ فلسفہ کہ انسان نیکی بدی کا کچھ خیال نہ رکھے، جو جی میں آئے کرے، مزے اُڑائے، بظاہر نہایت خطرناک ہے، لیکن خیام سے ایسے خطرناک فلسفہ کی توقع نہیں ہوسکتی، اُس نے بہت سی رباعیوں میں معاد اور جزا و سزا کا اقرار کیا ہے، اور نکوکاری اور بُرائیوں سے

بچنے کی ہدایت کی ہے،

ایشیائی سلطنتوں میں، جاہ و مال کے حاصل کرنے میں جن ذلیل، کمینہ، ناجائز اور ناپاک ذریعوں سے کام لینا پڑتا ہے، اس کا اندازہ ہمارے ملک میں نہیں ہوسکتا، کم سے کم اس کے لئے کسی ہندوستانی ریاست کا سفر کرنا چاہیئے، خیام کے سامنے زندگی کا جو نمونہ موجود تھا، وہ یہی تھا کہ اربابِ دنیا رات دن جوڑ توڑ، سازش، حیلہ انگیزی، نفاق، خوشامد، تگ ودو اور ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے تھے، پھر ان سب مصیبتوں سے جو چیز حاصل کرتے تھے، وہ کس قدر ناقابلِ اعتبار اور سریع الزوال ہوتی تھی، آج ایک شخص وزیر اعظم ہے، کل دربدر مارا پھرتا ہے، کل تک ایک شخص تاج و تخت کا مالک تھا، آج مسجد کے دروازہ پر گداگری کر رہا ہے، برامکہ نے ابھی تمام عالم کو چھا لیا ہے، ابھی خاندان کا خاندان برباد ہو کر نام و نشان تک مٹ گیا، ابوالفضل کل تک ندیم خاص تھا آج دربار میں اس کا سر کٹ کر آرہا ہے،

ان حالات کو دیکھ کر بے شبہ ایک فلسفی گھبرا اُٹھے گا اور کہے گا کہ دنیا ناقابلِ اعتبار ہے، جاہ و منصب کوئی چیز نہیں، خود زندگی کس قدر ہیچ ہے، فریدوں کی خاک سے کمہار کے برتن بنتے ہیں، جمشید کا کالبد، خشت سازی کے کام میں آتا ہے، اس لئے تگ و دو اور تردد و فکر بیکار ہے، تھوڑی سی زندگی ہے، اس کو قناعت، خاموشی و سکون اور اطمینان کے ساتھ گزار دو، کھاؤ، پیو، خوش رہو اور خوشی خوشی دنیا سے چلے جاؤ،

خیام اس بات سے واقف ہے کہ اس قسم کے قانع شخص کو عام لوگ ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، لیکن وہ اس پر تعجب کرتا ہے،

ایں جمع اکابر کہ مناصب دارند	از غصہ و غم زجانِ خود بیزارند
وانکس کہ اسیر حرص چون ایشاں نیست	ایں طرفہ کہ آدمیش می نہ شمارند

نہایت خوبی سے وہ قناعت اور آزادی کی تعلیم کرتا ہے،

چوں رزق تو آنچہ عدل قسمت فرمود | یک ذرہ نہ کم شود نہ خواہد افزود
آسودہ ز ہر چہ نیست می باید شد | وآزادہ ز ہر چہ ہست می باید بود
خواہی کہ ترا تربیت اسرار رسد | مپسند کہ کس ز راز تو آزار رسد
از مرگ میندیش و غم رزق مخور | کیں ہر دو بوقت خویش ناچار رسد

خیام جس زندگی کو قابل رشک سمجھتا ہے، وہ یہ ہے،

در دہر آنکہ نیم نانے دارد | وز بہر نشست آستانے دارد
نے خادم کس بود نہ مخدوم کسے | گو شاد بزی کہ خوش جہانے دارد

ابن یمین نے اس زندگی کی تصویر اس خوبی سے کھینچی ہے،

دو تائے ناں اگر از گندم ست یا از جو | دو تائے جامہ اگر کہنہ است یا خود نو
بہ چار گوشۂ دیوار خود، بخاطر جمع | کہ کس نگوید از ینجا بخیز و آں جا رو
ہزار بار فزوں تر بہ نزد ابن یمین | ز فر مملکت کیقباد و کیخسرو

اخلاقی تعلیم | خیام کا فلسفۂ اخلاق نہایت مختصر ہے، لیکن جس قدر ہے، اس مختصر سی دُنیا کے لئے کافی ہے،

غیبت مکن و دل کساں را مازار | در عہدۂ آں جہاں منم، بادہ بیار
بدخواہ کساں ہیچ بہ مقصد نرسد | یک بد نہ کند تا بہ خودش صد نہ رسد
من نیک تو خواہم و تو خواہی بد من | تو نیک نہ بینی و بہ من بد نرسد
گر شادی ازاں خویشتن میدانی | کاسودہ دلے را بہ غمی بنشانی
در ماتم عقل خویش بنشیں ہمہ عمر | پندار مصیبت کہ عجب نادانی
اے آنکہ خلاصۂ چہار ارکانی | بشنو سخنے ز عالم روحانی
دیوی و ددی و ملک و انسانی | با تست، ہر آنچہ می نمائی آنی

یعنی تم شیطان، درندہ، فرشتہ، انسان، سب کچھ ہو سکتے ہو، اب جو چاہو،

ہو جاؤ، تم کہوگے کہ یہ ایسی کیا اچھوتی تعلیم ہے، سب اہلِ مذہب، اسی کی تعلیم دیتے ہیں، ہاں یہ سچ ہے، لیکن اہلِ مذہب نے اپنی فیاضی کا دائرہ محدود کر دیا ہے، اُن کے نزدیک نیکی، احسان، بھلائی، ہمدردی، غمخواری، ان تمام اوصاف کا محل صرف اپنے ہم مذہب ہیں، لیکن خیام کے نزدیک آفتاب کی روشنی دشت وچمن، دونوں پر یکساں پڑتی ہے،

خیام کی اخلاقی تعلیم میں ریاکاری سب سے بڑا جُرم ہے، اور اس نے جس خوبی سے اس کی پردہ دری کی ہے، آج تک کسی نے نہیں کی، سعدی اور حافظ ریاکار زاہدوں اور پیشواؤں کی دھجیاں اُڑانے میں نہایت نامور ہیں اور نہایت عجیب عجیب نادر پیرایوں میں ان لوگوں کے پتھرے کھولتے ہیں، لیکن خیام نے ایک رباعی میں اس مضمون کا خاتمہ کر دیا ہے؛

زاہد بہ زن فاحشہ گفتا مستی　　　بنگر زکہ بگسستی وچوں پیوستی
زن گفت چنانکہ می نمایم ہستم　　　تو نیز چنانکہ مے نمائی ہستی

یعنی ایک زاہد نے ایک فاحشہ عورت سے کہا کہ تو بدمست ہے، تو خیال نہیں کرتی، کہ تُو نے کس چیز کو چھوڑا اور کس چیز کو اختیار کیا ہے، اس نے جواب دیا کہ مَیں تو جیسا اپنے آپ کو ظاہر میں دکھلاتی ہوں ویسی ہی ہوں بھی، کیا آپ بھی اپنے آپ کو جیسا دکھلاتے ہیں ایسے ہی حقیقت میں بھی ہیں؛

ظاہر و باطن کے یکساں نہ ہونے کی بُرائی کا پیرایہ اِس سے زیادہ اچھوتا، نادر اور موثر و عبرت خیز نہیں ہوسکتا تھا، خیام نے اس بات پر بھی خوب غور کیا تھا، کہ کن کن اسباب سے انسان کو خواہ مخواہ ہی ریا میں گرفتار ہونا پڑتا ہے، اِس لئے وہاں موقعوں سے بچنے کی تعلیم دیتا ہے،

در راہ چناں رو کہ سلامت نہ کنند　　　با خلق چناں زی کہ قیامت نہ کنند
در مسجد اگر روی چناں رو کہ ترا　　　در پیش نہ خوانند و امامت نہ کنند

یعنی رستہ اس طرح چلو کہ کوئی تم کو سلام نہ کرے، لوگوں کے ساتھ اس طرح بسر کرو کہ لوگ تمہاری تعظیم کے لئے قیام نہ کریں، مسجد میں جاؤ تو اس طرح کہ لوگ تم سے امام بننے کی خواہش ظاہر نہ کریں، مطلب یہ کہ ایسی سادگی، بے تکلفی، خاموشی سے زندگی بسر کرو کہ لوگ تم کو مقدس نہ خیال کریں، یہ ظاہر ہے کہ انسان جب لوگوں کی نظر میں مقدس ہو جاتا ہے تو اس کو سینکڑوں باتیں ایسی کرنی پڑتی ہیں جن سے اس کا تقدس قائم رہے، حالانکہ وہ باتیں بہ تکلف کرتا ہے، اگر اس منصب پر وہ نہ پہنچتا تو اس خود داری اور حفظ مراتب کی اس کو کیا ضرورت تھی،

خیام کا فلسفۂ اخلاق زہاد اور علماء کے فلسفۂ اخلاق سے نہایت بلند ہے، یہ مقدس گروہ کسی کام کو صرف اس نظر سے دیکھتا ہے کہ اس پر عذاب یا ثواب ہوگا، ان لوگوں کو اگر اس امر کا اطمینان ہو جائے کہ اس فعل پر عذاب نہیں ہوگا، یا خدا اُس کو بخش دے گا، تو پھر ان کو کچھ پروا نہ ہوگی، خیام کسی کام کے کرنے کے وقت صرف یہ دیکھتا ہے کہ خود یہ کام کیسا ہے، اگر وہ کام بُرا ہے تو اس سے اس کو کچھ تسلی نہیں ہوتی، کہ خدا اس کو بخش دے گا، اس کے نزدیک یہی بڑا عذاب ہے کہ خدا دیکھ رہا تھا، اور اس نے جُرم کا ارتکاب کیا،

بانفس ہمیشہ در نبردم چہ کنم ورکردۂ خویشتن بدردم چہ کنم
گیرم کہ زمن درگزرانی بہ کرم زیں شرم کہ دیدی کہ چہ کردم چہ کنم

یعنی اے خدا! میں نے مان لیا کہ تو میرا گناہ معاف کر دے گا، اور عذاب نہ دے گا، لیکن یہ کیا کم عذاب ہے کہ تیری نظر کے سامنے میں نے ایسا فعل کیا،

فقہا کی نسبت خیام کی رائے | خیام کے فلسفہ، اخلاقی تعلیم اور آزادی خیال کا نمونہ تم نے دیکھا، ایسا شخص فقہا کی نسبت جو رائے رکھ سکتا ہے، تم خود سمجھ سکتے ہو، وہ کہتا ہے اور کس قدر سچ کہتا ہے،

بااین دوسہ ناداں کہ چناں میدانی | از جہل کہ دانائے جہاں ایشانند
خوش باش کازخری ایشاں بمثل | ہرگونہ خراست کافرش می دانند

غور کرو، امام غزالی، امام رازی، محی الدین عربی، شیخ الاشراق، ان میں سے ہر شخص فقہا کی تکفیر کا زخم خوردہ ہے، کیوں؟ صرف اس لئے کہ یہ لوگ فقہا کے سے عامیانہ اور لغو عقائد اور خیالات نہیں رکھتے تھے، اسی نکتہ کو خیام اس تلخ جملہ میں ادا کرتا ہے، کہ جو شخص ان تکفیر کرنے والوں کی طرح سے گدھا نہیں ہے اس کو یہ لوگ کافر کہتے ہیں،

خیام نے گو شاعری کے پردہ میں دل کے پھپولے توڑے، لیکن افسوس ہے، کہ فقہا کی سخت گیری کی وجہ سے وہ بھی اسرار اور حقائق کے ظاہر کرنے کی جرأت نہ کر سکا، چنانچہ خود کہتا ہے،

اسرار جہاں چنانکہ در دفتر ماست | گفتن نتواں کہ آں وبال سر ماست
چوں نیست دریں مردم دنیا اہلے | نتواں گفتن ہرانچہ در خاطر ماست

افسوس! ظاہر پرستوں کی گیروداری نے خدا جانے کتنے عجیب و غریب اسرار اور حقائق و حرف بحرف دفن کرا دیئے، آج آزادی کا زمانہ ہے، لیکن اب وہ حقائق اور اسرار کہاں، بازاری اور عامیانہ باتیں زبان پر آئیں تو اس سے کیا حاصل!!!

انچہ در کار رست نتوانی تو گفت | انچہ می گوئی تو خود در کار نیست

خیام اور یورپ | یہ عجیب بات ہے کہ خیام کی قدردانی، ایشیا سے زیادہ یورپ نے کی، اور کرنی چاہیئے تھی، خیام کے خیالات، یورپ سے اس قدر ملتے جلتے ہیں کہ آج اگر موجود ہوتا تو شاید یورپین بن جاتا،

عمر خیام کی نسبت ۱۸۹۶ء تک جو کچھ یورپ میں لکھا گیا وہ وصایا وغیرہ نہایت محدود ماخذوں سے تھا، مگر پروفیسر ژکوسکی (Zhukooski) کے قابل یادگار مضمون نے خیالات میں تغیر عظیم برپا کر دیا اور اب پروفیسر براس، ہیرن ایلن (HeyoNALLEN) وغیرہ نے

انگریزی میں عمدہ ترجمے اور تذکرے شائع کئے، ان سے پہلے انگلستان میں سر جیرلڈ (Fitizgerald) کے مشہور ترجمہ کے علاوہ میکارتھی (Mecorthy) نے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپا تھا مگر گارنر (Gorner) کا ترجمہ عالمانہ اور مطلب خیز تھا، ون فیلڈ (Whinpield.) نے ۱۸۸۳ء میں دو کتابیں ایک میں صرف ترجمۂ رباعیات اور دوسری میں رباعیاں اور ان کے مقابل میں ترجمہ شائع کیں، نکلسن فرانسیسی (Nicholason) نے فٹز جیرلڈ سے ایک سال بعد فرنچ میں ایک ترجمہ شائع کیا تھا، باڈن اسٹیڈ (Bodensted) نے جرمن میں ایک ترجمہ چھاپا ہے اور چند رباعیوں کا ترجمہ ہالینڈ کی زبان میں بھی ہو گیا ہے،

پروفیسر لکھتے ہیں کہ اگر وہ تمام کتابیں اور رسالے جمع کئے جائیں، جن میں عمر خیام کا ترجمہ یا حال شائع ہوا ہے تو درحقیقت ہماری زندگی میں یہ کام پورا نہیں ہو سکتا،

آکسفورڈ میں ایک نہایت قدیم نسخہ ہے، اس کو ہیرن ایلن نے عکس میں چھاپا ہے، ایک عمدہ نسخہ پیرس میں ہے، مگر آکسفورڈ والے سے پرانا نہیں،

انوری

محمد نام، اوحد الدین لقب، انوری تخلّص، ابیورد کے علاقہ میں بدہنہ ایک گاؤں ہے، جو مہنہ کے مقابل واقع ہے، انوری یہیں پیدا ہوا، یہ دولت شاہ کا بیان ہے، لیکن عرفی کہتا ہے ع "انوری گر بود از مہنہ منم از شیراز۔ اس علاقہ کو خاوران بھی کہتے ہیں، اِس مناسبت سے انوری نے پہلے اپنا تخلّص خاوری رکھا تھا، پھر اپنے اُستاد عمارہ کی فرمایش سے بدل کر انوری کر دیا،

انوری نے علوم و فنون کی تحصیل طوس کے مدرسہ منصوریہ میں کی، اور تمام درسی علوم و فنون حاصل کئے، ریاضی میں خصوصیت کے ساتھ کمال پیدا کیا، دولت شاہ کا بیان ہے کہ انوری ایک دن مدرسہ کے دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا کہ سامنے سے ایک شخص بڑے جاہ و تجمل سے گزرا، انوری نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ پایۂ تخت کا شاعر ہے، انوری نے اسی وقت تعلیم و تعلّم کو خیرباد کہا، اور رات بھر میں قصیدہ لکھ کر تیار کیا جس کا مطلع یہ ہے،

گر دل [illegible] کاں باشد　　　دل [illegible]ست خدائگاں باشد

صبح کو دربار میں جاکر قصیدہ پڑھا، سنجر نہایت سُخن شناس تھا، بہت محظُوظ ہوا، کہا نوکری چاہتے ہو یا صلہ، انوری نے آداب بجالا کر عرض کی،

جُز آستان توام در جہاں پناہے نیست　　　سرمرا بجز ایں در حوالہ گاہے نیست

سنجر نے منصب اور وظیفہ مقرر کر دیا، سنجر راد کان سے روانہ ہوا تو انوری بھی ساتھ تھا، راہ میں

چند قصیدے لکھ کر پیش کئے جن میں سے ایک یہ ہے،

بازاں چہ جوانی و جمال ست جہان را   ویں حال کہ نوگشت زمین را و زمان را

ہمارے تذکرہ نویسوں کی بے خبری دیکھو، یہ واقعہ سب لکھتے آتے ہیں لیکن یہ کسی سے نہ ہوسکا کہ جس قصیدے کو انوری کی شاعری کا دیباچہ کہتے ہیں، اس کو کبھی اُٹھا کر دیکھ بھی لیا ہوتا، انوری خود اس قصیدہ میں کہتا ہے،

خسروا! بندہ را چو دہ سال است   کہ ہمی آرزوے آن باشد

کز ندیمان مجلس ار نہ شود   از مقیمان آستاں باشد

اس میں صاف تصریح ہے کہ یہ قصیدہ ابتدائً نہیں، بلکہ دس برس کی امیدواری کے بعد لکھا گیا ہے، انوری جس طرح سنجر کے دربار میں پہنچا ہے، اس کی کیفیت یہ ہے کہ انوری مدت سے شعر و شاعری میں مشغول تھا، لیکن دربار تک رسائی حاصل نہیں ہوئی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ دربار کا ملک الشعرا امیر معزی تھا، اور وہ کسی کو دربار میں کامیاب نہیں ہونے دیتا تھا، اس کا حافظہ نہایت قوی تھا، یعنی صرف ایک بار کے سُننے میں قصیدہ یاد کرلیتا تھا، جب کوئی شاعر دربار میں آتا تھا اور قصیدہ سُناتا تو معزی بادشاہ سے کہتا کہ یہ قصیدہ میری تصنیف ہے، چنانچہ قصیدہ کا قصیدہ نوبہ پڑھ کر سُنا دیتا، شاعر خفیف ہوکر چلا آتا، انوری کو یہ حالت معلوم ہوئی تو پھٹے پُرانے کپڑے پہن، پاگلوں کی صورت بنا کر معزی کے پاس گیا، اور کہا کہ میں شاعر ہوں، بادشاہ کی مدح میں قصیدہ لکھ کر لایا ہوں، آپ پیش کرا دیجئے، معزی نے کہا کیا لکھا ہے، پڑھ کر سناؤ، انوری نے پڑھا،

زہے شاہ و زہے شاہ و زہے شاہ   زہے میر و زہے میر و زہے میر

معزی نے کہا یُوں کہتے تو مطلع ہوجاتا،

زہے شاہ و زہے شاہ و زہے شاہ   زہے ماہ و زہے ماہ و زہے ماہ

انوری نے بہکی بہکی باتیں کیں، معزی نے یہ سمجھ کر کہ دربار کا مسخرہ بنائیں گے، انوری سے کہا کل آنا، انوری دوسرے روز پہنچا تو معزی خود ساتھ لے کر دربار میں گیا، اور کہا کہ جو قصیدہ تم نے مدح میں لکھا ہے، سناؤ، انوری نے شاعرانہ انداز میں پڑھا،

گر دل و دست بحر و کاں باشد　　دل و دست خدائیگاں باشد

شاہ سنجر کہ کمتریں خدمش　　در جہاں بادشا نشاں باشد

دو شعر پڑھ کر رک گیا، اور معزی کی طرف خطاب کر کے کہا کہ یہ قصیدہ آپ کا ہے، تو باقی اشعار سنائیے، معزی چپ رہا، انوری نے پورا قصیدہ سنایا، سنجر نہایت محظوظ ہوا اور ندیمانِ خاص میں داخل کیا[1]، رفتہ رفتہ یہ مرتبہ حاصل کیا کہ سنجر نے بہ آں جاہ و جلال، دو دفعہ انوری کے مکان پر جا کر اس کی عزت افزائی کی[2]،

انوری کو علم نجوم میں کمال تھا، سنجر کے عہد حکومت میں اتفاق سے سبعۂ سیارہ برج میزان میں جمع ہوئے، انوری نے اس بناء پر پیشین گوئی کی کہ فلاں دن اس زور کا طوفان آئیگا کہ تمام مکانات برباد ہو جائیں گے، لوگوں نے ڈر کر تہ خانے اور سرداب تیار کرائے اور تاریخ مقررہ پر ان میں چھپ کر بیٹھے، اتفاق سے اس دن اتنی ہوا بھی نہ چلی کہ چراغ گل ہوتا، سنجر نے انوری کو بلا کر عتاب کیا، انوری نے کہا قرانات کے احکام فوراً ظاہر نہیں ہوتے، فرید کاتب نے اس پر قطعہ لکھا،

گفت انوری کہ از جہت بادہائے سخت　　ویراں شود عمارت و کہ نیز برسری

در سال حکم او نہ وزیدست ہیچ باد　　یا مرسل الریاح تو دانی و انوری

انوری نے اب دربار میں رہنا مناسب نہ سمجھا اور ترکِ ملازمت کر کے نیشاپور چلا آیا، اب اس کی شہرت دور دور پھیل گئی تھی، ہر طرف سے امراء و رؤساء کے پیغام آتے تھے کہ ہمارے دربار میں قدم رنجہ کیجئے، ۵۲۳ھ میں سلطان احمد پیروز شاہ نے

---

[1] یہ پوری تفصیل تاریخ حبیب السیر میں ہے [2] خزانۂ عامرہ،

اس کو خط بھیج کر بلایا اور ساتھ لے کر خوارزم کی طرف روانہ ہوا، انوری یہ سُن کر کہ دریائے جیحوں راہ میں پڑتا ہے، اس قدر ڈرا کہ بلخ پہنچ کر سلطان احمد سے معذرت چاہی، اور وہیں رہ گیا، لیکن بلخ میں اس قدر تکلیف پہنچی کہ تنگ آکر ایک قصیدہ لکھا اور سلطان احمد کی خدمت میں بھیجا، مطلب کی بات اس طرح ادا کی،

اینست حال کہ در بلخ کنوں دارم	از خوفِ پریشانی و گمراہی
زیں پیش اگر بہم و گماں بروے	آں مخلصے کو تہ نظر شاہی
بر عبرۂ جیحوں نہ بہ آموزش	چوں بط بطبیعت شدمی راہی

سلطان احمد نے اسی کو دربار میں طلب کیا اور معتمد خاص بھیجا کہ انوری کو ساتھ لے کر آئے انوری روانہ ہوا، لیکن دریائے جیحوں کے کنارے پہنچ کر اس کے اوسان جاتے رہے، رہبر جو ساتھ تھا، ڈھارس دلانے کے لئے لنگ باندھ کر دریا میں اُترا، تیرتا ہوا دُور تک گیا اور چاروں طرف چکر لگا کر دکھلایا کہ گھبرانے کی بات نہیں، انوری بہزار خرابی کشتی میں بیٹھا، گھاٹ پر شاہی اہتمام تھا، اور اسپ خاصہ سواری کے لئے آیا تھا، انوری نے آدابِ شاہی کے لحاظ سے گھوڑے پر سوار ہونے میں تامل کیا، لیکن پیش خدمت کے اصرار سے سوار ہوا، اور دربار میں آیا، قصیدہ راہ میں لکھ رکھا تھا، دربار میں پہنچ کر پڑھا، دیکھو تمام واقعات کو کس خوبی سے ادا کیا ہے،

حبذا بختِ مساعد کہ سوے حضرتِ شاہ	مردمی کرد و رہم داد پس از چندیں گاہ،
اندر آمد ز در حجرۂ من صبحدمے	روز بہمن جنہ یعنی دوم بہمن ماہ
سال پر پانصد و سی و سہ ز تاریخ عجم	گفت برخیز کہ از شہر بدر شد ہمراہ
چہ روے راہ ترد و قضی الامر فقم	چہ کشتی نقش تخیل بلغ السیل زباہ"
چوں برانگیخت مرا رفت و چراغے افروخت	بے تحاشی چو رفیقی کہ بود از اشباہ

ف ۱ اس قصیدہ کی شرح میں ابوالحسن فراہانی نے اس قصیدہ کا شانِ نزول یہی لکھا ہے،

تا که من جامه بپوشیدم و بیرون رفتم   به شتابی که دو دائم نه رهی کرده نه راه

او برون برده بدم فرش و آورده دستور   محملی بهت و مرا کرده چو شاهی برگاه،

همچنان جمله راه هم بسلامت می برد   نه دران طبع ملالت نه درین طوع اکراه

تا به حدی ز مرا او همی میخ و کفش   تا بجایی که همی داد خرم را جو و کاه

چون به جیحون برسیدیم ز من هوش برفت   گفت لَاحَولَ وَلَاقُوۃَ اِلّا بِاللّٰہ

رفت و بربست ازاری و به جیحون در جست   وندران جست به یکدم بگذشت او شناه

باز باز آمد و گفتا که بدیدی سهل است   در نشین، خیز و مکن وقت گذشتن بیگاه

کشتی آورد و نشستیم در و هر دو بهم   چون تو یار، او همه یاری ده و من یاری خواه

او چو شیری به یکی گوشهٔ کشتی بنشست   من سر اندر زن و بیرون زن همچو روباه[۱]

آخرالامر چو کشتی بسلامت بگذشت   جستم از کشتی و آمد به لب کشتی گاه

عرصه دیدم چون جان و جوانی بخوشی   شادی افزای چو جان و جوانی غم کاه

گفتم ای بخت بهشت است سواد ترمد   گفت راضی مشو از روضهٔ رضوان به گیاه

باش تا شهر به بینی، و درو   باش تا قلعه به بینی و درو عرض سپاه

تا درین بودم، گردی ز در شهر بخاست   گفتم آن کیست مرا گفت جبینت کش شاه

آمد القصه و آورد جبینت پیشم   دیدهٔ من چو دران شکل و شبه کرد نگاه

بوسه دادم سُمّ، و زانوی رکابش هر سه   گفتم ای روز براق از تو چو رنگ تو سیاه

به سعادت به سر آخر خود باز خرام   که ترا پایه بلند است و مرا پا کوتاه

این همی گفتم و او دست همی کوفت که نے   ترک فرماں همه حال گناه هست و گناه

اقسامِ سخن میں سے انوری کی طبیعت ہجو سے خاص مناسبت رکھتی تھی، ہجو میں وہ نہایت

---

[۱] سر اندر زن، منہ اندر کر لینا، یعنی لومڑی کی طرح کبھی منہ باہر نکالتا تھا، اور کبھی اندر کر لیتا تھا،

دلچسپ اور لطیف مضامین پیدا کرتا تھا، جو شعر اس کی زبان سے نکلتا عالم میں پھیل جاتا، اس کے ساتھ طبیعت میں تنگ ظرفی اور کم حوصلگی تھی، ذرا کسی سے رنج ہوا اور اُس کی ہجو کا طومار باندھ دیا، اس عادت کی وجہ سے اس نے سارے زمانہ کو دشمن بنا لیا تھا، چنانچہ سلطان علاءالدین ملک الجبال سے لوگوں نے شکایت کی کہ انوری نے حضور کی ہجو لکھی ہے، سلطان نے ملک طوطی کو، جو مرو شاہجہاں کا رئیس تھا، خط لکھا کہ انوری کو گرفتار کرکے دربار میں بھیج دو، ملک طوطی نے فخرالدین مروزی کو جو اس کے دربار کا شاعر اور منشی تھا حکم دیا کہ انوری کو لکھو کہ میں آپ کے ملنے کا مشتاق ہوں، فخرالدین مروزی انوری کا بڑا دوست تھا، اُس نے انوری کو اصل حال سے مطلع کرنا چاہا، لیکن ملک طوطی کے ڈر سے صاف صاف نہیں لکھ سکتا تھا، اس لئے خط کے سرنامہ پر یہ شعر لکھا،

هی الدنیا تقول بملاء فیها حذار حذار من بطشی وفتکی

انوری سمجھا کہ کچھ بھید ہے، تحقیق سے اصل واقعہ معلوم ہوا، ملک طوطی کے دربار میں سفارشیں پہنچائیں، سلطان علاءالدین کو یہ حال معلوم ہوا تو اُس نے ملک طوطی کو لکھا کہ انوری کو میرے دربار میں بھیج دو، ہزار بکریاں صلہ میں دونگا، ملک طوطی نے انوری کو بلا کر کہا کہ تمہارے معاوضہ میں مجھ کو ہزار بکریاں ملتی ہیں، انوری نے کہا علاءالدین مجھ کو ہزار بکریوں کے بدلے خرید تا ہے، اور آپ مفت بھی نہیں لیتے، ملک طوطی کو یہ لطیفہ پسند آیا اور اپنے مقربین میں داخل کیا[۵۵]،

انوری کے مخالف شعرا نے اب یہ طریقہ اختیار کیا کہ خود ہجویں لکھ کر اس کے نام سے مشہور کرتے تھے اور انوری کو اس کا خمیازہ اُٹھانا پڑتا تھا، چنانچہ جب وہ بلخ میں آیا، تو فتوحی شاعر نے حکیم سوزنی کی فرمایش سے بلخ کی ہجو لکھی اور انوری کے

---

[۵۵] لب اللباب عوفی یزدی و مجمع الفصحا تذکرۂ فخرالدین مروزی،

نام سے مشہور کردی، اس کے چند اشعار یہ ہیں،

چار شہرست خراساں را بہر چار طرف — کہ وسط شاں بہ مسافت کم صد در صد نیست
گرچہ معمور و خرابش ہمہ مردم دارد — نہ چناں ہست کہ البتہ دم و دو دو نیست
بلخ را عیب اگر چند باوباش کنند — بر ہر بحر و بر نیست کہ صد بحر و نیست
مصر جامع را چارہ نبود از بد و نیک — معدن زر و گہر بے سر و بن بشد نیست
چند اشہر نشاپور کہ در ملک خدائے — گر بہشت است ہمین ست گرنہ خود نیست

اہل شہر اس پر اس قدر برہم ہوئے کہ انوری کو پکڑ کر تختہ کلاہ کیا اور اوڑھنی اُڑھا کر گلی کوچوں میں تشہیر کی، اس سے بھی زیادہ نوبت پہنچی، لیکن قاضی حمید الدین جن کی تصنیف سے مقامات حمیدی ہے، اور جن کی شان میں انوری نے لکھا ہے،

بہ مدح و ثنا گر کنم رائے نظمے — نہ دشوار گویم نہ آساں فرستم
ولیکن بہ مدح جناب حمیدی — اگر وحے باشد ہراساں فرستم

انہوں نے انوری کی حمایت کی اور اُس کی جان بچ گئی، انوری نے ان واقعات کا اس قصیدہ میں ذکر کیا ہے،

اے مسلماناں فغاں از دور چرخ چنبری

چونکہ انوری کے بچانے میں ابو طالب نعیم، صفی الدین عمر، مفتی تاج الدین، حسن محتسب، نظام الدین احمد مدرس نے بھی کوشش کی تھی، اس لئے قصیدہ میں سب کا ذکر کیا ہے اور بلخ کی ہجو سے نہایت تبری کی ہے کہ بلخ قبۃ الاسلام ہے میں اس کی ہجو کیونکر کہہ سکتا ہوں،

بالآخر انوری نے تمام لغویات سے توبہ کی، اور گوشہ گزین ہو کر بیٹھا، سلطان

---

۵ مجمع الفصحاء تذکرۂ فتوحی مروزی و ریاض الصالحین، تذکرۂ انوری، دولت شاہ نے لکھا ہے کہ خود انوری نے یہ ہجو لکھی تھی، لیکن یہ غلط ہے،

علاء الدین غوری جہانسوز نے دربار میں طلب کیا، لیکن اس نے انکار کیا اور یہ قطعہ جواب میں لکھا،

کلبۂ کاندرو بہ روز و بہ شب | جائے آرام خورد و خواب من است
جا یکے دارم اندراں کہ ازو | چرخ در عین رشک و تاب من است
ہرچہ در مجلس ملوک بود، | ہمہ در کلبۂ خراب من است
رحل اجزا و نان خشک درو | گرد خوان من و کباب من است
قلم کوتہ و صریر خوشش، | زخمۂ و نغمۂ رباب من است
خرقۂ صد قبائۂ اطلس | از ہزار اطلس انتخاب من است
ہرچہ بیروں بود ازیں کم و بیش | حاش للسامعین عذاب من است
خدمت بادشہ کہ باقی باد | نہ بہ اندازۂ خاک و آب من است
زیں قدر راہ رحمتم بستہ است | آنکہ او مرجع و مآب من است
ویں طریق از نمایش است خطا | چہ کنم ایں خطا صواب من است
نیست ایں بندہ را زبان جواب | جائے و جائے من جواب من است

مدح اور ہجو کے ساتھ غزل کہنی بھی چھوڑ دی، کسی نے پوچھا تو جواب دیا،

دی مرا عاشقکے گفت غزل می گوئی | گفتم از مدح و ہجا دست بیفشاندم ہم
گفت چوں؟ گفتمش آن جانب گمراہی بود | حالت رفتہ دگر باز نیاید ز عدم
غزل و مدح و ہجا ہر سہ ازاں می گفتم | کہ مرا شہوت و حرص و غضبے بود بہم

اخیر شعر کا مضمون اگرچہ عربی سے ماخوذ ہے، لیکن اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انوری شاعری کی حقیقت سے واقف تھا، یعنی یہ کہ شاعری، جذبات انسانی کے اظہار کا نام ہے، شہوت، حرص، غصہ، سب جذبات ہیں، اور یہی جذبات غزل و مدح اور ہجو کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں،

انوری نے حسب روایت دولت شاہ ۵۴۷ھ میں بمقام بلخ وفات پائی، اور سلطان احمد خضرویہ کے پہلو میں دفن ہوا،

انوری بخلاف اکثر شعرا کے اکثر علوم متداولہ میں کمال رکھتا تھا، چنانچہ خود کہتا ہے،

گرچہ دربستم در مدح وغزل یکبارگی | ظن مبر کز نظم الفاظ و معانی قاصرم
بلکہ بر علمے کز اقران من داند کسے | خواہ جزوی باشد آں را خواہ کلی قادرم
منطق و موسیقی و ہیئت شناسم اندکے | راستی باید بگویم بانصیب وافرم
وز الٰہی انچہ تصدیقش کند عقل صریح | گر تو تصدیقش کنی بر شرح بسطش ماہرم
وز طبیعی رمز چند از جذبے تشویہ ہست | کشف دانم کرد اگر حاسد نباشد ناظرم
نیستم ہم جاہل از اعمال احکام نجوم | ور ہمی باور ندانی رنجہ شو من حاضرم
ایں ہمہ بگذار باشعر مجرد آمدم | چوں سنائی ہستم آخر گرنہ ہمچوں صابرم
قدر من صاحب قوام الدین حسن داند از انکہ | صدر او را یادگار ناصر الدین طاہرم

ان کمالات کی وجہ سے تمام لوگ اس کی عزت کرتے تھے، سلطان سنجر اس جاہ وجلال کا بادشاہ اس کے گھر آتا تھا، فتوحات کا یہ حال تھا کہ جلال الوزرا کے ہاں سے سالانہ پانچ سو اشرفیاں مقرر تھیں، بااین ہمہ چونکہ طبیعت کا دنی تھا اور زبان قابو میں نہ تھی، اِس لئے ذلتیں اُٹھاتا تھا، ایک وزیر کی مدح میں قطعہ لکھا اور اخیر میں یہ شعر لکھے،

تو کہ از دور ہمی بینی پوشیدہ مرا | حال بیروں دروں نہ ہمانا دانی
طاق بوطالب نعمہ است کہ دارم زبروں | وز دروں پیرہن بوالحسن عمرانی

یعنی میرے بدن پر مدت کے پھٹے پرانے کپڑے ہیں، چادر ابو طالب کی دی ہوئی ہے اور پیراہن ابوالحسن عمرانی کا عنایت کیا ہوا ہے، وزیر نے ناراض ہوکر، فتوحی مروزی کو حکم دیا کہ جواب لکھے، چنانچہ اس نے ایک قصیدہ لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں،

از پس آنکہ بہ یک مصرع والف ملکی | داشت در بلخ ملک شاہ بتو ارزانی

ونیس آنکہ ہزار دگرت دادہ زیر　　قرض آں پیرہن خشی زچہ می بستانی

از پس آنکہ زانعام جلال الوزراء　　بتو ہر سالہ رسد مہرے پانصد کانی

اے بد اناقی معروف چرا میگوئی　　ورثنائے کہ فرستادہٗ از نادانی

طاق بوطالب نعمہ ارت کدام نہ برون　　وزدرون پیرہن بوالحسن عمرانی

چہ بخیلی کہ چندین زر وسیم ونعمت　　طاق وپیراہنے دوختہ ہمی نتوانی

پانزدہ سال فزون باشد تا کشتہ شدہ است　　بوالحسن آنکہ ز احسانش سخن میرانی

پیرہن کہنہ او گرت بجائیست ہنوز　　پس نخواں پیرہنش کو زرہ خفتانی

باقی عمرش آں پیرہن وطاق ترا　　سزدار ندہی ابرام وہ گر بستانی

یعنی ابوالحسن عمرانی کو مرے ہوے آج پندرہ برس ہو گئے، اتنی مدت تک اس کا دیا ہوا پیرہن موجود ہے، تو پیرہن کا ہے کو ہے زرہ ہے، اور اُس کے ہوتے اب کسی پیرہن کی کیا حاجت ہے،

لطیفہ۔ ایک دفعہ انوری راہ میں چلا جاتا تھا، ایک شخص کو دیکھا کہ اشعار پڑھ رہا ہے، انوری نے خیال کیا تو اِسی کے اشعار تھے، پُوچھا کہ آپ کا تخلص کیا ہے؟ اس نے کہا "انوری" انوری نے کہا، شعر کے چور پہلے بھی سُنے تھے، شاعر چرانے والا آج دیکھا

کلام پر رائے

انوری جس پایہ کا شاعر تھا، اس سے زیادہ بہت خوش قسمت تھا، ایران میں تین شاعر پیغمبر سخن تسلیم کئے گئے، اُن میں ایک انوری بھی ہے چنانچہ مشہور ہے

در شعر سہ تن پیمبرانند　　ہر چند کہ لا نبی بعدی

ابیات وقصیدہ وغزل را　　فردوسی وانوری وسعدی

ہاتفی نے مثنوی کی رعایت سے اس کو اس طرح بدل دیا ہے،

---

[1] مجمع الفصحاء تذکرۂ فتوحی مروزی،

در شعر سه تن پیمبرانند | قولے است کہ جملگی برانند
فردوسی و انوری و سعدی | ہر چند کہ لا نبی بعدی

آباقاآن خاں کے زمانہ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ انوری اور ظہیر فاریابی دونوں میں کس کو ترجیح ہے، سب نے مجد[1] ہمگر کو ثالث قرار دیا اور ایک منظوم استفتا لکھا،

اے آں زمین وقار کہ بر آسمان فضل | ماہ خجستہ فضلے و خورشید انوری
جمعے ز ناقدانِ سخن گفتہ ظہیر | ترجیح می نہند بر اشعار انوری
جمعے دگر بریں سخن انکار می کنند | فی الجملہ در محلِ نزاع اند و داوری
رجحانِ یک طرف تو بدیشاں نما کہ ہست | زیر نگین طبع تو ملک سخنوری

مجد ہمگر نے جواب لکھا،

جمعے ز اہل خطۂ کاشاں کہ بزدہ اند | ز ارباب فضل و دانش گوی سخنوری
کردند بحث در سخن نیشان نظم | تا خود کہ سفتہ بہ دُر در سخنوری
در انوری مناظرہ شاں رفت و در ظہیر | تا مر کراست پایۂ بہتر ز شاعری
انصاف چوں نیافت گروہ از دگر گروہ | مر بندہ را گزید نظر شاں بداوری
در کانِ طبع آں چہ گشتم کراں کراں | در قعر بحر ایں چہ نمودم شناوری
شعر یکے بر آمدہ چوں در شاہوار | نظم دگر بر آمدہ چوں مہر خاوری
شعر ظہیر اگرچہ بر آمد ز جنس شعر | برتر ز انوری نہ زند لاف شاعری
بر اوج مشتری نہ رسد تیر نظم او | خاصہ کہ در ثناگری و مدح گستری
طعم رطب اگرچہ لذیذ است و خوش مذاق | کے بود ز خاصیت قند عسکری
انیست اعتقاد رہی خوش قبول کن | گر تو مقید سخن مجد ہمگری
زاد ایں نتیجہ نیم شب از آخر رجب | در خائے عین و دال ز ہجرت پیمبری

---

[1] مجد ہمگر اس درجہ کا شاعر تھا کہ بعضوں نے اس کو شیخ سعدی کا ہم پلّہ مانا ہے،

امامی ہروی نے بھی اس فیصلہ سے اتفاق کیا ہے، چنانچہ کہتے ہیں،

ای سالک مسالکِ فکرت دریں سوال — معذور نیستی بتحقیقت چو بنگری
تمیز راز بہر تناسب دریں دو طور — ہیچ احتیاج نیست بدیں شرح گستری
کیں معجزاست واں سحر آں شمع وایں چراغ — ایں ماہ آں ستارۂ و آں حور و ایں پری

انوری ظہیر سے بلکہ اپنے تمام معاصرین سے بڑھ کر ہو تو، ہم کو انکار نہیں، لیکن اس سے بڑھ کر کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ فردوسی اور سعدی کے پہلو میں اس کو جگہ دی جائے، قطعہ مشہور اور مجد ہمگر کے فیصلہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انوری قصیدہ گوئی میں پیغمبر تھا، جس طرح فردوسی اور سعدی مثنوی اور غزل میں تھے، لیکن یہ اور بھی حیرت انگیز ہے، قصیدہ کا جو اندازہ چلا آتا تھا، اس پر انوری نے کچھ اضافہ نہیں کیا، اور جس قدر کیا اس میں اس کے اور ہمعصر شریک ہیں، انوری کے قصائد کے خصوصیات یہ بتائے جاتے ہیں کہ اس نے جدید مضامین پیدا کئے، مبالغہ کو ترقی دی، نئی تشبیہیں پیدا کیں، لیکن عبد الواسع جبلی، ازرقی اور ظہیر ان باتوں میں انوری سے کسی طرح کم نہیں، انوری نے ایک قصیدہ میں ہلال کی تشبیہ سے مدح کی طرف گریز کیا ہے، اور وہ انوری کے محاسنِ اشعار میں محسوب ہے،

دوش سلطانِ چرخ آئینہ فام — آنکہ دستور شاہ راست غلام
از کنار نبرد گاہِ افق — چوں بدست غروب داد زمام
دیدم اندر سوادِ طرۂ شب — گوشوار فلک ز گوشۂ بام
گفتم آں نعل خنگ دستور است — قرۃ العین و فخر آلِ نظام

ملہ یہ وہی امامی ہیں جن کو مجد ہمگر نے شیخ سعدی پر ترجیح دی تھی، اور شیخ سعدی نے ناراض ہو کر کہا تھا ۔

ہمگر بعمر خود نکردست نماز — شک نیست کہ ہرگز بہ امامی نرسد

ملہ مجالس المومنین تذکرہ انوری، ہمگر کے قطعہ کے چند شعر ہم نے چھوڑ دیئے ہیں،

لیکن یہ تشبیہ اور گریز منطقی رازی سے ماخوذ ہے، وہ کہتا ہے،

مہ گردوں مگر بیمار گشتہ — کہ نالیدہ تنش بگرفت نقصان
بسان گوے سیمیں بود اکنوں — برآمد بر فلک چونوک چوگاں
تو گفتی خنگ صاحب تاختن کرد — فگند ایں نعلِ زریں در بیاباں

اس میں جو لطافت اور ندرت ہے انوری کے ہاں نہیں، ظہیر فاریابی نے بھی اس تشبیہ کو لیا ہے، لیکن چند اور تشبیہیں اضافہ کر کے اس کو زیادہ دلآویز کر دیا ہے،

پیدا شد از کرانۂ میدانِ آسمان — شکلِ ہلال چوں سرِ چوگانِ شہریار
من باخرد بہ حجرۂ خلوت شتافتم — گفتم کہ اے نتیجۂ الطافِ کردگار
باز ایں چہ نقشِ بوالعجب و شکلِ نادرست — کز کارگاہِ غیب ہمے گردد آشکار
گردوں زجامۂ کہ بریدہ است ایں طراز — گیتی ز ساعد کہ؟ بود ست ایں سوار
گفت آنچہ بر شمردی از انجملہ ہیچ نیست — دانی کہ ہیچ با تو بگویم بہ اختصار
نعلِ سمند شاہِ جہاں ست کاسماں — ہر ماہ بر سرش نہد از بہرِ افتخار

وطن کی ناقدری میں انوری کا مشہور شعر ہے،

بہ شہر خویش دروں بے خطر بود مردم — بہ کانِ خویش دروں بے بہا بود گوہر

لیکن یہ بالکل میر معزی کے شعر کا سرقہ ہے،

مردم بہ شہر خویش ندارد بسے خطر — گوہر بہ کان خویش ندارد بسے بہا

غرض انوری کی پیغمبری کے ثبوت میں کوئی معجزہ موجود نہیں، البتہ اپنے معاصرین یعنی ادیب صابر، ازرقی، لامعی، رشید الدین وطواط، عبدالواسع جبلی، معزی وغیرہ سے بعض باتوں میں ممتاز ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اور شعراء کی طرح اس کا کلام مدح پر محدود نہیں، وہ ہر طرح کے واقعات اور معاملات ادا کرتا ہے، جس سے زبان کو وسعت حاصل ہوتی ہے،

آج کوئی شخص اگر عام معاملات ادا کرنا چاہے تو اس کو الفاظ میں، بندش میں، ترکیب میں، انوری کے سوا اور شعراء کے کلام سے بہت کم مدد ملے گی،

ایک قصیدہ میں شاعری کی بُرائی اور اس کا غیر ضروری ہونا بیان کیا ہے، اس میں وہ تمام خیالات ظاہر کئے ہیں جو آج کل شاعری کے بیکار ثابت کرنے میں پیش کئے جاتے ہیں، اس نے ثابت کیا ہے کہ شاعر کا رُتبہ حلال خور سے بھی کم ہے، اس لئے کہ حلال خور دُنیا کے لئے ضروری ہے، لیکن شاعری کی کیا ضرورت ہے؟ ایک ادنیٰ سی چیز کے بنانے میں، بواسطہ اور بلا واسطہ سینکڑوں آدمی کی شرکت کی ضرورت پڑتی ہے، لیکن شاعر کون سا کام انجام دے سکتا ہے، مدحیہ شعر کہہ کر صلہ کا طالب ہونا کس قدر لغو ہے، ممدوح نے کب کہا تھا کہ تم اس کی مدح کرو، البتہ وہ شاعر قدر کے قابل ہے، جو کسی کی مدح وغیرہ نہیں کرتا، ان تمام خیالات کو انوری نے نہایت صفائی اور برجستگی سے ادا کیا ہے،

اے برادر بشنوی رمزی ز شعر و شاعری
تا ز ما مشتے گدا کس را بمردم نشمری

زاں کہ از کناس ناکس در ممالک چارہ نیست
حاش اللہ تا ندانی ایں سخن را سرسری

زانکہ گر حاجت فتد تا فضلۂ را کم کند
نا قلے باید، تو نتوانی کہ خود بیروں بری

کار خالد کے بجعفر مے شود ہرگز تمام
آں یکے جولاہگی داند دگر بندری گری

باز گر شاعر نہ باشد، ہیچ نقصان نا و فتد
در نظام عالم از روے خرد گر بنگری

آدمی را چوں مونث شرط کار شرکت است
نان کنامی خود ہی بہ ان بود کر شاعری

آں شنیدستی کہ سہ صد کس بباید پیشہ ور
تا تو نا دانستہ و بے آگہی نانے خوری

دار اے آں اگر از تو نباشد یار یے
آں نہ ناں خوردن بود، دانی چہ باشد مدبری

چوں نہ داری بر کسے حق حقیقت آں کہ ہست
ہم تقاضا ریش گا دے، ہم بجا...

از چہ واجب شد بگو؟ آخر دریں آزار مرد
اینکہ میخواہی از و، یا آنکہ زو مستکبری

او ترا کے گفت ؟ کایں گلترہ‌ہا را جمع کن　　تا ترا لازم شود چنداں شکایت گستری
عمر خود خود میکنی ضائع ازو تا واں مخواہ　　ہم تو حاکم باش تا ہم زاں کہ بفروشی خری
دشمنِ جانِ من آمد شعر چندش پرورم　　اے مسلماناں فغاں از دستِ دشمن پروری
شعر دانی چیست ؟ دور از روئے تو حیض الرجال　　قائلش گو خواہ حیواں باش و خواہی مشتری
اینکہ پرسد ہر زماں ایں کون خران گاو ریش　　کانوری بہ یا فتوحی در سخن یا سنجری
راستی بہ بوفراس آمد نگار شاعراں　　واں نہ از جنسِ سخن بل از کمالِ قادری
زانکہ ہمچوں دیگراں مدح و ثنا ہرگز نہ گفت　　پس مرنج ار گویدت من دیگرم تو دیگری
مرد را باید کہ حکمت نیز دامن گیردش　　تا شفاے بوعلی خواند نہ زرِ اثرِ بحتری

جس زمانہ میں غزوں (تاتاریوں) نے سلطان سنجر کو گرفتار کر لیا، اور کئی برس تک قید میں رکھا، تمام ملک میں بدامنی پھیل گئی، اہلِ خراسان نے احمد سلیمان سے استغاثہ کرنا چاہا، انوری نے درخواست کی کہ ان عبرت انگیز واقعات کو نظم میں ادا کر دے، انوری نے فرمایش کی تعمیل کی،

بر سمرقند اگر بگذری اے بادِ سحر　　نامۂ اہلِ خراساں بہ برِ خاقان بر
نامۂ مطلع او، رنجِ تن و آفتِ جاں　　نامہ مقطع او دردِ دل و سوزِ جگر
نامہ بر رقمش، آہِ شہیداں پیدا　　نامہ در شکنش، خونِ شہیداں مضمر
تاکنوں حالِ خراسان و رعایا بودہ است　　بہ خداوندے خاقان پوشیدہ مگر
اے کیومرث بقا، بادشہ کسریٰ عدل　　اے منوچہر لقا، خسرو افریدوں فر
قصۂ اہلِ خراسان بشنو از سرِ لطف　　چوں شنیدی، ز سرِ رحم در ایشاں بنگر
ایں دلِ افگار جگر سوختگاں می گویند　　کاے دل و دولت و دیں را بہ تو شادی و ظفر
خبرت ہست کزیں زیر و زبر شوم غزاں　　نیست یک تن بہ خراساں کہ نشد زیر و زبر
بر بزرگانِ زمانہ شدہ خرداں سالار　　بر کریمانِ جہاں گشتہ لئیماں مہتر

شاد الّا بہ در مرگ نہ بینی ہر دم ۔۔۔ بکر جزو مدشہکم بادام نیابی وختر
بر مسلماناں زآں شکل کنند استخفاف ۔۔۔ کہ مسلماں نہ کند صد یک آں با کافر
خلق را زیں غم فریاد رس اے شاہ نژاد ۔۔۔ ملک را زیں ستم آزاد کن اے پاک سیر
رحم کن رحم براں قوم کہ جو بیند جو بن ۔۔۔ از پس آنکہ نخوردندے از ناز شکر،
رحم کن رحم بر آنہا کہ نیابند نمد ۔۔۔ از پس آنکہ ز اطلس شاں بودے بستر

کسی دوست کو دعوت میں بلایا ہے، اور نظم میں رقعہ لکھا ہے،

ندارد مجلس ما بے تو نورے ۔۔۔ اگرچہ نیست مجلس در خور تو
چہ فرمائی چہ گوئی مصلحت چیست ۔۔۔ تو آئی نزد ما؟ یا ما بر تو

دربارداری اور دریوزہ گری سے توبہ کی تو یہ قطعہ لکھا،

من و ایں عہد کہ با قحبۂ رعنائی جہاں ۔۔۔ بعد ازاں عشق بنازم نہ بسہو و نہ بہ عمد
قوت دادن اگر نیست مرا باکے نیست ۔۔۔ قوت ناستدن ہست فللّٰہ الحمد

یعنی اگر دوسروں کو دینے کا مقدور نہیں تو یہ قدرت تو ہے کہ دوسروں سے کچھ نہ لوں،
علم کی بے قدری پر اس طرح غصہ ظاہر کرتا ہے،

اے خواجہ مکن، تا بتوانی طلب علم ۔۔۔ تا در طلب راتب ہر روزہ بمانی
رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز ۔۔۔ تا داد خود از کہتر و مہتر بستانی
فرعون غذا بہ بدو ریش مرصع ۔۔۔ موسیٰ کلیم اللہ و چوبی و شبانی

یعنی فرعون کافر ہو کر داڑھی میں موتی پروتا تھا، اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ ہو کر بکریاں چراتے تھے،

عوام کی بے تمیزی کو ایک فرضی قصہ میں ادا کرتا ہے،

رو بھے می دوید در غم جاں، ۔۔۔ روبہے دیگرش بدید چناں،
گفت خیر است؟ باز گوئی خبر ۔۔۔ گفت خر گیری می کند سلطاں

گفت تو خرنۂ چہ می ترسی ۔۔۔ گفت آرے ولیک آدمیاں
می ندانند و فرق می نہ کنند ۔۔۔ خرد رو بادہ شاں بود یکساں

شیخ سعدیؒ نے "ایں ہم بچۂ شتر است" کا لطیفہ غالباً یہیں سے لیا ہے،
بات چیت، خط کتابت میں ایشیائی تکلفات سے انوری بھی تنگ آگیا تھا، چنانچہ کہتا
ہے اور کس بے تکلفی سے کہتا ہے،

تکلف میانِ دو آزاد مرد ۔۔۔ بود ناپسندیدہ و سخت کام
بیا تا تکلف بیک سو نہیم ۔۔۔ نہ از تو رکوع و نہ از ما قیام
بہ سنت کنم اقتدا زیں سپس ۔۔۔ سلامٌ علیکم، علیکم سلام

ہجو | انوری کا اصلی مایۂ فخر ہجو ہے اور کچھ شبہہ نہیں کہ اگر ہجو گوئی شریعت ہوتی تو انوری
اس کا پیغمبر ہوتا، ہجو میں اُس نے نہایت اچھوتے، نادر، باریک، اور لطیف مضامین
پیدا کیے ہیں، ان ہجوؤں میں قوتِ تخئیل جو شاعری کی سب سے ضروری شرط ہے،
صاف نظر آتی ہے، لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ اس صنف میں اس کا جو کلام زیادہ
نادر ہے، اسی قدر زیادہ فحش ہے، سینکڑوں اشعار ہیں لیکن دو ایک کے سوا) ایک بھی
درج کرنے کے قابل نہیں، کسی کو ایسا ہی شوق ہو تو آتشکدۂ آذر موجود ہے، ہم اپنے
دست و قلم کو اس سے آلودہ نہیں کرسکتے، ایک آدھ ہجو فحش سے خالی بھی ہے، وہ
حاضر ہے،

پہلے ایک شخص کی مدح لکھی پھر صلہ کا تقاضا کیا، اس کے بعد، ہجو کی دھمکی دی دیکھو
کس لطیف طریقہ سے ادا کیا ہے،

سہ بیت رسم بود شاعرانِ طامع را ۔۔۔ یکے مدیح و دگر قطعۂ تقاضائی
اگر بداد سوم شکر، ورنہ داد ہجا ۔۔۔ ازیں سہ بیت دو گفتم، دگر چہ فرمائی

یعنی شاعروں کا قاعدہ ہے کہ تین نظمیں لکھتے ہیں، اوّل مدح پھر قطعۂ تقاضائی جس میں

صلہ کا تقاضا ہوتا ہے، اب ممدوح نے صلہ دیا تو شکریہ ورنہ ہجو، ان تین نظموں سے میں تو کہہ چکا، فرمائیے اب کیا ارشاد ہوتا ہے،

گھوڑے کی ہجو لکھتا ہے،

برعادت از وثاق بصحرا بروں شدم || با یک دو آشنا ہم از ابنائے روزگار
اسپے چناں کہ دانی زیر از میانہ زیر || وز کاہلی کہ بود نہ سکسک نہ راہوار
در خفت و خیز ماند، ہمہ راہ عید گاہ || من گاہ ازو پیادہ و گاہے براو سوار
نہ از غبار خاستہ بیروں شدے بزور || نہ از زمین خستہ بر انگیختے غبار
گہ طعنۂ ازیں کہ رکابش دراز کن || گہ بذلۂ ازاں کہ عنانش فرو گذار
من والہ و خجل متحیّر فرو شدہ || چشمے سوے بہیمہ و گوشے سوے سوار

سوؔدا نے گھوڑے کی ہجو میں جو قصیدہ لکھا ہے، اسی کا تتبع ہے، چنانچہ بحر و قافیہ بھی یہی ہے،

نکتہ۔ انوؔری کے دیوان میں چند ہجویں، انوؔری کی بیوی اور بیٹے کی بھی پائی جاتی ہیں، عام لوگوں کا خیال ہے کہ انوؔری کو ہجو کا ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ بیوی اور بیٹے کو بھی نہ چھوڑ سکا، لیکن غالباً اور شعرا نے یہ ہجویں لکھ کر اس کے دیوان میں داخل کر دیں، اور چونکہ پبلک اُس کی دشمن تھی، اس لئے وہ اسی طرح قائم رہ گئیں، اس خیال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ فتوحؔی مروزی نے انوؔری کے نام سے بلخ کی جو ہجو لکھ کر مشہور کر دی وہ آج تک انوؔری کے دیوان میں داخل ہے، حالانکہ ابو الحسن فراہانی شارح قصائد انوؔری وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ وہ ہجو، فتوحؔی مروزی کی تصنیف ہے،

انوؔری علوم عربیہ میں کمال رکھتا تھا، اس لئے اس کے کلام میں یہ خصوصیت خود بخود پیدا ہو گئی ہے کہ عربی تلمیحات، عربی جملے، عربی الفاظ اِس خوبی سے شامل کرتا ہے، کہ گویا انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا ہے، ملاحظہ ہو،

شاعری، دانی، کدامی قوم کردند آنکه بود   اوّل شاں امرء القیس، آخرشاں بوفراس
دین کہ من خادم ہمی پردازم اکنوں ساحریست   سامری گو تا بیاید گوشمال ازماس

سنائی کے قصیدے کا جو جواب لکھا ہے، اس میں اکثر قافیے اسی قسم کے آئے ہیں، مثلاً

بر و جان پدر تن در شیت دہ که دیر افتد   زیا جوج تمنّا رخنه در سدّ دو شینا
بلے از جاهدوا کینسر ست تست این رشته   ولیک از جاهدوا هم بر نخیزد هیچ بے فینا
یعنی جاهدوا فینا ۱۲
چوں مراد خویش را با ملک رے کردم قیاس   در خراساں تازه نہادم اقامت را اساس
چوں غنیمت را مقابل کرده شد با ایمنی   عقل سی روزه و طمع ماہے بود راسا براس
انظروا نقتبس من نورکم کے گفت چرخ   کافتاب از آفتاب ہمتت کرد اقتباس
تا که باشد این مثل کالیاس احدی الراحتین   باشے اندر راحتے کو را نباشد ہیچ یاس
بے سپیده دم شب خذلان بد خواہت چنانکہ   تا بصبح حشر میگوید احادٌ ام سداس

متنبی کے اس مطلع کی طرف اشارہ ہے، احادٌ ام سداسٌ فی اُحاد،

دوستاں بایک پُرخوں کرا نیک قد مضے   دشمناں با یکدگر پُرخنده کا نیک قد هلک

آدم از نسبتِ وجود تو یافت   اختصاصِ خلقتہ بیدی
دوش با آسماں ہمے گفتم   بر سبیل سوال مطلب ایّہ
کاے علی اخرج این حشم بر کیست   ہمتت گفت قد ضنیت علی
میر آب رت وحق ہمی گوید   کہ من الماء کلّ شیءٍ حیّ

خصم تو در قاعدهٔ ملک او   آں شده اند بد و جہان مستقیم
چوں دو بنا بود برافراشتہ   زاں دو یکے محدثہ دیگر قدیم
زلزلهٔ قہر توشاں کرد پست   زلزلة الساعة شیءٌ عظیم

جو لوگ انوری کی پیغمبری کے قائل ہیں وہ اس کے ثبوت میں اُس کی مضمون آفرینیوں سے

استدلال کرتے ہیں،

متنبّی نے مضمون باندھا تھا کہ ممدوح گو انسانوں میں داخل ہے، لیکن انسانوں سے فائق ہے جس طرح نافہ کہ ہرن کے خون سے بنا ہے، لیکن خون سے اس کو کچھ نسبت نہیں ہے،

فان تفق الانام وانت منهم   فان المسك بعض دم الغزال

اس سے ترقی کرکے شراب و انگور کی مثال دی ہے،

فان فی الخمر معنیً لیس فی العنب

یعنی گو شراب انگور سے بنتی ہے، لیکن یہ انگور سے بڑھ کر ہے، ممدوح کا بھی یہی حال ہے،
انوری نے ان سب تشبیہوں کو گرد کر دیا،

در جہانی و از جہاں بیشی،   ہمچو معنی کہ در بیاں باشد

یعنی اے ممدوح تو دنیا میں ہے، لیکن دنیا سے زیادہ ہے، جس طرح عبارت میں معنی ہوتے ہیں کہ عبارت ذراسی ہوتی ہے اور مضمون نہایت وسیع ہوتا ہے،

ز حرص خدمت او سر نگوں ہمے آیند   بوقتِ زادن از ارحام مادراں طفلاں

بچے عموماً ماں کے پیٹ سے سر کے بل پیدا ہوتے ہیں، انوری اس کا سبب یہ قرار دیتا ہے کہ انسان فطرۃً ممدوح کی خدمت کے خواہشمند ہیں، اس لئے دنیا میں آتے ہیں تو سر کے بل آتے ہیں، مبالغہ جو عوام کے نزدیک شاعری کی ایک اعلیٰ صفت ہے، انوری اس میدان میں سب سے آگے ہے،

ممدوح کی مدح میں   ع اے بیش ز آفرینش و کم ز آفریدگار

ع چیست کاں بر تو روا نیست مگر عز و جل

بزرگواری کاندر کمال قدرت خویش   نہ ایزد دست چو ابر دا بزرگ بے ہمتا رست

گر صبا از کف دست تو وزد وقت بہار   درم افشاں دمد از شاخ بروں دست چنار

انوری اور یورپ | انوری کی خوش قسمتی میں ایک نمبر یہ بھی اضافہ کرنا چاہیئے کہ یورپ نے اس کے کلام کے ساتھ نہایت اعتنا کیا، روس کے پروفیسر والن ٹن ژوکوسکی نے ۱۸۸۳ء میں بمقام سینٹ پٹرسبرگ، انوری کے کلام اور اس کی سوانحمری پر ایک کتاب لکھی جس کا نام یہ ہے "میٹریس فار اے بیوگرفی اینڈ کیرکٹر سٹک اسکیچ" یہ کتاب ۱۷۰ صفحات پر مشتمل ہے، اور اس کے عنوانات حسب ذیل ہیں:-

دیباچہ	از صفحہ ۱ تا ۷
مقدمہ	۸ تا ۲۴
باب اول	۱ تا ۳۰ اس میں انوری کی سوانحمری ہے
باب دوم	۳۱ تا ۷۸ مشتمل بر خصوصیات انوری
باب سوم	از ۷۹ تا ۹۷ مشتمل بر شرح کلام انوری
باب چہارم	از ۹۸ تا ۱۰۲ انوری کی زبان اور تاریخ تصانیف
باب پنجم	از ۱۰۳ تا ۱۳۵ ترجمہ قصائد انوری
باب ششم	از ۱۳۵ تا ۱۳۷ ترجمہ غزلیات انوری

پروفیسر براؤن نے اس کتاب کا حال تفصیل سے لکھا ہے، ناظرین اس کو ملاحظہ فرمائیں اور غور کریں کہ اہل یورپ ہر زبان کے متعلق، کیا کیا نکتہ سنجیاں اور دیدہ ریزیاں کرتے ہیں کہ ہم ان کی تقلید بھی نہیں کر سکتے۔

نظامی

الیاس یوسف نام، ابو محمد کنیت، نظام الدین لقب، نظامی تخلص، باپ کا نام مؤید تھا، وطن عام طور پر گنجہ مشہور ہے، لیکن در اصل قم کے رہنے والے تھے، چنانچہ خود سکندر نامہ میں فرماتے ہیں،

چو در گرچہ در بحر گنجہ گمم — ولے از قہستانِ شہر قمم

قم کے اضلاع میں تفرش ایک ضلع ہے، اصل وطن یہاں تھا، لیکن چونکہ قم صدر مقام ہے، اس لئے انتساب میں تفرش کے بجائے قم کا نام لیتے ہیں، نظامی کے والد بزرگوار وطن چھوڑ کر گنجہ میں آئے، نظامی یہیں پیدا ہوئے[1]، سالِ ولادت کسی نے بیان نہیں کیا، لیکن چونکہ بروایت صحیح سن وفات ۵۹۶ھ ہے اور ان کی عمر عموماً ۶۳ برس کی بیان کی جاتی ہے، اس لئے سال ولادت ۵۳۳ھ سمجھنا چاہیئے،

نظامی کا خاندان علمی خاندان تھا، ان کے بھائی قوامی مطرزی مشہور شاعر ہیں، ان کا ایک قصیدہ ہے، جس میں تمام صنائع شاعری جمع کر دیئے ہیں،

نظامی نے ابتدا میں درسی علوم کی تحصیل کی، ان کے کلام سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ علمی مسائل ان کے پیشِ نظر ہیں، خود بھی دعویٰ کرتے ہیں،

ہر چہ ہست از دقیقہاے نجوم — با یکایک نہفتاے علوم

---

[1] یہ امین رازی اور لطف علی آذر کی تحقیق ہے، لیکن سکندر نامہ کے جس شعر سے امین رازی نے استدلال کیا ہے، وہ موجودہ نسخوں میں مذکور نہیں، تفرش کی مزید تفصیل، اور نظامی کی جائے ولادت لطف علی آذر سے ماخوذ ہے،

خواندم و سر ہر ورق جستم   چوں ترا یافتم ورق شستم

سلسلۂ طریقت میں واخی فرج زنجانی سے بیعت تھی،

نظامی اگرچہ درویشانہ طبیعت رکھتے تھے، لیکن شاعری بھی ازل سے ساتھ لائے تھے، گھر میں پہلے سے شاعری کا چرچا تھا، اس لئے درسی علوم سے فارغ ہو کر تصنیف کا قلم ہاتھ میں لیا، تو حرف موزوں نکلے، مشق روز بروز بڑھتی گئی، اور کلام کا شہرہ دُور دُور پہنچا، یہاں تک کہ اُس زمانہ کے تمام بڑے بڑے سلاطین نے ان کی قدر دانی کو لازمۂ سلطنت سمجھا، اور فرمایش کر کے اُن سے اپنے اپنے نام پر کتابیں لکھوائیں، اسباب اس کے مقتضی تھے کہ سب سے پہلے قریبی دربار سے تعلق پیدا ہوتا لیکن یہ سعادت دُور والوں کی قسمت میں لکھی تھی، سب سے پہلے جس کو یہ عزت نصیب ہوئی وہ بہرام شاہ[1] تھا، نظامی نے مخزن الاسرار ۵۵۹ھ میں اسی کے نام پر لکھی، اور صلہ میں اس نے پانچہزار اشرفیاں، ایک قطار شتر، اور انواع و اقسام کے بیش قیمت کپڑے بھیجے،

مخزن کی تصنیف کے وقت نظامی کا سن تقریباً ۲۵ برس کا تھا،

نظامی کا وطن گنجہ، سلجوقیوں کی حدودِ حکومت میں واقع تھا، اور اس زمانہ میں اس سلسلہ میں سلطان طغرل بن ارسلان فرماں روا تھا، وہ نہایت دلیر، شجاع اور عدل پرور بادشاہ تھا، علم و فضل میں بھی کمال رکھتا تھا، شعر و شاعری کا بھی مذاق تھا، چنانچہ یہ باعی

---

[1] سلطان الپ ارسلان سلجوقی نے منکوچک غازی کو، جو قائم بامر اللہ کا منظورِ نظر تھا، ارزنجان اور کماخ وغیرہ کے علاقہ کا حاکم مقرر کیا تھا، اس کے خاندان میں سے بہرام شاہ نے بہت جاہ و جلال حاصل کیا، یہاں تک کہ سلطان قلیچ ارسلان سلجوقی بادشاہ روم نے اس کو اپنی لڑکی بیاہ دی، بہرام شاہ نہایت فیاض اور بلند ہمت تھا، یہی بہرام، نظامی کا ممدوح ہے، جس کے نام پر انہوں نے مخزن الاسرار لکھی،

(از ہفت اقلیم امین رازی)

اس کی مشہور ہے،

دی روز چناں وصال جاں افروزی — وامروز چناں فراق عالم سوزی

حیف است کہ در دفتر عمرم ایام — آں را روزے نویسد، ایں را روزی

طغرل نے سلطنت کا تمام کاروبار اتابک محمد بن ایلدگز کے ہاتھ میں دے دیا تھا، جو ابتدا میں غلام تھا اور ترقی کرتے کرتے امیرالامراء کے منصب پر پہنچ گیا تھا، محمد ابن ایلدگز کا بھائی قزل ارسلان جس کی مدح میں ظہیر فاریابی کا یہ شعر مشہور ہے،

نہ کرسی فلک نہد، اندیشہ زیر پائے — تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد

کاروبار سلطنت میں برابر کا شریک تھا،

اس زمانہ میں نظامی نے شیریں خسرو لکھنی شروع کی تھی، کتاب کا ابھی آغاز تھا کہ اس کے چرچے دور دور پھیل گئے، طغرل کو خبر ہوئی، اسی وقت فرمان بھیجا کہ ایسی کتاب لکھئے کہ یادگار رہ جائے، چنانچہ دیباچہ میں لکھتے ہیں،

چو سلطان جہاں شاہ جوان بخت — کہ برخوردار بادا زتاج و از تخت

بسلطانی بتاج و تخت پیوست — بجای ارسلاں بر تخت بنشست

من ایں گنجینہ را دم می گشادم — بنای ایں عمارت مے نہادم

اشارت رنگے از درگاہ معمور — بہ شغل بندہ القا کرد منشور

کز نیساں تحفۂ عالی بسازد — کہ عقل از منش گردن فرازد

جس زمانہ میں نظامی یہ مثنوی لکھ رہے تھے، ان کے ایک دوست جو مذہب میں نہایت تعصب رکھتے تھے، ان کے پاس آئے اور نہایت ناراضی کے لہجہ میں کہا کہ کافروں کے جھوٹ سچ قصے لکھنے سے کیا فائدہ،

فسوں بت پرستاں بفگن از مشت — فسوں خوانی مکن بر ژند زردشت

؎ حبیب السیر،

در توحید زن کا وازه داری چرا رسم مغاں را تازه داری

لیکن نظامی نے جب مثنوی کے چند اشعار پڑھ کر سنائے، توانھوں نے بیساختہ کہا،

چنیں سحرے تو دانی ساز کردن بُتے با کعبۂ انباز کردن

شیریں خسرو جب انجام کو پہنچی تو محمد بن یلد کز جو درحقیقت تاج و تخت کا مالک تھا وفات کرچکا تھا، اوراس کا بھائی قزل ارسلاں اس کا قائم مقام مقرر ہوا تھا اس کو شیریں خسرو کے تمام ہونے کی خبر پہنچی تو نظامی کی طلبی کا فرمان بھیجا، قاصد فرمان لے کر آیا، نظامی نے آداب شاہی کے مطابق فرمان کو پہلے سر پر رکھا، پھر تین جگہ بوسہ دے کر کھولا، چنانچہ شیریں خسرو کے خاتمہ میں خود فرماتے ہیں،

مثالِ شاہ را بر سر نہادم سہ جا بوسیدم و سر بر کشادم

اسی وقت گھوڑے پرسوار ہوئے، اور دشت و بیاباں طے کرتے ہوئے قریباً ایک مہینہ میں پائے تخت میں پہنچے، قاصد نے جاکر دربار میں اطلاع کی، قزل ارسلاں نے شمس الدین محمد کو حکم دیا کہ خود جاکران کو ساتھ لائے، دربار میں پہنچے تو دیکھا کہ مجلسِ عیش آراستہ ہے، ساز چھڑ رہے ہیں، گانا ہورہا ہے، بادہ و جام کا دور چل رہا ہے، قزل ارسلاں نے فوراً ان کے ادب سے گانا بجانا بند کرادیا، اور تخت سے اٹھ کر تعظیم بجالایا، پھر بیٹھنے کا اشارہ کیا، ہرطرح کی باتیں ہوتی رہیں، بیچ بیچ میں بزرگانہ نصیحتیں بھی کرتے جاتے تھے، مدحیہ نظم لکھ کرلے گئے تھے، اس کو سنانا چاہا، قاعدہ یہ تھا کہ شعرا اپنا کلام خود نہیں پڑھتے تھے، بلکہ کسی خوش لہجہ سے پڑھواتے تھے، جو ہمیشہ اُن کے ساتھ رہتا تھا، اوراس کو راوی کہتے تھے، چنانچہ راوی نے قصیدہ پڑھنا شروع کیا، یہ بھی دستور تھا کہ جب قصیدہ پڑھا جاتا تھا تو شاعر کھڑا ہوجاتا تھا، اور قصیدہ کے ختم ہونے تک کھڑا رہتا تھا، نظامی نے بھی اس قاعدہ کو بجالانا چاہا، لیکن قزل ارسلاں نے قسم دلاکر منع کیا،

پو چو بر پا ایستادم گفت بنشیں
بر سوگندم نشاند این منزلت بیں

راوی نے مدح کے بعد، شیریں خسرو کا قصہ شروع کیا، بادشاہ نظامی کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے نہایت شوق میں سن رہا تھا اور بار بار بیساختہ تحسین کرتا جاتا تھا، نظامی کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ آپ نے ہمیشہ کے لئے میرا نام زندہ کر دیا، اس کا صلہ دینا میرا فرض ہے، پھر پوچھا کہ بھائی صاحب (اتابک پہلوان محمد بن ایلدکز) نے آپ کی جاگیر میں جو دو گاؤں دیئے تھے، وہ آپ کو ملے یا نہیں، انہوں نے کہا،

بلے شاہ سعید از خاص خویشم
پذیرفت انچہ فرمودی زپیشم

چو در خت عمر او کشتی رواں کرد
مرا نے جملہ عالم رازیاں کرد

قزل ارسلاں نے ایک گاؤں جس کا نام حمدونیاں تھا، اپنی طرف سے جاگیر میں دیا،[۱] معلوم نہیں، جان کر یا غلطی سے، گاؤں جو جاگیر میں دیا گیا وہ غیر آباد اور بنجر تھا، چنانچہ نظامی نے شیریں خسرو میں، اس کی شکایت اس تقریب سے کی ہے کہ حاسدوں نے مجھ کو طعنہ دیا، میں نے جواب میں کہا کہ غیر آباد ہے تو کیا، بادشاہ کا عدل اس کو آباد کر دے گا،

نظامی کی شہرت اب اس قدر عالمگیر ہوگئی تھی کہ اور سلاطین کو بھی آرزو ہوئی کہ ان سے اپنے نام پر تصنیفات لکھوائیں کہ اس ذریعہ سے ان کا نام بھی یادگار رہ جائے، ان میں علم و فضل کی قدردانی کے لحاظ سے سب سے ممتاز منوچہر خاقان کبیر جلال الدنیا والدین شاہ آخستان تھا جو سلاطین شروانیہ کے سلسلہ کا درۃ التاج تھا، یہ خاندان خالص ایرانی النسل یعنی بہرام چوبیں کی یادگار تھا، منوچہر نہایت علم دوست اور علم پرور تھا، خاقانی ابو العلاء گنجوی (استاد خاقانی) ذوالفقار شروانی، شاہفور وغیرہ شعراء اسی کے خوان کرم کے زلہ خوار تھے، ابو العلاء گنجوی، اسی کے دربار کا ملک الشعراء تھا، اور خاقانی کو افضل الشعراء کا خطاب اسی نے عنایت کیا، منوچہر نے اپنے ہاتھ سے نظامی کو دس پندرہ سطروں کا خط لکھ کر

[۱] یہ تمام حالات تفصیل کے ساتھ خود نظامی نے شیریں خسرو کے خاتمہ میں لکھے ہیں،

بھیجا کہ لیلیٰ مجنوں کی داستان نظم کیجئے، چنانچہ دیباچہ میں خود کہتے ہیں،

درحال رسید، قاصد از راہ	آورد مثال حضرت شاہ
نبشتہ بہ خط خوب خویشم	دہ پانزدہ سطر نغز بیشم
کای محرم حلقۂ غلامی	جادوئے سخن جہاں نظامی
خواہم کہ بہ یاد عشق مجنوں	گوئی سخنے چو دُرِّ مکنوں

خط پہنچا تو نظامی کو تردد ہوا، اتفاق سے ان کے صاحبزادے محمد جن کی عمر اس وقت ۱۴ برس کی تھی، اس وقت موجود تھے، اُنہوں نے بھی تحریک کی، نظامی نے کہا جان پدر قصہ کی شہرت میں کلام نہیں، لیکن جہاں کی سرگذشت ہے، وہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں، باغ و بہار، چشمہ و سبزہ زار، رقص و سرود، شاہی در و دربار، خیل و حشم، جاہ و جلال کسی چیز کا پتہ نہیں، خشک ریگ زار، اور کوہستان میں میں کیا صنعت گری دکھاؤں گا،

نے باغ و نہ بزم شہریاری	نے رود و نہ می نہ کامگاری
بر خشکیٔ ریگ و سختیٔ کوہ	تا چند سخن رود در اندوہ

یہی بھید ہے کہ آج تک کسی نے اس قصہ کو ہاتھ نہیں لگایا، صاحبزادہ نے کہا یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایسا موثر اور عجیب و غریب واقعہ نظم کی آرایش سے محروم رہ جائے، غرض نظامی نے بادشاہی ارشاد کی تعمیل شروع کی، اور کچھ کم چار مہینے میں انجام کو پہنچائی، سالِ اتمام رجب ۵۸۴ھ ہے،

من گفتم و دل جواب می داد	خاریدم و چشمہ آب می داد
این چار ہزار بیت و اکثر	گفتم بہ چہار ماہ کمتر
گر شغل دگر حرام بودے	در چاردہ شب تمام بودے
تاریخ عیاں کہ داشت باخود	ہشتاد و چہار بود و پانصد ۵۸۴ھ

نظامی نے اس مثنوی کے صلہ میں بادشاہ سے یہ خواہش کی کہ ان کے صاحبزادے ولیعہدِ سلطنت کے ندیموں اور مصاحبوں میں داخل کئے جائیں،

۱۴ رمضان ۵۹۳ھ میں سلطان غیاث الدین کرپ[1] ارسلاں علاء الدین آقنقری کی فرمایش سے ہفت پیکر لکھی، جس میں بہرام گور کا قصہ ہے،

قزل ارسلاں کے مرنے کے بعد، اس کا بھتیجا یعنی محمد بن ایلدکز کا فرزند ارجمند ابو بکر نصرۃ الدین ۵۸۷ھ میں مسند آرا ہوا، نظامی کو اس خاندان سے قدیم تعلق تھا، اسوقت تک اُنھوں نے جو کتابیں لکھی تھیں، سلاطینِ وقت کی فرمایش سے لکھی تھیں، لیکن سکندرنامہ اپنی خواہش سے لکھا، اور ابو بکر نصرۃ الدین کے نام سے موسوم کیا، یہ کتاب ۵۹۹ھ میں انجام کو پہنچی، چنانچہ خود سکندر نامۂ بحری کے خاتمہ میں لکھتے ہیں،

بہ پایاں شد ایں داستانِ دری	بہ فیروز فالی و نیک اختری
زہجرت چناں بردہم یادگار	نود و نہ گزشتہ ز پانصد شمار

کتاب لکھ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کی، تو مقررہ رقم کے علاوہ، سواری کا گھوڑا، بیش قیمت کپڑے، خلعت وغیرہ عطا ہوا[2]،

اساتذہ سے میں نے سُنا ہے کہ سلاطینِ وقت نظامی کی اس قدر عزت کرتے تھے، کہ ایک بادشاہ نے اپنی لڑکی، ان کے بیٹے سے بیاہ دی تھی، میں نے کسی کتاب میں یہ واقعہ نہیں دیکھا، لیکن سکندر نامہ بحری کے خاتمہ سے اس قدر بہ تصریح ثابت ہوتا ہے کہ نظامی نے اپنی صاحبزادی اور اپنے فرزند محمد کو، نصرۃ الدین کی خدمت میں بھیجا تھا، چنانچہ کہتے ہیں،

---

[1] اس کا حال نہ معلوم ہو سکا، [2] سکندر نامۂ بحری کے خاتمہ میں یہ تصریح ہے، لیکن تعجب ہے کہ نقد رقم صرف ہزار لکھی ہے، اگر یہ ہزار دینار بھی فرض کر لئے جائیں تب بھی ایسی رقم ہے جو نہ نظامی کے شایان ہے، نہ ایک مشرقی بادشاہ کے چہرے پر کھلتی ہے،

دو گوہر برآمد ز دریاے من | فروزندہ از ر دی شاں راے من
یکے عصمتِ مریمے یافتہ | یکے نورِ عیسیٰ برو تافتہ
فرستادہ ام ہر دو را نزد شاہ | کہ یاقوت را ورج دارد نگاہ
عروسے کہ دو را و زنا در بود | بہ ار پردہ دارش برادر بود
بباید چو آید بر شہریار | چنیں پردگی را چناں پردہ دار
چو من نزل خاص تو جا دادہ ام | جگر نیز با جان فرستادہ ام

اخیر شعر سے صاف یہ راز کھل جاتا ہے،

اِس کتاب کی تصنیف کے وقت اُن کی عمر ۶۳ برس کی تھی، چنانچہ جہاں اور حکما کے مرنے کا الگ الگ عنوان قائم کیا ہے، اپنے نام کی بھی سُرخی قائم کی ہے، اس کے ذیل میں لکھتے ہیں،

نظامی چو ایں داستان شد تمام | بہ عزم شدن تیز برداشت گام
فزوں بود شش مہ ز شصت و سہ سال | کہ بر عزم رہ بر دہل زد دوال

اِس کتاب پر ان کی شاعری اور عُمر دونوں کا خاتمہ ہوا، سالِ وفات میں سخت اختلاف ہے، دولت شاہ میں ۵۹۶ھ لکھا ہے، لیکن یہ خود نظامی کی تصریح کے خلاف ہے، تقی کاشی نے ۶۰۶ھ لکھا ہے، جامی ۵۹۲ھ بیان کرتے ہیں، لیکن اس قدر قطعی ہے کہ ۵۹۹ھ کے بعد اُن کی وفات ہوئی ہے اور غالباً چھٹی صدی سے آگے نہیں بڑھے، چونکہ انہوں نے تمام عمر گوشۂ عزلت سے قدم نہیں نکالا، نہ لوگوں سے زیادہ ملتے جُلتے تھے، اِس لئے ان کی زندگی کے حالات و واقعات بہت کم معلوم ہیں، عام تذکرہ نویس ان کے اس وصف کے نہایت مداح ہیں کہ وہ بادشاہوں کی خوشامد اور دربارداری سے بالکل پاک تھے، البتہ جو سلاطین ان کے ساتھ ارادت و اعتقاد کے ساتھ پیش آتے تھے، ان پر بزرگانہ عنایت کرتے تھے، لیکن ان کی کتابوں میں سلاطین کی جو مدحیں ہیں

ان میں وہی حد سے زیادہ مبالغہ، خوشامد اور تملق ہے جو عام مداحوں کا انداز ہے، اس سے بڑھ کر یہ کہ جس بادشاہ کا ذکر کرتے ہیں اس طرح کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس کے سوا، کسی دربار سے تعلق نہیں، اور وہ اس کو فرمانروائے عالم سمجھتے ہیں، بے شبہ انہوں نے مدحیہ قصائد نہیں لکھے لیکن مثنویوں میں اس زور کی مدحیں لکھیں جن کے آگے قصائد کی کوئی ہستی نہیں، ملاحظہ ہو،

ولایت ستاں شاہِ گیتی پناہ	فریدوں کمر بلکہ خاقاں کلاہ
ستارہ کہ بر چرخ سایہ سرش	زدہ سکۂ عبدہٗ بر درش
چو تیر از کمانِ کمیں افگند	سر آسماں بر زمیں افگند
فرنگ و فلسطین و رہبانِ روم	پذیرائے فرمان مہرش چو موم

اس سے زیادہ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ بادشاہوں کے سامنے اپنے آپ کو جس حیثیت سے پیش کرتے ہیں، وہی ہوتی ہے جو گداپیشہ شاعروں کا انداز ہے، یعنی حضور کا نمکخوار ہوں، غلام ہوں، بندۂ درگاہ ہوں، حضور کی ذراسی توجہ سے میرے سارے کام بن جائیں گے، حضور ہی میری مشکلوں کو حل کر سکتے ہیں،

کلام پنج گنج کے سوا نظامی کا اور بہت سا کلام تھا جو آج مفقود ہے، دولت شاہ کا بیان ہے کہ اس میں غزلیں، موشحات اور صنائع کے بیس ہزار شعر تھے، تذکروں میں چند قصائد، قطعات اور غزل کے جستہ جستہ اشعار پائے جاتے ہیں، تعجب یہ ہے کہ عشقیہ شاعری کی نقش آرائیاں انہی کی بدولت وجود میں آئیں، لیکن غزلیں پھیکی اور بے مزہ ہیں، ملاحظہ ہو،

خوشا جانے کزو جانے بیاسود	نہ درویشے کہ سلطانے بیاسود
نکوئی برنکو روے بماناد	کہ از لبہاش دندانے بیاسود
بہ عمر خود پریشانی مبنیاد	دلے کز وے پریشانے بیاسود

مرا گوئی کہ چونی؟ چونم اے دوست
جگر پُر درد و دل پُر خونم اے دوست

شنیدم عاشقاں را مے نوازی
مگر من زاں میاں بیرونم اے دوست

پیش تو کردہ ام عیاں حالِ تباہ خویش را
تا تو نصیحتے کنی چشم سیاہ خویش را

زر نشنم مکن کہ تو شیفتہ تر زمن شوی
گر نگری در آئینہ روئے چو ماہ خویش را

ختنی جمالی اے مہ زحبش چہ نام داری
تو بجز خطے و خالے زحبش کدام داری

حبشی منم بہ رتن ہمہ سوختست خونم
ختنی توئی کہ در بر ہمہ سیم خام داری

حبشی است رنگ مویت ختنی است رنگ رویت
تو میان ایں دو کشور بہ کجا مقام داری

حبشی سفید نہ بود، ختنی نمک نہ دارد
تو بغایتِ سفیدی نمکے تمام داری

انہی بوڑھے غمزوں میں، کبھی کبھی بڑے شوخ جملے بھی زبان سے نکل جاتے ہیں،

بوسہ می خواہم ازاں لب تو چہ می فرمائی
گر صواب است بگو ورنہ خطلے بہ کنم

میں لب کا ایک بوسہ چاہتا ہوں کہئے کیا رائے ہے
مناسب ہو تو بہتر، ورنہ نامناسب ہی کیا جائے

قصیدے بہت ہیں، لیکن ان میں بھی کوئی خاص بات نہیں، سنائی کا انداز ہے، اخلاق اور تصوف کو ترکیب دے کر کہتے ہیں، لیکن سنائی سے بہت پیچھے ہیں، اس لئے مقبول نہ ہو سکے، البتہ ایک قطعہ نہایت صاف، شستہ اور پُر لطف کہا ہے، جس کا آج تک جواب نہ ہو سکا،

دوش رفتم بہ خرابات و مرا راہ نبود
می زدم نالہ و فریاد کس از من نشنود

یا نہ بد ہیچ کس از بادہ فروشاں بیدار
یا کہ من ہیچ کسم ہیچ کسم، در نگشود

پاسے از شب بگذشت بیشترک یا کمتر
رندے از غرفہ بروں کرد سر و رُخ بنمود

گفت خیر است بدیں وقت کرا میخواہی
بے محل آمدنت بر درِ ما بہر چہ بود

گفتمش در بکشا، گفت برو ہرزہ مگوی
کاندریں وقت کسے بہر کسے در نگشود

ایں نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشایند
کہ تو دیر آئی و اندر صف پیش استی زود

این خرابات مغان ست در و رندانند | شاہد و شمع و شراب و شکر و نای و سرود
ہرچہ در جملۂ آفاق در ینجا حاضر | مومن و برہمن و گبر و نصارا و یہود
گر تو خواہی کہ دم از صحبت ایشان بزنی | خاک پائے ہمہ شو، تا کہ بیابی مقصود

عصمت بخاری اور عُرفی نے قوافی بدل کر اس کا جواب لکھا ہے، لیکن جواب نہ ہو سکا، عصمت کا قطعہ یہ ہے،

سرخوش از کوی خرابات گذر کردم دوش | بہ طلبگاری ترسا بچۂ بادہ فروش
پیشم آمد بہ سر کوچہ پری رخسارے | کافرے عشوہ گرے زلف چو زنار بدوش
گفتم این کوی چہ کوی ست ترا خانہ کجا است | اے مۂ نو خم ابروی ترا حلقہ بگوش
گفت تسبیح بہ خاک افگن و زنار بہ بند | سنگ بر شیشۂ تقوی زن و پیمانہ بنوش
بعد ازاں پیش من آتا بتو گویم سخنے | راہ بنمایم اگر بر سخنم داری گوش
دین برافگندہ و مدہوش و دیدم در پیش | تا رسیدم بہ مقامے کہ نہ دین ماند و نہ ہوش
دیدم از دور گروہے ہمہ دیوانہ و مست | از خم بادۂ عشق آمدہ در جوش و خروش
بے می و مطرب و ساقی ہمہ در عیش و سرود | بے می و جام و صراحی ہمہ در نوشانوش
چوں سر رشتۂ ناموس برفت از دستم | خواستم تا سخنی پرسم ازو گفت خموش
این نہ کعبہ است کہ بے پا و سر آئی بہ طواف | دین نہ مسجد کہ چنیں بے ادب آئی بخروش
این خرابات مغان است و در و رندانند | از دم صبح ازل تا بقیامت مدہوش

قصیدہ میں ان کی یہ خصوصیت لحاظ کے قابل ہے کہ اگرچہ ان کو مختلف درباروں سے تعلق تھا، اور جس قدر مثنویاں لکھیں سب کسی نہ کسی فرماں روا کے نام پر لکھیں، تاہم قصیدہ کو انہوں نے مداحی سے آزاد رکھا، اور یہ بتایا کہ شعر کی اس عمدہ صنف سے اور بھی مفید کام لئے جا سکتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان کے نقشِ قدم پر کوئی نہ چلا قصیدے اس وقت سے آج تک خوشامد کی طرز میں ادا کئے جاتے ہیں ؛

نظامی کی شاعری

نظامی نے شاعری کو جس طرح ترقی دی اور جو باتیں اس میں پیدا کیں ان کو ہم تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں، لیکن پہلے ان سب کو اجمالاً لکھ دینا چاہیئے تاکہ یکجائی طور سے سب باتیں پیشِ نظر ہو جائیں، ان کی خصوصیات حسبِ ذیل ہیں :-

(۱) جامعیت، یعنی شاعری کی ہر صنف کو انہوں نے ترقی دی،

(۲) زورِ کلام،

(۳) بلاغت،

(۴) جدتِ استعارات اور تشبیہات،

(۵) ایجاد واختراع اور قوتِ تخئیل،

(۶) اوّلیات یعنی بہت سی باتیں اوّل انہی نے ایجاد کیں،

اب ہم ایک ایک کو تفصیل سے لکھتے ہیں،

جامعیت | ایران میں جس قدر شعرا گزرے ہیں وہ خاص خاص انواعِ شاعری میں کمال رکھتے تھے، مثلاً فردوسی رزم کا مردِ میدان ہے، عشقیہ شاعری میں اس کو کمال نہیں، سعدی اخلاقی اور عشقیہ شاعری کے پیغمبر ہیں، لیکن رزم میں پھیکے ہیں، چنانچہ سکندر نامہ کی طرز پر شاطر اصفہانی کی جو حکایت بوستان میں لکھی ہے، اگرچہ اس میں اپنا پورا زور صرف کر دیا ہے، لیکن وہ بوڑھاپن نہیں جاتا، ایک مصرع نہایت زور شور کا ہے، دوسرے میں دفعتہً پست ہو جاتے ہیں، خیام صرف فلسفہ لکھ سکتا ہے، حافظ صرف غزل لکھ سکتے ہیں، بخلاف اس کے نظامی نے رزم، بزم، فلسفہ، عشق، اخلاق، سب کچھ لکھا ہے، اور جو کچھ لکھا ہے، لاجواب لکھا ہے، البتہ مدح ان سے نہیں بن پڑتی، لیکن مدح کوئی شاعری نہیں، شاعر بھاٹ نہ ہو تو اس کی شاعری میں کیا نقص ہے،

نظامی کی انواعِ شاعری پر الگ الگ بحث آگے آتی ہے،

اولیات، نظامی بہت سی باتوں کے موجد ہیں،

مثلاً سب سے پہلے انہی نے پانچ مختلف بحروں میں مثنویاں لکھیں، جس کی تقلید اُس وقت سے آج تک تمام بڑے بڑے شعراء کرتے آئے ہیں، چنانچہ اُن کے خمسہ پر تمام اکابر شعراء نے خمسہ لکھا ہے،

مخزن اسرار اور ہفت پیکر کی بحر کو اوّل انہی نے مثنوی میں داخل کیا،

سب سے پہلے انہی نے ایک مثنوی (مخزن اسرار) میں پانچ نعتیں لکھیں اور ہر ایک کا جُدا رنگ ہے،

سب سے پہلے انہی نے فلسفیانہ مباحث کو نظم کیا،

سب سے پہلے انہی نے ساقی نامہ کا خاکہ قائم کیا،

سب سے پہلے انہی نے قصیدہ کو مدح سے پاک کیا،

زورِ کلام نظامی سے پہلے شعراء کا کلام، صفائی، سادگی، شستگی تک محدود رہا تھا، اور انہی چیزوں کے کمال سے شاعری کے کمال کا اندازہ کیا جاتا تھا، نظامی پہلے شخص ہیں، جس نے ترکیبوں میں چُستی اور کلام میں زور، بلندی اور شان و شوکت پیدا کی، عُرفی اور ابو الفضل کی نظم و نثر کا زور مشہور ہے، مگر دونوں پر نظامی ہی کا اثر ہے، یہاں تک کہ طغرا نے کہہ دیا کہ ابو الفضل نے سکندر نامہ ہی کو لے کر نثر کر دیا ہے،

فردوسی کے زمانہ تک روزمرہ اور بول چال کی زبان خالص فارسی تھی، چنانچہ مثنویوں کی زبان وہی رہی، البتہ قصائد میں جس سے لفاظی اور علمی قابلیت کا اظہار بھی مقصود ہوتا تھا، عربی الفاظ اور ترکیبیں کثرت سے شامل ہو جاتی تھیں، یہاں تک کہ علومِ عربیت کے گھر گھر پھیل جانے سے روزمرہ کی زبان بھی وہی مخلوط العربیۃ فارسی ہو گئی، اب عربی الفاظ کا جُدا کرنا، فارسی زبان کا بدمزہ اور بے اثر کر دینا تھا، اِس لئے

نظامی نے اس باب میں فردوسی کی تقلید نہیں کی، بلکہ اسی زبان کو لیا جو ملک اور قوم کی عام زبان تھی، لیکن ان کی نکتہ سنجی یہ ہے کہ عربی اور فارسی کے جو لفظ ان کے ہاں آتے ہیں وہ ہوتے ہیں کہ اس کا ہم معنی کوئی لفظ اس انداز اور شان و شوکت کا تمام زبان میں نہیں مل سکتا، یہی بات ہے کہ ان کے کسی مضمون کو جب کوئی شاعر اپنے لفظوں میں ادا کرنا چاہتا ہے، تو وہ شان قائم نہیں رہتی، مثلاً اُن کا یہ شعر کمند کی تعریف میں ہے،

کمند اژدہا ہائے مسلسل شکنج　　دہن باز کردہ بہ تاراج گنج

سعدی اسی مضمون کو لے کر یوں تصرف کرتے ہیں،

بہ صید ہژبراں پُرخاش ساز　　کمند اژدہاے دہن کردہ باز

دونوں کے مضمون اور معنی میں جو فرق ہے، اس سے یہاں بحث نہیں، لیکن الفاظ کی ساخت اور ترکیب پر غور کرو، کس قدر فرق ہے، مسلسل شکنج، تاراج، گنج، یہ الفاظ، اور ان کی پُرزور ترکیب، سعدی کے ہاں کہاں ہے،

فردوسی، سعدی اور نظامی کے ہاں، جو مضامین مشترک ہیں، اُن کا باہم موازنہ کرو، بلاغت سے قطع نظر، الفاظ کی شکوہ و شان اور ترکیبوں کی چستی اور نظم و نسق میں نظامی کا کلام علانیہ ممتاز نظر آئیگا، نمونہ کے لئے ہم صرف دو ایک مثالیں درج کرتے ہیں،

فردوسی خدا کی ذات اور عالم غیر عنصری کے ادراک کی حد سے خارج ہونے کو اس طرح ادا کرتا ہے،

نیابد بدو نیز اندیشہ راہ　　کہ او برتر از نام و از جایگاہ
سخن ہرچہ زیں گوہراں بگذرد　　نیابد بدو راہ جان و خرد
ازیں پردہ برتر سخن گاہ نیست　　بہ ہستیش اندیشہ را راہ نیست

نظامی اسی مضمون کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں،

اساسے کہ در آسمان و زمی است　　باندازۂ فکرتِ آدمی است

شود فکرت اندازہ را رہنموں ... سر از حد اندازہ نارد بروں
بہر پایۂ دست چنداں رسد ... کہ آں پایہ را حد بہ پایاں رسد
چو پایاں پذیرد حد کائنات ... نماند در اندیشہ دیگر جہات
نیندیشد اندیشہ افزوں ازیں ... کہ ہستی نہ، بلکہ بیروں ازیں

اسی مضمون کے قریب قریب یہ اشعار ہیں،

چناں برکشیدی و بستی نگار ... کہ بہ زاں نیارد خرد در شمار
چناں بستی ایں طاق نیلوفری ... کہ اندیشہ رانیست زو برتری
چناں آفریدی زمین و زماں ... ہماں گردش انجم و آسماں
کہ چنداں کہ اندیشہ گردد بلند، ... سر خود بروں ناورد زیں کمند۔

شاید تم کو خیال ہو کہ فردوسی کے بہت سے الفاظ، اب نامانوس ہیں، نظامی ان کے بجائے متداول الفاظ لاتے ہیں، اس کے سوا نظامی کو یہ موقع حاصل ہے کہ جہاں فارسی الفاظ سے شان و شکوہ نہ پیدا ہو سکے، وہاں عربی الفاظ سے کام لیں، فردوسی اپنے التزام کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتا، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، نظامی جہاں خود فردوسی کی بولی بولتے ہیں، وہاں بھی یہ فرق قائم رہتا ہے، عناصر کی ابتدا اور ان کی ترکیب کو دونوں نے لکھا ہے اور خالص سادہ فارسی میں لکھا ہے، فردوسی

از آغاز باید کہ دانی درست ... سرمایۂ گوہراں از نخست
یکے آتشے برشدہ تابناک ... میاں باد و آب از بر تیرہ خاک
نخستیں کہ آتش ز جنبش دمید ... ز گرمیش پس خشکی آمد پدید
وزاں پس ز آرام سردی نمود ... ز سردی ہماں باز تری فزود
چو ایں چار گوہر بجاے آمدند ... ز بہر سپنجی سراے آمدند
گہر ہا یک اندر دگر ساختہ ... ز ہر گونہ گردن برافراختہ

یعنی عناصر (گوہر) کی ابتدا یوں ہوئی کہ پہلے آگ بلندی پر پیدا ہوئی، اس کے پیچھے ہوا، پھر پانی، پھر خاک، آگ حرکت سے پیدا ہوئی، اس کی حرارت کی وجہ سے یبوست پیدا ہوئی، پھر سکون کی وجہ سے برودت کا وجود ہوا، برودت نے رطوبت پیدا کی، یہ عناصر باہم ترکیب پا کر عالم بنا، نظامی

زگشت سپہر آتش آمد پدید | کہ آتش بہ نیروی گرمش دمید
زنیروی آتش ہوائے کشاد | کہ مانند او گرم دارد نہاد
بہ بادی گرایندہ شد گوہرش | کہ گروندگی دور بود از برش
چکید از ہوا ترّئے در مغاک | پدید آمد آبے چناں نغز و پاک
چو ہر چار گوہر بہ امر خدائے | گرفتند بر مرکز خویش جائے
مزاج ہمہ در ہم آمیختند | وزور رشتہا بر انگیختند

ان اشعار میں امر، مرکز مزاج کے سوا باقی تمام الفاظ فارسی ہیں، لیکن فردوسی کے الفاظ اور ترکیب الفاظ میں وہ بلندی اور شان نہیں جو نظامی کے ہاں ہے، گشت سپہر، نیرو، نہاد، گرایندہ، گروندگی، مغاک، نغز، ان الفاظ اور ان کی حسن ترکیب نے جو بات پیدا کی مذاق صحیح اس کا اندازہ کر سکتا ہے،

اسی مضمون کو ایک اور جگہ لکھا ہے،

نخستیں طلسمے کہ پرداختند | زمیں بود و ترکیب از و ساختند
چو نیروی جنبش در و کرد کار | با فسردگی زود آمد بخار
از و ہر چہ رخشندہ و پاک بود | سزاوار اجرام افلاک بود
دگر بخشہا کاں بلندی نداشت | بہر مرکزے مایۂ می گذاشت
یکے بخش از و آتش روشن است | کہ بالاترین طاق ایں گلشن است
دگر بخش از و باد جنبندہ خواست | کہ تا او نہ جنبد نداند کو است

سوم نجش از و آب راوق پذیر — کہ ہستش ز راوق گری ناگزیر

ان اشعار میں اکثر فلسفیانہ اصطلاحات کو عربی کے بجائے فارسی میں ادا کیا ہے، مثلاً

عربی	فارسی	عربی	فارسی
قوتِ حرکت	نیروی جنبش	قسر	افسردگی
نوع	نجش	مادہ	مایہ
متحرک بالطبع	جنبندہ خو	سیال	راوق پذیر

نظامی کے اشعار کا سعدی سے مقابلہ کرو، تو یہ فرق اور واضح ہو جاتا ہے، مثلاً نظامی انقلاباتِ زمانہ اور واقعاتِ عالم کی عبرت انگیزی کو اس طرح ادا کرتے ہیں،

فلک بر بلندی، زمیں بر مغاک — یکے طشت خوں شد، یکے طشت خاک

نوشتہ بریں ہر دو آلودہ طشت — ز خونِ سیاوش بسے سر نوشت

سعدی اسی مضمون کو اس طرح بیان کرتے ہیں،

زدم تیشہ یک روز بر تلِ خاک — بگوش آمدم نالۂ دردناک،

کہ زنہار اگر مردی آہستہ تر — کہ چشم و بناگوش و روی است و سر

جوانی شُد و زندگانی نماند — جہاں گو مماں چوں جوانی نماند

عہدِ شباب کی حسرت کو دونوں نے لکھا ہے، نظامی کہتے ہیں،

چو بادِ خزانی در اُفتد بہ باغ — زمانہ دہد جائے بُلبل بہ زاغ

بود برگ ریزاں چو شاخِ بلند — دلِ باغباں زاں شود دردمند

بنال اے کہن بُلبلِ سال خورد — کہ رُخسارۂ سُرخ گل گشت زرد

دوتا شد سہی سروِ آراستہ — کدیور شد از باغ برخاستہ

فروماند وستم زمے خواستن — گراں گشت پایم ز برخاستن

تنم گوشۂ لاجوردی گرفت — گلم سُرخی انداخت زردی گرفت

ہیون رونده زره مانند باز　　ببالیں گہ آمد سرم رانیاز

سعدی لکھتے ہیں،

چو باد صبا بر گلستان وزد　　چمیدن درخت جواں راسزد

نزیبد مرا با جواناں چمید،　　کہ برعارضم صبح پیری دمید

شمارست نوبت بریں خواں نشست　　کہ ما از تنعم بشستیم دست

گل سرخ رویم، نگر زر ناب　　فرو رفت چوں زرد شد آفتاب

گلستان مارا طراوت گذشت　　کہ گلدستہ بندو چو پژمردہ گشت

قوت تخیل | شاعری کے تمام نازک اور مشکل مقامات میں ان کی جدت اور اختراع کی عجیب وغریب صناعیاں نظر آتی ہیں، قصہ کے خاکے کھینچنے میں، ترتیب واقعات میں، تمہید میں، واقعہ نگاری میں، بندش مضامین میں، تشبیہات میں، استعارات میں، مبالغوں میں ہر جگہ نیا انداز نظر آتا ہے، اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُن کی قوت تخیل (امیجنیشن) کس قدر قوی اور زبردست ہے،

بادشاہ کی مدح لکھتے ہیں، اور یہ تمہید اُٹھاتے ہیں،

علم برکش اے آفتاب بلند　　خراماں شو، اے ابر مشکیں پرند

بنال اے دل رعد چوں کوس شاہ　　بخند اے لب برق چوں صبحگاہ

ببار اے ہوا، قطرۂ ناب را　　بگیر اے صدف در کن آں آب را

برآ اے گہر از قعر دریائے خویش　　بہ تاج سر شاہ کن جائے خویش

قدیم خیال یہ تھا کہ آفتاب کی گرمی سے بخارات پیدا ہوتے ہیں، اس سے بادل پیدا ہوتے ہیں، بادل برستا ہے، تو سیپ کے مُنہ میں جو قطرے پڑتے ہیں، موتی بن جاتے ہیں، ان خیالات کی بنا پر نظامی کہتے ہیں،

او آفتاب، علم اُٹھا، او سیہ پوش بادل، آہستہ آہستہ چل،

اور عد! نقارۂ شاہی کی طرح کڑک، او بجلی صبح کی طرح ہنس، او ہوا قطرے برسا، او سیپ قطرہ کو لے کر موتی بنا، او موتی دریا کی تہ سے نکل، اور نکل کر بادشاہ کے تاج پر جگہ لے،

بات اتنی تھی کہ بادشاہ کا تاج جواہر نگار ہے، لیکن شاعر کو قوتِ تخیئل کے ذریعہ سے یہی بات اس صورت میں نظر آتی ہے کہ عالم کا تمام کاروبار صرف بادشاہ کی اوج شان بڑھانے کے لئے ہے، اس کی قوتِ خیالیہ اس سے بھی آگے بڑھتی ہے، ممدوح کے بل پر اس کو تمام عالم اپنا محکوم نظر آتا ہے، اور وہ تحکمانہ انداز سے آفتاب، بادل، رعد، برق اور ہوا کو حکم دیتا ہے کہ اپنے اپنے کام انجام دے کر موتی تیار کرو، تاکہ بادشاہ کے تاج پر ٹانکے جائیں، اس کے ساتھ انداز بیان کے زور الفاظ کی شوکت، بندش کی درستی کو دیکھو کہ طلسم کا عالم نظر آتا ہے، پھر خیال کرو کہ ایک ایک مختلف حالت کو کس طرح صرف ایک ایک مصرع میں کھپا دیا ہے،

مثال ۲۔ سکندر نامہ میں متعدد جگہ آفتاب کے غروب اور طلوع کو بیان واقعہ کی حیثیت سے لکھا ہے، لیکن ہر جگہ ایک نیا پیرایہ قائم کیا ہے، مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں،

چو یاقوت خورشید را دزد برد — بیاقوت جستن جہاں پے فشرد
بدزدی گرفتند مہتاب را — کہ ایں برد آں گوہر ناب را

یعنی جب آفتاب کا یاقوت چوری گیا تو زمانہ نے یاقوت کے ڈھونڈھنے کے لئے دوڑ دھوپ شروع کی، آخر چاند کو جا کر پکڑا کہ اس نے یہ جوہر چرایا ہے، چونکہ آفتاب کے غروب کے بعد چاند نکلتا ہے، اس لئے اس کو چور قرار دیا،

کہ چوں آتش روز روشن گذشت — پر از دود شد گنبد تیز گشت
شب از ماہ بربست پیرایۂ — شگفتے بود نور در سایۂ

یعنی جب دن کی آگ بجھ گئی تو دھواں اٹھا (یعنی رات) اور گنبد (آسماں) میں

بھر گیا، رات نے چاند کا زیور پہنا، لوگوں کو اس پر حیرت ہوئی کہ سایہ میں نُور نظر آتا ہے،

دگر روز کیں ساقیٔ صبح خیز — زمی کرد بر خاک، یاقوت ریز

چو خورشید برزد سر از گنج نیل — فرو شست (یعنی دھوپ) گردوں قبارا ز نیل

چو در برقع کوہ رفت آفتاب — سر روز روشن، فرو شد بخواب

شب تیرہ چوں اژدہائے سیاہ — ز ماہی برآورد سر سوے ماہ

سیہ کرد بر شبروان راہ را — فرو برد چوں اژدہا ماہ را

سپاہِ سحر چوں علم برکشید — جہاں، حرف شب را قلم درکشید

چو سلطانِ شب، چتر بر سر گرفت — سواد جہاں راہ عنبر گرفت

ستارہ چناں گنجے از زر فشاند — کہ مہد زمیں گاؤ بر گنج راند

کہ چوں شاہ چین صبح را بار داد — عروس عدن دُر بہ دینار داد

چو شب در سر آورد کحلے پرند — سر مہ در آمد بہ مشکیں کمند (رات، ستارہ، آفتاب)

استعارات اور تشبیہات | نظامی کی خصوصیات شاعری میں نہایت نمایاں خصوصیت استعارات اور تشبیہات کی جدت ہے، استعارہ اور تشبیہ اگر صرف حسنِ کلام اور تفنن طبع کے کام آئے تو وہ کوئی بڑی چیز نہیں، لیکن بعض استعارے یا تشبیہات ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر اصل مضمون پر پڑتا ہے، یعنی مضمون کا زور بڑھ جاتا ہے، جو بات صفحوں میں ادا ہو سکتی ہے، ایک لفظ سے ادا ہو جاتی ہے، صُورتِ واقعہ کی تصویر اس طرح سامنے آجاتی ہے، کہ کسی اور طرح سے نہیں آسکتی تھی، اس قسم کے استعارات اور تشبیہیں اور شعرا کے ہاں بہت کم پائی جاتی ہیں، لیکن نظامی کا کلام ان سے بھرا پڑا ہے، مثلاً دارا جب زخم کھا کر گرا ہے، اس موقع پر اس واقعہ کو یُوں ادا کرتے ہیں،

نسب نامۂ دولتِ کیقباد — ورق بر ورق ہر سوئے بُرد باد

دارا سلسلۂ کیانی کا اخیر فرماں روا تھا، اور اس کے مرنے سے گویا، اس عظیم الشان

خاندان کی تاریخ مٹ گئی، اس مضمون کو تشبیہ نے کس قدر موثر اور بلند کر دیا، دارا کو خاندان کیاں کا نسب نامہ کہا، یعنی جس طرح نسب نامہ میں تمام خاندان کے نام درج ہوتے ہیں دارا کا وجود گویا تمام خاندان کا وجود ہے، اور اس کے دیکھنے سے کیقباد، کیخسرو، کیکاؤس سب کی مجموعی عظمت و شوکت آنکھوں میں پھر جاتی ہے، پھر اس کے مرنے کو یوں بیان کیا کہ نسب نامۂ کیانی کا ایک ایک ورق اڑ گیا، اسی مضمون کو ایک اور تشبیہ کے ذریعہ سے ادا کیا ہے،

بہار فریدوں و گلزار جسم ... زباد خزاں گشت تاراج غم

سکندر نے جب دارا کی سسکتی لاش کو اپنے زانو پر رکھ لیا ہے، اس موقع پر کہتے ہیں،

سر خستہ را بر سر راں نہاد ... شب تیرہ بر روز رخشاں نہاد

سکندر نے جب دارا کو گستاخانہ جواب لکھا ہے تو دارا کہتا ہے

ازاں ابر عاصی چناں ریزم آب ... کہ نارد دگر دست بر آفتاب

اس سرکش بادل کو اس طرح نچوڑ دونگا ... کہ پھر آفتاب پر ہاتھ نہ بڑھا سکے

سکندر نے جب ایک حبشی سردار پر حملہ کیا ہے تو حملہ کی تیزی اور زور کو اس طرح ادا کرتے ہیں،

بہ کبک دری چوں؟ درآید عقاب ... چگونہ؟ جہد بر زمیں آفتاب

ازاں تیز تر خسرو پیلتن ... بہ تندی درآمد بہ آں اہرمن

آفتاب سورج کو بھی کہتے ہیں، اور دھوپ کو بھی، اس موقع پر بلاغت کے انداز کو دیکھو تشبیہ سے ابتدا نہیں کی، بلکہ مخاطب سے کہتے ہیں؟ کہ تم کو خیال ہے کہ عقاب چکور پر کیونکر گرتا ہے، دھوپ کس طرح زمین پر دفعتہً چھا جاتی ہے؟ اس سے مقصد یہ ہے کہ پہلے مخاطب کے ذہن میں اچھی طرح یہ سماں قائم ہو جائے، پھر کہتے ہیں" اس سے بھی زیادہ تیزی اور زور کے ساتھ سکندر نے اس دیو پر حملہ کیا" حملہ کی خاص حالت سے قطع نظر کر کے

سکندر کو آفتاب اور حریف کو زمین سے تشبیہ دینا، یُوں بھی موزوں تھا، تشبیہ مرکب نے اس لُطف کو اور دوبالا کر دیا،

سکندر نے جب ایک روسی پہلوان پر کمند پھینکی ہے، اس موقع پر کہتے ہیں،

بینداخت چوں چنبر روزگار   کمند عدو بند را شہریار

کہنا یہ تھا کہ سکندر نے اس طرح کمند پھینکی کہ حریف کسی طرح اس سے بچ نہیں سکتا تھا، اس مضمون کو چنبر روزگار کی تشبیہ نے کس قدر پر زور کر دیا،

رسول اللہ صلعم نے جب خسرو پرویز کو خط لکھا ہے تو خط میں عرب کی رسم کے مطابق اپنا نام خسرو کے نام سے پہلے لکھا تھا، خسرو نے خط کھولا تو چونکہ ایران میں بادشاہ کا نام عموماً تمام تحریروں میں پیشانی پر لکھا جاتا تھا، رسول اللہ صلعم کا نام سرنامہ پر دیکھ کر خسرو سخت جھلّا اُٹھا، اور خط کو پُرزے پُرزے کر کے پھینک دیا، اس موقع کو نظامی نے شیریں خسرو میں جہاں لکھا ہے، خسرو کی جھلّاہٹ اور برہمی کو اس طرح تشبیہ کے ذریعہ سے ادا کرتے ہیں،

چوں عنواں گاہِ عالم تاب را دید   تو گفتی سگ گزیدہ آب را دید

دیوانہ کُتّا جب کسی کو کاٹ کھاتا ہے، تو سگ گزیدہ پانی کو دیکھ کر بڑے زور سے جھجھکتا ہے،

اب تشبیہ کے تمام اجزا پر خیال کرو، رسول اللہ صلعم کا خط آبِ شیریں ہے، خسرو نے چونکہ رسول اللہ صلعم کے خط سے بے ادبی کی ہے، اس لئے شاعر اس کو سگِ نجس سمجھتا ہے، فوری اور شدت کی جھلّاہٹ، سگ گزیدہ کی اس مخصوص حالت سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی، ان سب باتوں کو پیشِ نظر رکھو، تو نظر آئیگا، کہ یہ مضمون جس طرح اس تشبیہ سے ادا ہو سکتا تھا اور کسی طرح ادا نہیں ہو سکتا تھا،

قدماء اور متاخرین کی خصوصیات جُدا جُدا ہیں اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ گو قدماء کی

متانت، پختگی، جزالت کے مقابلہ میں متاخرین کا کلام سبک معلوم ہوتا ہے، تاہم متاخرین کی بعض بعض خصوصیتیں اس قابل ہیں کہ اُن پر رشک کیا جائے، ان میں ایک تشبیہات کی لطافت اور استعارات کی نزاکت ہے، قدماء آس پاس کی چیزوں سے سادہ سادہ تشبیہیں پیدا کرتے تھے، استعارے بھی سادے اور سہل الماخذ ہوتے تھے، لیکن متاخرین کے زمانہ میں تمدن بہت ترقی کر گیا تھا، اِس لئے انسانی احساسات نازک اور لطیف ہو گئے تھے، اس بناء پر اب قدماء کی تشبیہیں بے مزہ ہو گئی تھیں، اس کو مادیات کے ذریعہ سے یُوں سمجھو کہ جب کسی قوم کا تمدن، ابتدائی حالت میں ہوتا ہے تو وہ نہایت تیز اور کرخت خوشبو کو پسند کرتی ہے، اور کم درجہ کی خوشبو کو اس کا دماغ اچھی طرح محسوس نہیں کر سکتا، یہی سبب ہے کہ عرب مشک اور عنبر، اور ہندو تُلسی اور ناز بو کی خوشبو پسند کرتے تھے، لیکن آج چونکہ ہر چیز میں لطافت پیدا ہو گئی ہے، مشک اور تلسی کی خوشبو سے بعض وقت دماغ پراگندہ ہو جاتا ہے، اب گلاب اور کیوڑہ کا عطر درکار ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر انگریزی عطر محبوب ہے، جو اس قدر لطیف ہوتا ہے، کہ عام آدمیوں کو اس کی خوشبو محسوس بھی نہیں ہوتی، استعارہ اور تشبیہ کا بھی یہی حال ہے، استعارہ اور تشبیہ کی یہ لطافت، متاخرین کا خاصہ ہے، مثلاً قدماء معشوق کے چہرہ کو آفتاب سے اور اس کی ہنسی کو خندۂ صُبح سے تشبیہ دیتے تھے، لیکن متاخرین کے مذاق میں ایک شاعر کہتا ہے، ع

صبح ز خورشید رخت خندۂ

یعنی معشوق کا چہرہ ہنسا تو صبح پیدا ہو گئی، یعنی صبح خود معشوق کی ہنسی کا نام ہے،

استعارہ اور تشبیہ کی اس لطافت اور نزاکت کے موجد نظامی ہیں، انہوں نے اس کثرت سے نازک اور لطیف استعارے اور تشبیہیں پیدا کیں، کہ متاخرین میں سے بھی کسی ایک شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

بر باغ شعلہ ور دہقان انگشت　　　بنفشہ می درود و لالہ می کشت

کہنا یہ تھا کہ انگیٹھی میں آگ جلائی تو دھواں کم ہو جاتا تھا اور آگ بھڑکتی جاتی تھی، اس کو اِس طرح ادا کیا کہ انگیٹھی کا دہقاں، شعلوں کے باغ میں بنفشہ کاٹتا جاتا تھا، اور لالہ بوتا جاتا تھا

درآمد نقشبند مانوی دست		زمیں را نقشہا بوسہ می بست

کہنا یہ تھا کہ مصوّر جب دربار میں آیا، تو آداب دربار کے موافق زمین بوس کرتا آتا تھا، اس کو اِس طرح پر ادا کیا کہ مصوّر بوسوں سے نقش و نگار کرتا آتا تھا،

بہ نوشیں لب آں جام را نوش کرد		زلب جام را حلقہ درگوش کرد

پیالہ پینے کے وقت لب کی جو ہیئت پیدا ہوتی ہے اس کو حلقہ سے تشبیہ دی ہے، اور اس بنا پر پیالہ کو لب کا حلقہ بگوش قرار دیا ہے،

ہوا بر سبزہ ہا گوہر گسستہ		زمرد را بہ مروارید بستہ

شبنم کو موتی سے، اور سبزہ کو زمرد سے تشبیہ دی ہے، اس بناء پر کہتا ہے کہ ہوا نے سبزہ پر جو موتی بکھیر دیئے تھے، تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ زمرد میں موتی ٹانک دیئے ہیں،

زگیسو گہ کمرمے کرد و گہ تاج		بداں تاج و کمر شہ گشتہ محتاج

معشوقہ جو زلفوں کا کبھی جوڑا باندھتی تھی اور کبھی کمر پر چھوڑ دیتی تھی، اس کو تاج و کمر سے تشبیہ دی ہے،

قلم کی تعریف، ع		مشک در جیب لعل در داماں،

عاشق و معشوق کا ہمکنار ہونا،

شبا روزے دگر خفتند مدہوش		بنفشہ در سر و نسریں در آغوش

نوشابہ کا جواب دینا،

بہ پاسخ نمودن زنِ ہوشمند		ز یاقوت سربستہ بکشاد بند

انہاں سیمگوں سکۂ نو بہار		درم ریز کن بر لب جوئبار

آغازِ بہار میں جو شگوفے کھلتے ہیں، ان کو بہار کا سکہ قرار دیا ہے،

زباریدن ابر کافور بار　　　سمن رستہ از دستہاے چنار

یعنی چنار کے پتوں پر جو برف گرتی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ چنار کے ہاتھوں پر چنبیلی کے پھول کھلے ہیں،

سمنبر غافل از نظارۂ شاہ　　　کہ سنبل بستہ بُد بر نرگسش راہ

یہ اُس وقت کا بیان ہے کہ شیریں نہا رہی تھی، اور زُلفوں کو چہرہ پر چھوڑ دیا تھا، شعر کا مطلب یہ ہے کہ شیریں کو خسرو کے نظارہ کی خبر نہ تھی، کیونکہ سنبل نے نرگس کا راستہ روک رکھا تھا،

گشادہ طاقِ ابرو تا سر دوش　　　کشیدہ طوقِ غبغب تا بنا گوش

خواب نرگس، خمار دیدۂ او　　　ناز نسریں، درم خریدۂ او،

چو بر فرق آبے انداخت از دست　　　فلک بر ماہ مروارید می بست

سمن ساقی و نرگس جام بر دست　　　بنفشہ در خمار و سُرخ گل مست

بنفشہ تابِ زلف افگندہ بر دوش　　　گشادہ باد نسریں را بناگوش

گونہ گونہ گلے شگفتہ در و　　　سبزہ بیدار آب خفتہ در و

بعض اوقات تشبیہ سے ہیبت اور عظمت مقصود ہوتی ہے، اس قسم کی تشبیہات آج تک کسی نے نظامی سے بڑھ کر بلکہ ان کے برابر بھی نہیں پیدا کیں، مثلاً

کمند اژدہاے مسلسل شکنج　　　دہن باز کردہ بہ تاراج گنج

زمین کو بساطے بد آراستہ　　　غبارے شد، از جائے برخاستہ

دراں دجلۂ خوں بلند آفتاب　　　چو نیلوفر، افگندہ زورق در آب

ز شمشیر برگشتہ جاے نبود　　　کہ در غار وے اژدہاے نبود

زخم کو غار اور تلوار کو اژدہا سے تشبیہ دی ہے،

لے مدنی برقع و مکی نقاب　　　سایہ نشیں چند بود آفتاب

تاج تو و تخت تو دارد جہاں — تخت زمیں آمد و تاج آسماں
زبس خوں کہ گرد آمد اندر مغاک — چو گوگرد شد سرخ آتشیں گشت خاک
نہنگ خدنگ، از کمین کماں — نیاسود بر یک زمیں یک زماں

شاعری کی لطافت اور رنگینی کا ایک بڑا راز یہ ہے کہ بے جان چیزوں کو صاحبِ ادراک قرار دے کر اُن کی نسبت ارادی کام منسوب کئے جائیں، مثلاً عُرفی کہتا ہے،

نگفت و من بشنودم، ہر آنچہ گفتن داشت — کہ در بیان نگہش کرد بر زباں تقدیم
لبش چو نوبت خویش از نگاہ باز گرفت — فتاد سامعہ در موجِ کوثر و تسنیم

یعنی اس نے کچھ نہیں کہا، لیکن میں نے سن لیا، کیونکہ تقریر کرنے میں، اس کی نگاہوں نے زبان سے پیشدستی کی، جب ہونٹوں نے نگاہ سے اپنی باری مانگی تو سامعہ کوثر کی موجوں میں ڈوب گیا، یا مثلاً

راضیم از نگہ شوق کہ گوید ہمہ باز — از زباں آنچہ دم عرض تمنا ماند

متاخرین نے اِس طرز کو نہایت وسعت دی، اور اس سے نہایت لطیف اور رنگین نئے نئے اسلوب پیدا کئے، لیکن اس طرز کے موجد نظامی ہیں، شیریں خسرو میں لکھتے ہیں،

نہاں! شاہ می گفت آں بناگوش — کہ مولائے توام، ہا، حلقہ در گوش
چو سر پیچید گیسو مجلس آراست — چو رُخ گردید گردن عُذرہا خواست
بگویم غمزہ را تا وقت شبگیر — سمندش را برقص آرد بیک تیر
بگویم زُلف را تا یک فن آرد — شکیبش را رسن در گردن آرد

نظامی کے یہ مضامین، متاخرین کے شمعِ راہ بنے، جس کی روشنی میں ان کو گوناگوں اسالیب کا سلسلہ ہات آگیا، نظامی نے جب (پہلے شعر میں) بناگوش کی نسبت یہ باندھا، کہ اسی نے چپکے سے بادشاہ سے کہا، تو بے تکلف ایک شاعر اس کو یُوں بدل کر

کہہ سکتا ہے،

ع زُلف او خم شدہ در گوش سخن می گوید

شعر کے سینکڑوں انواع ہیں، لیکن بڑی قسمیں یہ ہیں، رزمیہ، عشقیہ، فلسفیانہ، اخلاقی، جذباتِ انسانی کا اظہار اور مناظر کی تصویر، ان میں سے ہر نوع کو نظامی نے لیا ہے اور معراجِ ترقی تک پہنچا دیا ہے،

سکندر نامہ میں انہوں نے لکھا ہے کہ سکندر کے حالات تین حیثیتیں رکھتے ہیں، سلطنت، نبوت، فلسفہ و حکمت، میں تینوں قسم کے حالات لکھوں گا، اور تفصیل سے لکھوں گا،

گروہیش خوانند صاحب سریر	ولایت ستاں بلکہ آفاق گیر
گروہے ز دیوان دستورِ او	بہ حکمت نوشتند منشورِ او
گروہے ز پاکی و دیں پروری	پذیرا شدندش بہ پیغمبری
من از ہر سہ دانہ کہ دانا فشاند	درختے برومند خواہم نشاند

چنانچہ سکندر نامہ برّی میں کشورستانی اور سکندر نامہ بحری میں پیغمبری کے واقعات اور فلسفیانہ بحثیں ہیں،

فارسی میں فلسفیانہ مسائل ناصر خسرو کے سوا، کسی نے ادا نہیں کئے، لیکن ناصر خسرو نے تمام اصطلاحیں وہی عربی کی قائم رکھی ہیں، اس بنا پر عام خیال یہ ہے کہ فارسی میں فلسفیانہ خیالات ادا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے، بوعلی سینا کی کتاب حکمت علائیہ سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے، لیکن انصاف یہ ہے کہ نظامی نے فلسفیانہ مسائل اس حد تک لکھ دیئے ہیں کہ زبان کی کم مایگی کی شکایت نہیں ہو سکتی، اور اگر متاخرین بھی اس کے نقشِ قدم پر چلتے تو فارسی زبان ایک فلسفیانہ زبان بن گئی ہوتی،

سکندر نامۂ بحری میں انہوں نے ایک خاص داستان سکندر اور حکمائے یونان کی فلسفیانہ بحثوں کے متعلق لکھی ہے، اس میں ارسطو، فلاطون، والیس، بلیناس، سقراط

فرفوریوس (یا رفیریس)، ہرمس کے اقوال اور رائیں لکھی ہیں، ہندوستان کے ایک حکیم نے سکندر سے سوالات کئے تھے، سکندر کی زبان سے اُن کے جوابات لکھے ہیں، ان تمام بحثوں میں فلسفہ کی اصطلاحیں فارسی میں ادا کی ہیں، عربی الفاظ جا بجا آتے ہیں، لیکن اس حد تک کہ زبان نامانوس اور دساتیر وژند نہ بن جائے،

ایک ہندو حکیم نے سکندر سے سوال کیا تھا کہ نظر بد کیا چیز ہے؛ اس میں کہاں سے تاثیر پیدا ہوتی ہے؛ عام قاعدہ یہ ہے کہ کسی چیز کو پسند کیا جائے تو اس کی ترقی کا سبب ہوتا ہے، بخلاف اس کے بد نظر جس چیز کو پسند کرتا ہے، اسی کو نظر لگتی ہے، سکندر نے جواب دیا کہ انسان جب کسی چیز کو دیکھتا ہے تو آنکھ سے شعاعیں نکل کر اس چیز پر پڑتی ہیں، شعاع ہوا سے گزر کر اس چیز تک پہنچتی ہے، اب ہوا میں اگر سمیت ہے تو یہ شعاعیں بھی اس سے آلودہ ہو کر زہریلی ہو جاتی ہیں اور اس چیز کو جا کر نقصان پہنچاتی ہیں ———

اِس سے قطع نظر کرکے کہ سوال و جواب دونوں طفلانہ ہیں، یہ دیکھو کہ نظامی ان باتوں کو کن الفاظ میں ادا کرتے ہیں،

دگر بار ہندو درآمد بہ گفت   گہر کرد بانوک الماس جفت

کہ بر چشم بد شاہئے دہ مرا   ز چشم بد آگاہئے دہ مرا

چہ نیروست، در جنبش چشم بد   کہ نیکوی خود را کند چشم زد

ہمہ چیز را کاز مالش رسید   چو دیدہ پسندد فزایش رسید

جز اُو را کہ ہرچہ پسند آورد   سر و گردنش زیر بند آورد

بہر حرفتے چونکہ دیدیم ژرف   درستی ندیدیم در ہیچ حرف

ہمیں یک کماندار شد از نخست   بر آماج گہ تیر او شد درست

ع بگو تا چہ نیروست نیروے او

جهاندار گفتا کہ طالع شناس چنیں آرد از روی معنی قیاس

کہ بر ہرچہ گردد نظر جائگیر گزر بر ہوائے کند ناگزیر

بر آں چیز کارد نظر تاختن کند با ہوا رای دم ساختن

بنہ چوں درآرد بہ آں رخت گاہ ہوا نیز یابد برآں رخنہ راہ

ہوا گر ہواے بود سودمند در ارکان آں چیز ناید گزند

مزاج ہوا گر بود زہرناک بیندازد آں چیز را در مغاک

ہواے بدست آں کہ در چشم زد بدارد بہ ہمراہیِ چشم بد

موجودات کی ابتدا، اوران کی ترتیب، افلاک، عناصر، سلسلۂ علل، ان تمام بحثوں کے متعلق، یونانی حکماء کی رائیں نقل کی ہیں، اوران تمام مباحث میں بہت کم عربی کے الفاظ کو دخل دیا ہے،

اخلاقی شاعری نظامی کی شاعری کا بڑا حصّہ اخلاق کے متعلق ہے، مخزن اسرار کے سوا جو خاص اسی مضمون پر لکھی ہے، اور مثنویوں میں بھی جابجا اخلاقی ہدایتیں موقع بموقع لکھی ہیں، چنانچہ کسی صاحبِ ذوق نے خاص اس قسم کے اشعار کو اُن کے پنج گنج سے چُن کر یکجا جمع کر دیا ہے اور اخلاق کے ۳۵ عنوان قرار دے کر ایک ایک عنوان کے نیچے تمام مثنویوں کے وہ اشعار نقل کر دیئے ہیں، جو اس عنوان سے تعلق رکھتے تھے، میں نے اس مجموعہ کا ایک نہایت خوشخط نسخہ، عالمگیری کتب خانے کا حیدرآباد میں دیکھا تھا،

جذباتِ انسانی شاعری کی اس اہم اور لطیف نوع کو نظامی نے جس رتبہ پر پہنچایا، قدماء میں فردوسی کے سوا اس کی نظیر نہیں مل سکتی، اورانصاف یہ ہے کہ فردوسی بھی اس خصوصیّت میں اُن کی ہمسری نہیں کرسکتا، فردوسی نے جہاں جذبات کا اظہار کیا ہے معمولی اور سادہ حالت کو ادا کیا ہے، بخلاف اس کے نظامی نہایت نازک، لطیف اور دقیق پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، مثلاً دارا جب زخمی ہو کر گرا ہے تو سکندر اس کے پاس گیا ہے،

اور دارا نے اس سے حسرت ناک باتیں کی ہیں، فردوسی نے اس موقع پر وہی معمولی افسوس اور عبرت کے کلمات ادا کر دیئے ہیں، جو ہر شخص کے خیال میں آسکتے ہیں، لیکن نظامی کی نظر ان نازک اور دقیق نکتوں تک پہنچی ہے، جہاں ہر شخص کا وہم رسائی نہیں پا سکتا، دارا کوئی معمولی آدمی نہ تھا، بلکہ دُنیا کے وسیع خطّہ کا شاہ اور شاہنشاہ تھا، شکست کھانے اور خود اپنے نوکروں کے ہات سے زخمی ہو کر مرنے کا اس کو صدمہ ہے، اور اس وجہ سے افسوس، حسرت اور بیکسی کے خیالات اس کے دل میں ہجوم کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی شاہنشانہ ادعا، غُرور اور تمکنت کا نشہ بھی سر میں ہے، اِس لئے اس کے غمزدہ اور عاجزانہ الفاظ بھی صولت اور رُعب کے لہجہ میں ادا ہوتے ہیں، اس کی آہیں بھی نعرۂ جنگ ہیں، اس کی پُرحسرت نگاہیں بھی برق غضب ہیں، نظامی ان تمام خصوصیات کو دکھاتے ہیں،

چو در موکبِ قلبِ دارا رسید — زموکب‌وراں ہیچ کس را ندید
تنِ مرزباں دید در خاک و خُوں — کلاہِ کیانی شدہ سرنگوں
بہ بازوئے بہمن بر آسودہ مار — زروئیں دژ افتادہ اسفندیار
بہارِ فریدوں و گلزارِ جم — ز بادِ خزاں گشتہ تاراجِ غم
نسب نامۂ دولتِ کیقباد — ورق بر ورق ہر سوئے بُردہ باد
سکندر فرود آمد از پُشتِ بور — در آمد بہ بالینِ آں پیلِ زور
بہ بالینِ گہ خستہ آمد فراز — زدرعِ کیانی گرہ کرد باز
سرِ خستہ را بر سرِ راں نہاد — شبِ تیرہ بر روزِ رخشاں نہاد
چو دارا بروئش نگہ کرد و دید — بہ سوزِ جگر آہ از دل کشید
چنیں داد دارا بہ خسرو جواب — کہ بگذار تا سر نہم من بہ خواب
رہا کُن کہ در من رہائی نماند — چراغِ مرا روشنائی نماند
سپہرم بداں گونہ پہلو درید — کہ شُد در جگر پہلوم ناپدید

رہا کُن کہ خواب خوشم مے برد　　زمیں آب چرخ آتشم مے برد

سر سروراں را رہا کُن ز دست　　تو مشکن کہ ما را جہاں خود شکست

چو من زمیں ولایت کُشادم کمر　　تو خواہ افسر از من ستاں خواہ سر

اگر تاج خواہی ربود از سرم　　یکے لحظہ بگزار تا بگذرم

مبیں سرورا در سر افگندگی　　چناں شاہ را در چنیں بندگی

دریں بندم از زحمت آزاد کُن　　بہ آمرزش ایزدی یاد کُن

چو گشت آفتاب مرا روی زرد　　نقابے بمن در کش از لاجورد

مگرداں سر خُفتہ را از سریر　　کہ گردون گرداں بر آرد نفیر

تو اے پہلوان کامدی سوے من　　نگہدار پہلو ز پہلوے من

کہ با آں کہ پہلو دریدم چو میغ　　ہمے آید از پہلوم بوے تیغ

چہ دستے کہ با مادر ازی کنی　　بہ تاج کیاں دست بازی کنی

نگہدار سنت کہ دارا ست ایں　　نہ پنہاں چو روز آشکار است ایں

زمیں را منم تاج تارک نشیں　　مجنباں مرا تا نہ جنبد زمیں

اِس واقعہ کو فردوسی نے بھی لکھا ہے، لیکن زور اور اثر نہیں، چنانچہ اس موقع کے اشعار ہم درج کرتے ہیں،

بر آنم کہ از پاک دادار خویش　　بیابی تو پاداشِ گفتارِ خویش

یکے آنکہ گفتی کہ ایراں تراست　　سر تاج و تختِ دلیراں تراست

بمن مرگ نزدیک تر زانکہ تخت　　بپرداخت تخت از نگوں گشتہ بخت

بریں است فرجام چرخِ بلند　　خرامش ہمہ رنج و سرش گزند

بمردی نگر تا نگوئی کہ من،　　فزونم ازیں نامدار انجمن

بد و نیک، ہر دو زیزداں شناس　　وزو دار تا زندہ باشی سپاس

نمودارِ گفتار من، من بسم — بریں داستان عبرتِ ہر کسم

کہ چنداں بزرگی و شاہی و گنج — مرا بود و از من بہند کس برنج

ہماں تیر چنداں سلیح و سپاہ — گراں مایہ اسپان و تخت و کلاہ

ہماں تیر فرزند و پیوستگاں — چہ پیوستگاں داغِ دلخستگاں

زمین و زماں بندہ بد پیشِ من — چنیں بود تا تخت بد خویشِ من

چو از من ہماں بخت بیگانہ شد — ہمہ کاخ وایواں چو ویرانہ شد

زنیکی جدا ماندہ ام زیں نشان — گرفتار و در دستِ مردم کشاں

ز فرزند و خویشاں شدہ نا اُمید — سیہ شُد جہاں، دیدگانم سفید

ز خویشاں کسے نیست فریاد رس — امیدم بپروردگار ست و بس

بدیں گونہ خستہ بخاک اندرم — ز گیتی بدارم ہلاک اندرم

بریں است، آئین چرخ رواں — اگر شہریاری اگر پہلواں

بزرگی بفرجام، ہم بگذرد — شکار است مرگش ہمی بشکرد

سکندر ز دیدہ ببارید خوں — بر آں شاہِ خستہ بخاک اندروں

چو دارا بدید از دل دردا وی — سرشکِ رواں بر رُخِ زرد داوی

بدو گفت مگری کز و سود نیست — ز آتش مرا بہرہ جز دود نیست

مناظر | مناظرِ قدرت کو جا بجا لکھا ہے، اور جہاں لکھا ہے، نیچر کی تصویر کھینچ دی ہے، مناظرِ قُدرت میں باغ و بہار ایک عام موضوع ہے، جس پر تمام شعرا نے طبع آزمائیاں کی ہیں، اور دادِ سخن دی ہے، لیکن نظامی یہاں بھی سب سے علیحدہ اور سب سے ممتاز ہیں، تمام شعراء نے صرف بہار کا سماں دکھلانے پر اکتفا کیا ہے، لیکن نظامی نے اس کے ساتھ یہ بھی دکھایا ہے کہ بہار میں ایک رنگین مزاج پر کس طرح نشہ سا چھا جاتا ہے، وہ باغ میں جاتا ہے، پھولوں سے کھیلتا ہے، گلدستے بنا کر درختوں پر اُچھالتا ہے، نہر کے کنارے بیٹھ جاتا ہے،

اور شگوفے توڑ توڑ کر نہر میں بہاتا ہے، حوض کے پاس چنبیلی کے پھولوں کا بچھونا بچھاتا ہے،
بغل میں معشوق ہے، اس کی زُلفوں کے حلقے اپنی گردن میں ڈالتا ہے، اور دُنیا سے آزاد
ہو جاتا ہے، مُرغانِ چمن سے فرمایش کرتا ہے کہ ہاں پھر اسی انداز سے اُڑنا ساتھ ہی ساز بھی
چھیڑتا جاتا ہے، اور قابو سے باہر ہوا جاتا ہے،

بیا باغباں خرمی ساز کُن — گل آمد در باغ را باز کُن،
نظامی بباغ آمد از شہر بند — بیارای بستاں بہ چینی پرند،
ز جعدِ بنفشہ برانگیز تاب — سرِ نرگسِ مست برکش ز خواب
زسیمای سبزہ فرو شوی گرد — کہ روشن بہ شستن شود لاجورد
درختاں شگفتند در طرفِ باغ — برافروختہ ہر گلے چوں چراغ
بہ مُرغِ زباں بستہ آواز دہ، — کہ پروازِ پارینہ را ساز دہ
سرایندہ کُن نالۂ چنگ را — برآور بہ رقص ایں دلِ تنگ را
سرِ زُلفِ معشوق را طوق ساز — برافگن بگردن خود ایں طوق باز
ریاحین سیراب را دستہ بند — برافشاں بہ بالاے سرو بلند
اناں سیمگوں سکۂ نو بہار — درم ریزہ کن برلبِ جوئبار
بہ پیراہنِ برکۂ آب گیر — زسوسن در افگن بساطِ حریر

شقیہ | ایران کی شاعری کا اصل مایۂ ناز عشقیہ شاعری ہے، اور اس میں شُبہ نہیں کہ
ق و عاشقی کے معاملات اور راز و نیاز، جس رنگینی اور دلفریبی سے ایرانی شاعری نے ادا
ے، دُنیا کی اور کوئی زبان اس انداز سے ادا نہیں کر سکتی، اس قسم کی شاعری کے لئے غزل
صوص کر دی گئی ہے، اور اس کے موجد شیخ سعدی خیال کئے جاتے ہیں، تام کے لئے

یہ نکتہ بھی لحاظ رکھنا چاہیئے کہ نظامی نے ان باتوں کو بجائے خبر کے انشا کے پیرایہ میں ادا کیا ہے،
رہ زیادہ بلیغ ہے،

غزل کی بُنیاد ان سے بھی بہت پہلے پڑچکی تھی، لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ قدمائے کے بوڑھے غمزے ہیں،

بے شبہ غزل کے موجد سعدی ہیں، لیکن غزل کی اصلی رُوح یعنی عشقیہ شاعری کی ایجاد نظامی کا خاص کارنامہ ہے، عشقیہ مثنویاں نظامی سے پہلے بھی لکھی گئیں جن میں سے فردوسی کی یُوسف زلیخا آج بھی موجود ہے، لیکن مثنویاں وہی قدماء کی غزلیں ہیں نظامی نے عشقیہ شاعری کی جس طرح بُنیاد ڈالی اور اُس کو ترقی دی اُس کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

(۱) عشق و عاشقی کے خیالات کے ادا کرنے کے لئے ایک خاص زبان درکار ہے، جس کے الفاظ نازک، لطیف اور شیریں ہوں، خاص قسم کے استعارات اور تشبیہیں ہوں، ادائیں دلآویزی اور دلفریبی ہو، یہ زبان خاص نظامی نے پیدا کی ہے، قدماء کی عشقیہ مثنویوں کا نظامی کی مثنویوں سے مقابلہ کرو تو یہ فرق صاف نظر آتا ہے،

غزل کے مہاتِ مضامین یہ ہیں، معشوق کے حُسن کی تعریف، ادا اور ناز و غمزہ کے کرشمے، الگ الگ اعضا کا بیان اور ان کی تشبیہات، عاشق و معشوق کے معاملات یعنی راز و نیاز، اصرار و انکار، سوال و جواب، عجز و غرور، وغیرہ، ان تمام مضامین کو نظامی نے اس وسعت، تنوع، رنگینی اور لطافت سے ادا کیا ہے کہ ان کا ہر ہر شعر سینکڑوں غزلوں کا سرمایہ ہے، چند مثالیں ذیل میں درج ہیں:-

شیریں کا غُسل کرنا،

چو قصد چشمہ کرد آں چشمۂ نُور	فلک را آب در چشم آمد از دُور
پرند آسماں گوں بر میاں زد	بشد در آب و آتش در جہاں زد
تنِ صافش کہ می غلطید در آب	چو غلطد قاقمے بر روی سنجاب
چو بر فرق، آب مے انداخت از دست	فلک بر ماہ، مروارید می بست
ز ہر سو شاخِ گیسو، شانہ می کرد	بنفشہ بر سرِ گل، دانہ می کرد

در آب انداختہ از گیسوان شست   نہ ماہی بلکہ ماہ آوردہ در دست

شیریں آراستہ ہو کر خسرو کے سامنے آتی ہے،

پس آنکہ ماہ را پیرایہ بربست   نقاب آفتاب از سایہ بربست

فرو پوشید گلنارے پرندے   بروہر شاخِ گیسو چوں کمندے

سر آغوشے برآمودہ بگوہر،   بہ رسم چینیاں افگندہ برسر

دوپٹہ

بدیں طاؤس کردارے ہمارے   رواں شد چوں تدروے در ہوائے

ایک موقع پر جب خسرو نے شیریں سے زیادہ اختلاط کرنا چاہا ہے، تو وہ برہم ہو کر اُٹھی ہے، اس حالت میں اس کا تن کر کھڑا ہونا، پیشانی کا غصہ سے سمٹنا، چہرہ کا کھل جانا، بدن ڈھکنے میں حسن کا اور چمکنا، بالوں کو کبھی سمیٹنا اور کبھی چھوڑ دینا، ان تمام اداؤں کو کس خوبی سے ادا کیا ہے،

بگفت ایں وچو سرو از جای برخاست   جبیں را گرد کرد و فرق را راست

یہ کہہ کر سرو کی طرح اُٹھ کھڑی ہوئی   پیشانی سمٹ گئی اور قد تن گیا

بہ آں آئین کہ خوباں را بود دست   زنخداں می کشاد و زلف می بست

اس خاص انداز سے جسمیں معشوقوں کو کمال ہوتا ہے   چہرہ کھولنے اور بال سمیٹنے لگی،

جمالِ خویش را در خز و خارا،   بہ پوشیدن ہمے کرد آشکارا

اپنے حُسن کو حریر اور کمخواب میں جس قدر   چھپاتی تھی، اسی قدر اور کھلتا تھا،

گہے بر فرق تُند آشفتہ می بود   گرہ می بست و بر مہ مشک می سود

کبھی زُلفوں پر جھلاتی تھی اس میں   گھونگھر بناتی تھی اور چاند پر مشک ملتی تھی

بہ زیور راست کردن دیر می شد   کہ پایش بر سر شمشیر می شد،

زیور کے سنبھالنے میں دیر ہوئی جاتی تھی،   کیونکہ جلدی کی وجہ سے گویا اسکا قدم تلوار پر تھا

زگیسو گہ کمر می کرد گہ تاج   ازاں تاج و کمر شہ گشتہ محتاج

زُلفوں کو کبھی کمر سے لپیٹتی تھی اور کبھی سر پر جوڑا باندھتی تھی   جو کمربند اور تاج بن جاتی تھی اور اس کمربند اور تاج کا خسرو بھی محتاج تھا

ایک موقع پر شیریں جب رُوٹھ کر اُٹھی تو اس ادا سے اُٹھی جس میں لگاوٹ بھی پائی جاتی تھی، اس کی تصویر اس طرح کھینچی ہے،

به چشمے ناز بے اندازه می کرد به دیگر چشم عذرے تازه می کرد
چو سر پیچید، گیسو مجلس آراست، چو رُخ گردید، گردن عُذر ہا خواست
نمود اندر ہزیمت شاه را پست به گو گردِ سفید آتش ہمی کُشت
غلط گفتم نمودش تختۂ عاج که شه را نیز باید تخت یا تاج
حسابے دیگر آں بودش دراں کوی که پشتم نیز محرابیست چوں روے
دگر وجه آنکه گر وجهے شد از دست ازاں روشن ترم وجهے دگر ہست
چه خوش نازیست نازے خوبرویاں ز دیده رانده را دُز دیده جویاں
به چشمے خیرگی کردن که برخیز به دیگر چشم دل دادن که مگریز

مُنہ پھیر کر بھاگنے کی توجیہیں کس قدر شاعرانہ ہیں، یعنی اس کو یہ دکھانا تھا کہ جس طرح میرا چہرہ، محرابی اور روشن ہے، اسی طرح پیٹھ بھی محرابی اور بلوری ہے،

غزلیہ شاعری کا ایک بڑا میدان معشوق کا ناز و غرور ہے، نظامی نے داستان کی داستان اس مضمون پر لکھی ہے، جس کا ہر شعر غزل کا کام دے سکتا ہے،

خسرو نے جب شیریں کو شاہی اقتدار کا زور دکھانا چاہا ہے تو وہ کہتی ہے،

ہنوزت در سر از شاہی غرور است دریغا کیں غرور از عشق دُور است
ابھی تک تیرے سر میں سلطنت کا غرور ہے لیکن افسوس، عشق کو غرور سے کیا نسبت
دریں گرمی کہ آہِ سرد باید دل آسان است با دل درد باید
اس گرمجوشی میں کہ آہ سرد کی ضرورت ہے دل آسان ہے، لیکن دل میں درد مُشکل ہے
ہنوزم ہندواں آتش پرستند ہنوزم چشم چوں ترکان مستند
ابھی تک ہندو، مجھ کو پوجتے ہیں ابھی تک میری آنکھیں ترک ہیں

هنوزم لب پر آب زندگانی است
ابھی تک میرے ہونٹوں میں آب حیات ہے

هنوزم آب در جوی جوانی است
ابھی تک میرے چشمہ میں آب شباب ہے،

بہ غمزہ گرچہ ترکی دلستانم،
اگرچہ غمزہ کے لحاظ سے میں ترک ہوں

بہ بوسہ دل نوازی نیز دانم
لیکن بوسہ سے میں دلداری بھی کرسکتی ہوں

برو تا بر تو نکشانم بخون دست
ہٹ جا! ایسا نہ ہو کہ میں تیرے خون پر ہاتھ ڈالدوں

کہ در گردن چنیں خونم بسے ہست
ایسے اور بہت سے خون میری گردن پر ہیں

خسرو نے جب شاپور کے ہاتھ شیریں کو بلا بھیجا ہے، تو وہ کہتی ہے،

اگر خسرو نہ کیخسرو بود شاہ
نباید کردنش سر پنجہ با ماہ

بگویم غمزہ را تا وقت شبگیر
سمندش را برقص آرد بیک تیر

فرستم زلف را تا یک فن آرد
شکیبش را رسن در گردن آرد

میں زلف کو بھیجدونگی کہ چالاکی سے
خسرو کے صبر کو گرفتار کرکے لائے

مزاحی کردم و او خواست پنداشت
دروغے گفتم و او راست پنداشت

مینے تو دل لگی تھی تو وہ تقاضا سمجھے
میں نے جھوٹ کہدیا تھا وہ سچ سمجھ گئے

خسرو ایک مرتبہ چند ندیموں کے ساتھ مستی کی حالت میں شیریں کے مکان پر گیا شیریں نے اس کی یہ حالت دیکھ کر کوٹھے سے اُترنا مناسب نہ سمجھا، خواصوں کو بھیجا کہ شہ نشین میں فرش کرکے وہیں خسرو کو بٹھائیں، خسرو کوٹھے پر جانا چاہتا ہے، شیریں منظور نہیں کرتی، اس موقع کا سماں اور سوال و جواب کا انداز دیکھو،

رقیبے را بہ نزد خویش خواند
ایک خواص کو اپنے پاس بُلایا اور کہا

کہ ما را نازنیں بر در چرا ماند
کہ مجھ کو نازنین نے باہر کیوں بٹھایا

درون شو، گو نہ شاہنشہ غلامی
اندر جاکر کہو کہ ایک شاہنشہ نے نہیں بلکہ

فرستاد است نزدیکت پیامی
ایک غلام نے پیغام بھیجا ہے،

کہ مہمانے بہ خدمت مے گراید   چہ فرمائی؟ در آید یا نیاید
کہ ایک مہمان خدمت کے لئے آیا ہے   کیا ارشاد ہے؟ اندر آئے یا نہ آئے،

بدیں زاری پیام شاہ می گفت   شکر لب می شنید و آہ می گفت
بادشاہ کا عاجزانہ کلام شیریں   سُنتی تھی اور افسوس کرتی تھی،

کنیزے کارداں را گفت آں ماہ   بخدمت خیز و بیروں شو سوی شاہ
ایک ہوشیار کنیز سے شیریں نے کہا کہ   بادشاہ کے پاس جا،

فلاں شش طاق دیبا را بروں بر   بزن با طاق ایں ایواں برابر
مخمل کے تھان لے جا کر   شہ نشیں میں بچھا دے

بنہ بر پیشگاہ و شقہ بر بند   پس آنگہ شاہ را گو کاے خداوند
اور پردے باندھ کر   بادشاہ سے کہہ

نہ ترک ایں سرا ہندوی ایں بام   شہنشہ را چنیں داد است پیغام
اس گھر کی ترک (یعنی معشوق) نے نہیں بلکہ   ہندو (غلام) نے حضور کو یہ پیغام دیا ہے

اِس کے بعد خسرو اور شیریں سے دوبدو گفتگو ہوئی ہے، خسرو کہتا ہے کہ تم نے دروازہ کیوں بند کر دیا، شیریں جواب دیتی ہے،

حدیث آں کہ در بستم روا بود   کہ سرمست آمدن پیشم خطا بود
چوں من خلوت نشیں باشم تو مخمور   ز تہمت رائے مردم کے بود دور
تو می خواہی مگر کز راہ دستاں   بہ نقلانم خوری چوں نقلِ مستاں
بدست آری مرا چوں غافلاں مست   چو گل بوی کنی و اندازی از دست
رہا کن نامِ شیریں از لبِ خویش   کہ شیرینی دہانت را کند ریش
تو در عشقِ من از مالی و جاہے   چہ دیدی جز خداوندی و شاہے
تو ساغر می زدی با دوستاں شاد   قلم شاپور می زد تیشہ فرہاد

اس کے مقابلہ میں رندانہ شوخیاں دیکھو، شیریں جب کسی طرح راضی نہیں ہوتی تو خسرو اس سے کہتا ہے،

بگستاخی درآمد کاے دلارام | گرفتہ چند خواہی بد، بیارام
خسرو نے گستاخانہ کہا کہ اے معشوق | یہ برہمی کب تک، ذرا نرم ہو
چو می خوردی و میدادی بمن یار | چرا باید کہ من مستم تو ہشیار
تم نے شراب پی اور مجھ کو بھی پلائی لیکن یہ خلافِ انصاف ہے کہ میں مست ہو جاؤں اور تم ہوش میں رہو
شمار بوسہ خواہد بود کارم | تو می دہ بوسہ تا من می شمارم
میرا کام صرف بوسہ کا گننا ہوگا | تم بوسہ دیتی جاؤ میں گنتا جاؤں گا

یعنی یہ کام تمہارا ہی ہے، لیکن میں اس کو تمہاری خاطر سے انجام دے دونگا،

سکندر نے جب کنیزک چینی سے اختلاط کرنا چاہا ہے تو وہ غرور کے لہجہ میں اپنے اوصاف بیان کرتی ہے، بادشاہ اور کنیز کا کوئی مقابلہ نہیں، لیکن اس موقع پر نظامی نے جدت آفرینی سے سکندر کا ایک ایک وصف بیان کر کے اس کے مقابلہ میں اس کے ترجیح کی وجہیں کنیز کی زبان سے ادا کی ہیں،

فلک گر ز جمشید بالاترست | رخ من ز خورشید زیباترست
شہ ار کیقباد بلند افسرست | مرا افسر از مشک و از عنبرست
شہ ار چون سلیمان شود دیو بند | مرا در جہاں ہست دیوانہ چند
شہ ار زانکہ عالم گرفت ای شگفت | من آں را گرفتم کہ عالم گرفت
اگرچہ کمند جہانگیر شاہ | فتادہ است در گردن مہر و ماہ
کمندے من از زلف بر سازمش | نہ ترسم بہ گردن در اندازمش
گر او را کمندے بود ماہ گیر | مرا ہم کمندے بود شاہ گیر
گر او ناوک اندازد، از دور دست | مرا غمزۂ ناوک انداز ہست

سکندر بہ حیواں خطامی رود | من اینجا سکندر کجا می رود
اگر راہ ظلمات می بایدش | سر زلف من راہ بنمایدش
لب من کہ یاقوت رخشاں نہ است | بسے چشمۂ آب حیواں درو است

رزمیہ

شاہ نامہ کو سو برس سے اوپر ہو چکے تھے، اس عرصہ میں زبان میں بڑا انقلاب ہو گیا تھا، سینکڑوں الفاظ بالکل متروک ہو گئے تھے، اکثر الفاظ حروف زائد گرا کر خوبصورت قالب میں ڈھل چکے تھے، عربی کے نئے نئے مانوس الفاظ داخل ہوتے جاتے تھے، زبان کے انقلاب کے ساتھ مضامین کی طرز ادا کی روش بھی بدل گئی تھی، استعارات اور تشبیہات میں لطافت و نزاکت آگئی تھی، طبیعتیں مضمون آفرینی کی طرف مائل ہوتی جاتی تھیں، ان باتوں سے شاہنامہ کی عالمگیر آواز دھیمی پڑنے لگی تھی، قصے زبانوں پر رہ گئے تھے، لیکن اشعار بھولتے جاتے تھے، اس بنا پر قوم کے شجاعانہ جذبات کے زندہ رکھنے کے لئے ایک دوسرے شاہنامہ کی ضرورت تھی جو سکندر نامہ کے قالب میں نمودار ہوا، سکندر نامہ کے ہیرو کے انتخاب میں غلطی ہوئی، لیکن مجبوری تھی، قومی تاریخ فردوسی کے حصہ میں آچکی تھی، رسول اللہ صلعم کے غزوات اور خلفاء کے معرکوں میں شاعری کی گنجایش کم تھی کیونکہ اصلیت سے بال برابر بھی ہٹتے تو مذہبی عدالت میں مجرم قرار پاتے اور شاعری کے لئے کچھ نہ کچھ آب و رنگ چڑھانا ضرور تھا، خود کہتے ہیں،

چو نظمیم گذارش بود راہ گیر | غلط کردن رہ بود ناگزیر
مرا کار با نغز گفتاریست | ہمہ کار من خود غلط کاریست
وگر بے شگفتے گذاری سخن | ندارد نوی، نامہ ہاے کہن

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ کسی مشہور کشورستان کی داستان اختیار کی جائے، اس حیثیت سے سکندر کا کوئی ہمسر نہ تھا، ایشیا، اور یورپ دونوں اس کو مانتے تھے، البتہ یہ افسوس ہے کہ نظامی نے مذہب ملا دیا، یعنی ذوالقرنین کو سکندر بنا دیا، جو صریح

قرآن مجید کے خلاف ہے،

سکندر نامہ میں اگرچہ شاعری کے محاسن بہت زیادہ ہیں، بااین ہمہ شاہنامہ کے برابر مقبول نہ ہو سکا، اس کے خاص اسباب ہیں،

۱۔ سکندر نامہ میں اکثر جگہ تعقید ہے، جو بات کہنا چاہتے ہیں، اس طرح صاف صاف نہیں کہہ سکتے کہ زبان سے نکلنے کے ساتھ دل میں اُتر جائے، یہی وجہ ہے کہ کثرت سے شرحیں اور حاشیے لکھے گئے، اس پر بھی بہت سے مقامات لاینحل رہ گئے، اور اکثر جگہ زبردستی مطالب پہنانا پڑا،

۲۔ کتاب کا ہیرو ایک شخص یعنی سکندر تھا، اس لئے ایرانیوں کو اس کے واقعات سے ایسی دلچسپی اور محبت نہیں ہو سکتی تھی جو خود اپنی قوم سے ہو سکتی تھی، شاہنامہ کے مقبول ہونیکا بڑا گُر یہ تھا کہ خود اپنی قوم کی داستان تھی،

۳۔ تمام کتاب میں صرف ایک شخص کی داستان ہے، پڑھنے والا اکتا اُکتا جاتا ہے، بخلاف اس کے شاہنامہ میں سینکڑوں اشخاص کے واقعات اور گوناگوں حالات ہیں، ایک غذا سے جی گھبرائے تو اور طرح طرح کے الوانِ نعمت موجود ہیں،

۴۔ تمام کتاب میں کوئی درد انگیز اور عبرت خیز واقعہ نہیں ہے، بخلاف اس کے شاہنامہ میں رستم و سہراب، منیژہ و بیژن، جمشید و ضحاک کی داستانیں نہایت پُراثر اور حسرت آمیز ہیں، باوجود ان باتوں کے سکندر نامہ نے جو قبولیت حاصل کی، تعجب انگیز ہے، شاہنامہ کے سَو ڈیڑھ سو ہی برس بعد سکندر نامہ لکھا گیا، اور شہرتِ عام پا گیا، سکندر نامہ کو آج چھ سو برس کا زمانہ گزر چکا، اس مدت میں اس طرز پر بیسیوں کتابیں لکھی گئیں، لیکن ان کا نام بھی کوئی نہیں جانتا، سکندر نامۂ جامی، آئینہ سکندری، ہمای ہمایوں، اکبر نامہ سلیمان نامہ[۵]، ان کا نام کس نے سُنا ہے؟

۵؎ یہ سب مثنویاں سکندر نامہ کی طرز پر اور اس کے جواب میں لکھی گئی ہیں،

رزمیہ نظم کا یہ اصول ہے کہ پہلے حربی باجوں کے بجنے، دار و گیر، ہنگامۂ شور و غل اور
عام ہلچل کا نقشہ کھینچا جائے، پھر فوجوں کی حملہ آوری، زور و شور، جوش و خروش کا ذکر
کیا جائے، پھر آلاتِ جنگ یعنی تیر و کمان، تیغ و سناں، نیزہ و خنجر کی کارستانیاں دکھائی
جائیں، پھر ایک پہلوان کا معرکہ میں آنا، رجز پڑھنا، مبارز طلب ہونا، حریف سے
لڑنا، داؤں پیچ کرنا، مرنا یا مارنا، ان باتوں کا ذکر کیا جائے اور اس طرح کیا جائے کہ
میدانِ جنگ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے، سکندر نامہ میں یہ سب باتیں ہیں
اور کمال کے درجہ پر ہیں،

حربی باجوں کا ذکر،

درآمد بغریدن آواز کوس — فلک بر دہانِ دہل داد بوس
ز غریدنِ کوس خالی دماغ — زمیں لرزہ افتاد در کوہ و راغ
چناں آمد از نالۂ ترک خروش — کہ از نالۂ ترکاں برآورد جوش
برآوردہ خر مہرہ آواز شیر (ناگوش) — دماغ از دمِ گاؤ دم گشت سیر
طراقے کہ از مقرعہ خواستہ (ترکے کی آواز، تازیانہ) — برون رفت، از زیں طاق آراستہ
ز بیم چقاچق کہ آمد ز تیر — کفن گشت در زیر جوشن حریر

ہنگامۂ جنگ

روا رو برآمد ز راہ نبرد — ہزاہز درآمد بہ مردانِ مرد
بجنبش درآمد دو دریائے خوں — شد از موجِ آتش، زمیں لالہ گوں
زمیں گفتی از یک دگر بر درید — سرافیل صورِ قیامت دمید
یکے گفت ہوی و دگر گفت ہاں — برآورد ہر ہائے ہوی از جہاں
جگر تاب شد نعرہ ہائے بلند — گلو گیر شد حلقہ ہائے کمند
سپاہ از دو جانب صف آراستہ — زمیں آسماں وار برخاستہ
ز سم ستوراں دراں پہن دشت — زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

فرو رفت و بر رفت روز نبرد
نم خوں بہ ماہے و ہر ماہ گرد

زبس گرد بر تارکِ ترک شد زیں
زمین آسمان، آسماں شد زمیں

چناں گرم گشت آتشِ کارزار
کہ از نعلِ اسپاں برآمد شرار

زبس خوں کہ گرد آمد اندر مغاک
چو گو گرد سُرخ آتشیں گشت خاک

زغریدنِ ژندہ پیلانِ مست
گرہ در گلوی ہژبران شکست

زمیں کو بساطے بُد آراستہ
غباری شد از جاے برخاستہ

زپولاد پیکان پیکر شکن،
تنِ کوہ لرزید بر خویشتن

پدر با پسر کیں برآراستہ
محابا شدہ، مہر برخاستہ

ستونِ علم جامہ در خوں زدہ
نجات از جہاں خیمہ بیروں زدہ

آلاتِ جنگ

زشمشیر برگشتہ جاے نبود،
کہ در غار را اژدہاے نبود

نہنگ خدنگ از کمین کماں
نیاسود بر یک زمیں یک زماں

کمند اژدہاے مسلسل شکنج
دہن باز کردہ بہ تاراجِ گنج

زبس بردہن ناچخ انداختن
نفس را نہ راہِ بروں تاختن

زنیزہ نیستاں شدہ روئے خاک
زگرز گوپالہا کوہ گشتہ مغاک

سناں در سناں بستہ چوں نوکِ خار
سپر بر سپر بستہ چوں لالہ زار

نہنگانِ شمشیر جوشن گداز
بہ گردن کشی کردہ گردن فراز

بہ ابرو در آمد کماں را شکنج
شتاباں شدہ تیر چوں مار گنج

زرومی در آمد بہ ناوردگاہ
یکے شیر پرطاسؔ[1] روئیں کلاہ

مبارز طلب کرد و جولاں نمود
بہ نام آوری خویشتن را سرود

کہ پرطاسیاں را درین خام چرم
بہ پرطاسیٔ من شود پشت گرم

---

[1] پرطاس ایک مقام کا نام ہے،

پلنگاں درم بر سرِ کوہسار — نہنگاں خورم بر لبِ جوئبار
درشتم بہ چنگال و سختم بزور — بہ حملہ درم پہلوئے نرّہ گور
سنانم زپہلو درآید بہ ناف — درمِ غے نمی گویم اینک مصاف
ہمہ خونِ خام است نوشیدنم — ہمہ چرمِ خام است پوشیدنم
شہ گرد ناں شاہ گرد ہں گرائے — زپرکار موکب تہی کرد جائے
زدہ بر میاں (پہلوان) گوہر آگیں کمر — درآورد پولاد ہندی بہ سر
بہ تن بر، یکے آسماں گوں زرہ — چو مرغولِ زنگی گرہ در گرہ،
یمانی یکے تیغ زہراب جوش — حمائل فرو ہشتہ از طرفِ دوش
بہ کبکِ دری چوں درآید عقاب — چگونہ جہد بر زمیں آفتاب
ازاں تیز تر خسرو پیل تن — بہ تُندی درآمد بہ آں اہرمن
بزد بانگ بروی کہ اے زاغِ پیر — عقابِ جواں، آمد آرام گیر
نخستیں نبردے کہ تدبیر کرد — برآں تیرہ دل بارشِ تیر کرد
چو دژخیم را نامد از تیر باک — زنندہ شد از تیرِ خود خشمناک
یکے (بدذات) خشت پولاد الماس رنگ — برآورد و زد بر دلاور نہنگ
ز سختی کہ تن را بہم در فشرد — برآں خارہ شد خشت پولاد خرد
دگر خشتے انداخت زاں تیز تر — بہ آں (دونوں) کُشتنی ہم نہ شد کارگر
چو دانست کاں دیو آہن سرشت — نیندیشد از حربۂ تیر و خشت
نہنگ جہانسوز را بر شیار — سوئے اژدہاے دمندہ دوید
زدش (تا زانو) بر کتف گاہ و بردش زجائے — چناں کاں سُتگر درآمد زجاے

لحۂ جنگ سے راستہ ہو کر حملہ کرنا

جنگ

لیکن انصاف یہ ہے نظامی، فردوسی کی طرح خاص لڑائی کے داؤں پیچ اور فنونِ جنگ کی تصویر اچھی طرح نہیں کھینچ سکتے ،

نظامی اور فردوسی کا موازنہ | اگرچہ انصاف یہ ہے کہ نظامی فردوسی کے ہمپایہ نہیں ہیں، تھوڑا سا شیریں پانی لے کر بار بار چھانا جائے، مقطر کیا جائے، اور پھر کسی خوشرنگ، خوشنما گلاس میں رکھا جائے تو اس کی شیرینی، خوشگواری، صفائی اور خوشنمائی میں کیا شک ہے، لیکن ایک صاف شیریں قدرتی چشمہ جو پہاڑ کے دامن سے نکل کر، بہتا چلا جاتا ہے اس سے کیا نسبت؛ تاہم دونوں کا انداز کلام دکھانے کے لئے ہم چند مشترک عنوانوں کے اشعار نقل کرتے ہیں اور ان کا فرق دکھاتے ہیں،

سکندر کا قاصد بن کر نوشابہ کے دربار میں جانا، سکندر نامہ کی مشہور داستان ہے، یہی قصہ شاہنامہ میں بھی ہے، فرق یہ ہے کہ شاہنامہ میں نوشابہ کے بجائے قیدافہ کا نام ہے جو اندلس کا بادشاہ تھا، باقی حالات مشترک ہیں، یعنی بادشاہ نے سکندر کو پہچان لیا ہے، اور اس سے اس کا اظہار کیا ہے، سکندر انکار کرتا ہے، بادشاہ اسکی تصویر منگا کر سامنے رکھ دیتا ہے کہ اپنے چہرہ سے ملا لو، سکندر سخت مضطر ہوتا ہے، بادشاہ اس کو تسلی دیتا ہے کہ یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے،

فردوسی	نظامی
چو قیدافہ را دید بر تختِ عاج	بر آراست نوشابہ درگاہ را
زیاقوت و پیروزہ بر سرش تاج	بزر در گرفت آہنی راہ را
ز زربفت پوشیدہ چینی قبائے	پری چہرگاں را بصد گونہ زیب
فراواں پرستندہ پیشش بپائے	صف اندر صف آراست آں دلفریب
رخِ شاہ تاباں بکردار ہور	برآمود گوہر بہ مشکیں کمند
نشستنگہش راستوں ہا بلور	فروہشت بر گوہر آگیں پرند
پرستندہ با طوق و با گوشوار	بر اورنگ شاہنشہی بر نشست
برپا اندراں گلشنِ زرنگار	گرفتہ معنبر ترنجے بدست

فردوسی

سکندر بداں در شگفتی بماند
فراواں نہاں نام یزداں بخواند
نشستنگہے دید، قیصر کہ نیز
نیامد ور از روم و ایراں بچیز
بر مہتر اندر زمیں داد بوس
چناں چوں بود، مردم چاپلوس
درا دید قیدافہ بشناختش
بپرسید بسیار و بنواختش
بہ مے خوردن اندر گراں مایہ شاہ
فزوں کرد سوی سکندر نگاہ
بہ گنجور گفت آں درخشاں حریر
نبشتہ برو صورت دلپذیر
بہ پیشِ من آور چناں ہم کہ ہست
بہ تندی بروہیچ پسا[۱] می دست
بیاورد گنجور و بنہاد پیش
چو دیدش نگہ کرد زاندازہ بیش
بہ چہر سکندر نکو بنگرید
ازاں صورت او را جدائی ندید
بدانست قیدافہ کاو قیصر است

نظامی

بفرمود کائیں بجاے آورند
فرستادہ را در سرائے آورند
فرستادۂ از در آمد دلیر
سوے تخت شُد چوں شتابندہ شیر
کمر بند شمشیر بکشاد باز
برسمِ رسولاں نہ بردش نماز
نہانی دراں قصرِ زیبندہ دید
بہشتی سرائے فریبندہ دید
زبس گوہریں گوش گردن کشاں
شدہ چشم بینندہ گوہر فشاں
ز تابندہ یاقوت و رخشندہ لعل
خرامندہ را آتشیں گشت نعل
مگر کان و دریا بہم تاختند
ہمہ گوہر اینجا بر انداختند
زنِ زیرک از سیرت شان او
دراں داوری شُد ہراسان او
کہ ایں کارواں مرد آہستہ راے
چرا شرطِ خدمت نیارد بجاے
ز سر تا قدم دید در شہریار

---

۱ یعنی بے احتیاطی سے ہاتھ نہ لگانا،

فردوسی

بران لشکر نامور مهتر است
بدو گفت کای مرد گسترده کام
بیا تا چه داری سکندر پیام
چنین داد پاسخ که شاه جهان
سخن گفت با من میان جهان
که قیدافهٔ پاک دل را بگوی
که جز راستی در زمانه مجوی
مگر سر نپیچی ز فرمان من
نگهدار بیدار پیمان من
دگر هیچ تاب اندر آری بدل
بیارم یکی لشکری دل گسل
برآرم دمار از همه لشکرت
به آتش بسوزم همه کشورت
بدو گفت کای زادهٔ فیلقوس
همت رزم و بزم ست و هم نعم و بوس
دلیر آمدی پیش من باژ خواه
ندانم ترا اینکه بنمود راه
سکندر ز گفتار او گشت زرد
روان پر ز درد و دو رخان لاجورد
بدو گفت کای مهتر پر خرد

نظامی

زر ریخته را بر محک زد عیار
چو نیکو نگه کرد بشناختش
به تخت خود آرام گه ساختش
سکندر به رسم فرستادگان
نگه داشت آئین آزادگان
پس آنگه گزارش گرفت از پیام
که شاه جهان داور نیک نام
چنین گفت کای داور نامجوی
ز نام آوران جهان برده گوی
چه افتاد کز ما عنان تافتی
سوی ما تو یک روز نشتافتی
ز تو نی چه دیدی که توسن شدی
چه بیداد کردم که دشمن شدی
چو من ره درین مملکت ساختم
برو سایهٔ دولت انداختم
کمر چون نه بستی بدرگاه من
چرا روی پیچیدی از راه من
به پاسخ نمودن زن هوشمند
ز یاقوت سر بسته بگشاد بند
که صد آفرین بر تو شاه دلیر

فردوسی	نظامی
چنیں گفت از تو نہ اندر خورد	کہ پیغام خود خود گزاری چو شیر
منم نیطقون کدخدائے جہاں	چناں آیدم در دل اے پہلواں
جز ایں بچۂ فیلقوسم مخواں	کہ با ایں سرِ سایۂ خسرواں
بدو گفت قیدافہ کز داوری	میانجی نۂ شاہ آزادۂ
بت را بپرداز کا سکندری	فرستندۂ نہ فرستادۂ
بیاورد و بنہاد پیشش حریر	پیام تو چوں تیغ گردن زند
نوشتہ برو صورتے دلپذیر	کراز ہرہ کیں تیغ برمن زند
کہ گر ہیچ جنبش بدے در نگار	ز تیغ سکندر چہ رانی سخن
بنودے جز اسکندر شہریار	سکندر توئی چارۂ خویش کن
	مرا خواندی و خود بدام آمدی
	نظر پختہ ترکن کہ خام آمدی
	جہاندار گفت اے سزاوار تخت
	پژوہش مکن جز بہ فرمان بخت

نظامی	
سکندر محیط است من جوئے آب	منہ تہمت سایہ بر آفتاب
بدرگاہ او بیش ازاں ست مرد	کہ او را قدم رنجہ بایست کرد
دگر بار نوشابۂ ہوشمند	ز نوشیں لب خویش بکشاد بند
کزیں بیش بر دلفریبی مباش	بہ ناراستی یک رکیبی مباش
پیاورت بزرگ است نامت بزرگ	نہفتہ مکن شیر در چرم گرگ
فرستادہ را نیست ایں دسترس	کہ با ما بہ تنہائی بر آرد نفس

نظامی

نہ جبّاری خویش را کم کنند	نہ در پیش من پشت را خم کنند
جوابش چنیں داد شاہ دلیر	کہ ناید ز روباہ پیغام شیر
اگر من چہ چشم تو نام آورم	سکندر نیم زو پیام آورم
اگر در میانجی دلیر آمدم	نہ از روبہ از نزد شیر آمدم
برآشفت نوشابہ زاں شیر دل	کہ پوشید خورشید را زیر گل
بفرمود کارد کنیزے دواں	حریرے برو پیکر خسرواں
یکے گوشہ از شقۂ آں حریر	بدو داد کیں نقش بر دست گیر
ببیں تا نشانِ رُخِ کیست ایں	دریں کارگاہ از پے چیست ایں
اگر پیکر تست چندیں مکوش	بہ ابروی خود آسماں را مپوش
سکندر بفرمانِ او ساز کرد	حریر نوشتہ ز ہم باز کرد،
بعینہ در و صورت خویش دید	ولایت بدست بداندیش دید
ترسید شد رنگ رویش چو کاہ	بدارائے خود برد خود را پناہ

(۱) سب سے پہلے اس پر نظر ڈالو کہ جہاں ایک ہی خیال ایک ہی واقعہ، ایک ہی بات کو دونوں نے لکھا ہے وہاں بھی بندشِ الفاظ کے لحاظ سے کس قدر فرق ہے، نظامی کی ترکیبوں کی چستی، قافیوں کی بلندی، فقروں کے در و بست، الفاظ کے شکوہ کا یہ انداز ہے کہ گویا شیر گونج رہا ہے، اس کے مقابلہ میں فردوسی کا کلام ایسا معلوم ہوتا ہے، جس طرح کوئی پراتم بڈھا پیرانہ لہجہ میں ٹھہر ٹھہر کر باتیں کرتا ہے، ان اشعار کا مقابلہ کرو،

فردوسی	نظامی
ز زربفت پوشیدہ چینی قبائے فراواں پرستندہ پیشش بپائے	پرستندگاں را بصد گونہ زیب صف اندر صف آراستہ آں دلفریب

فردوسی

بر مہتر اندر زمین داد بوس
چنان چون بود مردم چاپلوس
سکندر بدان در شگفتی بماند
فراوان نہان نام یزداں بخواند
بہ مے خوردن اندر گران مایہ شاہ
فزون کرد سوے سکندر نگاہ
بہ گنجور گفت آں درخشاں حریر
نبشتہ بر و صورتے دلپذیر
کہ قیدافۂ پاک دل را بگوے
کہ جز راستی در زمانہ مجوے
دلیر آمدی پیش من باز خواہ
ندانم ترا اینکہ بنمود راہ
بدو گفت قیدافہ کز داوری
لبت را بپرداز کا سکندری
سکندر ز گفتار او گشت زرد
رواں پر ز درد و رخاں لاجورد
منم نیطقون گہ خداے جہان
جز ایں بچۂ فیلقوسم مخوان

نظامی

سکندر بہ رسم فرستادگاں
نگہ داشت آئین آزادگاں
نہانی دراں قصر زیبندہ دید
بہشتی سراے فریبندہ دید
ز سر تا قدم دیدہ در شہریار
زر پختہ را بر محک زد عیار
یکے گوشہ از شقۂ آں حریر
بدو داد کیں نقش بر دست گیر
چنیں گفت کاے داور نامجوی
ز نام آوران جہان بردہ گوے
کہ صد آفریں بر تو شاہ دلیر
کہ پیغام خود خود گزاری چو شیر
میانجی نۂ شاہ آزادۂ
فرستندۂ نہ فرستادۂ
تبرسید شد رنگ و لیش چو کاہ
بہ زاری خود بر خود را پناہ
سکندر محیط است و من جوی آب
منہ تہمت سایہ بر آفتاب

(۲) انہی اشعار میں بلاغت کا فرق دیکھو۔

فردوسی	نظامی
فراواں پرستندہ پیش بپائے	صف اندر صف آراستہ آں دلفریب

فردوسی کے بیان سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ غلاموں اور لونڈیوں کا ہجوم تھا، اور سب کھڑے تھے، لیکن نظامی کے بیان سے ان کا باقاعدہ صف بصف ایستادہ ہونا بھی ثابت ہوتا ہے، "آراستہ" کے لفظ نے اس خصوصیت کو اور روشن اور خوشنما کر دیا ہے،

فردوسی	نظامی
بر مہتر اندر زمیں داد بوس	سکندر بہ رسم فرستادگاں
چناں چوں بود مردم چاپلوس	نگہ داشت آئین آزادگاں

فردوسی نے سکندر کی شان کا کچھ لحاظ نہیں رکھا، زمین چومنا خوشامدیوں کا شیوہ ہے، فردوسی کو اس پر بھی قناعت نہیں بلکہ کھول کر کہتا ہے کہ سکندر نے اس طرح زمین چومی جس طرح خوشامدی چوما کرتے ہیں، نظامی نے اگرچہ "برسم فرستادگاں سکے" لفظ سے ظاہر کر دیا ہے کہ سکندر نے قاصدوں کے طریق اور آئین کو ملحوظ رکھا تھا، تاہم دوسرے مصرع میں دفع دخل بھی کر دیا، کہ اس حالت میں بھی اپنی آن بان نہیں چھوڑی،

فردوسی	نظامی
سکندر بداں در شگفتے بماند	نہانے دراں قصر زیبندہ دید
فراواں نہاں نام یزداں بخواند	بہشتی سرائے فریبندہ دید

فردوسی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سکندر بالکل ندیدہ تھا، دربار کے ٹھاٹ کو دیکھ کر مبہوت ہو گیا تھا، اور بار بار خدا کا نام لیتا تھا، نظامی نے مکان اور ایوان کی عمدگی اور خوبی کا اثر سکندر پر طاری کرنا چاہا ہے، لیکن اسی قدر کہ وہ کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا،

نظامی	فردوسی
زسر تا قدم دید در شہریار	فزوں کرد سوئے سکندر نگاہ

فزوں نگاہ کردن سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ قیدافہ سکندر کو بڑی دیر تک دیکھتا رہا، ممکن ہے کہ صرف چہرہ پر ہی دیر تک اس کی نظر جمی رہی ہو، لیکن صرف چہرہ کی مشابہت پہچاننے کے لئے کافی نہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کے چہرے ملتے جلتے ہوتے ہیں، لیکن اور اعضا میں فرق ہوتا ہے، بخلاف اس کے نظامی کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ نوشابہ نے سکندر کو سر سے پاؤں تک دیکھا، یعنی نہ صرف چہرہ بلکہ تمام اعضا اور ڈیل ڈول، رنگ روپ، سج دھج کو بھی دیکھا جس سے صاف ثابت ہو گیا کہ یہ سکندر ہے،

نظامی	فردوسی
چنیں گفت کاے داور ناجوی	کہ قیدافۂ پاک دل را بگوے
زنام آورانِ جہاں بردہ گوی	کہ تیز راستی در زمانہ مجوے

قاصد کا بادشاہ کے دربار میں بادشاہ کا نام لینا، اور پھر فوراً تنبیہ اور نصیحت شروع کر دینا دستور کے خلاف ہے، اس لئے نظامی نے نام نہیں لیا بلکہ داور ناجو کے لفظ سے خطاب کیا اور اس کے ساتھ مدحیہ الفاظ اضافہ کئے،

نظامی	فردوسی
کہ صد آفریں بر تو شاہ دلیر	دلیر آمدی پیش من باز خواہ
کہ پیغام خود خود گزاری چو شیر	ندانم ترا ایں کہ بنمود راہ

فردوسی نے اس بات کو کہ قیدافہ نے سکندر کو پہچان لیا نہایت بے مزہ طریقہ سے بیان کر دیا ہے، اس کے ساتھ یہ الفاظ کہ معلوم نہیں کس نے تم کو یہ طریقہ سکھایا اور بدتہذیبی ہے، بخلاف اس کے نظامی اس بات کو اس طرح ادا کرتے ہیں، جس

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ نوشابہ کو یہ ظاہر کرنا مقصود نہیں کہ میں نے آپ کو پہچان لیا بلکہ وہ سکندر کی دلیری اور جرأت کے اثر سے متاثر ہے، اور بے اختیار تعریف کرتی ہے،

فردوسی	نظامی
سکندر ز گفتار او گشت زرد	بترسید شد رنگِ رویش چو کاہ
رواں پُر ز درد و رخاں لاجورد	بہ دارائے خود برد خود را پناہ

اِس قدر مضمون دونوں کے ہاں مشترک ہے کہ جب سکندر کو معلوم ہوا کہ بادشاہ نے اس کو پہچان لیا، تو وہ ڈرا اور متردد ہوا، لیکن فردوسی نے اس کے ڈرنے کو اس قدر حد سے بڑھا دیا جو سکندر کی شان سے بالکل بعید ہے، "رواں پر ز درد و رخاں لاجورد" نظامی کے بیان سے بھی اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ سکندر کا رنگ زرد پڑ گیا اور دل میں خدا دعا مانگی کہ اس خطرہ سے بچ جائے، لیکن اتنا بھی بدحواس نہیں ہوا کہ دل میں ٹیس اُٹھنے لگی، فردوسی نے پہلے مصرع میں سکندر کا زرد پڑ جانا بیان کر دیا تھا، لیکن اس پر بھی تسلی نہیں ہوئی اور دوسرے مصرع میں پھر کہنا "رخاں لاجورد"

(۳) اب عام طرح پر نظر ڈالو، جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے تو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ بیان کرنے والا واقعہ کا خاکہ (پلین) کیونکر قائم کرتا ہے، اور یہ بلاغت کا لیکن سب سے ضروری مرحلہ ہے،

فردوسی نے واقعہ کا جو خاکہ قائم کیا ہے اُس میں متعدد ناموزونیاں ہیں،

(۱) سکندر قاصد کے لباس میں خوشامدیوں کی طرح دربار میں آداب بجالاتا ہے،

(۲) دربار کو دیکھ کر مبہوت ہو جاتا ہے، گویا کبھی شاہانہ دربار دیکھا ہی نہ تھا،

(۳) حالانکہ سکندر کی رفتار، گفتار، طور و طریقہ سے ابھی کوئی بات ظاہر نہیں ہوئی جس سے اس احتمال کی طرف ذہن جائے کہ یہ خود سکندر ہے، تاہم بادشاہ کو شبہ ہے اور وہ سکندر کے چہرہ کو بہت غور سے دیکھتا ہے، اس لئے نظامی نے اس کا یہ پہلو

نکالا کہ سکندر نے قاصدوں کی طرح سجدہ نہیں کیا تھا، اس حالت میں شبہہ پیدا ہونا ضرور تھا، اور شبہہ کو اس لئے قوت ہوئی کہ سکندر کی تصویر اُس کی نظر سے گزر چکی تھی،

(۴) قیدافہ نے سکندر کے سامنے ہی تصویر منگا کر دیکھی، حالانکہ جب مخفی طور سے سکندر کو پہچاننا مقصود تھا، تو سکندر کے سامنے تصویر منگوا کر دیکھنا نہ چاہیئے تھا،

(۵) سکندر جب قاصد کی حیثیت سے پیغام ادا کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے، کہ آدابِ شاہی سے ناواقف ہے، اوّل تو بادشاہ کا نام لینا خلافِ ادب ہے اس کے علاوہ پہلے ہی سخت کلامی شروع کر دینی نہایت بدتہذیبی ہے،

برآرم دمار از ہمہ لشکرت بہ آتش بسوزم ہمہ کشورت

(۶) سکندر جب اپنے آپ کو چھپاتا، اور سکندر کا قاصد ہونا ظاہر کرتا ہے تو اس کو سکندر کا نام بڑی تعظیم و تکریم سے لینا چاہیئے تھا، لیکن وہ سکندر کو بچہ فیلقوس کے خطاب سے یاد کرتا ہے، ع جزایں بچۂ فیلقوسؔ ہم مخواں

اس کے مقابلہ میں نظامی نے جس طرح اس تمام واقعہ کا خاکہ کھینچا ہے وہ یہ ہے،

نوشابہ کو جب معلوم ہوا کہ سکندر کے دربار سے قاصد آتا ہے تو اس نے بڑے ساز و سامان سے دربار آراستہ کیا، خود بھی بن ٹھن کر ہاتھ میں ایک ترنج لئے ہوئے تختِ شاہی پر بیٹھی، سامنے پری چہرہ کنیزیں صف باندھ کر کھڑی ہوئیں، پھر سکندر کو طلب کیا، سکندر دربار میں آیا تو آدابِ شاہی کے موافق کمر بند سے تلوار کھول کر رکھ دی، لیکن سجدہ نہیں کیا، اِس موقع پر دربار جو جواہرات سے جگ مگ کر رہا تھا، اس کو نہایت مبالغہ آمیز پیرایہ میں ادا کیا ہے،

زتابندہ یاقوت و رخشندہ لعل خرامندہ را آتشیں گشت نعل

ملہ اس بیان میں فردوسی اور نظامی کے اشعار مکرر آگئے، لیکن اس بحث کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لئے ایسا کرنا ضرور تھا،

نگر کان و دریا بہم تاختند　　　ہمہ گوہر آں جا بر انداختند

قاصد کے شاہانہ طرز کلام سے نوشابہ کو شبہہ ہوا کہ یہ خود سکندر ہے، خوب غور سے دیکھا تو یقین ہو گیا، قاصد نے اب پیغام ادا کرنا شروع کیا، کہ شہنشاہ نے کہا ہے کہ ہماری طرف سے کیا کمی ہوئی جو تم نے بے اعتنائی کی، آج تک تم دربار میں نہ آئے، ہم ان اطراف میں بھی آئے، لیکن تم نے اِدھر رُخ نہ کیا،

نوشابہ نے کہا کہ آپ کی جرأت پر صد ہزار آفریں ہے کہ آپ اپنا پیغام ادا کرتے ہیں، آپ کی باتیں تلوار کا کاٹ کرتی ہیں، یہ تلوار اور کس کی مجال ہے کہ مجھ پر چلائے، سکندر انکار کرتا ہے کہ میں سکندر نہیں، پھر اس کی نہایت عمدہ توجیہیں بیان کرتا ہے کہ کجا سکندر، کجا میں، سکندر کے دربار میں آدمیوں کی کیا کمی ہے کہ خود قاصد بن کر آتا، اس موقع پر نوشابہ و سکندر کے سوال و جواب کو نہایت بلیغ انداز میں طول دیا ہے، آخر نوشابہ جھلا کر سکندر کی تصویر منگوا کر اس کو دکھلاتی ہے، اور سکندر لاجواب ہو کر رہ جاتا ہے، اس کے ساتھ خطرہ کے خیال سے اس کے چہرہ کی رنگت زرد پڑ جاتی ہے،

اس تمام سلسلہ میں کہیں سے کوئی کسر نہیں، تمام واقعات، اصلیت اور نیچر کے مطابق ہیں، اس کے ساتھ فصاحت و بلاغت، تشبیہات اور استعارات کی ندرت اور لطافت، الفاظ کی شان و شکوہ، ان تمام باتوں نے اِس داستان کو سحر سامری بنا دیا ہے،

نظامی اور فردوسی میں یہ فرق اور بہت سے موقعوں پر نظر آتا ہے، لیکن طول کے لحاظ سے، ہم قلم انداز کرتے ہیں، سکندر و دارا کی گفتگو اوپر گزر چکی ہے، اس کو اس موقع پر ایک بار اور دیکھ لینا چاہیئے، ان سب باتوں پر بھی فردوسی ہے اور نظامی نظامی ؀

چند ضروری باتیں

۱۔ شعر العجم کے چار حصوں میں سے یہ پہلا حصہ جو شائع ہو رہا ہے، اس میں صرف قدیم شعراء کے حالات اور ان کی شاعری سے بحث ہے، دوسرا اور تیسرا حصہ مطبع میں جا چکا ہے، پہلے حصہ کی تالیف میں اگرچہ تدقیق اور محنت میں کچھ کمی نہیں کی گئی لیکن مجھ کو صاف کہنا چاہیئے کہ یہ حصہ اور تمام حصوں کی بہ نسبت کم دلچسپ ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کی تصنیف کی دلچسپی یا شعراء کے حالات سے ہو سکتی تھی یا اُن اشعار سے جو جا بجا مثال میں پیش کئے جاتے ہیں، قدیم شعرا کے حالات کم ملتے ہیں، اور یہ حصہ قدماء ہی تک محدود ہے، دقیقی، عنصری، نظامی بہت بڑے رُتبہ کے شاعر ہیں، لیکن ان کے حالات اور واقعات اس قدر کم ہیں کہ مجبوراً چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر پھیلانا پڑا ہے، قدماء میں سے دورِ اوّل کی زبان آج بالکل نامانوس ہے، دقیقی، فردوسی، منوچہری، عنصری کے متواتر دو شعر بھی آجکل کی زبان میں نہیں ملتے، اس کے علاوہ ان کی شاعری میں عشق کی چاشنی گویا ہے ہی نہیں، اس لئے ان کے کلام میں آج کل کے لوگوں کو مزا نہیں آ سکتا، غرض یہ حصہ چنداں تفریح اور تفنّن کے کام کا نہیں، اس کو ایک علمی خشک مضمون کی حیثیت سے پڑھنا چاہیئے، باقی حصے البتہ دلچسپ، بامزہ اور رنگین ہیں،

۲۔ چونکہ کتابوں سے تفحص اور تلاش کا سلسلہ اب تک قائم ہے، اور بعض بعض نادر کتابیں اس حصہ کی تصنیف کے بعد ہاتھ آئیں، اس لئے وہ معلومات جو ان کتابوں سے ہاتھ آئے اب چوتھے حصے کے کام آئیں گے، مثلاً یہ تذکروں میں مذکور ہے، کہ ایران میں سب سے پہلے بہرام گور نے شعر کہا اور وہ یہ تھا،

منم آں پیل دمان و منم آں شیر یلہ
نام بہرام مرا و پدرم بو جبلہ

لیکن میں نے اس روایت کو اس لئے نظر انداز کیا تھا کہ اوّل تو اُس زمانہ کی زبان نہیں ہو سکتی، دوسرے یہ کہ بہرام کے کلام میں ابوجبلہ عربی لفظ کیوں آتا، لیکن لب اللباب عوفی کی پہلی جلد، کتاب کی تصنیف کے بعد چھپ کر یورپ سے آئی تو اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ بہرام گو عرب میں پلا تھا، اور عربی زبان میں شعر کہتا تھا، چنانچہ عوفی نے اس کا عربی دیوان خود دیکھا تھا، لب اللباب میں یہ شعر کسی قدر تغیر کے ساتھ مذکور ہے جس سے اُس کی ساخت اور زبان دونوں پر اثر پڑتا ہے،

۲- دُنیا میں ناممکنات کی اب تک جو فہرست تیار ہو چکی ہے، اس میں ایک نمبر کتاب کا صحیح چھپنا بھی اضافہ کرنا چاہیئے، یہ مصیبت مدّت سے مجھ کو پیش آتی ہے، لیکن علاج کی کوئی صورت نہیں نکلتی، کاپیوں اور پروف کی تصحیح چنداں کام نہیں دیتی، چھپنے میں حرف کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں، کسی کتاب کے ساتھ غلط نامہ لگانا بھی بیکار سا ہے، غلط نامہ سے کتاب کو مطابق کر کے تصحیح کرنا، اتنی بڑی زحمت کون اُٹھائے، اسی بنا پر میں نے کبھی اس کا قصد نہیں کیا، لیکن شعر العجم فارسی لٹریچر کا آئینہ ہے، اس کی غلط بیانی کا اثر خود زبان پر پڑ سکتا ہے، اس لئے چار و ناچار میں خود زحمت اُٹھاتا ہوں اور احباب کو بھی زحمت دیتا ہوں، خفیف غلطیاں تو اس قدر ہیں کہ سب کا احصا کروں تو ایک اور کتاب تیار ہو جائے، اس لئے موٹی موٹی غلطیاں لکھ دی ہیں، ایک عام غلطی یہ ہے کہ بین السطور میں جہاں کہیں میں نے کسی لفظ کے نیچے اس کے معنی لکھ دیئے ہیں کاتب صاحب وہاں سے ہٹا کر کسی دوسرے لفظ کے نیچے وہ معنی لکھ دیتے ہیں، اور اس سے مصنف کی سخت جہالت ثابت ہوتی ہے،

ایک جگہ اہلِ مطبع نے نہیں بلکہ میں نے خود سخت غلطی کی ہے جس سے فردوسی کی شاعری پر حرف آتا ہے، اس لئے نہایت ندامت کے ساتھ فردوسی سے اس کی

Vol. 5

معافی چاہتا ہوں، کتاب کے ۱۶۷ صفحہ سطر ۵ میں یہ عبارت ہے،

"صلاح و مشورہ کے لئے لوگ جمع ہوئے ہیں، اس میں کھانا بھی سامنے آ گیا ہے، لوگ کھا پی کر اُٹھ کھڑے ہوئے، اس کو اس طرح ادا کرتا ہے،

پے مشورہ مجلس آراستند ... نشستند، خوردند و برخاستند

لیکن فردوسی کا شعر ہیں نے غلط نقل کیا، اور اس لئے معنی بھی غلط لکھے، شعر کا دُوسرا مصرع اصل میں یوں آیا ہے ع

نشستند و گفتند و برخاستند

نکتہ دانِ بلاغت جانتا ہے کہ اس ایک لفظ (گفتند) کے تغیّر سے شعر برباد ہو جاتا ہے۔

شعر العجم

حصّۂ دوم

خواجہ فرید الدین عطار سے حافظ اور ابن یمین تک

مادۂ تاریخ آغاز تصنیف

تاریخ عجم

سنہ ۱۳۲۴ھ

مادۂ تاریخ اختتام تصنیف

تذکرہ

سنہ ۱۳۲۵ھ

مُصنّفہٗ

شبلی نعمانی

جسے

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ

لاہور نے

عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام حافظ محمد عالم چھپوایا

سنہ ۱۹۴۶ء

قیمت ۸ روپیہ

Vol. 2

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
شاعری کا دوسرا دور اور اُس کے خصوصیات اور خصوصیات کے اسباب	۱	اظہار جذبات	۵۳
خواجہ فریدالدین عطار	۱۰	اخلاقی شاعری	۵۵
خواجہ صاحب کی تصنیفات	۱۲	قوت تخئیل	۶۸
کلام پر رائے	۱۲	طرز ادا	۶۹
کمال اسمٰعیل	۱۷	غزل گوئی اور اس کی خصوصیات	۷۴
کمال کی شاعری کی عظمت	۱۸	**امیر خسرو دہلوی**	۸۳
کمال کی خصوصیات	۱۹	ولادت و تعلیم	۸۴
شیخ سعدی	۲۶	دربار کے تعلقات	۸۵
بچپن کے حالات	۲۶	وفات و اولاد و اعزہ	۹۵
طالب العلمی	۲۸	فقر و تصوف	۹۸
سیر و سیاحت	۳۰	جامعیت کمالات	۱۰۱
شیراز میں واپس آنا	۳۶	فن موسیقی کا کمال	۱۰۳
دربار کے تعلقات	۳۶	تصانیف	۱۰۵
وفات	۴۱	شاعری	۱۰۹
عام حالات اور اخلاق و عادات	۴۱	شاعری میں تلمذ	۱۱۰
تصانیف	۴۴	خود اپنی شاعری کی نسبت اظہار رائے	۱۱۳
شاعری	۴۷	خصوصیات شاعری	۱۱۵
آزادی	۵۰	امیر خسرو کی مثنویاں	۱۱۷
		قصائد	۱۲۵

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
غزل	۱۲۸	غزل	۱۷۸
واقعہ بندی	۱۳۴	اساتذہ کا تتبع	۱۷۹
روزمرہ	۱۳۵	خواجہ صاحب کی خصوصیات	۱۸۵
مسلسل غزلیں	۱۳۸	جوش بیان	۱۸۶
جدت	۱۴۱	بدیع الاسلوبی	۱۹۲
مضمون آفرینی	۱۴۲	واردات عشق	۱۹۸
صنائع وبدائع	۱۴۵	فلسفہ	۲۰۳
سلمان ساوجی	۱۴۹	فلسفہ اخلاق	۲۰۷
کلام پر راے	۱۵۳	واعظین کی پردہ دری	۲۰۸
خواجہ حافظ	۱۶۱	روزمرہ ومحاورہ	۲۱۲
نام ونسب اور بچپن	۱۶۱	خوش نوائی	۲۱۶
سن رشد اور شاعری کی شہرت	۱۶۲	بندش کی چستی	۲۱۸
وفات اور اولاد	۱۷۰	ظرافت	۲۲۲
دنیاوی تعلقات	۱۷۳		
کلام پر راے	۱۷۶	**ابن یمین**	۲۲۵

شعر العجم

حصۂ دوم

ساتویں صدی ہجری تا ۹ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شاعری بلکہ تمام اسلامی علوم و فنون کا جوش شباب تھا کہ دفعۃً تاتار کی طرف سے اس زور کا طوفان اٹھا کہ دنیا کا شیرازہ بکھر گیا، یعنی ۶۱۶ھ میں چنگیز خان نے تاتار سے نکل کر خراسان سے شام تک سب بے چراغ کر دیا، کم و بیش چالیس لاکھ آدمی کا خون بہ گیا، سیکڑوں ہزاروں شہر خاک سے برابر ہو گئے، مدارس اور خانقاہوں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، علمی خزانوں کا ایک ایک ورق اڑ گیا، لیکن اسلام کچھ ایسا سخت جان تھا کہ ان ہنگاموں پر بھی زندہ بچ گیا، بلکہ جونہی یہ طوفان تھمنا شروع ہوا، دبی ہوئی چنگاریاں پھر چمکیں اور چمک کر اس طرح مشتعل ہوئیں کہ ایک دفعہ پھر ع عالم تمام مطلع الانوار ہو گیا،

چنگیز خان ایک غارتگر کی شان سے اٹھا تھا اور اپنی فوری اور سرسری انتظامات کے لئے اس نے کچھ قاعدے بھی بنا لئے تھے جو تورہ چنگیز خانی کے نام سے مشہور ہیں لیکن جب سلطنت کو استقلال ہوا تو شاہانہ نظم و نسق کی ضرورت پڑی، تاتاری لوٹ مار کے سوا اور کچھ جانتے نہ تھے اس لئے مسلمانوں سے اعانت لینے کے سوا چارہ نہ تھا، چنگیز خان کے بعد اس کا بیٹا اوکتائی قاآن اور اسکے بعد چنگیز خان کا پوتا ہلاکو بن **تولی بن چنگیز خان** تخت نشین ہوا، ہلاکو نے محقق طوسی کو وزارت کا منصب دیا، رفتہ رفتہ مسلمانوں نے دربار پر قبضہ کر لیا یہاں تک کہ اس کا بیٹا نکودار، خواجہ شمس الدین محمد وزیر سلطنت کی ترغیب سے مسلمان ہو گیا اور اپنا نام احمد رکھا مگر کے

اس پر بگڑ گئے اور ارغون خان (ہلاکو خان کا دوسرا پوتا) کی افسری میں احمد خان کو گرفتار کر کے ۶۸۰ھ میں قتل کر دیا، لیکن جب ارغون کا بیٹا غازان خان ۶۹۴ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا تو وہ بھی مسلمان ہو گیا، اور اسکے ساتھ ساٹھ ہزار ترک مسلمان ہو گئے، غازان ۷۰۳ھ میں مر گیا اسکے بعد اسکا بھائی خدا بندہ اور اسکے بعد اسکا بیٹا سلطان ابو سعید بادشاہ ہوا، یہ تمام سلاطین نہایت عادل، انصاف پسند، مدبر اور دیندار تھے، اور بالخصوص سلطان ابو سعید کے عدل و انصاف اور نظم و نسق کے قواعد اور آئین، مساجد اور مدارس پر کندہ ہو کر مدتوں قائم رہے، یہاں تک کہ اوحدی کرمانی نے جو مشہور صوفی گزرے ہیں اپنی مثنوی جام جم میں ابو سعید کی اس طرح مدح سرائی کی ہے،

سکہ بر نام بو سعید زدند دو جہان را صلائے عید زدند

مدح این گلبن اُو نوا الامرے درچمن گفتہ بلبل و قمرے

سلطان ابو سعید نے ۷۳۶ھ میں وفات پائی، تمام ملک نے اسکے مرنے کا ماتم کیا یہاں تک کہ مسجد کی میناروں پر ماتمی کپڑے لپیٹے گئے اور ہر شہر کی گلی کوچوں میں بھی کئی کئی دن تک خاک اُڑتی رہی، چونکہ سلطان کے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے ہر طرف سے سرداروں نے خودسری کی، آذربائیجان، امیر چوبان و شیخ حسن جلایر نے دبا لیا، عراق اور فارس پر مظفر نے قبضہ کیا، غرض ۷۳۶ھ سے ۷۸۱ھ تک تمام قومیں پریشان رہیں اور یہ چھوٹے چھوٹے فرمانروا آپس میں لڑتے بھڑتے رہے، یہی زمانہ ہے جو تاریخ میں طوائف الملوکی کے نام سے مشہور ہے[1]۔

بالآخر تیمور اُٹھا اور تمام دعویداروں کو مٹا کر شہنشاہی قائم کی اسکے خاندان میں حکومت کا جو سلسلہ قائم ہوا، اسکا خاتمہ سلاطین صفویہ کے آغاز سے جا کر ملتا ہے جہاں سے ہماری کتاب کا تیسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا واقعات میں ہمارے کام کی جو باتیں ہیں، حسب ذیل ہیں:-

۱- تاتار کے قتل عام میں جو بے شمار جانیں ضائع ہوئیں اس نے مسلمانوں کے شجاعانہ

[1] یہ تمام حالات اول سے آخر تک مجالس المومنین اور دولت شاہی سے لئے گئے ہیں۔

جذبات کو فنا کر دیا، اسکا شاعری پر یہ اثر ہوا کہ رزمیہ نظمیں ہمیشہ کے لئے معدوم ہو گئیں شاعری کے فرائض پورے کرنے کے لئے متعدد رزمیہ مثنویاں لکھی گئیں مثلاً ہمائے ہمایوں خواجوی کرمانی، آئینہ اسکندری امیر خسرو، سکندر نامہ جامی، تیمور نامہ ہاتفی، شاہنامہ قاسم گونابادی، اکبر نامہ فیضی، لیکن صاف نظر آتا ہے کہ کہنے والے منہ چڑھاتے ہیں، دل میں کچھ نہیں، قوم اس قدر افسردہ ہو گئی تھی کہ ان کتابوں کے دو شعر بھی زبانوں پر نہ رہ سکے،

۲۔ عام قاعدہ ہے کہ مصیبت میں خدا زیادہ یاد آتا ہے، اس لئے اس عہد میں تصوف کا زیادہ زور رہا، عطار، مولنٰنا روم، اوحدی، عراقی، سعدی، مغربی، انہی اسباب کے نتائج ہیں،

۳۔ جنگی جذبات کے فنا ہونے نے طبیعتوں میں انفعالی اثر زیادہ پیدا کیا جو تصوف کے سوا، ایک اور رنگ میں ظاہر ہوا یعنی غزل گوئی، یہ مسلّم ہے کہ غزل جس چیز کا نام ہے اسکی ابتدا شیخ سعدی اور انکے معاصرین سے ہوئی، یہ اسی کا اثر ہے،

تاتار اور تیمور کی عام سفاکی نے قوموں کی قومویں غارت کر دیں بڑے بڑے جگمگاتے ہوئے اورادرنگ نشینوں کا تاج و تخت خاک میں ملا دیا، خراسان سے لیکر شام تک زمین و آسمان میں سناٹا ہو گیا ام الدنیا بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، تمام بڑے بڑے پایۂ تختوں میں خاک اڑنے لگی، کم از کم پچاس ساٹھ لاکھ آدمی ایکدم سے فنا ہو گئے، ان امور نے دنیا کی بے ثباتی اور انقلابات کا ایسا نقشہ کھینچ دیا تھا جو مدت تک آنکھوں کے سامنے پھرتا رہا، اس بنا پر دنیا کی بے ثباتی کے مضامین زیادہ تر اشعار میں آنے لگے شیخ سعدی، ابن یمین، خواجہ حافظ کے ہاں ان مضامین کی بہتات اسی بنا پر ہے۔ ان لوگوں نے یہ سماں خود آنکھوں سے دیکھا تھا وہی زبان پر آیا اور پھر ایک روش قائم ہو گئی اور سب اسی انداز میں کہنے لگے،

۴۔ ترک اور مغل بادشاہ اگرچہ اکثر نہایت مدبر اور عادل تھے اور اسلئے ان کے عہد میں امن و امان رہا لیکن طبیعتوں میں شاعری کا مذاق نہ تھا، اسلئے دربار میں شعرا کی چنداں

قدر نہ تھی، یہی وجہ ہے کہ اس دور کے جو مشہور شعرا ہیں، مثلاً سعدی، خواجہ، حافظ، مولانا روم اوحدی، ابن یمین، کسی دربار سے خاص تعلق نہ رکھتے تھے، نہ سلطنت سے ان کو کوئی خطاب حاصل تھا،

۵- اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری میں فی الجملہ آزادی کی روح آئی اور ابن یمین کے قصائد اور قطعات میں جو خوشامد اور بیہودہ مداحی کی جا بجا عیب گیری پائی جاتی ہے وہ اسی کا اثر ہے،

۶- تیموریہ خاندان جو ایران میں قائم ہوا اُسکا خاتمہ سلطان حسین مرزا پر ہوا، وہ عادل اور ہنر پرور ہونے کے ساتھ شعر و شاعری کا نہایت فریفتہ اور قدردان تھا، اسلئے اسکے عہد میں شاعری اس کثرت سے پھیلی کہ بچہ بچہ شاعر بن گیا والہ داغستانی ریاض الشعرا میں لکھتے ہیں،

در رعایت فضلا و شعرا سعی بلیغ فرمودہ است و در ترتیب شعرا آن قدر مبالغہ کردہ است کہ فن شاعری کہ فضیلت علوم را لازمہ داشت از علم جدا شدہ و ہر بے مایہ بہ محض طبیعت موزون ارادہ شاعری کردہ رفتہ رفتہ فن شاعری کہ الطف فنون بود از درجۂ اعتبار افتادہ بہ مضحکہ انجامید،

سلطان حسین کا انجام، صفویہ کے آغاز سے ملا ہوا ہے، اس لئے صفویہ کے زمانہ میں دفعۃً جو ایران کے چپہ چپہ سے شعرا ابل پڑے یہ وہی سلطان حسین کے ابر فیض کے رشحات تھے والہ داغستانی کو تو یہ رنج ہے کہ اس تعمیم کی وجہ سے ہر عامی شعر کہنے لگا اور علمی کمالات کی قید اُٹھ گئی، لیکن ہمارے نزدیک اسی بات نے شاعری کو شاعری کے رتبہ پر پہنچایا، بے شبہ پہلے شعرا کے لئے علوم عربیہ اور معقول و منقول سے واقف ہونا ضرور ہوتا تھا، لیکن ان کمالات کے بوجھ میں اصلی جذبات دب کر رہ جاتے تھے، وقار و متانت، اور عوام کے معتقد علیہ ہونے کی وجہ سے اکثر جذبات اس آزادی سے ظاہر نہیں ہو سکتے تھے جس طرح دل میں آتے تھے، یہی وجہ ہے کہ متوسطین اور متاخرین کی عشقیہ شاعری اس قدر جلدی جذبات سے لبریز ہے کہ قدما کے ہاں اس کا پتہ بھی نہیں لگ سکتا،

اس دور میں شاعری میں اصناف ذیل کو ترقی ہوئی،

تصوف، عطار، مولٰنا روم، اوحدی، عراقی، مغربی،

غزل، مولٰنا روم، شیخ سعدی، امیر خسرو، حسن، خواجہ حافظ،

اخلاق و موعظت، شیخ سعدی، ابن یمین،

قصیدہ گوئی، کمال اسمٰعیل، سلمان ساوجی،

قصیدہ گوئی میں، جو ترقی ہوئی اُس کی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) زبان زیادہ صاف ہوگئی، قدما کے دور میں ظہیر فاریابی نے زبان کو جس حد تک صاف کر دیا تھا وہ اس دور کی اخیر سرحد ہے کمال اسمٰعیل نے اور بھی زیادہ صاف کیا،

(۲) مضمون آفرینی میں بہت ترقی ہوئی، کمال نے ابتدا کی اور سلمان نے اس حد تک پہنچا دیا کہ متاخرین کی سرحد سے ڈانڈا مل گیا،

(۳) خاقانی، والوری وغیرہ جو علمی اصلاحات سے کلام کو زیر بار کرتے تھے، یہ بات جاتی رہی، اس عہد کے قصائد ایک عامی کو بھی دیدیے جائیں تو اصطلاحات وغیرہ کی بنا پر اسکو کہیں اٹکاؤ نہ ہوگا،

اب ہم اس دور کے مشہور شعراء کا حال لکھتے ہیں،

اس موقع پر اس قدر لکھ دینا ضرور ہے کہ اس دور کے ایک بڑے رکن شاعری یعنی مولٰنا روم کا تذکرہ ہم کو قلم انداز کرنا پڑا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ہم انکے حالات اور ان کی شاعری پر ایک مستقل کتاب، سوانح مولٰنا روم کے نام سے لکھ چکے ہیں اور وہ گھر گھر پھیل چکی ہے،

در مکر رستنِ مضمون رنگین لطف نیست ۔۔۔ کم دہد رنگ ار کسے بندد حنائے بستہ را

خواجہ فریدالدین عطار

ولادت شعبان ۵۱۳ھ وفات ۶۲۷ھ

اصلی نام محمد تھا فریدالدین لقب ہے، نیشاپور کے اضلاع میں کدکن ایک گاؤں ہے وہاں کے رہنے والے تھے، انکے والد ابراہیم بن اسحاق، عطاری کا پیشہ کرتے تھے، اور کاروبار خوب پھیلا ہوا تھا، باپ کے مرنے کے بعد انہوں نے کارخانہ کو اور زیادہ رونق دی، ریاض العارفین میں لکھا ہے کہ نیشاپور کے تمام کارخانے خواجہ صاحب کے اہتمام میں تھے ارباب تذکرہ متفقاً لکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب ایک دن دکان میں بیٹھے ہوئے تھے، کسی طرف سے ایک فقیر آنکلا اور اُن کی دکان کے ساز و سامان اور آرائش کو دیر تک غور سے دیکھا کیا، خواجہ صاحب نے ناراض ہوکر کہا کیوں بیفائدہ اوقات ضائع کرتے ہو اپنا راستہ لو، اُس نے کہا تم اپنی فکر کرو، میرا جانا کیا مشکل ہے، میں یہ چلا، یہ کہکر وہیں لیٹ گیا، خواجہ صاحب نے اُٹھ کر دیکھا تو تمام ہو چکا تھا، سخت متاثر ہوئے، کھڑے کھڑے دکان لٹوادی اور سارا کاروبار چھوڑ کر فقیر ہو گئے،

لیکن، افسوس ہے کہ ہمارے تذکرہ نویسوں نے خود خواجہ صاحب کی تصنیفات نہیں پڑھیں اُن کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ تصوف اور فقر کے کوچہ میں آنے کے بعد بھی وہ اپنے قدیم پیشہ میں مشغول رہے اور اسی حالت میں اسرار اور عرفان کے حقائق پر کتابیں لکھتے رہے، مصیبت نامہ اور الٰہی نامہ جو انکی قابل قدر تصنیفیں ہیں، اسی زمانہ کی تصنیف ہیں، چنانچہ خود لکھتے ہیں،

مصیبت نامہ کاندوہ جہان است　　الٰہی نامہ کاسرار عیان است
بداروخانہ بردہ کردم آغاز　　چہ گویم، زود رستم زین و آں باز

خواجہ صاحب کی تصریحات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف عطار نہیں بلکہ طبیب بھی تھے، اور بڑے زور شور کا مطب تھا، روزانہ پانسو آدمی انکے مطب

ہیں آتے تھے، خسرو نامہ میں لکھتے ہیں،

بہ دارو خانہ پانصد شخص بودند | کہ در ہر روز نبضم مے نمودند
میان آں ہمہ گفت و شنیدم | سخن را بہ ازیں روے ندیدم

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں،

بمن گفت اے بمعنی عالم افروز | چنیں مشغول طب گشتی شب و روز
سہ سال است ایں زماں تا لب بہ بستی | بہ زہد خشک در کنجے نشستی

حقیقت یہ ہے کہ خواجہ صاحب بچپن سے درد آشنا تھے، انکے والد قطب الدین حیدر کے مرید تھے جو مشہور مجذوب گزرے ہیں اور ۵۹۷ھ تک زندہ تھے، جب کہ خواجہ صاحب کی عمر ۸۴ برس کی تھی، خواجہ صاحب نے بچپن ہی میں ان سے فیض حاصل کیا تھا، لیکن چونکہ اسلام رہبانیت کو گوارا نہیں کرتا اور اسی وجہ سے حضرات صوفیہ کو انکے مجاہدات اور ریاضتیں مشاغل دنیوی سے مانع نہیں آتیں، اس لئے خواجہ صاحب نے باوجود فقر اور تصوف کے عطار خانہ اور مطب کا تعلق قائم رکھا، اور متعدد کتابیں اسی حالت میں تصنیف کیں، یہ ممکن ہے کہ اخیر میں جب جذبہ محبت زیادہ بڑھا تو خود بخود اور چیزوں سے دل اُچاٹ ہو گیا، اسی حالت میں فقیر کا واقعہ گزرا، اور اس نے آگ پر روغن کا کام دیا، خواجہ صاحب کی تحریروں سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اس عالم میں انہوں نے مدت تک سیاحی بھی کی، لسان الغیب میں لکھتے ہیں،

چار اقلیم جہاں گردیدہ ام
سر بر آوردہ بہ محبوبے عشق | سیر کردہ مکہ و مصر و دمشق
کوفہ و رے تا خراساں گشتہ ام | سخن دجیحون را بہ بریدہ ام
ملک ہندوستان و ترکستان زمین | رفتہ چوں اہل خطا از سوے چین
عاقبت کردم بہ نیشاپور جاے | اوفتاد از من بعالم ایں صداے
در نشاپورم بہ کنج خلوتے | با خداے خویش کردم وحدتے

ملہ دولت شاہ،

خواجہ صاحب نے اگرچہ بہت سے بزرگوں سے فیض اٹھایا تھا، لیکن جیسا کہ دولت شاہ نے لکھا ہے خرقۂ فقر مجد الدین بغدادی سے حاصل کیا تھا،

مجد الدین بغدادی، قطب الدین خوارزم شاہ کے طبیب خاص تھے، جس زمانہ میں چنگیز خان دنیا کے مرقع کو زیر و زبر کر رہا تھا، خواجہ صاحب نیشاپور میں تھے، نیشاپور کی غارتگری میں ایک مغل نے خواجہ صاحب کو پکڑ کر قتل کر دینا چاہا، برابر سے ایک مغل بولا کہ ہزار روپے پر میرے ہاتھ بیچ ڈالو، خواجہ صاحب نے مغل سے کہا کہ اتنی قیمت پر کبھی نہ بیچنا میرے دام بہت زیادہ ہیں، ایک اور مغل آنکلا، اُس نے کہا اس غلام کو میرے ہاتھ ایک توبڑہ گھاس کے معاوضہ میں فروخت کر دو، خواجہ صاحب نے گرفتار کرنیوالے سے کہا ضرور بیچ ڈالو میری قیمت اس سے کہیں کم ہے، خواجہ صاحب کی اس اختلاف بیانی کو وہ تمسخر سمجھا اور اُن کو قتل کر ڈالا، وہ اس نکتہ کو کیا سمجھ سکتا تھا، کہ واقعی انسان سے بڑھ کر کوئی چیز گراں نہیں، اور نہ اس سے بڑھ کر کوئی چیز ارزاں ہے، لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددناہ اسفل سافلین ۵

مغل نے خواجہ صاحب کو قتل کر دیا، لیکن خواجہ صاحب کا خون خالی نہیں جاسکتا تھا مغل کو انکی عظمت[۲] کا حال معلوم ہوا تو توبہ کر کے ان کے مزار کا مجاور ہو گیا اور مرتے دم تک جدا نہ ہوا،

خواجہ صاحب کی تصنیفات تصنیفات کی یہ تفصیل ہے، اسرار نامہ، الٰہی نامہ، مصیبت نامہ، جوہر الذات، وصیت نامہ، منطق الطیر، بلبل نامہ، حیدر نامہ، گل و ہرمز، سیاہ نامہ، شتر نامہ، مختار نامہ، ان کے علاوہ غزلوں اور رباعیوں کا دیوان ہے، کل اشعار ایک لاکھ سے زیادہ ہیں، فقراء کا ایک تذکرہ لکھا ہے جو تذکرۃ الاولیا کے نام سے مشہور ہے، اور حال میں مسٹر براؤن نے اسکو شائع کیا ہے، عبد الوہاب قزوینی نے جو مسٹر براؤن کے شاگرد ہیں ایک محققانہ دیباچہ لکھا ہے،

کلام پر رائے صوفیانہ شاعری کے چار ارکان ہیں، سنائی، اوحدی، مولانا روم،

---

[۱] ریاض العارفین، [۲] ریاض العارفین ؂

اور خواجہ فریدالدین عطار، خود مولانا روم باوجود ہم رتبگی کے فرماتے ہیں، ع ما از پس سنائی و عطار آمدیم،

ہفت شہر عشق را عطار گشت ــــ ما ہماں اندر خم یک کوچہ ایم

خواجہ صاحب نے تصوف کے جو خیالات ادا کئے ہیں وہ حکیم سنائی سے زیادہ دقیق نہیں لیکن زبان اس قدر صاف ہے کہ اس وصف کا گویا ان پر خاتمہ ہوگیا، ہر قسم کے خیالات اس بے تکلفی روانی اور سادگی سے ادا کرتے ہیں کہ نثر میں بھی اس سے زیادہ صاف ادا نہیں ہو سکتے،

اسکے ساتھ قوت تخیئل بھی اعلیٰ درجہ کی ہے، بہت سے نئے مضامین پیدا کئے ہیں، اور جو پہلے بندھ چکے تھے ان کو ایسے نئے پہلو سے ادا کرتے ہیں کہ بالکل نیا مضمون معلوم ہوتا ہے، مثلاً یہ مضمون کہ، معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد، سقراط، فارابی، بوعلی سینا، الگ الگ طریقہ سے ادا کر چکے ہیں تاہم خواجہ صاحب نے اس کی بالکل صورت بدل دی، فرماتے ہیں،

کاملے گفتہ است می باید بسے ــــ عقل و حکمت تا شود گویا کسے
باز باید عقل بے حد و قیاس ــــ تا شود خاموش یک حکمت شناس

یعنی ایک کامل کا قول ہے کہ بولنے اور تقریر کرنے کے لئے بہت عقل اور حکمت درکار ہے، لیکن چپ رہنے کے لئے اس سے بھی کہیں زیادہ عقل درکار ہے، مطلب یہ ہے کہ انسان انتہائے درجۂ کمال تک پہنچتا ہے، تب جا کر یہ سمجھتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں سمجھا اور اس بنا پر چپ ہو جاتا ہے، اسی خیال کو ایک رباعی میں ادا کیا ہے،

می پنداری کہ جان توانی دیدن ــــ اسرار ہمہ جہان توانی دیدن
ہرگاہ کہ بینش تو گردد بکمال ــــ کورئی خود آن زمان توانی دیدن

وحدت وجود کا مضمون، حد سے زیادہ پامال ہو چکا تھا، تاہم خواجہ صاحب کے پیرائے نئے ہیں،

پرشد از دوست ہر دو کون ولیک ــــ سوئی او زہرۂ اشارت نیست

فغانی نے اسی مضمون کو اُڑایا ہے۔

مشکل حکایتے است کہ ہر ذرّہ عین اوست امانمی تواں کہ اشارت باد کنند

خواجہ صاحب کے اور مختلف طرز ادا دیکھو،

از برائے غریب خود خود گشت جلوہ در قد و در قدم رفتار

تاب در زلف، و وسمہ بر ابرو سرمہ در چشم، و غازہ بر رخسار

رنگ در آب و آب در یاقوت بوئے در مشک و مشک در تاتار

قم باذنی و قم باذن اللہ ہر دو یک نغمہ آمد از لب یار

تو از دریا جدائی دین عجب بین ز تو یک لحظہ ایں دریا جدا نیست

در عشق چو من توام تو من باش یک پیرہن ست گو دو تن باش

خواجہ صاحب کا جو فلسفہ ہے ذیل کے اشعار سے معلوم ہوگا،

عبادت اور وحی کی حقیقت،

روزہ حفظ دل ست از خطرات پس بود با مشاہدہ افطار

حج چہ باشد ز خود سفر کردن بہ کجا؟ جانب ہدایت کار

وحی چہ بود ہر انچہ در دل تو سر زند از نتائج اسرار

انسان اصل حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا،

قرب سی سال بود تا کہ ہمی کندم جان کہ بجاں راہ برم راہ نہ بردم بہ تنم

گرچہ بسیاری رسن بازی فکرت کردہ ام بیش ازیں چیزے نمی دانم کہ سر در چنبرم

وصل تو گنجے است ہم پنہاں ز خود ہر کہ گوید یافتم دیوانہ ایست

بیگانہ شدم ز ہر دو عالم واگہ نہ کہ آشنائے من کیست

چندیں در بستہ بے کلید است چہ سود کس نام کشادن نشنید است چہ سود

پیراہن یوسف ست یک یک ذرّات یوسف ز میانہ ناپدید است چہ سود

نقش تو در خیال و خیال از تو بے بصر نام تو بر زبان و زبان از تو بے خبر

در حقیقت گر قدم خواہی زدن محو گردی تا کہ دم خواہی زدن

ہر آں مینے کہ بشناسد سراز پا | از و دعوے مستی نا پسند است
گر در عشق از عشقت خبر نیست | ترا ایں عشق عشق سودمند است
عشق بتان و خویشتن بفروشش | کہ نگو ترا زیں تجارت نیست
دریں دریا کہ من ہستم نہ من ہستم نہ دریا ہم | نداند ہیچ کس ایں سرا گر آں کو چنیں باشد
ترا در راہ یک یکدم چو معراجیست ؎ حق | زیک یک پایہ برتر می گزر چندانکہ بتوانی
گرفتم در بہشت نسیہ نتوانی رسیدن تو | ولے خود را ازیں دوزخ کہ نقد تست برہانی

اخیر شعر میں ان لوگوں کے خیال کو رد کیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بہشت کوئی چیز نہیں اسکو اُدھار سمجھنا چاہیئے، خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ مانا بہشت اُدھار ہے لیکن یہ تو کرنا چاہیئے کہ اس نقد دوزخ (تفکرات دنیوی) سے نجات ہات آئے،

تو چوں در بند صد چیزی خدا را بندہ چوں گردی | کہ تو در بند ہر چیزے کہ ہستی بندۂ آنی

عالم حقیقت، کفر و اسلام دونوں سے بالاتر ہے،

لب دریا ہمہ کفر ست و در یا جملہ دینداری | ولیکن گوہر دریا ورائے کفر و دیں باشد

انسان ہی میں سب کچھ ہے،

انچہ می جویند بیروں دو عالم سالکان | خویش را یابند چوں ایں پردہ از ہم بر درند
بہ ہمیں دیدہ بنگر ہی ظاہر | صورت خویش را بصورت یار
ہر کہ ایں جا ندیدہ محروم ست | در قیامت ز لذت دیدار
انا لیلے بگو اگر مردے | ورنہ چوں ابلہاں ہری می خوار

وحدت وجود،

جہان از تو پُر و تو در جہان نہ | ہمہ در تو گم و تو درمیان نہ
خموشی تو از گویائی تست | نہائی تو از پیدائی تست
ترا با ذرہ ذرہ راہ بینم | دو عالم ثم وجہ اللہ بینم
دوئی را نیست رہ در حضرت تو
ہمہ عالم توئی و قدرت تو

نکو گوئے نکوگفتہ است در ذات   کہ التوحید اسقاط الاضافات

خدا را جز خدا یک دوست کس نیست   کہ در خورد خدا ہم اوست کس نیست

دریں معنی کہ من گفتم شکے نیست   تو بے چشمی و عالم جز یکے نیست

کمال اسمٰعیل خلّاق المعانی اصفہانی

وفات سنہ ۶۲۶ ہجری

اسمٰعیل نام، اور کمال تخلص تھا، ان کے والد جمال الدین عبد الرزاق مشہور شاعر تھے
انکا پورا دیوان آج موجود ہے، آتشکدہ میں انکے بہت سے اشعار نقل کئے ہیں انکے دو بیٹے
تھے، عبد الکریم، اور اسمٰعیل، عبد الکریم فقیہ تھے، اسمٰعیل نے بھی مذہبی علوم حاصل کئے تھے،
لیکن شاعری کا مذاق خاندانی تھا، اس لئے اسی طرف توجہ کی اور اسی میں کمال پیدا کیا خاندان
صاعدیہ[1] کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، جلال الدین خوارزم شاہ کی مدح میں بھی قصیدہ کہا
ہے جو دیوان میں موجود ہے، لیکن درباروں میں چنداں قدر نہیں ہوئی۔

ایک دفعہ لوگوں نے پوچھا کہ آپ خاندان صاعدیہ کی مدح کرتے ہیں اور سلاطین سے
اعراض کرتے ہیں، بولے کہ صاعدیہ سخن فہم ہیں اُن سے داد سخن ملتی ہے اور میں اسکو صلہ سے
بڑھکر سمجھتا ہوں[2] تاہم چار ناچار سلاطین کی مدح بھی کرتے تھے، بہارستان سخن میں
لکھا ہے کہ جب سلطان سنجر سلجوقی، گرجستان کو فتح کرکے اصفہان میں آیا تو کمال نے
اس کی مدح میں قصیدہ لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے:۔

حجاب ظلم تو برداشتی ز چہرۂ عدل　　　نقاب کفر تو بکشادی از رخ ایمان

بالآخر افسردہ ہو کر ترک تعلقات کیا اور حضرت شہاب الدین سہروردی کے ہاتھ پر بیعت
کی، دیوان میں ایک قصیدہ بھی انکی مدح میں موجود ہے، ایک دفعہ کسی بات پر اہل وطن
سے ناراض ہوئے، اور نظم میں بددعا کی،

اے خداوند ہفت سیارہ　　　بادشاہے فرست خون خوارہ

[1] یہ کوئی شاہی خاندان نہ تھا بلکہ اصفہان کے قضاۃ میں تھے،

[2] بہارستان سخن از شاہ نواز خان مصنف مآثر الامراء۔

تا در و کوه را چو دشت کنند | جوئے خون آورد ز جو بارہ
عدد مرد مان بیفزاید | ہر یکے را کنند بہ صد پارہ

۶۳۵ھ ہجری میں جب او کتائے قاآن، اصفہان میں پہنچا تو قتل عام کا حکم دیا، اس زمانہ میں یہ گوشہ نشین ہو چکے تھے اور شہر کے باہر زاویہ میں رہتے تھے، چونکہ لوگ انکا ادب کرتے تھے اور ان سے کوئی تعرض نہیں کرتا تھا اس لئے لوگ نقدی وغیرہ انکے گھر میں لاکر امانت کے طور پر رکھدیتے تھے، گھر میں ایک کنواں تھا وہ ان امانتوں کا خزانہ بن گیا تھا، شہر کی غارتگری میں ایک ترک اس طرف نکل آیا، اور ایک پرند کو غلیل سے مارنا چاہا، اتفاق سے زرہ گیر اڑ کر کنوئیں میں جا پڑی، ترک کنوئیں میں اترا، زر و جواہر کا انبار دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں، سمجھا کہ اور بھی خزانے گڑے ہونگے، کمال اسمٰعیل کو پکڑ کر پتہ بتاؤ انہوں نے لاعلمی ظاہر کی اُس نے غصہ میں آکر ان کا خاتمہ کر دیا، مرتے وقت یہ رباعی کہی اور اپنے خون سے دیوار پر لکھی،

دل خون شد و شرط جانگدازی این است | در حضرت تو کمینہ بازی این است
با این ہمہ ہیچ دم نمے باید زد | شاید کہ ترا بندہ نوازی این است

ریاض الشعرا میں ایک اور رباعی لکھی ہے، جو کمال نے اس حالت میں لکھی تھی، وہ یہ ہے،

این کشتہ نگر، کمال اسمٰعیل است | قربان شدنش نہ از رہ تخییل است
قربان تو شد کمال اندر رہ عشق | قربان شدن از کمال اسمٰعیل است

ید بیضا میں لکھا ہے کہ ترک کی انگوٹھی گر گئی تھی، اسکے نکالنے کے لئے وہ کنوئیں میں اترا تھا، ید بیضا میں اس واقعہ کا سن ۶۲۶ لکھا ہے،

شاعری

کمال کی شاعری، قدما اور متاخرین کی سرحد ہے، یعنی اسکا ایک سرا قدما اور دوسرا متاخرین سے ملا ہوا ہے، قدما کی متانت، پختگی، استواری اور متاخرین کی مضمون بندی و خیال آفرینی، نزاکت مضمون، دونوں یکجا جمع ہو گئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ متوسطین

سلہ اصفہان کے ایک محلہ کا نام ہے، سلہ یہ تمام حالات آتشکدہ اور دولت شاہ سے ماخوذ ہیں،

اور متاخرین دونوں اُنکے معترف ہیں، خواجہ حافظؒ فرماتے ہیں،

گر باورت نمی شود از بندہ ایں حدیث | از گفتۂ کمال دلیلے بیاورم
گر برکنم دل از تو و بردارم از تو مہر | آں مہر بر کہ افگنم و دل کجا برم

عرفی کہتا ہے،

مرا ز نسبت ہمدردی کمال غم است | وگرنہ شعر چہ غم دارد از غلط خوانی

حزین کے زمانہ میں بحث پیدا ہوئی کہ کمال اور جمال میں سے کس کو ترجیح ہے، لوگوں نے حزیں سے استفتا کیا، اس نے یہ جواب لکھا،

در شعر جمال ارچہ جمالے بجمال است | اما نہ بہ زیبائی افکار کمال است
لفظش بہ صفا آئنۂ شاہد معنی است | یعنی بہ شکوہے سرت کہ طغرائے ہلال ست
صد بار ز سر تا سر دیوانش گزشتم | لیلی ست کہ سر تا بقدم غنج و دلال ست
دریوزہ گر رشحۂ او بیند عریفاں | الحق رگ ابر قلمش بحر نوال ست

کمال اور محقق طوسی ہمعصر ہیں کمال کی بلند پائگی کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہوگی کہ محقق طوسی نے عظمت کے لہجہ میں کمال کا ذکر اپنی کتاب معیار الاشعار میں کیا ہے،

کمال کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

۱- بہت سے نئے نئے مضامین پیدا کئے جن سے متاخرین کی مضمون آفرینیوں کی بنیاد قائم ہوئی ہے، مثلاً،

چوں صبح باز کرد دہن را بوصف او | چرخش درست مغربی اندر دہان نہاد

(اشرفی)

جب صبح نے بادشاہ کی تعریف میں منہ کھولا تو آسمان نے اسکے صلہ میں اس کے منہ میں اشرفی ڈالدی،

افگند چار نعل ہلالی، آسمان دو بار | تا بار کاب خواجہ عناں بر عناں نہاد
بیروں فگند چرم تراز د زبان زکام | از بسکہ بار جود بر دبیکران نہاد

۲- نہایت مشکل مشکل طرحیں کرتے ہیں اور ان میں نئے نئے مضمون پیدا کرتے ہیں مثلاً

در گرد عزم او نہ رسد برق گرم رو | وز آتشش بود بہ مثل چوں شرار پائے
از بیم ہمت تو بر آرم چو مور پر | از فرط عجز، اگرچہ ندارم چو مار پائے

ترسم کہ چوں دراز شد ایں شعر ہیچکس — در گوش خویش جانہ دہد چوں ہزار پائے
کھنکھجورا

ایک بڑا سیر حاصل قصیدہ لکھا ہے، جس کی ردیف برف ہے،

ہرگز کسے ندید بدنیساں نشان برف — گوئی کہ لقمہ ایست زمین در دہان برف
مانند پنبہ دانہ کہ در پنبہ تعبیہ است (پوشیدہ) — اجرام کوہ گشتہ نہاں در میان برف

۳- زبان کی صفائی اور سلاست کی حد جو ظہیر فاریابی پر ختم ہو چکی تھی، **کمال** نے اس سرحد کو اور آگے بڑھایا، مثلاً،

سپیدہ دم کہ نسیم بہار مے آید — نگاہ کردم و دیدم کہ یار مے آید
شراب در سر و چہرہ ز شرم رنگ آمیز — چنیں میانۂ شرم و عقار مے آید
رخش چو شاخ درخت بہشت و گل از آں — کہ می بچیدم، دیگر ببار مے آید

اُسکا چہرہ، بہشت کا درخت تھا کہ جو پھول میں چنتا تھا، اُس کی جگہ دوسرا نکل آتا تھا،

زبسکہ داشت دل خستہ بستہ در فتراک — چناں نمود مرا کز شکار مے آید
گرفتمش ہمہ رہ در حدیث و او گہ گہ — بقدر حاجت، پاسخ گزار مے آید

میں نے اسے باتوں میں لگایا اور وہ بھی کبھی کبھی بقدر ضرورت جواب دیتا جاتا تھا،

ہر آں فریب کہ از عشوہ بست در کارم — مراز سادہ دلی، استوار (یقین) مے آید
مراغرور کہ تشریف می دہد، او خود — برائے خدمت صدر کبار مے آید

ایک قصیدہ میں ممدوح کی لیت و لعل کرنے کی شکایت ہے، ردیف ہیچ ہے اور کس روانی سے ہر جگہ ادا ہوتی ہے،

صدرا روا مدار کز انعام خود مرا — محروم ماندہ داری و آں را بہانہ ہیچ
ہر روز بامداد کنم رو بہ در گہت — یک دل پر از امید و پس آنگہ شبانہ ہیچ
چندیں ہزار تیر معانی ز شست طبع — کردم گشاد، و ماند از و بر نشانہ ہیچ
پنجاہ سال خدمت ایں خانہ کردہ ام — و امروز نیست بہرہ من جز فسانہ ہیچ
گر مستحق ہیچ نیم من، بدیں ہنر — پس نیست مستحق عطا، در زمانہ ہیچ
از طالعست اینکہ من و آفتاب چرخ — مشہور عالمیم و بر آں آستانہ ہیچ

زانم نمیدہی کہ ترا در خزانہ نیست یعنی کریم را نبود در زمانہ ہیچ
بر منہج امید من از وعدہائے تو دامے است بس شگرف دوران دام دانہ ہیچ

آگے اور عنوانوں کے نیچے جو اشعار آئینگے ان میں صفائی زبان کی خصوصیت پر بھی لحاظ رکھنا چاہیے،

۴۔ شاعری پر سب سے بڑا احسان کمال کا یہ ہے کہ شاعری کی ایک صنف یعنی ہجو اور ظرافت جو انوری اور سوزنی وغیرہ کی وجہ سے پچوں کی زبان بن گئی تھی، کمال نے اسکو نہایت لطیف اور پرمزہ کر دیا، اگرچہ بہتر تو یہی تھا کہ یہ بیہودہ صنف سرے سے اڑا دی جاتی لیکن ہجو شعرا کا ایک بڑا آلہ تھا جس سے انکے معاش کو تعلق تھا، اس لئے وہ اس سے بالکل دست بردار نہیں ہو سکتے تھے، امرا اور سلاطین، جب صلہ کے دینے میں لیت و لعل کرتے تھے تو کمال ہجو اور ظرافت سے کام لیتا تھا لیکن اس طرح کہ خود اس شخص کو مزہ آئے جس کی ہجو لکھی گئی ہے، ایک دفعہ گھوڑے کے زین و لگام، اور دانہ گھاس کے لئے ممدوح سے درخواست کی، دیکھو کس ظریفانہ پیرائے میں اس مطلب کو ادا کیا ہے،

دوش خربندہ (سائیس) کرد پیشم یاد کاسپک خواجہ، زندگی بتو داد
تنگ دل گشتم از رہ خبرش کہ جوان بود و زیرک و استاد
گرچہ غمگین شدم ز واقعہ اش گشتم الحق ازاں سیکے دلشاد
کہ شنیدم کہ او بہ وقت وفات بہ وصیت لب و دہاں بکشاد
از جو و کاہ (گھاس) از جل (زین) و افسار (لگام) ہرچہ بُد، در وجوہ خیر نہاد (یعنی خیرات کیا)
در چناں وقت ایں چنیں توفیق ہمہ جانور خدا بدہاد
واجبم گشت تعزیت نامہ بتو اے سرور کریم نہاد
بر تو فرض است حق گزاری او زانکہ در خدمتت بسے استاد
مستحق تر ز اسپ من نبود گر وصیت ہمی کنی انفاد (جاری کرنا)
ہیچ تاخیر بر نتابد خیر زود تعجیل کن کہ خیرت باد

یعنی کل سائیس نے مجھ سے یہ خبر بیان کی کہ حضور کا گھوڑا مر گیا، مجھکو سخت رنج ہوا

لیکن اس خیال سے خوشی بھی ہوئی کہ اس نے مرتے وقت وصیت کی اور جو کچھ اسکے پاس ساز و سامان تھا سب خیرات کر دیا، ایسی توفیق خدا سب کو دے، بہرحال آپ پر اسکا بڑا حق ہے اور آپ کو اس کی وصیت پوری کرنی چاہیئے، لیکن اس وصیت کا مستحق امیر کے گھوڑے سے بڑھ کر کوئی نہیں"

ایک بخیل کی ہجو کی ہے،

دی مرا گفت دوستے کہ مرا با فلاں خواجہ از پے دو سہ کار

سخنے (کل) چند ہست واز پے آں خلوتے مے ببایدم ناچار

خلوتے آں چناں کہ اندر وے ہیچ مخلوق را نباشد بار (گذرا)

گفتم ایں فرصت ار توانی یافت وقت نان خوردنش نگہ مے دار (خیال، طمع)

یعنی مجھ سے کل ایک دوست نے کہا کہ فلاں رئیس سے مجھ کو کچھ مخفی کام ہے اس لئے میں ایسی تنہائی کا موقع چاہتا ہوں، کہ اس وقت اُنکے پاس کوئی نہ ہو، میں نے کہا ایسا موقع صرف اُن کے کھانے کے وقت مل سکتا ہے.

ایک اور بخیل کی ہجو میں لکھتے ہیں،

ز مرد فانی باور کنم اگر گوید، کہ من بخانۂ خود می خورم طعام حلال

نہ آنکہ مال حلالست مرد فانی را کدام مال کرا داردہ کدام حلال

ولے ز ممسکی آنگاہ مال خویش خورد کز اضطرار مرا دار اشود حرام حلال

یعنی فلاں شخص اگر کہے کہ میں اکل حلال کھاتا ہوں تو میں یقین کر لونگا لیکن نہ اس بنا پر کہ درحقیقت اسکا مال پاک اور حلال ہے، بلکہ اسوجہ سے کہ وہ کھانا اتنی دیر کے بعد کھاتا ہے، جبکہ مردار بھی حلال ہو جاتا ہے (کم سے کم تین دن کے بعد)

ایک اور بخیل کی ہجو،

بدہن نان خواجہ چوں بردم خواجہ گفتا کہ آہ من مردم

گفتمش خواہ میر و خواہ ممیر کہ من ایں لقمہ را فرو بردم

کسی نے کمال کو بُرا کہا تھا، اسکے جواب میں کہتے ہیں،

شخصے بدما بہ خلق مے گفت | ما از بد او نے خبراشیم
ما نیکی او بخلق گفتیم | تا ہر دو، دروغ گفتہ باشیم

محقق طوسی کا یہ مشہور قطعہ،

نظام بے نظام ار کافرم خواند | چراغ کذب را نبود فروغے
مسلمانان خوانمش زیرا کہ نبود | سزاوار دروغے جز دروغے

اسی قطعہ سے ماخوذ ہے۔

ایک رئیس سے صلہ کا تقاضا کیا ہے اور کس قدر لطیف پیرایہ اختیار کیا ہے،

سہ شعر رسم بود، شاعران طامع را | یکے مدیح، دوم قطعہ تقاضائی
اگر بداد، سوم شکر، ور ندا، ہجا | ازیں سہ بیت، دو گفتم، دگر چہ فرمائی

یعنی شعراء پہلے مدح لکھتے ہیں پھر صلہ کی یاد دہانی کے لئے ایک نظم لکھتے ہیں، اب اگر ممدوح نے صلہ عنایت کیا تو شکریہ لکھتے ہیں ورنہ ہجو، میں ان تینوں نظموں سے دو لکھ چکا ہوں، تیسری کی نسبت کیا ارشاد ہوتا ہے،

غزل کی نسبت یہ مسلّم ہے کہ سب سے پہلا خاکہ کمال ہی نے قائم کیا ہے جسکو شیخ سعدی نے اس قدر ترقی دی کہ موجد بن گئے، خان آرزو مجمع النفائس میں فغانی کے تذکرہ میں لکھتے ہیں،

قدما را در غزل طرز بود بسیار سادہ، چوں نوبت بہ کمال الدین اسمٰعیل رسید، اور نگے دیگر داد، بعد از و شیخ سعدی و خواجو نمکے دیگر ریختند،

کمال نے غزل میں سادگی اور صفائی کے ساتھ رنگینی اور جدت مضمون بھی پیدا کی جس کا اندازہ ان مثالوں سے ہوگا،

دوش بگذشتم و دشنام ہمیداد مرا | خدمتش کردم و پند اشرت کہ من نشنیدم

کل میں اُدھر سے گذرا تو وہ مجھکو گالیاں دے رہا تھا، میں نے اُسکو سلام کیا اور وہ سمجھا کہ میں نے گالیاں نہیں سُنیں

گرچہ لعلش بہ سر ناخوشی آنہا میگفت | من ازاں خوشتر ازو ہیچ سخن نشنیدم

ملہ یہ اشعار انوری کی طرف بھی منسوب ہیں،

اسکے ہونٹھ اگرچہ بری طرح گالیاں دیے رہے تھے لیکن میٹھے اس سے زیادہ خوش مزہ کوئی بات آجتک نہیں سنی،

زمستان راست اندازی ندارد چشم کس ہرگز — مگر چشمش کہ چوں شد مست ناوک بہتر اندازد

مست آدمی اچھی طرح تیر اندازی نہیں کرسکتا، لیکن اسکی آنکھیں مستی میں اور زیادہ ٹھیک نشانہ لگاتی ہیں،

چو اندازد بمن تیرے، کنم در سینہ پنہانش — بداں تا از پئے ہر تیر تیرے دیگر اندازد

از چشم نیم خواب تو امروز روشن است — آں نالہ ہا کہ در غم تو دوش کردہ ایم

بود ہمیشہ جان من رسم تو بے گنہ کشی، — ہیچ نمی کشی مرا، من چہ گناہ کردہ ام؛

زبان کی سادگی دیکھو،

روئے زاں خوبتر تواند بود؟ — ہاں بگوئید اگر تواند بود

آنچناں نازک وچناں شیریں، — لب نباشد، شکر تواند بود

دل خود طلب چو کردم بر نرگس تو، گفتا — بر والے فلان وبہمان برمن چہ کار دارد

چو پے بگفتم اورا بکرشمہ گفت بامن — سر گفتگو ندارم، کہ مرا خمار دارد

(مجھے خمار ہے)

چہ دہی صداع مستان چہ کنی حدیث چیزے — کہ کمینہ ہندوے من بہ ازیں ہزار دارد

(تکلیف) (غلام)

نخستم دل بدام اندر کشیدی — پس آنگاہم، قلم بر سر کشیدی

بقصد جان چوں من ناتوانے — ز روم و ہند وچین لشکر کشیدی

پراگندہ ہمہ غمہائے عالم — ز بہر من، بہ یک دیگر کشیدی

اگرچہ آستین برمن فشاندی — دگر چہ دامن از من در کشیدی

نہ خواہد رفت از یادم کہ بامن — تو شبے تا صبحدم ساغر کشیدی

رباعی — رباعی کو جس قدر کمال نے ترقی دی، قدما، اور متوسطین میں اُس کی نظیر نہیں مل سکتی،

گل خواست کہ چوں رخش نکو باشد ونیست — چوں دلبر من برنگ وبو باشد ونیست

صدر روے فراہم آورد در سالے — باشد کہ یکے چو روے او باشد ونیست

(شاید)

گرلاف زنم کہ یار خوشنود ست، نہ   بامابہ وفا و عہد نیکوست، نہ
زیں نادرہ تر کہ از برائے تو مرا   شہرے ہمہ دشمن اند و تو دوست، نہ

در دیدۂ روزگار نم بایستے   یا با غم او صبر بہم بایستے
یا مایۂ غم چو عمر کم بایستے   یا عمر بہ اندازۂ غم بایستے

یار آمد و دوشش کردمش مہمانے   ہر چیش گفتم نہ کرد، نافرمانے
مے خورد و بخفت و دست در را بستم   دانگاہ بہ او، چہ کردہ باشم دانے

شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی

مصلح الدین لقب اور سعدی تخلص تھا، انکے والد اتابک سعد بن زنگی بادشاہ شیراز کے ملازم تھے اس تعلق سے شیخ نے سعدی تخلص اختیار کیا[1]۔

سال ولادت معلوم نہیں، وفات کی نسبت سب متفق ہیں کہ ۶۹۱ھ میں ہوئی عمر مدت تمام تذکروں میں ۱۰۲ برس کی لکھی ہے لیکن اس حساب سے سال ولادت ۵۸۹ھ ہوگا شیخ نے تصریح کی ہے کہ وہ ابوالفرج ابن جوزی کے شاگرد ہیں اور غالباً یہ وہ زمانہ ہوگا جب شیخ بغداد میں تحصیل علم کے لئے آئے ہیں ابن جوزی نے ۵۹۷ھ میں وفات پائی شیخ کی ولادت اگر ۵۸۹ھ میں مانی جائے تو ابن جوزی کی وفات تک انکی عمر کل ۹ برس کی ہوگی اور یہ کسی طرح صحیح نہیں بعض تذکروں میں شیخ کی عمر ۱۲۰ برس لکھی ہے اگر یہ خارج از قیاس عمر تسلیم کر لی جائے تو اور واقعات کی کڑیاں ملجائینگی لیکن ایک سخت دقت پھر باقی رہتی ہے وہ یہ کہ شیخ نے گلستان میں لکھا ہے کہ جس زمانہ میں سلطان محمود خوارزم شاہ نے ختا سے صلح کی میں کاشغر میں آیا۔

سلطان محمود ۵۸۹ھ میں مر لیے اس لئے اس زمانہ میں انکی عمر ۱۰ برس کی ہوگی لیکن واقعات اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کی شاعری درکمال انہوں نے کم سے کم ۴۰، ۳۰ برس کی عمر میں شہرت پائی ہے، اسلئے یا تو شیخ نے غلطی سے علاءالدین تکش خوارزم شاہ کے بجائے محمود خوارزم شاہ کا نام لکھ دیا ہے، یا انکی شاعری کی شہرت ان کے شباب ہی میں ہو چکی ہوگی۔

شیخ کے بچپن کے حالات اگرچہ کسی تذکرہ نویس نے قلمبند نہیں کئے

---

[1] مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے حیات سعدی میں سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھا دیا اسکے بعد کچھ لکھنا بے فائدہ ہے لیکن بعض تعلیم یافتہ دوستوں نے حد سے زیادہ اصرار کیا اور آخر مجبوراً لکھنا پڑا[2]

[2] تذکرہ دولت شاہی

لیکن خود شیخ کے بیانات سے بہت سی دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں،
شیخ کے والد نے شیخ کو جب پڑھنے کیلئے بٹھایا تو لکھنے کی تختی، کاغذ اور ایک طلائی انگوٹھی خرید کر دی، یہ اس وقت اس قدر کمسن تھے کہ کسی نے مٹھائی دیکر ان سے انگوٹھی اڑالی، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

زعہد پدر یاد دارم ہمے | کہ باران رحمت بر و ہر دمے
کہ در طفلیم لوح و دفتر خرید | زبہرم یکے خاتم زر خرید
بدر کرد ناگہ یکے مشتری | بشیرینی از دستم انگشتری

شیخ کے والد شیخ کو مزید محبت اور تربیت کے خیال سے ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے ایک دفعہ عید گاہ میں ان کو ساتھ لیکر چلے، ہاتھ میں دامن پکڑا دیا تھا کہ ساتھ سے الگ نہ ہو جائیں، راستہ میں بچے کھیل رہے تھے یہ دامن چھوڑ کر ان میں جا ملے اور باپ کا ساتھ چھوٹ گیا، کشمکش اور ہجوم میں باپ کی صورت نظر نہ آئی تو گھبرا کر رونے لگے اتفاق سے باپ نے دیکھ لیا، کان پکڑ کر کہا احمق! تجھ سے کہا نہ تھا کہ دامن نہ چھوڑنا، اس قسم کے واقعات ہر بچہ کو پیش آتے ہیں، لیکن اس سے یہ پاکیزہ نتیجہ نکالنا کہ

تو ہم طفل راہی بہ سعی اے فقیر | برو دامن پیر دانا بگیر

شیخ کا کام ہے،

ان کے باپ انکی تربیت اس طرح کرتے تھے جس طرح ایک عارف سالک مرید کو تزکیہ نفس کی منزلیں طے کراتا ہے، وہ بات بات پر انکو ٹوکتے تھے اور ان کی غلطیوں پر تنبیہ کرتے تھے، انکے اثر سے شیخ کو بچپن ہی میں زہد و عبادت کا چسکا پڑ گیا تھا، ایک دفعہ حسب معمول باپ کی صحبت میں رات بھر جاگے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہے گھر کے اور آدمی غافل سو رہے تھے، ان کو خیال آیا، باپ سے کہا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ کیسے بیخبر سو رہے ہیں، کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ اٹھ کر دو رکعت نماز پڑھ لے، باپ نے کہا جان پدر! اگر تم بھی سو رہتے تو اس سے بہتر تھا کہ لوگوں کی غیبت کر رہے ہو،

بچپن میں جب انکو وضو کرنا نہیں آتا تھا محلہ کے ایک مولویصاحب سے روزہ اور نماز سیکھنی شروع کی مولویصاحب نے وضو کرکے سب آداب وسُنن سکھا کر یہ بھی بتایا کہ روزہ میں دوپہر ڈھلنے کے بعد مسواک کرنا منع ہے، پھر کہا کہ ان فرائض کو مجھ سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں جانتا ہوگا، گاؤں کا رئیس بالکل بڈھا پھوس ہو گیا ہے، رئیس نے سُنا تو کہلا بھیجا کہ

نہ مسواک در روزہ گفتی خطا است   بنی آدم مردہ خوردن روا است

یعنی تم نے خود بتایا کہ روزہ میں مسواک کرنا منع ہے لیکن کیا مردہ کا گوشت کھانا (غیبت کرنا) جائز ہے،

شیخ کے باپ نے انکے بچپن ہی میں وفات پائی اور جس ناز و نعم سے پل رہے تھے وہ سامان جاتے رہے، خود کہتے ہیں،

من آنگہ سر تاجور داشتم   کہ سر در کنار پدر داشتم
اگر بر وجودم نشستے مگس   پریشاں شدے خاطر چند کس
کنوں دشمناں گر برندم اسیر   نباشد کس از دوستانم نصیر
مرا باشد از درد طفلاں خبر   کہ در طفلی از سر برفتم پدر

لیکن انکی والدہ ان کی جوانی تک زندہ رہیں اور ان سے بھی انکو اخلاقی سبق ملتے رہتے تھے، گلستان میں لکھا ہے،

وقتے از جہل جوانی بانگ بر مادر زدم، دل آزردہ بہ کنجے نشست و گریاں ہمیگفت مگر خوردی را فراموش کردی کہ درشتی میکنی (باب ششم)

طالبعلمی

شیراز میں اگرچہ تحصیل علم کا ہر قسم کا سامان مہیا تھا، سیکڑوں علما و فضلا درس و تدریس میں مشغول تھے، اسکے علاوہ اتابک مظفر الدین تکلہ بن زنگی المتوفی ۵۹۱ھ کا مدرسہ موجود تھا، لیکن اس زمانہ میں تحصیل کمال کیلئے ممالک دور و دراز کا سفر اور مشہور درسگاہوں میں حاضر ہونا لازمی امر خیال کیا جاتا تھا، اس زمانہ میں سب سے بڑا مدرسہ جس کو یونیورسٹی کہہ سکتے ہیں نظامیہ بغداد تھا، شیخ نے نظامیہ میں تحصیل علم شروع کی اور جیسا کہ عام طریقہ تھا

مدرسہ سے کچھ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا، یہ پتہ نہیں چلتا کہ نظامیہ میں انہوں نے کس
سے تحصیل علم کی، ان قرائن سے کہ شیخ نے ابن جوزی کی شاگردی کی ابن جوزی بغداد
میں رہتے تھے، شیخ نظامیہ میں حدیث پڑھتے تھے، لوگوں نے نتیجہ نکالا ہے کہ شیخ نے
نظامیہ میں ابن جوزی ہی کے آگے زانوے شاگردی تہ کیا، لیکن مدرسین نظامیہ کی
فہرست میں ہم ابن جوزی کا نام نہیں پاتے بے شبہ ابن جوزی بغداد میں حدیث کا
درس دیتے تھے، لیکن اپنے مکان پر دیتے ہونگے، نظامیہ سے انکا تعلق ثابت نہیں ہوتا،
یہ عجیب بات ہے کہ ابن جوزی کا اثر شیخ کی تعلیم پر نہیں پڑا، ابن جوزی ان محدثین
میں شمار کئے جاتے ہیں جو حدیث اور روایت میں نہایت سخت احتیاط سے کام لیتے تھے
اور مشتبہ اور ضعیف روایتوں کو بالکل ترک کر دیتے تھے، لیکن شیخ اتفاق سے کہیں
کوئی حدیث ذکر کرتے ہیں تو عموماً ضعیف اور مصنوعی ہوتی ہے، مثلاً

سزد گر بدورش بنازم چناں   کہ سید بدوران نوشیرواں

یا مثلاً لی مع اللہ وقت لا یسعہ ملک مقرب الخ

یا مثلاً حضرت ابوہریرہ کی حدیث زر غباً الخ

یا مثلاً طبیب فارس کی حدیث وغیرہ وغیرہ،

شیخ کی تحصیل علمی کا وہ زمانہ ہے جب اتابکان فارس کے سلسلہ میں سے سعد زنگی
تخت حکومت پر متمکن تھا، وہ نہایت عادل اور صاحب جبروت حکمران تھا، لیکن معلوم
نہیں کیا اسباب تھے کہ شیخ کو شیراز میں امن و آسایش سے رہنا نہیں نصیب ہو سکتا
تھا، چنانچہ خود کہتے ہیں،

سعدیا حب وطن گرچہ حدیثے ہست صحیح   نتواں مرد بسختی کہ من آں جا زادم

غرض شیخ نے تحصیل علم سے فارغ ہو کر سیر و سیاحت شروع کی اور ایک مدت دراز
تک سفر کرتے رہے جس کی مدت عام تذکرہ نویس ۲۰ برس لکھتے ہیں[1]،
سیر و سیاحت کی غرض مختلف ہوتی ہے اور جو غرض پیش نظر ہوتی ہے سیاح اسی

---

[1] جامع التواریخ صفحہ ۳۰۰

حیثیت سے تمام چیزوں کو دیکھتا ہے بلکہ تمام چیزیں اُسی حیثیت سے خود اسکی نظر میں

سفر و سیاحت

جلوہ گر ہوتی ہیں، شیخ میں کثرت سے مختلف حیثیتیں جمع تھیں، وہ شاعر تھے، صوفی تھے، فقیہ تھے، واعظ تھے، حسن پرست تھے، رند تھے، شوخ طبع تھے، اس لئے اُنھوں نے تماشا گاہ عالم کو ہر پہلو سے دیکھا۔

وہ کبھی زہد و ریاضت کے عالم میں حج و زیارت کیلئے بڑے بڑے سفر کرتے ہیں نہایت دشوار گزار اور چٹیل صحراؤں میں پیادہ پا سیکڑوں کوس چلے جاتے ہیں رات رات بھر کی متصل پیادہ روی سے تھک کر چور ہو جاتے ہیں اور عین راستہ میں پتھریلی زمین پر پڑ کر سو جاتے ہیں، کبھی نفس کشی کیلئے بیت المقدس میں کاندھے پر مشک رکھ کر سقائی کرتے ہیں، لوگوں کو پانی پلاتے پھرتے ہیں، کبھی کسی صاحبدل درویش کا تذکرہ سن کر اسکی زیارت کیلئے روم پہنچتے ہیں کبھی انبیا کے مزارات پر اعتکاف کرتے ہیں جمعہ کا دن ہے نماز کو جانا چاہتے ہیں لیکن پاؤں میں جوتی نہیں دل میں شکایت پیدا ہوتی ہے، دفعۃً ایک شخص پر نظر پڑتی ہے جسکے سرے سے پاؤں ہی نہیں، صبر آجاتا ہے اور سمجھ جاتے ہیں، کہ صبر و رضا کی تعلیم ہے،

ایک دفعہ لوگوں کی صحبت سے تنگ آکر بیت المقدس کے صحرا میں بادیہ نوردی شروع کی، اتفاق سے عیسائیوں نے پکڑ لیا اور طرابلس (ٹرپولی) میں خندق کھودنے کے کام پر لگا دیا، بہت پریشان ہوئے لیکن مجبور تھے، اتفاق سے ایک قدیم دوست کا اُدھر گزر ہوا، پوچھا خیر ہے؟ فرمایا،

همی گریختم از مردمان بکوه و به دشت   که از خدای نبودم به دیگری پرداخت
قیاس کن که چه حالت بود درین ساعت   که در طویلهٔ نامردمم بباید ساخت

یعنی جو شخص آدمیوں سے بھاگتا پھرتا تھا جب جانوروں میں پھنس جائے تو اسکی کیا حالت ہوگی دوست کو رحم آیا، فدیہ دیکر اُن کو چھڑا لیا، اور اپنے ساتھ حلب میں لائے، مزید عنایت سے سو اشرفی مہر پر اپنی بیٹی کے ساتھ شادی کر دی لیکن صاحبزادی نہایت شوخ اور زباندراز تھیں شیخ سے ہمیشہ ان بن رہتی تھی ایک دن کہنے لگیں تم اپنی حق

بھول گئے تم وہی تو ہو کہ میرے باپ نے دس دینار دیکر تمکو چھڑایا تھا، شیخ نے کہا ہاں دس دینار دیکر چھڑایا لیکن سو دینار کے عوض پھر گرفتار کرا دیا،

شیخ نے تصوف و سلوک کی تعلیم شیخ شہاب الدین سہروردی المتوفی ۶۳۲ھ سے حاصل کی، اسی سیاحت کی بدولت سفر دریا میں انکا ساتھ ہوا اور انکی فیض صحبت سے شیخ نے تزکیہ نفس کے مراتب طے کئے، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

مرا پیر دانائے فرخ شہاب — دو اندرز فرمود بر روئے آب
یکے آنکہ بر خویش خودبین مباش — دگر آنکہ بر غیر بدبین مباش

ایک دفعہ بعلبک کی جامع مسجد میں وعظ کہہ رہے تھے اور نحن اقرب الیہ من حبل الورید کا نکتہ بیان فرما رہے تھے، کسی پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا تاہم یہ اپنے عالم میں مست تھے اور یہ شعر زبان پر تھا،

دوست نزدیک تر از من بمن است — وین عجب تر کہ من از وے دورم
چکنم با کہ توان گفت کہ او — در کنار من و من مہجورم

اتفاق سے کوئی صاحبدل آنکلے انہوں نے بیساختہ نعرہ مارا، انکے اثر سے مجلس کی مجلس گرما گئی، شیخ کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ دوران باخبر در حضور و نزدیکان بے بصر دور، ایک دفعہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے قاضی کے دربار میں گئے اور اونچی صف میں جا کر بیٹھے قاضی صاحب نے تیز نگاہوں سے دیکھا، اور میر دربار نے جو لوگوں کو حسب مدارج بٹھانے پر مامور تھا ان کے پاس آکر کہا،

ندانی کہ برتر مقام تو نیست — فروتر نشین یا برو یا بایست

بیچارے وہاں سے اٹھکر صف پائیں میں آکر بیٹھے، تھوڑی دیر کے بعد حسب معمول کسی فقہی مسئلہ پر بحث چھڑی اور ہر طرف سے شور و غل کی آوازیں بلند ہوئیں لیکن کوئی شخص کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہتا تھا کہ سب اسکے سامنے سر جھکا دیں، شیخ کو اظہار کمال کا موقع ملا، صف پائیں سے للکار کہا،

کہ برہان قوی باید و معنوی — نہ رگہائے گردن بحجت قوی

لوگوں نے انکی طرف توجہ کی انہوں نے اس خوبی سے اس مسئلہ کو سلجھا کر ادا کیا کہ سب مان گئے، یہانتک کہ خود قاضی حب صدر مجلس سے اٹھے اور اپنی پگڑی، اتار کر انکے سر پر رکھدی،

اُس زمانہ میں اتنا انصاف بھی تھا آج کا دن ہوتا تو کوئی اُنکی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا،

اسکندریہ کے مشہور قحط میں جس میں لوگ بھوک کے مارے آدمی کو زندہ بھون کر کھا جاتے تھے، ایک دولتمند مخنث نے اپنا خوان کرم اس قدر وسیع کر رکھا تھا کہ کسی شخص کے لئے روک نہ تھی شیخ اس زمانہ میں اسکندریہ ہی میں تھے انکے دوستوں نے ان سے کہا کہ مخنث کی دعوت میں چلنا چاہیئے، انکی خودداری نے گوارا نہ کیا اور کہا،

نہ خورد شیر، نیم خوردۂ سگ ور ز سختی بمیرد اندر غار

شیخ کی آزادہ روی اور تجرد کے لحاظ سے بظاہر قیاس ہوتا ہے کہ انہوں نے اہل و عیال کا جھگڑا انہیں خریدا ہوگا لیکن تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ انہوں نے اس تجربہ گاہ کی بھی سیر کی ایک دفعہ تو وہی مجبوری کا تعلق اختیار کرنا پڑا تھا جسکا ذکراوپر گذر چکا دوسری دفعہ صنعاء یمن کا صدر مقام، میں نکاح کا اتفاق ہوا، اور اس سے اولاد ہوئی، لیکن بچپن ہی میں جاتی رہی، باوجود آزادی کے شیخ کو اسکا بہت صدمہ ہوا چنانچہ خود بوستان میں فرماتے ہیں،

بہ صنعا درم طفلے اندر گذشت چہ گویم کزانم چہ بر سر گذشت

یہانتک حواس باختہ ہوئے کہ قبر کا ایک تختہ اکھاڑ کر لخت جگر کو دیکھنا چاہا، لیکن ہولناک منظر دیکھ کر کانپ اُٹھے، اور غشی سی طاری ہوگئی، ہوش میں آئے تو فرزند دلبند نے زبان حال سے کہا،

شب گور خواہی منور چو روز ازینجا چراغ عمل بر فروز

جس زمانہ میں سلطان خوارزم شاہ نے خطا والوں سے صلح کرلی، شیخ کاشغر میں

حالانکہ ہاتھی دانت کو ہندو پاک نہیں سمجھتے اس لئے اُس کا بُت نہیں بنا سکتے، برہمنوں کو لکھا ہے کہ وہ پاژند پڑھتے تھے،

فتادند گبران پاژند خوان ۔۔۔ چو سگ با من از بہر آں استخوان

حالانکہ پاژند ہندوؤں کی کتاب نہیں بلکہ پارسیوں کا صحیفہ ہے، برہمنوں کو کہیں گبر اور کہیں مطران کہتے ہیں،

پس پردہ مطران آذر پرست

حالانکہ مطران عیسائیوں کے پادری کو کہتے ہیں، پھر مطران کو آذر پرست کہنا اور بھی لغویت ہے، ان جزئیات کے سوا اصلی واقعہ بھی نہایت دوراز قیاس ہے، شیخ کتنی ہی بت پرستی کرتے لیکن یہ ناممکن تھا کہ ایسے عظیم الشان بتخانہ میں تمام برہمن اور پجاری اکیلے انکے ہاتھ میں بت خانہ چھوڑ کر باہر نکلجاتے اور انکو یہ موقع ملتا کہ چاروں طرف کے دروازے بند کر کے جو چاہتے کرتے،

حقیقت یہ ہے کہ یہ تازہ ولایت تھے خدا جانے کس چیز کو کیا سمجھے اور کس واقعہ کو کیونکر لکھ گئے، اکثر انگریز سیاحوں کا یہی حال ہے دو چار دن ہندوستان میں رہ کر سفرنامے لکھتے ہیں جنکو پڑھ کر ہندوستانیوں کو غور کرنا پڑتا ہے کہ یہ کس ملک کی داستان ہے شیخ نے اس حکایت کے خاتمہ میں لکھا ہے کہ سومنات سے میں ہندوستان میں آیا، غالباً اس زمانہ میں ہندوستان خاص دہلی کو کہتے ہونگے، لیکن شیخ نے کچھ زیادہ تصریح نہیں کی اور نہ کہیں سے پتہ لگتا ہے کہ کہاں تک پہنچے تھے،

شیخ نے جب سیاحت شروع کی تو فارس میں اتابکان سلغری کی حکومت تھی، یہ سلسلہ بھی اور سلسلوں کی طرح سلجوقیوں کا دست پرور تھا، اس سلسلہ کا پانچواں حکمران سعد زنگی شیخ سعدی کا ہمعصر تھا، لیکن اسکے اخیر زمانہ تک سعدی وطن میں نہیں آئے صاف نہیں کھلتا کہ اسکے اسباب کیا تھے، لیکن شیخ کی بعض تلمیحات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کو اس زمانہ میں امن وامان کی طرف سے اطمینان نہ تھا، سعد زنگی نے ۶۲۳ھ میں وفات پائی، اسکے بعد اسکا بیٹا اتابک ابو بکر بن سعد زنگی تخت نشین ہوا، وہ نہایت

شان و شوکت کا بادشاہ تھا، فارس کی حکومت جو دو برس سے تاراج گاہ بن رہی تھی اسکے زمانہ میں عروس رعنا بن گئی، ہر طرف نظم و نسق قائم ہو گیا، جا بجا مدرسے اور درسگاہیں کھل گئیں، علماء و فضلا و شعراء دور دور سے کھنچ آئے، شیخ ہمیشہ وطن کے شوق میں بیتاب رہتے تھے، اور وطن پہنچنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے، چنانچہ ایک قصیدہ میں لکھتے ہیں،

چہ خوش سپیدہ دمے باشد آنکہ بینم باز ‌ ‌ ‌ رسیدہ بر سر اللہ اکبر[1] شیراز

نہ لائق ظلمات ست باللہ ایں اقلیم ‌ ‌ ‌ کہ تختگاہ سلیمان بدست و حضرت راز

اب جو امن و امان کی طرف سے اطمینان ہوا تو شام سے عراق ہو کر شیراز میں آئے چنانچہ ایک قطعہ میں غریب الوطنی اور مراجعت کی وجہ بتصریح لکھی ہے،

ایک قطعہ میں اس سے بھی زیادہ صاف لکھا ہے،

ندانی کہ من در اقالیم غربت ‌ ‌ ‌ چرا روزگارے بکردم درنگی

بروں رفتم از تنگ ترکان کہ دیدم ‌ ‌ ‌ جہاں درہم افتاد چوں موے زنگی

ہمہ آدمی زادہ بود ند لیکن (کشمکش) ‌ ‌ ‌ چو گرگان بہ خونخوارگی تیز چنگی

چو باز آمدم کشور آسودہ دیدم ‌ ‌ ‌ پلنگاں رہا کردہ خوئے پلنگی

چناں بود در عہد اوّل کہ دیدم ‌ ‌ ‌ جہاں پر ز آشوب و تشویش و تنگی

چنیں شد در ایام سلطان عادل ‌ ‌ ‌ اتابک ابو بکر بن سعد زنگی

شیراز پہنچکر شاہی تعلقات سے بالکل آزاد رہنا تو ممکن نہ تھا، ابو بکر بن سعد زنگی کے درباریوں میں داخل ہوئے، مدحیہ قصائد لکھے، گلستان اور بوستان اسی کے نام سے معنون کی، غالباً صلے بھی (بلا طلب) ملے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ آزاد مزاجی کی وجہ سے دربار کے قابل نہ تھے، اور ابو بکر بن سعد نے اس وجہ سے انکی چنداں قدردانی نہیں کی، چنانچہ ایک قصیدہ میں ہلکی سی شکایت بھی کی ہے،

بہ دولتت ہمہ افتادگان بلند شدند ‌ ‌ ‌ چو آفتاب کہ بر آسماں برد شبنم

[1] اللہ اکبر، شیراز کے ایک چشمہ کا نام ہے،

آئے جامع مسجد میں ایک مدرسہ تھا جس میں حسب دستور درسیات کی ابتدائی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، سیر کرتے کرتے مدرسہ میں آئے، ایک خوش جمال لڑکا زمخشری کی کتاب (غالباً مفصل ہوگی)، پڑھ رہا تھا اور یہ فقرہ زبان پر تھا ضرب زید عمرا شیخ نے کہا خوارزم وخطا میں صلح ہوگئی اور زید اور عمر کا جھگڑا ابتک ختم نہیں ہوچکا، لڑکا ہنس پڑا اور انکا نام ونشان پوچھا، انہوں نے کہا شیراز شیخ کا شہرہ عالمگیر ہوچکا تھا، شیراز کا نام سن کر اُس نے کہا سعدی کے شعر بھی کچھ آپ کو یاد ہیں؟ انہوں نے عربی کے دو شعر اسی وقت موزوں کرکے پڑھے، لڑکا سمجھ نہ سکا، بولا کہ ہمارے ملک میں تو انکے فارسی شعر مشہور ہیں، آپ فارسی شعر پڑھتے تو میں سمجھ بھی سکتا، شیخ نے برجستہ کہا،

اے دل عشاق بدام تو صید　　　ما بتو مشغول و تو با عمرو زید

دوسرے دن کسی نے لڑکے سے کہدیا کہ یہی سعدی ہیں، وہ دوڑا ہوا شیخ کے پاس گیا اور نہایت اخلاص وعقیدت ظاہر کی اور کہا کہ آپ نے نام کیوں نہیں ظاہر فرمایا کہ میں خدمتگذاری کی سعادت حاصل کرسکتا، شیخ نے جواب دیا ع با وجودت زمن آواز نیامد کہ منم تیرے سامنے میں یہ کہہ نہ سکا کہ میں ہوں، لڑکے نے عرض کی کہ چندروز آپکا قیام ہوتا تو سب آپ سے مستفید ہوتے، شیخ نے کہا نہیں میں نہیں ٹھہر سکتا پھر یہ اشعار پڑھے،

بزرگے دیدم اندر کوہسارے　　　قناعت کردہ از دنیا بہ غارے
بدو گفتم بہ شہر اندر نیائی؟　　　کہ بارے بندے از دل برکشائی
بگفت آنجا پری رویاں نغز اند　　　چو گل بسیار شد پیلاں بلغزند

وقت کی تہذیب دیکھو، شیخ جیسا مقدس اور صوفی منش ایک امرد کو گلے لگاتا ہے، اور پیار کرتا ہے، منہ چومتا ہے اور پھر دیدہ دلیری سے کہتا ہے،

ایں بگفتیم و بوسہ چند بر سرو روے یکدیگر دادیم و وداع کردیم،

بوسہ دادن بروے یار چہ سود　　　ہم دراں لحظہ کردنش پدرود

اسی عالم سیاحت میں شیخ ہندوستان میں بھی آئے، عام تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ شیخ امیر خسرو سے ملے تھے لیکن مستند تاریخوں میں اسی قدر ہے کہ امیر خسرو کے ممدوح

خان شہید نے دو دفعہ شیخ کو شیراز سے طلب کیا، لیکن شیخ نے بڑھاپے اور ضعف کا عذر کیا اور گلستاں و بوستاں اپنے ہاتھ سے لکھ کر تحفہ میں بھیجی،

خان شہید نے امیر خسرو کا کلام بھی بھیجا تھا، شیخ نے اس کی بہت تحسین کی اور لکھا کہ یہ جوہر قابل قدر دانی کے قابل ہے،

ہندوستان کے سفر کا ایک واقعہ شیخ نے بوستان میں لکھا ہے لیکن بیان واقعہ میں اس قدر غلطیاں ہیں کہ سرے سے اصل واقعہ مشتبہ ہو جاتا ہے، اُنکا بیان ہے کہ وہ سومنات میں آئے یہاں ایک عظیم الشان بت خانہ تھا، پوجاریوں سے راہ و رسم پیدا کی، ایکدن ایک برہمن سے کہا کہ مجھکو سخت تعجب ہے کہ ایک پتھر کو لوگ کیوں پوجتے ہیں وہ نہایت برہم ہوا اور تمام بت خانہ میں یہ چرچا پھیل گیا، سب ان پر ٹوٹ پڑے اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، انہوں نے کہا بت کے ظاہری حسن و خوبی کا میں بھی معترف ہوں لیکن جاننا چاہتا ہوں کہ معنوی کمال کیا ہے؟ برہمن نے کہا ہاں یہ پوچھنے کی بات ہے میں نے بھی بہت سفر کئے اور ہزاروں بت دیکھے لیکن جو معجزہ اس میں ہے کسی میں نہیں، یہ ہر روز صبح کو دعا کے لئے خود ہاتھ اُٹھاتا ہے، چنانچہ دوسرے دن شیخ نے یہ شعبدہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا، شیخ کو نہایت حیرت ہوئی اور اس فکر میں ہوئے کہ اصل راز کیا ہے؟ تقیۃً بت کے ہاتھ چومے اور بہت خشوع و خضوع ظاہر کیا اور بت خانہ میں اس عقیدت کے ساتھ رہنے لگے جیسے پوجاری مندر میں رہا کرتے ہیں، برہمنوں کو جب انکی طرف سے اطمینان ہو گیا تو ایک دن بت خانہ کا پھاٹک بند کر کے چاروں طرف نظر دوڑائی، دیکھا تو بت کی پشت کی طرف ایک مغرق پردہ ہے، پردہ کی اوٹ میں ایک شخص بیٹھا ہوا ہے جسکے ہاتھ میں ایک رسی ہے، رسی میں بت کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، اندر سے یہ شخص رسی کو کھینچتا ہے تو ہاتھ اُٹھ جاتے ہیں، ان کو دیکھ کر وہ شخص بھاگا، انہوں نے تعاقب کر کے اس کو کنوئیں میں دھکیل اور خود بھاگ نکلے،

ان واقعات کے بیان میں عام غلطیاں تو یہ ہیں کہ بت کو ہاتھی دانت کا بتایا ہے

[1] خان شہید نے سنہ ۶۸۲ھ میں شہادت پائی اور شیخ سعدی کے بلانے کا واقعہ اسی سنہ کے دو چار برس قبل کا واقعہ ہے،

اباقا آن پر ان اشعار کا نہایت اثر ہوا،

ایک دفعہ خواجہ شمس الدین نے چند سوالات لکھ کر شیخ کے پاس بھیجے اسکے ساتھ ایک عمامہ اور پانچسو اشرفیاں بھی بھیجیں، لیکن قاصد نے ڈیڑھ سو اشرفیاں خود اڑا لیں، شیخ نے سوالات کے جواب کے ساتھ اشرفیوں کی رسید بھی لکھی اور عجیب لطیف طریقہ سے نوکر کی خیانت ظاہر کی،

چونکہ تشریفم فرستادی و مال   مالت افزوں باد و خصمت پائمال

ہر بہ دیناریت سالے عمر باد   تا بمانی سیصد و پنجاہ سال

یعنی آپ کو ہر اشرفی کے بدلے ایک برس عمر دے تاکہ آپ ۳۵۰ برس زندہ رہیں،
خواجہ شمس الدین نے نوکر سے بازپرس کی، خواجہ علاء الدین برادر خواجہ شمس الدین نے جلال الدین ختنی کو جو شیراز میں ایک معزز عہدہ پر مامور تھے خط لکھا کہ دس ہزار اشرفیاں شیخ کی خدمت میں پہنچا دینا، سو، اتفاق یہ کہ جب نوکر شیراز میں پہنچا تو اس سے چھ دن پہلے جلال الدین کا انتقال ہو چکا تھا، نوکر نے جلال الدین کے نام کا خط شیخ کو لیجا کر دیا، شیخ نے علاء الدین کو جواب میں یہ قطعہ لکھا،

پیام صاحب دولت علاء دولت و دین   کہ دین بود ہر بہ ایام او ہمے نازد

رسید پایۂ دولت فزود سعدی را   بسے نماند کہ سر بر فلک برافرازد

بمثال داد کہ صدر ختن جلال الدین   قبول خدمت او را تعہدے سازد

ولیک بر سر او خیل مرگ تاختہ بود   چنانکہ بر سر ابنائے دہر می تازد

جلال زندہ نخواہد شدن دریں دنیا   کہ بندگان خداوندگار بنوازد

طمع ندارم ازو در سرائے عقبیٰ نیز   کہ از مظالم مردم بہ ما بپردازد

یعنی اسکا تو چنداں رنج نہیں کہ جلال الدین اب زندہ نہیں ہو سکتا کہ میری حق رسی کر سکے، رونا یہ ہے کہ قیامت میں بھی اسکو اوروں کی دادرسی سے اتنی فرصت کہاں ہو گی کہ ہم غریبوں کی طرف متوجہ ہو،

خواجہ شمس الدین نے قطعہ پڑھ کر حکم دیا کہ فوراً پچاس ہزار اشرفیاں شیخ کی خدمت میں

بھیج دی جائیں شیخ قبول نہیں کرتے تھے لیکن چونکہ خواجہ موصوف نے قسمیں دلائی تھیں شیخ نے اس رقم سے ایک کاروان سرا تعمیر کرادی[1]

خواجہ شمس الدین کو ارغون خان (ہلاکو خان کا پوتا) نے ۶۸۳ھ میں قتل کرادیا انکے بعد بھی شیراز کے تمام حکام اور امراء شیخ کی اسی طرح عزت اور تعظیم کرتے رہے ملک عادل شمس الدین تازی کے زمانہ میں عمال نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ سرکاری باغوں کے پھل نہایت گراں قیمت پر زبردستی دوکانداروں کے ہاتھ بیچتے تھے اور بیچاروں کو خواہ مخواہ مول لینا پڑتا تھا، شیخ کے بھائی بقالی کا پیشہ کرتے تھے، انکی دوکان اتابک کے محل کے سامنے تھی، ان پر بھی چند بار یہ آفت آئی آخر مجبور ہو کر بھائی کے پاس آئے شیخ نے یہ قطعہ لکھ کر ملک عادل کے پاس بھیجا،

زاحوال برادرم بر تحقیق	دانم کہ ترا خبر نہ باشد
خرمائے بہ طرح مے دہندش	بنحت بد ازیں تبر نہ باشد
اطفال پر اند و مرد درویش	خرما نخورند و زر نہ باشد
آنگہ تو محصلے فرستے، (بہت ہیں)	شخصے کہ ازو تبر نہ باشد
چنداں بزنندش اے خداوند	کز خانہ رہش بدر نہ باشد
اے صاحب من بغور اورس	لطفے بہ ازیں دگر نہ باشد

ملک شمس الدین نے قطعہ پڑھنے کے ساتھ منادی کرادی کہ جن لوگوں سے ایسا معاملہ کیا گیا ہے، سب دربار میں حاضر ہوں، چنانچہ سب کی دادرسی کی، پھر شیخ کی خدمت میں آیا اور نہایت معذرت کی، ساتھ ہی ہزار اشرفیوں کی تھیلی پیش کی کہ آپکے بھائی کے نقصان کا تاوان[2] ہے،

شیخ نے آخر زندگی میں شہر سے باہر ایک زاویہ بنوالیا تھا، رات دن وہیں رہتے تھے اور عبادت کرتے تھے، سلاطین اور امرا اسی آستانہ پر حاضر ہوتے اور مراتب اخلاص بجالاتے،

---

[1] یہ تمام حالات احمد بن بیستون نے کلیات شیخ کے دیباچہ میں لکھے ہیں،

[2] دیباچہ کلیات،

نگر کمینۂ احاد بندگان سعدی　　کہ سعیش از ہمہ بیش است حظش از ہمہ کم

انکیانو جو اباقا آن خاں (پسر ہلاکو خان) کی طرف سے خاندان اتابک کے انقراض کے بعد شیراز کا گورنر مقرر ہوا تھا، اس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے، جس کے دو شعر یہ ہیں،

سعد یا چند انکہ میدانی بگو　　حق نبا ید گفتن الّا آشکار

ہر کرا خوف و طمع در کار نیست　　از خطا باکش نباشد و ز تتار

ان اشعار سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ ایشیائی درباروں میں کیونکر فروغ پاسکتے تھے غرض ابوبکر بن سعد نے تو انکے رتبہ کے موافق انکا احترام نہ کیا، لیکن جو امرا خود صاحب علم و فضل تھے وہ شیخ کی پرستش کرتے تھے،

اس زمانہ میں علم و فضل کے اصلی پشت و پناہ شمس الدین صاحب دیوان اور علاء الدین تھے:

خواجہ شمس الدین، ہلاکو خان کا وزیر اعظم تھا، اور ہلاکو خان کے زمانہ میں باوجود اختلاف مذہب اور تاتاریوں کی سفاکی کے اسلام کا جو نام و نشان رہ گیا وہ صرف خواجہ شمس الدین کا صدقہ تھا، تاتاریوں میں جو اسلام پھیلا وہ بھی خواجہ شمس الدین ہی کی بدولت تھا سب سے پہلے اس سلسلہ میں نکودار (ہلاکو خاں کا بیٹا) اسلام لایا اور سلطان احمد کے لقب سے ملقب ہوا، نکودار نے خواجہ شمس الدین ہی کی ہدایت اور ترغیب کی وجہ سے اسلام قبول کیا تھا،

خواجہ شمس الدین کا دوسرا بھائی علاء الدین ہلاکو خان کی طرف سے بغداد کا حاکم تھا اور نہایت صاحب فضل و کمال تھا، تاتاریوں کی سب سے مفصل اور مستند تاریخ جہانکشا اسی کی تصنیف ہے،

یہ دونوں بھائی شیخ سعدی کے مرید اور معتقد خاص تھے، شیخ ایک دفعہ جب حج سے واپس آکر تبریز میں آئے جو ہلاکو خاں کا پایہ تخت تھا تو خواجہ شمس الدین سے ملنے گئے، اتفاق یہ کہ ادھر سے اباقا آن خاں (پسر ہلاکو خان) کی سواری آرہی تھی، خواجہ شمس الدین اور علاء الدین

بھی ساتھ تھے، شیخ نے اس خیال سے کہ تعارف کا یہ موقع نہیں، چاہا کہ نظر بچا کر نکل جائیں
اتفاق سے دونوں بھائیوں نے ان کو دیکھ لیا، گھوڑوں سے اُتر پڑے اور جا کر شیخ کے
ہاتھ پاؤں چومے اباقا آن خان دیکھ رہا تھا، اس کو سخت حیرت ہوئی کہ برسوں سے
یہ میرے دربار میں ہیں اور نمکخوار ہیں تاہم جو تعظیم انہوں نے اس بوڑھے کی کی میری کبھی بھی
نہیں کی، جب دونوں بھائی شیخ سے رخصت ہو کر جلوس میں شامل ہوئے تو اباقا آن
نے پوچھا کہ یہ کون شخص تھا؟ جسکی تم نے اس قدر تعظیم و تکریم کی، انہوں نے کہا یہ ہمارا باپ
تھا، اباقا آن نے کہا تمہارا باپ تو مر چکا ہے، بولے کہ پدر طریقت ہے، حضور نے
سعدی کا نام سُنا ہو گا جنکی نظم و نثر آج تمام عالم میں پھیلی ہوئی ہے وہ یہی بزرگ ہیں
اباقا آن ملنے کا مشتاق ہوا، دوسرے دن دونوں بھائی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے
اور بادشاہ کا پیغام کہا، شیخ نے انکار کیا لیکن ان لوگوں نے اسقدر اصرار کیا کہ شیخ
کو چارناچار جانا پڑا، اباقا آن سے دیر تک صحبت رہی، چلتے چلتے اس نے کہا کہ مجھ کو
کچھ نصیحت فرماتے جائیے، شیخ نے کہا مرنے کے بعد صرف اعمال ساتھ جائینگے اب تمکو اختیار ہے کہ
اچھے اعمال ساتھ لیجاؤ یا بُرے، اباقا آن نے کہا اس مضمون کو نظم کر دیجئے، شیخ
نے برجستہ کہا،

شہے کہ حفظ رعیت نگاہ می دارد	حلال باد خراجش کہ مزد چوپانی است
وگرنہ راعی خلق است زہر مارش باد	کہ ہرچہ میخورد از جزیت مسلمانی است

اباقا آن کے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور کہا کہ میں راعی ہوں یا نہیں؟ شیخ نے کہا
اگر راعی ہو تو پہلا شعر حسب حال ہے ورنہ دوسرا، اباقا آن بار بار پوچھتا کہ میں راعی ہوں یا
نہیں؟ لیکن شیخ ہر بار وہی شرطیہ جواب دیتے رہے، چلتے ہوئے شیخ نے یہ اشعار پڑھے،

بادشہ سایۂ خدا باشد	سایہ با ذات آشنا باشد
نشود نفس عامہ قابل خیر	گر نہ شمشیر بادشا باشد
ملکت او صلاح نپذیرد	گر ہمہ رائے او خطا باشد
ہر صلاحے کہ در جہاں آید	اثرِ عدلِ بادشا باشد

کھانے کا یہ انتظام تھا کہ امراء خود کھانے لیجاتے یا بھجوا دیتے شیخ جسقدر کھا سکتے کھا لیتے باقی ایک زنبیل میں رکھکر دیوار سے لٹکا دیتے کہ ع بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست

شیخ جب شیراز میں واپس آئے تو ابو بکر بن سعد کی حکومت کا زمانہ تھا اسکے بعد اس کا پوتا محمد بن سعد بادشاہ ہوا لیکن چونکہ وہ نہایت صغیر سن تھا حکومت کے سب کام اسکی ماں انجام دیتی تھی، دو برس ۷ مہینے کے بعد وہ مر گیا اسکے بعد محمد شاہ بن سلغر بن اتابک سعد بادشاہ ہوا لیکن چونکہ سفاک اور خونریز تھا اسلئے آٹھ مہینے کے بعد ارکان دولت نے اسکو گرفتار کرکے ہلاکو خان کے پاس بھیجدیا پھر اسکے بھائی نے برائے نام حکومت کی اور ۶۶۳ھ میں قتل کردیا گیا اب اس خاندان میں کوئی مرد باقی نہیں رہا تھا، آتش خاتون دختر اتابک سعد مسند حکومت پر بیٹھی اس نے ہلاکو خان کے بیٹے منکو تیمور سے شادی کرلی ۶۸۶ھ میں وہ بھی مر گئی اور اب شیراز و فارس براہ راست تاتاریوں کی زیر حکومت آگیا،

یہ ارغون خان بن اباقا آن خان بن ہلاکو خان کا زمانہ ہے شیخ نے اسکے عہد حکومت میں ۶۹۱ھ میں وفات پائی، تاریخ وفات "خاص" کے لفظ سے نکلتی ہے کسی نے اسکو موزوں کردیا ہے، ع زخاصان بود زاں تاریخ شد خاص،

شیخ کا مزار مقام دلکشا سے کچھ فاصلہ پر پہاڑ کی تلی میں ہے، اور اب سعدیہ کے نام سے مشہور ہے ہفتہ میں ایک دن مقرر ہے لوگ زیارت کو جاتے ہیں، دن بھر وہیں رہتے ہیں، چائیں پیتے ہیں لطف اُٹھاتے ہیں اور شام کو چلے آتے ہیں،

عام حالات اور اخلاق و عادات

شیخ نے گو اپنی سوانح نہیں لکھی لیکن گلستان اور بوستان میں جستہ جستہ ضمنی موقعوں پر اسقدر حالات لکھدیئے ہیں کہ اُن سے اخلاق اور عادات کی پوری تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے،

شیخ کا شمار صوفیہ کبار میں ہے اور بے شبہ وہ پاکیزہ باطن اور صاحب حال تھے لیکن انکی مخصوص حالت یہ ہے کہ وہ اس رتبہ پر مجاہدہ اور ریاضت کے بعد پہنچے تھے انکی اصلی سرشت یہ تھی، بچپن سے شباب بلکہ ادھیڑپن کے زمانہ تک ان میں وہ اوصاف

نظر آتے ہیں جو مولویوں کا خاصہ ہیں یعنی خود بینی، حرفگیری، مشاجرت، و مخاصمت،
باپ کی صحبت کے اثر سے بچپن میں عبادت کا ذوق شوق پیدا ہو گیا ہے، شب بیداری
اور درود و ظائف میں معروف ہیں لیکن ساتھ ہی اوروں پر حرفگیری بھی کرتے
جاتے ہیں کہ دیکھے کسی کو نماز پڑھنے کی توفیق نہیں ہوتی،
نظامیہ میں حدیث پڑھتے ہیں کسی نے انکے خلاف کچھ کہدیا ہے اسپر آپ سے باہر
ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں،

چو من داد معنی وہم در حدیث　　بر آید بہم اندرون خبیث

ایک درویش سے دولتمندی اور درویشی کے متعلق بحث کرتے کرتے دست و
گریباں ہو جاتے ہیں اور دھول دھپے تک نوبت پہنچا دیتے ہیں،

دشنامم داد سقطش گفتم گریبانم درید زنخدانش شکستم،

حج کا سفر ہے، ذوق و شوق میں احرام باندھے پا پیادہ جا رہے ہیں، اس
حالت میں بھی زبان سے ناسزا کلمات نکل جاتے ہیں، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

درسر دردی ہمدیگر فتادیم و داد فسق و جدال دادیم

حسن پسندی، امرد پرستی تک پہنچ گئی ہے اور ایسے کھل کھیلتے ہیں کہ اسکا
ذکر تک نہیں کیا جا سکتا،
بے شبہ یہ باتیں انکے عارض کمال کے داغ ہیں لیکن ایک رفارمر اور مصلح کیلئے
ان تمام مراحل سے گزرنا ضرور تھا،
مولانا روم سے کسی نے ایک بزرگ کی نسبت کہا کہ "شاہد باز بود اما پاکباز بود"
مولانا نے کہا "کاوش کردی و گذاشتی"
شیخ نے چونکہ بیماریاں اٹھا کر صحت پائی تھی اسلئے وہ امراض (اخلاقی) کی حقیقت،
ماہیت، علامات، اور طریق علاج سے جسقدر واقف ہونگے دوسرا نہیں ہو سکتا تھا،
اخلاقی بیماریوں میں اکثر دل کو دھوکا ہوتا ہے اور مرض کو مرض نہیں سمجھتے مثلاً ایک فقیہ
فطری بدنفسی کی وجہ سے اپنے مخالف کو برا کہتا ہے اور اسکو ضرر پہنچاتا ہے لیکن اسکا نفس اسکو

یہ دھوکا دیتا ہے کہ چونکہ یہ شخص فلاں مسئلہ کا قائل ہے بدعتی اور کافر ہے اسلئے اسکو بُرا کہنا اور اُسکی تکفیر کرنا غیرت مذہب کا اقتضا ہے، یا مثلاً ایک صوفی صاحب امرد پرستی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ مجاز حقیقت کا زینہ ہے، شیخ ان غلطیوں میں نہیں پڑسکتا چنانچہ امرد پرستی کی نسبت، لطف بازصوفیوں کی اس طرح پردہ دری کرتا ہے،

گروہے نشینند باخوش پسر	کہ ماپاکبازیم واہل نظر
زمن پرس فرسودۂ روزگار	کہ برسفرہ حسرت خورد روزہ دار
چرا طفل یکروزہ ہوشش نبرد	کہ در صنع دیدن چہ بالغ چہ خورد

شیخ کے مزاج میں ظرافت حد سے زیادہ تھی، ایک دفعہ ایک مکان کرایہ پر لینا چاہتے تھے، ایک یہودی پڑوس میں رہتا تھا اس نے کہا حضور خرید لیجئے میں اس مکان کی حالت سے خوب واقف ہوں، اس میں کوئی عیب نہیں، شیخ نے کہا بجز اس کے کہ آپ اسکے ہمسایہ ہیں،

خواجہ ہمام ایک مشہور شاعر تھے اور محقق طوسی کے شاگرد تھے، شیخ سے اور ان سے تبریز میں ایک حمام میں ملاقات ہوئی، شیخ نے دانستہ ہمام سے چھیڑ چھاڑ شروع کی، ہمام ان سے واقف نہ تھے نام اور نشان پوچھا، شیخ نے کہا شیراز میں رہتا ہوں، ہمام نے کہا عجیب بات ہے ہمارے شہر میں شیرازی کتوں سے زیادہ ہیں، شیخ نے کہا ہاں، لیکن شیراز میں تو تبریزی کتے سے بھی کم درتبہ ہیں،

اتفاق یہ کہ ایک خوشرو جوان ہمام کو پنکھا جھل رہا تھا، شیخ اُس سے لطف نظر اٹھانا چاہتا تھا، لیکن ہمام بیچ میں حائل تھے ہمام نے سلسلہ سخن میں کہا کہ شیراز میں ہمام کے شعر کا بھی چرچا ہے؟ شیخ نے کہا ہاں، یہ شعر اکثر زبانوں پر ہے،

درمیان من و دلدار حجاب است ہمام	وقت آن است کہ این پردہ بیکسو فگنم

ہمام کو گمان ہوا کہ یہ سعدی ہیں قسم دلاکر پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے شیخ نے مجبوراً بتایا ہمام نے اٹھ کر شیخ کے پاؤں پر سر رکھ دیا گلے سے لگے اور بڑی گرمجوشی سے مہمانیاں کیں[1]

[1] دولت شاہ ذکر سعدی،

مجدالدین ہمگر شیخ کے معاصر اور اسی دربار سے تعلق رکھتے تھے جس سے شیخ کو تعلق تھا، آج تو کوئی ان کا نام بھی نہیں جانتا لیکن اس زمانہ میں فارس کے ملک الشعرائی کا منصب جو شیخ کا حق تھا قسمت نے ان کو عنایت کیا تھا،

سعد بن ابوبکر سعد زنگی ان کی تعظیم اور تکریم شیخ سے زیادہ کرتا تھا، اسی زمانہ میں امامی ایک شاعر تھا، زمانہ کی بے بصری نے ان کو بھی شیخ کا حریف بنا دیا تھا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ خواجہ شمس الدین محمد اور ملک معین الدین پروانہ اور نور الدین اور افتخار الدین نے یہ قطعہ لکھ کر مجد الدین ہمگر کے پاس بھیجا،

زشمع فارس، مجد ملت و دین ۔۔۔ سوالے می کنند پروانہ ردم
زشاگردان تو ہستند حاضر ۔۔۔ رہے و افتخار و نور مظلوم
تو از اشعار سعدی و امامی، ۔۔۔ کدامی بہ پسندی اندریں بوم

مجد الدین نے جواب میں لکھا،

ما گرچہ بہ نطق طوطی خوش نفسیم ۔۔۔ بر شکر گفتہ ہائے سعدی مگسیم
در شیوۂ شاعری بہ اجماع امم ۔۔۔ ہرگز من و سعدی بہ امامی نرسیم

شیخ کو بھی اس بے امتیازی کا رنج ہوا، چنانچہ یہ رباعی لکھی،

ہر کس کہ بہ بارگاہ سامی نرسد ۔۔۔ از بخت سیاہ و بدکلامی نرسد
ہمگر کہ بہ عمر خود نکردہ است نماز ۔۔۔ شک نیست کہ ہرگز بہ امامی نرسد[1]

شیخ کے سیر و سفر کے ذکر میں جو واقعات ہم اوپر لکھ آئے ہیں انکو اس موقع پر دوبارہ پڑھنا چاہیے، جن سے شیخ کے اخلاق و عادات کی تصویر پوری نظر میں آجائیگی،

شیخ کی تصانیف | کلیات[2] شیخ کا قدیم ترین قلمی نسخہ کتب خانہ دیوان ہند میں موجود ہے، جسکا نمبر ۱۱۱ ہے، تاریخ استنساخ اول رجب ۷۲۸ھ یعنی شیخ کی ممات کے بعد قریب ۳۷ سال ہے، کاتب کا نام ابوبکر بن علی بن محمد ہے جس نے شیخ کے اصلی نسخہ سے

۱؎ تذکرہ دولت شاہ تذکرہ امامی ہروی،

۲؎ یہ تمام مضمون شیخ عبدالقادر صاحب ایم اے پروفیسر دکن کالج پونا نے ترجمہ کر کے ہمکو عنایت کیا ہے،

نقل لی ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے "منقول من خط الشیخ العارف السعدی"

اس نسخہ سے شیخ کا نام شرف الدین بن مصلح الدین پایا جاتا ہے اور اس میں حسب ذیل کتابیں ہیں (۱) عربی قصیدہ قافیہ میم (۲) دوسرا رسالہ (۳) بوستان جسکا نام یہاں سعدی نامہ لکھا ہوا ہے (۴) گلستان (۵) طیبات (۶) بدائع (۷) خواتیم (۸) قصائد فارسیہ (۹) مراثی (۱۰) ملمعات (۱۱) مثلثات (تین زبانوں میں عربی، فارسی، اور ترکی) (۱۲) قصائد عربیہ (۱۳) ترجیعات (۱۴) مقطعات (۱۵) مجلس ہزل، ہزلیات (۱۶) مطائبات (۱۷) رباعیات (۱۸) مفردات۔

جو کتابیں کہ اس نسخہ میں داخل نہیں وہ یہ ہیں ۱،۳،۴،۵،۶، غزلیات قدیم، صاحبیہ، مضحکات،

اہل یورپ نے شیخ کے کلام کے جو حصے شائع اور ترجمے کئے اسکا مختصر حال یہ ہے (ماخوذ از فہرست کتب قلمی فارسی موجودہ دیوان ہند مرتبہ ڈاکٹر ایتھ Dr. Ethe

رسالہ دوم پانچ مجلسوں میں سے تیسری اور چوتھی مجلسیں ایم گوڈمان M. Gwedmen. صاحب نے معہ ترجمہ و شرح کے شائع کیں بمقام بریسلا Bresla ۱۸۹۶ء

بوستان، نہایت نفیس اڈیشن معہ شرح فارسی کے ایچ گراف صاحب K. H. Graff. کے اہتمام سے چھپا ہے بمقام وینا Vienna. سنہ ۱۸۵۰ء

متن مع نوٹس مرتبہ اے راجرس A. Rodgers. بمقام لنڈن سنہ ۱۸۹۱ء

تراجم در زبان جرمن کے ایچ گراف K. H. Graff. صاحب کا ترجمہ، جینا Jena. سنہ ۱۸۵۰ء

" در زبان جرمن شلیختا ویسرڈ Schlecha Wesschrd وینا Viena. سنہ ۱۸۵۲ء

" " روکرٹ Rockert صاحب کا ترجمہ لیپزک Leepzig. سنہ ۱۸۸۲ء

" فرنچ باربیر ڈی مینارڈ Barbierde meynard کا پارس سنہ ۱۸۸۰ء

" انگریزی ایچ. ولبرفورس کلارک H. Wilberforce Clark. صاحب کا ترجمہ، بمقام لنڈن سنہ ۱۸۷۹ء

تراجم انگریزی جی۔ ایس۔ ڈیوِی G. S. Davie. صاحب کا ترجمہ
بمقام لندن ۱۸۸۲ء
منتخبات مترجمہ رابنس Robinson. لندن ۱۸۸۳ء
ایک ترکی میں بمقام قسطنطنیہ ۱۲۸۸ھ میں شائع ہوا ہے،
گلستان، اڈیشنس، گلیاڈون Gladwin. صاحب کی متن مع انگریزی
کلکتہ ۱۸۰۶ء
" ای۔ بی۔ ایسٹوِک E. B. Eastwick. صاحب کی مع فرہنگ
بمقام ہرٹ فرڈ Hertford. ۱۸۵۰ء
" جانسن Johnson کی مع فرہنگ، ہرٹ فرڈ ۱۸۶۳ء
" جے۔ ٹی۔ پلاٹس J. T. Platts. لنڈن ۱۸۷۴ء
تراجم، در فرنچ۔ اے۔ ڈیورائر A. Due Ryer. کا ترجمہ ۱۶۳۴ء
ڈالیگر Dalegre. کا ترجمہ ۱۷۰۴ء
گاندان Gaundin کا " ۱۷۸۹ء
سیمیلٹ Semelet. کا " ۱۸۵۸ء پارس
لاطینی جنٹس Gentius کا " ۱۶۵۱ء اڈیشن دوم ۱۶۵۵ء

تراجم، در جرمن، ادم اولیاری اس Adam Olearius. کا بمقام
شلیسوگ Schlesswing. ۱۶۵۴ء
بی۔ ڈارن B. Dorn. صاحب کا، ہانبرگ
۱۸۲۲ء

وولف Wolff. کا، سٹٹگارٹ Stuttgart. ۱۸۴۱ء
کے، ایچ، گراف K. H. Graff. کا، لیپزگ ۱۸۴۶ء
در انگریزی، گلیاڈون صاحب Gladwin. کا، کلکتہ ۱۸۰۶ء
لنڈن ۱۸۳۳ء

ڈیومولن Dumoulin. کا ۱۸۰۶ء

جیمس راس James Rass کا، لندن ۱۸۲۳ء

نئی ایڈیشن ۱۸۹۰ء

ای، بی، ایسٹوک E.B Eastwick. ہرٹ فرڈ ۱۸۵۲ء

نئے ایڈیشن، لندن ۱۸۸۰ء

جی، ٹی، پلاٹس J.T Platts. لندن ۱۸۷۳ء

در روسی، ایس، نسریتیز S. Nusariang. کا، ماسکو ۱۸۵۷ء

در پولش، آٹو نوسکی Otwinawski کا، وارسا ۱۸۷۹ء

در ترکی، قسطنطنیہ میں ۱۸۷۴ء، ۱۸۷۶ء میں شائع ہُوا اور مع شرح سودی کے

تراجم ۱۲۸۶ اور ۱۲۹۳ میں،

عربی میں بمقام بولاق ۱۲۶۳ھ ہندوستانی میں میر شیر علی افسوس کا کلکتہ ۱۸۵۲ء

جو زیر نگرانی جان گلگرسٹ صاحب Jhon Gilchrist. کے شائع کیا گیا

طیبات کی چودہ غزلیں گراف k.H. Graff. صاحب نے ترجمہ کر کے جرمن میں شائع کیں

بدائع، دس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

خواتیم، رسالت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

قصائد فارسیہ کے اور قصائد عربیہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مراثی، چند مراثی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

رباعیات، چند رباعیات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مفردات، کولاٹوش Latowche. صاحب نے ایڈٹ اور شائع کیا ہے،

صاحبیہ، کو باخر Bacher. صاحب نے مع ترجمہ شائع کیا ہے، اسٹراسبرگ

Strasoburg. ۱۸۷۹ء

شیخ کی شاعری | شریعت شعر کے تین پیغمبر ہیں، ان میں ایک شیخ بھی ہیں،

در شعر سہ تن پیمبرانند ہر چند کہ لا نبی بعدی

ابیات و قصیدہ و غزل را فردوسی و انوری و سعدی

ہر پیغمبر جداگانہ شریعت کا پیغمبر ہے، شیخ کی پیغمبری کا صحیفہ غزل ہے،
خواجہ حافظ نے غزل کو معجزہ بنادیا تاہم کہتے ہیں،

ع استاد غزل سعدی است پیش ہمہ کس اما،

حضرت امیر خسرو غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ غزل میں سعدی کا پیرو ہوں، مثنوی نہ سپہر میں لکھتے ہیں،

تا بجائے کہ حد پارسیان اندریں عہد و تن گشت عیاں
زاں یکے سعدی و ثانیش ہمام ہر دو را در غزل آئین تمام

لیکن اور اصناف سخن میں شیخ کی شاعری اس درجہ پر تسلیم نہیں کی گئی امیر خسرو شیخ کی غزل گوئی کی تعریف کرکے لکھتے ہیں،

لیک اگر سوے دگر بازی دست شعر شاں ہست بداں گونہ کہ ہست

خود شیخ کے زمانہ میں بھی اکثر لوگوں کا یہی خیال تھا، اور اسکا چرچا شیخ تک بھی پہنچا، چنانچہ ایک شخص نے کہا کہ شیخ اخلاق اور وعظ کے مضامین اچھے لکھ سکتے ہیں لیکن رزم کے مرد میدان نہیں،

کہ فکرش بلیغ است و رایش بلند دریں شیوۂ زہد و طامات و پند
نہ در خشت و گوپال و گرز گران کہ ایں کار ختم است بر دیگران

شیخ کو یہ رائے ناگوار گزری، ایک رزمیہ داستان لکھ کر بوستان میں شامل کی، جس میں بہت کچھ زور طبع دکھایا، نظامی کے خاص خاص مشہور مضامین اور اشعار کا جواب بھی لکھا اور اُن سے بڑھا دینا چاہا مثلاً نظامی کا شعر تھا،

کمند اژدہائے مسلسل شکنج دہن باز کردہ بہ تاراج گنج

شیخ اس تشبیہ کو زیادہ صاف اور صورت نما کرتے ہیں،

بہ صید ہژبراں پرخاش ساز کمند اژدہاے دہن کردہ باز

لیکن انصاف یہ ہے کہ شیخ سے یہ کمان زہ نہیں ہوسکی، دو چار قدم تن کر اور اکڑ کر

چلتے ہیں، لیکن پھر طبعی بڑھاپے کے ضعف سے دفعۃً جھک جاتے ہیں، رزم کا آغاز کس زور و شور سے کیا ہے،

ع برانگیختم گرد ہیجا چو دود،

لیکن دوسرے ہی قدم میں لڑکھڑا کر گر تے ہیں،

ع چو دولت نہ باشد تہور چہ سود،

بااینہمہ چونکہ شیخ کا یہ بھی ایک کارنامہ ہے، ہم اس رزمیہ کے چند اشعار نقل کرتے ہیں،

ہماندم کہ دیدیم گرد سپاہ	زرہ جامہ کردیم و مغفر کلاہ
چو ابر اسپ تازی برانگیختم	چو باران پلارک فرو ریختم
دو لشکر بہم بر زدند از کمین	تو گفتی زدند آسمان بر زمین
زباریدن تیر ہمچوں تگرگ	زہر گوشہ برخاست طوفان مرگ
بہ صید ہژبراں پر خاش ساز	کمند اژدہائے دہن کردہ باز
زمین آسمان شد ز گرد کبود	چو انجم درو برق شمشیر و خود

غرض نہ انکا یہ دعوے مسلم ہے کہ وہ رزم میں فردوسی اور نظامی کے دوش بدوش چل سکتے ہیں نہ امیر خسرو وغیرہ کی یہ رائے صحیح ہے کہ وہ غزل کے سوا اور کچھ نہیں لکھ سکتے قصائد اور مثنوی میں انکی بلند پائگی سے کون انکار کرسکتا ہے،

ایران میں شاعری کو تین سو برس گذر چکے تھے لیکن شاعری ابتک اصلی جادہ پر نہیں آئی تھی، شاعری کی اصلی حقیقت یہ ہے کہ شاعر کے دل میں کوئی جذبہ پیدا ہو، اور وہ اس جذبہ کو اُسی جوش و خروش سے ادا کردے جس جوش سے وہ پیدا ہوا تھا، فردوسی نظامی، فرخی، انوری کی کمال شاعری میں کسکو کلام ہے لیکن ان میں سے اپنے دل کے جذبات کس نے لکھے؟ فردوسی قدرتی شاعر ہے، اسلیئے وہ غیروں کے جذبات بھی اُسی طرح ادا کرتا ہے کہ گویا خود اسکے دل سے اُٹھے ہیں، عرب کی تحقیر اور طعن کے وقت وہ خود یزدگرد بن جاتا ہے، سہراب کی ماں کا نوحہ اس درد سے لکھا ہے کہ گویا اُسکو سہراب کی ماں کی زبان ہاتھ آگئی ہے، لیکن فرض کرو یہ واقعات خود فردوسی پر پیش آتے تو

گیا ان شعلوں کی شرر فشانی اور نہ بڑھ جاتی، مدحیہ قصائد تو بالکل ہی تصنع اور آورد تھی غزل بھی اس وقت تک گویا قصیدہ ہی کی ایک دوسری صورت تھی، محبت عشق کے جذبات اس میں ادا نہیں کئے جاتے تھے، بلکہ جس طرح مدحیہ قصائد میں ممدوح کی شجاعت وقدرت، جود وسخا، تلوار اور گھوڑے کی مدح کرتے تھے، غزل میں معشوق کے حسن اور اعضا کے اوصاف بیان کرتے تھے،

شیخ پہلا شخص ہے جس نے شاعری کا صحیح استعمال کیا، تفصیل اسکی حسب ذیل ہے،

آزادی

سب سے بڑی چیز جو شیخ کی خصوصیات شاعری میں ہے آزادی ہے، عرب کی شاعری کی اصلی روح یہی تھی، جو عجم میں آ کر گم ہو گئی تھی، عرب کے شعرا سلاطین اور امراء کے متعلق ہر قسم کے خیالات نہایت آزادی سے ادا کرتے تھے متنبی سیف الدولہ کی مدح لکھ کر لیجاتا ہے اور ساتھ ہی نہایت گستاخی اور بیباکی سے اسکو صلواتیں سُناتا جاتا ہے، فردوسی نے بھی محمود کی جاں خراش ہجو لکھی، لیکن رو در رو نہیں بلکہ چوری سے اور پھر تمام عمر بھاگتا پھرا، شیخ کو کئی درباروں سے تعلق رہا، ابو بکر سعد زنگی اسکا خاص ممدوح اور آقا تھا انکیانو جو خاندان اتابک کے خاتمہ کے بعد ہلاکو خاں کے جانشین کی طرف سے شیراز کا گورنر تھا اُس سے بھی شیخ کو تعلق رکھنا پڑتا تھا ان سب کے مقابلہ میں اس نے اپنی آزادی قائم رکھی، ابو بکر بن سعد نے ہلاکو خاں کی اطاعت قبول کر لی تھی یہانتک کہ جب ہلاکو خاں نے بغداد پر چڑھائی کی تو ابو بکر نے اپنے بیٹے سعد کو فوج دیکر اعانت کے لئے بھیجا اور جب بغداد تاراج ہوا تو ابو بکر نے مبارکباد کے لئے سفارت بھیجی، بایں ہمہ شیخ نے بغداد کی تباہی اور خلیفہ مستعصم باللہ کے قتل کا مرثیہ لکھا اور اس قدر پُر اثر لکھا کہ لوگوں کے دل ہل گئے، یہ مرثیہ درحقیقت ابو بکر بن سعد زنگی کی ہجو تھی کہ اس نے اسلام کی تباہی اور بربادی میں ہلاکو خاں کا ساتھ دیا، شیخ نے اس مرثیہ میں ابو بکر کا بھی ذکر کیا اور ہجو ملیح کے طور پر مدح کے پیرایہ میں چوٹ کی،

خسرو صاحبقران غوث زمان بو بکر سعد — آنکہ اخلاقش پسندیدہ ست و اوصافش گزین

مصلحت بود اختیار رائے روشن بین او — زیر دستان را سخن گفتن نشاید جز چنین

یعنی ابوبکر نے جو اتاکو کو بد ددی تو اس میں کچھ مصلحت ہوگی،

انکیانو کی مدح میں شیخ کے متعدد قصیدے ہیں، لیکن ہر قصیدہ میں نہایت دلیری سے اسکو نصیحت کی ہے اور صاف کہدیا کہ جسکو دربار کی طمع نہیں وہ دنیا میں کسی سے نہیں ڈر سکتا،

سعدیا چند انکہ میدانی بگو | حق نباید گفتن الا آشکار
ہر کرا خوف و طمع در بار نیست | از خطا باکش نباشد وز تتار
خسرو عادل امیر نامور | انکیانو خسرو عالی تبار

ایک اور قصیدہ میں لکھتے ہیں،

حرامش باد ملک بادشاہی | کہ پیشش مدح گویند از قفا ذم
جہاں سالار عادل انکیانو | سپہدار عراق و ترک و دیلم
چنیں پند از پدر نشنیدہ باشی | الا گر ہوشیاری بشنو از عم
نہ ہر کس حق تواند گفت گستاخ | سخن ملکی است سعدی را مسلم

بوستان میں لکھتے ہیں،

دلیر آمدی سعدیا در سخن | چو تیغت بدست است فتحے بکن
بگو آنچہ دانی کہ حق گفتہ بہ | نہ رشوت ستانی و نہ رشوہ دہ
طمع بند و دفتر ز حکمت بشوے | طمع بگسل و ہر چہ خواہی بگوے

اس زمانہ میں شاعری کا بڑا حصہ مدح تھی اور شعرا اسی کے ذریعہ سے بسر کرتے تھے شاعری کی بڑی اصلاح یہ تھی کہ شاعری کے چہرہ سے یہ داغ مٹا دیا جائے شیخ نے یہ فرض نہایت نفس کشی کے ساتھ ادا کیا، وہ تنگ حال اور مفلس تھا، لوگ اسکو ترغیب دیتے تھے کہ مدحیہ قصائد لکھو تو اچھی طرح بسر ہوگی، وہ جواب دیتا تھا کہ آزاد گردن کسی کے آگے جھک نہیں سکتی،

گویند سعدیا بچہ بطال ماندہ | سختی مبر کہ وجہ کفافت معین است
یکچند اگر مدیح کنی کامران شوی | صاحب ہنر کہ مال ندارد تغابن است

بے زر میسرت نشود کام دوستاں | چوں کام دوستاں ندہی کام دشمن است
آرے مثل بہ کرگس مُردار خور دہند | سیمرغ را قاف قناعت نشیمن است
از من نیاید ایں کہ بہ دہقان و کدخدا | حاجت برم کہ نعل گدایان خرمن است

عرب میں مدح کے یہ معنی تھے کہ شاعر جس شخص کا ممنون ہوتا تھا یا جو شخص قوم میں قابل مدح کام کرتا تھا، شاعر اسکا اظہار کرتا تھا، لیکن صلہ اور انعام سے اسکو کچھ واسطہ نہ ہوتا تھا زہیر بن ابی سلمےٰ جب ہرم بن سنان کے دربار میں گیا اور ہرم کو سلام کیا تو ہرم نے حکم دیا کہ زہیر جب دربار میں آئے اور سلام کرے تو اسکو صلہ دیا جائے اسکے بعد سے زہیر کا معمول ہو گیا کہ جب دربار میں جاتا تو کہتا کہ تمام مجمع کو سلام کرتا ہوں لیکن ہرم کو نہیں؛ عرب میں سب سے پہلے جس شاعر نے قصیدہ پر صلہ لیا وہ نابغۂ ذبیانی تھا، عرب نے اسکو نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھا،

شیخ نے مدحیہ قصائد کو عرب کے قدیم انداز پر لانا چاہا اس نے سلاطین و امراء کی مدح میں بہت سے قصیدے لکھے ہیں لیکن انکے صحیح اوصاف بیان کرتا ہے اور مبالغہ آمیز خیالات جو مدحیہ قصائد کے عنصر میں داخل ہو گئے تھے اُن کو لغو بتاتا ہے، مثلاً قصیدہ کے خاتمہ میں ممدوح کو یوں دعا دیتے تھے کہ لاکھوں کروڑوں برس زندہ رہے، یہانتک کہ مرزا غالب نے قصہ ہی فیصل کر دیا، ع تا خدا باشد بہادر شاہ باد

شیخ ہزار برس کی دعا دینے پر بھی راضی نہیں،

ہزار سال نگویم بقائے عمر تو باد | کہ ایں مبالغہ دانم ز عقل نشماری
ہمیں سعادت توفیق بر مزیدت باد | کہ حق گزاری و ناحق کسے نیازاری
نہ کاہد انچہ نوشتہ است عمر و نفزاید | پس اینچہ فائدہ گفتن کہ تا بہ حشر بپائے

محمود کو عموماً ابر گہر فشان اور دریائے بیکران کہا کرتے تھے، شیخ کہتا ہے،

نہ گویمت چو زبان آوران رنگ آمیز | کہ ابر مشک فشانی و بحر گوہر زائے

ایک اور قصیدہ میں لکھتے ہیں،

من ایں غلط نہ پسندم ز رائے روشن خویش | کہ دست و طبع تو گویم بہ بحر و کان ماند

یہ انوری کے اس شعر پر تعریض ہے،

گر دل بحر و دست کان باشد		دل و دست خدائگان باشد

مجد الدین رومی کی مدح میں کہتے ہیں،

نگویمت بہ تکلف فلاں دولت و دین		سپہر مجد و معالے جہان دانش و داد

خواجہ شمس الدین محمد اور علاء الدین کا تمام دنیائے اسلام پر احسان تھا تاتاریوں کے آشوب ناک زمانہ میں اسلام کی جو کچھ حالت قائم رہگئی وہ انہی بھائیونکی بدولت تھی اس لئے شیخ ان دونوں بھائیوں کی مدح نہایت اخلاص سے کرتا ہے، لیکن بالکل اسی طرح جس طرح آج کسی گورنر یا حاکم صوبہ کو سپاسنامہ پیش کیا جاتا ہے، مثلاً خواجہ علاء الدین کی مدح میں کہتا ہے،

خدائے خواست کہ اسلام در حمایت او		زشیر حادثہ در بارۂ امان ماند

وگرنہ فتنہ چناں کردہ بود دنداں تیز		کزیں دیار نہ مرغ و نہ آشیان ماند

تو آں جواد زمانی کز ازدحام زمان		درت بہ مشرب شیریں کاروان ماند

جذبات (۲) شیخ کی شاعری عموماً جذبات سے لبریز ہے، وہ شاعری کی کسی صنف کو رسم اور تقلید کی حیثیت سے نہیں برتتا، وہ جانتا ہے کہ شاعری کا اصلی عنصر جذبات ہیں اس لئے وہ اسی وقت شعر کہتا ہے، جب اسکے دل میں کوئی جذبہ پیدا ہوتا ہے، غزل اسوقت تک محض معشوق کی مداحی تھی شیخ نے اسمیں عشق کے اصلی جذبات ادا کئے، جن لوگوں کا اس نے مرثیہ لکھا وہ لوگ تھے جنکے مرنے سے اسکو سخت صدمہ پہنچا تھا، اخلاقی مضامین بھی وہ اسی وقت ادا کرتا ہے جب کسی موثر واقعہ کے پیش آجانے سے خود اسکے دل پر سخت اثر پڑتا ہے مثلاً

تنم بے بلرزد چو یاد آورم		مناجات شوریدۂ در حرم

کہ می گفت و فریاد دلش می فروخت		کرم روز بر بندۂ دلی بسوخت

مرا رقتے در دل آمد بریں		کہ پاک است و خرم بہشت بریں

دراں جلسے پاکاں امیدوار		بگل آلودۂ معصیت را چہ کار

امراء میں سے اسکو سب سے زیادہ محمد بن ابی بکر بن سعد زنگی سے محبت تھی وہ نہایت ہنرور

اور شوکت و شان کا شہزادہ تھا، وہ سفر میں تھا کہ باپ کی مرض الموت کی خبر سنی اضطراب اور سراسیمگی کی حالت میں شیراز کو روانہ ہوا، لیکن راہ میں قضا آ گیا، چونکہ وہ ولیعہد تھا سب لوگ منتظر تھے کہ وہ آ کر تخت و تاج کا مالک ہوگا، اس بنا پر اسکے مرنے کا عام ماتم ہوا، شیخ کو بھی سخت صدمہ ہوا، اسی حالت میں مرثیہ لکھا جس کے ہر شعر سے خون جگر کی بو آتی ہے،

بزرگان چشم و دل در انتظارند — عزیزان وقت و ساعت می شمارند

غلامان دُردگوہر می فشانند — کنیزان دست و ساعد مے نگارند

بہ ترک خان و سیاق و بدرو ترخان — بہ رہواران تازی بر سوارند

کہ شاہنشاہ عادل سعد بوبکر — بہ ایوان شہنشاہی در آرند

حرم شادی کنان برطاق ایوان — کہ مروارید بر تاجش ببارند

بہیبالی امید تاج و تخت خسروی بود — ازیں غافل کہ تابوتش در آرند

چہ شد پاکیزہ رویان حرم را — کہ بر سر کاہ و بر زیور غبارند

نمی دانم حدیث نامہ چون است — ہمی دانم کہ عنوانش بہ خون است

مرثیہ کی اصلاح

(۳) اس وقت تک مرثیہ کا عام انداز یہ تھا کہ اشخاص کا مرثیہ لکھتے تھے قومی یا ملکی مرثیہ کا مطلق رواج نہ تھا، شیخ پہلا شخص ہے جس نے قوم اور ملک کا مرثیہ لکھا، عباسیوں کی سلطنت گو اب برائے نام رہ گئی تھی پھر بھی پانچسو برس کی اسلامی یادگار تھی اور بغداد تمام اسلامی دنیا کا مرکز تھا، اسلئے اُسکا مٹنا قوم کا مٹنا تھا، شیخ نے اس بنا پر خلیفہ اور بغداد اور سلطنت کا مرثیہ لکھا اور جس دل سے اسکا اندازہ ان اشعار سے خود کر سکتے ہو،

آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمین — بر زوال ملک مستعصم امیرالمومنین

اے محمد گر قیامت سر بروں آری ز خاک — سر بروں آر و قیامت در میان خلق بین

نازنینان حرم را موج خون بید ریغ — ز آستان بگذشت و ما را خون دل از آستین

لہ دیکھو مستعصم کے مرنے کا رنج نہیں کرتا بلکہ ملک کے زوال کا رنج کرتا ہے اور انہیں باتوں کا ذکر کرتا ہے جن سے عام قوم کو تعلق ہے،

دیدہ بردار اے کہ دیدی شوکت بیت الحرام | قیصران روم سر برخاک و خاقان بر زمین
خون فرزندان عم مصطفی اشد ریختہ | ہم بر آں جاے کہ سلطانان نہادندی جبین
باش تا فردا بہ بینی روز داد و رستخیز | کز لحد با زخم خون آلودہ برخیزد دفین

ان اجمالی اور سرسری خصوصیات کے بعد ہم ان انواع شاعری سے مفصل بحث کرتے ہیں جنکو شیخ نے ترقی دی یا اُسکا رنگ بدل دیا،

اخلاقی شاعری

(۴) اخلاقی شاعری شیخ سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی، حکیم سنائی خیام، اوحدی، عطار، نے اس زمین کو آسمان تک پہنچا دیا تھا، تاہم شیخ نے اس آسمان کو اور بلند کر دیا، اخلاقی شاعری پر دو حیثیتوں سے نظر ڈالی جا سکتی ہے،

(۱) کس قسم کے اخلاق کی تعلیم کی، اور ان میں کس حد تک فلسفیت اور نکتہ سنجی پائی جاتی ہے،

(۲) فلسفۂ اخلاق کو کس طرح شاعرانہ پیرایہ میں ادا کیا، یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اخلاقی مسائل اگر محض سادہ طریقہ پر نظم میں ادا کر دیئے جائیں تو وہ فلسفہ ہوگا شاعری نہ ہوگی، شیخ نے اخلاقی عنوان جو اختیار کئے وہ حسب ذیل ہیں،

عدل و تدبیر، احسان عام، عشق و محبت، تواضع، رضا بالقضا، قناعت، تربیت شکر، توبہ، مناجات،

عدل و تدبیر اصل میں پالیٹکس اور سیاست سے تعلق رکھتے ہیں لیکن چونکہ انکو اخلاق سے نہایت قومی تعلق ہے، شیخ نے اسکو بھی اخلاق میں شامل کر لیا، ایشیائی ملکوں میں سلطنت کی بنیاد بادشاہ پرستی پر قائم ہوتی ہے اور وہ حاکم علی الاطلاق سمجھا جاتا ہے، اگر وہ عدل و انصاف کرے تو اس کی عنایت ہے اور نہ کرے تو اُسکو کوئی ٹوک نہیں سکتا،

اگر شہ روز را گوید شب است ایں | بباید گفت اینک ماہ و پروین

لیکن شیخ نے مختلف حکایتوں کے پیرایہ میں بتایا کہ ہر شخص کو نہایت آزادی کے ساتھ بادشاہ پر نکتہ چینی کا حق ہے، شیخ نے آزادانہ اعتراض کو جس پیرایہ میں ادا کیا، آزادی بیباکی اور جانبازی کی اس سے بڑھ کر تعلیم نہیں ہو سکتی،

ایک ظالم بادشاہ کی حکایت لکھی ہے کہ لوگوں کے جانور زبردستی پکڑ کر اُن سے کام لیتا تھا اتفاق سے ایک دن شکار کے پیچھے فوج کا ساتھ چھوٹ گیا اور ایک گاؤں میں رات بسر کرنی پڑی ایک شخص کو دیکھا کہ اپنے گدھے کو اسطرح مار رہا ہے کہ اسکے ہاتھ پاؤں بیکار ہوئے جاتے ہیں، بادشاہ نے روکا اسنے کہا میں اسلیئے اسکو بیکار کئے دیتا ہوں کہ ہمارے ملک کا بادشاہ بیگار میں نہ پکڑ لے، یہ کہکر بادشاہ کو خوب برا بھلا کہا، صبح کو اہل فوج ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے گاؤں میں پہنچے اور بادشاہ تخت گاہ میں واپس آیا، یہاں پہنچکر اس نے اس شخص کو پکڑ بلایا اور رات کی گستاخی کی سزا دینی چاہی، اُس نے کہا،

نہ تنہا منت گفتم اے شہریار	کہ برگشتہ بختی و بد روزگار
چرا خشم بر من گرفتی و بس	منت پیش گفتم ہمہ خلق پس

یعنی مجھی پر کیوں غصہ ہے، تجھکو تو سب برا کہتے ہیں، فرق یہ ہے، کہ لوگ پیچھے برا کہتے ہیں، میں نے سامنے کہا،

چو بیداد کردی توقع مدار	کہ نامت بہ نیکی رود در دیار
ترا چارہ از ظلم برگشتن است	نہ بیچارۂ بے گنہ کشتن است

یعنی تجھ کو یہ مناسب ہے کہ ظلم سے باز آئے یہ نہیں کہ ایک بیگناہ کو قتل کردے،

زنا مہربانی کہ در دور تست	ہمہ عالم آوازۂ جور تست
عجب گز منت بر دل آمد درشت	بکش گر توانی ہمہ خلق کشت
بداں کے ستودہ شود بادشاہ	کہ خلقش ستایند در بارگاہ
چہ سود آفرین بر سر انجمن	پس پردہ نفرین کناں مرد و زن
ہمیں گفت و شمشیر بالاے سر	سپر کردہ جان پیش تیر قدر

ایک اور حکایت لکھی ہے کہ ایک درویش کی حق گوئی سے بادشاہ ناراض ہوا اور اسکو قید کر دیا، اُسکے دوستوں نے سمجھایا کہ بادشاہ کے سامنے یہ آزادی خلاف مصلحت تھی، درویش نے جواب دیا،

رسانیدن امر حق طاعت است	ز زندان نہ ترسم کہ یک ساعت است

کسی نے یہ خبر بادشاہ کو پہنچائی، بولا کہ یہ اس کی حماقت ہے ایک ساعت نہیں، تمام عمر اُسکو قید خانہ میں رہنا ہوگا، درویش نے کہا،

کہ دنیا ہمی ساعتے بیش نیست   غم و خور می پیش درویش نیست

بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کی زبان گُدی سے کھینچ لیجائے، درویش نے کہا مجھکو اسکی بھی پروا نہیں، مجھکو جس سے کہنا سننا ہے وہ بولے بغیر میری بات سمجھ سکتا ہے،

من از بیزبانی ندارم غمے   کہ دانم ناگفتہ داند ہمے

اس قسم کی متعدد حکایتیں نہایت پر اثر طریقہ سے لکھی ہیں جس نے اپنے تمام ابنائے زمانہ کے خلاف لوگوں کو آزادی اور بیباکانہ حق گوئی کی تعلیم دی ہے اور جب یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیخ کا یہ قول نہ تھا بلکہ عمل بھی تھا تو اسکی تعلیم کا دل پر نہایت قوی اثر ہوتا ہے، شیخ نے یہ بھی بتایا کہ ملک کی آمدنی میں بادشاہ کا صرف اسقدر حق ہے کہ بقدر ضرورت اس سے تمتع اٹھائے، اس سے زیادہ اسکو کوئی حق نہیں، ایک سادہ وضع بادشاہ کی حکایت لکھی ہے کہ کسی نے اس سے کہا کہ حضور! دیبائے چینی کی قبا زیب تن فرماتے تو زیادہ موزون تھا، بادشاہ نے کہا،

نہ از بہر آن می ستانم خراج   کہ زینت کنم بر خود و تخت و تاج

مرا ہم ز صد گونہ آز و ہوا است   ولیکن نہ تنہا خزینہ مرا است

خزائن پر از بہر لشکر بود   نہ از بہر آئین و زیور بود

چو دشمن خر روستائی برد   ملک باج و دہ[1] یک چرا می خورد

یہ خود شیخ کے خیالات ہیں لیکن بلاغت کے اصول کے لحاظ سے بادشاہ کی زبان سے ادا کیا ہے کہ بادشاہوں پر اسکا اثر زیادہ ہوگا،

احسان عام احسان کا مضمون ایشیا کا مرغوب عام مضمون ہے اور شیخ نے اس مضمون کو اُسی عام طریقہ پر لکھا ہے جو ایشیائی طبائع کا عام انداز ہے، حاتم طائی کی فیاضیوں کی جھوٹی حکایتیں بڑی آب و تاب سے لکھی ہیں اور یہ نہ سمجھے،

[1] وہ محصول جسکو عربی میں عشر کہتے ہیں، یعنی آمدنی کا دسواں حصہ،

بیا بہ ملک قناعت کہ در دسر نہ کشی   زقصہ ہا کہ بہمت فروش طے بستند

یہ بھی ہدایت کی ہے کہ مستحق اور غیر مستحق کی تمیز کی کوئی ضرورت نہیں،

گرہ بر سر بند احسان مزن   کہ ایں مکر و شید است و آں زرق و فن

احیرہیں بڑا دل کرکے یہ تفریق کی ہے کہ ظالموں کے ساتھ احسان نہ کرنا چاہئے تاہم اس باب میں بھی شیخ نے بعض نکتے اپنے زمانہ کے عام سطح سے بالاتر لکھے ہیں مثلاً دینداروں کے نزدیک محاسن اخلاق جس قدر ہیں مثلاً عفو حلم، مروت، جود و کرم سب مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں، غیر مذہب والوں کے ساتھ عموماً اشداء علی الکفار کا برتاؤ کرنا چاہئے لیکن شیخ کے احسان عام کا بادل، ویرانہ و چمن دونوں پر یکساں برستا ہے،

اُس نے ایک حکایت لکھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک گبر کو مومن سمجھکر مہمان کیا، جب اسکا گبر ہونا ظاہر ہوا تو دسترخوان پر سے اُٹھا دیا اس پر وحی آئی کہ

منش دادہ صد سال روزی و جان   ترا نفرت آمد ازو یک زمان

یعنی میں نے تو اسکو سو برس تک کھلایا پلایا، تم دم بھر بھی اسکے ساتھ بسر نہ کرسکے،

عشق

عشق شیخ کے زمانہ میں مسلمانوں کی قوتوں میں یک لخت زوال آچکا تھا، اسلئے عشق و محبت کے سوا اور کیا کام باقی رہا تھا، شیخ نے عام مذاق کے لحاظ سے اس راگ کا چھیڑنا بھی ضروری سمجھا اور اپنی دانست میں اسمیں بھی اصلاح کی یعنی عشق مجازی کو بُرا کہا اور عشق حقیقی کے محاسن بیان کئے، لیکن سچ یہ ہے کہ اگر ایک اخلاقی کتاب سرے سے اس فتنہ انگیز مضمون سے پاک رہتی تو بہت اچھا ہوتا،

ع اہل زکام را دہ ایں گل کہ بو کنند،

قناعت

قناعت تواضع اور رضا وغیرہ کو جادو اثر طریقہ سے بیان کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان مضامین کے بار بار اعادہ کرنے سے قوم میں افسردگی، بیکاری، پست ہمتی پیدا ہوتی ہے اس لئے یہ مضامین ہمارے اخلاقی دفتر سے چند روز کے لئے نکال دینے کے قابل ہیں،

قناعت بظاہر پست ہمتی کا دوسرا نام ہے اور اس میں شک نہیں کہ قناعت کے

جو غلط معنی عموماً علما اور زہاد نے دلوں میں بٹھا دیئے ہیں اس نے قوم کے اپاہج بنانے میں بہت مدد دی ہے، لیکن انصاف یہ ہے کہ شیخ نے قناعت کے جو معنی قرار دیئے وہ انسان کی خودداری اور عزت نفس کا سب سے ضروری مرحلہ ہے، ایشیائی حکومتوں میں ہر قسم کے بیہودہ اخلاق مثلاً خوشامد، ذلت نفس، نفاق، ریا، زمانہ سازی صرف اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ ان باتوں کے بغیر کوئی شخص دولت اور عزت نہیں حاصل کر سکتا اس لئے دولت و عزت کی پروا نہ کرنا ان عیوب سے بچنے کا سب سے پہلا مرحلہ ہے، شیخ اسی بنا پر قناعت کی تعلیم دیتا ہے،

قناعت کن اے نفس بر اندکے — کہ سلطان و درویش بینی یکے

چرا پیش سلطاں بہ خواہش روی — چو یکسو نہادی طمع، خسروی

دگر خود پرستی شکم طبلہ کن — درِ خانۂ این و آں قبلہ کن

قناعت سرافراز دا اے مرد ہوش — سر پر طمع بر نیاید ز دوش

کسے را کہ درج طمع در نوشت — نباید بہ کس عبد و چاکر نوشت

کند مرد را نفس امارہ خوار — اگر ہوشمندی، عزیزش بدار

گر آزادہ بر زمین خسپ و بس — مکن بہر قالی، زمیں بوس کس

چو بینی کہ از سعی بازو خورم — بہ از میدہ بر خوان اہل کرم

یعنی اگر تم قناعت اختیار کروگے تو تمکو بادشاہ اور فقیر یکساں نظر آئینگے، تم بادشاہ کے آگے کیوں سر جھکاتے ہو، طمع چھوڑ دو تم خود بادشاہ ہو، جو شخص طمع چھوڑ دیگا وہ اپنے آپکو غلام اور خانہ زاد نہیں لکھ سکتا، نفس امارہ انسان کو ذلیل کرتا ہے، اگر تمکو عقل ہے تو تم نفس کی عزت کرو، تم کو زمین پر پڑ کر سو رہنا چاہیئے، لیکن قالین کیلئے کسی کے آگے زمین نہیں چومنی چاہیئے، اس سے بڑھ کر کیا شریفانہ تعلیم ہو سکتی ہے،

اس سے ظاہر ہے کہ اگر عزت نفس کے قائم رہنے کے ساتھ دولت و ثروت، نام و نمود، جاہ و اعزاز حاصل ہو سکتا ہے تو شیخ ان سے باز رہنے کی تعلیم کبھی نہیں دیتا ایک حکایت میں شیخ نے اس نکتہ کو صاف اور واضح کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ کسب اور

جہد کو توکل پر ترجیح ہے، حکایت یہ ہے کہ ایک شخص نے ایک لومڑی کو دیکھا جسکے ہاتھ
پاؤں کٹے ہوئے تھے، اسکو تعجب ہوا کہ یہ کھاتی پیتی کہاں سے ہے؟ اتفاق سے ایک شیر
آنکلا اسکے مُنہ میں شکار تھا، جب وہ کھاکر چلا گیا تو لومڑی نے اسکا بچا ہُوا جھوٹا کھالیا،
یہ دیکھ کر اس شخص کو خیال ہُوا کہ ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت نہیں، میں بھی اسی طرح
پا شکستہ بن کر بیٹھ رہوں، خدا کہیں سے روزی بھیجدیگا، لیکن کئی دن گزر گئے یہ یونہی
فاقے کیا کئے، آخر ہاتف غیب پکارا،

برو شیر غرّندہ باش اے دغل | مینداز خود را چو روباہ شل
یعنی شیر ہو کر لومڑی کیوں بنتے ہو،
بہ چنگ آرو با دیگراں نوش کن | نہ بر فضلۂ دیگراں گوش کن
چو مرداں بہ تن رنج و راحت رساں | مخنّث خورد دست رنج کساں
بگیر اے جوان دست درویش پیر | نہ خود را بیفگن کہ دستم بگیر

تربیت

تربیت، تربیت پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، اور بہت سے نکتے ایسے لکھے ہیں جو اس زمانہ کی
سطح سے بالاتر ہیں، مثلاً قدیم تربیت میں لڑکوں کو زجر و توبیخ بلکہ جسمانی سزا دینی ایک
ضروری چیز تھی، اور آجتک وہ خیال قائم ہے، خود شیخ نے ایک معلم کی زبان سے کہا ہے
ع جور استاد بہ ز مہر پدر،
لیکن شیخ کی خود تعلیم یہ ہے،
نو آموز را ذکر و تحسین و زہ | ز توبیخ و تہدید استاد بہ
صنعت و حرفت کی تعلیم امراء کے بچوں کے لئے بھی لازمی قرار دی ہے حالانکہ آج یورپ
کی مثالیں دیکھ کر بھی ہم اُن چیزوں کو ہاتھ نہیں لگاتے،
بیاموز پروردہ را دست رنج | دگر دست داری چو قاروں بگنج
بپایاں رسد کیسۂ سیم و زر | نگردد تہی کیسۂ پیشہ ور
چہ دانی کہ گردیدن روزگار | بہ غربت بگرداندش در دیار
چو بر پیشہ باشدش دسترس | کجا دست حاجت برد پیش کس

عام خیال یہ ہے کہ بچوں کو کم درجہ کی خوراک اور جھوٹا کپڑا پہنانا چاہیئے تاکہ آرام طلب اور عیش پسند نہ ہو جائیں، لیکن شیخ فرماتے ہیں،

پسر را نکو دار و راحت رسان ۔۔۔ کہ چشمش نماند بہ دست کسان

یعنی بچے کو سرو سامان سے رکھنا چاہیئے تاکہ اس میں بلند نظری پیدا ہو اور لوگوں کی طرف اس کی نگاہیں حسرت سے نہ اٹھیں،

اس زمانہ میں امرد پرستی کا عام مرض پھیلا ہوا تھا، صوفیہ اور اہل نظر اسکو عشق حقیقی کی منزل اولین قرار دیتے تھے اور ارباب ذوق کیلئے تفریح خاطر کا اسکے سوا کوئی سامان نہ تھا شیخ چونکہ اس سانپ کو کھلا چکا تھا، اس کی مضرتوں سے خوب واقف تھا اس لئے اس نے نہایت سختی سے اس کی برائیاں بیان کیں،

سر از مغز و دست از درم کن تہی ۔۔۔ چو خاطر بہ فرزند مردم نہی

مکن بد بہ فرزند مردم نگاہ ۔۔۔ کہ فرزند خویشت بر آید تباہ

صوفیہ کا پردہ کھولتے ہیں،

گروہے نشینند با خوش پسر ۔۔۔ کہ ما پاک بازیم و اہل نظر

ز من پرس فرسودۂ روزگار ۔۔۔ کہ بر سفرہ حسرت خورد روزہ دار

ازاں برگ خرما خورد گوسفند ۔۔۔ کہ قفل است بر تنگ خرما و بند

صوفیوں کے اس دعوی کو کہ جمال سے ہمکو صنعت ایزدی کا مطالعہ ہوتا ہے اسطرح رد کرتے ہیں،

چرا عقل یک روزہ ہوشش نہ برد ۔۔۔ کہ در صنع دیدن چہ بالغ چہ خرد

محقق ہماں بیند اندر ابل ۔۔۔ کہ در خوبرویان چین و چگل

یعنی اگر صنعت ایزدی کا مطالعہ مقصود ہے تو وہ ذرہ ذرہ اور پتہ پتہ میں نظر آتی ہے خوش جمال اور پر جمال کی کیا تخصیص ہے، ایک باریک بین کو اونٹ کے ناموزوں ڈیل ڈول میں بھی وہی صنعت کاریاں اور نکتہ آفرینیاں نظر آتی ہیں جو چین اور چگل کے معشوقوں میں ہیں،

شیخ حسن پرستی سے منع نہیں کرتا لیکن بتاتا ہے کہ اسکا صحیح مصرف کیا ہے

زن خوب و خوشخوئے آراستہ ۔۔۔ چہ ماند بہ نادان نو خاستہ
امرد

درو دم چو غنچہ دمے از وفا | کہ از خندہ افتند چو گل بر قفا
خرابت کند شاہد خانہ کن | برو خانہ آباد گرداں بہ زن

افسوس ہے کہ عورتوں کا رتبہ شیخ کے زمانہ میں مردوں سے بہت کم سمجھا جاتا تھا اسلئے جو لوگ اپنی بیوی سے زیادہ محبت رکھتے تھے زن پرست کہلاتے تھے اور لوگ انکو طعنہ دیتے تھے' شیخ نے اگرچہ ان لوگوں کی طرف سے یہ معذرت کی ہے،

کسے را کہ بینی گرفتار زن | مکن سعدیا طعنہ بر وے مزن
تو ہم جور بینی و بارش کشی | گر یک شبے در کنارش کشی
زناں شوخ و فرمانده و سرکش اند | و لیکن بدیدم کہ دربر خوش اند

لیکن افسوس ہے کہ اس قدسی پیکر کی غرض و غایت لوگوں نے صرف نفس پرستی سمجھی' یہ نہ سمجھے کہ یہ جنس لطیف چہرۂ کائنات کا آب و رنگ ہے' شیخ نے عورتوں کے متعلق ایک اور ہدایت کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ کا معیار اخلاق کس قدر پست ہو گیا تھا،

زن نو کن اے دوست در ہر بہار | کہ تقویم پارینہ ناید بکار

لیکن اگر عورت بھی اس فلسفہ پر عمل کرے تو کیا جواب ہوگا؟

شیخ ہمہ تن مذہبی آدمی تھا، اس لئے اُس نے تعلیم و اخلاق کی بنیاد بھی مذہب پر رکھی ہے' مذہبی غلو میں حقیقت شناسی بہت کم قائم رہتی ہے' فرض کرو ایک شہر میں ہزاروں مسجدیں ہیں اور نمازیوں کی ضرورت سے زیادہ ہیں، باوجود اسکے ایک شخص پھر نئی مسجد بنائے تو مذہبی آدمی کبھی اس کام کو عبث اور بیفائدہ نہیں کہہ سکتا، حالانکہ قرون اولی میں ایسے کام سے علانیہ روک دیا جاتا تھا حضرت عمر نے حکم بھیجدیا تھا کہ کسی شہر میں بجز کوفہ و بصرہ کے' ایک سے زیادہ مسجد نہ بننے پائے' ولید نے جامع مسجد کی تعمیر میں شاہانہ حوصلہ مندی کی تو قوم نے علانیہ کہدیا کہ بیت المال کا روپیہ اس طرح ضائع نہیں کیا جا سکتا' فرض کرو ایک شہر میں بہت سی مسجدیں موجود ہیں' لیکن انگریزی تعلیم (جو تحصیل معاش کا ذریعہ ہے) اسکا سامان بالکل نہ ہو، اب ایک شخص مسجد اور دوسرا شخص انگریزی مدرسہ

بتائیے تو تم کس کام کو ترجیح دوگے؟

شیخ کی نکتہ سنجی پر حیرت ہوتی ہے جب نظر آتا ہے کہ وہ مذہبی جوش اور غلو کے ساتھ حقیقت شناسی سے کبھی الگ نہیں ہوتا، ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک بادشاہ نے روزہ رکھا باورچی کی بیوی نے کہا سلطان کو اس روزہ سے کیا ثواب ہوگا کہ ہم سب بھوکے مرینگے،

کہ سلطان ازیں روزہ گوئی چہ خواست | کہ افطار او عید طفلان ماست

شیخ اس مسئلہ کو زیادہ روشن کرنے کے لئے خود اپنی زبان سے کہتا ہے،

خورندہ کہ خیرش بر آید ز دست | بہ از صائم الدہر (روزہ دار) دنیا پرست

مُسلّم کسے را بود روزہ داشت | کہ درماندۂ را دہد نان چاشت

وگرنہ چہ حاجت کہ زحمت بری | ز خود باز داری وہم خود خوری

خیالات نادان خلوت نشین | بہم بر کنند عاقبت کفر و دین

اخیر شعر میں کہتا ہے کہ سادہ دل خلوت نشین مذہب کو خراب کر دیتا ہے،

ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک درویش نے حج کا سفر کیا اور ہر ہر قدم پر دو رکعتیں نماز پڑھتا جاتا تھا، اس ریاضت شاقہ پر اسکو دل میں غرور پیدا ہوا، ہاتف غیب نے آواز دی کہ ایک دل کو خوش کرنا ہزار رکعت سے بہتر ہے،

بہ احسانے آسودہ کردن دلے | بہ از الف رکعت بہر منزلے

ریاکار عالموں کی قلعی سب نے کھولی ہے لیکن صوفیہ کا گروہ کثیر جو ہمہ تن ریاکار ہے انکی نسبت کسی کو ریاکاری کا گمان بھی نہیں ہوتا اور ہو بھی تو عوام کے ڈر سے ظاہر نہیں کرسکتا، شیخ اس راز سے خوب واقف تھا، اس لئے اس نے نہایت دلیری سے اس طلسم کو توڑا، غزلوں میں نہایت لطیف پیرایوں میں اس مضمون کو ادا کیا ہے،

بروں نمیرود از خانقہ یکے ہشیار | کہ پیش شحنہ بگوید کہ صوفیان مستند

محتسب در قفائے رندان است | غافل از صوفیان شاہد باز

بوستان میں ایک شخص کی زبان سے ان لوگوں کی پوری تصویر کھینچی ہے،

کہ زنہار ازیں مردمان خموش | پلنگاں درندۂ صوف پوش

کہ چوں گربہ زانو بہم برزنند — وگر صیدے افتد چو سگ درجہند
سوے مسجد آوردہ دکان شید — کہ در خانہ کمتر تواں یافت صید
سپید و سیہ پارہ بر دوختہ — بہ سالوس پنہاں زر اندوختہ
زہے جو فروشان گندم نماے — جہاں گرد و سالوس و خرمن گداے
مبیں در عبادت کہ پیرند و سست — کہ در رقص و حالت جوانند و چست
عصاے کلیم اند بسیار خوار — بہ ظاہر چنیں زرد روے و نزار
ز سنت نہ بینی در ایشان اثر — بجز خواب پیشین و نان سحر

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شیخ نے اخلاق کی بنیاد بے تعصبی پر قائم کی، اُس نے مختلف طریقوں سے بے تعصبی کی تعلیم دی ہے اور جتایا ہے کہ تعصب کے ساتھ اخلاق کا لطیف اور نازک حاسہ قائم نہیں رہ سکتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک گبر سے جو برتاؤ کیا تھا اسکی نسبت وحی کے ذریعہ سے انکو خدا نے تنبیہ کی کہ ہمارا یہ طریقہ نہیں، اس حکایت سے شیخ کو یہ جتانا تھا کہ معاشرت اور حسن اخلاق میں کافر و مسلم کی تمیز نہیں، شیخ عموماً ہر مذہب و ملت کے بڑے لوگوں کا نام جب لیتا ہے تو ادب سے لیتا ہے، دارا آتش پرست تھا، تاہم شیخ کہتا ہے،

شنیدم کہ داراے فرخ تبار — ز لشکر جدا ماند روز شکار

نوشیرواں کے زمانہ میں پیدا ہونے پر رسول اللہ کا ناز کرنا ثابت کرتا ہے،

سزد گر بدورش بنازم چناں — کہ سید بدوران نوشیرواں

خود سنی اور پکا سنی تھا (علی رغم انف قاضی نور اللہ)، لیکن فردوسی کا نام (جو قطعاً شیعہ تھا) اسطرح لیتا ہے،

چہ خوش گفت فردوسی پاک زاد — کہ رحمت بر آں تربت پاک باد

کیا آج کوئی روشن خیال سے روشن خیال سنی عالم، کسی شیعہ کی تربت کو پاک اور اُس کی نسبت رحمت کی دعا کرسکتا ہے،

باریک

شیخ نے اگرچہ فلسفہ اخلاق کو شاعرانہ انداز میں لکھا لیکن مسائل اخلاق کے متعلق بہت سے ایسے نازک، دقیق، اور لطیف دلائل اور وجوہ بیان کئے کہ اخلاق کی فلسفیانہ

تصنیفات میں بھی نہیں مل سکتے، کبر، حسد، غیبت وغیرہ خبائث نفسانی کی برائیوں کے وجوہ تمام کتابوں میں مذکور ہیں، لیکن شیخ ان سب سے الگ دقیق باتیں پیدا کرتا ہے بدگوئی کی برائی کی نسبت کہتا ہے،

بد اندر حق مردم نیک و بد   مگوئے جواں مرد صاحب خرد
کہ بد مرد را خصم خود میکنی   دگر نیک مرد است بد می کنی

یعنی بدگوئی نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ جس کی بدگوئی کروگے دو صورت سے خالی نہیں، اگر وہ اچھا آدمی ہے، تو اچھے آدمی کو برا کہنا مناسب نہیں اور برا ہے تو برے آدمی کو اپنا دشمن بنا لینا اچھا نہیں، یہ ظاہر ہے کہ برا آدمی کسی کی دشمنی کرتا ہے تو جائز ناجائز کی پروا نہیں کرتا اسلئے برے آدمی کو اپنا دشمن بنانا اپنے آپ کو بلا میں پھنسانا ہے، یہ تقسیم اور استدلال جس قدر فلسفیانہ ہے اسی قدر واقعی اور عملی ہے،

یا مثلاً خاموشی کی خوبیاں تمام اخلاقی کتابوں میں مختلف طریقوں سے بیان کی ہیں لیکن شیخ سب سے الگ فلسفیانہ طریقہ سے اسکو ثابت کرتا ہے،

ترا خامشی اے خداوند ہوش   وقار است و نااہل را پردہ پوش
اگر عالمے ہیبت خود مبر   وگر جاہلی پردۂ خود مدر

یعنی خاموشی، عالم، جاہل دونوں کے لیے مفید ہے، عالم کا وقار بڑھتا ہے اور جاہل کا پردہ ڈھکا رہتا ہے،

یا مثلاً دوسروں کے اعتراض اور نکتہ چینی کا برا نہ ماننا اور اسکو گوارا کرنا اسکو شیخ اسطرح دلنشین کرتا ہے،

گر آید کہ دشمنت گوید مرنج   در آں نیستی گو، برو باد سنج

یعنی دو حال سے خالی نہیں، یا جو اعتراض دشمن کرتا ہے واقعی ہے تو واقعی اور سچی بات کا برا ماننا کیا؟ اور جھوٹ اور غلط کہتا ہے تو جھوٹ بات کا کیا رنج اسکو بکنے دو،

یا مثلاً بدمزاج اور بد اخلاق زہاد کی نسبت لکھتے ہے،

زخورد از عبادت بر آں بیخرد   کہ با حق نکو بود و با خلق بد

بیخرد

یعنی اس شخص نے عبادت کا پھل نہیں چکھا جو بندوں کے ساتھ بھلائی سے پیش آیا اور مخلوقات کے ساتھ برائی سے یہاں یہ دقیق نکتہ بتایا ہے کہ کج خلق عابد جو عبادت کرتے ہیں انکی عبادت اصلی نیکی اور دل کے اقتضا سے نہیں ہوتی بلکہ سزا اور عقاب کے ڈر سے ہوتی ہے اسکا ثبوت یہ ہے کہ جس سے انکو اس قسم کا اندیشہ نہیں (بندگان خدا سے) اُس سے وہ کج اخلاقی اور بدمزاجی اور دل آزاری کا برتاؤ کرتے ہیں،

شیخ نہایت سرسری اور معمولی واقعات سے جو رات دن لوگوں کو پیش آتے رہتے ہیں نہایت دقیق نکتے پیدا کرتا ہے مثلاً چھوٹے بچوں کو لوگ میلے ٹھیلے میں ساتھ لیجاتے ہیں تو اُسکے ہاتھ میں دامن دیدیتے ہیں کہ پکڑے رہیں کہیں بھٹک نہ جائے، شیخ کو بچپن میں یہ واقعہ پیش آیا تھا،

شیخ نے اس سے یہ نکتہ پیدا کیا،

همے یاد دارم ز عہد صغر کہ عیدے برون آمدم با پدر
بہ بازیچہ مشغول مردم شدم در آشوب خلق از پدر گم شدم
برآوردم از بیقراری خروش پدر ناگہانم بمالید گوش
کہ اے شوخ چشم آخرت چند بار بگفتم کہ دستت ز دامن مدار
تو ہم طفل راہی بہ سعی اے فقیر برو دامن نیک مردان بگیر

یعنی جو شخص راہ سلوک کی ابتدائی منزلوں میں ہے وہ بچہ ہے اس لئے اُسکو مرشد کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیئے،

تم نے دیکھا ہوگا کہ بلّی اپنے فضلہ کو خاک میں چھپا دیتی ہے تم کو کچھ خیال بھی نہ آیا ہوگا لیکن شیخ اس بتذل واقعہ سے کس قدر پُر اثر اخلاقی نتیجہ استنباط کرتا ہے،

پلیدے کند گربہ بر جائے پاک چو زشتش نماید بپوشد بہ خاک
تو آزادی از ناپسندیدہ ہا نترسی کہ بر وے فتد دیدہ ہا

یعنی بلّی کو اتنا خیال ہے کہ وہ اپنے فضلہ کو جو بدنما معلوم ہوتا ہے، چھپا دیتی ہے، تم ہزاروں برائیاں کرتے ہو اور لوگ دیکھتے ہیں اور تمکو شرم نہیں آتی،

ایک شخص کیچڑ میں لتھڑا ہوا مسجد میں جانے لگا، موذن نے ڈانٹا کہ نجاست کے ساتھ ایسی پاک جگہ میں جاتا ہے شیخ پر اسکا اثر جو ہوا وہ یہ تھا،

گِل آلودہ راہ مسجد گرفت ۔ ز بخت نگوں طالع اندر شگفت
یکے زجر کردش کہ تبت یدا ۔ مرو دامن آلودہ در جائے پاک
مرا رقتے در دل آمد بریں ۔ کہ پاک است وخرم بہشت بریں
دراں جای پاکاں امیدوار ۔ گِل آلودۂ معصیت را چہ کار

بچپن میں شیخ کے والد نے شیخ کو انگوٹھی خرید کر دی کسی عیار نے مٹھائی کا لالچ دیا انکو انگوٹھی کی کیا قدر تھی، مٹھائی لیکر انگوٹھی دیدی، یہ واقعے عموماً پیش آتے ہیں شیخ اس سے کس قدر عظیم الشان نتیجہ پیدا کرتا ہے،

بدر کرد ناگہ یکے مشتری ۔ بہ شیرینی از دستم انگشتری
چو نشناسد انگشتری طفل خرد ۔ بہ شیرینی از وے تواند برد
تو ہم قیمت عمر نشناختی ۔ کہ در عیش شیریں برانداختی

لطف واحسان کا اثر ایک معمولی واقعہ سے اس طرح ثابت کرتے ہیں،

بہ رہ بر یکے پیشم آمد جوان ۔ بہ تگ در پیش گوسفندے دواں
بدو گفتم ایں ریسمان است وبند ۔ کہ می آید اندر پیت گوسفند
سبک طوق وزنجیرازو باز کرد ۔ چپ وراست پوئیدن آغاز کرد
چو باز آمد از عیش وشادی بجائے ۔ مرا دید وگفت اے خداوند رائے
نہ ایں ریسمان مے برد بانمش ۔ کہ احسان کمندیست در گردنش

ایک درویش کو کتے نے پاؤں میں کاٹ لیا، زخم کی تکلیف سے رات بھر وہ کراہا کیا اُسکے ایک کمسن لڑکی تھی، اُسنے کہا ابا! پھر آپنے کیوں نہیں کتے کو کاٹا کہ برابر سرابر ہوجاتے درویش نے کہا جان من! میرے دانت کتے کے قابل نہ تھے شیخ اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ تم کو اگر کوئی نااہل برا کہے اور تم بھی اسکو برا کہو تو اسکی یہی مثال ہوگی کہ آدمی کتے کو کاٹنا چاہے،

محال است اگر تیغ بر سر خورم — کہ دندان بہ پائے سگ اندر برم
تواں کرد با ناکساں بد رگی — ولیکن نیاید ز مردم سگی

شیخ کی انتہائے قوتِ تخیل کا اندازہ، اُن فرضی حکایتوں سے ہوسکتا ہے جو محض اُسکی قوتِ تخیل کا نتیجہ ہوتی ہیں اور جنکو وہ واقعیت اور حسنِ استدلال کا مجموعہ بنادیتا ہے مثلاً

یکے قطرہ باران ز ابرے چکید — خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائیکہ دریاست من کیستم — گر او ہست، حقا کہ من نیستم
چو خود را بہ چشمِ حقارت بدید — صدف در کنارش بجاں پرورید
سپہرش بہ جائے رسانید کار — کہ شد نامور لولوئے شاہوار

یعنی بادل سے ایک قطرہ ٹپکا، دریا کا پاٹ دیکھ کر شرمایا کہ اسکے آگے میری کیا حقیقت ہے، چونکہ اُس نے اپنے آپ کو حقیر سمجھا، سیپ نے اسکو اپنی گود میں لیا، چند روز کے بعد دیکھا تو وہی قطرہ گوہرِ شاہوار تھا،

یا مثلاً گلے خوشبوئے در حمام روزے — رسید از دستِ محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری — کہ از بوئے دل آویزِ تو مستم
بگفتا من گلِ ناچیز بودم — ولیکن مدتے با گل نشستم
جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد — وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

یا مثلاً زدم تیشہ یک روز بر تلِ خاک — بگوش آمدم نالۂ دردناک
کہ زنہار اگر مردی آہستہ تر — کہ چشم و بناگوش و روئے ست و سر

یعنی میں نے ایک دن ایک خاک کے ٹیلہ پر پھاوڑا مارا، اُس سے آواز آئی کہ میاں اگر تم میں آدمیت اور غیرت ہے تو ذرا آہستہ، کیونکہ یہ سب آنکھیں اور کان اور چہرے اور سر ہیں،

(یعنی آج جو خاک ہے یہ پہلے انسان کے اعضا تھے جو بوسیدہ ہو کر خاک ہوگئے)

یا مثلاً نگر دیدہ باشی کہ در باغ و راغ — بتابد بہ شب کرمکے چوں چراغ
یکے گفتش اے مرغکِ شب فروز — چہ بودت کہ بیروں نیائی بروز

بہ بیں کاتشیں کرمک خاک زاد — جواب از سر روشنائی چہ داد
کہ من روز و شب جز بہ صحرا نیم — ولے پیش خورشید پیدا نیم

یا مثلاً

شبے یاد دارم کہ چشمم نخفت — شنیدم کہ پروانہ باشمع گفت
کہ من عاشقم گر بسوزم رواست — ترا گریہ و سوز بارے چراست
بگفت اے ہوادار مسکین من — برفت از برم یار شیریں من
تو بگریزی از پیش یک شعلہ خام — من استادہ ام تا بسوزم تمام
ترا آتش عشق اگر پر بسوخت — مرا بیں کہ از پائے تا سر بسوخت

پیرایۂ ادا

شیخ کی کمال شاعری کا اصلی معیار، اسکا پیرایہ ادا ہے، اس سے زیادہ کوئی شخص اس بات کا اندازہ نہیں کرسکتا کہ کس مضمون کے موثر کرنیکا سب سے بڑھکر کونسا طریقہ ہے جن جن مضامین کو اس نے لیا ہے انکو جس پیرایہ میں ادا کیا ہے، متقدمین اور متاخرین میں اسکی نظیر مطلق نہیں مل سکتی، اسی کا نتیجہ ہے کہ اخلاق میں، سیکڑوں ہزاروں کتابیں لکھی گئیں، صرف ایک مخزن الاسرار نظامی کی طرز پر ٦٥ مثنویاں لکھی گئیں، اور سب کی سب اخلاق و تصوف ہی میں ہیں، لیکن بوستان اور گلستان کے آگے کسی کا چراغ نہ جل سکا، چند مثالوں سے تم اسکا اندازہ کرسکتے ہو،

مثلاً دولت و حکومت کی تنقیص، ایک پامال مضمون ہے جو سیکڑوں دفعہ لوگ مختلف پیرایوں میں ادا کرچکے ہیں، لیکن شیخ کا صرف ایک شعر سب پر بھاری ہے

گدا را کند یک درم سیم سیر — فریدون بہ ملک عجم نیم سیر

شیخ نے اسکے ساتھ فلسفیانہ طریقہ سے ثابت کردیا ہے کہ دولتمندی درحقیقت محتاجی ہے،

خبر دہ بہ درویش سلطان پرست — کہ سلطان ز درویش مسکین ترست
نگہبانی ملک و دولت بلا است — گدا پادشاہ است و نامش گدا است
بخسپند خوش روستائی و جفت (دہقان، بیوی) — بہ ذوقے کہ سلطان در ایوان نخفت

اسی مضمون کو ایک مصرع میں ادا کیا ہے،

ع آنانکہ غنی تراند محتاج تراند،

یہ ظاہر ہے کہ انسان جس قدر دولتمند اور امیر ہوتا جاتا ہے، اُسکی ضرورتیں اور حاجتیں بڑھتی جاتی ہیں، اسلئے زیادہ دولتمندی درحقیقت زیادہ محتاجی ہے، یا مثلاً یہ تلقین کرنا تھا کہ دولتمندوں کو غریبوں پر رحم کرنا چاہیئے، اسکو شیخ نے اس حکایت کے پیرایہ میں ادا کیا،

ملک صالح از پادشاہان شام — بروں آمدے صبحدم با غلام
بگشتے در اطراف بازار و کوی — برسم عرب نیمہ بربستہ روی
دو درویش در مسجدے خفتہ یافت — پریشان دل و خاطر آشفتہ یافت
یکے زاں دو می گفت با دیگرے — کہ ہم روز محشر بود داورے
گرایں بادشاہان گردن فراز — کہ با لہو و عیش اند و با کام و ناز
درآیند با عاجزاں در بہشت — من از گور سر بر نگیرم ز خشت
بہشت بریں ملک و ماوای ماست — کہ بند غم امروز بر پای ماست
اگر صالح آں جا بہ دیوار باغ — درآید بہ کفشش بدرم دماغ

حکایت کا ماحصل یہ ہے کہ ملک صالح (شام کا بادشاہ، اور سلطان صلاح الدین کے خاندان سے تھا) ایک دن شہر کے گشت کو نکلا، دو فقیر ایک مسجد میں لیٹے تھے، اور جاڑے اور بھوک کی تکلیف سے بیتاب تھے، ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ آخر قیامت میں بھی کوئی حاکم ہوگا، اگر یہ بادشاہ لوگ جو دنیا میں مزے اڑاتے پھرتے ہیں، ہم غریبوں کے ساتھ بہشت میں داخل ہونگے تو میں قبر سے سر نہ اٹھاؤنگا، بہشت ہمارا حصہ ہے کہ ہم آج مصیبتیں بھر رہے ہیں صالح اگر وہاں بہشت کی دیوار کے پاس بھی آیا تو اسکا سر توڑ دونگا،

دولتمندوں کو غریبوں پر رحم دلانے کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ یہ ہے کہ تکلیف کی حالت میں غریبوں کو امیروں کی ناز و نعمت پر جو رشک، جلن اور غصہ پیدا ہوتا ہے اسکو دکھایا جائے

شیخ نے اسکی نہایت صحیح تصویر کھینچی، خیبر کا شعر باوجود اسکے تہذیب کی حد سے بڑھا ہوا ہے واقعیت اور اصلیت کی اصلی تصویر ہے، لیکن شیخ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بادشاہ کی فیاضانہ طرز عمل کو بھی دکھایا،

روان سرور دکس را فرستاد و خواند ۔۔۔ بہ ہیبت نشست و بہ حرمت نشاند
بر ایشاں ببارید باران جود ۔۔۔ فرو شست شان گرد ذل از وجود
شہنشہ ز شادی چو گل بر شگفت ۔۔۔ بخندید و در روے درویش گفت
من آں کس نیم کز غرور و حشم ۔۔۔ ز بیچارگاں روے در ہم کشم
من امروز کردم، در صلح باز ۔۔۔ تو فردا مکن، در بر ویم فراز

یعنی بادشاہ نے ان فقیروں کی مہمانی اور حاجت روائی کرکے کہا کہ آج میں آپ لوگوں کے ساتھ عاجزی اور دوستی کا برتاؤ کرتا ہوں، آپ بھی میرے ساتھ قیامت میں مہربانی کیجئے گا اور مجھ کو بہشت میں آنے سے نہ روکئے گا،

سننے والے پر فقیروں کے غم اور غصہ سے جو اثر پیدا ہوا تھا وہ بادشاہ کے شریفانہ طرز عمل اور حکیمانہ جواب سے کس قدر اور زیادہ قوی ہوگیا، ممکن نہیں کہ ایک دردمند دل اسکو پڑھے اور اُسکے آنسو نکل نہ آئیں،

یا مثلاً غیبت کی برائی کو لوگوں نے مختلف پیرایوں میں ادا کیا تھا شیخ نے سب سے زیادہ اچھوتے لیکن نہایت موثر طریقہ سے اس حکایت کے پیرایہ میں مضمون کو ادا کیا،

طریقت شناسانِ ثابت قدم ۔۔۔ بہ خلوت نشستند چندے بہم
یکے زاں میان غیبت آغاز کرد ۔۔۔ در ذکر بیچارۂ باز کرد
کسے گفتش اے یار شوریدہ رنگ ۔۔۔ تو ہرگز غزا کردۂ در فرنگ
بگفت از پس چار دیوار خویش ۔۔۔ ہمہ عمر ننہادہ ام پائے پیش
چنیں گفت درویش صادق نفس ۔۔۔ ندیدم چنیں بخت برگشتہ کس
کہ کافر ز پیکارش ایمن نشست ۔۔۔ مسلماں ز جور زبانش نہ رست

یعنی چند آدمی ایک صحبت میں شریک تھے ایک شخص نے کسی کی غیبت شروع کی ایک

نیک نفس نے اُس سے کہا کہ کیوں یار کبھی تم نے کافروں سے لڑائی بھی کی ہے؟ اس نے کہا میں نے تو کبھی گھر سے قدم بھی باہر نہیں نکالا، نیک نفس نے کہا سبحان اللہ! کافر تو آپ کے حملہ سے محفوظ رہا، لیکن مسلمان آپ کی تیغ زبان سے نہ بچ سکا، ایک اور طریقہ سے اسی مضمون کو ادا کیا ہے،

زبان کرد شخصے بہ غیبت دراز | بدو گفت دانندۂ سرفراز
کہ یاد کساں پیش من بد مکن | مرا بدگماں در حق خود مکن

زیادہ گوئی کی برائی نہایت پامال مضمون ہے شیخ اس مضمون کو کس قدر عجیب اسلوب سے ادا کرتا ہے،

کمال است در نفس انسان سخن | تو خود را بہ گفتار ناقص مکن

یعنی قوت ناطقہ ہی انسان کا سب سے بڑا کمال ہے ایسا نہ کرو کہ یہی صفت زیادہ گوئی کی وجہ سے تمہارے نقصان کا سبب قرار پائے،

کم آواز ہرگز نہ بینی خجل | جوی مشک بہتر کہ یک تودہ گل
حذر کن ز نادان دہ مردہ گوی | چو دانا یکے گوی و پروردہ گوی
صد انداختی تیر و ہر صد خطا است | اگر ہوشمندی یک انداز و راست

یعنی سیکڑوں تیر تم نے نشانہ پر لگائے اور سب خالی گئے اگر عقلمند ہو تو ایک تیر لگاؤ لیکن ٹھیک نشانہ پر لگاؤ،

مناجات، تضرع، استغفار اور توبہ فی نفسہ ایک موثر مضمون ہے لیکن شیخ نے اسکو ایک حکایت کے پیرایہ میں کس قدر اور زیادہ مؤثر کر دیا ہے،

شنیدم کہ مستی ز تاب نبید | بہ مقصورۂ عابدے بر دوید
بنالید بر آستان کرم | کہ یارب بہ فردوس اعلیٰ برم
مؤذن گریبان گرفتش کہ ہین | سگ و مسجد اے فارغ از عقل و دین
چہ شائستہ کردی کہ خواہی بہشت | نمی زیبدت ناز بر بار دوئے زشت
بگفت این سخن پیر و بگریست مست | کہ مستم بدار از من اے خواجہ دست

عجب داری از لطف پروردگار | کہ باشد گنہگارے امیدوار
تر امی نگویم کہ عذرم پذیر | در توبہ باز است وحق دستگیر
ہمی شرم دارم زلطف کریم | کہ خواہم گنہ پیش عفوش عظیم

یعنی ایک مست نشہ کے زور میں مسجد میں گھس گیا اور روکر پکارا کہ اے خدا مجھ کو بہشت میں لیجا، مؤذن نے اسکا گریبان پکڑ کر کہا کہ او سگ نجس، مسجد میں تیرا کیا کام، تونے کون اچھا عمل کیا ہے کہ بہشت کا دعوےٰ ہے، مست رو پڑا اور بولا کہ آپ کو خدا کے لطف عمیم سے یہ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ ایک گنہگار اسکی مغفرت کا امیدوار ہو، میں نے آپ سے تو مغفرت کی خواہش نہیں کی توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اور خدا دستگیر ہے مجھکو تو شرم آتی ہے کہ میں خدا کے عفو کے مقابلہ میں اپنے گناہ کو زیادہ سمجھوں،

غور کرو شیخ نے اس مضمون کے مؤثر کرنے کیلئے بلاغت کے کن نکتوں کو ملحوظ رکھا ہے، سب سے پہلے یہ کہ مناجات میں براہ راست خدا کو مخاطب نہیں کیا، کیونکہ انسان کسی شخص کو جب مخاطب کرکے اسکی مدح، یا اسکی نسبت حسن ظن ظاہر کرتا ہے تو اس میں ظاہر داری اور خوشامد کے شائبہ کا احتمال ہوتا ہے، یہی نکتہ ہے کہ سورۂ الحمد میں خدا کی حمد صیغۂ غائب سے ادا کی ہے، مؤذن کی ڈانٹ بتانے سے، مناجات مانگنے والے کی نسبت دل میں رحم کا اثر پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس سے اسکی نہایت مظلومی اور مؤذن کی بیرحمی ظاہر ہوتی ہے اب اسکا یہ جواب کہ میں آپ سے تو رحم کا خواستگار نہیں، مجھکو جس سے امید ہے، وہ اور ہی کریم النفس ذات ہے مناجات کے قبول کیلئے کس قدر مؤثر ہے، یہ قاعدہ ہے کہ کوئی شخص اگر کسی کی پیٹھ پیچھے اسکی مہربانی اور رحم پر اپنا بھروسہ ظاہر کرے تو اس شخص کو خواہ مخواہ اسکی شرم اور اسکا پاس ہوگا، ان باتوں کی مجموعی ترتیب نے مناجات اور طلب مغفرت کے مضمون کو نہایت مؤثر کر دیا ہے،

ہمنے اطناب کے ڈر سے صرف چند مثالوں پر قناعت کی، عموماً جن مضامین کو شیخ نے ادا کیا ہے انکا مقابلہ اور شعرا اور مصنفین سے کرو تو صاف نظر آئیگا کہ شیخ کو اس خصوصیت میں کیا ترجیح حاصل ہے،

مناظرِ قدرت اس قسم کے مضامین ہیں، بہار کا مضمون سب سے زیادہ پامال ہے اور ابتک پامال ہوتا آتا ہے لیکن شیخ کے قصیدہ کا ابتک جواب نہ ہو سکا،

بامدادان کہ تفاوت نہ کند لیل و نہار — خوش بود دامن صحرا و تماشائے بہار
(یعنی دن اور رات برابر ہو گئے)

آدمی زادہ اگر در طرب آید چہ عجب — سرو در باغ برقص آمدہ و بید و چنار

باش، تا غنچۂ سیراب دہن باز کند — بامدادان چو سر نافۂ آہوئے تتار

باد گیسوی عروسان چمن شانہ کند — بوی نسرین و قرنفل برود در اقطار

ژالہ بر لالہ فرود آمدہ، ہنگام سحر — راست، چون عارض گلبوی عرق کردہ یار

شبنم ارغوان ریختہ، بر در گہ خضراے چمن — ہم چنان است کہ بر تختۂ دیبا، دینار

این ہنوز اول آثار جہان افروزی است — باش تا خیمہ زند، دولت نیسان و ایار
(بہار کے مہینے میں)

شاہد دختر دوشیزۂ باغ اند ہنوز — باش تا حاملہ گردند بہ الوان ثمار
(رنگ برنگ کے پھل)

تا نہ تاریک شود، سایۂ انبوہ درخت — زیر ہر برگ چراغے بنہند از گل نار

سیب را ہر طرفے دادہ طبیعت رنگے — ہم بدان گونہ کہ گلگونہ کند بوئے نگار

گو نظر باز کن و خلقت نارنج بہ بیں — ایکہ باور نہ کنی فی الشجر الاخضر نار

آب در پائے ترنج و بہ بادام روان — ہم چو در زیر درختان بہشتی انہار

غزل یہ عموماً مُسلّم ہے کہ شیخ غزل کے ابوالآباء ہیں، قدماء تو سرے سے غزل کہتے نہ تھے قصائد کے ابتداءً میں عرب کے طرز پر جو تشبیب کہتے تھے یہی اُس زمانہ کی غزل تھی، متاخرین قدماء مثلاً انوری، ظہیر، وغیرہ نے قصیدہ سے الگ کر کے غزلیں لکھیں لیکن ان میں کسی قسم کا اثر، اور کسی قسم کی خیال بندی اور نکتہ آفرینی نہ تھی البتہ چونکہ زمانہ کی امتداد سے قدرتی طور پر زبان خود روز بروز سادہ اور صاف ہوتی جاتی تھی اسلئے غزل کی صفائی اور سادگی بھی روز بروز ترقی کرتی جاتی تھی، کمال اسمٰعیل کی غزل کا نمونہ اوپر گذر چکا، اس زمانہ کے اور شعراء کی سادگی کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہو گا،

غزل (از محمد بن نصیر)

گل کشایان بادہ بود، رسید — آمدن وعدہ دادہ بود، رسید
جنگ لالہ گذشت ولشکرگل — گرچہ پیشتر فتادہ بود رسید
سرو آزاد، بہر سوسن راست — منتظر ایستادہ بود، رسید
لالہ رفت، ارچہ پاے در گل بود — گل اگرچہ پیادہ بود، رسید

دیگر (از صفی)

چہ درد است این کہ عشقش نام کردند — وزو آشوب خاص و عام کردند
ہر آنچہ اندر زمانہ درد دل بود — یکے کردند و عشقش، نام کردند
خراباتے است اندر عشق کان جا — ز خون دل، می اندر جام کردند
بیک ساغر دران بت خانہ مارا — چنیں سرمست و بے آرام کردند

دیگر

فتنہ ہا بر دلم انبار مکن، گونہ کنم — بار ہا کردۂ ایں کار، مکن، گونہ کنم

شیخ کو سادگی اور صفائی کے متعلق کچھ کوشش نہیں کرنی پڑی جو زبان انکے زمانہ میں موجود تھی پہلے ہی منجھ چکی تھی، شیخ نے جو باتیں غزل میں پیدا کیں، حسب ذیل ہیں،

(۱) شیخ کے زمانہ سے پہلے جو شعرا گزرے وہ عشق کے زخم خوردہ نہ تھے، ان میں سے بعضوں نے تو سرے سے عشق کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا، بعضوں نے حسن سخن کے لئے اُس سے کام لیا، لیکن وہ نرے الفاظ ہی الفاظ تھے، اور کچھ نہ تھا، شیخ کے زمانہ میں قوم کے شجاعانہ جذبات فنا ہو چکے تھے، اسلئے زندگی کا کچھ سہارا رہ گیا تھا یہی عشق و عاشقی تھی، حسن اتفاق سے شیخ میں یہ جذبہ فطری تھا اور چونکہ وہ تمام عمر ہر قسم کے دنیوی تعلقات سے آزاد رہا اسلئے اس جذبہ کی گرمی اور تیزی اسی طرح مشتعل رہی، اسی آگ کے شعلے ہیں جو اسکی زبان سے نکلتے ہیں اُس نے معشوقوں کے جور و ستم اور بے مہری اور بیوفائی کے جانگداز صدمے اُٹھائے ہیں، اسلئے اسکا سینہ درد اور سوز و گداز کا آتشکدہ ہے، اشعار ذیل سے اسکا اندازہ کرو،

---

[1] یہ سب غزلیں لب اللباب عونی یزدی میں موجود ہیں،

خبر ما برسانید به مرغانِ چمن — که ہم آواز شما در قفسے افتادہ است

گر دلے داری به دلدارے سپار — ضائع آں کشور کہ سلطانیش نیست

ماجرائے عقل پرسیدم ز عشق — گفت معزول است و فرمانیش نیست

گفتم کہ عشق را به صبوری دوا کنم — ہر روز عشق بیشتر و صبر کمتر است

به خشم رفتہ ٔ ما را کہ مے برد پیغام؟ — بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است

همه از دست غیر می نالد — سعدی از دست خویشتن فریاد

در سوختہ پنہاں نتواں داشتن آتش — ما ہیچ نہ گفتیم و حکایت بدر افتاد

گفتمش سیر ببینم مگر از دل برود — آں چناں جائے گرفت است کہ مشکل برود

دلے از سنگ بباید بہ سر راہ وداع — کہ تحمل کند آں لحظہ کہ محمل برود

ندانمت ز کجا آں سپر بدست آری — کہ تیر آہ مرا ز آسمان بگذرانی

حدیث عشق چہ داند کسے کہ در ہمہ عمر — بسر نہ کوفتہ باشد در سرائے را

سعدیا! ایں ہمہ فریاد تو بے چیزے نیست — آتشے ہست کہ دود از سرآں مے آید

سعدیا! نوبتے امشب دہل صبح نہ کوفت — یا مگر صبح نباشد شب تنہائی را

دو دوست قدر شناسند روز صحبت را — کہ مدتے ببریدند و باز پیوستند

ایکہ گفتی مرو اندر پے خونخوارہ ٔ خویش — با کسے گوی کہ در دست عنانے دارد

۲۔ شیخ سے پہلے عشق کے واردات اور معاملات نہیں بیان کرتے تھے شیخ پہلا شخص ہے جس نے اس کی ابتدا کی خسرو، شرف جہان قزوینی نے اسکو ترقی دی اور وحشی یزدی پر اس طرز کا خاتمہ ہو گیا،

بوسہ از لب جان بخش دیدہ یا بستان[1] — کایں متاعی است کہ بخشند و بہا نیز کنند

شب وصل امشب مگر بہ وقت نمی خواند ایں خروس — عشاق بس نہ کردہ ہنوز از کنار و بوس

تا نشنوی ز مسجد آدینہ بانگ صبح — یا از در سرائے اتابک غریو کوس

لب از لب چو چشم خروس ابلہی بود — برداشتن بہ گفتن بیہودہ خروس

مرا راحت از زندگی دوش بود — کہ آں ماہ رویم در آغوش بود

[1] بہا کردن، قیمت لینا،

ندانستم از غایت لطف و حسن | کہ سیم و سمن یا بر و دوش بود
بہ دیدار و گفتار جان پرورش | سراپاے من دیدہ و گوش بود
مؤذن غلط گفت بانگ نماز | مگر ہمچو من مست و مدہوش بود

سرمست بتے لطیف و سادہ | در دست گرفتہ جام بادہ
در مجلس بزم بادہ نوشان | بستہ کمر و قبا کشادہ
لعلش چو عقیق گوہر آگین | زلفش چو کمند، تاب دادہ
بنشستہ زمین بہ حضرت وے | گردونش بہ خدمت ایستادہ

دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست | تا ندانند حریفان کہ تو منظور منی

۳۔ شیخ کی غزلوں کے حسن قبول کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ جو خیالات ادا کرتا ہے عموماً وہ ہوتے ہیں جو عموماً عشاق اور ہوس پیشہ لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں اس بنا پر جب اس مذاق کے لوگ اُن اشعار کو سنتے ہیں تو انکو نظر آتا ہے کہ کوئی شخص اُن ہی کے خیالات کی سفارت کر رہا ہے اور ایسے دلنشین اور مؤثر طریقہ سے کر رہا ہے کہ وہ خود نہیں کر سکتے تھے، مثلاً عشق پر ملامت کرنے کے وقت عاشق کے دل میں عموماً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کوئی نئی بدعت نہیں سبھی اس مرض میں مبتلا ہیں اور اچھی صورت کی طرف دل کا نہ کھچنا ہو بھی تو نہیں ہو سکتا شیخ اسی خیال کو نہایت برجستگی اور صفائی سے ادا کرتا ہے؛

عشق بازی نہ من آخر بہ جہان آوردم | یا گناہے است کہ اول من مسکین کردم
گر کند میل بہ خوبان دل من خردہ مگیر | کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

رفیق و مہربان و یار ہمدم | ہمہ کس دوست می دارند و من ہم
نظر بر نیکوان رسمے است معہود | نہ ایں بدعت من آوردم بہ عالم
تو گر دعوے کنی پرہیزگاری | مصدق دانمت واللہ اعلم
وگر گوئی کہ میل خاطرم نیست | من ایں دعوے نمیدارم مسلم
حدیث عشق، اگر گوئی گناہ است | گناہ اول ز حوا بود و آدم

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم | باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

اس شعر کی بلاغت پر لحاظ کرو، کہنا یہ تھا کہ لوگ مجھکو عاشقی سے منع کرتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ معشوق کا حسن ہی ایسا دلفریب ہے کہ دل قابو میں نہیں رہ سکتا،

اس بات کو کہ معشوق کا حسن نظرفریب ہے، یوں ادا کیا کہ یہ معشوق سے پوچھنا چاہیے کہ وہ اس قدر حسین کیوں ہے؟ اس طرز ادا میں پھر یہ جدت کہ خود معشوق کو مخاطب بنایا اور یہ کہا کہ یہ تو تجھ سے پوچھنا چاہیئے کہ تو اسقدر حسین کیوں ہے؟ معشوق کے حسن کی تعریف خود اسکے مُنہ پر، اسکا پہلو اس سے بڑھ کر کیا لطیف اور دلاویز ہو سکتا ہے،

۴- شیخ پہلا شخص ہے جس نے غزل میں زاہدوں اور واعظوں کا پردہ فاش کیا ہے اور ریاکاری کی دقیق اور باریک کارسازیوں کی قلعی کھولی ہے خیام نے رباعیوں میں اس مضمون کو ادا کیا تھا، لیکن صاف اور کھلے کھلے لفظوں میں شیخ کی طرح چھپی اور چھبتی ہوئی چوٹیں نہ تھیں جن سے ریاکاروں کے دل برما جائیں،

محتسب در قفائے رندان است غافل از صوفیان شاہد باز

یعنی محتسب رندوں کا تعاقب کرتا پھرتا ہے، لیکن شاہد باز صوفیوں کی اس کو خبر تک نہیں کہ یہ چھپ چھپ کر کیا کرتے ہیں،

بروں نمی رود از خانقہ یکے ہشیار کہ پیش شحنہ بگوید کہ صوفیاں مستند

گر کند میل بہ خوباں دل من خورده مگیر کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

اس مضمون کو خواجہ حافظ نے اس قدر پھیلایا کہ خاص انکا ہو گیا، لیکن اصل بنیاد شیخ نے قائم کی،

اے محتسب از جواں چہ پرسی من توبہ نمی کنم کہ پیرم

اس شعر میں اوروں کے بجائے خود اپنے آپکو ملزم قرار دیا ہے اور یہ بلاغت کا خاص پہلو ہے،

ہیچ کس بے دامن تر نیست اما دیگراں بازی پوشند و ما در آفتاب افگنده ایم

۵- مدح، ذم، رزم، مرثیہ غرض جسقدر انواع مضامین ہیں، اگرچہ ان پر ہزاروں بلکہ لاکھوں اشعار لکھے جا سکتے ہیں لیکن اساس مضامین چند ہی ہوتے ہیں، اُن ہی کو سو سو طرح اُلٹ پلٹ کر بیان کرتے ہیں، اسلئے اصلی شاعری کا حقدار وہی ہے جس نے بنیادیں قائم کی ہوں

شیخ کے بعد اگرچہ غزل کو بہت ترقی ہوئی اور خواجہ حافظ نے اس عمارت کو اس قدر بلند کر دیا کہ طائر خیال بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا لیکن غور سے دیکھو تو اکثر مضامین اور طرز خیال کی داغ بیل شیخ نے ڈالی تھی مثلاً،

حافظ	سعدی
بنال بلبل اگر بامنت سر یاری است	اے بلبل اگر نالی من باتو ہم آوازم
کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاری است	تو عشق گلے داری من عشق گل اندامے
من از بیگانگاں ہرگز ننالم	فریاد دوستاں ہمہ از دست دشمن است
کہ با من ہرچہ کرد آں آشنا کرد	فریاد سعدی از دل نامہرباں دوست
من ارچہ عاشقم و رند، و می کش، و قلاش	گر کند میل بہ خوباں دل من خردہ مگیر
ہزار شکر کہ یاران شہر بے گنہ اند	کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

خواجہ حافظ نے نہایت لطیف طریقہ سے اس مضمون کو ادا کیا ہے لیکن اصل خیال کی بنیاد وہی شیخ کا شعر ہے،

حافظ	سعدی
تو دستگیر شو اے خضر پے خجستہ کہ من	اے قافلہ سالار چنیں تند چہ رانی
پیادہ میروم و ہمرہاں سوار انند	آہستہ کہ در کوہ دگر باز پسانند
ع ہمہ جا جلوۂ یار است چہ مسجد چہ کنشت	ع سجدہ کا یزد را بود گو سجدہ در میخانہ باش
چہ عذر از بخت خود جویم کہ آں عیار شہر آشوب	اے گنج نوشدارو بر خستگاں گذر کن
بہ تلخی کشت حافظ را و شکر در دہاں دارد	مرہم بدست و ما را مجروح می گزاری
دو یار زیرک و از بادہ کہن دو منے	شبے و جمعے و گویندۂ دل زیبائے
فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے	ندارم از ہمہ عالم جز یں تمنائے
من ایں مقام بد نیا و آخرت ندہم	

اے برادر ما بہ گرداب اندریم
اگرچہ در ہیم افتند خلق انجمنے
واں کہ شنعت می زند بر ساحل است

ٍ

شب تاریک و بیم موج و گرداب چنیں ہائل
کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

ولے از سنگ بباید بسر راہ وداع
کہ تحمل کنند آں لحظہ کہ محمل برود

ٍ

قمی
قمی آں صبر و تحمل کہ با دمی نازی
می نمایم بتو چوں یک دو سہ منزل برود

گر تو خواہی کہ بجوئی دلم، امروز بجوے
ورنہ بسیار بجوئی دنیا بے بازم

یہ شعر گویا واسوخت کی بنیاد ہے،

۶۔ شیخ سے پہلے غزل میں جو مضامین ادا کئے جاتے تھے صاف صاف سرسری طور پر ادا کر دیتے تھے، شیخ نے طرز ادا میں بہت سی جدتیں کیں اور بیان کے نئے نئے اسلوب پیدا کئے، وہ ایک معمولی سی بات کو لیتے ہیں اور طرز ادا سے اس میں انجوبگی پیدا کر دیتے ہیں، مثلاً اُن کو کنا یہ تھا کہ گناہ سب کرتے ہیں، فرق یہ ہے کہ اور لوگ پردہ میں کرتے ہیں، اور ہم ریاکاری سے چھپاتے نہیں، اس مضمون کو شیخ اس طرح ادا کرتا ہے،

ہیچ کس بے دامن تر نیست اما دیگران
باز می پوشند و ما بر آفتاب افگندہ ایم

دامن تر گناہ کو کہتے ہیں بر آفتاب افگندن، دھوپ میں ڈالنا، اور کسی کام کے علانیہ کرنیکو بھی کہتے ہیں، شعر کا مطلب یہ ہے کہ گناہ کون نہیں کرتا، فرق یہ ہے کہ اور لوگ چھپاتے ہیں اور ہم علانیہ کرتے ہیں، دامن تر اور بر آفتاب افگندن کے محاورہ اور اس طرز ادا نے کس قدر خوبی پیدا کر دی ہے، دھوپ میں ڈالدینے سے چیز خشک ہو جاتی ہے اسلئے یہ بھی کنایہ ہے کہ ریاکاری سے بچنا کسی نہ کسی دن ہمکو گناہ سے مجتنب بھی کر دیگا، یا یہ کہ خدا ایسا گناہ معاف بھی کر دیگا، لیکن ریاکاری کا گناہ نہ چھوٹ سکتا ہے نہ معافی کے قابل ہے،

کشتہ ببینندم و قاتل نشناسند کہ کیست
کیں خدنگ از نظر خلق نہاں می آید
خواستم تا نظرے افگنم و باز آیم
گفت ازیں کوچہ ما راہ بدر می رود

جمال در نظر و شوق ہمچناں باقی — گدا اگر ہمہ عالم بدو دہند گدا است

بعض جگہ معمولی واقعات اور حالات کو اس پیرایہ میں دکھاتے ہیں کہ نہایت عجیب ہوجاتا ہے مثلاً معشوق کی بیوفائی کو جو ایک عام بات ہے اس طریقہ سے بیان کرتے ہیں،

فریاد دوستاں ہمہ از دست دشمن است — فریاد سعدی از دل نامہربان دوست

یعنی اور لوگ تو دشمن کے ہاتھ سے نالاں ہوتے ہیں سعدی کی بدقسمتی دیکھو کہ اسکو دوست اور معشوق کے ہاتھ سے فریاد کرنی پڑتی ہے، یا مثلاً یہ شعر،

ہر کس از دست غیر می نالد — سعدی از دست خویشتن فریاد

ہر شخص اپنے کئے کو بھگتتا ہے اور یہ ایک معمولی بات ہے شیخ نے اسی بات کو طرز ادا سے ایک اعجوبہ بنا دیا، یعنی اور لوگ تو غیروں سے فریاد کرتے ہیں سعدی خود اپنے آپ سے فریاد کرتا ہے، یا مثلاً یہ شعر،

مبارزان جہاں قلب دشمناں شکنند — ترا چہ شد کہ ہمہ قلب دوستاں شکنی

بعض جگہ ایک دعویٰ کرتے ہیں جو نہایت مستبعد ہوتا ہے پھر شاعرانہ توجیہ سے معمولی واقعہ ثابت کر دیتے ہیں، مثلاً

یادت نمی کنم بہمہ عمر زاں نہ یاد — آنکس کند کہ دلبرش از یاد می رود

پہلے مصرع میں دعویٰ کیا کہ میں کبھی معشوق کو یاد نہیں کرتا یہ ہر عاشق کے مذہب سے نہایت مستبعد تھا، اسکو اسطرح ثابت کیا کہ یاد وہ کرے جو کبھی بھولتا بھی ہو، یہاں کبھی بھولتا ہی نہیں تو یاد کیا کریں، بعض جگہ ایک ممکن اور معمولی واقعہ کو شاعرانہ تخیل سے ناممکن یا مستبعد بنا دیتے ہیں، مثلاً

خلق را بیدار باید بود ز آب چشم من — ویں عجب کاں دم کہ میگریم کسی بیدار نیست

من از دست تو در عالم نہم روی — ولیکن چون تو در عالم نباشد

بلطف دلبر من در جہاں نہ بینی کس — کہ دوستی کند از دشمنی بیفزاید

گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم — چہ بگویم کہ غم از دل برود چون تو بیائی

اسی طرح بیسیوں بلکہ سیکڑوں اسلوب پیدا کئے جنکی الگ الگ تشریح نہیں ہو سکتی،

اشعار ذیل سے ایک عام اندازہ ہوگا،

دنبال تو بودن گنہ از جانب ما نیست | با غمزہ بگو تا دل مردم نہ رباید
زمن مپرس کہ از دست او دلم چوں است | از و بپرس کہ انگشتہاش پُر خون است
توبہ کنند از گناہ خلق بہ شعبان | در رمضان نیز چشمہائے تو مست ست

امیر خسرو کی ایک غزل ہے۔

اے مسلمانان کسی روزہ بدینسان دارد

یہ خیال یہیں سے لیا ہے،

من آں نیم کہ حلال از حرام نشناسم | شراب با تو حلال است و آب بے تو حرام
بہ خشم رفتہ ما را کہ می برد پیغام | بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است
دی زمانے بر سعدی بہ تکلف بنشست | فتنہ بنشست و چو برخاست قیامت برخاست
ما نامہ او سپردہ بودیم | او نافہ مشک ازو فرآورد
اے تماشا گاہ عالم روئے تو | تو کجا بہر تماشا میروی
اے مسلمانان بہ فریادم رسید | کاں فلانے بیوفائی می کند
یار من اوباش و قلاش است و رند | لیک بر من پارسائی می کند
قاضی شہر عاشقان باید | کہ بیک شاہد اختصار کند

شاہد معشوق کو کہتے ہیں، اور گواہ کو بھی مقدمات کے ثبوت میں عموماً دو گواہ ضرور ہیں، شاعر کہتا ہے کہ گو عام قاعدہ یہی ہے کہ مقدمہ کے ثبوت میں دو گواہ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن عاشقوں کے ملک میں، قاضی کو ایک ہی شاہد (معشوق) پر اکتفا کرنا چاہئیے شاہد کے ذو معنیین ہونے نے جو لطف پیدا کیا ہے وہ مخفی نہیں،

برخیز کہ چشم ہائے مستت | خفتہ است و ہزار فتنہ بیدار
اے محتسب از جوان چہ پرسی | من توبہ نمی کنم کہ پیرم

حضرت امیر خسرو[1] دہلوی

ترکوں کا ایک قبیلہ لاچین کے لقب سے مشہور ہے امیر خسرو اسی قبیلے سے ہیں، انکے والد کا نام سیف الدین محمود ہے، ترکستان میں ایک شہر کش ہے، وہاں کے رہنے والے اور اپنے قبیلے کے رئیس تھے، فرشتہ اور دولت شاہ نے لکھا ہے کہ بلخ کے امرا میں سے تھے، چنگیز خاں کا فتنہ جب اُٹھا تو سیف الدین ہجرت کر کے ہندوستان میں آئے اور سلطان محمد تغلق کے دربار میں ایک بڑے عہدہ پر مامور ہوئے محمد تغلق انکی نہایت قدر و منزلت کرتا تھا، ایک مہم میں کفار سے لڑ کر شہید ہوئے،

لیکن صاحب بہارستان سخن، تاریخی استدلال سے اس واقعہ کا ناممکن ہونا ثابت کر کے لکھتے ہیں،

پس آنچہ دولت شاہ در تذکرہ خود نوشتہ کہ پدر امیر خسرو در عہد سلطان محمد تغلق شہید شدہ و امیر خسرو را در حق وے قصائد غرا گفتہ است خلاف صریح و محض غلط است غالباً شاہزادہ سلطان محمد شہید را کہ حاکم ملتان بود بہ علت اشتراک اسم سلطان محمد تغلق خیال کردہ

بہر حال سیف الدین کے تین بیٹے تھے اعز الدین[1] علی شاہ، حسام الدین[2] اور امیر خسرو[3]،

---

[1] امیر خسرو کا حال تمام تذکروں میں کسی قدر تفصیل سے پایا جاتا ہے، تاریخ فرشتہ میں بھی دلچسپ واقعات ہیں لیکن خود امیر موصوف نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں جو مختصر حالات لکھے ہیں وہ سب سے زیادہ اعتبار میں اور جہانتک اس میں مذکور ہیں میں نے اسی کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے امیر کی دیگر تصنیفات سے بھی انکے واقعات معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ موقع بموقع انکے حوالے دئے جائینگے، ڈاکٹر ریو نے برٹش میوزیم لنڈن کی قلمی کتابوں کی جو فہرست مرتب کی ہے اس میں امیر خسرو کی تصنیفات سے ان کے حالات مرتب کئے ہیں، کہیں کہیں اس سے بھی مدد لی گئی ہے،

سیف الدین کے انتقال کے وقت امیر خسرو کی عمر ۷ برس کی تھی امیر خسرو کی والدہ عماد الملک کی بیٹی تھیں جو مشہور امرائے شاہی میں تھے اور دس ہزار فوج کے افسر تھے امیر خسرو ۶۵۱ھ میں بمقام پٹیالی[۲] پیدا ہوئے قدیم خوش اعتقادی نے یہ روایت پیدا کی کہ جب وہ پیدا ہوئے تو امیر سیف الدین ایک خرقہ میں لپیٹ کر ایک مجذوب کے پاس لے گئے، مجذوب نے دور ہی سے دیکھ کر کہا کہ وہ شخص آتا ہے جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے جائیگا، مجذوب صاحب کے کمالات معنوی کا ہم انکار نہیں کرتے لیکن ان کے شاعرانہ مذاق کا تسلیم کرنا مشکل ہے خاقانی کو امیر خسرو سے کیا نسبت،

جب انہوں نے ہوش سنبھالا تو انکے والد نے انکو مکتب میں بٹھایا اور خوشنویسی کی مشق کے لئے مولنا سعد الدین خطاط کو مقرر کیا لیکن امیر کو پڑھنے لکھنے کے بجائے شعر گوئی کی دھن رہتی تھی جو کچھ موزوں کہہ سکتے تھے کہتے تھے اور وصلیوں پر اُسی کی مشق کیا کرتے تھے، خواجہ اصیل کوتوال کے نائب تھے وہ کبھی کبھی سعد الدین خطاط کو خطوط وغیرہ لکھوانے کے لئے بلا لیا کرتے تھے ایک دن بلایا تو امیر خسرو بھی ساتھ گئے خواجہ اصیل کے مکان پر خواجہ عزیز الدین بھی تشریف رکھتے تھے سعد الدین نے خواجہ صاحب سے کہا کہ یہ لڑکا بھی کچھ غوں غاں کرتا ہے معلوم نہیں کہ موزوں بھی کہتا ہے یا نہیں؟ آپ ذرا اسکے کلام کو سن لیجئے، خواجہ عزیز کے ہاتھ میں اشعار کی بیاض تھی، امیر خسرو کو دی کہ کوئی شعر پڑھو امیر نے نہایت خوش الحانی سے پڑھا، چونکہ آواز میں قدرتی تاثیر تھی لوگوں پر اثر ہوا، سب کی آنکھیں بھر آئیں اور سب نے بے اختیار تحسین کی، انکے استاد نے کہا شعر گوئی میں امتحان لیجئے خواجہ عزیز الدین نے چار بے جوڑ چیزوں کا نام لیا کہ ان کو ملا کر شعر کہو، مو، بیضہ، تیر، خربزہ

---

[۱] والہ داغستانی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ امیر خسرو باپ کے ساتھ غزنین کے اطراف سے ہندوستان میں آئے، پھر لکھتے ہیں کہ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ امیر خسرو کی ماں حاملہ آئی تھیں اور خسرو دہلی میں پیدا ہوئے لیکن پہلی روایت بظاہر صحیح ہے تمام واقعات تاریخی سے ثابت ہے کہ خسرو ہندوستان زاد ہیں لیکن والہ داغستانی کو کیونکر گوارا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی خاک ایسا شخص پیدا ہو۔

[۲] پٹیالی ضلع ایٹہ کمشنری آگرہ میں چھوٹا سا قصبہ ہے پہلے یہی مقام ضلع کا صدر تھا، اب ایٹہ ہے، اس زمانہ میں دریائے گنگا اسکے نیچے بہتا تھا لیکن اب میلوں کا فاصلہ ہے یہاں اب اسٹیشن بھی ہے۔

امیر نے برجستہ کہا،

ہر موئے کہ در دو زلف آں صنم است[1] — صد بیضہ عنبریں بر آں موئے ضم است

چوں تیر بداں راس دلش راز پراکہ — چوں خربوزہ دندانش دروں شکم است

خواجہ عزیز الدین کو سخت حیرت ہوئی، پوچھا نام کیا ہے؟ انہوں نے کہا خسرو، باپ کا نام پوچھا انہوں نے اصل نام کی بجائے قبیلہ کا نام بتایا، یعنی لاچین۔ خواجہ صاحب نے ظرافت سے کہا، لاچین یعنی چین نہیں، پھر کہا "ترک خطا است" یعنے انکو ترک کہنا خطا ہے انہوں نے اسی لفظ کو الٹ کر کہا ہے خط ترک است یعنی قطعاً وہ ترک ہے، خواجہ صاحب نے کہا چونکہ تمکو دربار سلطانی سے تعلق ہے اسلئے تمکو سلطانی تخلص رکھنا چاہئیے چنانچہ تحفۃ الصغر کی اکثر غزلوں میں یہی تخلص ہے۔

امیر کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی کی تحصیل تمام تھی لیکن تذکرہ نویسوں نے انکے متعلق کچھ تفصیل نہیں لکھی تاہم یہ قطعی ہے کہ ۱۵۔۲۰ برس کی عمر میں یہ تمام درسی فنون سے فارغ ہو چکے تھے،

درباری تعلقات امیر خسرو جب سن رشد کو پہنچے تو دلی کے تخت پر سلطان غیاث الدین بلبن صدر نشین تھا جو ۶۶۴ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا تھا اسکے امرائے دربار میں سے کشلو خان معروف بہ چھجو[2] بہت بڑے رتبہ کا سردار تھا۔ وہ سلطان کا بھتیجا اور بار بکی کے عہدہ پر مامور تھا

[1] جس نسخہ سے یہ رباعی نقل کی ہے وہ غلط تھا میں نے اسی طرح نقل کر دیا۔

[2] یہ تمام حالات اپنے امیر خسرو نے خود تحفۃ الصغر میں لکھے ہیں مگر چھجو خاں کا نام تاریخوں میں اسطرح مختلف لقب اور خطاب سے آتا ہے کہ دھوکا ہوتا ہے کہ ایک شخص ہے یا کئی ہیں، امیر خسرو غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں تاتار کی وفات کے بعد سب سے پہلے خان معظم کشلی خان عرف چھجو کے دربار میں پہنچا، اس سے اسقدر ثابت ہوا کہ کشلو اور چھجو ایک ہی شخص ہیں، بدایونی (صفحہ ۵۸ جلد اول) میں ہے چھجو آخر میں کڑہ مانک پور کے ساتھ سامانہ کا حاکم مقرر ہوا تھا، اور سلطان معز الدین کیقباد نے اسکی بیٹی سے شادی کی تھی۔

فرشتہ میں لکھا ہے کہ علاء الدین محمد بن اعز الدین، سلطان غیاث الدین بلبن کا برادر زادہ تھا، سلطان نے اسکو باربک مقرر کر کے خان اعظم کو کشلی خان خطاب دیا۔ بدایونی (صفحہ ۶۴) میں ہے کہ چھجو کو برادر زادہ سلطان غیاث الدین لکھ کر لکھا ہے کہ اسکو کشلو خان خطاب ملا تھا، ان تمام عبارتوں کو ملاؤ تو ثابت ہوگا کہ علاء الدین کشلو خان، چھجو ایک ہی شخص ہیں۔

فرشتہ میں لکھا ہے کہ مجلس آرائی اور جود وکرم کی وجہ سے حاتم کی طرح مشہور ہو گیا تھا اور
مصر، شام، روم، بغداد، عراق، خراسان، ترکستان وغیرہ سے اہل کمال اور شعرا اسکے
دربار میں آتے تھے اور کامیاب ہوکر جاتے تھے بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ جو کچھ نقد اسباب
سامان تھا سب لٹا دیا، یہانتک کہ خود اسکے بدن پر پیرہن کے سوا کچھ نہ رہا۔
امیر خسرو کو جیسا انہوں نے خود غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھا ہے سب سے پہلے اسکے دربار
میں رسائی حاصل ہوئی اور دو برس تک اسکے دربار میں ملازم رہے، چنانچہ اکثر قصیدے
اس کی مدح میں لکھے ہیں، ایک قصیدہ میں مدح کی تمہید لکھتے ہیں،

بود پنہاں آفتاب آں دم کہ صبح ۔۔۔ ہمدمے با باد عنبر بو نمود
صبح را گفتم کہ خورشیدت کجاست ۔۔۔ آسمان روے ملک چھجو نمود

امیر خسرو نے مثنوی نہ سپہر میں لکھا ہے،

زشاہان کسے کا دلم کرد یاد ۔۔۔ معزالدنا بود شہ کیقباد

لیکن اس سے کتلوخان کی اولیت پر حرف نہیں آتا، کتلوخان امرا میں سے تھا،
بادشاہ نہ تھا، بادشاہوں میں سے البتہ سب سے پہلے جس نے امیر کی قدردانی کی وہ معزالدین
کیقباد تھا، امیر خسرو اکثر کتلوخان کے دربار میں قصیدے لکھ کر لیجاتے اور مجلس گرم کرتے تھے
ایک دن اتفاق سے بغراخان (سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا) بھی موجود تھا اور
شعر و شاعری کے چرچے ہو رہے تھے شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر جو مشہور شعرا میں سے تھے
وہ بھی حاضر تھے، امیر خسرو نے اپنی زمزمہ سنجی سے یہ سماں باندھا کہ بغراخان نہایت متاثر
ہوا اور صلہ کے طور پر لگن بھر کر روپے دئے کتلوخاں کو یہ ناگوار ہوا کہ اسکا وابستہ دولت
دوسرے دربار کا احسان اٹھائے چہرہ سے ملال کے آثار ظاہر ہوئے امیر خسرو نے اسکے
بعد بار بار مختلف موقعوں پر اسکی تلافی کرنی چاہی لیکن کتلوخاں کے دل سے وہ پھانس نہ نکلی،
بغراخان سامانہ کا حاکم تھا، امیر خسرو نے ملک چھجو سے مایوس ہو کر سامانہ کا قصد کیا
بغراخاں نے نہایت قدر و عزت کی اور ندیم خاص بنایا، اسی زمانہ نے یعنی ۶۷۸ھ میں

لہ یہ تمام حالات خود امیر خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھے ہیں۔

لکھنوتی (بنگال) میں طغرل نے بغاوت کی اور شاہی لشکر کو بار بار شکستیں دیں، بالآخر سلطان غیاث الدین بلبن نے خود اس مہم پر جانے کی تیاریاں کیں اور بغرا خاں کو ساتھ لیا امیر خسرو بھی اس سفر میں ساتھ گئے[1]، سلطان غیاث الدین اس بغاوت کو فرو کر کے دلی واپس آیا اور بنگالہ کی حکومت بغرا خان کو عنایت کی امیر خسرو کو اب زیادہ اطمینان کا موقع حاصل تھا دربار کے شعرا شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر بھی انکے قیام پر مصر تھے، لیکن وہ دلی کو بنگال کے معاوضہ میں نہیں دے سکتے تھے، چنانچہ رخصت لیکر دلی میں آئے[2]، اتفاق سے اسی زمانے میں سلطان غیاث الدین کا بڑا بیٹا ملک محمد قاآن (مشہور بہ خان شہید) دلی میں آیا تھا، وہ نہایت قابل صاحب علم فیاض اور قدردان علم و فن تھا، تہذیب و متانت کا یہ حال تھا کہ جب دربار میں بیٹھتا تو گو کبھی دن کا دن گزر جاتا تھا، لیکن زانو نہیں بدلتا تھا، اسکی مجلس میں ہمیشہ شاہنامہ، دیوان خاقانی، انوری خمسہ نظامی کے اشعار پڑھے جاتے تھے، ایک بیاض تیار کی تھی جس میں اپنے مذاق کے موافق بیس ہزار شعر انتخاب کر کے درج کئے تھے، تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ ان اشعار کے حسن انتخاب پر امیر خسرو اور حسن دہلوی بھی داد دیتے تھے[3]۔

یہ بیاض ایسی نادر چیز تھی کہ جب شہزادہ کا انتقال ہوا تو سلطان غیاث الدین نے اپنے خاص دوات دار امیر علی کو دی، امیر علی کے بعد امیر خسرو کے ہات آئی ارباب ذوق اس کی نقلیں لیتے تھے اور بیاضوں میں درج کرتے تھے،

امیر خسرو کی شاعری کا شہرہ ہو چکا تھا، سلطان محمد نے ان کو بلا کر شعرائے خاص میں داخل کیا، اور جب وہ ملتان کا حاکم مقرر ہو کر گیا تو انکو اور انکے ساتھ حسن دہلوی کو بھی ساتھ لے گیا، پانچ برس تک یہ اسکے دربار میں رہے اس زمانہ میں ہلاکو خاں کا پوتا ارغو خان ایران کا حکمران تھا، اسکے امرا میں سے تیمور خان بیس ہزار سوار لیکر لاہور اور دیپال پور کو فتح اور

[1] تاریخ فرشتہ، [2] امیر خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں ان واقعات کو خود لکھا ہے لیکن اسقدر پیچیدہ لکھا ہے کہ بڑی مشکل سے اور تاریخوں کے باہم مقابلہ کرنے سے اصل حال کا پتہ چلتا ہے ایک اور دقت سخت تر یہ ہے کہ غرۃ الکمال کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے وہ سخت غلط اور گویا بالکل مسخ ہے [3] تاریخ فرشتہ۔

غارت کرتا ہوا ملتان کی طرف بڑھا، سلطان محمد قاآن نے ملتان سے نکلکر تیمور خاں کو شکست دی، لیکن چونکہ ظہر کی نماز نہیں پڑھی تھی ایک تالاب کے کنارے پانچسو آدمیوں کے ساتھ نماز میں مشغول ہوا، یہ موقع پاکر تاتاریوں نے دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ حملہ کیا سلطان محمد نے انہی نمازیوں کے ساتھ نماز سے فارغ ہوکر تاتاریوں کا مقابلہ کیا اور گو بار بار انکو شکستیں دیں لیکن اتفاق سے ایک تیر آکر لگا اور زخم کھاکر مر گیا[1]، امیر خسرو اور حسن دہلوی بھی اس معرکہ میں شریک تھے چنانچہ تاتاری انکو گرفتار کرکے بلخ لے گئے، یہ واقعہ ۶۸۳ھ میں پیش آیا[2]، امیر خسرو نے نہایت پراثر مرثیے لکھے اور دوراً بھیجے مہینوں تک لوگ گھر گھر ان مرثیوں کے اشعار پڑھتے تھے اور اپنے مقتول عزیزوں پر نوحہ کرتے تھے، چند اشعار ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

واقعہ است ایں یا بلا از آسماں آمد پدید | آفتے است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید
راہ در بنیاد عالم داد سیل فتنہ را | رخنہ کامسال در ہندوستاں آمد پدید
مجلس یاراں پریشاں شد چو برگ گل زباد | برگ ریزی گوئی اندر بوستاں آمد پدید
بسکہ آب چشم خلقے شد رواں در چار سو | پنج آبے دیگر اندر مولتاں آمد پدید
جمع شد سیارہ در تشنیم مگر طوفاں شود | چوں بہ برج آبی انجم را قراں آمد پدید

من نخواہم جز ہماں جمعیت ایں کے شود
خود محال ست ایں بنات النعش پرویں کے شود

تاچہ ساخت بد کہ شاہ از مولتاں لشکر کشید | تیغ کافر کش برائے کشتن کافر کشید
آنچہ حاضر بود لشکر لشکر دیگر نہ جست | زانکہ رستم را نشاید منت لشکر کشید
چوں خبر کردند ش از دشمن بداں قوت کہ داشت | بے محابا خشم در سر کرد و رایت بر کشید
یک کشش از مولتانش تا بلاہور اوفتاد | یعنی اندر عہد من کافر تواند سر کشید
آنچناں رنگیں کنم امسال از خون شاں | کز زمیں باید شفق را گونہ احمر کشید
او دریں تدبیر و آگہ نے کہ تدبیر فلک | صفحہ تدبیر را خط مشیت در کشید

---

[1] تاریخ فرشتہ، [2] بدایونی صفحہ ۱۳۱

تاچہ ساعت بُد کہ کافر بر سر لشکر کشید
جوق جوق از آب بگزشتند و ناگہ در رسید

بہت بڑا مرثیہ ہے اور لڑائی کی تمام کیفیت لکھی ہے، اخیر کے بند جہاں شہزادہ کی شہادت کا ذکر ہے نہایت پر اثر ہیں،

دو برس کے بعد امیر نے کسی طرح تاتاریوں کے ہاتھ سے رہائی پائی، اور دلّی میں آئے خان شہید کے مرنے پر جو مرثیہ لکھا تھا، غیاث الدین بلبن کے دربار میں جا کر پڑھا دربار میں کہرام پڑ گیا، کسی کا ہوش نہ تھا، سلطان اس قدر رویا کہ بخار آ گیا اور بالآخر اسی صدمہ میں انتقال کر گیا،

امیر دلّی سے پٹیالی میں آئے اور گنگا کے کنارے قیام پذیر ہوئے، ۶۸۶ھ میں سلطان غیاث الدین بلبن نے وفات پائی اور درباریوں نے اسکے خلاف وصیت اسکے پوتے کیقباد کو جو بغرا خان کا بیٹا تھا، تخت نشین کیا،

کیقباد نے امیر خسرو کو دربار میں طلب کیا لیکن چونکہ عنان سلطنت ملک نظام الدین کے ہاتھ میں تھی اور وہ امیر سے صاف نہ تھا امیر نے تعلق پسند نہ کیا اور خان جہان جو امرائے شاہی میں تھا اس کی ملازمت اختیار کی،

خان جہان اودھ کا صوبہ دار مقرر ہوا اور امیر کو ساتھ لے گیا، چنانچہ خود قران السعدین میں فرماتے ہیں،

خان جہان حاتم مفلس نواز	گشت بہ اقطاع اودہ سرفراز
من کہ بدم چاکر او پیش ازاں	کرد کرم انچہ کہ بد بیش ازاں
تازچناں بخشش خاطر فریب	بندہ شدہ لازمۂ آں رکیب
در اودم بروز لطف چناں	کیست کہ از لطف بتابد عناں
در اودہ از بخشش او تا دو سال	ہیچ غم و نالہ نبود از مثال

دو برس تک اودھ میں رہے ان کی والدہ کو ان سے حد سے زیادہ محبت تھی وہ دلّی میں تھیں، اور انکے خطوط آتے رہتے تھے کہ میں تم سے دور رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی امیر کو

بھی ماں سے بے انتہا محبت تھی چنانچہ سب تعلقات چھوڑ کر دلی میں آئے، ماں نے گلے سے لگالیا اور آنکھوں محبت کے دریا بہائے،

مادرم آں خستۂ تیمار من | چوں نظر افگند بہ دیدار من
پردہ ز روئے شفقت برگرفت | اشک فشاناں بہ برم درگرفت

کیقباد جب تخت سلطنت پر بیٹھا تو عیاشی اور رندی شروع کی اسکا باپ بغرا خان بنگال میں تھا، یہ حالت سن کر بنگال سے روانہ ہوا، کیقباد نے ناخلفی سے باپ کا مقابلہ کرنا چاہا چنانچہ ایک عظیم الشان فوج تیار کر کے دلی سے روانہ ہوا، راہ میں نامہ و پیام ہوتے رہے آخر صلح پر خاتمہ ہوا اور کیقباد دلی کو واپس آگیا،

امیر خسرو نے باپ بیٹے کے اتحاد اور مصالحت پر ایک قصیدہ لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں،

زہے ملک خوش چوں دو سلطان یکے شد | زہے عہد خوش چوں دو پیمان یکے شد
پسر بادشاہے، پدر نیز سلطان | کنوں ملک بیں چوں دو سلطان یکے شد
زمہر جہانداری و بادشاہے | جہاں را دو شاہ جہانبان یکے شد
یکے ناصر عہد محمود سلطان | کہ فرمانش در چار ارکان یکے شد
دگر شاہ معز جہاں کیقباد ے | کہ در ضبطش ایران و توران یکے شد

کیقباد چاہتا تھا کہ یہ واقعات نظم کے پیرایہ میں آئیں امیر خسرو کو بلا کر یہ خواہش ظاہر کی چنانچہ امیر نے چھ مہینے کی مدت میں قران السعدین لکھی جس میں باپ بیٹے کے مراسلات اور ملاقات کا حال تفصیل سے لکھا ہے، اس وقت امیر کی عمر ۳۶ برس کی تھی اور سنہ ہجری ۶۸۸ تھا، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

ساختہ گشت از وہ شش نامہ | از پس شش ماہ چنیں نامہ
در رمضان شد بہ سعادت تمام | یافت قران نامہ سعدین نام
آنچہ بہ تاریخ ز ہجرت گذشت | بود سنہ ششصد و ہشتاد و ہشت
سال من امروز اگر بر رسی | راست بگویم ہمہ ششم بود و سی

سلہ بدایونی،

کیقباد عیاشی میں بیمار ہو کر تین برس حکومت کے بعد ۶۸۹ھ میں مرگیا یا مارا گیا، اسکے بعد اسکا خردسال بیٹا شمس الدین کیکاؤس تخت نشین ہوا، وہ بالکل بچہ تھا تین مہینے کے بعد امرائے دربار نے تخت سے اتار کر قید کردیا، اب اس خاندان میں کوئی شخص دعویدار سلطنت نہیں رہا تھا اس لئے ترکی امرائے دربار میں سے ملک فیروز شائستہ خاں خلجی جسکی عمر ۷۰ برس کی تھی اور جس نے دربار میں بڑا اثر حاصل کیا تھا، تخت سلطنت پر بیٹھا۔ اور سلطان جلال الدین خلجی کے نام سے مشہور ہوا، وہ بڑے عظمت اور اقتدار وجاہ وجلال کا بادشاہ تھا اسکے ساتھ نہایت صاحب مذاق رنگین طبع، خوش صحبت تھا شعر بھی کہتا تھا، چنانچہ بدایونی نے اسکے دو شعر بھی نقل کئے ہیں،

آں زلف پریشانت ژولیدہ نمے خواہم دال روئے چو گلنارت تفسیدہ نمے خواہم
بے پیر منت خواہم یک شب بکنار آئی ہاں بانگ بلندست ایں پوشیدہ نمے خواہم

احباب اور شریک صحبت بھی جسقدر رکھے، سب قابل اہل فن موزوں طبع اور رنگین مزاج تھے مثلاً ملک تاج الدین کوچی، ملک فخرالدین، ملک اعزالدین، ملک قرابیگ، ملک نصرت، ملک حبیب، ملک کمال الدین ابوالمعالی، ملک نصیرالدین کمرانی، ملک سعدالدین، انیس اور ہم صحبت تھے،

اسی طرح اکثر بڑے بڑے اہل کمال ندیمی کیلئے انتخاب کئے تھے چنانچہ تاج الدین عراقی خواجہ حسن دہلوی، موید جاجرمی، موید دیوانہ، امیر ارسلان، اختیار الدین باقی، ندمائے خاص میں تھے، ساقی، مغنی اور مطرب بھی وہ لوگ تھے جو زمانہ میں انتخاب تھے، مثلاً امیر خاصہ حمید، راجہ، نذاام، محمد شاہ، نصیر خاں، بہروز،

ایسے گوناگوں صاحب مذاق بادشاہ کے دربار کیلئے امیر خسرو سے زیادہ کون موزوں ہو سکتا تھا، وہ عالم بھی تھے، فاضل بھی، مغنی بھی، مطرب بھی، اور شاعر تو تھے ہی معز الدین کیقباد کے زمانہ میں جب سلطان جلال الدین عارض تھا، اسی وقت اس نے امیر خسرو کو قدردانی کی نگاہ سے دیکھا تھا، چنانچہ معقول مشاہرہ مقرر کرکے خاص اپنا لباس عنایت

لے فرشتہ:

کیا تھا، تخت پر بیٹھا تو امیر کو ندیم خاص بنایا اور مصحف داری[1] اور امارت کا عہدہ دیا، اسکے ساتھ جامہ اور کمر بند جو امراء کبار کا مخصوص لباس تھا انکے لئے مقرر کیا، امیر خسرو جو "امیر" کے خطاب سے پکارے جاتے ہیں، اسکی وجہ یہ ہے،

امیر نے جلال الدین خلجی کے تمام فتوحات نظم کئے اور تاج الفتوح نام رکھا اسکی تفصیلی کیفیت آگے آئیگی، جلال الدین خلجی کو اسکے بھتیجے سلطان علاء الدین خلجی نے ۶۹۴ھ میں دھوکے سے قتل کرادیا اور خود تخت نشین ہوا، سلطان علاء الدین نے اگرچہ دغا اور بیرحمی سے تخت سلطنت حاصل کیا تھا اور اگرچہ سخت دلی اور سفاکی اسکی طینت کا جوہر تھا، تاہم بہت بڑے عزم واستقلال اور شوکت وشان کا فرمانروا گزرا ہے، تعجب انگیز فتوحات اور انتظامی کارناموں کو چھوڑکر علمی فیاضیاں بھی کچھ کم حیرت خیز نہیں اسکا دربار فقرا، علما، فضلا، شعرا سے ہروقت معمور رہتا تھا، ان میں بعض کے نام حسب ذیل ہیں[2]۔

قاضی فخر الدین ناقلہ، قاضی فخر الدین کرمانی، مولٰنا نصیر الدین غنی، مولٰنا تاج الدین مقدم قاضی ضیاء الدین، مولٰنا ظہیر الدین لنگ، مولٰنا ظہیر الدین بھکری، قاضی زین الدین ناقلہ مولٰنا شر کتی، مولٰنا نصیر الدین رازی، مولٰنا علاء الدین صدر شریف، مولٰنا میراں بابکہ مولٰنا نجیب الدین بیانوی، مولٰنا شمس الدین، مولٰنا صدر الدین، مولٰنا علاء الدین لاہوری قاضی شمس الدین کازرونی، مولٰنا شمس الدین یحیی، مولانا شمس الدین، مولٰنا صدر الدین پاد مولٰنا معین الدین لولوی، مولٰنا افتخار الدین رازی، مولانا معیر الدین اندریتی، مولٰنا نجم الدین مولٰنا حمید الدین بلوری، مولٰنا علاء الدین کرک، مولٰنا حسام الدین سادہ، محی الدین کاشانی مولٰنا کمال الدین کوہی، مولٰنا وحید الدین کابلی، مولٰنا منہاج الدین، مولٰنا نظام الدین کلانی مولٰنا نصیر الدین کرہی، مولٰنا نصیر الدین لوہی، مولٰنا علاء الدین تاجر، مولٰنا کریم الدین جوہری مولٰنا محب ملتانی، مولٰنا حمید الدین، مولٰنا برہان الدین بھکری، مولانا افتخار الدین، مولٰنا حمید الدین ملتانی، مولانا گل محمد شیرازی، مولانا حسام الدین سرخہ، مولٰنا شہاب الدین،

[1] جسکو قرآن مجید رکھنے کی خدمت سپرد ہوتی تھی اس کو مصحف دار کہتے تھے،

[2] یہ فہرست بدایونی سے ماخوذ ہے،

ملتانی، مولٰنا فخر الدین ہنسوی، مولٰنا فخر الدین شقاقلی، مولٰنا علیم الدین،
قراء مولٰنا انشاطی، مولٰنا علاء الدین سفری، خواجہ زکی،
واعظین، مولٰنا حسام الدین درویش، مولٰنا شہاب الدین، مولٰنا کریم،
شعراء، خواجہ حسن دہلوی، صدر الدین عالی، فخر الدین قواس، حمید الدین راجہ، مولانا
عارف عبد الحکیم، شہاب الدین، لیکن امیر خسرو کے آفتاب کمال نے ان تمام
ستاروں کو بے نور کر دیا تھا،

چنانچہ اس وسیع مرقع میں صرف امیر موصوف کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے انکے بعد
اگر کسی کے خط و خال پہچانے جاتے ہیں تو وہ خواجہ حسن ہیں کہ وہ بھی امیر ہی کا فیض ہے،
علاء الدین نے امیر خسرو کا ایک ہزار سالانہ ٹنکہ مقرر کیا تھا[1] امیر نے سلطان علاء الدین
کی تمام فتوحات کو نہایت تفصیل سے لکھا، جسکا نام خزائن الفتوح ہے، تفصیل اسکی
آگے آئے گی،

۶۹۸ھ میں امیر کی والدہ اور ان کے بھائی حسام الدین نے انتقال کیا، چنانچہ
لیلی مجنوں میں اس واقعہ کو نہایت پُر درد مرثیہ کی صورت میں لکھا ہے،
نظامی کی پنج گنج کا جواب اسی زمانہ میں لکھا، چنانچہ ہر کتاب سلطان علاء الدین کے
نام سے معنون ہے، سب سے آخری مثنوی ہشت بہشت ہے جو ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی،

اسی زمانہ میں امیر نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے ہاتھ پر بیعت کی چنانچہ تفصیل
آگے آئیگی، سلطان علاء الدین نے ۲۱ برس کی حکومت کے بعد ۷۱۶ھ میں وفات کی، اسکے
بعد اسکا بیٹا شہاب الدین (مدت حکومت ۳ ماہ) اور اسکے بعد ۷۱۶ھ میں قطب الدین
مبارک بن علاء الدین خلجی، بادشاہ ہوا، وہ اگرچہ نہایت عیاش، بے مغز، اور سبک سر تھا
لیکن امیر کی قدر دانی سب سے بڑھ کر کی چنانچہ امیر نے جب ۷۱۸ھ میں اسکے نام پر مثنوی
نہ سپہر لکھی تو ہاتھی برابر تول کر روپے دئیے، چنانچہ خود امیر قطب الدین کی زبان سے لکھتے ہیں،

به تاریخ ہمچوں من اسکندرے ۔۔۔ کند ہر کہ آرائش دفترے

[1] تاریخ فرشتہ، غالباً یہ طلائی سکہ ہوگا،

ز گنج گراں مایۂ بے شمار — دہم بار ہیتش نہ آں پیلبار
مرا خود دریں رہ پدر شہ دلیل — کہ سید از زر ہم ترازوے پیل
شناسد کسے کش خرد رہنمون — کہ از پیلبار است وزنش فزون
چو میراث شد پیل زر دادنم — نہ زیبا است زیں سہل تر دادنم
شہا! گنج بخشا! کرم گسترا! — معانی شناسا سخن داورا
چنیں بخششے کز تو جم یافتم — در ایام پیشینہ کم یافتم
کنوں لاند از سحر سنج چو من — بہ اندازۂ بخشش آید سخن

قطب الدین خلجی نے ایک ہندو نومسلم غلام کو خسرو خان کا خطاب دیکر قلمدان وزارت عطا کیا تھا، اسنے سنہ ۷۲۱ھ میں قطب الدین کو قتل کرکے خود تخت حکومت پر جلوس کیا چونکہ اُس نے دربار میں تمام ہندو بھر دیئے اور خاندان شاہی پر طرح طرح کے ظلم کئے، امرائے نے بغاوت کی، چنانچہ ۴ مہینے کی حکومت کے بعد سنہ ۷۲۳ھ میں غازی ملک کے ہاتھ سے قتل ہوا،

اب خلجی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، اور امرائے دربار میں سے غازی ملک نے جسکا باپ سلطان غیاث الدین بلبن کا تُرکی غلام اور ماں اسکی ہندنی تھی دربار میں پکار کر کہا کہ مجھکو تخت سلطنت کی آرزو نہیں، خاندان شاہی سے کسی کو تخت نشین کیا جائے لیکن چونکہ خلجی خاندان میں سے کوئی شخص باقی نہیں رہا تھا اور ملک غازی کی خدمات کا تمام دربار معترف تھا، اسلئے سب نے باتفاق اسی کو بادشاہ بنایا، وہ سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے نہایت عدل و انصاف سے حکومت کی اور نئی نئی فتوحات حاصل کیں، تغلق آباد کا مشہور قلعہ اسی کی یادگار ہے امیر خسرو کی اس نے نہایت قدردانی کی اور ان کو دولت اور مال سے نہال کر دیا، امیر نے بھی اسکے احسانات کا حق ادا کیا چنانچہ اسکے نام پر تغلق نامہ لکھا، جو تغلق کے عہد حکومت کی مفصل تاریخ ہے،

تغلق نے جب بنگال کا سفر کیا تو امیر خسرو ساتھ گئے، تغلق واپس آیا لیکن امیر خسرو وہیں رہ گئے، اسی اثنا میں خبر مشہور ہوئی کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے انتقال کیا۔ امیر یلغار کرتے ہوئے دلی میں آئے اور جو کچھ زر و مال پاس تھا خواجہ صاحب کے نام

پرنثار کر دیا، ماتمی سیاہ کپڑے پہن کر خواجہ صاحب کی قبر پر مجاور ہو بیٹھے، چھ مہینے کے بعد ذیقعدہ ۷۲۵ھ میں انتقال کیا، خواجہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ خسرو کو میرے پہلو میں دفن کرنا، لوگوں نے اس وصیت کی تعمیل کرنا چاہی، لیکن ایک خواجہ سرانے جو وزارت کا منصب رکھتا تھا کہا کہ لوگوں کو دونوں قبروں کی تمیز کرنے میں دھوکا ہوگا، غرض خواجہ صاحب کے پائنتی دفن کیا، اور اس سے بڑھکر ان کی کیا خوش قسمتی ہو سکتی تھی[1] ان کا مقبرہ مہدی خواجہ نے جو سلطان بابر کے امراءمیں سے تھا تعمیر کرایا اور ملا شہاب معمائی نے تاریخ لکھکر لوح پر کندہ کرائی،

وفات

شد "عدیم المثل" یک تاریخ او   واں دگر شد "طوطی شکر مقال"

امیر کو خدا نے فرزندان معنوی کے علاوہ اولاد ظاہری بھی عنایت کی تھی[2] انکے ایک صاحبزادہ کا نام ملک احمد ہے، وہ شاعر تھے اور سلطان فیروز شاہ کے دربار میں ندیم تھے، ان کی شاعری نے چنداں فروغ حاصل نہیں کیا، لیکن شعر اور شاعری کے دقائق سے خوب واقف تھے، اشعار کے عیب و ہنر کو خوب پرکھتے تھے، اور نہایت نازک اور دقیق نکتے پیدا کرتے تھے، چنانچہ اکثر اساتذہ کے اشعار پر جو حرف گیریاں کیں عموماً اہل فن اسکو تسلیم کرتے ہیں، ظہیر کا شعر ہے،

خاندان اور آل و اولاد

کلاہ گوشۂ حکم تو از طریق نفاذ   ربودہ از سر گردوں کلاہ جباری

ملک موصوف نے ربودہ کو فگندہ سے بدل دیا جس سے مصرع کی ترکیب چست ہو گئی، بخیل کی ہجو میں مشہور شعر ہے

ایں سہل بود کہ گوگرد سرخ خواست   گرنان خواجہ خواستی آں راچہ کردمے

ملک صاحب نے یوں اصلاح دی،

ایں سہل بود کہ آب حیات خواست   گرنان خواجہ خواستی آں راچہ کردمے

نان کے ساتھ آب حیات کے مقابلہ نے لطف پیدا کر دیا،

ایک اور شعر تھا،

---

[1] خزانہ عامرہ، [2] فرشتہ حالات خسرو،

گر مشک خواند خاک درت را فلک مرنج	نرخ گہر بہ طعن خریدار نشکند

ملک موصوف نے پہلے مصرع کو یوں بدل دیا،

گر لعل خواند سنگ درت مشتری مرنج،

لیکن انصاف یہ ہے کہ امیر خسرو کی یادگار سے ہم اس سے زیادہ توقع رکھتے تھے، بدایونی نے ان اصلاحوں کو نقل کر کے سچ لکھا کہ ملک احمد چونکہ خسرو کی یادگار تھے اسلئے بادشاہ اور درباری اسکو بھی امیر کا تبرک سمجھتے تھے اور غنیمت جانتے تھے،

امیر خسرو کی ایک صاحبزادی تھیں لیکن سخت افسوس ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں کی ایسی بیقدری تھی کہ امیر کو انکے پیدا ہونیکا رنج تھا، جب وہ سات برس کی ہوئیں تو امیر نے لیلی مجنوں لکھی، اس میں صاحبزادی سے خطاب کرتے ہیں،

اے زعفت فگندہ برقع نور	ہم عفیفہ بنام وہم مستور
کاش ماہ تو ہم بہ چہ بودے	در رحم طفل ہشت مہ بودے
لیک چوں دادہ خدائی رواست	باخداداد گاں ستیزہ خطااست
من پذیرفتم انچہ یزداں داد	کانچہ او داد باز نتوان داد
پدرم ہم زمادر است آخر	مادرم نیز دختر است آخر

پہلے آرزو کی ہے کہ کاش تم پیدا نہ ہوتیں، یا ہوتیں تو بیٹی کے بجائے بیٹا ہوتیں، پھر طرح طرح کی تاویلوں سے دل کو تسلی دی ہے کہ خدا کے دئیے کو کون ٹال سکتا ہے، اور آخر میرا باپ بھی تو عورت سے پیدا ہوا، اور میری ماں بھی تو آخر عورت ہی تھی،

صاحبزادی کو جو نصیحتیں کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں کی حالت نہایت پست تھی، امیر خسرو اس قدر صاحب دولت وثروت تھے لیکن بیٹی سے کہتے ہیں کہ خبردار چرخہ کاتنا نہ چھوڑنا اور کبھی موکھے کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر نہ جھانکنا،

دوک وسوزن گزاشتن نہ فن است	کالت پردہ پوشی بدن است
پابہ دامان عافیت سر کن	روبہ دیوار وپشت بردر کن

در تماشائے روزنت ہوس است — روزنت چشم سوزن تو بس است

امیر کو اپنی والدہ سے بے انتہا محبت تھی، بڑی عمر کو بھی پہنچ کر وہ اس جوش محبت سے ماں سے ملتے تھے جس طرح چھوٹے بچے ماں سے لپٹ جاتے ہیں، اودھ کی معقول امارت صرف اس بنا پر چھوڑ دی کہ ماں دلی میں تھیں، اور انکو یاد کیا کرتی تھیں اودھ سے جب دلی میں آئے ہیں تو ماں سے ملنے کا حال اس جوش سے لکھا ہے کہ لفظ لفظ سے محبت کی شراب ٹپکتی ہے،
ایک موقع پر جب ماں سے ملے ہیں اور ماں نے سینہ سے لگایا ہے تو ایک شعر بے اختیار زبان سے نکلا ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ ماں کا سینہ بہشت ہے، چنانچہ دو نہریں دودھ کی اس میں جاری ہیں، ۶۹۸ھ میں انہوں نے انتقال کیا، اسی سال انکے چھوٹے بھائی حسام الدین نے بھی انتقال کیا، لیلی مجنوں میں دونوں کا مرثیہ ایک ساتھ لکھا ہے،

امسال دو نور اخترم رفت — ہم مادر وہم برادرم رفت
یک ہفتہ ز بخت خفتۂ من — گم شد دو مہ دو ہفتۂ من
بخت از دو شکنجہ داد پیچم — چرخ از دو طمانچہ کرد ہیچم
ماتم دو شد و غمم دو افتاد — فریاد کہ ماتمم دو افتاد
حیف است دو داغ چون منے را — یک شعلہ بس است خرمنے را
یک سینہ دو بار بر نگیرد — یک سر دو خمار بر نگیرد
چوں مادر من بزیر خاک است — گر خاک بسر کنم چہ باک است
اے مادر من کجائی آخر — روئے از چہ نمی نمائی آخر
خنداں ز دل زمیں بروں آئی — بر گریۂ زار من بہ بخشائے
ہر جا کہ ز پائے تو غبارے است — مارا ز بہشت یادگارے است
ذات تو کہ حفظ جان من بود — پشت من وپشت بان من بود
روزے کہ لب تو در سخن بود — پند تو صلاح کار من بود
امروز منم بہ دست پیوند — خاموشی تو ہمی دہد پند

اڑتالیس برس کی عمر میں ماں کو اس طرح یاد کرتے ہیں جس طرح کمسن بچہ ماں کے لئے بلکتا

ہے اس سے آگے بھائی کے مرثیہ کے شعر ہیں اور وہ بھی خون جگر سے رنگین ہیں،

امیر خسرو اگرچہ خاندان کے اثر سے شاہی دربار سے تعلق رکھتے تھے اور اسی قسم کی زندگی بسر کرتے تھے جو عام دنیاداروں کا طریقہ ہے لیکن یہ امر انکی اصل فطرت کے خلاف تھا، درباداری، خوشامد اور شخص پرستی سے انکو طبعی نفرت تھی اور موقع بموقع یہ خیالات بے اختیار انکی زبان سے نکلجاتے تھے، لیلی مجنوں ۶۹۸ھ میں لکھی تھی جب انکو سلطان علاء الدین خلجی جیسے جبار بادشاہ سے تعلق تھا، تاہم خاتمہ میں لکھتے ہیں،

شب تا سحر و ز صبح تا شام — در گوشۂ غم نگیرم آرام
باشم ز برائے نفس خود راسے — پیش چو خودے، استادہ بر پاے

اس پر مزید یہ ہوا کہ انکے والد نے انکو آٹھ برس کی عمر میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے قدموں پر ڈالدیا تھا اور برکت کیلئے بیعت کرادی تھی، خواجہ صاحب کی روحانی تاثیر چھپکے چھپکے اپنا کام کرتی جاتی تھی، امیر خسرو کی طبیعت میں عشق و محبت کا مادہ بھی ازلی تھا وہ سرتاپا عشق تھے اور بجلی انکی رگ رگ میں کوندتی پھرتی تھی، آخر یہ نوبت پہنچی کہ ۱۲۷۱ھ میں جیسا کہ خود افضل الفوائد میں لکھا ہے خواجہ صاحب کے ہاتھ پر دوبارہ بیعت کی خواجہ صاحب نے چارگوشہ کی ٹوپی جو اس سلسلہ کی نشانی تھی عنایت کی اور مریدان خاص میں داخل کیا، قدرت اللہ قدرت نے نتیجات الشعرا میں لکھا ہے کہ امیر نے جب خواجہ صاحب سے بیعت کی تو جو کچھ نقد اور اسباب تھا، سب لٹا دیا اور پابدامن ہو کے بیٹھ گئے۔

خواجہ صاحب سے امیر کی ارادت اور عقیدت عشق کے درجہ تک پہنچ گئی تھی ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے تھے اور گویا انکا جمال دیکھ کر جیتے تھے، خواجہ صاحب کو بھی انکے ساتھ یہ تعلق تھا کہ فرمایا کرتے تھے کہ جب قیامت میں سوال ہوگا کہ نظام الدین کیا لایا ہے تو خسرو کو پیش کر دونگا" دعا مانگتے تھے تو خسرو کی طرف اشارہ کر کے فرماتے تھے الٰہی

بہ سوز سینۂ این ترک مرا بہ بخش؛

ایک دفعہ خواجہ صاحب لب دریا کوٹھے پر بیٹھ کر ہندوؤں کی عبادت اور اشنان کا تماشا دیکھ رہے تھے امیر خسرو بھی حاضر تھے خواجہ صاحب نے فرمایا دیکھتے ہو

ع ہر قوم راست راہے دینے وقبلہ گاہے

اسوقت خواجہ صاحب کی ٹوپی ذرا ٹیڑھی تھی امیر نے اُسکی طرف اشارہ کر کے برجستہ کہا، ع

ماقبلہ راست کردیم برطرف کجکلاہے

جہانگیر نے تزک جہانگیری میں لکھا ہے کہ میری مجلس میں قوال یہ شعر گا رہے تھے میں نے اسکا شان نزول پوچھا، ملا علی احمد مہرکن نے واقعہ بیان کیا، مصرع آخر کے ختم ہوتے ملا کی حالت بدلنی شروع ہوئی یہانتک کہ غش کھا کر گرے، دیکھا تو دم نہ تھا[1]

خواجہ صاحب نے امیر خسرو کو ترک اللہ کا خطاب دیا تھا اور اسی لقب سے پکارتے تھے، امیر نے جابجا اس پر فخر کیا ہے چنانچہ ایک قصیدہ میں جو خواجہ صاحب کی مدح میں ہے فرماتے ہیں،

برزبانت چوں خطاب بندہ ترک اللہ رفت — دست ترک اللہ گیر د ہم بہ اللہش سپار

خواجہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ خسرو کو میری قبر کے پہلو میں دفن کرنا، یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر ایک قبر میں دو لاشوں کا دفن کرنا جائز ہوتا تو میں اپنی ہی قبر میں ان کو بھی دفن کراتا،

امیر نے تصوف میں جو مدارج حاصل کئے، ان کو ہم نہ جان سکتے اور نہ بیان کر سکتے ہیں، یہ البتہ نظر آتا ہے کہ امیر کا ہر شعر جو بجلیاں گراتا ہے وہ اسی وادی ایمن کی شرر باریاں ہیں،

امیر کی صوفیانہ زندگی کا ایک بڑا واقعہ حسن دہلوی کے تعلقات ہیں حسن نہایت صاحب جمال تھے اور نانبائی کا پیشہ کرتے تھے امیر کا عین شباب تھا کہ ایک دن اتفاق سے انکی دوکان کے سامنے سے گزرے، آفتاب حسن کی شعاعیں ان پر بھی پڑیں، وہیں ٹھہر گئے اور پوچھا کہ کس حساب سے روٹی بیچتے ہو، حسن نے کہا کہ ایک پلڑے میں روٹی رکھتا ہوں اور خریدار سے کہتا ہوں دوسرے پلہ میں سونا رکھے، سونے کا پلہ جھک جاتا ہے،

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۱۰۸ مطبوعہ علی گڈھ

تو روٹی حوالہ کر دیتا ہوں، امیر نے کہا اور خریدار مفلس ہو؟ حسن نے کہا تو سونے کے بدلے درد اور نیاز لیتا ہوں، اس انداز گفتگو نے امیر کو اور بھی بے اختیار کر دیا، ف، نظام الدین اولیا کی خدمت میں آسے اور واقعہ بیان کیا، حسن نے گوناوک اندازی کی تھی، لیکن خود بھی شکار ہو گئے، اُسی وقت دوکان بند کر کے خواجہ صاحب کی خدمت میں پہنچے، اور اپنے دلدادہ (امیر خسرو) سے ملے، اسی تعلق سے خواجہ صاحب کی خدمت میں اکثر آتے جاتے رہتے تھے[1]،

امیر سے اس قدر تعلقات بڑھے کہ دونوں ایک دم کے لئے بھی جدا نہیں ہوتے تھے امیر نے جب خان شہید کی ملازمت کی تو حسن بھی ساتھ ملازم ہوئے چنانچہ جب ملتان میں خان شہید کو تاتاریوں نے ہلاک کیا تو خسرو کے ساتھ حسن بھی اس موقع پر موجود تھے دونوں کے تعلقات کا چرچا زیادہ پھیلا تو لوگوں نے خان شہید سے شکایت کی امیر نے اس واقعہ پر یہ غزل لکھی،

زیں دل خود کام کار من بہ رسوائی کشید   خسروا فرمان دل بردن ہمیں بار آورد

خان شہید نے بدنامی کے خیال سے حسن کو امیر کے ملنے سے منع کر دیا، لیکن کچھ اثر نہ ہوا، خان شہید نے غصہ میں آکر حسن کے ہاتھ پر کوڑے لگوائے، حسن سیدھے خسرو کے پاس گئے، خان شہید کو اسی وقت پرچہ لگا، نہایت متحیر ہوا اور امیر کو بلوا بھیجا، آئے تو کہا کیا حالت ہے؟ امیر نے آستین سے ہاتھ نکال کر دکھایا اور کہا، ع

گواہ عاشق صادق در آستین باشد،

دیکھا تو جہاں حسن کے کوڑے لگے تھے وہیں خسرو کے ہاتھ پر بھی کوڑے کے نشان تھے[2]،

---

[1] یہ واقعہ اکثر تاریخوں اور تذکروں میں منقول ہے لیکن صاحب بہارستان سخن نے اسکی معقول بنا پر تکذیب کی ہے اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی یہ عبارت نقل کی ہے "بہ قیاس چناں دے آید کہ حسن را بہ نسبت امیر خسرو گونہ تقدم باشد چہ امیر حسن را در مدح سلطان غیاث الدین بلبن قصائد غرا است و در کلام امیر خسرو در مدح سلطان کمتر چیزے بینواں یافت"

[2] یہ تمام واقعات فرشتہ نے امیر خسرو کے تذکرہ میں لکھے ہیں لیکن اخیر کا واقعہ آجکل کون تسلیم کریگا،

چونکہ حسن کا تذکرہ ہم الگ نہیں لکھتے، اور صنف غزل پران کا خاص احسان ہے اسلئے انکے شیدائی امیر خسرو ہی کے تذکرہ میں ان کے اشعار نقل کرتے ہیں،

خلق گویند، دل از صبر، بجب آور باز | ایدل، از صبر نشانے دہ اگر جائے ہست
ایکہ نظارۂ دیوانہ نہ کردی ہرگز | قدمے رنجہ کن، این سوے کہ رسوائے ہست

بر چوں تو، کسے دگر گزیدن | کا ہے دگرست، کار من نیست
گفتی کہ چرا جدائی از من | این از فلک ست، از حسن نیست
باز این دلم بسوے دلارام میرود | از دام جستہ باز سوے دام میرود
ایام در نیامدہ با ما بہ دوستی | وان شوخ ہم بہ سیرت ایام میرود
اے خواجہ! در محلہ تقوی قیام گیر | در کوے عاشقی نتوان نیکنام شد
عقلم کہ زین بر ابلق ایام می نہاد | آخر بتا زیانۂ عشق تو رام شد
طرفہ مرد کا سے است کہ با وعدۂ معشوق | صابر نتوان بود و تقاضا نتوان کرد
از حسن این یک سوالیست کہ معشوق تو کیست | این سخن را چہ جواب ست تو ہم میدانی
دو سہ بار با تو گفتم کہ مرا بہ ہیچ بستان | نہ شد اتفاق، شاید کہ بدین بہا گرانم
تلخ کردم جہانے را نخواب | زان دعا ہا کہ مستجاب نبود
اے حسن یار گر خطائے کرد | ہم شکایت ازو، صواب نبود
بہ تقوے نام نیکو بردہ بودم | نکورویان مرا بدنام کردند
گفتی کہ چرا حال دل خویش نہ گوئی | من خود کنم آغاز بہ پایان کہ رساند

ان اشعار سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جو سوز و گداز اور جذبہ و اثر، انکے کلام میں موجود ہے انکے کشتۂ محبت (امیر خسرو) میں بھی نہیں،

جامعیت اور کمالات

ہندوستان میں چھ سو برس سے آجتک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا، اور سچ پوچھو تو اسقدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع، ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کئے ہونگے، صرف ایک

شاعری کو تو انکی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے، فردوسی، سعدی، انوری، حافظ، عرفی، نظیری بے شبہ اقلیم سخن کے جمؔ وکےؔ ہیں، لیکن انکی حدود حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتے، فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا، سعدی قصیدہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتے، انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا، حافظ، عرفی، نظیری، غزل کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتے، لیکن خسرو کی جہانگیری میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی سب کچھ داخل ہے اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنی تضمین، مستزاد اور صنائع و بدائع کا تو شمار نہیں، تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو انکی ہمسری کا دعوے نہیں ہوسکتا، فردوسی کے اشعار کی تعداد کم و بیش ستر ہزار ہے صائب نے ایک لاکھ شعر سے زیادہ کہا ہے. لیکن امیر خسرو کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں اکثر تذکروں میں خود امیر خسرو کے حوالے سے لکھا ہے کہ انکا کلام تین لاکھ سے زیادہ اور چار لاکھ سے کم ہے، لیکن اس میں غالباً ایک غلط فہمی ہے، امیر نے ابیات کا لفظ لکھا ہے اور قدما کے محاورہ میں بیت ایک سطر کو کہتے ہیں چنانچہ نثر کی کتابوں کے متعلق یہ تصریحیں جا بجا نظر آتی ہیں کہ اس میں اس قدر بیتیں ہیں،

ان سب پر مستزاد یہ کہ اوحدی نے تذکرہ عرفات میں لکھا ہے کہ امیر کا کلام جسقدر فارسی میں ہے اسی قدر برج بھاکا میں ہے کس قدر افسوس ہے کہ اس مجموعہ کا آج نام و نشان بھی نہیں،

مختلف زبانوں کی زباندانی کا یہ حال ہے کہ ترکی اور فارسی اصلی زبان ہے، عربی میں ادبائے عرب کے ہمسر ہیں،

سنسکرت کے ماہر ہیں، چنانچہ مثنوی نُہ سپہر میں تواضع کے لہجہ میں اسکا ذکر کیا ہے،

ع من قدرے بر سر ایں کار شدم،

شاعری کے بعد نثاری کا نمبر ہے، اسوقت تک کسی نے نثر لکھنے کے اصول اور قاعدے نہیں مرتب کئے تھے، انہوں نے ایک مستقل کتاب اعجاز خسروی تین جلدوں میں لکھی اور اگرچہ افسوس ہے کہ زیادہ تر زور صنائع و بدائع پر بیکار گیا، لیکن انکی طباعی اور ذہانت

انواع شاعری

اشعار کی تعداد

سنسکرت دانی

سے کون انکار کر سکتا ہے،

موسیقی میں یہ کمال پیدا کیا کہ نایک کا خطاب' انکے بعد آجتک پھر کوئی شخص حاصل نہ کر سکا، چنانچہ اسکی تفصیل مستقل عنوان میں آتی ہے، موسیقی

ان مختلف الحیثیات مشغلوں کے ساتھ فقر و تصوف کا یہ رنگ ہے کہ گویا عالم قدس کے سوا دنیائے فانی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا، چنانچہ اسکا ذکر بھی الگ عنوان میں آئیگا، فقر و تصوف

ان سب باتوں کے ساتھ جب اس پر نظر کیجاتی ہے کہ انکو ان کاموں میں مشغول ہونے کے لئے وقت کس قدر ملتا تھا، تو سخت حیرت ہوتی ہے' وہ ابتدا سے ملازمت پیشہ تھے اور درباروں میں تمام تمام دن حاضری دینی پڑتی تھی' کام جو سپرد تھا، وہ شاعری نہ تھی بلکہ اور اور اشغال تھے، لیلیٰ مجنوں کے خاتمہ میں لکھتے ہیں، عدیم الفرصتی

مسکین من متمند مدہوش — از سوختگی چو دیگ پُر جوش
شب تا سحر و ز صبح تا شام — در گوشۂ غم نہ گیرم آرام
باشم ز برائے لقمۂ خود رائے — پیش چو خودی ستادہ برپائے

یعنی نفس پروری کی وجہ سے اپنے ہی جیسے کے آگے، صبح سے شام تک مؤدب کھڑا رہتا ہوں،

تا خوں نہ رود ز پائے تا سر — دستم نہ شود ز آب کس تر

جب تک پاؤں کا پسینہ سر تک نہیں پہنچتا، کھانا کھانے کو نہیں ملتا،

ان حالات کے ساتھ اگر صانع قدرت انکے پیدا کرنے پر ناز کرے تو چنداں ناموزوں نہ ہوگا،

موسیقی امیر کی ہمہ گیر طبیعت نے اس نازک اور لطیف فن پر بھی توجہ کی اور اس درجہ تک پہنچایا کہ چھ سو برس کی وسیع مدت نے بھی ان کا جواب پیدا نہ کیا، انکے زمانہ کا مشہور جگت استاد جو تمام ہندوستان کا استاد تھا، نایک گوپال تھا اسکے بارہ سو شاگرد تھے' جو اسکے سنگھاسن یعنی تخت کو کہاروں کی طرح کاندھے پر لیکر چلتے تھے' سلطان علاء الدین خلجی نے اسکے کمال کا شہرہ سنا تو دربار میں بلایا امیر خسرو نے عرض کی کہ میں تخت کے نیچے چھپ کر بیٹھتا ہوں' نایک گوپال سے گانے کی فرمائش کیجائے نایک نے چھ

مختلف جلسوں میں اپنا کمال دکھایا، ساتویں دفعہ امیر بھی اپنے شاگردوں کو لے کر دربار میں آئے، گوپال بھی ان کا شہرہ سُن چکا تھا، ان سے گانے کی فرمایش کی امیر نے کہا میں مغل ہوں، ہندوستانی گانا کچھ یوں ہی سا جانتا ہوں، پہلے آپ کچھ سنائیں تو میں بھی کچھ عرض کردونگا،

گوپال نے گانا شروع کیا، امیر نے کہا یہ راگ تو مدت ہوئی میں باندھ چکا ہوں، پھر خود اسکو ادا کیا، گوپال نے دوسرا راگ شروع کیا، امیر نے اسکو بھی ادا کرکے بتایا کہ مدتوں پہلے میں اسکو ادا کرچکا ہوں، غرض گوپال جو راگ راگنی اور سُر ادا کرتا تھا امیر اسکو اپنا ایجاد ثابت کرتے جاتے تھے، بالآخر کہا کہ یہ تو عام بازاری راگ تھے، اب میں اپنے خاص ایجادات سناتا ہوں، پھر جو گایا تو گوپال مبہوت ہو کر رہ گیا[1]

امیر خسرو چونکہ ہندی کے ساتھ فارسی راگوں سے بھی واقف تھے، اسلئے اُنھوں نے دونوں موسیقی کو ترکیب دیکر ایک نیا عالم پیدا کردیا، چنانچہ اُنکے ایجاد کردہ راگ حسب ذیل ہیں[2]،

نام راگہاے مخترع امیر خسرو	کن راگوں سے مرکب ہے
مجیر	غار اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے
ساز گری	پوربی، گورا، کنگلی، اور ایک فارسی راگ قِران السعدین میں اسکا ذکر کیا ہے چنانچہ کہتے ہیں

زمزمہ ساز گری در عراق ۔۔۔ کردہ بہ گلبانگ عراق اتفاق

ایمن	ہنڈول اور نیریز

---

[1] عالمگیری علما میں فقیر اللہ جسکا لقب سیف خاں تھا ایک مشہور امیر تھا، ناصر علی نے اسی کی شان میں کہا ہے،

گفتگو ے طوطی از آئینہ مے خیزد علے ۔۔۔ گر نباشد سیف خاں مار انفس در کار نیست

وہ موسیقی کا بڑا ماہر تھا، فن موسیقی کی ایک مستند کتاب مانک سوہل تھی فقیر اللہ نے اسکا فارسی میں ترجمہ کیا، اور اور بہت سے فوائد اضافہ کئے اور اسکا نام راگ درپن رکھا، چنانچہ مآثر الامرا جلد دوم صفحہ ۷۹۴ مطبوعہ کلکتہ میں یہ تفصیل مذکور ہے، اس کتاب کا ایک قدیم نسخہ میرے پاس ہے اور ایک ندوہ کے کتب خانہ میں ہے گوپال کا واقعہ اور آیندہ امیر خسرو کی ایجادات میں نے اسی کتاب سے لئے ہیں،

[2] راگ درپن کے دو نسخے جو میرے استعمال میں ہیں، دونوں غلط ہیں اس لئے راگوں کے نام صحیح نہیں پڑھے گئے اس لئے کہیں کہیں میں نے حرف ضورت نویسی کردی ہے،

عشاق	سارنگ اور بسنت اور نوا
موافق	توڑی ومالڑی ودوگاہ وحسینی
غنم	پوربی میں ذرا تغیر کردیا ہے،
زیلف	کھٹ راگ میں شہ ناز کو ملایا ہے
فرغنہ	کنگلی اور گورا میں فرغانہ ملایا ہے
سرپردہ	سارنگ پلاول، اور راست کو ترکیب دیا ہے
باخرز	ویسکار میں ایک فارسی راگ ملادیا،
فردوست دیا، پھر دوست	کانہڑا، گوری، پوربی، اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے،
منم	کلیان میں ایک فارسی راگ شامل کیا ہے،

راگ درپن میں لکھا ہے کہ ان راگوں میں سازگری، باخرز، عشاق اور موافق میں موسیقی کا کمال دکھایا ہے، باقی راگوں میں کچھ یوں ہی ادل بدل کر کے دوسرا نام رکھ دیا ہے قول، ترانہ، خیال، نقش، نگار، بسیط، تلانہ، سوہلہ، یہ سب بھی امیر خسرو کی ایجاد ہیں، ان میں سے بعض خاص اُن کی ایجاد ہیں، بعض کے نام ہندی میں پہلے موجود تھے امیر نے ان میں کچھ تصرف کر کے نام بدل دیا،

تصانیف جامی نے نفحات الانس میں لکھا ہے کہ امیر خسرو نے ۹۲ کتابیں تصنیف کیں یہ بھی مشہور ہے کہ امیر نے خود کسی کتاب میں تصریح کی ہے کہ میرے اشعار پانچ لاکھ سے کم اور چار لاکھ سے زیادہ ہیں، اوحدی نے عرفات میں لکھا ہے کہ امیر کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اس سے زیادہ ہندی میں ہے،

امیر کی کثرت تصنیف سے کسکو انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن بیانات مذکورۂ بالا مبالغہ سے خالی نہیں، چار پانچ لاکھ اشعار کی یہ کیفیت ہے کہ قدیم زمانہ میں سطر کو بیت کہتے تھے، اور یہ استعمال نہایت کثرت سے مروج ہے، اس بنا پر ان کی ہر قسم کی تصانیف کی ۴، ۵ لاکھ سطریں ہوں تو چنداں تعجب نہیں، لوگوں نے بیت اور شعر کو مرادف سمجھ کر بیت کی جگہ شعر لکھ دیا،

ہندی کلام مدون نہیں ہوا، اس لئے مبالغہ کے لئے کافی موقع ہے، بہرحال جس قدر تصنیفات آج ملتی ہیں وہ بھی کم نہیں، اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

دیوان تحفۃ الصغر[۱]
اسکے دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ یہ سب سے پہلا دیوان ہے جس میں ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس تک کا کلام ہے،

دیوان وسط الحیات
اس میں ۲۰ برس کی عمر سے ۳۲ یا ۳۴ برس کا کلام ہے اس میں جو قصائد ہیں سلطان شہید کشلو خاں وغیرہ کی مدح میں ہیں،

غرۃ الکمال
یہ دیوان اپنے بھائی علاء الدین علی خطاط کے اصرار سے مرتب کیا، ۳۴ برس کی عمر یعنی ۶۸۵ھ سے تقریباً ۶۹۵ھ تک کا کلام ہے، دیباچہ میں اپنی مختصر سی سوانحعمری لکھی ہے سلطان معز الدین کیقباد، اور جلال الدین خلجی کے مدحیہ قصائد ہیں،

بقیہ نقیہ
دو ہفتہ میں اسکی ترتیب کی اور دیباچہ لکھا بڑھاپے کا کلام ہے، تاریخ تالیف مذکور نہیں لیکن سلطان علاء الدین خلجی کا مرثیہ اس میں موجود ہے اسلئے کم از کم ۷۱۵ھ کے بعد تک کا کلام ہے۔

۱ امیر نے اپنے چاروں دیوانوں کے دیباچوں میں تصنیف کے متعلق کچھ کچھ حالات بھی لکھے ہیں تحفۃ الصغر اور غرۃ الکمال کا دیباچہ اسوقت میرے پیش نظر ہے اور دیوانوں کے دیباچے بھی نظر سے گذرے ہیں لیکن اسوقت سامنے نہیں اسلئے انکی نسبت میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ ڈاکٹر ریو (آر آئی ای وی)، کے ریویو سے ماخوذ ہے جو انھوں نے برٹش میوزیم کے کتبخانہ کی فہرست میں لکھے ہیں اس اطلاع کے متعلق میں مولوی عبدالقادر پروفیسر پونا کالج کا ممنون ہوں

نہایۃ الکمال

پانچواں دیوان ہے، اس میں غزلوں کے علاوہ قطب الدین مبارک خلجی المتوفی ۷۲۰ھ کا مرثیہ اور اسکے ولی عہد کی مدحیں ہیں، ایک قصیدہ میں ۷۲۵ھ کا ایک واقعہ مذکور ہے اور اسی سن میں خسرو نے انتقال کیا ہے،

قران السعدین

سب سے پہلی مثنوی ہے ۶۸۸ھ میں جبکہ مصنف کی عمر ۳۶ برس کی تھی لکھی، کیقباد، اور بغراخاں کے مراسلات اور صلح و ملاقات کا حال ہے،

مطلع الانوار

مخزن الاسرار کا جواب ہے، سلطان علاء الدین خلجی کے نام پر لکھی، ۳۳۱۰ شعر ہیں دو ہفتہ میں تمام ہوئی سال اختتام ۶۹۸ھ ہے تصوف کے مضامین ہیں اور پنج گنج کے سلسلہ کی پہلی کتاب ہے،

شیریں خسرو

رجب ۶۹۸ھ میں تمام ہوئی ۴۱۲۴ شعر ہیں،

آئینہ اسکندری

سکندر نامہ کا جواب ہے سال اختتام ۶۹۹ھ ہے اشعار کی تعداد ۴۴۵۰

لیلیٰ مجنوں

۲۶۶۰ شعر ہیں، ۶۹۸ھ میں ختم ہوئی،

ہشت بہشت

سلسلہ پنج گنج کی سب سے اخیر مثنوی ہے ہفت پیکر نظامی کا جواب ہے، ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی ۳۳۸۲ شعر ہیں،

پورا خمسہ سلطان علاء الدین خلجی کے نام پر ہے کل ۱۸ ہزار شعر ہیں خمسہ نظامی میں ۲۸ ہزار شعر ہیں یہ پانچوں کتابیں دو برس کی مدت میں تمام ہوئیں،

تاج الفتوح

سلطان جلال الدین فیروز شاہ کی تخت نشینی کے

سال اوّل یعنی ۶۸۹ھ سے جمادی الآخر ۶۹۰ھ تک کے حالات ہیں اور اسی سنہ میں یہ مثنوی تمام بھی ہوئی مطلع یہ ہے، سخن بر نام شاہے کردم آغاز،

نُہ سپہر

قطب الدین خلجی کے نام پر ہے، نُو باب ہیں اور ہر باب جُداگانہ بحر میں ہے، اس مناسبت سے نہ سپہر نام رکھا ہے، اسوقت امیر خسرو کی عمر ۶۵ برس کی ہو چکی تھی ۷۱۸ھ میں تمام ہوئی،

دول رانی خضر خاں

دول رانی گجرات کے راجہ کی لڑکی تھی، خضر خاں سلطان علاء الدین کا بیٹا تھا، وہ دول رانی پر عاشق ہو گیا تھا اور اس سے شادی کی، خضر خاں نے خود یہ حالات بطور یادداشت کے لکھے تھے، اسکی فرمائش سے، امیر خسرو نے اسکو نظم کا لباس پہنایا، اور عشقیہ نام رکھا، چار مہینے میں تمام ہوئی، ۴۲۰۰ شعر تھے، خضر خاں کے مرنے پر دول رانی کو جو واقعات پیش آئے انکو لکھا تو ۳۱۹ شعروں کا اضافہ ہوا ۷۱۵ھ میں تمام ہوئی،

افضل الفوائد

خواجہ نظام الدین اولیا کے ملفوظات ہیں،

اعجاز خسروی

نثر نویسی کے اصول اور قواعد منضبط کئے ہیں، اور سیکڑوں صنعتیں اختراع کی ہیں، ۷۱۹ھ میں تمام ہوئی تین جلدوں میں ہے،

تغلق نامہ

غیاث الدین تغلق کے حالات اور فتوحات ہیں،

خزائن الفتوح

سلطان علاء الدین کی فتوحات ہیں،

مناقب ہند، تاریخ دہلی

ان کتابوں کا ذکر دولت شاہ نے کیا ہے،

دولت شاہ نے لکھا ہے کہ ان تصنیفات کے علاوہ فن حساب اور فن موسیقی میں بھی ان کی تصنیفیں ہیں،

شاعری

امیر خسرو اگرچہ ہندی نژاد تھے، لیکن ایرانی شعرا کو بھی انکی شاعری اور زباندانی کا اعتراف کرنا پڑا، جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ خمسۂ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا، طوطی ہند جو ان کا خطاب تھا، ایرانی بھی اسی خطاب سے ان کو یاد کرتے ہیں،

عرفی
بہ روح خسرو ازیں پارسی شکر دادم — کہ کام طوطی ہندوستان شود شیریں

خواجہ حافظ
شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند — زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

آذری نے جواہر الاسرار میں لکھا ہے کہ شیخ سعدی شیرازی خسرو سے ملنے کے لئے شیراز سے دلی میں آئے، اگرچہ یہ روایت قرین قیاس نہیں اور بعض تذکرہ نویسوں نے صراحۃً اس واقعہ سے انکار کیا ہے، تاہم اس سے اسقدر ثابت ہوتا ہے کہ آذری کے نزدیک خسرو اس پایہ کے شخص تھے کہ سعدی کا انکی ملاقات کے لئے سفر کرنا ممکن تھا اور اس قدر تو تمام مورخوں اور تذکرہ نویسوں کو تسلیم ہے کہ جب سلطان شہید نے سعدی کو شیراز سے بلایا تو انہوں نے بڑھاپے کا عذر کیا اور لکھ بھیجا کہ خسرو جوہر قابل ہیں، انکی تربیت کی جائے، اسوقت خسرو کی عمر بتیس برس سے زائد نہ تھی،

تاہم بعض بعض ایرانی شعرا قومی تعصب کو چھپا نہیں سکے، عبید ایک شاعر جو امیر خسرو کا معاصر ہے کہتا ہے،

غلط افتاد خسرو را زخامی — کہ سکبا ریخت در دیگ نظامی

امیر کی شاعری قدرتی تھی، وہ ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوئے تھے، انکے باپ دادا شاعری سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھتے تھے بلکہ قلم کے بجائے تیغ سے کام لیتے تھے، تاہم امیر کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے تھے کہ انکی زبان سے بے اختیار شعر نکلتے تھے، دیباچہ غرۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں،

لہ بدایونی جلد اول صفحہ ۲۲۲ و ۲۲۳،

دراں صغر سن کہ دندان می افتاد سخن می گفتم و گوہر از دہانم میریخت،

دیوان تحفۃ الصغر کے دیباچہ میں لکھتے ہیں،

چوں مرا استاتے سر آمدہ بر سر نیامدہ بود کہ بہ سرو قایق دال شدے و آہوے مشکبار قلم را از سواد خطا باز آوردے،

ایک مدت تک یوں ہی بطور خود کہتے رہے استاد کے بجائے اساتذہ کے دیوان کو سامنے رکھ کر ان کا تتبع کرتے تھے جس دیوان کا مطالعہ کرتے تھے اسی انداز پر کہنا شروع کرتے، خاقانی کا کلام دیکھا تو بہت مغلق نظر آیا، اسکے الفاظ حل کئے لیکن خود تحفۃ الصغر میں لکھتے ہیں کہ اسکا تتبع نہ ہو سکا، پہلا دیوان بالکل بے اصلاح ہے امیر اسکو مرتب کرنا بھی نہیں چاہتے تھے، لیکن بھائی کی خاطر سے مجبور ہو گئے،

لیکن بالآخر وہ اپنا کلام اساتذہ کو دکھلانے لگے، ہشت بہشت کے خاتمہ میں تصریح کی ہے کہ یہ کتاب شہاب کی اصلاح یافتہ ہے، شہاب کی پہلے نہایت تعریف کی ہے پھر لکھتے ہیں،

من بدو عرضہ کردہ نامۂ خویش	او بہ اصلاح راند خامۂ خویش
دید ہر نکتہ را رقم بہ رقم	رنج بر خود نہاد و منت ہم
نظرے تیز کرد موئے شگافت	نے بہ عمیا نظارہ بگذافت
این دقائق کہ شد ز مغز ش پوست	مو بمو شعر بیز کردۂ اوست
شمع من یافتہ ضیا ازوے	مس من گشتہ کیمیا ازوے
ہر چہ او گفت من نہادم گوش	بر کشیدم مگس ز شربت نوش
وانچہ بنمود من نہ جستم پے	عیب آں بر من است نہ بروے
یا رب او چوں ز پنج نامۂ من	برد بیروں خطائے خامۂ من
نامۂ او کہ حسر ز جانش باد	در قیامت خط امانش باد

اخیر کے شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچوں مثنویاں شہاب کی اصلاح دادہ ہیں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ امیر نرے مقلد نہ تھے، جہاں ان کو اصلاح کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی

وہاں اُستاد کی رائے تسلیم نہیں کرتے تھے، گو ادب کا پاس اب بھی ملحوظ رکھتے تھے ؎

عیب آں بر من است نہ بر وے،

کیا عجیب بات ہے، وہ اُستاد جس کے دامن تربیت میں خسرو جیسا شخص پل کر بڑا ہو، آج اُس کا نام و نشان تک معلوم نہیں،

معاصر اُستادوں کے علاوہ خسرو نے قدیم اساتذہ سے بھی بہت فیض حاصل کیا ہے وہ اُنکے کلام کو سامنے رکھ کر لیتے تھے اور اُسی طرح اُس سے فائدہ اُٹھاتے تھے جس طرح کوئی شاگرد زندہ اُستاد سے شاعری سیکھتا ہے، اسی بنا پر لیلیٰ مجنوں میں نظامی کی نسبت لکھتے ہیں،

زندہ است بہ معنی اُوستادم	در نیست منش حیات دادم

شیخ سعدی سے استفادہ کا اشارہ کرتے ہیں،

خسرو سرمست اندر ساغرِ معنی بریخت	شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ خسرو جوانی کے جوش میں اکثر اساتذہ کی شان میں گستاخی کرتے تھے چنانچہ جب مطلع الانوار لکھتے ہوئے یہ شعر کہا،

کوکبۂ خسرویم شد بلند	زلزلہ در گور نظامی فگند

تو قبر سے ایک تلوار نکلی اور خسرو کی طرف بڑھی خسرو نے حضرت خواجہ نظام الدین کا نام لیا، دفعۃً ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اُس نے آستین تلوار کے سامنے کر دی تلوار آستین کو کاٹتی ہوئی ایک بیری کے درخت پر جا لگی یہ واقعہ جس قدر عقل کے خلاف ہے اُسی قدر تاریخ کے بھی مخالف ہے، خسرو نے مطلع الانوار ۶۹۸ھ میں لکھی ہے اسوقت انکی عمر ۴۷ برس کی ہو چکی تھی یہ شباب کا زمانہ کہاں ہے، شباب کے زمانہ میں انہوں نے غرۃ الکمال مرتب کیا ہے اُسکے دیباچہ میں صاف لکھتے ہیں کہ میں مثنوی میں نظامی کا پیرو اور شاگرد ہوں،

اسی زمانہ میں قران السعدین لکھی اُس میں لکھتے ہیں،

نظم نظامی بہ لطافت چو دُر	وز دُر او سر بسر آفاق پُر
پختہ ازو شد چو معانی تمام	خام بود پختن سودائے خام

بگذر ازیں خانہ، کہ جائے تو نیست	ویں رہ باریک بہ پائے تو نیست
کالبدے داری و جان اندر دست	ہر چہ تو دانی بہ ازاں، اندر دست
تا بود ایں سکّہ بہ عالم درست	بر تن تو کے بود ایں شُقّہ چیست
ثنوی ادراست ثنائے بگوے	بشنوش از دور و دعائے بگوے
ایں ہمہ زانصاف نگر زور نیست	گر تو نہ بینی دگرے کور نیست

نظامی کی نسبت لیلیٰ مجنوں میں لکھتے ہیں،

زندہ است بہ معنی اوستادم	ور نیست منش حیات دادم

غرض امیر نے کبھی اساتذہ کی استادی سے انکار نہیں کیا وہ تمام استادوں کا نہایت ادب کرتے تھے مطلع الانوار میں جو کہدیا ہے وہ ایک اتفاقیہ فخریہ جوش تھا جس سے نظامی کی تحقیر منظور نہ تھی،
امیر کے حالات شاعری میں یہ سب سے عجیب تر واقعہ ہے کہ وہ اپنے کلام پر آپ ریویو کرتے ہیں اور ایسی بے لاگ رائے دیتے ہیں کہ انکا دشمن سے دشمن بھی ایسی آزادانہ رائے نہیں دے سکتا، قران السعدین میں اُنھوں نے کیقباد اور بغراخان کا حال لکھا ہے لیکن اصلی واقعہ کو چھوڑکر خاص خاص چیزوں کی تعریف میں اس قدر مصروف ہوجاتے ہیں کہ واقعات کا سلسلہ بالکل ٹوٹ جاتا ہے اور کلام نہایت بے ربط ہوجاتا ہے۔ اس عیب کو خود ظاہر کرتے ہیں،

وصف بر آں گونہ فروراندہ ام	کز غرض قصہ فرو ماندہ ام
عیب چناں نیست کہ بنہفتہ ام	کانچہ بگویند ہمہ گفتہ ام
چوں منم اندر قلب کان خویش	معترف عجز بہ نقصان خویش
عیب یکے نیست کہ جویند باز	چوں ہمہ عیب است چگویند باز

غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ شاعر کی تین قسمیں ہیں،
استاد تمام، جو کسی طرز خاص کا موجد ہو، جیسے حکیم سنائی، انوری، ظہیر، نظامی،
استاد نیم تمام، خود کسی طرز خاص کا موجد نہیں، لیکن کسی خاص طرز کا پیرو ہے اور اس میں کمال بہم پہنچایا ہے،

سارق، جو اوروں کے مضامین چُراتا ہے، پھر لکھتے ہیں کہ اُستادی کی چار شرطیں ہیں،
طرزِ خاص کا موجد ہو، اسکا کلام شعرا کے انداز پر ہو، صوفیوں اور واعظوں کے
طریقہ پر نہ ہو، غلطیاں نہ کرتا ہو،

یہ شرائط لکھ کر فرماتے ہیں کہ میں درحقیقت اُستاد نہیں اسلیئے چار شرطوں میں سے
مجھ میں صرف دو شرطیں پائی جاتی ہیں، یعنی میں سرقہ نہیں کرتا، اور میرا کلام صوفیوں اور واعظوں
کے انداز پر نہیں، لیکن دو شرطیں مجھ میں موجود نہیں، اول تو میں کسی طرزِ خاص کا موجد نہیں،
دوسرے میرا کلام لغزشوں سے خالی نہیں ہوتا، اُنکے الفاظ یہ ہیں،

بندہ را ازاں چہار شرطِ اُستادی کہ گفتہ شد اول شرطے کہ سلک طرز است،
برعکس ماجرائے کہ در مجرائے قلم جریان یافت، کہ چندیں استادرا متابع
کلمات بودہ ام،

چوں پس رو طرز ہر سوادم   پس شاگردم نہ اوستادم

دو شرط دوم آنکہ در نافۂ سواد، بوئے خطا نہ باشد ازاں نیز دم نتوانم زد، کہ نظم بندہ
اگرچہ بیشتر روان است، اما جا بجا در غزل و نظم لغزیدنی ہم است، دریں دو شرط
معترفم کہ از لاف اُستادی قرعہ بر فال نتوانم غلطانید،

کیا دنیا میں اس سے زیادہ کوئی انصاف پرستی اور بے نفسی کی مثال ملسکتی ہے امیر کے
کلام پر ریویو کرنے کے لیئے اس سے زیادہ بڑھ کر کیا دلیل راہ ہو سکتا ہے،

امیر نے یہ بتا دیا ہے کہ وہ اصنافِ سخن میں سے کس صنف میں کس کے پیرو
ہیں، تفصیل اس کی یہ ہے

غزل	سعدی
مثنوی	نظامی
مواعظ و حکم،	سنائی و خاقانی
قصائد،	رضی الدین نیشاپوری، و کمال اسمٰعیل خلاق المعانی

لیکن لغزشیں کون بتائے؟ یہ کس کا مُنہ ہے، ہم دبی زبان سے صرف اسقدر

کہہ سکتے ہیں کہ بعض کلام میں (قران السعدین و اعجاز خسروی) لفظی رعایت بہت ہے جو صنائع جگت کی حد تک پہنچ گئی ہے، اور بعض جگہ بالکل تکلف اور آورد ہے،

امیر نے شعر و شاعری کے متعلق دیوانوں کے دیباچہ میں بہت سے نکتے لکھے ہیں جن سے اس فن کے متعلق مفید نتائج حاصل ہوسکتے ہیں، غرۃ الکمال کے دیباچہ میں اس پر بحث کی ہے کہ فارسی اور عربی شاعری میں کسکو ترجیح ہے، فیصلہ فارسی کے حق میں کیا ہے اور اس کی یہ دلیلیں لکھی ہیں،

(۱) عربی میں ایسے زحافات ہیں کہ اگر فارسی میں ہوں تو کلام ناموزوں ہو جائے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فارسی کے اوزان ایسے منضبط اور لطیف ہیں کہ ذرا سی کمی بیشی کی برداشت نہیں کر سکتے،

(۲) عربی زبان میں ایک ایک چیز کیلئے متعدد مترادف الفاظ ہیں، اسلئے شاعری آسان ہے ایک لفظ کسی وزن یا بحر میں نہ کھپ سکا تو دوسرا موجود ہے، بخلاف اسکے فارسی میں نہایت محدود الفاظ ہیں، باوجود اسکے فارسی شعرا پر میدان شاعری تنگ نہیں،

(۳) عربی زبان میں صرف قافیہ ہے، ردیف نہیں،

اب غور کرو عربی زبان کو متعدد طرح کی وسعت حاصل ہے، وزن اتنا وسیع کہ جتنے زحافات چاہیں استعمال کرتے جائیں لفظوں کی یہ بہتات کہ ایک لفظ کے بجائے دوسرا، اور دوسرے کے بجائے تیسرا موجود ہے، ردیف کی سرے سے ضرورت نہیں، نرے قافیہ پر مدار ہے، جسقدر قافیے ملتے جائیں لیتے جاؤ، ان سب وسعتوں کے ساتھ عربی شاعری فارسی شاعری پر غالب نہیں آسکتی،

اسکے علاوہ عرب کا شاعر اگر ایران میں آئے اور برسوں قیام کرے، تاہم فارسی زبان میں شعر نہیں کہہ سکتا، لیکن ایران کا شاعر بے تکلف عربی میں شاعری کر سکتا ہے، زمخشری اور سیبویہ عجمی تھے، لیکن زباندانی میں عرب عربا سے کم نہ تھے، فارسی کے وجوہ ترجیح لکھ کر لکھتے ہیں کہ "اور بہت سے وجوہ ہیں لیکن میں اسلئے قلم انداز کرتا ہوں کہ کوئی مذہبی تعصب کے پردہ میں مخالفت پر نہ آمادہ ہو جائے،

امیر خسرو فن شاعری میں جن خصوصیات کے لحاظ سے ممتاز ہیں انکی تفصیل حسب ذیل ہے
(۱) ایران میں جس قدر شعرا گزرے ہیں خاص خاص اصناف شاعری میں کمال رکھتے تھے
مثلاً فردوسی و نظامی مثنوی میں، انوری اور کمال قصائد میں، سعدی اور حافظ غزل
میں، یہی لوگ جب دوسری صنف میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو پھیکے پڑ جاتے ہیں، بخلاف
اسکے امیر، قصائد، مثنوی اور غزل تینوں میں ایک درجہ رکھتے ہیں، مثنوی میں نظامی کے
بعد آجتک ان کا جواب نہیں ہوا، غزل میں وہ سعدی کے دوش بدوش ہیں، قصائد
میں ان کی چنداں شہرت نہیں ہوئی، لیکن کلام موجود ہے، مقابلہ کر کے دیکھو تو، کمال
اور ظہیر سے ایک قدم پیچھے نہیں، تفصیل اسکی آگے آتی ہے،
(۲) ایشیائی شاعری پر یہ عام اعتراض ہے کہ خاص خاص چیزوں پر نظمیں نہیں لکھی گئیں
مثلاً، قلم، کاغذ، کشتی، دریا، شمع، صراحی، جام، خاص خاص میووں اور پھولوں وغیرہ وغیرہ پر
ایسی مسلسل اور لمبی نظمیں نہیں ملتیں جن سے اُن کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے، امیر خسرو
نے ایشیائی شاعری کی اس کمی کو پورا کر دیا ہے، انہوں نے قران السعدین میں اکثر اسی
قسم کی نظمیں لکھی ہیں، اور اس کتاب سے اُن کا بڑا مقصد اسی قسم کی شاعری کا
نمونہ قائم کرنا تھا چنانچہ خود فرماتے ہیں،

بود در اندیشۂ من چند گاہ	کز دل دانندۂ حکمت پناہ
چند صفت گویم و آبش دہم	مجمع اوصاف خطابش دہم
طرز سخن را روشش نو دہم	سکہ ایں ملک بہ خسرو دہم
سکہ خود زیں فن اندیشہ زاے	تا نہ نشانم نہ نشینم ز پاے
وصف نہ زاں گونہ شاز دل بُراں	کان دگرے را بدل آید کہ چوں

اس قسم کی شاعری کا نام امیر نے "وصف نگاری" رکھا، اور یہ نہایت موزوں نام ہے
اگرچہ افسوس ہے کہ زمانہ کے مذاق کے لحاظ سے اس میں نیچر کا پورا رنگ نہیں آیا، بلکہ
تکلف اور مضمون آفرینی کا رنگ چڑھایا ہے، تاہم جس قدر ہے غنیمت ہے،
کاغذ کی تعریف،

کاغذِ شامی نسب[1] و صبح دام — آنکہ شد آرایشِ صبحش زشام
سادہ حریرے و لے اصلش زخویش — با قصب و خز شدہ پیوند چویش
تا بہ سریر آمدہ اندر نورد — طرفہ حریرے کہ تواں جز وکرد
آمدہ اجزاش فراہم ز آب[2] — لیک پراگندگیش ہم ز آب
بسکہ شد از کوبش بسیار پست — پشت دوتا گردش از یک شکست
گر بود از دستۂ تیغش گزر — گر دہد از تیغ بہ مقراض سر
گر خلد سوزنِ مسطر کشد — گر کشش رشتۂ دفتر کشد
حرف بحرف از قلم آرد سخن — لیک بہ پیچد ہمہ بر خویشتن

بہت سے شعر لکھے ہیں، ہم نے قلم انداز کر دئیے،

کشتی کی تعریف،

ساختہ از حکمت کار آگہاں — خانۂ گردندہ بہ گردِ جہاں
نادرۂ حکمِ خدائے حکیم — خانہ رواں، خانگیانش مقیم
اہلِ سفر را ہمہ بر وے گذر — ہمرہ او ساکن و او در سفر
جاریۂ ہند ز بالش سلیم — حامل چندیں بچہ، لیکن عقیم
بیشتر از مرغ پرد، در گشاد — بیشتر از باد رود، روز باد
رفتہ دو منزل بہ دمے بل دو چند — بارسن و سلسلۂ و تختہ بند
ہمچو کلنگاں بہ ہوا سر فراز — پر چو حواصل زدہ سو کردہ باز
ہر طرفش رہ بہ شتاب دگر — ہر قدمش بر سر آب دگر
گرچہ بدریا گذرد بیش و کم — آب نباشد بگرش تا شکم
دست چو در آب فراز افگند — آب بدست آرد و باز افگند

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک کاغذ شام سے آتا تھا،

[2] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے بھی اسی طرح کاغذ بناتے تھے کہ روئی اور کپڑے کے چیتھڑوں کو پانی میں بھگو کر پانی کی طرح سیال بنا لیتے تھے، پھر وہ خشک ہو کر کاغذ ہو جاتا تھا،

لطمہ زدہ بر رخ دریا بہ زور — آب ازاں لطمہ بر فریاد و شور
دررہ بے آب نداند شدن — کیست کہ بے آب تواند شدن

(۳) تشبیہ شاعری کے چہرہ کا غازہ ہے، لیکن تقلید پرستی نے یہ حالت پیدا کردی تھی کہ جن چیزوں کی جو تشبیہیں ایک دفعہ قدما کے قلم سے نکل گئیں، اُنکے سوا گویا دنیا کی تمام چیزیں بیکار تھیں،

امیر نے بہت سی نئی تشبیہیں خود پیدا کیں، چنانچہ غرۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں،

تشبیہات نو بسیار است ایں مجمل جملہ را تحمل نتواند کرد، اما دو سہ نظیر برای یاد کردن گرد شدہ،

اسکے بعد دو تین مثالیں لکھی ہیں،

زانتظار دو ماہی سیاق تو صد چشم — بزیر ہر مو دارم چو دام ماہی گیر
مژہ ہائے کژ دل آویز ست — کژ ہائے دکان قصاب است
زہے خرامش آں نازنین بہ عیارے — کبوترے بہ نشاط آمدست پندارے

امیر چونکہ ہندی زبان سے آشنا تھے اسلئے تشبیہات میں انکو برج بھاکا کے سرمایہ سے بہت مدد ملی ہوگی اخیر شعر غالباً اسی خرمن کی خوشہ چینی ہے فارسی شعرا معشوق کی رفتار کو کبک کی رفتار سے تشبیہ دیتے تھے، ہندی میں ہنس کی چال عام تشبیہ ہے۔ لیکن کبوتر مستی کی حالت میں جس طرح چلتا ہے وہ مستانہ خرام کی سب سے اچھی تصویر ہے،

قصیدہ، مثنوی، غزل میں انہوں نے جو جدتیں پیدا کیں، اُن کی تفصیل علحدہ عنوانوں میں آگے آتی ہے،

مثنوی! مثنوی میں جیساکہ وہ خود لکھتے ہیں، نظامی کے پیرو ہیں، نظامی کے پنج گنج میں تین قسم کی مثنویاں ہیں، رزمیہ، عشقیہ، صوفیانہ، خسرو نے بھی تینوں مضامین کو لیا ہے اور ہر رنگ کو نظامی کے انداز میں لکھا ہے،

ایک ایک مثنوی پر ریویو کرنا خاص انکے سوانح نگار کا کام ہے۔ البتہ نمایاں مثنویوں کا ذکر کرنا ضروری ہے،

قران السعدین یہ سب سے پہلی مثنوی ہے جو ۳۶ برس کی عمر میں لکھی، اسلئے اس میں تکلف اور آورد بہت ہے لیکن باوجود اسکے اکثر جگہ نہایت بلند روان اور برجستہ ہے، مثنوی کا قصہ نہایت بیہودہ تھا یعنی باپ بیٹوں کی مخالفانہ خط وکتابت اور حملہ کی تیاری بیٹا یعنی کیقباد نہایت گستاخ اور بے تمیز تھا، لیکن مشکل یہ تھی کہ وہی صاحب تخت تھا اور اسی کی فرمایش سے یہ مثنوی لکھی گئی، بیٹا یہ بھی چاہتا تھا کہ اسکی گستاخیاں جنکو وہ اپنی دلیری کے نام سے سمجھتا تھا، تفصیل اور آب و رنگ کے ساتھ لکھی جائیں، اور یہ ثابت کیا جائے کہ باپ کے ہوتے تخت سلطنت کا مستحق بیٹا ہے، اس جھوٹی منطق کو امیر نے جہانتک ہوسکا خوب نباہا ہے، چنانچہ بیٹے کی زبان سے کہتے ہیں،

گر بہ گہر تاج ستانِ توام ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ عیب مکن گوهر کانِ توام
در ہوس تاج ترا در سر است ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ من گہرم تاج مرا درخور است
چوں سرم از بخت سرافراز گشت ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ تاج تو بر تارکِ من باز گشت
تخت جہاں بہر تو بر پاے کرد ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ لیک براں تخت مرا جاے کرد
ملک بہ میراث نیابد کسے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ تا نزند تیغ و دو دستی بسے
از تو اگر نامِ پدر روشن است ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ خطبۂ جدہیں کہ بنام من است
ہر دو جوانیم من و بخت من ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ با دو جواں پنجہ بہم در مزن
گرچہ بروئیت نہ کشم دستِ تیز ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ از پے تعظیم تو شمشیر تیز
لیک تو دانی کہ چو کیں آورم ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ شیر فلک را بزمیں آورم
جز تو کسے گردم ازیں در زدسے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ سرزنش تیغ منش سر زدے
لیک توئی چوں بہ پے ایں سریر ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ من ندہم تو توانی بگیر

باپ نے جو جواب لکھا ہے دیکھو کس طرح حرف حرف پدرانہ محبت کے نشے سے چور ہے،

اے زنسب گشتہ سزاے سریر ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ وز پسر سے ہمچو پدر بے نظیر
گرچہ غبار است ز کار توام ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ سرمۂ چشم است غبار توام
تا تو ندانی کہ دریں گفتگوے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ از پے ملک است مرا گفتگوے

گرچہ توانم زتو ایں پایہ بُرد	از تو ستانم بکہ خواہم سپرد
شکر کہ شد زندہ در ایام تو	من زتو و نامِ من از نامِ تو
باش بکامم کہ بہ کامِ توام	زندہ و نازندہ بہ نامِ توام
خواہمت از جان کہ پناہے مرا	در تو بخواہی و نخواہی مرا
جز بہ تمنائے تو سودائے نیست	بہتر ازیں ہیچ تمنائم نیست
گرچہ کہ سلطان جہانم بہ ملک	تاج دہ و تخت ستانم بہ ملک
لیک چو دورم زتو اے نیک بخت	نے خوشم از تاج و نہ شادم ز تخت
بخت من ار پائے بر افلاک سود	با تو چو یک دم نہ نشینم چہ سود

ان خار اگداز الفاظ نے بیٹے کے دل پر بھی اثر کیا، اب اس کا لہجہ بدل جاتا ہے اور فرزندانہ جوش محبت میں کہتا ہے،

من کہ گلے رستۂ باغ توام	پرتوے از نور چراغ توام
گر ہمہ بر ماہ رسد افسرم	ہم بہ تہ پائے تو باشد سرم
زابر و خود کن تو اشارت بہ چین	من سر خاقان فگنم بر زمین
تاج ز من سر ز تو افراختن	عاج ز تو، تخت ز من ساختن
در بہ ملاقات رہے رائے تست	افسر من خدمت پائے تست
نیست مرا آں محل و آں شکوہ	کز سرِ خود سایہ فشانم بہ کوہ

باپ جب بیٹے سے ملنے آیا ہے تو بیٹا تخت شاہی پر متمکن تھا، باپ کو دیکھ کر بے اختیار تخت سے اُترا اور باپ کی طرف بڑھا باپ نے چھاتی سے لگا لیا، دیر تک دونوں جوش محبت میں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے، پھر بیٹے نے باپ کو لیجا کر تخت پر بٹھایا،

گرم فرو جست ز تخت بلند	کرد بہ آغوشش تن ارجمند
داشت بہ آغوش خودش تا بہ دیر	سیر نہ شد چوں شود از عمر سیر
با خودش از فرش بہ اورنگ برد	تخت کیان باز کیان را سپرد
گاہ ز دیدہ بہ نثارش گرفت	گاہ دو بارہ بہ کنارش گرفت

گاہ نظر بر رخ زیباش کرد | گاہ دل از مہر شکیباش کرد
پرسش از اندازہ زغایت گزشت | حدّ نوازش زعنایت گزشت

قران السعدین کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نظم اور لطائف نظم کی پابندی کے ساتھ تاریخی حیثیتیں تمام ملحوظ رکھی گئیں ہیں، اسطرح کہ کوئی نثر لکھتا تو اس سے بڑھکر ان باتوں کو نہ لکھتا

خمسہ | خمسہ میں پانچ مثنویاں ہیں یعنی مطلع الانوار، شیرین خسرو، لیلی مجنوں، آئینہ سکندری ہشت بہشت،

جس ترتیب سے ہم نے ان کتابوں کے نام لکھے ہیں یہی اُنکی تصنیف کی ترتیب ہے چنانچہ امیر نے خود ہشت بہشت میں تصریح کی ہے، ان پانچوں کتابوں کی تصنیف کا زمانہ کل سوا دو برس ہے اور یہ قادر الکلامی اور پرگوئی کا حیرت انگیز اعجاز ہے،

اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ نظامی کے جواب میں جسقدر خمسے لکھے گئے ان میں نسبتہً امیر کا خمسہ سب سے بہتر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں بعض نظامی کی تصنیف سے کچھ نسبت نہیں رکھتیں، مطلع الانوار میں صاف خامی نظر آتی ہے اور آئینہ اسکندری بالکل پھیکی اور کمزور ہے، معلوم ہوتا ہے کہ خود امیر کے دل میں بھی بے اطمینانی تھی آئینہ اسکندری میں لکھتے ہیں،

دگر باز گیری تو پیوند خویش | مرا خود عزیز است فرزند خویش
سزد گرچہ آواز خر خندہ را | بود ارغنوں گوش خر بندہ را
برو باد بخشایش دادگر | کہ برمن بہ بخشش گمارد نظر
ہنر جوی و در عیب جوئی مکوش | ترا نیز عیبے است برخود بپوش

نظامی کے پُر زور رزمیہ معرکوں کے مقابلہ میں انکی زور طبع کا یہ نمونہ ہے،

بہ گردوں شد از نالۂ زریں خروش | بہ دریائے لشکر درافتاد جوش
ہزاہز درآمد بہ ہر دو سپاہ | روا رو درآمد بہ خورشید و ماہ
علم سرز عیوق برتر کشید | سنان چشم سیارہ برسر کشید
بیاباں ہمہ بیشہ شیر گشت | جہانے پراز شیر و شمشیر گشت

غبار زمیں کلہ بر ماہ بست | نفس را درونِ گلو راہ بست
چناں گشت روئے ہوا گرد ناک | کہ سیارہ گم کرد خود را بہ خاک
سپاہ از زرہ موج زن تا بہ اوج | چو دریا کہ بادش در آرد بہ موج
بدریائے آہن جہاں گشتہ غرق | ہوا پر ز تیغ و زمیں پر ز برق
زبانگ ہیونان گیتی نورد | شدہ پر صدا گنبد لاجورد
عرق کردن توسناں در شتاب | ز دریائے آتش برانگیخت آب
شرارہ کہ ز نعل ہنگام رو | ستارہ بروں ریخت از ماہ نو
نفیر زہ از چاشنی کماں | شدہ چاشنی بخش جان ہر زماں
گرہ بر گرہ دشت پیکاں زناں | زرہ بر زرہ پشت رویں تناں
بزیر سپر تیغ رخشاں ز تاب | چناں کز تہ برگ نیلوفر آب

اس کمی کے مختلف اسباب ہیں، مثنوی امیر کا اصلی مذاق نہیں، سلاطین کی فرمایش سے وہ مثنویاں لکھتے تھے اور گویا بیگار ٹالتے تھے، چنانچہ خمسہ کا خمسہ دو سوا دو برس میں لکھا ہے اور مطلع الانوار تو صرف دو ہفتہ کی کمائی ہے،

ان کتابوں کی تصنیف کے زمانہ میں دربار کی خدمتوں سے بہت کم فرصت ملتی تھی، لیلیٰ مجنوں کے خاتمہ میں لکھتے ہیں کہ نظامی کو شاعری کے سوا کوئی شغل نہ تھا، اور کسی قسم کی بے اطمینانی نہ تھی، میرا یہ حال ہے کہ پاؤں کا پسینہ سر پر چڑھتا ہے تب روٹی ملتی ہے،

مسکین من مستمند بیہوش | از سوختگی چو دیگ در جوش
شب تا سحر و ز صبح تا شام | در گوشۂ غم نگیرم آرام
باشم ز برائے نفس خود را | پیش چو خودی ستادہ برپائے
تا خون نہ رود ز پائے تا سر | دستم نشود ز آب کس تر

اس خمسہ میں ایک کتاب البتہ خاص مذاق کی ہے یعنی لیلیٰ مجنوں اگرچہ اس کتاب میں بھی انھوں نے خاکساری سے نظامی کے سامنے اپنے آپ کو ہیچ کہا ہے،

می داد چو نظم نامہ را پیچ | باقی نہ گذاشت بہر ما ہیچ

لیکن انصاف یہ ہے کہ انکی لیلیٰ مجنوں اور نظامی کی لیلیٰ مجنوں میں اگرچہ کچھ فرق ہے تو اسقدر نازک ہے کہ خود وہی اسکو سمجھ سکتے ہیں،

اس کتاب میں ہر قسم کی شاعری کے موقع پیدا کئے ہیں، اوران کا کمال دکھلایا ہے مثلاً ایک موقع پر دھوپ کی شدت اور گرمی کا سماں دکھلاتے ہیں،

آتش زدہ گشتہ کوہ و کان ہم	تفسید زمین و آسمان ہم
جاے نہ کہ دیدہ را برد خواب	ابرے نہ کہ تشنہ را دہد آب
مرغان چمن خزیدہ در شاخ	دررفتہ چرندگان بہ سوراخ
ریگ از تف پختہ در گرانی	چوں تابہ روز میہمانی
از گرمی ریگہاے گردان	پُرآبلہ پاے رہ نوردان

عشق و محبت کے جذبات کے دکھلانے کا اس سے بڑھکر کونسا موقع ملسکتا تھا، اس لحاظ سے اس مثنوی کا ہر شعر گویا ایک پُردرد غزل ہے، سگ لیلیٰ کا واقعہ عموماً مشہور ہے اور شعرا نے اس دلچسپ روایت کو طرح طرح سے رنگا ہے امیر خسرو نے اس کو سب سے زیادہ موثر طریقہ سے ادا کیا ہے مجنوں کتے سے خطاب کرتا ہے،

ہستیم من و تو ہر دو شب گرد	لیکن تو بنالہ و من از درد
چوں باز گذر کنی دراں کوے	برخاک درش ز من نہی روے
ہر خس کہ بر و گذاشت گامے	از من برسانیش سلامے
ہر جا کہ نہاد پاے روشن	زنہار بہ بوسی از لب من
خواہد چو ترا درون دہلیز	یادش دہی از سگ دگر نیز
زنجیر خودت نہد چو بر دوش	از گردن من مکن فراموش

اس پیرایۂ ادا کو دیکھو کہتے ہیں کہ جب لیلیٰ تجھ کو ڈیوڑھی کے اندر بلائے تو ایک اور سگ کو یاد دلادینا، جب لیلیٰ تیری گردن میں طوق ڈالے تو دیکھنا میری گردن کو بھول نہ جانا،

عاشق کا پیغام وسلام سب لکھتے ہیں لیکن معشوق عاشق کو کیا لکھتا ہے اور کیونکر لکھتا ہے نہایت نازک مقام ہے دیکھو امیر خسرو اس نازک موقع کو کیونکر نباہتے ہیں لیلیٰ مجنوں کو

لکھتی ہے،

اے عاشق دور ماندہ چونے | وے شمع ز نور ماندہ چونے
روزت دانم کہ شب نشان است | شبہاے سیاہ برچہ سان است
از من بکہ مے بری حکایت | با خود زکہ می کنی شکایت
در گوش کہ؟ نالہ می رسانی | دریائے کہ قطرہ می فشانی
بازار تو در کدام سوے است | سیلاب تو در کدام جوے است

معشوق اسقدر ضرور جانتا ہے کہ عاشق رونے دھونے اور درد دل کہنے سے باز نہیں رہ سکتا، اب اسکی غیرت یہ سوالات پیدا کرتی ہے کہ کس کے سامنے روتا ہے؟ کس سے درد دل کہتا ہے کس کے آگے میرا نام لیتا ہے، یہ باتیں تو رازداری اور معشوق پرستی کے خلاف ہیں ان سچے جذبات اور خیالات کو کس خوبی سے ادا کیا ہے،

آئینہ سکندری پھیکی ہے لیکن اس کتاب میں بھی انکے مذاق کا جو میدان آیا ہے اس میں وہ نظامی کے دوش بدوش ہیں نظامی نے سکندر اور بت چینی کی بزم آرائی کا قصہ بڑی آب و تاب سے لکھا ہے خاص اس موقع پر خوب زور طبع دکھایا ہے، جہاں وہ دلربا سکندر کی ایک ایک بات پر اپنی ترجیح ثابت کرتی ہے۔

خسرو نے بھی یہ معرکہ باندھا ہے، اور اسی طرح بت چینی کا فخریہ لکھا ہے نظامی کے فخریہ سے ملاکر دیکھو، معشوق چینی کہتا ہے اور سکندر کے ایک ایک وصف کے مقابلہ میں اپنی ترجیح ثابت کرتا ہے،

مشعبد کہ داند جہاں سوختن | زمن بایدش بازی آموختن
ہمہ خون خوباں باسم می خورم | ولے نوش بادم کہ خوش می خورم
رخ ہر صنم ناپدید از من است | صنم خانہ ہا را کلید از من است
سپہر آفتاب زمیں خواندم | وگر ماہ بیسند، ہمیں خواندم
سکندر کہ گرد آب حیواں ہوس | نظیر منش بود مقصود وبس
گراو ہست کیخسرو جام جوے | مرا جام گیتی نماے است روے

گراز مجلس او سمن می دمد — مرا لالۂ و گل، ز تن می دمد
گر او راست بر تخت پائے نشست — مرا در دل اُو دست جائے نشست
گر او تاج خواہد ز شاہان خراج — من از سروران سرستانم نہ تاج
گر اقبال و دولت در آیا و رند — مرا ہر دو چوں کمترین چاکرند
گر او دشمناں را بہ خوں خوردن است — مرا خون صد دوست در گردن است
گر او در ایک آئینہ بر کف نشست — دو آئینہ دارم من از پشت دست
کمان وے ار صد شکار افگند — یک ابروے من صد ہزار افگند
کمند وے ار صید بندد بدام — من آنم کہ صیاد گیسرم بدام
گر او را کلاہے است بر آسمان — مرا صد کلاہ است بر آستان

ہشت بہشت | یہ سب سے اخیر مثنوی ہے اور امیر کی شاعری اس میں پختگی اور پرکاری کی آخیر حد تک پہنچ گئی ہے، خاص جو بات اس میں ہے وہ واقعہ نگاری کا کمال ہے، ساری کتاب میں فرضی حکایتیں لکھی ہیں، لیکن التزام کیا ہے جو واقعہ لکھا جائے، اسکے نہایت چھوٹے چھوٹے جزئیات جنکے ادا کرنے سے زبان قاصر ہوئی جاتی ہے ادا کئے جائیں، تمام کتاب کا یہی انداز ہے اور خصوصیت کے لحاظ سے فارسی زبان کی کوئی مثنوی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی،

مثلاً ایک قصہ لکھا ہے کہ حسن ایک سنار تھا، اسکو بادشاہ نے ایک جرم کی بنا پر یہ سزا دی کہ ایک اونچی لاٹ پر چڑھوا دیا حسن کی بیوی لاٹ کے پاس گئی حسن نے لاٹ پر سے کہا کہ بازار سے ریشم اور قند لا، جب وہ لائی تو کہا کہ ریشم کے تار کے سرے پر قند چپکا کر کسی چیونٹی کے منہ میں جو لاٹ پر چڑھ رہی ہو دیدے اور خود جلد جلد تار کی گولی کھولتی جائے، چیونٹی تار کو لئے ہوئے اوپر چڑھتی چلی گئی حسن کے قریب پہنچی تو حسن نے تار کو لیکر اس سے رسی بٹی اور پھر ایک خاص تدبیر سے اُسی کے سہارے نیچے اترا، تمام قصہ بہت لمبا ہے ابتدا کے چند شعر ہم نقل کرتے ہیں،

چوں نگہ کرد خواجہ از بالا — کز نشش در رسید با کالا

داد شسلم آواز گفت بر سر تار — پارهٔ قند کن بزودے بار
ده بہ مورے کہ می رود بر میل — تا بہ بالاش می رود تعجیل
رشتہ راز و دزد دمے کن باز — کز نشیب آورد بہ سوے فراز
ہمچناں کرد زن کہ او فرمود — داد رشتہ بہ مور و مور ربود
راند بالاے میل تار کشاں — رسن فتنہ بر حصار کشاں
چوں بہ نزدیک رخنہ رفت بزور — ریسماں را ربود خواجہ ز دور

قصیدہ میں ان کا کوئی خاص انداز نہیں ہے، کمال اسمٰعیل، خاقانی اور انوری کی تقلید کرتے ہیں اور جسکے جواب میں قصیدہ کہتے ہیں، اسکا تتبع کرتے ہیں، خاقانی کا مشہور قصیدہ ہے

مجلس دو آتش داد بر ایں از شجر واں از حجر — ایں کرد منقل را مقعر واں جام را جاد اشتہ

اسکے جواب میں بہت بڑا قصیدہ لکھا ہے، وہی انداز، وہی ترکیبیں، وہی استعارے ہیں اور چونکہ خاقانی کا مقابلہ ہے، اس لئے ۷۰ اشعر کہہ کر دم لیا ہے، اس میں بھی واقعہ نگاری کا خاص انداز قائم ہے، عید کا بیان کیا ہے، اور عید کا پورا سماں دکھایا ہے،

ہر سو جواناں نو سلب، ہر سو عروساں در قصب — طفلاں نہ خفتہ از طرب دیدہ بہ فردا داشتہ
از شیر و خرما مرد و زن، در شیر خواری تن بہ تن — چوں شیر خواراں در دہن پستان خرما داشتہ
خورشید چوں سر بر زدہ، ہر کس بہ راہے در شدہ — ایں رو بہ سوئے میکدہ او در مصلا داشتہ
فاسق کہ می ناخوردہ گہ، در عید گہ بیہودہ رہ — سر بر بساط سجدہ گہ، دل سوئے صہبا داشتہ
دارد سبو مشغول است می، بل جان مشغول است مے — خورشید مشغول است می در طاس مینا داشتہ

ان کے قصائد میں مدحیہ مضامین ہمیشہ بد مزہ اور پھیکے ہوتے ہیں جسکی وجہ یہ ہے کہ سچ دل سے انکو پسند نہیں، صرف معاش کی ضرورت سے یہ ذلت گوارا کرتے ہیں، اس لئے قصیدہ میں اور اور مضامین کہ لیتے ہیں اور ان میں زور طبع دکھاتے ہیں، مثلاً بہار کا سماں برسات کی رت صبح و شام کی کیفیت، ایک قصیدہ میں برسات کے آغاز سے تمہید شروع کی ہے اور صرف مطلع میں سب کچھ کہہ دیا ہے،

ابر بارید و ہمہ روے زمیں را تر کرد — خبر آرید کہ سبزہ چہ قدر سر بر کرد

سپیدہ دم کہ صبا گشت بوستان فرمود
بساط خاک ز دیباد پرنیان فرمود
چو روے نازک گل تاب آفتاب نداشت
زمانہ بر سرش از ابر، سایہ بان فرمود
زلال خواست چمن ساغر و سبک بخشید
ز ابر خواست زمین شربت و رواںؔ فرمود
ہر انچہ در ورق خویش، غنچہ مشکل داشت
بنفشہ گوش نہاد و صبا بیاں فرمود

صبح کا سماں،

سُپیدہ دم کہ تذکار روشنی بہ گیہاں داد
نسیمِ غالیہ در دامن گلستان داد
چو چرخ پیر بہ رخ زد سپیدی و سُرخی
بدستش آئینہ داد آفتاب و خنداں داد
درست مغربی آفتاب را کہ فلک
نہاد زیر زمیں بامداد تاباں داد
ستارہ راز چہ شد دیدہ خیرہ از خورشید
چو شب زُحقہ میناش سُرمہ چنداں داد
غلامِ باد صبا ام کہ بامداد و پگاہ
صلاے عیش بہ عشرت سرا ے مستاں داد

باغ، نو بہار ست و چمن جلوہ چو حورا کردہ
ابر ہار یختی لولو لالا کردہ
گرہ طرۂ سنبل کہ صبا باز شدہ
دامن لالہ پر از عنبر سارا کردہ
برگل و لالہ چناں میسرود آنگہ قمری
پاے آلودہ بہ خون پائچہ بالا کردہ
عاشقاں رفتہ بہ گلزار و دل سوختہ را
بہ تکلف زگل و لالہ شکیبا کردہ
نو بہار امسال یارا روزہ فرماید ہمے
گل چناں تر دامن از می لب نیالاید ہمے
بردہان غنچہ گر گہ ہمے سبز ند بوسہ نسیم
کاں شکر لب جز بہ بوسہ روزہ نگشاید ہمے
باد در کہسار جام لالہ را بر سنگ زد
گل بہ خندہ گفت آرے ایں چنیں باید ہمے
نرگس رعنا قدح بر دست و چشم اندر ہوا
گوئیا میخوارہ ماہِ عید را باید ہمے

گویا شراب خوار ماہ عید کو ڈھونڈھتا ہے،

برسات

ہواے خرم است و ہر طرف باران ہمی بارد
نگویم قطرہ کز بالا گل ریحاں ہمی بارد
نگوں سر شاخہائے سبز گوئی در ہمی چیند
زبس کا بر دُر افشاں لولوی غلطاں ہمی بارد
یعنی شاخیں جو جھکی ہوئی ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادل نے جو زمین پر موتی برسائے

ملے رواں فرمودن، فوراً حاضر کرنا،

ہیں یہ ان کے رولنے کو جھکی ہیں،

چکاں قطرہ زسرہائے انارِ تر تو پنداری ‫ ‫ کہ ہر دانہ کہ بودہ است اندر وپنہاں ہمی بارد
خوش آں وقتے کہ مطرب در سماع نیکوان سرخوش ‫ ‫ خراماں در میان سبزہ و بالان ہمی بارد

بعض قصائد سرتاپا موعظت و اخلاق ہیں۔ ان میں بحر الابرار جو بڑا مشہور حاصل قصیدہ ہے مشہور ہے، التزام کیا ہے کہ ہر شعر میں دعوے اور اسکے ساتھ دلیل ہو،

کوس سہ نمائی بانگ غلغلش دردِ سر است ‫ ‫ ہر کہ قانع شد بہ خشک و تر شہ بحر و بر است
عاشقے رنج است مردان را بسینہ راحت است ‫ ‫ سلسلہ بند است شیراں را بہ گردن زیور است

یعنی عاشقی میں گو تکلیف ہے لیکن مردوں کو وہی آرام دہ ہے، جس طرح شیر زنجیر میں بندھا ہوتا ہے اور یہی زنجیر اسکا زیور ہے،

مرد پنہاں در گلیمے بادشاہے عالم است ‫ ‫ تیغ خفتہ در نیامے پاسبان کشور است
راہرو چوں در ریا کوشد مرید شہوت است ‫ ‫ بیوہ زن چوں رخ بیارایہ بہ بند شوہر است
نفس خاکی نیست ہر گہ نور بالا بر تو تافت ‫ ‫ سایہ زیر پا شود ہر گہ کہ بر ناک خور است
کار ایں جا کن کہ تشویش است در محشر بسے ‫ ‫ آب زیں جا بر کہ در دریا بسے شور و شر است
ناکس و کس ہر کہ حرص بالا دارد دوزخی است ‫ ‫ عود سرگیں ہر چہ در آتش فتد خاکستر است
اے برادر مادرِ دہر ار خورد خونت مرنج ‫ ‫ چوں ترا خون برادر بہ ز شیر مادر است
دہر خاکے را نمونہ می کند کیں مردم است ‫ ‫ بحر آبے را غلولہ می کند کیں گوہر است

اہل سخن کے نزدیک قصیدہ میں شاعر کی جدت طبع کا اندازہ مخلص یعنی گریز سے ہوتا ہے اس معیار کے لحاظ سے امیر خسرو اپنے تمام ہمعصروں سے ممتاز نظر آتے ہیں انکے مخالص کی چند مثالیں ذیل میں ہیں،

برسات کے ذکر کے بعد،

برآمد ابر در بخشش و گرزاں پایہ در غلطد ‫ ‫ نگیرد ہیچ کس دستش مگر شاہ جہانگیرد

بہار کی تمہید کے بعد

گل ار کم عمر شد گو باش داني ‫ ‫ کہ در خور کیست عمر جاوداں را

نہال باغ شاہی رکن حق آنکہ ... ز بزم او ست رونق بوستاں را

کشادہ چہرہ کہ یا ہے شدم بروئے زمین ... در ملک بنمودم کہ آسمان این است

طلوع صبح کا بیان کرکے،

صبح را گفتم کہ خورشیدت کجاست ... آسمان روئے ملک پیچجو نمود

ندارد روئے آں نازکے گریابیچ آیسبہ ... مگر در سایۂ رایات شاہ کامگار آمد

طلوع آفتاب کے بیان کے بعد۔

خورشید جہانگیر مپندار کہ در بزم ... شمشیر کشیدہ ملک المشرق برآمد

قصائد میں امیر نے جس قدر جدید مضامین لطیف استعارات نئی نئی تشبیہیں گوناگوں اسلوب پیدا کئے اسکا احاطہ نہیں ہوسکتا ہم اس موقع پر صرف بہاریہ تمہید کے چند شعر اس لحاظ سے نقل کرتے ہیں کہ بہار شعرا کا پامال میدان ہے لیکن امیر اس میں بھی سب سے الگ ہیں،

بوستاں بشگفت روئے لالہ خنداں گشت باز ... بر رخ گل طرۂ سنبل پریشاں گشت باز

سبزہ خطے چند بہر خواندن بلبل نوشت ... بلبل آنکہ از خط خوباں غزل خواں گشت باز

خون لالہ گوئیا خواہد چکید از تیغ کوہ ... یا چکید آں خوں کہ کوہ آلودہ داماں گشت باز

غزل، اوپر پڑھ آئے ہو کہ غزل قدماء کے زمانہ تک کوئی مستقل چیز نہ تھی سعدی نے غزل کو غزل بنادیا، امیر خسرو کی غزل گوئی پر تقریظ کرنی ہو تو صرف یہ کہنا کافی ہے کہ وہی خمخانۂ سعدی کی شراب ہے جو دوبارہ کھنچکر تیز ہوگئی ہے،

غزل کی جان کیا ہے؟ درد، سوز و گداز، جذبات، معاملات عشق، عجز و نیاز اسکے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ یہ جذبات اور معاملات جس زبان میں ادا کئے جائیں وہی زبان ہو جس میں عاشق معشوق سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے یعنی سادہ ہو، بے تکلف ہو، نرم ہو، لطیف ہو، نیاز آمیز ہو، اسکے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ چھوٹی چھوٹی بحریں ہوں جملوں کی ترکیبوں میں نام کو بھی الجھاؤ نہ ہو، قریب الفہم خیالات ہوں اس حد تک امیر خسرو شیخ سعدی کے دوش بدوش ہیں لیکن وہ اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں انھوں نے

غزل کی اصلیت کے علاوہ کمال شاعری کی بہت سی چیزیں اضافہ کیں، اور ایجادات و اختراعات کے چمن کھلا دئے، یہ سب اجمال تھا، تفصیل ذیل میں ہے،

بحروں کی موزونی وہ اکثر شگفتہ اور چھوٹی چھوٹی بحریں اختیار کرتے ہیں جن میں خواہ مخواہ بات کو صفائی، سادگی، اور اختصار سے ادا کرنا پڑتا ہے، مثلاً،

سرے دارم کہ سامان نیست اورا   بہ دل دردے، کہ درمان نیست اورا
فراموش کرد عمرم روز راز انکہ   شبے دارم کہ پایاں نیست اورا
بہ راہ انتظارم ہست چشمے   کہ خوابے ہم پریشان نیست اورا

یار من دل ز دوستاں برداشت   مہر دیرینہ از میان برداشت
در دل او نہ کرد کار ارچہ   سنگ از نالہ ام فغاں برداشت
دی بہ تندی بلند کرد ابرو   از پئے کشتنم کمان برداشت

آں دوست کہ بود برگران شد   واں صبر کہ داشتم نہاں شد
گفتم کہ اسیر گردی اے دل   دیدی کہ بہ عاقبت ہماں شد
دل بر دگرے نہم ولیکن   عاشق بہ ستم بہ جبر نمی تواں شد

عاشقے را چو نامہ باز کنید   نام من بر سرش طراز کنید
گر شما دین عاشقاں دارید   بعد ازیں پیش بت نماز کنید
گاہ مردن، شنیدہ ام محمود   گفت رویم سوے ایاز کنید

داد من آں بت طراز نہ داد   پاسخے نیز دل نواز نہ داد
خواب ما را بہ بست و باز نہ کرد   دل ما را بہ برد و باز نہ داد
تو چہ دانی نیاز مندی چیست   چوں خدایت بہ کس نیاز نہ داد

سوز و گداز سوز و گداز کے خیالات جب وہ ادا کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آگ سے دھواں اٹھ رہا ہے، اس میں کبھی معشوق سے اپنا حال کہتے ہیں، کبھی اپنی تصویر کھینچتے ہیں کبھی خود اپنے آپ پر ان کو رحم آتا ہے،

ماجرا اے دوست پرسیدی کہ چوں بگذشت حال   اے سرت گردم چہ می پرسی بدشواری گذشت

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عاشق معشوق سے اپنی سرگذشت جب بیان کرتا ہے تو تھوڑا سا کہہ کر اسکو رونا آتا ہے، ٹھہر جاتا ہے، رو لیتا ہے، پھر آگے بڑھتا ہے، اسکی تصویر کھینچتے ہیں

خسرو است و شب افسانہ و یار و ہر بار   قدرے گرید و پس بر سر افسانہ رود

زانوش خسرو بزیر سر نیافت   سر نہادہ بر سر زانو بخفت

اے آشنا کہ گریہ کناں پند میدہی   آب از برون مریز کہ آتش بجاں گرفت

کبھی کبھی عاشق کا دل کہتا ہے کہ صبر سے کام لینا چاہیئے، پھر دل پر غصہ آتا ہے اور کہتا ہے کہ کمبخت جو بات ہو نہیں سکتی اسکے کہنے سے کیا فائدہ، اس مطلب کو یوں باندھتے ہیں،

غصہ ام می کشد، اے دل سخن صبر مگوے   وہ چرا گوئی ازاں کار کہ نتوانی کرد

حسد می بردی اے دشمن! بہ عقل و دانش خسرو   بیا تا بر مراد خاطر خود بینی اکنونش

رنج اور غم کی اس سے بڑھ کر عبرت انگیز تصویر نہیں کھینچی جا سکتی، عاشق (جسکا فضل و کمال اور عقل اور سمجھ عموماً مسلم ہے) عاشق ہو کر تمام اوصاف کو کھو چکا ہے، وہ اپنی حالت پر نظر ڈالتا ہے تو خیال آتا ہے کہ دشمنوں کی امید برآئی، اسکو کس مؤثر طریقہ سے ادا کیا ہے،

جاں زتن بردی و در جانی ہنوز   دردہا دادی و درمانی ہنوز

گفتی اندر خواب گہ گہ روے خود بنمایمت   ایں سخن بیگانہ را گو، کآشنا را خواب نیست

غمزۂ تو بر دل سلطان زند   ورنہ رنجی بر دل درویش ہم

یعنی تیرا غمزہ بادشاہوں کے دل پر حملہ کرتا ہے، اور اگر برا نہ مان تو فقیروں پر بھی، "ورنہ رنجی" سے کس قدر عاشقانہ خضوع ظاہر ہوتا ہے،

کشتم از تیغ جفایش خویش را   بر تو آساں کردم و بر خویش ہم

من کجا خسپم کہ از فریاد من   شب نمی خسپد کسے در کوے تو

صبر طلب می کنند از دل عاشق   ہمچو خراجے کہ بر خراب نویسند

یعنی معشوق عاشق کے دل سے صبر چاہتے ہیں، یہ ایسی بات ہے کہ بنجر زمین پر محصول لگایا جائے،

اے دیدہ چہ ریزی از بردن آب — کیں شعلہ بہ جان گرفت مارا
اے خواب! بروکہ باز امشب — سودائے فلاں گرفت مارا

اے عشق کار تو بہ چو من ناکسے فتاد — گویا کسے نماند جہاں خراب را
دل ندارم غم جاناں بچہ بتوانم خورد — پیش ازیں گرچہ غمے بود ولے ہم بودہ است
کس چہ داند کہ چہ رفت از غم تو دوش بمن — از شب تیرہ، خبر پرس کہ محرم بودہ است
بیا بر دوستاں جاناں قضا کن — ہر آں تیرے کہ بر دشمن خطا شد

دل باز سوئے آں بت بدخو چہ میرود — آں خو گرفتہ باز دراں کوچہ میرود
جان میرود ز تن چو گرہ میزند بہ زلف — مردن مراست از گرہ او چہ میرود

گر بہ بینی دل ویران مرا — گوئیا ہیچ گہ آباد نبود
کافرے رخت دلم غارت کرد — شہر اسلام دمرا داد نہ بود

کرشمہ چند کنی برمن آخر ایں جان است — نمی دمد ز زمین و صبا نمی آرد
(میرا انصاف نہ کیا گیا)

اس مضمون پر تین سو برس کے بعد اہلی نے یوں دست درازی کی،

کرشمہ چند کنی با من آخر ایں جان است — نمی دمد ز زمین ز آسماں نمی بارد
بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم — پس ازانکہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

جدت اسلوب | غزل کی ترقی کا نور دز لطف ادا اور جدت اسلوب ہے جسکے موجد شیخ سعدی ہیں لیکن پھر وہ نقش اولیں تھا، امیر کی بوقلموں طبیعت نے جدت اسلوب کے سیکڑوں نئے نئے پیرایے پیدا کر دئے، جو اگلوں کے خواب و خیال ہیں بھی نہ آئے تھے مثلاً یہ مضمون کہ معشوق ظلم وستم کرنے کے ساتھ بھی محبوب ہے یوں ادا کرتے ہیں،

جان ز تن بردی و در جانی ہنوز — دردہا دادی و درمانے ہنوز

مثلاً معشوق کی گراں قدری کو اس پیرایے میں ادا کرتے ہیں،

ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ — نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

معشوق کی آنکھ کو سب مخمور اور مے آلود باندھتے تھے، اسی مضمون کو دیکھو امیر نے کس انداز سے کہا ہے،

مے حاجت نیست مستیم را | درچشم تو تا خمار باشد

معشوق کا عاشقوں کے رنج وغم سے بے خبر ہونا، عام مضمون ہے اسکو کس لطف سے ادا کیا ہے،

گل چہ داند کہ درد بلبل چیست | او ہمیں کار رنگ و بو داند

معشوق معشوقانہ اداؤں کو چھوڑنا چاہتا ہے، اسکو یوں باز رکھتے ہیں،

ہنوز ایمان و دل بسیار غارت کردنی دارد | مسلمانی میاموز آں دو چشم مسلماناں را

رخصت کے وقت معشوق کو ٹھہراتے ہیں کہ میرے آنسو تھم جائیں تو جانا،

می روی دگریہ مے آید مرا | ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

لطف اور قہر کی نگاہ کی تاثیر کا فرق،

گفتم چگونہ می کشی و زندہ می کنی | از یک نگاہ کشت و نگاہ دگر نہ کرد

سعدی کا شعر ہے۔

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم | باید اول بہ تو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

یہ مضمون اگرچہ نیچرل ہونیکی حیثیت سے اسقدر اعلیٰ درجہ کا تھا کہ اس پر ترقی نہیں ہوسکتی تھی لیکن امیر نے ایک اور جدید اسلوب پیدا کیا،

جراحت جگر خستگاں چہ می پرسی | ز غمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

غالب نے اسی خیال کو اور زیادہ بدیع اور شوخ کردیا ہے،

نظر کہیں نہ لگے اُن کے دست و بازو کو | یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

معشوق کی آمد کی دلفریبی کو اس طریقہ سے ادا کرتے ہیں،

بتے وآفت تقویٰ و آخر ایں نمیدانی | کہ در شہر مسلماناں نباید ایں چنیں آمد

اس مضمون کے ادا کرنے کا معمولی پیرایہ یہ تھا کہ معشوق کے آنے سے لوگوں کے زہد و تقویٰ میں فرق آتا ہے، بجائے اسکے خود معشوق سے خطاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے شہر میں یوں نہیں آیا کرتے، گویا معشوق کا فتنہ انگیز ہونا اسقدر حد سے بڑھ گیا ہے کہ اپنی حالت کا خیال نہیں، بلکہ یہ فکر ہے کہ اسلام کی حالت خراب نہ ہو جائے،

معشوق کی زیادتی لطف کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں،

جان زنظارہ خراب ناز او ز اندازہ بیش　　ما بہ بوے مست و ساقی پر دہد پیمانہ را

وحشی یزدی نے اسی خیال سے ایک اور لطیف خیال پیدا کیا،

شراب لطف پر در جام میریزی دمی ترسم　　کہ زود آخر شود این بادہ و من در خمار افتم

اکثر جگہ صرف لفظوں کی الٹ پلٹ سے عجیب لطیف بات پیدا کر دیتے ہیں،

چشم بد دور از چناں روئے　　کہ از و چشم دور نتواں کرد

مردماں در من و بیہوشی من حیرانند　　من در آں کس کہ ترا بیند و حیراں نشود

گفتیم ناخوشس چرائی خسرو!　　چوں کنم؟ آن قد و آں بالا خوش است

گفتم کہ ہمیں ترا غلامم　　گر ہست گناہ من ہمین است

دہنت ذرہ کم از ذرہ است　　رخ ز خورشید ذرہ کم نیست

ایہام یعنی ذو معنیین الفاظ سے عجیب عجیب نکتے پیدا کرتے ہیں،

زبان شوخ من ترکی و من ترکی نمیدانم　　چہ خوش بودی اگر بودی زبانش در دہان من

پیش ازیں بر خودم یقینے بود　　کہ دلم ہیچ دلستاں نبرد

تو بہ بردی ہمہ یقین مرا　　بہ طریقے کہ کس گماں نبرد

دی رو سے تو دیدم و نہ مردم　　شرمندہ بماندہ ام ز رویت

دیگر سر آں نیست کہ من زہد فروشم　　ساقی قدحے بادہ کہ بر روے تو نوشم

اکثر جگہ جملۂ معترضہ یا شرطیہ جملے سے عجیب عجیب لطیفے پیدا کرتے ہیں اور یہ اوکا خاص مذاق ہے

برو اے باد! بوسے زن برآں پائے　　دگر چیزے نگوید بر دہاں ہم

غمزۂ تو بر صف سلطاں زند　　ورنہ رنجی بر دل درویش ہم

رشکم آید کہ برم پیش تو نام دگراں　　دگر انصاف بود پیش تو ہم نتواں گفت

کشتم از تیغ جفایت خویش را　　بر تو آساں کردم و بر خویش ہم

غمے دارم کہ باد از دوستاں دور　　بحق دوستی کز دشمناں ہم

واقعہ گوئی اور معاملہ بندی | مولوی غلام علی آزاد خزانہ عامرہ میں لکھتے ہیں[1]،

مخفی نماند کہ ہنگامہ آرائے سخن طرازی شیخ سعدی شیرازی کہ مروج طرز غزل است خال خال وقوع گوئی ہم دارد مثل ایں بیت،

دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست — تا ندانند رقیباں کہ تو منظور منی

امّا ناسخ نقوش بانوی امیر خسرو دہلوی کہ معاصر شیخ سعدی است بانی وقوع گوئی گردید و اساس آں را بلند ساخت"

عشق و ہوس بازی میں جو حالات پیش آتے ہیں انکے ادا کرنے کو وقوع گوئی کہتے ہیں اہل لکھنؤ نے اس کا نام معاملہ بندی رکھا ہے، بہر حال اس طرز کے موجد جیسا کہ آزاد نے لکھا ہے امیر خسرو ہیں،

شرف قزوینی، ولی دشت بیاضی، اور وحشی یزدی نے اسکو ترقی کی حد تک پہنچا دیا، آزاد نے وقوع گوئی کی مثال میں امیر خسرو کے یہ اشعار پیش کئے ہیں،

خوش آں زماں کہ بروئیش نظر نہفتہ کنم — چو سوے من نگرداد، نظر بگردانم

غلام آں نفسم کا مدم چو خانۂ او — بہ خشم گفت کہ از درکشید بیرونش

چو رفتم بر درش بسیار دربان گفت ایں مسکین — گرفتار است شاید کیں طرف بسیار می آید

امیر خسرو کے کلام کی زیادہ تفحص سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہر قسم کے نازک لطیف اور شوخی آمیز معاملات ادا کئے ہیں،

چند گویند کہ گہ گہ بہ دلش می گذری — ایں حدیثے است کہ بہر دل ما نیز کنند

یعنی لوگ کہتے ہیں کہ خسرو، تم کو وہ کبھی کبھی یاد کرتا ہے، لیکن یہ بات تو لوگ تسلی دینے کے لئے بھی کہہ دیا کرتے ہیں اس لئے اعتبار کیونکر آئے،

جاناں! اگر شبیت دہن بر دہن نہم — خود را بخواب ساز و مگوئیں و ہاں کیست

معشوق سے کہتے ہیں کہ اگر میں کبھی رات کو تیرے منہ پر منہ رکھدوں تو اپنے آپ کو سوتا بنا لینا، یہ نہ کہنا کہ ارے یہ کس کا منہ ہے،

دل من مست بود و غصۂ دوست — گہے ز انجام و گہ ز آغاز می گفت

اندک اندک گہ گہے با یار بودن خوش بود — در میسر گر دوم بسیار بودن ہم خوش است

تو شبینہ می نمائی بہ برکہ بودی؟ امشب | کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد
مست آں دو قم کہ شب در کوے خویشم دید و گفت | کیست ایں؟ گفتند مسکینے گدائی میکند
جاں باد فدات آندم کز بعد دو سہ بوسہ | گویم کہ یکے دیگر، گوئی تو کہ نتوانم
وعدہ می خواہم و در بند وفا نیز نیم | غرض آنست کہ بارے بہ تقاضا باشم

روزمرہ اور عام بول چال، عموماً شعرا اور اہل فن اپنے کلام کا رتبہ عام بول چال سے برتر سمجھتے ہیں اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک جدا گانہ زبان پیدا ہو گئی ہے جسکا نام علمی زبان ہے، سعدی و نظامی وغیرہ کی بولنے کی زبان اگر قلمبند کی جاتی تو بوستان اور سکندر نامہ کی زبان سے صاف الگ نظر آتی، بلکہ آج اگر اس عہد کی بول چال کی کوئی کتاب ہاتھ آجائے تو ہمکو سمجھنے میں دقت ہوگی لیکن یہ شاعری کا بہت بڑا نقص ہے، بے شبہ شاعری اور عام تصنیف میں ایسے بہت سے مضامین اور خیالات ادا کرنے پڑتے ہیں جو عام زبان میں ادا نہیں ہو سکتے ہیں اسلئے انکے لئے علمی الفاظ وضع کرنیکی ضرورت پیش آتی ہے، لیکن یہ ضرور نہیں کہ ضرورت کے علاوہ اور اور موقعوں پر بھی یہی مصنوعی زبان استعمال کیجائے خصوصاً غزل کی زبان، روزمرہ اور عام بول چال ہونی چاہیئے، کیونکہ عاشق و معشوق علمی زبان میں باتیں نہیں کرتے،

قدما میں فرخی اور متوسطین میں سعدی اور امیر خسرو نے خاص اسکا خیال رکھا کہ روزمرہ اور عام بول چال کو زیادہ وسعت دی جائے، سعدی اور خسرو کے کلام میں جو روانی، شستگی اور صفائی پائی جاتی ہے اسکا ایک بڑا اگر یہی ہے،

امیر خسرو کی غزلیں اکثر اس زبان میں ہوتی ہیں کہ گویا دو آدمی آپس میں بیٹھ کر بالکل بے تکلف سیدھی سادی باتیں کر رہے ہیں، اس میں کہیں کہیں خاص خاص محاورے بھی آجاتے ہیں جو آج ہمکو اس لئے کسی قدر نامانوس معلوم ہوتے ہیں کہ ہمکو اس زمانہ کے روزمرہ کے محاورات سے واقفیت نہیں،

دل بسے بردہ، نکو بشناس | آنکہ مجروح تر ازاں من است

یعنی تم نے بہت سے دل لئے ہیں، خوب غور کر کے دیکھو جو بہت زخمی ہو، وہی میرا دل ہے،

صبح روے تو بدنیساں کہ بر آمد امروز — نیست امکان کہ چو من سوختہ تا شام کشد[1]

لب و دہان و رخت ہر یکے بلائے دل اند — یکے دلم چہ کند، جانب کدام شود

یعنی تیرا لب، دہن، اور چہرہ، سب بلا ہیں، میرا دل کیا کرے، کدھر کدھر جائے،

گفتم اے دل مرو آنجا کہ گرفتار شوی — عاقبت رفت ہماں گفتہ من پیش آمد[2]

خلقے براہ منتظر جاں سپردن اند — اے ترک نیم مست عناں را کشیدہ تر

ذرا باگ کو روکے ہوئے۔

بوسۂ گفت و زبان گردانید — خود ہمے گوید و ہمے گرداند

بوسہ دینے کو کہا اور پلٹ گیا، آپ ہی کہتا ہے اور آپ ہی پلٹ جاتا ہے،

بوئے خوشم آید از تو در جیب — گل داری، یا ہمین است بویت

تیرے بدن سے خوشبو آرہی ہے، تیری جیب میں پھول ہے یا یہ تیری بو ہے

خشکسالے ست دریں عہد وفا رالے اشک — زاں حوالے کہ تو می آئی باران چون است

جدھر سے تم آتے ہو اُدھر بارش کیسی ہے؟

اے گل دہن تنگ صد تنگ شکر چیزے — گل با تو نمی ماند در حسن مگر چیزے ذرا سا

گویم غم و دردم بیں گوئی کہ تبر خواہم — بسم اللہ اگر خواہی زیں ہر دو تبر چیزے

چو سبزہ خویش را خط تو خواند جائے آں باشد — کہ گل از خندہ بر خاک افتد غنچہ شکم گیرد

یعنی سبزہ جب تیرے خط کی برابری کرے تو یہ زیبا ہے کہ پھول ہنستے ہنستے زمین پر لوٹ جائے اور غنچہ کے پیٹ میں بل پڑ جائیں،

دلم میخواستی برہم عفاک اللہ چناں دیدی — مرا می خواستی رسوا الحمد اللہ کہ آں ہم شد

اے صبا دی کہ فلانے بہ چمن مے میخورد — ہیچ یاد من گم گشتۂ زندانے کرد

از کجا آمدی اے باد کہ دیوانہ شدم — بوئے گل نیست کہ می آیدم ایں بوے کسے است

دل من دور نہ رفتہ است نگو میدانم — باز جوئید ہمیں جائے کہ در کوے کسے است

۱؎ تا شام کشد یعنی شام تک زندہ رہجائے، ۲؎ یعنی وہی میرا کہا سامنے آیا،

مشتبہ می شودم قبلہ ز رویت چہ کنم — کز ابروے تو چشمم بدو محراب افتاد

تیرا چہرہ دیکھ کر مجھ کو قبلہ میں دھوکا سا ہوتا ہے، کیونکہ مجھ کو تیرے ابرو سے دو محرابیں نظر آتی ہیں،

رخ جملہ رانمود و مرا گفت تو مبیں — زیں ذوق مست و بیخبرم کاں سخن چہ بود

سب کو منہ دکھایا اور مجھ سے کہا کہ تو نہ دیکھ — میں اس مزہ میں مدہوش ہوں کہ یہ کیا بات کہدی

ساکناں سر کوے تو نباشند بہ ہوش — کاں زمینے است کہ آنجا ہمہ مجنوں خیزد

ز چشمت کاروانِ صبر من تاراج کافر شد — مسلمانان کسے دید است کاندر شہر راہ افتد

مسلمانو کسی نے شہر میں بھی ڈاکہ پڑتے دیکھا ہے،

بہ بازی سوے من آمد بہ شوخی دل ز من بستد — بدو گفتم چہ خواہی کرد گفتا کار می آید

عام محاورہ بکار می آید ہے کار می آید امیر خسرو کے سوا اور کسی کے کلام میں نظر سے نہیں گزرا

حُسن تو عالمے بخواہد سوخت — ہم در آغاز می تواں دانست

نرخ کردی بہ بوسۂ جانی — بندہ بخرید رائگاں دانست

تو نے ایک بوسہ کی قیمت جان قرار دی۔ میں نے خریدا اور یہ سمجھا کہ مفت لیا،

از بہر آں کہ لاف جمال تو میزند — صد بار لالہ بر دہن یاسمیں زدہ است

ما جان فداے خنجر تسلیم کردہ ایم — خواہی بہ بخش خواہ بکش راے راے تست

ساقی بیار مے کہ چناں سوخت دل ز عشق — کز سوز ایں کباب ہمہ خانہ بو گرفت

راست کردی ز ابرواں محراب — می نماید نماز خواہی کرد

ابروؤں سے تو نے محراب درست کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے کا ارادہ ہے۔

من آں ترک طناز را می شناسم — من آں مایۂ ناز را می شناسم

شبم تازہ شد جان بہ دشنام مستی — تو بودی من آواز را می شناسم

باد صبا چو از رخ او زلف در ربود — ابر سیہ کشادہ شد و آفتاب کرد[1]

تو حال من ہم ازیں روے زرد بیروں بر — کہ من بر روے تو پیدا نمی توانم کرد

(دھوپ نکل آئی)

سالہا شد کہ نیایم خبرو در کویت — دل ویران شدہ را آیم و آواز کنم

[1] پیدا کردن، ظاہر کرنا۔

من از سر زندہ گردم، گر تو یارا یک سخن گوئی — تو سیدانم نگوئی لیک من گفتار میگویم

مجھ کو معلوم ہے کہ تم نہ کہوگے لیکن میں بات کہتا ہوں

دعوی خون بہائے دل خویش می کنم — یک بوسہ بر لبم زن و مالا کلام کن

امیر نے ایسے بھی بہت سے محاورے باندھے ہیں جو اُنکے سوا کسی اور اہل زبان کے کلام میں نہیں ملتے، مثلاً

از گرہ او چہ میرود،

آواز کردن، پکارنا،

گفتار میگویم یوں ہی ایک بات کہتا ہوں،

مالا کلام کردن، کسی کو ساکت اور بند کرنا،

اس بات نے بدگمانوں کو موقع دیا ہے کہ یہ ہندوستان کی سکونت کا اثر ہے کہ ہندی محاورے اُنکی زبان سے نکلجاتے ہیں، ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن چونکہ ہمکو اپنے تتبع اور استقراء پر اعتماد نہیں اس لئے ہم اس بدگمانی میں شریک نہیں ہو سکتے،

تسلسل مضامین

غزل کا یہ بڑا عیب تھا کہ کسی مسلسل خیال کو ادا نہیں کرتے تھے، قصائد کا موضوع مدح ہے، مثنویاں قصے یا اخلاق کے لئے مخصوص ہیں، قطعات میں بھی اور اور باتیں ہوتی ہیں، عشق اور محبت کے معاملات میں تفصیلی حالات بیان کرنے ہوں تو کیونکر کریں، اسکے لئے صرف مسلسل غزل کام دے سکتی ہے لیکن قدماء بلکہ متاخرین میں بھی اس کا بہت کم رواج ہوا، امیر خسرو نے البتہ اکثر مسلسل غزلیں لکھی ہیں اور خاص خاص کیفیتوں کا نقشہ اس خوبی سے کھینچا ہے کہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی،

مثلاً عاشق، قاصد یا اپنے رازدار سے معشوق کا حال پوچھتا ہے کہ کہاں ہے؟ اور کن لوگوں کے ساتھ ہے؟ کیا کرتا ہے؟ میرا بھی کچھ ذکر کرتا ہے کہ نہیں وغیرہ وغیرہ، دیکھو کس اشتیاق، کس حسرت کس انداز سے یہ باتیں پوچھتے ہیں،

اے صبا باز بہ من گو کہ جاناں چون است؟ — آن گل تازہ و آن غنچۂ خنداں چوں است؟

بادہ سے می خورد آں ظالم و درمی خوردن — آں رخ پر خوے آں زلف پریشاں چون است؟

چشم بدخوش کہ ہشیار نہ باشد مست است | چشم بیگوش کہ دیوانہ کند آں چون است؟
روی و زلف بت عیارا آں ہر دو خوش اند | دل دیوانۂ من پہلوئے ایشاں چون است؟
روزہا شد کہ دلم رفت و دراں زلف بماند | یارب آں یوسف گم گشتہ بزنداں چون است؟

پوچھتے پوچھتے دفعۃً خیال آتا ہے کہ معشوق کے ذکر میں اپنا تذکرہ خلاف عاشقی ہے۔ اس لئے ان سب باتوں کو چھوڑ کر کس محویت سے کہتا ہے،

ہم بہ جان و سر جاناں کہ کم و بیش مگو | گو ہمیں یک سخن راست کہ جاناں چون است؟

یعنی معشوق کی جان کی قسم اِدھر اُدھر کی باتیں نہ کہہ صرف یہ بتا کہ معشوق کس حالت میں ہے؟

معشوق نے روزہ رکھا ہے، اس پر عاشق کے دل میں جو جو خیالات پیدا ہو سکتے ہیں اُن کو دیکھو کس طرح ادا کیا ہے؟

ماہ من روزہ میان شکرستان دارد | اے خوش آں روزہ کہ جا در لب جاناں دارد
لب آلودہ دہان پر شکر نرگس مست | اے مسلماناں! کس روزہ بدینساں دارد
خضر گر بر لبش آید شکند روزۂ خویش | کاں لب سر زدہ نہ لب چشمۂ حیواں دارد
خون من می خورد آخر زنش پنہاں نیست | من گرفتم کہ نخو د او روزہ پنہاں دارد
جان من گر تو قدم رنجہ کنی، بندہ تو | قدرے آب دو چشم و دل بریاں دارد

معشوق سر و سامان کے ساتھ سوار آرہا ہے، عاشق پر حیرت طاری ہوتی ہے کہ کیا آسمان سے چاند اتر آیا ہے؟ یہ خوشبو کیسی پھیل رہی ہے؟ کیا ہوا پھولوں میں بس کر آرہی ہے؟ پھر خیال آتا ہے کہ نہیں معشوق آتا ہے لیکن ان دلفریبیوں کے ہوتے کس کا ایمان سلامت رہیگا، اسلامی آبادی میں یوں نہیں آنا چاہیئے ان خیالات کو مسلسل ادا کرتے ہیں،

کہ می آید؟ چنیں یارب مگر مہ بر زمین آمد | چہ گرد است اینکہ می خیزد کہ با جان ہمنشیں آمد
کہ می راند چنیں ست را کہ میدان عنبر آگیں شد | کہ ایں بادے جہند کہ بوئے یاسمیں آمد
بتے دانت تقوی و آخر ایں سواری نمیدانی | کہ در شہر مسلماناں نباید ایں چنیں آمد

بہار آئی ہے عاشق باغ میں جاتا ہے، مجلس آرائی کے سامان ساتھ ہیں، قاصد کو معشوق کے پاس یہ پیغام دیکر بھیجتا ہے کہ باغ میں عجب بہار ہے، سبزہ لب جو اور عالم آب کی

سیر قابل دید ہے، قاصد سے یہ بھی کہدیا ہے کہ ادھر اُدھر کی باتوں میں ٹالنا چاہے تو نہ ماننا، اور جس طرح ہوسکے ساتھ لانا، اور اگر عالم مستی میں ہو تو اسی طرح مست اُٹھا لانا، ان تمام خیالات کو تفصیل کے ساتھ ایک غزل میں ادا کیا ہے،

آمد بہار و شد چمن و لالہ زار خوش
وقتے است خوش بہار کہ وقت بہار خوش

در باغ باترانہ بُلبلُ دریں ہوا
مستی خوش است و بادہ خوش است و بہار خوش

مائیم و مطربے وشرابے و محرمے
جامے بزیر سایہ شاخ چنار خوش

اے باد کاہلی مکن و سوے دوست رو
مارا بکن بہ آمدن آں نگار خوش

چیزے دگر مگوے ہمیں گو کہ در چمن
سبزہ خوش است و آب خوش و جوئبار خوش

گر خوش کند ترا بہ حدیثے کہ باز گرد
پیشش کن و بیار مشو زینہار خوش

ور بینیش کہ مست بود خفتنش مدہ
ہم چنانش مست بہ نزد من آر خوش

من مست خوش حریفی اویم کہ آں حریف
سر خوش خوش است و مست خوش و ہوشیار خوش

یا او دراں زماں کہ منش راہ میدہد
بازی خوش است و بوسہ خوش است و کنار خوش

سرو پیادہ خوش بود اندر چمن ولیک
آں سرو من پیادہ خوش است و سوار خوش

بہار میں کیا کیا چاہیئے؟ اسکو تفصیل سے لکھتے ہیں،

ہنگام گل است بادہ باید
ساقی و حسریف سادہ باید

گر غنچہ گرہ در ابرو افگند
پیشانی گل کشادہ باید

ساقی بر خیز و یار بنشاں
کیں نشستہ و آں ستادہ باید

وانگاہ حریف سادہ و مست
در چنگ من اوفتادہ باید

بہار کا سامان

بوستان جلوہ در گرفت اینک
گل ز رخ پردہ در گرفت اینک

آتشِ لالہ برف ریخت زباد
دامنِ کوہ در گرفت اینک

بلبل آمد نشست بر سر گل
بے نوا بود، زر گرفت اینک

لہ وقت کسے خوش بودن، دعائیہ جملہ ہے، یعنی خدا اُن کو خوش و خرم رکھے،

غنچہ درپیش فاختہ را صول سبقے تازہ بر گرفت اینک
ورق غنچہ را کہ تر شدہ بود ورقش یکدگر گرفت اینک

یعنی غنچہ کے ورق چونکہ نم تھے اس لئے چپک کر رہ گئے،

آب را گرچہ چشم ہا پاک است بوستاں را ببر گرفت اینک

یعنی پانی گو پاک نظر ہے، تاہم اُس نے باغ کو سینہ سے لپٹا لیا،

خار چوں تیز کرد پیکان را گل بصد تو سپر گرفت اینک
طوطی آغاز شعر خسرو کرد روے گل در شکر گرفت اینک

جدت — جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں امیر کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے سیکڑوں نئی تشبیہیں ایجاد کیں، اور یہ دعویٰ بدیہی دعویٰ ہے، انکی ایک غزل بھی نہیں مل سکتی جس میں کوئی نہ کوئی جدید تشبیہ نہ ہو، چند مثالیں ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں،

راز خون آود خویش اے دل منہ بامن بروں کیں ورق خام است حرف از وے بروں خواہد گذشت

اے دل اپنا بھید مجھ سے نہ کہہ کیونکہ یہ کاغذ کچا ہے اس میں حرف پھوٹ نکلے گا،

زلف او پہلوی خال لب او گوئی از شہد مگس می راند
نہ رود مہ براوج در شب تار تا ز زلف تو نردبان نہ برد

یعنی چاند اندھیری رات میں بلندی پر نہیں چڑھ سکتا، جبتک تیری زلفوں کی سیڑھیاں نہ لگائے

(چہرہ کو چاند اور زلف کو زینہ سے تشبیہ دی ہے)

ہست صحرا چوں کف دست پر از لالہ جام خوش کف دستی کہ چندیں جام صہبا بر گرفت

اس مضمون کو دانش مشہدی نے عجیب لطیف پیرایہ میں بدل دیا ہے،

دیدہ ام شاخ گلے بر خویش می پیچم کہ کاش می توانستم بیک دست ایں قدر ساغر گرفت

یعنی میں نے ایک ڈالی پھولوں سے بھری دیکھی، اور تڑپ گیا کہ کاش میں ایک ہاتھ میں اتنے ہی پیالے لے سکتا،

غلام نرگس مستم کہ بامداد پگاہ قدح بدست گرفتہ ز خواب برخیزد

گلستاں نسیم سحر یافتہ است　　صبا غنچہ را خفتہ دریافتہ است
چناں خواب دیدہ است نرگس بخواب　　کہ گویا یکے جام زر یافتہ است

نرگس کے پھول میں جو زرد کٹوری ہوتی ہے اسکو جام زر سے تشبیہ دیتے ہیں، اور یہ تشبیہ عام تھی لیکن اس اسلوب بیان نے کہ نرگس نے خواب میں دیکھا کہ اسکو جام زر ہاتھ آگیا ہے ایک خاص لطف پیدا کر دیا، اور چونکہ نرگس کو مخمور اور خواب آلود باندھتے ہیں اسلئے خواب دیکھنے کی توجیہ واقعیت کا پہلو رکھتی ہے،

میروی و گریہ مے آید مرا　　ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

آنسو کی جھڑی کو سب بارش سے تشبیہ دیتے آئے ہیں، لیکن یہ بالکل نیا اسلوب ہے کہ معشوق سے کہتے ہیں کہ تیرے جانے کے وقت مجھ کو رونا آتا ہے، اتنا ٹھہر جا کہ بارش تھم جائے، اور اس میں مزید لطف یہ ہے کہ معشوق کا جانا ہی اس بارش کی علت ہے اسلئے وہ جانا چاہیگا تو بارش ہوگی، اور اس لئے وہ کبھی نہ جا سکیگا،

می میسان شیشۂ ساقی نگر　　آتشے گویا بہ آب آلودہ اند

ابر آمد و بہ ساغر لالہ شراب کرد　　در گوشہائے باغ بسے در ناب کرد
فراش باغ بارگہ خود بہ باغ زد　　د ہنگہ بر آب خرگہ سیم از حباب کرد
نرگس کہ شب نخفت ز فریاد بلبلاں　　بنہاد سر بہ بالش گل میل خواب کرد

مضمون آفرینی

خیال بندی اور مضمون آفرینی کا موجد کمال اسمٰعیل خیال کیا جاتا ہے لیکن کمال کی جدت قصائد کے ساتھ مخصوص ہے، غزل میں اس نے اس رنگ کی مطلق آمیزش نہیں کی ہے، غزل میں نئے نئے مضامین اور نئے نئے اسلوب پیدا کرنے امیر خسرو کا ایجاد ہے اور انہیں پر خاتمہ بھی ہو گیا، متاخرین کی مضمون آفرینیاں گو حد سے بڑھ گئیں، لیکن اسکا دوسرا انداز ہے، وہ اور سلسلہ کی چیز ہے، چنانچہ آگے چل کر اسکی حقیقت کھلے گی،

امیر خسرو کی مضمون آفرینیاں مختلف قسم کی ہیں، مثالوں سے اندازہ ہوگا

بہ خانۂ تو ہمہ روز بامداد بود　　کہ آفتاب نیارد شدن بلند آنجا

تیرے گھر میں ہمیشہ صبح رہتی ہے کیونکہ وہاں آفتاب اونچا نہیں ہو سکتا،

زلف تو سیه چراست مانا[غالباً ۱۲] — بسیار در آفتاب گشته است

مشتبه می شودم قبله زرویت چه کنم — کز ابروے تو چشم بدو[پھرا ۱۲] محراب افتاد

چشم مست تو کردی برہمن بیتاب افتاد — تو نیفگندی از آلودگی خواب افتاد

زہے آن چنین تاریک باشد خانۂ چشم — کہ ہرگز آفتاب من درین روزن نمی آید

پیش تو آفتاب نتوان جست — روز روشن چراغ نتوان کرد[۱]

می روی و گریہ مے آید مرا — ساعتے بنشین کہ باران بگذرد

دل من بہ زلف و رویت شد اسیر و چون نہ گردد — شب ماہتاب و زدے کہ بہ خانۂ در آید

زہے عمر دراز عاشقان گر — شب ہجران حساب عمر گیرند

یعنی اگر شب ہجر کو بھی شامل کر لیا جائے تو عاشقوں کی عمر کس قدر بڑی ہوتی ہے،

زلف ازان می بُرد آن شوخ کہ شبہائے غمم — گر شود کوتہ ازان جا ہمہ پیوند کنند

یعنی اپنی زلف وہ اسلئے تراشتا ہے کہ میرے غم کی راتیں چھوٹی ہو جائیں تو ان میں جوڑ لگا کر بڑھا دے

راہی است براے بردن دل — ابروے تو کز میان کشاد است

یعنی تیرے دونوں ابروؤں کے درمیان میں جو فاصلہ ہے اسلئے ہے کہ دل لیجانے کیلئے راستہ رہے.

زلفت سرو پا شکستہ زان است — کز سرو بلندت اوفتاد است

یک شب ز رخ خویش چراغیم کرم کن — تا قصۂ اندوہ تو ہم پیشِ تو خوانم

یعنی کسی رات کو اپنے چہرہ کا چراغ عنایت کرو کہ میں اسکی روشنی میں اپنا قصہ تمہارے سامنے پڑھ کر سناؤں.

خانہ چشم من خراب شدہ است — کہ بہ بنیاد خانہ، نم رفتہ است

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی — مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

شکرین لعل تو کان نمک است — گرچہ شکر نہ مکان نمک است

آب روے تو ملاحت افزود — گرچہ از آب زیانِ نمک است

خواہی اے جان برو و خواہ بمن باش کہ من — مردنی نیستم امروز کہ جانان اینجاست

آئینہ کرد حسن روے از آسمان سوال — برخواست آفتاب و بہ زانو جواب کرد

---

[۱] چراغ کردن، چراغ جلانا،

یعنی اُسکے حسن نے آسمان سے آئینہ مانگا آفتاب نے ادب سے زانو ٹیک کر کہا کہ حاضر ہے،

سر ابروے تو گردم گرہش باز کشاے | کہ کمانت نہ بہ اندازہ بازوے کسے است
ہر چند کہ زلف تو سپاہی است جہانگیر | زیں گونہ پریشاں نتواں کرد سپہ را
بہ سایہ خفتہ بدم کہ یار آمد و گفت | چہ خفتۂ کہ رسید آفتاب در سایہ

اکثر شاعرانہ اجتماع النقیضین ثابت کرتے ہیں اور وہ طبیعت پر استعجاب کا اثر پیدا کرتا ہے،

ع دردہا دادی و درمانی ہنوز،
یاد باد آنکہ ہمہ عمر نہ کردی یادم

صنائع | امیر نے اعجاز خسروی میں صنائع بدائع پر اسقدر ہمت صرف کی کہ ہمکو بڑا ڈر تھا کہ جو جال انہوں نے بچھایا اُس میں خود بھی پھنس نہ جائیں، لیکن یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ جن جن لوگوں نے صنائع و بدائع کو فن بنایا اور اُس پر مستقل کتابیں لکھیں مثلاً فرخی و ابن المعتز وغیرہ وہ خود اس بدعت سے محفوظ رہے،

امیر خسرو، اوروں کی بہ نسبت کسی قدر آلودہ ہیں، تاہم انکے صنائع بہت سے بے تکلف بھی ہوتے ہیں اور اس حد تک نہیں پہنچتے کہ نکتہ گیری کی زد میں آئیں صنعت طباق یعنی اضداد اُنکی خاص مرغوب چیز ہے اور وہ اسکو بڑی خوبی سے نباہتے ہیں،

ع دردہا دادی و درمانی ہنوز،

زبند دو جہاں آزاد گردم | اگر تو ہمنشیں بندہ باشی
من درویش را کشتی بہ غمزہ | کرم کردی الٰہی زندہ باشی
گفتیم ناخوشش چرائی خسروا | چوں کنم؟ آں شکل و آں بالا خوش است
بندہ را در غم تو نیست خبر | ہمہ یاران بندہ را خبر است
خرد سالے بہ من کند بیداد | اے بزرگان شہر داد دہید

عربیت | اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امیر کو عربی علم ادب میں کمال تھا، اور اس فن کی نادر کتابیں انکے حافظہ میں مخزون تھیں، تاہم انکو اس فن میں دعوے نہیں، غرۃ الکمال

کے دیباچہ میں عربی کے چند اشعار لکھے ہیں جن سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ باوجود اعتراف عجز کے ان کو اس زبان پر کس قدر قدرت ہے، اشعار یہ ہیں،

ذاب الفواد وسال من عینی الدم ۔۔۔ وحکی الدوامع کل ما انا اکتم

دل پگھل گیا، اور آنکھ سے خون بہا اور آنسوؤں نے وہ سب کہدیا جو میں چھپاتا تھا،

واذا ابحت لدی الوری کرب النوی ۔۔۔ تبکی الاحبۃ والاعادی ترحم

اور جب میں لوگوں کے سامنے فراق کی تکلیف بیان کرتا ہوں تو دوست روتے ہیں اور دشمنوں کو رحم آتا ہے

یا عاذل العشاق، دعنی باکیا ۔۔۔ ان السکوت علی المحب محرم

او ناصح! تو مجھے رونے دے چُپ رہنا، عاشق پر حرام ہے۔

من بات مثلی فھو یدری رحلیتی ۔۔۔ طول اللیالی کیف بات متیم

جو شخص میری طرح رات گذارے وہ البتہ سمجھ سکتا ہے کہ عاشقوں کی رات کس طرح گذرتی ہے،

اعجاز خسروی میں عربی زبان میں خطوط لکھے ہیں جن سے انکی عربیت کا اندازہ ہوسکتا ہے، اگرچہ ان میں قافیہ بندی اور لغو تکلفات ہیں لیکن یہ اُس زمانہ کا عام اندازہ تھا، تنہا ان پر الزام نہیں آسکتا،

وان انا الا من غزیۃ، ان غوت ۔۔۔ غویت وان ترشد غزیۃ ارشد

میں بہرحال قبیلہ غزیہ کا آدمی ہوں غزیہ گمراہ ہے تو میں بھی گمراہ ہوں اور وہ ٹھیک راستہ پر ہے تو میں بھی ہوں،

صنائع و بدائع امیر خسرو نے صنائع و بدائع میں جو زور آوریاں صرف کیں اگرچہ کوہ کندن و کاہ برآوردن ہیں لیکن اس لحاظ سے کہ انکی محنت بالکل رائگان نہ جانے پائے، ان کا اجمالی تذکرہ کرنا ضرور ہے،

ان میں بہت سی صنعتیں وہ ہیں جو عربی میں موجود تھیں لیکن فارسی میں انکا ادا کرنا اس لئے مشکل تھا کہ فارسی زبان کی کم وسعتی اسکی متحمل نہیں ہوسکتی مثلاً صنعت منقوطہ یعنی عبارت میں ایسے الفاظ لانا جنکا ایک ایک حرف نقطہ دار ہو۔ امیر نے اس قسم کی صنائع میں صفحے کے صفحے لکھے ہیں بعض فارسی میں تھیں لیکن ایک آدھ سطر سے زیادہ کوئی شخص لکھ نہ سکا، امیر خسرو نے ورق کے ورق لکھے۔ بعض صنائع میں انہوں نے تصرفات کئے اور بعض

بالکل خاص انکے ایجاد ہیں، چنانچہ ہم انہی کو مختصر طور پر لکھتے ہیں،

دورُو، یعنی ایسی عبارت لکھنی کہ نقطوں کے ردّ و بدل سے دو مختلف زبانوں میں پڑھی جا سکے اور با معنی ہو، امیرؔ نے اس صنعت میں کئی صفحے لکھے ہیں لیکن کاتبوں کی غلط نویسی سے انکا صحیح پڑھنا ناممکن ہے، اس لئے صرف ایک دو سطر پر اکتفا کرتا ہوں۔

رسیدی بدیدی مرا، دی بہ خانے　　زمانے بباشی، بہ یاری بشائی

اس شعر کو اگر فارسی میں پڑھیں تو اسکا لفظی ترجمہ یہ ہے،

کل تو آیا اور تو نے مجھ کو ایک مکان میں دیکھا، ایک ذرا ٹھہر جا تو دوستی کرنے کے قابل ہے،

لیکن اگر اسی کو عربی میں پڑھیں تو یوں پڑھ سکتے ہیں،

رشیدی، نذیدی، مرادی، نجاتی　　زمانی بیاسٍ تباری نسائی

تو میرا ہدایت یافتہ ہے، بے نظیر ہے، میری مراد ہے، میری نجات ہے، مجھ کو اس بات نے نا امید کیا ہے کہ میری عورتیں باہم لڑتی ہیں،

تقلب اللسانین، بہت سے اشعار لکھے ہیں کہ فارسی میں ہیں، لیکن اگر ان کو الٹ کر پڑھیں تو عربی عبارت بن جائے، مثلاً،

بسی کامرانی در جہاں باش،
می باش بہ کار شادمانی،
بای یار ما کہ کار می کنیم بہم
دوست ما یار منی بہ یاری ما آئی،
بکن داد و بکشور کامراں باش

ان تمام مصرعوں کو الٹ کر پڑھیں تو عربی عبارت بن جاتی ہے،

وصل الحرفین، یہ وہ صنعت ہے کہ جسقدر الفاظ عبارت میں آئیں ان میں کہیں کوئی حرف الگ نہ آئے، بلکہ دو دو، یا تین تین، حرف کا لفظ ہو، مثلاً۔

چاکر خاصہ حاجی شرقانی، سرخدمت، بر پابیت می مالد و میگوید، کہ بدین جانب خاطر ما بافرحت قرین می باشد باید کہ گہ گہ جانب ما، نامہ فرماید، تا مہر خوشی کہ بر باست فرحی کامل باید،
یہ اُس صنعت کا نقیض ہے جسکا ہر لفظ الگ الگ حرفوں میں لکھا جاتا ہے مثلاً
دَردُوروداد آ درد، و رُودار، دَارای دَرارِی دَوار، ذات داور دوران را، الخ
امیر نے اس صنعت پر کئی صفحے کی عبارت لکھی ہے،
اربعۃ الاحرف، اس صنعت پر امیر کو بہت ناز ہے کئی کئی سطروں کی بامعنی عبارت لکھی ہے، اور یہ التزام کیا ہے کہ صرف چار حرف یعنی الف، ہ، واؤ ے، کے سوا اور کوئی حرف نہ آنے پائے، یعنی تمام الفاظ صرف انہی حرفوں سے بنے ہیں،
لیکن جو عبارت لکھی ہے، وہ بالکل سہل معلوم ہوتی ہے، اور اُس کا پڑھنا سخت مشکل ہے،
معجزۃ الالسنۃ والشفاء، اس صنعت پر اور بھی ان کو ناز ہے، اس میں ایسے الفاظ جمع کئے ہیں کہ سطریں کی سطریں پڑھتے جاؤ۔ لیکن کہیں ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوگی صرف حلق سے الفاظ نکلیں گے،
ترجمۃ اللفظ۔ یہ صنعت بھی خاص اُن کی ایجاد ہے، اس میں یہ التزام ہے۔ کہ جو لفظ آتا ہے، اُس کے بعد کا لفظ دوسری زبان کے لحاظ سے پہلے لفظ کا ترجمہ ہو جاتا ہے، مثلاً۔
سوداے رخ تو کشت مارا
یہ فارسی مصرع ہے، لیکن کشت کا اگر اردو میں ترجمہ کریں تو "مارا" ہوگا اس لئے مصرع کا اخیر لفظ پہلے لفظ کا ترجمہ بھی ہے، امیر نے اس صنعت میں پورے صفحہ بھر کی عبارت لکھی ہے،
محتمل المعانی، ایک شعر میں ایک لفظ لائے ہیں، کہ اس کے سات معنی ہیں، اور ہر معنی وہاں مراد لئے جا سکتے ہیں،

موقوف الآخر، ایک رباعی لکھی ہے، جس کا ہر قافیہ، دوسرے مصرعہ کی آغاز کا محتاج ہے، مثلاً،

در حسن ترا کسے نماند الّا — خورشید کہ ہر صبح بروں آید تا
خدمت کند و پائے تو بوسد اما — بینی تو بسوے او، چو پا بوسد تا

انہی صنعتوں اور بیجا کاوشوں میں کئی جلدیں لکھ ڈالی ہیں، اگر کسی صاحب کو امیر خسرو سے زیادہ مغز کادی مقصود ہو تو اعجاز خسروی موجود ہے، مطالعہ فرمائیں +

سلمان ساوجی

وفات ۷۶۹ھ یا ۷۷۸ھ

عراق عجم میں ساوہ ایک مشہور صوبہ تھا، صاحب آتشکدہ لکھتے ہیں کہ "اب صرف چند قصبے باقی رہ گئے ہیں" سلمان یہیں کے رہنے والے تھے، عربی میں نسبت کے وقت "ہ" "ج" سے بدل جاتی ہے، اسلئے ساوجی کہلاتے ہیں ان کا خاندان ہمیشہ سے معزز چلا آتا تھا اور سلاطین وقت انکا بہت احترام کرتے تھے، سلمان کے والد جنکا نام خواجہ علاء الدین محمد تھا، دربار شاہی میں ملازم تھے، سلمان کی ابتدائی تعلیم بھی اسی حیثیت سے ہوئی تھی چنانچہ دفتر کے کاروبار اور علم سیاق میں نہایت کمال رکھتے تھے اس زمانہ میں جو طوائف الملوک حکومتیں جابجا قائم ہوگئی تھیں ان میں ایک جلایر کا خاندان تھا جسکا پائے تخت بغداد تھا، اس خاندان نے ۸۶ برس تک حکومت کی، اور چار شخص مسند حکومت پر بیٹھے، اس سلسلہ کا پہلا فرمانروا حسن ایلکانی تھا، حسن ایلکانی کے فرزند سلطان اویس جلائر نے بڑا جاہ اور اقتدار پیدا کیا، ۷۵۶ھ میں آذربایجان، اران، موغان، شیروان، موصل وغیرہ فتح کرکے، اپنے حدود حکومت میں داخل کرلئے ۱۹ برس تک بڑے عظمت و اقتدار کے ساتھ حکومت کی، مختلف علوم وفنون میں کمال رکھتا تھا، تصویر ایسی عمدہ کھینچتا تھا کہ بڑے بڑے مصوّر دنگ رہ جاتے تھے، خواجہ عبدالحی جو مشہور مصوّر گذرا ہے، اسی کا تربیت یافتہ تھا، علم موسیقی میں اکثر چیزیں اسکی ایجاد ہیں، ان باتوں کے سوا حسن وجمال کا یہ حال تھا کہ جب اسکی سواری نکلتی تھی تو راستہ تماشائیوں سے رک جاتا تھا، ۷۷۶ھ میں وفات پائی، خواجہ سلمان انہی دونوں کے دربار کے ملک الشعرا تھے،

خواجہ سلمان کی ابتدائی تقریب کا یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے حسن ایلکانی کی فیاضیوں کا

لـه مجمع الفصحاء و تذکرہ دولت شاہ،

شُہرہ سُن کر بغداد کا قصد کیا، اور دربار میں پہنچے ایک دن حسن تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا، سلمان بھی اس موقع پر موجود تھے، برجستہ یہ اشعار کہہ کر پیش کئے،

چو در بارِ چاچی کماں رفت شاہ | تو گفتی کہ در برج قوس است ماہ
دو زاغ کماں با عقاب سہ پر | بریدم بیک گوشہ آوردہ سر
نہادند سر بر سر گوشِ شاہ | ندانم چہ گفتند در ہوش شاہ
چو از شست بکشادہ خسرو گرہ | برآمد زہر گوشہ آواز زہ
شہا! تیر در بند تدبیر تست | سعادت دواں در پے تیر تست
بہ عہدت ز کس نالۂ بر نخواست | بغیر از کماں کو بنالد رواست
کہ در عہد سلطان صاحبقراں | نکرد است کس زور جز بر کماں

حسن نے سلمان کی غیر معمولی قادر الکلامی دیکھکر مقربین خاص میں داخل کیا، سلطان حسن کی حرم دلشاد خاتون نہایت قابل اور لائق عورت تھی، سلطان برائے نام بادشاہ تھا، سلطنت کا نظم و نسق دلشاد خاتون کے ہاتھ میں تھا، وہ شعر اور سخن کی بہت قدر دان تھی، اس بنا پر سلمان کی نہایت قدر دانی کرتی تھی، سلمان نے بھی اس کی مدح میں جی کھول کر زور طبع دکھایا ہے،

سلطان اویس کو شاعری کے ساتھ خاص مذاق تھا، خود شعر کہتا تھا، اور سلمان کو دکھاتا تھا، اس بنا پر سلمان نے اسکے دربار میں نہایت تقرب حاصل کیا،

ایک دفعہ سلمان رات کے وقت سلطان اویس کی مجلس عیش میں شریک تھے جلسہ ختم ہوچکا تو سلمان اُٹھے، سلطان نے ملازم ساتھ کر دیا کہ روشنی دکھانے کے لئے شمع ساتھ لیجائے، گھر پر پہنچے تو ملازم شمع وہیں چھوڑ آیا، صبح کو شمع لینے گیا، تو خواجہ صاحب اس بنا پر گھبرائے کہ شمع کے ساتھ طلائی تھالی بھی تھی، وہ ہاتھ سے جاتی ہے، اُسی وقت یہ شعر لکھ کر ملازم کو دیا، کہ سلطان کی خدمت میں پیش کرنا،

شمع خود سوخت بزاری شب دوش و امروز | گر لگن می طلبد شاہ زمن می سوزم

سلطان نے ہنسکر کہا کہ شاعر سے کوئی چیز کون واپس لے سکتا ہے.

لہ دولت شاہ،

سلمان جب بہت ضعیف ہو گئے تو ملازمت سے استعفا دینا چاہا اور مسلسل چار قطعے لکھ کر پیش کئے،

بادشاہا بندہ در حضرت برسم عرضداشت
انبساطے می نماید بر امید رحمتت

قرب چل سال است تا سکان شرق و غرب را
طبع سلمان می کند در گوش دُرِّ مدحتت

در ثنائی حضرتت عہد جوانی گشت صرف
نوبت پیری رسید اکنوں بامر حضرتت

گوشۂ خواہم گرفتن تا اگر عمرے بود
چند روزے بگذرانم در دعائے دولتت

علت پیری و درد پا، وضعف جسم و چشم
می برد در رو سر من بندہ را از خدمتت

گفتہ ام در باب خود فصلے دو سہ آنرا جواب
چشم دارد بندہ از درگاہ گردوں حشمتت

قطعۂ دوم

اول آن است کہ چوں نیت عزلت دارد
بندہ زیں دائرۂ جمع، جدا خواہد بود

مدتے مالک ملک شعرا بود بہ حق
زیں زماں خادم جمع فقرا خواہد بود

پیش ازیں در پئے مخلوق پسر می گردید
بعد ازیں بر در معبود بپا خواہد بود

بندہ تا زندہ بود وجہ معاش بندہ
ہیچ شک نیست کہ احسان شما خواہد بود

لیک دارم طمع آں کہ معین باشد
کہ مرا وجہ معیشت زکجا خواہد بود

قطعۂ سیوم

دیگر آن است کہ محبوب جہاں مقری شاہ
آمد از بندگی[1] شاہ کہ مے فرماید

زد بگو بندۂ دیرینۂ ما سلمان را
کہ بخواہ از کرمم ہر چہ ترا مے باید

بندہ بر حسب اشارت طلبی کردم و شاہ
داشت مبذول جہاں کو کرم شاہ آید

وعدہ دین است زدین من اگر زانچہ کند
ذمۂ ہمت خود شاہ بری، مے شاید

قطعۂ چہارم

دیگر از خرچ تر و دخل کمش قرضے چند
ہست و فرض است کہ قرض غربا باز دہد

بندہ را غیر در شاہ در دیگر نیست
قرض باید کہ زانعام شما باز دہد

[1] بندگی کا لفظ اس زمانہ میں اس طرح بولتے تھے جس طرح آجکل بادشاہ کیلئے ہز مجسٹی کہتے ہیں۔

وجہ این قرض کہ از من غربا می خواہند   گرنہ خواہد ز تو سلمان ز کجا باز دہد

سلطان نے فی البدیہ پہلے قطعہ پر یہ شعر لکھا،

ہر چہ تا غایت بہ نام و مقرر بودہ است   ہمچناں باشد بہ نام او مقرر ہمچناں

دوسرے قطعہ پر یہ لکھا،

دہ ایرین کہ در حد ودے ، است   بدہندش کہ التماس وے است

غرض جاگیر اور تنخواہ کی بحالی کے ساتھ قرض بھی ادا کر دیا گیا[1]،

سلمان نے گوشہ نشینی اختیار کی اور جبتک زندہ رہے ہر قسم کے تعلقات سے آزاد رہے، حسب روایت دولت شاہ ۷۶۹ھ میں وفات پائی لیکن مولوی غلام علی آزاد لکھتے ہیں کہ میں نے دیوان سلمان کا ایک نسخہ ۷۹۱ھ کا لکھا ہوا دیکھا، اُسکے خاتمہ میں ایک قطعہ تھا، اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب قطعہ سلمان کا معاصر ہے، قطعہ یہ ہے۔

محل آیت اعجاز پارسی سلمان   کہ کرد ناطقہ پیش دمش بہ عجز اقرار

ندید بر سر شاخ گل سخن اصلا   بہار طبع چو او عندلیب خوش گفتار

نماز شام دوشنبہ یب از صفر بودہ   کہ نقد عمر بہ یک دم چو صبح کرد نثار

بساط دار قرارست سال تاریخش   چو کرد میل بہ سوے بساط دار قرار

اس سے ۷۷۸ نکلتے ہیں،

ناصر بخاری اس زمانہ میں مشہور شاعر تھے، اور درویشانہ وضع رکھتے تھے، حج کو جاتے ہوئے بغداد میں آئے، خواجہ سلمان کی شہرت عالمگیر ہو چکی تھی انکو بھی ملنے کا شوق پیدا ہوا، ایک دن سلمان دجلہ کے کنارے عالم آب کی سیر کر رہے تھے، ناصر وہیں پہنچے، سلمان نے مزاج پرسی کے بعد نام و نشان پوچھا، ناصر نے کہا شاعر ہوں، سلمان نے فی البدیہ یہ مصرع پڑھا،

ع دجلہ را امسال رفتارے عجب مستانہ ایست

---

[1] یہ تمام تفصیل خزانۂ عامرہ میں ہے،

ناصر نے برجستہ دوسرا مصرع پڑھا۔

ع پائے در زنجیر و کف بر لب مگر دیوانہ ایست[1]،

سلمان نے گلے سے لگا لیا اور کئی دن تک مہمان رکھا، ناصر باوجود کمال استادی کے سلمان کی شاگردی کا دم بھرتے تھے،

عبید زاکانی ہجوگویوں کا پیشوا اُسی زمانہ میں تھا، ایک دفعہ خواجہ سلمان سفر میں امیرانہ ساز و سامان کے ساتھ ایک چشمہ کے کنارے خیمہ زن تھے اتفاق سے عبید زاکانی کہیں سے آنکلا، سلمان نے پوچھا کدھر سے آنا ہوا عبید نے کہا قزوین سے، سلمان نے کہا، سلمان کا کلام کچھ یاد ہو تو سناؤ، عبید نے یہ شعر پڑھے،

من خراباتیم و بادہ پرست | در خرابات مغاں عاشق و مست
می کشندم چو سبو دوش بدوش | می برندم چو قدح دست بدست

ساتھ ہی کہا، لیکن سلمان بڑے رتبہ کا شخص ہے، یہ شعر اسکے نہیں ہو سکتے عجب نہیں اُنکی بیوی کا کلام ہو، سلمان بہت برہم ہوئے، لیکن قیاس سے سمجھا کہ عبید ہے، دیگر پوچھا، عبید نے اقرار کیا، اور کہا کہ تم بے دیکھے لوگوں کی ہجویں کرتے ہو، یہ زیبا نہیں میں بغداد خاص اس غرض سے آیا تھا کہ تمکو ہجوگوئی کا مزہ چکھاؤں، تمہاری خوش قسمتی ہے کہ میں نے قصداً چھوڑ دیا، سلمان نے شکرگزاری کی؛ خود گھوڑے پر سوار کرایا، نقدی اور کپڑے دئے، اس پر بھی ہمیشہ عبید کی ہجوگوئی سے ڈرتے رہے[2]،

کلام پر رائے سلمان کی کمال شاعری کا تمام اساتذہ نے اعتراف کیا ہے، خواجہ حافظ معاصر تھے، تاہم کہتے ہیں۔

سر آمد فضلائے زمانہ دانی کیست | ز راہ صدق و یقیں نے ز راہ کذب و گمان
شہنشہ فضلا بادشاہ ملک سخن | جمال ملت و دین خواجہ جہاں سلمان

[1] دولت شاہ تذکرہ ناصر بخاری، [2] دولت شاہ عبید زاکانی،

سلمان نے شاعری کی عمارت کمال اسمٰعیل اور ظہیر فاریابی کی داغ بیل پر قائم کی اکثر قصائد انہی دونوں کے جواب میں اور اسی طرز میں لکھے ہیں، مولانا جامی بہارستان میں لکھتے ہیں، کہ سلمان کے اکثر مضامین، اساتذۂ قدیم خصوصاً کمال اسمٰعیل سے ماخوذ ہیں لیکن سلمان نے ان کو اس قدر ترقی دی کہ جائے اعتراض نہیں اور اسکی یہ مثال ہے

معنی نیک بود شاہد پاکیزہ بدن | کہ بہر چند در و جامہ دگرگون پوشند
کسوت عار بود باز پسین خلعت او | گر نہ در خوبیش از پیشتر افزون پوشند
ہنر ست اینکہ کہن خرقۂ پشمیں ز برش | بدر آرند و در و اطلس و اکسون پوشند

شاعری میں سلمان کا ایک خاص درجہ ہے، یعنی وہ قدما اور متوسطین میں برزخ ہیں انکا کلام، قدما کے دور کا خاتمہ اور متوسطین کا آغاز ہے، انہوں نے کمال اسمٰعیل اور ظہیر سے زبان کی صفائی اور شستگی لی ہے اور اس میں ایجاد مضامین کی رنگ آمیزی کی ہے مضمون بندی جو متوسطین اور متاخرین کا مابہ الامتیاز جوہر ہے، گو کمال نے شروع کی لیکن سلمان نے کمال کو پہنچا دیا،

سلمان نے قصیدہ، مثنوی، غزل سب کچھ کہا ہے، مثنوی جمشید و خورشید انکی مشہور مثنوی ہے، اسکا انداز اشعار ذیل سے معلوم ہوگا،

شگوفہ چو نازک تنے سیم بر | ز صندوق چوبیں بر آوردہ سر
بنفشہ چو مشکیں سر زلف یار | بریدہ ز بار خودش روزگار
بر آنم کہ سوسن پری زادہ است | زباں آورے خوب و آزادہ است
شنیدم کہ پروانہ با بلبلے | ہمی کرد در عشق گل، غلغلے
ہمی گفت کیں بانگ فریاد چیست | ز بیداد معشوق ایں داد چیست
ز من عاشقی باید آموختن | کہ ہرگز نہ نالم از سوختن
نہ روز من و حال من کس مباد | گر یارم رود پیش چشمم بباد
ہما یدبداں زندہ بگریستن | کہ بے یار خود بایدش زیستن

سلمان نے اگرچہ مثنوی، قصیدہ، غزل، سب کچھ لکھا ہے، لیکن انکی شاعری کا اصلی

میدان قصیدہ گوئی ہے، انکے قصائد کی خصوصیات حسب ذیل ہیں،

۱۔ زبان کی صفائی اور روانی کے ساتھ، ترکیبوں میں وہ چُستی جو ان سے پہلے نہ تھی اور جو خاص متوسطین شعرا کا انداز ہے، مثلاً۔

خندہ زد دہنت، تنگ شکر پیدا کرد — سخنے گفت، لبت لولوے تر پیدا کرد
بود نایافت میان تو ولیکن کمرت — چُست بر لبست میان را و بہ زر پیدا کرد
پردہ از چہرہ برانداز کہ آن زلف سیاہ — در سپیدی عذار تو اثر پیدا کرد

باد نوروز نسیم گل رعنا آورد — گرد مشک ختن از دامن صحرا آورد
شاخ را باغ بہ نقش دم طاؤس نگاشت — غنچہ را باد بہ شکل سر ببغا آورد
لالہ از دامن کوہ آتش موسیٰ بنمود — شاخ بیروں زگریباں ید بیضا آورد
از پے خسرو گل، بلبل شیریں گفتار — نغمۂ بار بد و صوت نکیسا آورد
سرو را باد صبا منصب بالا بخشید — لالہ را لطف ہوا، خلعت والا آورد

صبحگاہے کہ صبا مجمرہ گرداں باشد — گل فرو کردہ بداں مجمرۂ داماں باشد
جامۂ سرو ز استبرق و سندس بافند — کمر کوہ، ز پیروزہ و مرجان باشد
می کند باد صبا طفل چمن را در خواب — در نہ مہد شجرش بہر چہ جنباں باشد
آب در رود، نواہاے تر و تازہ زند — مرغ بر عود سحر ساختہ الحاں باشد

۲۔ دقیق اور نازک مضمون آفرینی جو متوسطین اور متاخرین کا کارنامۂ فخر ہے۔ چند[1] مثالیں ذیل میں درج ہیں۔

دہن و دندان، لب، خال کی تشبیہ

در[2] درج دُر، عقیق لبت نقد جاں نہاد — جنس نفیس بود، بہ جائے نہاں نہاد
قفلے ز لعل، بر در آں درج زد لبت — خالت ز عنبر آمد و مہرے بر آں نہاد
باریک تر ز مو، کمرت را دقیقۂ — ناگاہ در دل آمد و اسمش میاں نہاد

---

[1] اوپر جو اشعار گذرے ان کو مضمون بندی کی حیثیت سے بھی دیکھنا چاہیئے۔

[2] یعنی تیرے ہونٹوں نے عاشق کی نقد جان کو موتی کے ڈبہ (دہن) میں رکھا، اسلئے کہ وہ نفیس چیز تھی اور نفیس چیز کو ایسی ہی مخفی جگہ رکھتے ہیں، پھر ہونٹوں نے ڈبہ پر یاقوت کا قفل لگا دیا، اور تل نے آکر عنبر کی مہر کر دی،

یعنی کمر بند کے خیال میں ایک مضمون یاد آیا جو بال سے بھی باریک تھا، کمر بند نے اسکا نام کمر رکھ دیا، مطلب یہ ہے، کہ معشوق کی کمر درحقیقت ایک باریک خیال ہے،

بعد ازیں از گرہ زلفِ مغاں، کن تسبیح — پس ازیں از خم ابروے بتاں کن محراب

جدّت تشبیہ

خوش برا ہیچو حباب از مے گلگوں دمنہ — ہیچ بنیاد بریں گنبد گردوں چو حباب

مدتے گردش ایں دائرہ مارا، از ہم — ہمچو پرکار جدا کرد، بہم باز آورد

حسن تعلیل تشبیہ

غنچہ راپیش دہان تو، صبا خنداں یافت — آں چناں بردہنش زد کہ دہن پُرخوں شد

پا ازیں دائرہ بیروں ننہم یکسر مو — گر سراپائے چو پرکار کنند م بدونیم

دامن ازمن مکش اے سرو کہ چوں آب رواں — من ہمے در قدمت مے نہم و می گذرم

۳۔ مخلص یعنی گریز میں نئے نئے پیرائے پیدا کئے، ایک قصیدہ ہے جس کی ردیف دست ہے اور قافیہ ہزار، نگار، بہار، اس میں گریز کا شعر ہے،

زلفت بہ عہد معدلت شہریار دست — سودائی است ورنہ چرامی کند دراز

تیری زلف سودائی ہے ورنہ بادشاہ کے زمانہ میں دست درازی کیوں کرتی،

ایک قصیدہ میں تشبیب کے بعد کہتے ہیں،

بعد ازیں غم مخور اے دل کہ غم امروز ہمہ — روزی دشمن دارائے مظفر شدہ است

اے دل غم نہ کھا کیونکہ اب تو غم، مظفر شاہ کے دشمن کی خوراک بن گیا ہے،

عیش اور رقص و سرود کا بیان کرتے کرتے کہتے ہیں،

مطربا راہ[1] طرب خوش بزن امروز کہ نیست — جز تو در عہد شہنشاہ جہاں راہ زنے

نیست پیدا دہنت بررخ، و در دولت شاہ — فتنہ آں بہ کہ بہمہ وجہ کہ پنہاں باشد

دور مستی است دریں دور نہ زیبد کہ بود — بجز از بخت خداوند جہاں کس بیدار

سایۂ زلف تو بر چشمۂ خورشید فتاد — خم زلف تو مگر چتر شہ دادگر است

۴۔ مشکل مشکل ردیفیں ایجاد کی ہیں اور اُن میں اسی روانی اور صفائی کے ساتھ کہتے جاتے ہیں گویا معمولی ردیفیں ہیں اسکے ساتھ ہر جگہ ردیف نہایت خوبی سے نمایاں ہوتی ہے، مثلاً

[1] راہ کے معنی راگنی کے بھی ہیں اور راستہ کے بھی پہلے مصرع میں پہلے معنی لئے ہیں اور دوسرے میں دوسرے معنے

منم ہر روز بلائے شب ہجراں بر سر — کردہ در کار تو چوں شمع دل و جاں بر سر
دست آنم نہ کہ در دامنت آویزم دست — تا مگر گسترم لطف تو داماں بر سر
سر و بر پائے تو می میرود مرغان چمن — می کنندش ہمہ شب نالہ و افغاں بر سر
ماہ تاباں تو یابد شب مشکیں بر دوش — سرو رعنائے تو دارد گل خنداں بر سر
آفتاب تو اگر سایہ زمن باز گرفت — باز یابندمرا سایۂ سلطاں بر سر

مدح کے بعد فخریہ کہتے ہیں،

شعرم از تربیت لطف تو جای برسید — کہ نہندش ہمہ اشراف خراسان بر سر

دعائیہ ملاحظہ ہو،

تا زند خسرو گل تخت زمرّد در باغ — تاج یاقوت نہد لالۂ نعمان بر سر
تیر باراں کند از روئے ہوا قوس قزح — ہر دم آرد، سپر لعل، گلستان بر سر
شجر روضۂ بخت تو چناں مثمر باد — کہ فلک را فگند سایۂ احسان بر سر

اسی طرح دست، پاے، ارد، وغیرہ ردیفوں میں قصیدے لکھے ہیں،

قطعات | قصیدہ کی افتاد ایسی بُری پڑ گئی تھی کہ اس میں بجز معشوق اور ممدوح کی مداحی کے اور کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا، جو شعرا، اور اور خیالات ادا کرنے چاہتے تھے وہ قطعات کے ذریعہ سے ادا کرتے تھے،

سلمان نے نہایت کثرت سے قطعات لکھے ہیں، اور اُن میں ہر قسم کے عجیب و غریب مضامین ادا کئے ہیں، افسوس ہے کہ سلمان کا جو دیوان بمبئی میں چھپا ہے اسمیں یہی قطعات نہیں ہیں، جو دیوان کی جان ہے، ہمارے پاس جو قلمی مجموعہ ہے اُس میں سے بعض نمونے درج کئے جاتے ہیں،

بادشاہ نے سلمان کو ایک سیاہ رنگ گھوڑا عنایت کیا تھا، سلمان نے واپس دیا کہ دوسرے رنگ کا گھوڑا مرحمت ہو، داروغۂ اصطبل نے وہ بھی رکھ لیا، اسپر کہتے ہیں،

شاہا مرا بہ اسپے موعود کردہ بودی — در قول بادشاہاں قیلے دگر نباشد
اسپے سیاہ و پیرم دادند و من بر آنم — کاندر جہاں سیاہے زاں پیر تر نباشد

آں اسپ بازدادم تا دیگرے ستانم — برصورتے کہ کس رازیں سرخبر نباشد
اسپ سیہ بدادم، رنگ دگر ندادند — آری" پس از سیاہی رنگ دگر نباشد"

ایک اور قطعہ میں گھوڑے کی ہجو کی ہے،

شاہا امید بود کہ خواہم بدولتت — برمرکبے بلند وجواں وروان نشست
اسپیم پیروکابل وکوتہ ہمی دہند — اسپے نہ آں چناں کہ توانم براں نشست
چوں کلک، مرکبے سیہ وسست ولاغراست — جہل مرکب است براسپے چناں نشست
ازبندہ مہتراست بہ سی سال راستی — گستاخی است برزبر مہتراں نشست

آنکھوں میں آشوب کی وجہ سے دربار میں جانا بند ہوگیا تھا، اسکی معذرت میں ایک قطعہ لکھا ہے

خسروا خاک درگہ تو مراست — ازغبار زروے نیکوتر
لیک درعین علتے کہ مراست — غیبتم از حضور نیکوتر
حال چشمم بداست دور از تو — چشم بد، از تو دور نیکوتر

بدن پر کپڑے نہیں رہے تھے، بادشاہ کو قطعہ لکھا،

اے زما مستغنی واز امثال ما — برشما احوال ما پوشیدہ نیست
برتنم پوشیدنی این ست وبس — بندہ راہیچ از شما پوشیدہ نیست

بادشاہ نے ملبوس خاص بدن سے اتار کر بھیجا اور یہ شعر لکھا،

ہر چند ترا، جامہ پوشیدن — عیب است ولیکن ایں عیب بپوش

درد پاکی وجہ سے دربار میں نہ جاسکتے تھے، اسکی عذرخواہی کرتے ہیں،

بہر استقبال شاہ از فرق وسر کردم قدم — خواستم تا رو بہ درگاہ ہمایوں آورم
درد پایم گشت ازاں مانع کہ آرم درد سر — من کہ درد پاہی دارم درد سر چوں آورم

سلمان کی بدعات

سلمان سب سے پہلے شخص ہیں جس نے صنعت ایہام کو نہایت کثرت سے برتا اس میں اکثر لطیف اور نئے نئے پیرائے پیدا کئے، مثلاً

باقد تو صنوبر در چشم من نیاید — او کیست تا قدت را قائم مقام باشد
کی تواند دلم از موے میان تو گذشت — کہ شب تیرہ وتاریک ہمی بر کمر ست

چشمِ سرمست ترا عین بلا می بینم | لیکن ابروے تو چیزے ست کہ بالاے بلاست
فتنہ در دور تو بیمار و ضعیف افتادہ است | آں چناں نیست کہ تا حشر تواند برخاست
باچنیں عارضہ وضعف، تمناے نجات | دارم اما ہمہ موقوف اشارات شماست

سرو را باد صبا منصب بالا بخشید | لالہ را لطف ہوا خلعت والا آورد

در بست بادلم دہن تنگ او بہ ہیچ | و ایں چنیں مضائقہ بسیار می کند
نیست سود اے سر زلف تو کار ہمہ کس | کان طریقے است خم اندر خم و دل گیر و دراز

لیکن اکثر اس قدر بے اعتدالی برتی کہ ضلع جگت کی حد تک نوبت پہنچ گئی، سیکڑوں اشعار ہیں جن میں صرف رعایت لفظی سے کام لیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ بدعت مقبول عام نہ ہوئی ورنہ ایران میں بھی بہت سے امانت پیدا ہو جاتے،

غزلیں | سلمان کی غزلیں چنداں مقبول نہیں ہوئیں ان سے پہلے سعدی کا رنگ عالم کو مسخر کر چکا تھا، اس رنگ میں وہ کہہ نہیں سکتے تھے اسلئے مضمون آفرینی شروع کی لیکن لوگوں کے کانوں میں سعدی کی نے گونج رہی تھی، اسلئے انکی آواز خالی گئی، سعدی ہی کا رنگ جب خواجہ حافظ نے اختیار کیا اور اس شراب کو اور تیز کردیا تو ع حریفاں را نہ سر ماند و نہ دستار

نمونہ کے طور پر ہم سلمان کی ایک دو غزل اور متفرق اشعار نقل کرتے ہیں،

بہ سر کوے تو سوگند کہ تا سر دارم | نیست ممکن کہ من از حکم تو سر بر دارم
اے کہ در خواب غروری خبرے نیست کہ من | ہر شب از خاک درت بالش و بستر دارم
ساغرم پُر می، دمی در سر، سر در کف دست | تو چہ دانی کہ من امروز چہ در سر دارم
گفتہٗ در قدم من گہر انداز بہ چشم | اینک از بہر قدمہاے تو گوہر دارم

دل برو دلبر و در دام بلاش انداز د | دل ما برد، کنوں تا بہ کجاش انداز د
چشم فتاں تو ہر جا کہ بلا انگیز د | اے بسا کس کہ دراں عرصہ بلاش انداز د
ہر کجا مرغ دلے بال کشاید، الحال | بہ کمان خانۂ ابرو، ز ہواش انداز د
خوش کمندے است سر زلف شکن پُر شکنش | وہ چہ خوش باشد اگر بخت بپاش انداز د
عاقل آن است کہ در پاے تو اندازد سر | پیشتر زاں کہ فراق تو ز پاش انداز د

بوئے گیسوے تو ہر جا کہ جگر سوختہ ایست　　در پے قافلۂ باد صبا شس اندازد

ہر کرا درد بہینداخت، دوا چارہ کند　　گر کند چارۂ سلمان چو دواش اندازد

یک شب خیال چشم تو دیدیم با بخواب　　زان شب دگر بہ چشم ندیدیم خواب را

غمزہ ات دل می برد چشم توام خوں می خورد　　روز و شب او در شکار این در شراب افتادہ است

زاہد دہدم توبہ ز روے تو زہے روی　　ہیچش ز خدا شرمے و ز روے تو حیا نیست

من خراباتیم و بادہ پرست　　در خرابات مغاں عاشق و مست

می کشندم چو سبو دوش بدوش　　می برندم چو قدح دست بدست

ظاہر نمی شود اثر صبح گوئیا　　دود دلم دریچۂ خاور گرفتہ است

---

*

خواجہ حافظ شیرازؒ

تاریخ شاعری کا کوئی واقعہ اس سے زیادہ افسوسناک نہیں ہو سکتا کہ خواجہ حافظ صاحب کے حالات زندگی اسقدر کم معلوم ہیں کہ تشنگان ذوق کے لب بھی تر نہیں ہو سکتے، اس پایہ کا شاعر یورپ میں پیدا ہوا ہوتا تو اس کثرت اور تفصیل سے اسکی سوانحعمریاں لکھی جاتیں کہ اسکی تصویر کا ایک ایک خد و خال آنکھوں کے سامنے آجاتا، لیکن ہمارے تمام تذکرہ نویسوں نے جو کچھ لکھا ان سب کو جمع کر دیا جائے تب بھی انکی زندگی کا کوئی پہلو نمایاں ہو کر نہیں نظر آتا، جسقدر تذکرے ہیں سب ایک دوسرے سے ماخوذ ہیں، اور وہی چند واقعات ہیں جنکو بہ اختلاف الفاظ سب نقل کرتے آئے ہیں ان سب میں عبد النبی فخر الزمانی نے اپنے تذکرہ میخانہ میں جو جہانگیر کے عہد میں ۱۰۲۶ھ میں لکھا گیا، ابتدائی حالات اوروں کی بہ نسبت اچھے بہم پہنچائے ہیں، حبیب السیر میں جستہ جستہ کچھ واقعات ملتے ہیں، خود حافظ کے کلام میں جابجا واقعات کے اشارے ہیں، ان سب کو ترتیب دے کر انکی زندگی کی تصویر کھینچتا ہوں، لیکن در اصل یہ تصویر نہیں بلکہ خاکہ ہے اور زیادہ سچ یہ ہے کہ خاکہ بھی نہیں بلکہ محض چند لکیریں ہیں،

نام و نسب۔ خواجہ صاحب کے دادا، اصفہان کے مضافات کے رہنے والے تھے، اتابکان شیراز کے زمانہ میں شیراز میں آئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی، خواجہ صاحب کے والد کا نام بہاء الدین تھا، اُنہوں نے یہاں تجارت شروع کی اور کاروبار کو اسقدر ترقی دی کہ دولتمندوں میں اُنکا شمار ہونے لگا، بہاء الدین نے جب انتقال کیا تو تین بیٹے چھوڑے انکو اگرچہ باپ سے بہت بڑا ترکہ ملا تھا لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ نہ تھا، چندروز میں باپ کی کمائی سب اُڑ گئی بیٹے پریشان ہو کر کہیں کے کہیں نکل گئے، لیکن خواجہ صاحب کمسنی کی وجہ سے اپنی ماں کے ساتھ شیراز ہی میں رہ گئے۔ گھر میں فاقے ہونے لگے

توانکی ماں نے انکو محلہ کے ایک آدمی کے حوالہ کر دیا کہ اپنی خدمت میں رکھے اور کھانے پینے کی کفالت کرے۔ لیکن یہ شخص بد اطوار تھا، خواجہ سن شعور کو پہنچے تو اسکی صحبت ناگوار ہوئی چنانچہ اس سے قطع تعلق کر کے خمیر بنانیکا پیشہ اختیار کیا، آدھی رات سے اُٹھ کر صبح تک خمیر گوندھتے، گھر کے پاس ہی ایک مکتب خانہ تھا، محلّے کے سب لڑکے اُس میں پڑھتے تھے، خواجہ صاحب اکثر اُدھر سے نکلتے، تو دل میں تعلیم کی تحریک پیدا ہوتی، رفتہ رفتہ شوق اسقدر بڑھا کہ مکتب میں داخل ہو گئے، خمیر سے جو کچھ حاصل ہوتا اُس میں سے ایک تہائی ماں کو اور ایک معلم کو دیتے۔ بقیہ خیرات کرتے، مکتب میں قرآن مجید حفظ کیا، معمولی سواد خوانی کی بھی لیاقت حاصل کی، اس زمانہ میں شعر و شاعری کا گھر گھر چرچا تھا محلے میں ایک بزاز رہتا تھا، وہ سخن سنج اور موزون طبع تھا، اس مناسبت سے اور ارباب ذوق بھی اُسکی دکان پر آبیٹھتے تھے، اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے خواجہ صاحب پر بھی اس مجمع کا اثر ہوا، چنانچہ شاعری شروع کی، لیکن طبیعت موزون نہ تھی بے تکے شعر کہتے اور لوگوں کو تفریح طبع کا سامان ہاتھ آتا رفتہ رفتہ اُنکی لغو گوئی کی شہرت تمام شہر میں پھیل گئی لوگ تفریح کے لئے انکو صحبتوں میں بلاتے اور لطف اٹھاتے، دو سال تک یہی حالت رہی لوگوں کا استہزا حد سے بڑھا تو ان کو بھی احساس ہوا، ایک دن نہایت رنجیدہ ہوئے اور بابا کوہی کے مزار پر جا کر پھوٹ پھوٹ کر روئے رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ انکو لقمہ کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جا اب تجھ پر تمام علوم کے دروازے کُھل گئے نام دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جناب امیر علیہ السلام ہیں، صبح کو اُٹھے تو یہ غزل لکھی۔

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند | وندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

شہر میں آئے تو لوگوں نے حسب معمول شعر پڑھنے کی فرمایش کی، انھوں نے وہی غزل پڑھی سب کو حیرت ہوئی اور سمجھے کہ کسی سے یہ غزل لکھوا لائے ہیں امتحان کے لئے طرح دی۔ انھوں نے طرح میں بھی عمدہ غزل لکھی، اسی وقت گھر گھر چرچا پھیل گیا۔

یہ تمام واقعات عبد النبی نے میخانہ میں لکھے ہیں، اس میں اگرچہ خوش اعتقادی و وہم پرستی نے بعض باتیں بڑھادی ہیں یا اصل واقعات کی صورت بدل دی ہے تاہم بہت کچھ اصلی واقعات بھی ہیں،

خواجہ صاحب کے کمالات اور شاعری کا چرچا عام ہوا، دور دور سے سلاطین اور امرا نے انکے بلانے کے لئے خطوط بھیجے، خواجہ صاحب کے زمانہ میں شیراز میں متعدد حکومتیں قائم ہوئیں اور حسن اتفاق یہ کہ فرمان روا عموماً خود صاحب علم وفضل اور علما اور شعرا کے نہایت قدر دان تھے،

غازان خان (چنگیز خان کا پوتا) کے زمانہ میں غازان خان کی طرف سے محمد شاہ انجو، فارس اور شیراز کا حکمران مقرر ہو کر آیا تھا، اسکے خاندان میں سے شاہ ابو اسحاق خواجہ حافظ کے زمانہ میں تھا، وہ نہایت قابل اور فاضل تھا، خود شاعر اور شعرا کا مربی اور قدر دان تھا، اسکے ساتھ نہایت عیش پرور اور لہو لعب کا دلدادہ تھا اس بنا پر اگرچہ ملکی انتظامات بے اصول تھے، لیکن گھر گھر عیش و نشاط کے چرچے تھے، اور شیراز باغ ارم بن گیا تھا، خواجہ حافظ کی مستانہ غزلوں میں اس دور کا اثر شامل ہے شاہ ابو اسحاق کی عیش پسندی حد سے بڑھ گئی تو ۷۵۴ھ میں محمد مظفر نے اسپر لشکر کشی کی، فوجیں شہر پناہ کے دامن میں آگئیں لیکن ابو اسحاق کو کوئی شخص خبر نہیں کرسکتا تھا، امین الدین نے کہ مقرب خاص تھا، ابو اسحاق سے کہا کہ جوش بہار نے شہر کو چمنستان بنادیا ہے، حضور ذرا بالاخانہ پر چل کر سیر فرمائیں، ابو اسحاق نے بالاخانہ پر چڑھ کر دیکھا تو چاروں طرف فوجیں پھیلی ہوئی ہیں، پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ شاہ مظفر کا لشکر ہے، مسکرا کر کہا عجب احمق ہے، اس بہار میں یوں اوقات خراب کرتا ہے یہ شعر پڑھ کر نیچے اتر آیا۔

بیا تا یک امشب تماشا کنیم　　　چو فردا شود، فکر فردا کنیم

غرض مظفر نے شیراز فتح کرلیا اور شاہ ابو اسحاق قتل کردیا گیا، خواجہ صاحب کو سخت رنج ہوا، چنانچہ ایک قطعہ لکھا جس میں اس عہد کے تمام ارباب کمال کا تذکرہ کیا

به عهد سلطنت شاه شیخ ابو اسحاق
به پنج شخص عجب ملک فارس بود آباد

نخست بادشهی همچو او ولایت بخش
که کوئے فضل بود او بعدل و بخشش و داد

دوم بقیه ابدال شیخ امین الدین
که بود داخل اقطاب و مجمع او تاد

سوم چو قاضی عادل اصیل ملت و دین
که قاضی به از و آسمان ندارد یاد

دگر چو قاضی فاضل عضد که در تصنیف
بنائے شرح مواقف بنام شاه نهاد

دگر کریم چو حاجی قوام دریا دل
که او به جود چو حاتم، همی صلا در داد

نظیر خویش نه بگذاشتند و بگذشتند
خدائے عز و جل جمله را بیامرزاد

شاہ ابو اسحاق کے مرنے کا صدمہ خواجہ صاحب کو مدت تک رہا، غزلوں میں بھی بے اختیار ابو اسحاق کا نام زبان پر آجاتا ہے،

راستی خاتم فیروزهٔ بو اسحاقی
خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

ابو اسحاق کے بعد محمد بن مظفر مبارز الدین، شیراز و فارس کا حکمران ہوا، وہ اصل میں خراسان کا باشندہ تھا، جس زمانہ میں سلطان ابو سعید نے وفات پائی اور طوائف الملوکی شروع ہوئی تو اس نے ۷۱۴ھ میں فوجیں فراہم کرکے آس پاس کے مواضع پر حملہ شروع کیا، سب سے پہلے یزد پر قبضہ کیا، رفتہ رفتہ اسکے حدود حکومت نہایت وسیع ہو گئے،

محمد بن مظفر نہایت متقشف تھا، تخت نشین ہونیکے ساتھ ہر جگہ محتسب مقرر کئے اور تمام میخانے بند کرا دئے، تذکرہ تقی الدین حسینی میں لکھا ہے کہ خواجہ حافظ نے اسی واقعہ پر یہ غزل لکھی ہے،

اگر چه باده فرح بخش و باد گلبیز است
به بانگ چنگ مخور مے که محتسب تیز است

در آستین مرقع، پیاله پنهاں کن
که همچو چشم صراحی زمانه خونریز است

ز رنگ باده بشوئید، خرقها از اشک
که موسم ورع و روزگار پرهیز است

خواجہ صاحب کے دیوان میں ایک غزل ہے جو شراب خانوں کے بند ہونیکا نہایت پر اثر مرثیہ ہے،

بود آیا کہ در میکدہ ہا بکشایند؟ گرہ از کار فرو بستۂ ما بکشایند
گیسو چنگ ببرید بمرگ مئی ناب تا ہمہ مغبچہ ہا زلف دوتا بکشایند
نامۂ تعزیت دختر رز بنویسید تا حریفان ہمہ خون از مژہ ہا بکشایند
در میخانہ بہ بستند خدایا مپسند کہ در خانۂ تزویر و ریا بکشایند
اگر از بہر دل زاہد خود بیں بستند دل قوی دار کہ از بہر خدا بکشایند

یہ غزل اسی زمانہ کی ہے،

امیر مبارز الدین کا بیٹا شاہ شجاع جسکا ذکر آگے آتا ہے اُس نے بھی اس موقع پر ایک رباعی لکھی اور خوب لکھی۔

در مجلس دہر ساز مستی پست است نہ چنگ بہ قانون و نہ دف بر دست است
رندان ہمہ ترک مے پرستی کردند جز محتسب شہر کہ بے مے مست است

امیر مبارز الدین کے بعد اسکا بیٹا شاہ شجاع فرمان روا ہوا، وہ اس سلسلہ کا سرتاج اور علم و فن کا پشت و پناہ تھا، وہ علم و فن کی گود میں پلا تھا، سات برس کے سن میں تعلیم شروع کی نو برس میں قرآن مجید حفظ کیا، قاضی عضد سے شرح مفصل وغیرہ پڑھی، حافظہ کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ کے سننے میں عربی کے چھ سات شعر یاد ہو جاتے تھے عربی اور فارسی میں اسکے مکاتبات اہل ادب میں مقبول عام ہیں، علم و فضل کی قدر دانی کی وجہ سے اسکا دربار علما و فضلا کا قبلۂ حاجات تھا، شعر بھی کہتا تھا، تقی الدین حسینی نے اپنے تذکرہ میں بہت سے اشعار لکھے ہیں، ایک رباعی یہ ہے،

احوال بدم ز خلق پنہان می کن و احوال جہاں بر دلم آسان می کن
امروز خوشم بدار و فردا با من انچہ از کرم تو می سزد آں می کن

معلوم ہوتا ہے کہ شاہ شجاع سے پہلے میخانوں کی جو روک ٹوک تھی شاہ شجاع نے آزادی تجارت کے لحاظ سے اُٹھا دی، خواجہ صاحب کے دیوان میں ایک غزل ہے وہ اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے،

غزل یہ ہے۔

سحر ز ہاتفِ غیبم رسید مژدہ بگوش　　کہ دورِ شاہ شجاع است می دلیر بنوش
شد آں کہ اہل نظر بر کنارہ می رفتند　　ہزار گونہ سخن بر دہان ولب خاموش
بہ بانگ چنگ بگوئیم آں حکایتہا　　کہ از شنیدن آں دیگ سینہ میزد جوش
رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند　　گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

معلوم ہوتا ہے شاہ شجاع کی آزاد پسندی نے میخواروں کو بہت آزاد کردیا تھا، اس بنا پر خواجہ صاحب اسکے بہت ممنون ہیں اور جو غزلیں شاہ شجاع کی مدح میں لکھی ہیں، سب میں اسکا بڑے جوش سے تذکرہ کیا ہے،

قسم بہ حشمت و جاہ و جلال شاہ شجاع　　کہ نیست باکمم از بہر مال و جاہ نزاع
بہ بیں کہ رقص کناں می رود بہ نالۂ چنگ　　کسے کہ اذن نمی داد استماع سماع

ایک اور غزل میں کہتے ہیں،

چنگ در غلغلہ آمد کہ کجا شد منکر　　جام در قہقہہ آمد کہ کجا شد متاع
عمر خسرو طلب ار نفع جہاں می طلبی　　کہ وجودے است عطا بخش و کریمی نفاع
مظہر لطف ازل روشنی چشم امل　　جامع علم و عمل جان جہاں شاہ شجاع

خواجہ صاحب نے اگرچہ جابجا اپنے اشعار میں شاہ شجاع کا نام مداحانہ انداز سے لیا ہے، چنانچہ ایک غزل میں فرماتے ہیں،

خیال آب خضر بست و جام کے خسرو　　بہ جرعہ نوشے سلطان ابوالفوارس شد

(شاہ شجاع کی کنیت)

لیکن شاہ شجاع خواجہ صاحب سے صاف نہ تھا، شجاع کے عہد میں خواجہ عماد فقیہ مشہور عالم تھے، شجاع انکا نہایت معتقد تھا،

خواجہ عماد کی ایک بلی تھی جسکو انہوں نے اس طرح تعلیم دی تھی کہ جب وہ نماز پڑھتے تو بلی بھی نماز پڑھنے کے انداز سے جھکتی اور سر اُٹھاتی، خواجہ حافظ نے اسی زمانہ میں ایک غزل لکھی،

صوفی بہ جلوہ آمد و آغاز ناز کرد　　بنیاد مکر با فلک حقہ باز کرد

اس غزل میں ظرافت سے یا خواجہ عماد کو ریاکار سمجھ کر خواجہ صاحب نے یہ شعر لکھا[1]

[1] حبیب السیر

اے کبک خوش خرام کہ خوش می روی بناز　　　غرہ مشو کہ گربہ عابد نماز کرد

غالباً شجاع کی ناراضی کی ابتدا اسی شعر سے ہوئی. رفتہ رفتہ کشیدگی زیادہ بڑھتی گئی ایک دن شجاع نے خواجہ صاحب سے کہا کہ آپکی کوئی غزل یکساں اور ہموار نہیں ہوتی ایک شعر میں تصوف، دوسرے میں مے پرستی، تیسرے میں شاہد بازی. اس طرح ہر شعر میں رنگ بدلتا جاتا ہے.

خواجہ صاحب نے کہا ہاں، لیکن ان سب برائیوں کے ساتھ بھی میری غزلیں میری زبان سے نکلکر تمام دنیا میں پھیل جاتی ہیں، بخلاف اوروں کے کہ انکا قدم شہر کے دروازے سے بھی باہر نہیں نکلتا. شجاع کو اس گستاخانہ اور آزادانہ جواب پر اور زیادہ ملال ہوا.

اتفاق یہ کہ اُسی زمانہ میں خواجہ صاحب نے ایک اور غزل لکھی جسکا مقطع تھا،

گر مسلمانی این است کہ حافظ دارد　　　وای اگر در پس امروز بود فردا اسے

شجاع نے یہ غزل سنی تو اس بہانہ سے کہ اس سے قیامت کا انکار یا کم از کم شبہ پایا جاتا ہے، خواجہ صاحب کو ستانا چاہا، خواجہ صاحب بہت پریشان ہوئے، حسن اتفاق یہ کہ مولانا زین الدین ابوبکر تائبادی حج کو جاتے ہوئے شیراز سے گزرے، خواجہ صاحب نے اُن سے یہ ماجرا بیان کیا، اُنہوں نے صلاح دی کہ مقطع کے اوپر ایک اور شعر لکھ دو جس سے مقطع دوسرے کا مقولہ بن جائے. خواجہ صاحب نے اُسی وقت کہا،

دی دو بیتم چہ خوش آمد کہ سحر گہ می گفت　　　بادف و بربط و نے، مغبچۂ ترسائے

شاہ شجاع نے ۷۸۶ھ میں انتقال کیا، اسکے بعد شاہ منصور بن محمد مظفر بادشاہ ہوا، وہ بھی بڑی شوکت و شان کا بادشاہ تھا، خواجہ صاحب نے اسکی مبارکباد میں غزل لکھی،

بیا کہ رایت منصور بادشاہ رسید　　　نوید فتح و ظفر تا بہ مہر و ماہ رسید

منصور کے عین عروج اقبال کا زمانہ تھا، تیمور نے شیراز پر حملہ کیا.

منصور اگرچہ نہایت دلیر اور صاحب عزم تھا، لیکن تیمور کی سطوت و عظمت کا غلغلہ تمام عالم میں پڑ چکا تھا، اسلیئے چاہا کہ شیراز سے نکلجائے، شہر پناہ کے دروازہ پر پہنچا تو ایک

[1] حبیب السیر

بڑھیا نے کہا کہ ایک مدت تک بادشاہی کر کے رعایا کو مصیبت میں چھوڑ کر کہاں بھاگے جاتے ہو؟ منصور وہیں سے پلٹا اور صرف دو ہزار فوج تیمور پر حملہ آور ہوا اور پے در پے تیمور کی فوجوں کو شکست دیتا ہوا قلب فوج تک پہنچ گیا، تیمور پر تلوار کا وار کیا لیکن عماری ایتاق نام ایک افسر نے بڑھ کر تلوار کو سپر پر روکا، چار دفعہ پے در پے تلوار ماری لیکن ہر دفعہ عماری ایتاق سپر ہو جاتا تھا اور تیمور کو بچا لیتا تھا، بالآخر فوجوں نے چاروں طرف سے ہجوم کر کے منصور کو قتل کر دیا، جسکا خود تیمور کو افسوس رہا، وہ کہا کرتا تھا کہ آج تک معرکوں میں کسی کو منصور کا ہمسر نہیں دیکھا۔

تیمور نے خواجہ حافظ کو طلب کیا اور کہا کہ میں نے تمام عالم کو اسلئے ویران کیا کہ سمرقند اور بخارا کو کہ میرا وطن ہے آباد کروں، تم ان کو ایک تل کے عوض میں دئے ڈالتے ہو۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا   بہ خال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

خواجہ صاحب نے کہا انہی فضول خرچیوں کی بدولت تو اس فقر و فاقہ تک نوبت پہنچی ہے،

خواجہ صاحب کی غزلیں اب چار دانگ عالم میں پھیل گئیں، چنانچہ خود کہتے ہیں،

بہ شعر حافظ شیراز می گویند و می رقصند   سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

اس زمانہ میں جسقدر سلاطین تھے سب آرزو رکھتے تھے کہ خواجہ صاحب کے کلام سے لطف اٹھائیں چنانچہ عراق، عرب، ہندوستان، ہر جگہ سے شوقیہ خطوط آئے بغداد کا فرمان روا سلطان احمد بن اویس تھا جو تمام کمالات کا مجموعہ تھا، مصوری، زرنگاری، کمان سازی، خاتم بندی وغیرہ ان تمام فنون میں بڑے بڑے صناع اسکی شاگردی کا دم بھرتے تھے، موسیقی میں یہ کمال تھا کہ خواجہ عبد القادر نے اسکی شاگردی اختیار کی اس فن میں اسکی متعدد تصنیفات ہیں، جو مدت تک گویوں کا دستور العمل رہیں، ان باتوں کے ساتھ سخن سنج اور شاعر تھا، خواجہ صاحب کو اس نے بار بار بلایا، خواجہ صاحب بھی للچائے چنانچہ بعض غزلوں میں اسکے اشارے بھی ہیں لیکن پھر رکنا باد کی خاک دامن نہیں چھوڑتی تھی، چنانچہ فرماتے ہیں،

---

۵۲ دولت شاہ

نمی دہندا جازت مرا بہ سیر و سفر　　نسیم باد مُصلّےٰ و آب رکنا باد

خواجہ صاحب نے یہ غزل لکھ کر سلطان احمد کو بھیجی۔

احمد اللہ علی معدلۃ السلطان　　احمد شیخ اویس حسن ایلخانی

خان بن خان شہنشاہ شہنشاہ نژاد　　آں کہ می زیبد اگر جان جہانش خوانی

ازگل فارسیم، غنچۂ عیشے نہ شگفت　　حبذا دجلہ بغداد دمے روحانی

بر شکن کاکل ترکانہ کہ در طالع تست　　دولت خسروی و منصب چنگیز خانی

اگرچہ خواجہ صاحب بغداد جا نہ سکے لیکن شوق کا کانٹا ہمیشہ دل میں کھٹکتا رہا چنانچہ جابجا اسکے اشارے پائے جاتے ہیں،

رہ نبردیم بہ مقصود خود اندر شیراز　　خرم آں روز کہ حافظ رہ بغداد کند

دکن میں سلاطین بہمنیہ کا دور تھا، اور سلطان شاہ محمود بہمنی مسند آرا تھا وہ نہایت قابل اور صاحب کمال تھا، عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں نہایت فصاحت اور روانی کے ساتھ شعر کہہ سکتا تھا، عام حکم تھا کہ عرب و عجم سے جو شاعر آئے اسکو پہلے قصیدہ پر ایک ہزار تنکہ جو ہزار تولہ سونے کے برابر ہوتے تھے، انعام میں دئے جائیں، اس کی قدر دانیوں کا شہرہ سُن کر خواجہ صاحب کو دکن کے سفر کا خیال ہوا لیکن خیال ہی خیال تھا، یہ خبر میر فضل اللہ کو پہنچی جو محمود کے دربار میں صدارت کے منصب پر ممتاز تھے، انہوں نے زادراہ بھیجکر طلبی کا خط لکھا، خواجہ صاحب نے اُس روپے میں سے کچھ بھانجوں کی ضروریات میں صرف کئے کچھ ادائے قرض میں صرف ہوا، جو باقی رہگیا اس سے زادراہ سفر کا سامان کر کے شیراز سے روانہ ہوئے مقام لار میں پہنچے تو وہاں ایک دوست سے ملاقات ہوئی جنکا مال اور اسباب حال ہی میں لُٹ گیا تھا، خواجہ صاحب نے جو کچھ پاس تھا انکے حوالہ کر دیا اور آپ خالی ہاتھ رہ گئے، اتفاق یہ کہ خواجہ زین الدین ہمدانی اور خواجہ محمد کاذرونی جو مشہور تاجر تھے، ہندوستان آرہے تھے، انکو یہ حال معلوم ہوا تو خواجہ صاحب کے مصارف کے کفیل ہوئے لیکن سوداگروں سے ایک نازک مزاج شاعر

ط دولت شاہ،

کی نازبرداریاں کہاں انجام پاسکتی ہیں خواجہ صاحب کو رنج ہُوا تاہم صبر کیا اور محمود شاہی جہاز پر جو دکن سے ہرمز کے بندرگاہ میں آیا تھا، اور ہندوستان کو واپس جارہا تھا سوار ہوئے، سوءِ اتفاق یہ کہ جہاز نے لنگر بھی نہیں اٹھایا تھا کہ ہوا کا طوفان اُٹھا خواجہ صاحب فوراً جہاز سے اُتر آئے اور یہ غزل لکھ کر فضل اللہ کو بھیجی،

دمے باغم بسر بُردن جہان یکسر نمی ارزد
به مے بفروش دلقِ ماکزیں بہتر نمی ارزد

شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جان درو درج است
کلاہ دلکش است اما بہ دردِ سر نمی ارزد

بہ کوئے میفروشانش بہ جامے درنمی گیرند
زہے سجادۂ تقوی کہ یک ساغر نمی ارزد

بس آسان می نمود اول غم دریا بہ بوی دُر
غلط کردم کہ یک موجش بہ صد من زر نمی ارزد

فضل اللہ نے غزل سلطان محمود بہمنی کی خدمت میں پیش کی اور تمام ماجرا بیان کیا، سلطان نے ملا محمد قاسم مشہدی کو جو دربار کے فضلاء میں سے تھے، ایک ہزار تنکہ طلا دیا کہ ہندوستان کے عمدہ مصنوعات خرید کر کے لیجائیں اور خواجہ صاحب کی خدمت میں پیش کریں،[1]

سلطان غیاث الدین سلطان سکندر فرمانروائے بنگالہ نے بھی جو ۷۶۸ھ میں تخت نشین ہُوا تھا، خواجہ صاحب کے کلام سے مستفید ہونا چاہا، چنانچہ طرح کا یہ مصرع بھیجا

ع ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود

خواجہ صاحب نے یہ غزل لکھ کر بھیجی،

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود
دیں بحث با ثلاثۂ غسالہ می رود

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

حافظ از شوق مجلس سلطان غیاث دین
غافل مشو کہ کار تو از نالہ میرود

خواجہ صاحب نے ۷۹۳ھ میں وفات پائی، خاک مصلےٰ تاریخ ہے جس میں ایک عدد کی کمی ہے،

[1] یہ پورا قصہ تاریخ فرشتہ میں ہے،

مصلّٰے ان کا محبوب مقام تھا، اسلئے دفن بھی یہیں ہوئے، سلطان بابر بہادر کے زمانہ میں محمد معمائی نے جو صدارت کی خدمت پر ممتاز تھا، خواجہ صاحب کا مقبرہ بصرف کثیر تیار کرایا جو ابتک قائم ہے، انکے نام کی مناسبت سے اس جگہ کا نام حافظیہ ہوگیا ہے ہفتہ میں ایک خاص دن مقرر ہے لوگ زیارت کو وہاں جاتے ہیں، وہیں دن بسر کرتے ہیں کھانے پکاتے ہیں چاء پیتے ہیں، کہیں کہیں شراب کا دور بھی چلتا ہے کوئی رنگین مزاج خواجہ صاحب کے نام کا حصہ خاک پر گرا دیتا ہے، خواجہ صاحب نے پانسو برس پہلے کہدیا تھا،

برسر تربت ما چوں گذری ہمت خواہ | کہ زیارت گہ رندانِ جہاں خواہد بود

اٰل اولاد خواجہ صاحب کی آزادہ مزاجی اور رندی سے قیاس ہوتا ہے کہ بیوی بچوں کے بکھیڑوں سے آزاد ہونگے لیکن واقعہ یہ ہے کہ شادی بھی کی تھی اور اولاد بھی تھی، صاحبزادہ کا نام شاہ نعمان تھا وہ ہندوستان میں آئے اور یہیں بمقام برہان پور وفات کی، ان کی قبر قلعہ اسیر کے متصل ہے،

دیوان میں ایک قطعہ ہے،

صباح جمعہ بدو سادس ربیع اول | کہ گشت فرقت آں مہ بکشتیم حاصل
بہ سال ہفتصد وشصت وچہار از ہجرت | چو آب حل بشدم ایں دقیقہ مشکل

غالباً یہ قطعہ بیوی کی وفات میں لکھا ہے، ایک اور قطعہ ہے،

دلا دیدی کہ آں فرزانہ فرزند | چہ دید اندر خم ایں طاق رنگین
بجائے لوح سیمیں در کنارش | فلک برسر نہادہ لوح سنگین

اگرچہ ممکن ہے کہ یہ قطعہ کسی اور جوانہ مرگ کی شان میں ہو، لیکن زیادہ قیاس یہی ہے کہ خود انہی کا کوئی فرزند تھا جو آغاز عمر میں گزر گیا تھا،

خواجہ صاحب کی تحصیل علم اور انکے مبلغ کا حال تذکرہ نویسوں نے مطلق نہیں لکھا، منجانہ سے جسکا حوالہ اوپر گذر چکا ہے، صرف اسقدر معلوم ہوتا ہے،

سلہ خزانہ عامرہ بہ حوالہ مرآۃ الصفا،

کہ محلہ میں جو مکتب تھا اس میں تعلیم پائی تھی لیکن کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے علوم درسیہ کی تحصیل مستعدانہ کی تھی، اکثر غزلوں میں عربی کے مصرعے جس برجستگی سے لاتے ہیں اس سے اُنکی عربیت کا اندازہ ہو سکتا ہے،

بعض غزلوں میں متعدد شعر خالص عربی میں ہیں اور سلاست و فصاحت میں جواب نہیں رکھتے،

الا اے ساربان محمل دوست ‏ ‏ ‏ ‏ الی رکبانکم طال اشتیاق
درونم خون شد از نادیدن یار ‏ ‏ ‏ ‏ الا نفیاً لایام الفراق
بیا ساقی بدہ رطل گرانم ‏ ‏ ‏ ‏ سقاک الله من کاس دهاق
نهانی الشیب من وصل العذاری ‏ ‏ ‏ ‏ سوی تقبیل خد و اعتناق

سلام الله من کر اللیالی ‏ ‏ ‏ ‏ علی ملک المکارم والمعالی
محبتک راحتی فی کل حین ‏ ‏ ‏ ‏ وذکرک مونسی فی کل حال
سبت سلمیٰ بصدغیها فوادی ‏ ‏ ‏ ‏ وروحی کل یوم لی تنادی

گر تیغ بارد در کوے آں ماہ ‏ ‏ ‏ ‏ گردن نہادیم الحکم لله
الصبر مر و العمر فانٍ ‏ ‏ ‏ ‏ یا لیت شعری حتام القاه

جا بجا عربی کے جملے اس خوبصورتی سے پیوند کرتے ہیں کہ گویا انگوٹھی پر نگین جڑ دیا ہے

چو ہست آب حیاتت بدست، تشنہ ممیر ‏ ‏ ‏ ‏ فلا تمت و من الماء کل شیءٍ حی
بخیل بوے خدا نشنود، بیا حافظ ‏ ‏ ‏ ‏ پیالہ گیر و سخن ورز و الضمان علی

قرآن مجید اور تفسیر کے ساتھ اُنکو خاص لگاؤ تھا، دیوان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ تفسیر کشاف پر حاشیہ بھی لکھا ہے، خود فرماتے ہیں،

زحافظان جہاں کس چو بندہ جمع نکرد ‏ ‏ ‏ ‏ لطائف حکما با کتاب قرآنی

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب قرآن مجید کی تفسیر میں معقول کو منقول سے تطبیق دیتے تھے فن قرات میں کمال تھا، اسکے ساتھ خوش آواز تھے، معمول تھا کہ ہمیشہ جمعہ کی رات کو مسجد کے مقصورہ میں تمام رات خوش الحانی کے ساتھ

قرآن مجید پڑھتے،

قرآن مجید حفظ یاد تھا اور اس مناسبت سے حافظ تخلص رکھتا تھا، قرآن دانی پر ان کو ناز تھا، چنانچہ اشعار میں جا بجا اسکے اشارے پائے جاتے ہیں،

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ | بہ قرآنے کہ اندر سینہ داری
صبح خیزی و سلامت طلبی چوں حافظ | آنچہ کردم ہمہ از دولت قرآن کردم

تجرد اور آزادی عام تذکروں کا بیان ہے کہ خواجہ صاحب دنیاوی تعلقات سے آزاد تھے اور سلاطین و امراسے بے نیاز رہتے تھے، لیکن خود انکے کلام سے اسکی تصدیق نہیں ہوتی انکے زمانہ میں شیراز کے جو جو فرمانروا گذرے سب کی مدح میں اُنکے قصائد موجود ہیں اور اُسی شان کے ہیں جو عام مدح گویوں کا انداز ہے شاہ شجاع کی مدح میں نونیہ قصیدہ ہے، جس میں لکھتے ہیں،

دارائے دہر، شاہ شجاع، آفتاب ملک | خاقان کامگار و شہنشاہ نوجوان
حکمش رواں چو باد براطراف بحر و بر | مہرش رواں چو روح دراعضائے انس و جان
بے طلعت تو جاں نگراید بہ کالبد | بے نعمت تو مغز نہ بندد در استخوان

سلطان ابو اسحاق کی مدح میں بڑے زور کا قصیدہ لکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے،

سپیدہ دم کہ صبا بوئے بوستاں گیرد | چمن ز لطف ہوا نکتہ بر جناں گیرد

مدح میں لکھتے ہیں،

جمال چہرۂ اسلام شیخ بو اسحاق | کہ ملک در قدمش زیب بوستان گیرد

سلطان محمود کی مدح مثنوی میں لکھی ہے جسکا ذکر آگے آئیگا منصور کے وزرا میں سے ایک بدہمت نے رائے دی تھی کہ علما، وفضلا کے وظیفے جنکی تعداد ۔ تومان تھی بند کردئے جائیں، منصور نے نہ مانا، اسپر خواجہ صاحب نے قصیدہ لکھا[1]

جوزا سحر نہاد حمائل برابرم | یعنی غلام شاہم و سوگند میخورم
منصور بن محمد غازی است حرز من | وزایں خجستہ نام براعدا مظفرم

---

[1] ہفت اقلیم امین رازی، [2] حبیب السیر،

اے شاہ شیرگیر چہ گردد، اگر شود　　در سایۂ تو ملک فراغت میسرم

جابجا خود انکے کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ سلاطین اور امرا کے نام مدحیں لکھ کر بھیجیں کہ صلہ ہات آئے، چنانچہ ایک قطعہ میں فرماتے ہیں،

شاہ ہرموزم نہ دید و بے سخن صد لطف کرد　　شاہ یزدم دید و مدحش گفتم و ہیچم نہ داد

کار شاہاں این چنیں باشد تو اے حافظ مرنج　　داور روزی رساں توفیق و نصرت شان دہاد

ایک اور قطعہ میں لکھتے ہیں،

خسروا! دادگرا! شیردلا! بحر کفا　　اے کمال تو بہ انواع ہنر ارزانی

در دو سال انچہ بیند وختم از شاہ و وزیر　　ہمہ بر بود بہ یکدم فلک چوگانی

غرض یہ بالکل غلط ہے کہ خواجہ صاحب ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے تھے، اور کسب معاش کی کچھ فکر نہ کرتے تھے البتہ فرق یہ ہے کہ اُنکے تمام معاصرین بلکہ پیشتر نہایت ذلیل اور کمینہ طریقوں سے کام لیتے تھے انوری، ظہیر فاریابی، سلمان ساوجی کس پایہ کے لوگ تھے لیکن سب کا یہ حال تھا کہ کسی کی مدح لکھی اور اُس نے صلہ کم دیا یا دیر لگائی تو ہجو شروع کر دیتے تھے اور یہانتک نوبت پہنچاتے تھے کہ تہذیب و شائستگی آنکھیں بند کر لیتی تھی، ظہیر وغیرہ کے کلام میں سیکڑوں قطعے اور قصائد ہیں جن میں اس درجہ کا گدایانہ ابرام ہے کہ انکو دیکھکر شرم آتی ہے خواجہ صاحب اس سفلہ پن سے بری ہیں، وہ مدح لکھتے ہیں صلہ ملا تو بہتر ورنہ یکلخت چُپ ہو جاتے ہیں کہ تقدیر میں نہ تھا کبھی کبھی ہلکا سا تقاضا بھی کرتے ہیں، لیکن پیرایہ نہایت لطیف ہوتا ہے، ایک قطعہ میں فرماتے ہیں،

بہ سمع خواجہ رساں اے رفیق وقت شناس　　بہ خلوتے کہ دراں اجنبی صبا باشد

لطیفۂ بہ میاں آر و خوش بخنداں‌اش　　بہ نکتۂ کہ دلش را دراں رضا باشد

پس آنگہے ز کرم اینقدر بپرس بہ لطف　　کہ گر وظیفہ تقاضا کنم روا باشد

ایک اور قطعہ میں کس لطف سے کنایہ کیا ہے،

دوش در خواب چناں دید خیالم کہ سحر　　گذر افتاد بر اصطبل شہم پنہانی

بستہ بر آخور او، استر من جو می خورد　　توبرہ افشاند و بمن گفت مرا میدانی

ہیچ تعبیرنمی دانمش ایں خواب کہ چیست   تو بفرمائے کہ در فہم نداری ثانی

یعنی میں نے کل خواب دیکھا کہ میرا گذر شاہی اصطبل خانے کی طرف ہوا، وہاں میرا خچر جو کھا رہا تھا، مجھکو دیکھ کر اس نے توبڑہ کا رخ میری طرف کر کے جھاڑا اور کہا کیوں مجھکو پہچانتے ہو اس خواب کی مجھکو کچھ تعبیر نہیں معلوم ہوتی، آپ بڑے نکتہ فہم ہیں آپ ہی بتائیں کہ اسکی تعبیر کیا ہے" مطلب یہ کہ گھوڑے کے دانے چارے کا سامان کر دیجئے،

معاشرت انکے اشعار اور جستہ جستہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت سادگی اور آزادی سے بسر کرتے تھے، حافظ قرآن تھے، قرآن مجید کے نکات اور حقائق پر درس دیتے تھے، لیکن بااین ہمہ اظہار تقدس سے نہایت نفرت رکھتے تھے صاف دل بے تکلف تھے، جو دل میں تھا وہی زبان پر تھا، کوئی برائی کرتے تو ریاکاری کے پردے میں چھپا کر نہ کرتے رکنا باد جو ایک چشمہ ہے شیراز کی مشہور سیرگاہ ہے، اب تو محض ذرا سی نہر رہ گئی ہے، خواجہ صاحب کے زمانہ میں وسیع چشمہ ہوگا، اسکے کنارے بیٹھ کر عالم آب کا لطف اٹھاتے تھے، دوست احباب جمع ہوتے، ہر قسم کی صحبتیں رہتیں، اکثر اشعار میں مزے لے لے کر اس کا ذکر کرتے ہیں،

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت   کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلا را

رکنا باد کے منبع کا نام اللہ اکبر ہے اسکا بھی ذکر جابجا کرتے ہیں،

فرق است ز آب خضر کہ ظلمات جائے اوست   تا آب ما کہ منبعش اللہ اکبر است

جو ارباب کرم ان سے اچھا سلوک کرتے تھے، اکثر غزلوں میں انکا ذکر احسانمندی کے ساتھ کرتے ہیں، یہ طریقہ اُن کا خاص انداز ہے،

بخواہ جام صبوحی بہ یاد آصف عہد   وزیر ملک سلیمان عماد بن محمود

ع چہ غم دارم چو در عالم قوام الدین حسن دارم،

دریائے اخضر فلک و کشتی ہلال   ہستند غرق نعمت حاجی قوام ما

مطرب بہ پردہ سازی شاید اگر بخواند   از طرز شعر حافظ در بزم شاہزادہ

تو بہ ایں نازکی و سرکشی اے شمع چو گل   لائق بزمگہ خواجہ جلال الدینے

باتو گرزیں پس فلک خواری کند | باز گو در حضرت دارا اے لے
خسرو آفاق بخشش کز عطا | نامۂ حاتم ز نامش گشت طے
از برائے صید دل در گردنم زنجیر زلف | چوں کمند خسرو مالک رقاب انداختی
نصرت الدین شاہ یحییٰ آں کہ تاج آفتاب | از سر تعظیم و قدرت، در تراب انداختی
اے در رخ تو پیدا انوار بادشاہی | در فکرت تو پنہاں صد حکمت الٰہی
عمرے است بادشاہا کز می تہی است جامم | اینک ز بندہ دعویٰ در محتسب گواہی

انصاف پسندی | خواجہ صاحب اگرچہ اس رتبہ کے شخص تھے کہ اُنکے تمام ہمعصر شعراُ غزل گوئی میں اُنکے سامنے ہیچ تھے، تاہم وہ سب کو نہایت ادب سے یاد کرتے ہیں بلکہ اپنے آپ کو اُن کا پیرو کہتے ہیں خواجو کرمانی کی نسبت کہتے ہیں،

اُستاد غزل سعدی است پیش ہمہ کس اما | دارد غزل حافظ طرز و روش خواجو

فخر کے جوش میں آکر کہتے ہیں،

چہ جائے گفتۂ خواجو و شعر سلمان است | کہ شعر حافظ شیراز بہ ز شعر ظہیر

لیکن انصاف سے دیکھو تو یہ اُنکے لئے ننگ ہے، ظہیر کو غزل میں اُن سے کیا نسبت؟

اس زمانہ میں کمال خجند مشہور شاعر اور صاحب کمال تھے[1] خواجہ صاحب سے ان سے بہت راہ و رسم تھی وہ خواجہ صاحب کی غزلیں منگوایا کرتے اور اپنا کلام اُنکو بھیجتے، ایک دفعہ اپنی یہ غزل بھیجی،

گفت یار از غیر ما پوشاں نظر گفتم بہ چشم | وانگہے دزدیدہ در ما می نگر گفتم بہ چشم

غزل میں یہ شعر بھی تھا،

گفت اگر سر در بیاباں غمم خواہی نہاد | تشنگاں را مژدۂ از ما ببر گفتم بہ چشم

خواجہ صاحب اس شعر پر پہنچے تو اُن پر حالت طاری ہوئی، افاقہ کے بعد کہا کہ واقعی اس شخص کا پایہ بہت بلند ہے،

کلام | تذکرہ میخانہ میں لکھا ہے کہ خواجہ صاحب کا دیوان صرف دو برس میں تیار ہوا

[1] دولت شاہ تذکرۂ کمال خجند،

لیکن یہ قطعاً غلط ہے، خلاف قیاس ہونے کے علاوہ غزلوں میں جابجا جن لوگوں کے نام آتے ہیں اُنکے زمانوں میں برسوں کا آگا پیچھا ہے،

خواجہ صاحب کی شہرت اگرچہ صرف غزل میں ہے لیکن انھوں نے قصائد اور مثنویاں بھی لکھی ہیں اور گو وہ تعداد میں کم ہیں، لیکن اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری کے تمام اصناف پر اُنکو قدرت حاصل تھی، عام خیال ہے کہ جو لوگ غزل اچھی لکھتے ہیں، قصیدہ اور مثنوی اچھی نہیں لکھتے، لیکن خواجہ صاحب کے قصیدے بھی کچھ کم نہیں اور مثنوی میں تو وہ صفائی لطافت اور زور ہے کہ نظامی اور سعدی کا دھوکہ ہوتا ہے،

سر فتنہ دارد دگر روزگار
من و مستی و فتنۂ چشم یار

فریب جہاں قصۂ روشن است
بہ بیں تا چہ زاید، شب آبستن است

ہماں مرحلہ است ایں بیابان دور
کہ گم شد در و لشکر سلم و تور

ہماں منزل است ایں جہاں خراب
کہ دیدا ست ایوان افراسیاب

چہ خوش گفت جمشید با تاج و گنج
کہ یک جو نیرزد سرائے سپنج

مغنی کجائی بہ گلبانگ رود
بہ یاد آور آں خسروانی سرود

مغنی بزن چنگ بر ارغنوں
ببر از دلم فکر دنیائے دوں

چناں برکش آہنگ ایں داورے
کہ ناہید چنگے بر قص آورے

مغنی دف و چنگ را ساز دہ
بہ یاران خوش نغمہ آوازدہ

مغنی کجائی نوائے بزن
بہ یکتائی او دوتائے بزن

بیا ساقی ایں نکتہ بشنو ز نے
کہ یک جرعہ مے بہ ز دیہیم کے

بیا ساقی آں آب اندیشہ سوز
کہ گر شیر نوشد شود بیشہ سوز

بیا ساقی آں آتش تابناک
کہ زردشت می جویدش زیر خاک

بدہ تا بگویدز آواز نے
کہ جمشید کے بود و کاؤس کے

مے دہ کہ بدنام خواہم شدن
خراب مے و جام خواہم شدن

بیا ساقیا مے کہ تا دم زنیم | قلم بر سر ہر دو عالم زنیم
سبک باش و رطل گرانم بدہ | وگر فاش نتواں نہانم بدہ
کہ ایں چرخ و ایں انجم آبنوس | بسے یاد دارد زبہرام وطوس
بدہ ساقی آں آب افسردہ را | بیا، زندہ ساز ایں دل مردہ را
کہ ہر پارہ خشتے کہ بر منظری است | سر کیقبادے و اسکندری است
ہر آں گل کہ در گلستانی بود | مہ عارض دلستانی بود
ہر آں شاخ سروے کہ در گلشنے است | قدِ دلبرو زلف سیمیں تنے است

خواجہ صاحب اگرچہ قصیدہ اور مثنوی میں بھی اساتذہ سے پیچھے نہیں لیکن انکا اصلی اعجاز غزل گوئی ہے، یہ عموماً مسلم ہے کہ عالم وجود میں آجتک کوئی شخص غزل میں انکا ہمسر نہ ہوسکا، متوسطین اور متاخرین غزل کے بزم آرا ہیں، لیکن انکو تسلیم ہے کہ خواجہ صاحب کا انداز کسی کو نصیب نہیں ہُوا،

صائب
روا است صائب اگر نیست از رہ دعوے | تتبع غزل خواجہ گرچہ بے ادبی است

"
صائب چہ تواں کرد بہ تکلیف عزیزاں | ورنہ طرف خواجہ شدن بے بصری بود

"
ع، چو شعر حافظ شیراز انتخاب ندارد،

سلیم
سلیم معتقد نظم خواجہ حافظ باش | کہ نشہ بیش بود در شراب شیرازی

عرفی نے کبھی غزل میں کسی استاد کا نام نہیں لیا، تاہم کہتا ہے،

عرفی
برآں تتبع حافظ روا است چوں عرفی | کہ دل بکاو دود در سخنوری داند

خواجہ صاحب کی غزل گوئی

غزل کی بنیاد سعدی نے ڈالی اور امیر خسرو اور حسن نے اسکو ترقی دی ساتویں صدی کا چمن اپنی بلبلوں کے زمزموں سے گونج رہا تھا کہ سلمان ساوجی اور خواجو کرمانی نے نغمہ سنجی شروع کی، سعدی اور خسرو کے آگے اگرچہ انکو فروغ نہیں ہوسکتا تھا، لیکن یہ دونوں اور اصناف سخن یعنی قصیدہ اور مثنوی میں اسقدر ممتاز اور نام آور تھے کہ اُس اثر نے غزل میں بھی کام دیا، اسکے ساتھ ان لوگوں نے غزل میں کچھ جدتیں بھی پیدا کیں جو زمانہ کے مذاق کے موافق تھیں اسلئے اور بھی مدد ملی اس سے بڑھکر یہ کہ

سلطنت نے بھی ساتھ دیا، سلمان بغداد کے ملک الشعرا اور خواجو ابو اسحاق فرمانروائے شیراز کے دربار میں سب سے ممتاز تھے،

غرض خواجہ حافظ نے آنکھیں کھولیں تو سلمان اور خواجو کا رنگ ملک پر چھایا ہوا تھا خواجہ صاحب نے دونوں کا زمانہ پایا تھا اور اتفاق یہ کہ خواجو نے جب ۷۵۳ھ میں شیراز میں وفات پائی، تو دفن اسی مقام یعنی اللہ اکبر میں ہوئے جو حافظ کی خاص سیرگاہ تھی، اور جس کی شان میں فرماتے ہیں،

فرق است زاب خضر کہ ظلمات جاے اوست تا آب ماکہ منبعش اللہ اکبر است

خواجہ صاحب نے غزل گوئی شروع کی تو خواجو کے کلام کو سامنے رکھکر کہنا شروع کیا چنانچہ خود فرماتے ہیں،

ع دارد سخن حافظ، طرز وروش خواجو،

جو غزلیں ہم طرح ہیں اُن میں جا بجا مصرعے تک لڑ گئے ہیں اور مضامین اور ترکیبیں تو کثرت سے متوارد ہیں سلمان کی غزلوں پر بھی اکثر غزلیں ہیں اور ان سے بھی اسقدر جا بجا توارد ہے کہ لوگوں کو دونوں کے کلام میں اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے یہانتک کہ بعض بعض غزلیں دونوں کے دیوانوں میں موجود ہیں اور ایک نقطہ کا فرق نہیں اسی بنا پر بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ کاتبوں نے حافظ، خواجو اور سلمان کے دیوانوں میں بہت خلط ملط کر دیا ہے،

خواجہ صاحب کے کلام کا خواجو وغیرہ سے موازنہ کرنا اگرچہ اس لحاظ سے غیر ضروری ہے کہ آج کسی کو حافظ کی ترجیح میں کلام نہیں، بلکہ خواجہ صاحب کی غزلوں کے مقابلہ میں خواجو اور سلمان کی غزلوں کا کوئی نام بھی نہیں جانتا، لیکن شاعری کی تاریخ کا یہ ایک ضروری باب ہے کہ شاعری کی ترقی کے تدریجی مدارج دکھائے جائیں، یہ ایک واقعہ ہے کہ سعدی، خواجو اور سلمان ہی کے نقاکے ہیں جن پر حافظ نے نقش آرائیاں کی ہیں اسلئے انکے باہمی امتیاز اور تدریجی ترقی کا دکھانا شعر العجم کا ضروری فرض ہے،

سعدی اور خسرو اور حسن تک غزل میں زیادہ تر عشق و عاشقی کے جذبات اور معاملات بیان کرتے تھے خواجو نے دنیا کی بے ثباتی وسعت مشرب اور رندی و مستی پر زیادہ

زور دیا، اکثر غزلیں پوری کی پوری صرف دنیا کی بے ثباتی پر ہیں مثلاً یہ غزل،

پیش صاحب نظران ملک سلیمان باد است   بلکہ آن است سلیمان کہ ز ملک آزاد است
این کہ گویند کہ بر آب نہادہ ست جہان   مشنو اے خواجہ کہ چون درنگری برباد است

یا مثلاً یہ غزل،

مشو بہ ملک سلیمان و مال قارون شاد   کہ مال و ملک بود در رہ حقیقت باد،

خواجہ صاحب نے بھی انہی مضامین پر شاعری کی بنیاد رکھی ہے،

سلمان کا خاص مذاق، مضمون آفرینی جدت تشبیہ اور صنائع لفظی ہے، خواجہ حافظ بھی ان چیزوں کو لیتے ہیں یہ اُن کا خاص انداز نہیں سعدی، خسرو اور حسن کا کلام ہمہ تن عشق سوز و گداز بیان شوق، نا امیدی اور حسرت ہے، خواجہ صاحب سعدی کی بھی تقلید کرتے ہیں، چنانچہ اکثر غزلیں اُنکی غزلوں پر لکھی ہیں، لیکن وہ فطرۃً شگفتہ مزاج اور دلولہ خیز طبیعت رکھتے تھے، اسلئے درد و غم کے نوحے ان سے اچھی طرح ادا نہیں ہوتے،

خواجہ صاحب نے سعدی، خواجو، سلمان کے جواب میں جو غزلیں لکھی ہیں، اُن میں سے بعض ہم اس لحاظ سے نقل کرتے ہیں کہ استاد اور شاگرد کے فرق مراتب کا اندازہ ہو سکے

حافظ	خواجو
دوش از مسجد سوے میخانہ آمد پیر ما	خرقہ، رہن خانہ خمار دارد پیر ما
چیست یاران طریقت بعد ازین تدبیر ما	اے ہمہ رندان مرید پیر ساغر گیر ما

خواجہ صاحب کا مطلع ہر پہلو سے خواجو کے مطلع سے بڑھا ہوا ہے اور یہ محتاج اظہار نہیں،

حافظ	خواجو
در خرابات مغان ما نیز ہمدستان شدیم	گر شدیم از بادہ، بدنام جہان تدبیر چیست
کاین چنین رفتست از روز ازل تقدیر ما	ہمچنین رفت است از روز ازل تقدیر ما

خواجہ صاحب نے خواجو ہی کے مضمون اور الفاظ کو الٹ پلٹ کر دیا ہے اور افسوس ہے کہ کچھ بھی ترقی نہیں کی، دوسرا مصرع تو حرف بحرف خواجو ہی کا مصرع ہے، پہلا مصرع

خواجو کا زیادہ برجستہ اور صاف ہے، اسکے ساتھ تدبیر اور تقدیر کا مقابلہ نہایت بے تکلفی سے آیا ہے، خواجہ صاحب نے یہ حسن بھی کھو دیا، خواجو کے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ شراب نے اگر ہمکو رسوا کر دیا تو علاج کیا؟ تقدیر یوں ہی تھی، خواجہ صاحب کہتے ہیں ہمکو بھی مغنوں کا ساتھ دینا پڑا، تقدیر میں یوں ہی لکھا تھا، خواجہ صاحب کو مضمون کے لحاظ سے بھی کچھ ترجیح نہیں،

حافظ	خواجو
عقل اگر داند کہ دل دربند زلفش چون خوش است	ما دل دیوانہ در زنجیر زلفت بستہ ایم
عاقلاں دیوانہ گردند از پے زنجیر ما	لسنہ بسا عاقلہا کہ شد دیوانہ زنجیر ما

مضمون وہی خواجو کا ہے، خواجہ صاحب نے یہ بات اضافہ کی، کہ عاقلوں کے دیوانہ زنجیر ہونے کی وجہ ظاہر کر دی، یعنی یہ کہ زلف کی قید کسقدر پُر لطف ہے، اسکے علاوہ خواجہ صاحب کا پہلا مصرع زیادہ صاف اور ڈھلا ہُوا ہے، لیکن خواجو کے مصرع میں ایک خاص نکتہ ہے جو خواجہ صاحب کے ہاں نہیں، خواجو کہتا ہے کہ میرا دیوانہ دل زنجیر زلف میں پھنس گیا یہ وہ زنجیر ہے کہ عاقل بھی اسکے دیوانے بنگئے، جس سے اس بات کی معذرت نکلتی ہے کہ جب عقلا اس زنجیر میں پھنستے ہیں تو دیوانہ کا پھنسنا کیا تعجب ہے؟ اسکے علاوہ دیوانوں کو عموماً زنجیر میں باندھتے ہیں، اسلئے اسکا دل زلف میں گرفتار ہونا قدرتی بات تھی خواجہ صاحب نے دل کی دیوانگی کا کچھ ذکر نہیں کیا، اسلئے گرفتاری کی کوئی معقول وجہ نہیں، خواجو کے ہاں عاقل و دیوانہ کے لفظی تقابل نے جو لطف پیدا کیا ہے، خواجہ صاحب کے ہاں وہ بھی نہیں،

حافظ	خواجو
تیر آہ ما ز گردوں بگذرد جاناں خموش	از خدنگ آہ عالم سوز ما غافل مشو
رحم کن بر جان خود، پرہیز کن از تیر ما	کز کمان نرم زخمش، سخت باشد تیر ما

مضمون وہی خواجو کا ہے، خواجہ صاحب نے کوئی ترقی نہیں دی بلکہ اسکے لطف کو کم کر دیا، خواجو نے معشوق سے صرف اسقدر کہا تھا کہ "غافل مشو" خواجہ صاحب "خاموش" اور

رحم کن، بر جان خود" سے معشوق کو خطاب کرتے ہیں، جو آداب عشق کے بالکل خلاف ہے،

خواجو	حافظ
ایا صبا خبرے کن مرا از اں کہ تو دانی	نسیم صبح سعادت بداں نشاں کہ تو دانی
بداں زمین گذرے کن بداں زماں کہ تو دانی	گذر بکوے فلاں کن دراں زمان کہ تو دانی
چو مرغ در طیران آئی و چوں بہ اوج رسی	تو پیک حضرت شاہی مراد و دیدہ براہست
نزول ساز دراں آشیاں کہ تو دانی	بمردمی نہ بفرمان ببر بہر آں کہ تو دانی
چناں مرو کہ غبارے بدو رسد زگذارت	بگو کہ جان ضعیفم ز دست رفت خدارا
بداں طرف چو رسیدی چناں بداں کہ تو دانی	ز لعل روح فزایت بہ بخش آں کہ تو دانی
	من ایں دو حرف نوشتم چناں کہ غیر نہ دانست
	تو ہم ز روے کرامت بخواں چناں کہ تو دانی

دونوں نے صبا کو قاصد بنایا ہے اور اسکو ہدایتیں کی ہیں، خواجو نے صبا کو مرغ سے اور معشوق کے گھر کو آشیانہ سے تشبیہ دیکر بدمزگی پیدا کر دی، لیکن اخیر کا شعر نہایت لطیف ہے یعنی اے صبا اسطرح آہستہ اور مؤدب جانا کہ گرد تک نہ اُٹھنے پائے اور بتلانے کی کیا حاجت ہے؟ تو تو خود آداب داں ہے جیسا مناسب سمجھنا کرنا

خواجہ صاحب کا مطلع نہایت برجستہ ہے، صبا کے بجائے نسیم اور اس پر صبح سعادت کی قید نے لطف پیدا کر دیا ہے، خواجو کے مصرع میں زمین و زمان کا جو لفظی تناسب تھا تکلف سے خالی نہ تھا اسلئے خواجہ صاحب نے اسکو اڑا دیا بداں زمین" کے بجائے بہ کوے فلاں" کا کنایہ زیادہ لطیف ہے، دوسرا شعر بھی نہایت لطیف ہے، کہتے ہیں کہ تو شاہی قاصد ہے میں تجھکو حکم نہیں دے سکتا البتہ عزت اور انسانیت کے اقتضا سے توقع رکھتا ہوں، اخیر شعر اور زیادہ پر مزہ ہے معشوق سے کہتے ہیں کہ میں نے یہ دو سطریں اسطرح چھپا کر لکھی ہیں کہ غیر کو خبر نہیں ہونے پائی، تم بھی اسی طرح پڑھنا جیسا مناسب ہو، یعنی کسی کو خبر نہ ہونے پائے،

خواجو	حافظ
دل دریں پیرزن عشوہ گر دہر مبند	مجو درستی عہد از جہان بے بنیاد

کیں عروسے است کہ در عقد بسے داماد است　　کہ این عجوزہ، عروس ہزار داماد است

مضمون وہی ہے لیکن خواجہ صاحب کی بندش میں ذرا حسن ہے' پہلے مصرع میں صرف اسقدر کہنا چاہیئے کہ دنیا میں دل نہ لگاؤ پھر اسکی وجہ بتانی چاہیئے کہ یہ ایک ایسی عجوزہ ہے جو ہزاروں کے نکاح میں ہے' خواجو نے پہلے ہی کہدیا کہ عجوزہ دہر سے دل نہ لگاؤ حالانکہ جب پہلے ہی عجوزہ کہدیا تو اس دلیل کی ضرورت نہیں رہی کہ وہ کثیر الازواج ہے کیونکہ بڑھیا سے یوں بھی انسان کو محبت نہیں ہوتی' خواجہ صاحب نے پہلے دنیا کی برائی کو مطلق حیثیت سے بیان کیا پھر ایک ساتھ نفرت کی دو وجہیں بتائیں یعنی یہ بوڑھی ہے اور کثیر الازواج بھی ہے'

خواجو　　　　حافظ

منزل ار یار قرین است چہ دوزخ چہ بہشت　　ہمہ کس طالب یارند چہ ہشیار چہ مست

سجدہ گر بہ نیاز است چہ مسجد چہ کنشت　　ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت

خواجو کے شعر کو خواجہ صاحب کے شعر پر ترجیح ہے' اول تو خواجو نے مطلع میں جسمیں قافیہ کی پابندی ہو جاتی ہے' ایسے وسیع مضمون کو ادا کیا ہے' اسکے ساتھ دونوں عالم کی دونوں چیزیں لے لیں یعنی دوزخ اور بہشت، مسجد اور کنشت' ان سب کے علاوہ مسجد کی تنکیر اور تعمیم اور نیاز کی قید نے جو لطف پیدا کیا ہے، خواجہ صاحب کے ہاں مطلق نہیں' خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ مسجد اور گرجا دونوں عشق کے گھر ہیں اور ایک ہی چیز ہیں خواجو دونوں کو مخالف تسلیم کر کے کہتا ہے کہ سجدۂ نیاز وہ چیز ہے کہ مخالف اور موافق ہر جگہ ادا کیا جا سکتا ہے' اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ سجدہ گہ جا میں بھی ادا کیا جائے تو مسجد بن جائے'

خواجو　　　　حافظ

کے برکنم دل از رخ جاناں کہ مہر او　　عشق تو در وجودم و مہر تو در دلم

باشیر در دل آمد و باجان بدر شود　　باشیر در بدن شد و باجان بدر شود

خواجہ صاحب نے جس طرح اس مضمون کو ترقی دی ہے محتاج اظہار نہیں'

خواجو اور خواجہ صاحب کی غزلیں اکثر ہم طرح ہیں اختصار کے لحاظ سے ہم اسی قدر پر اکتفا کرتے ہیں،

خواجہ صاحب نے سلمان کی اکثر غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں جن میں کہیں سلمان کی تقلید کی ہے، کہیں سلمان کے مضمون کو لیکر زیادہ دلکش پیرائے میں ادا کیا ہے کہیں سلمان کے آئینہ کو زیادہ جلا دیدی ہے،

سلمان	حافظ
آوازۂ جمالت تا در جہاں فتادہ	عید است و موسم گل ساقی بیار بادہ
خلقے بہ جستجویت سر در جہاں نہادہ	ہنگام گل کہ دید است بے مے قدح نہادہ

دونوں مطلع بالکل الگ الگ ہیں، ان میں کوئی موازنہ نہیں ہو سکتا،

سلمان	حافظ
سودائے زہد خشکم بر باد دادہ حاصل	گل رفت اے حریفان غافل چرا نشینید
مطرب بزن ترانہ. ساقی بیار بادہ	بے بانگ رود و چنگے بے یار و جام و بادہ

سلمان کا دوسرا مصرع نہایت برجستہ اور مستانہ ہے،

سلمان	حافظ
مائیم بستہ دل را در لعل دلکشایت	زین زہد و پارسائی بگرفت خاطر من
آں لب بہ خندہ بکشا تا دل شود کشادہ	ساقی پیالہ دہ تا دل شود کشادہ

صنعت اضداد کا دونوں نے لحاظ رکھا ہے لیکن سلمان کے الفاظ زیادہ صاف ہیں یعنی بستن و کشادن، گرفتن اور کشادن میں بھی گو یہی صنعت ہے، لیکن گرفتن کے یہ اصلی معنی نہیں ہیں بلکہ محاورہ نے یہ معنی پیدا کئے ہیں، اسکے علاوہ دل کے کھلنے کی توجیہ سلمان کے ہاں لفظاً اور معنیً دونوں لحاظ سے زیادہ روشن ہے، یعنی تو لب کھول تو ہمارا دل بھی کھلے کیونکہ ہمارا دل تیرے لبوں میں بندھا ہوا ہے، پیالہ سے دل کھلنے میں یہ بات نہیں،

سلمان	حافظ
سودائیان زلفت گرد تو حلقہ بستہ	در مجلس صبوحی دانی چہ خوش نماید
شوریدگان سویت در یکدگر فتادہ	عکس عذار ساقی بر جام می فتادہ

مضمون کے لحاظ سے دونوں شعر الگ الگ ہیں البتہ قافیہ مشترک ہے، اور سلمان کے

ہاں اچھا بندھا ہے، یوں بھی سلمان کا شعر اچھا ہے،

سعدی اور حافظ

شیخ سعدی کے جواب میں بھی گو اکثر غزلیں ہیں لیکن درحقیقت دونوں کے راستے الگ الگ ہیں اسلئے ان میں موازنہ نہیں ہوسکتا، تاہم متعدد مضامین خواجہ صاحب نے شیخ سعدی سے لئے ہیں لیکن انکے اسلوب کو اس طرح بدل دیا ہے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ موتی انہی قطروں سے بنے ہیں، مثالیں جدت اسلوب کے عنوان میں آئینگی،

خواجہ صاحب کی خصوصیات

تم نے دیکھا! خواجہ صاحب اپنے اساتذہ یا حریفوں کی طرحی غزلوں میں چنداں بلند رتبہ نہیں ہیں، انکی شاعری کے مہمات مضامین بھی انکا ذاتی سرمایہ نہیں، بلکہ خیام کے ابر قلم کے رشحات ہیں، بایں ہمہ انکی غزلوں نے دنیا میں جو غلغلہ برپا کر دیا، اسکے آگے سعدی، خسرو، خواجو، سلمان کی آوازیں بالکل پست ہوگئیں اسکا کچھ سبب ہوگا اور وہی خواجہ صاحب کی خصوصیات شاعری ہیں، یہ خصوصیات اگرچہ درحقیقت ذوقی اور وجدانی ہیں جو صرف مذاق سلیم سے تعلق رکھتے ہیں تاہم جس قدر ضبط تحریر میں آسکتا ہے وہ حسب ذیل ہے،

حقیقت یہ ہے کہ خواجہ صاحب کی شاعری میں متعدد ایسی باتیں جمع ہوگئی ہیں جنکا مجموعہ اعجاز بن گیا ہے، ممکن ہے کہ ان میں سے ایک ایک چیز کو الگ الگ لیں تو اوروں کے ہاں نکل آئے لیکن خواجہ صاحب کا کلام ع "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کا مصداق ہے،

ان میں بعض اوصاف ایسے بھی ہیں جو اوروں کے کلام میں اس درجہ تک نہیں پائے جاتے، مثلاً روانی، برجستگی اور صفائی، یہ وصف سعدی اور خسرو کا بھی بہ الامتیاز ہے لیکن یہ ایسی چیز ہے جسکے مدارج کی حد نہیں، ممکن ہے کہ ایک شعر خود نہایت روان اور صاف و شستہ ہو، لیکن ایک اور شعر اس سے بھی بڑھ کر ہو، اور اس سے بھی بڑھ کر کوئی اور شعر ہو جس طرح نغمہ اور حسن کہ انکے مدارج ترقی کی کوئی حد نہیں،

ایک اور چیز جو خواجہ صاحب کی شاعری کا نہایت نمایاں وصف ہے جوش بیان ہے اسی طرح تنوع مضامین بھی ان سے پہلے اس قدر نہ تھا چنانچہ ہم انکے کلام کے تمام

اوصاف کو الگ الگ عنوان کے ذیل میں لکھتے ہیں،

جوش بیان فارسی شاعری باوجود ہزاروں گوناگوں اوصاف اور خیالات کے جوش بیان سے خالی ہے، فردوسی اور نظامی کے ہاں خاص خاص موقعوں پر جوش بیان کا پورا زور ہے، لیکن وہ اورونکے خیالات اور واردات ہیں، خود شاعر کے حالات اور جذبات نہیں بخلاف اسکے خواجہ حافظ کے کلام میں جو جذبات ہیں وہ خود اُنکے واردات اور حالات ہیں اسلئے اُنکو وہ اس جوش کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ ایک عالم چھا جاتا ہے جوش بیان کے لئے کسی مضمون یا کسی خیال کی خصوصیت نہیں، ہر مضمون اور ہر خیال جوش کے ساتھ ظاہر کیا جا سکتا ہے، البتہ اختلاف نوعیت کی وجہ سے صورتیں بدل جاتی ہیں، مثلاً شاعر جوش مسرت کا بیان کرتا ہے تو اس انداز سے کرتا ہے کہ گویا آپے سے باہر ہوا جاتا ہے قہر اور غضب کا بیان ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا مرقع اُلٹ دیگا، دنیا کی بے ثباتی مذکور ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام عالم ہیچ ہے، غصہ اور غضب کا مضمون ہے نظر آتا ہے کہ مُنہ سے انگارے برس رہے ہیں،

خواجہ صاحب نے سیکڑوں گوناگوں خیالات ادا کئے ہیں اور جس خیال کو ادا کیا ہے اس جوش کے ساتھ کیا ہے کہ سُننے والے پر وہی اثر طاری ہوجاتا ہے۔ جو خود خواجہ صاحب کے دل میں ہوتا ہے،

زمانہ کی بے اعتباری	اعتمادے نیست بر دور جہاں	بلکہ بر گردون گرداں نیز ہم
	سرود مجلس جمشید گفتہ اند ایں بود	کہ جام بادہ بیاور کہ جم نخواہد ماند
استقلال و ثابت قدمی	حلقۂ پیر مغانم ز ازل در گوش است	ما ہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود
وجد و ذوق	در نمازم خم ابروئے تو ام یاد آمد	حالتے رفت کہ محراب بہ فریاد آمد
اثر عشق کی لازوالی	از حدیث سخن عشق ندیدم خوشتر	یادگارے کہ دریں گنبد دوار بماند
[illegible]	بادہ نخور غم مخور و پند مقلد مشنو	اعتبار سخن عام چہ خواہد بودن
معشوق کی دلنوازی	می ترسم از خرابی ایمان کہ می برد	محراب ابروے تو حضور نماز من
مستی کی تمنا	زاں پیشتر کہ عالم فانی شود خراب	مارا بہ جام بادۂ گلگوں خراب کن

فیض روح القدس ارباز مدد فرماید — دیگران ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم — از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

داستان در پردہ می گویم ولے — گفتہ خواہد شد بہ دستاں نیز ہم

محتسب داند کہ حافظ می خورد — آصف ملک سلیمان نیز ہم

رنگ و تزویر پیش ما نبود — شیر سرخیم و افعی سیہیم

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر — تا سحرگہ ز کنار تو جواں برخیزم

اے نور چشم من سخنے ہست گوش کن — تا ساغرت پر است بنوشان و نوش کن

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات — با دُرد کشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد

سوز آہ سینۂ سوزان من — سوخت ایں افسردگان خام را

کمال کسی پر محمود نہیں
ہمہ تن فنا و محبت ہونا
اعلان راز
ظاہر و باطن یکساں ہونا
معشوق کی روح افزائی
جود و کرم کی ترغیب
غریبوں کو ستانے کا انجام
سوز دل کا اثر

جوش بیان کا اصلی موقع وہاں آتا ہے جہاں کسی خاص جذبہ کا اظہار کرنا ہوتا ہے مثلاً رنج و غم فخر و ناز، غیظ و غضب، عشق و محبت،

خواجہ صاحب پر رندی اور سرمستی کا جذبہ غالب تھا انکے تمام کلام میں یہ جذبہ اس جوش اور زور کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ فارسی شاعری کی ہزار سالہ زندگی میں اسکی نظیر نہیں ملسکتی اسکے اندازہ کرنیکے لئے پہلے ایک رند سرمست کی حالت کا تصور باندھو کہ جب وہ مستی کے جوش و خروش میں ہوتا ہے تو اسکے دل میں کیا کیا خیالات آتے ہیں وہ مزے میں آکر ہنکارتا ہے کہ مجھکو نام و ننگ کی کچھ پروا نہیں ساقی پیالہ پر پیالہ دئے جا اور کسی سے نہ ڈر زاہد کیا جانتا ہے کہ جام میں کیا کیا گوناگوں عالم نظر آتے ہیں مطرب کہدو یہ ترانہ گائے کہ تمام دنیا پر میری حکومت ہے کل خاک میں جانا ہی ہے، آج کیوں نہ عالم میں غلغلہ ڈالدوں تم مجھے حقیر سمجھتے ہو شراب خانہ میں آؤ تو تمکو نظر آئے کہ میری کیا شان ہے؟ میرے ہاتھ میں جو پیالہ ہے جمشید کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا میں شراب آج سے نہیں پیتا، مدت سے آسمان اس غلغلہ سے گونج رہا ہے، صوفی اور واعظ رازدانی کی شیخیاں بگھارتے ہیں حالانکہ جو کہتے ہیں مجھی سے سن لیا تھا۔ یہ عالم لطف اُٹھانے کے لئے کافی نہیں، آؤ آسمان کی چھت توڑ کر ایک اور نیا عالم بنائیں،

خواجہ صاحب ان خیالات کو اسی جوش کے ساتھ ادا کرتے ہیں جس طرح ایک مست کے دل میں آتے ہیں،

ابھی یہ بحث چھوڑ دو کہ خواجہ صاحب کی شراب معرفت کی شراب ہے یا انگور کی مستی دونوں میں ہے اور یہاں صرف مستی سے غرض ہے،

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم ۔ فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم

آؤ پھول برسائیں اور شراب پیالے میں ڈالیں ۔ آسمان کی چھت توڑ ڈالیں اور نئی بنا ڈالیں

اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد ۔ من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

اگر غم عاشقوں کے مقابلہ کیلئے فوج تیار کرے تو ہم اور ساقی دونوں ملکر اسکی جڑ اکھاڑ کر پھینکدیں،

چو در دست ست رود خوش بزن مطرب سرود خوش ۔ کہ دست افشاں غزل خوانیم و پاکوباں سر اندازیم

رند مزے میں آکر جب گاتا ہے تو دونوں طرف ہاتھ جھٹکتا ہے، پاؤں زمین پر دے دے مارتا ہے، سر کو دائیں بائیں جھٹکے دیتا ہے، یہ شعر بعینہ اس حالت کی تصویر ہے،

ساقی بہ نور بادہ برافروز جام ما ۔ مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم ۔ اے بیخبر ز لذت شرب مدام ما

ساقیا برخیز و دردہ جام را ۔ خاک بر سر کن غم ایام را

گرچہ بدنامی است نزد عاقلاں ۔ ما نمی خواہیم ننگ و نام را

تا ز میخانہ و مے نام و نشاں خواہد بود ۔ سر ما خاک رہ پیر مغاں خواہد بود

حلقہ پیر مغانم ز ازل در گوش است ۔ با ہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود

بر سر تربت ما چوں گذری ہمت خواہ ۔ کہ زیارت گہ رندان جہاں خواہد بود

عاقبت منزل ما وادی خاموشاں است ۔ حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

حاصل کارگہ کون و مکاں اینہمہ نیست[1] ۔ بادہ پیش آر کہ اسباب جہاں اینہمہ نیست

ساقی بیار بادہ و با مدعی بگو ۔ انکار ما مکن کہ چنیں جام جم نداشت

خوش وقت رند مست کہ دنیا و آخرت ۔ از دست داد و ہیچ غم بیش و کم نداشت

[1] یعنی کچھ ایسی کائنات نہیں،

ما می به بانگ چنگ نه امروز می خوریم   پس دیر شد که گنبد چرخ این صدا شنید

سر خدا که عارف و سالک بکس نه گفت   در حیرتم که باده فروش از کجا شنید

من ترکِ عشق بازی و ساغر نمی کنم   صد بار توبه کردم و دیگر نمی کنم

من رند و عاشق و آنگاه توبه   استغفر الله استغفر الله

ما زہد و تقویٰ کمتر شناسیم   یا جام باده یا قصّه کوتاه

شراب و عیش نہاں چیست کار بے بنیاد   زدیم بر صف رندان و ہر چه بادا باد

سخن درست بگویم نمی توانم دید   که می خورند حریفان و من نظاره کنم

گدائے میکده ام لیک وقت مستی بیں   که ناز بر فلک و حکم بر ستاره کنم

نه قاضیم نه مدرس نه مفتیم نه فقیه   مرا چکار که منع شراب خواره کنم

با من خاک نشیں خیز و سوئے میکده آئے   تا به بینی که دراں حلقه چه صاحب جاہم

اے خوشا حالت آں مست که در پائے حریف   سر و دستار نه داند که کدام انداز د

خوشتر از فکر مے و جام چه خواہد بودن   چوں خبر نیست که انجام چه خواہد بودن

پیر میخانه چه خوش گفت معمای دوش   از خط جام که فرجام چه خواہد بودن

باده خور غم مخور و پند مقلد مشنو   اعتبار سخن عام چه خواہد بودن

غم دنیائے دنی چند خوری باده بخور   حیف باشد دل دانا که مشوش باشد

ساقی بیا که شد قدح لاله پُر ز مے   طامات تا بچند و خرافات تا به کے

شیخم به طنز گفت حرام است مے مخور   گفتم بروی گوش بهر خر نمی کنم

کِہ برد؟ به نزد شاہاں زمن گدا پیامے   که بکوے مے فروشاں دو ہزار جم به جامے

صبح است ژاله می چکد از ابر بہمنے   برگ صبوح ساز و بزن جام یک منے

ساقی بہوش باش که غم در کمین ما است   مطرب نگاه دار ہمیں ره که میزنی

بیا که رونق این کارخانه کم نشود   ز زہد ہمچو توئی یا ز رندی چو منی

ما مرد زہد و توبه و طامات نیستم   با ما به جام باده صافی خطاب کن

زاں پیشتر که عالم فانی شود خراب   ما را به جام باده گلگوں خراب کن

یہ مضامین کہ دنیا چار دن کی چاندنی ہے اسکے لئے جھگڑوں اور بکھیڑوں میں پڑنے سے کیا حاصل، کھاؤ پیؤ لطف اُٹھاؤ اور دنیا سے گذر جاؤ، سو سو طرح بندھ چکے ہیں، اور خیام کی تمام شاعری کی یہی کائنات ہے لیکن خواجہ صاحب کے ہاں جو جوش بیان پایا جاتا ہے فارسی شاعری اس سے خالی ہے،

شراب تلخ دہ ساقی کہ مرد افگن بود زورش — کہ تا لختے بیاسایم ز دنیا و ز شر و شورش
کمند صید بہرامے بیفگن جام مے بردار — کہ من پیمودم این صحرا نہ بہرام است نے گورش
مے دو سالہ و محبوب چاردہ سالہ — ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر
دو یار زیرک و از بادہ کہن دو منے — فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے
من این مقام بہ دنیا و آخرت ندہم — اگرچہ درپیم افتند خلق انجمنے

دنیا کی شان و شوکت، جاہ و جلال، دھوم دھام، انکو للچانا چاہتے ہیں، لیکن اُنکے دل سے یہ صدا آتی ہے کہ تا کے؟ یہ نیرنگیاں کب تک؟ اس جھوٹے طلسم کے لئے زندگی کو کیوں آلودہ کیا جائے،

بس کن ز کبر و ناز کہ دیدہ است روزگار — چین قبائے قیصر و طرف کلاہ کے
حاصل کارگہ کون و مکان اینہمہ نیست — بادہ پیش آر کہ اسباب جہان اینہمہ نیست
بیفشاں جرعۂ بر خاک و حال اہل شوکت بیں — کہ از جمشید و کیخسرو ہزاراں داستاں دارد
گرہ بہ باد مزن گرچہ بر مراد وزد — کہ این سخن بہ مثل باد با سلیمان گفت

یہ فلسفہ خواجہ صاحب پر اسقدر چھا گیا تھا کہ بوریائے فقر انکو مسند جمشید نظر آتا تھا وہ خود اس خیال میں مست تھے اور چاہتے تھے کہ اور لوگ بھی اس عالم کا لطف اُٹھائیں وہ مناظر قدرت سے بہار سے آب رواں سے سبزہ و مرغزار سے، لطف اُٹھاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ خوش عیشی کا یہ عالم ہر شخص کو نصیب ہو سکتا ہے، اس بنا پر وہ تمام دنیا کو خوش عیشی کے فلسفہ کی تعلیم دیتے ہیں، یونان میں اپکیورس کی بھی یہی تعلیم تھی، لیکن وہ فلسفی تھا اسلئے جو کچھ کہتا تھا فلسفہ کے انداز میں کہتا تھا، خواجہ صاحب شاعر تھے اور فطری شاعر تھے اسلئے اُنہوں نے خوش عیشی کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ زمین سے آسمان

تک جوش مسرت سے لبریز نظر آتا ہے اور یہی شاعری کا اصلی کمال ہے،

عید است ساقیا قدحے پر شراب کن ‏ دور فلک درنگ ندارد شتاب کن
ہش باده کہ ایام غم نخواہد ماند ‏ چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند
دمے باغم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد ‏ بمے بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد
شکوه تاج سلطانی کہ بیم جاں درو درج است ‏ کلاه دلکش است اما بدرد سر نمی ارزد
غم دنیائے دنی چند خوری باده بخور ‏ حیف باشد دل دانا کہ مشوش باشد
خوشتر از فکر مے و جام چہ خواہد بودن ‏ چوں خبر نیست کہ انجام چہ خواہد بودن

بہار سے لطف اٹھاتے ہیں،

نفس باد صبا مشک فشاں خواہد شد ‏ عالم پیر دگر باره جواں خواہد شد
ارغواں جام عقیقی بسمن خواہد داد ‏ چشم نرگس بشقائق نگراں خواہد شد
مطربا مجلس انس است غزل خوان و سرود ‏ چند گوئی کہ چنیں است و چناں خواہد شد
بلبل ز شاخ سرو بہ گلبانگ پہلوی ‏ میخواند دوش درس مقامات معنوی
مرغان باغ قافیہ سنجید و بذلہ گو ‏ تا خواجہ میخورد بہ غزل ہائے پہلوی
درویشم و گدا و برابر نمی کنم ‏ پشمین کلاه خویش بہ صد تاج خسروی
خوش فرش بوریا و گدائی و خواب امن ‏ کیں عیش نیست درخور اورنگ خسروی
آخر الامر گل کوزه گراں خواہی شد ‏ حالیا فکر سبو کن کہ پر از باده کنی
اے کہ در کوئے خرابات مقامے داری ‏ جم وقت خودی ار دست بہ جامے داری
اے کہ با زلف و رخ یار گذاری شب و روز ‏ فرصتت باد کہ خوش عیش دوامے داری
می خواہ گل افشاں کن از دہر چہ می جوئی ‏ ایں گفت سحر گہ گل بلبل تو چہ مے گوئی
مسند بہ گلستاں بر شاہد و ساقی را ‏ لب گیری و رخ بوسی می نوشی و گل بوئی

خواجہ صاحب کے اس خاص کمال (جوش بیان) کا اندازه اسوقت اچھی طرح ہو سکتا ہے جب انہی مضامین کے متعلق اور اساتذه کے کلام کا موازنہ کیا جائے نمونہ کے لئے ہم صرف چند شعروں پر اکتفا کرتے ہیں،

سلمان

رندی و عاشقی و قلاشی
ہیچ شک نیست کہ در ما ہمہ ہست

در دل صافی از اہل صلاح و زہد مجوے
کہ این نشانۂ رندان دُرد آشام است

لکن ملامت رندان دگر بہ بدنامی
کہ ہرچہ پیش تو ننگ است نزد ما نام است

غرض از کعبہ و بت خانہ توئی سلمان را
چگونہ خانۂ بے خانہ خدا باید رفت

من از آں روز کہ در بند توام آزادم
بادشاہم چو بدست تو اسیر افتادم

اے گنج تو شدار در خستگاں نظر کن
مرہم بدست ما را مجروح میگزاری

حافظ

عاشق و رند و نظربازم و میگویم فاش
تا بدانی کہ بہ چندیں ہنر آراستہ ام

راز درون پردہ ز رندان مست پرس
کین حال نیست صوفی عالیمقام را

گرچہ بدنامی است نزد عاقلاں
مانمی خواہیم ننگ و نام را

جلوہ بر من مفروش اے ملک الحاج کہ تو
خانہ می بینی و من خانہ خدا می بینم

فاش می گویم و از گفتۂ خود دلشادم
بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم

یارب ایں باکہ تواں گفت کہ آں نوشیں لب
کُشت مارا و دمِ عیسی مریم با اوست

بدائع الاسلوبی یعنی جدت و خوبی ادا

اکثر مضامین ایسے ہیں جو مدتوں سے بندھتے آتے تھے، اچھے بندھے نہ تھے لیکن بجائے خود معمولی مضمون تھے، جن میں کوئی دلفریبی نہ تھی خواجہ صاحب کے حسن اسلوب اور جدت ادا نے اسکو نہایت دل آویز اور لطیف کر دیا، مثلاً معشوق کی آنکھ کو سب مخمور، سرشار اور مست کہتے آئے ہیں خواجہ صاحب اسی بات کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں،

ہر کس کہ بدید چشم او گفت
کو محتسبے کہ مست گیرد

یعنی جس نے اس کی آنکھ دیکھی بول اُٹھا کہ کہیں محتسب نہیں کہ مست کو گرفتار کرے، معشوق کی زلف کو بنفشہ پر ترجیح دینا معمولی بات ہے خواجہ صاحب اسکو اس طرح ادا کرتے ہیں،

بنفشہ طرۂ مفتول خود گرہ میزد
صبا حکایت زلف تو در میان انداخت

یہ مضمون اس طرح ادا کیا ہے کہ تصویر کھینچدی ہے، بنفشہ گویا ایک حسین او رجمیلہ ہے اسکی زلفیں نہایت خوبصورت اور گھونگروالی ہیں، وہ بڑے ناز و انداز سے بیٹھی ہوئی چوٹی میں گرہیں لگا رہی ہے، اتنے میں کہیں سے صبا آنکلی اس نے معشوق کی زلفوں کا ذکر چھیڑ دیا، بنفشہ عین غرور اور ناز کی حالت میں شرما کر رہ گئی،

جدّت میں جدّت یہ ہے کہ نتیجہ یعنی بنفشہ کا شرمندہ ہوجانا بیان نہیں کیا کہ اسکے اظہار کی ضرورت نہیں،

زاہد کی نسبت یہ خیال ظاہر کرنا مقصود تھا کہ گو وہ شراب وغیرہ استعمال نہیں کرتا تاہم چونکہ اسکی فتوحات اور نذر ریا اور زور کے ذریعہ سے ہاتھ آتی ہیں اسلئے وہ بھی حرام سے کم نہیں، اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے،

ترسم کہ صرفہ نبرد روز بازخواست   نان حلال شیخ ز آب حرام ما

یعنی مجھے ڈر ہے کہ قیامت کے دن شیخ کی حلال روٹی میرے آب حرام (شراب) سے بازی لیجا سکے، جدت اسلوب کے ساتھ ہر لفظ ایک خاص لطف پیدا کرتا ہے،

ترسم سے دکھانا ہے کہ میں اس بات کو بطور شماتت کے نہیں کہتا، بلکہ ہمدردی کے لحاظ سے مجھکو کھٹکا لگا ہوا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو، قیامت کو بازخواست کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ کھوٹے کھرے کے پرکھنے کا دن ہے، نان حلال اور آب حرام کے مقابلہ نے علاوہ صنعت اضداد کے جو نہایت بے تکلفی سے ادا ہوئی ہے، اصل مضمون کو نہایت بلیغ کر دیا ہے، یعنی زاہد کی روٹی باوجود حلال ہونے کے میرے آب حرام سے بازی نہ لیجائے تو زاہد کیلئے کس قدر افسوس کا سبب ہوگا،

فقیہ مدرسہ دی مست بود و فتوی داد   کہ مے حرام ولے بہ ز مال اوقاف است

اس طرز ادا کی بلاغت پر لحاظ کرو، اول تو اس امر کا اعتراف کہ شراب گو حرام سہی لیکن مال وقف سے بہر حال اچھی ہے، خود فقیہ کی زبان سے کرایا ہے، اسکے ساتھ مست کی قید لگا دی ہے، جس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ فقیہ سچی بات کا اظہار یوں کا ہیکو کرتا مست تھا، اسلئے پس و پیش کا خیال نہ آیا اور جو دل میں تھا زبان سے کہہ گیا،

زاہد خدا کا تصور جو دلوں میں قائم کراتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ مجسم قہر و غضب ہے ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہوتا رہتا ہے اور نہایت بے رحمانہ سزائیں دیتا ہے لیکن اہل نظر کے نزدیک خدا سرتاپا لطف اور رحم ہے اس مضمون کو اسطرح ادا کرتے ہیں

پیر دردی کش ما گرچہ ندارد زر و زور　　خوش عطا بخش و خطا پوش خدائے دارد

"خدائے" کی تنکیر نے کیا لطف پیدا کیا ہے، گویا ایسا خدا ہست غیر معروف ہے زاہد وغیرہ سے اس سے مطلق شناسائی نہیں،

یہ مضمون کہ میں نے معشوق کا انتخاب ایسی دیدہ دری سے کیا کہ ہر شخص نے اسکی داد دی، اسکو یوں ادا کرتے ہیں،

ہر کس کہ دید روے تو بوسید چشم من　　کارے کہ کرد دیدۂ من بے بصر نکرد

یعنی جس نے تیرا چہرہ دیکھا میری آنکھیں چوم لیں کہ کیا عمدہ انتخاب ہے میری آنکھ نے جو کام کیا دیکھ بھال کے کیا،

شاہد بازی کی نسبت یہ عذر خواہی کہ اور لوگ بھی تو کرتے ہیں، عام مضمون ہے سعدی فرماتے ہیں،

گر کند میل بہ خوباں دل من خردہ مگیر　　کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

اسی مضمون کو خواجہ صاحب جدید اور لطیف اسلوب سے ادا کرتے ہیں،

من ارچہ عاشقم و رند و مست نامہ سیاہ　　ہزار شکر کہ یاران شہر بے گنہ اند

شعر کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ میں اگرچہ گنہگار اور نالائق ہوں لیکن خدا کا شکر ہے کہ شہر میں اور لوگ پاکیزہ اخلاق ہیں جنکی برکت سے میری شامت اعمال کا اثر اوروں پر نہ پڑیگا لیکن حقیقت میں یہ اوروں پر درپردہ چوٹ ہے، سعدی نے کھلے لفظوں میں کہدیا، خواجہ صاحب کنایۃً ادا کرتے ہیں،

خدا کے عفو کے بھروسہ پر شراب پینے کی جرات اس پیرایہ میں دلاتے ہیں،

بیار بادہ بنجو زاں کہ پیر میکدہ دوش　　بسے حدیث غفور و رحیم و رحمن گفت

اس موقع پر خدا کے متعدد نام جن سے رحم اور مغفرت کا اظہار ہوتا ہے، لانا

کس قدر بلاغت ہے،

دنیا کی بے ثباتی کو اس انداز میں ادا کرتے ہیں،

سرود مجلس جمشید گفتہ اند ایں بود کہ جام بادہ بیاور کہ جم نخواہد ماند

مطلب یہ ہے کہ دنیا کا کچھ اعتبار نہیں اسلیئے یہ چند روزہ زندگی عیش و عشرت میں گذار دو کل خدا جانے کیا ہوگا، اس مضمون کیلئے کسقدر بلیغ پیرایہ اختیار کیا ہے عیش اور کامیابی میں جمشید سب سے نام آور ہے، تاہم خود اُسکی مجلس میں یہ راگ گایا جاتا تھا اس سے بڑھکر دُنیا کی بے ثباتی کا کیا ثبوت ہوگا جمشید کا نام اس بے حقیقی سے لینا کہ القاب و خطاب ایک طرف پورا نام بھی نہیں اس مضمون کو نہایت با اثر کر دیتا ہے،

شرم ازاں چشم سیہ بادش و مژگاں دراز ہر کہ دل بردن او دیدہ و دراں کار من است

اس مضمون کے ادا کرنیکا معمولی پیرایہ یہ تھا کہ جو شخص میرے اوپر اعتراض کرتا ہے اگر معشوق کو دیکھ لیتا تو اعتراض سے باز آتا، اسکو یوں ادا کیا ہے کہ جو شخص میرے دل باختگی پر اعتراض کرتا ہے اسکو معشوق کی آنکھ اور مژگان سے شرم نہیں آتی یعنی مجھ پر اعتراض کرنا گویا آنکھوں کی دلربائی سے انکار کرنا ہے،

یارب بہ کہ بتواں گفت ایں نکتہ کہ در عالم رخسارہ بہ کس ننمود آں شاہد ہر جائی

اس مضمون کو کہ شاہد مطلق (خدا) کا جلوہ اگرچہ ایک ایک ذرہ میں چمکتا ہے لیکن اسکی حقیقت کسی کو معلوم نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی، کس بدیع اسلوب سے ادا کیا ہے یعنی کس قدر تعجب ہے کہ ہر جائی بھی ہے اور آجتک کسی نے اسکو دیکھا بھی نہیں، وصالی نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے،

اے کہ در ہیچ جانہ داری جا بو العجب ماندہ ام کہ ہر جائی

لیکن خواجہ صاحب کی طرز ادا میں لطافت کے علاوہ اسلوب بھی زیادہ معنی خیز ہے،

بدیع الاسلوبی کے اچھی طرح سے سمجھ میں آنیکے لئے ہم چند مثالیں لکھتے ہیں، جن سے ظاہر ہوگا کہ ایک مضمون جو کسی اور اُستاد نے باندھا تھا خواجہ صاحب نے خوبی ادا سے اسکو کسقدر بلند رتبہ کر دیا ہے،

سعدی	حافظ
توگرچہ امیر و ما فقیریم	درراہ عشق، فرق غنی وفقیر نیست
دلداری دوستاں ثواب است	اے بادشاہ حسن سخن باگدا بگو

سعدی	حافظ
اے بلبل اگر نالی من با تو ہم آوازم	بنال بلبل اگر با منت سر یاری است
تو عشق گلے داری من عشق گل اندامے	کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاری است

شیخ صاحب کہتے ہیں کہ بلبل اگر تو رونے پر آمادہ ہو تو میں بھی تیرا ساتھ دینے کو موجود ہوں مجھ کو تجھ سے ہمدردی کی یہ وجہ ہے کہ تو گل پر عاشق ہے اور میرا معشوق بھی گل اندام ہے" غرض شیخ نے ہمدردی کی وجہ معشوق کا یک گونہ اشتراک قرار دیا ہے، لیکن یہ پہلو نزاہت اور غیرت سے ذرا ہٹا ہوا ہے اسلئے خواجہ صاحب ہمدردی کی وجہ صرف عشق کی شرکت قرار دیتے ہیں، معشوق کے اشتراک سے کوئی تعلق نہیں اسکے ساتھ خود بلبل کے پیرو نہیں بنتے بلکہ بلبل کو اپنا پیرو بناتے ہیں "دو" کے لفظ پر جو زور دیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عشق کے صحیح دعویدار صرف دو ہی ہوسکتے ہیں عاشق اور بلبل ان باتوں کے ساتھ زار اور زاری کے اجتماع اور مطلع ہونے نے شعر کو نہایت بلند پایہ کر دیا ہے،

سعدی	حافظ
اے گنج نوشدارو درخستگاں نظر کن	چہ عذر از بخت خود گویم کہ آں عیار شہر آشوب
مرہم بدست و مارا مجروح می گزاری	بہ تلخی کشت حافظ را و شکر در دہاں دارد

خواجہ صاحب نے شیخ کے مضمون کا پیرایہ کس قدر لطیف کر دیا ہے،

سلمان	حافظ
رندی و عاشقی و قلاشی	عاشق و رند و نظر بازم و میگویم فاش
ہیچ شک نیست کہ در ما ہمہ ہست	تا بدانی کہ بچندیں ہنر آراستہ ام

چستی بندش اور جوش بیان کے علاوہ سلمان صرف یہ کہتے ہیں کہ مجھ میں یہ سب

باتیں ضرور ہیں اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ ان باتوں پر انکو فخر ہے یا ندامت، خواجہ صاحب صرف ان اوصاف کے پائے جانے پر قناعت نہیں کرتے بلکہ انکو باعث ناز قرار دیتے ہیں، ع تا بدانی کہ بچندیں ہنر آراستہ ام،

سلمان	حافظ
مکن ملامت رنداں دگر بہ بدنامی	گرچہ بدنامی است نزد عاقلاں
کہ ہرچہ پیش تو ننگ است نزد ما نام است	مانمی خواہیم ننگ و نام را

سلمان کہتے ہیں کہ ہمکو ملامت نہ کرو کیونکہ جس چیز کو تم ننگ سمجھتے ہو وہی ہمارے نزدیک ناموری کی بات ہے، اس مضمون میں یہ نقص ہے کہ اس سے اسقدر پھر ثابت ہوتا ہے کہ انکو نام کی خواہش ہے، گو وہ نام اوروں کے نزدیک ننگ ہے، خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہمکو نام و ننگ سے سرے سے غرض ہی نہیں اور رندی کی یہی شان ہے،

سلمان	حافظ
شاہد آں نیست کہ دارد خط سبز و لب لعل	شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد
شاہد آن است کہ ایں دارد و آنے دارد	بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

دیدہ ام طلعت زیباش کہ آنے دارد۔
ایں ہمہ شیفتہ من از پے آں می گردم۔

اصل مضمون یہ تھا کہ معشوق پن صرف تناسب اعضا کا نام نہیں بلکہ اصلی چیز ناز و انداز ہے، سلمان نے اس مضمون کو جسطرح ادا کیا، اس میں ایک اور لفظی خوبی یعنی این و آن کا مقابلہ شامل کر دیا جس سے اصل مضمون کا زور بٹ گیا، اس لئے خواجہ صاحب نے اصل مضمون کو صنعت لفظی سے بالکل الگ کر کے بیان کیا لیکن این و آں کا لطف بھی ہاتھ سے دینے کے قابل نہ تھا اسلئے دوسرے موقع پر اسکو زیادہ نمایاں پیرایہ میں ادا کیا،

ایں کہ می گویند آں بہتر ز حسن	یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

اس قسم کی سیکڑوں مثالیں ہیں، ہمکو صرف نمونہ دکھانا مقصود تھا،

ان جزئی اسالیب سے قطع نظر کرکے کلی اسالیب پر نظر ڈالو خواجہ صاحب نے جن مضامین کو زیادہ تر باندھا ہے وہ شراب کی تعریف' رندی و سرمستی کی ترغیب دنیا کی بے ثباتی' واعظوں اور زاہدوں کی پردہ دری ہے' ان میں سے ہر مضمون کے ادا کرنیکا جو پیرایہ اختیار کیا ہے اس سے بہتر خیال میں نہیں آسکتا، اور یہی وجہ ہے کہ انہی مضامین پر اور اساتذہ کے سیکڑوں ہزاروں اشعار موجود ہیں لیکن عام محفلوں میں خواجہ صاحب ہی کے ترانے زبانوں پر ہیں،

واردات عشق

خواجہ صاحب نے شاعری کی مختلف انواع کو لیا ہے اور ہر نوع کو اعلیٰ رتبہ پر پہنچایا ہے لیکن انکی اصلی شاعری عشق و عاشقی اور رندی و سرمستی ہے' رندانہ مضامین وہ جس آزادی' رنگینی اور جوش کے ساتھ ادا کرتے ہیں اسکی تفصیل جوش بیان کے عنوان میں گذر چکی' عشقیہ مضامین سے انکا دیوان بھرا پڑا ہے لیکن یہ نکتہ ملحوظ رکھنا چاہیئے (جیسا کہ ہم ابتدا میں لکھ آئے ہیں)، کہ خواجہ صاحب کے عشقیہ جذبات غم اور درد سے کم تعلق رکھتے ہیں' وہ فطرتاً شگفتہ مزاج اور رنگین طبع تھے' اسلئے عشق و عاشقی سے انکو وہیں تک تعلق ہے جہانتک لطف طبع اور شگفتگی خاطر کے کام آئے' وہ ناامیدی' حسرت' یاس وغیرہ کچھ لکھتے ہیں تو محض تقلید ہوتی ہے' وہ غمگین منہ بنانا بھی چاہتے ہیں تو چہرہ سے شگفتگی نہیں جاتی' اس بنا پر وہ شوق ناز و نیاز بوس و کنار، بزم آرائی، مجلس افروزی کے جذبات اچھی طرح ادا کرسکتے ہیں' وہ اس قسم کا عشق نہیں کرتے کہ کسی کے پیچھے زندگی برباد کردیں گلیوں میں پڑے پھریں' انکا عشق بھی لطف نظر ہے. اچھی صورت سامنے آئی دیکھ لی دل تازہ ہوگیا، پاس بیٹھ گئے، ہمزبانی کا لطف اٹھایا، زیادہ پھیلے تو سینہ سے لگا لیا. گلے میں باہیں ڈالدیں اس حالت میں بھی کوئی برا خیال نہیں پاکبازی اور پاک نظری کی روک قائم ہے، خود فرماتے ہیں،

منم کہ شہرۂ شہرم بعشق ورزیدن   منم کہ دیدہ نیالودہ ام بہ بد دیدن

بااین ہمہ عشق و محبت میں جو جو وارداتیں گذرتی ہیں ایک ایک سے باخبر ہیں، اور ان سب

جذبات کو اسی سچائی اُسی واقعیت اُسی جوش کے ساتھ ظاہر کیتے ہیں جسطرح دل میں آتے ہیں اور یہی اصلی شاعری ہے، وہ کوئی بات نہیں کہتے جبتک کوئی جذبہ دل میں پیدا نہیں ہوتا، معشوق کی تعریف بھی جو شاعروں کا رات دن کا وظیفہ ہے کرنا چاہتے ہیں تو اُسی وقت کرتے ہیں جب معشوق کی کسی نئی ادا سے دل پر نئی چوٹ پڑتی ہے، ورنہ یوں کچھ کہہ جاتے ہیں تو اُسکو بیکار سمجھتے ہیں، خود فرماتے ہیں،

نکتہ ناسنجیدہ گفتم دلبرا معذور دار — عشوہ فرمائے تا من طبع را موزوں کنم

غنی نے اسی بات کو اپنے انداز میں کہا ہے،

جلوہ حسن تو آورد مرا بر سر فکر — تو حنا بستی و من معنی رنگیں بستم

خواجہ صاحب اس نکتہ سے خوب واقف ہیں کہ عشق محض ظاہری حسن جمال سے نہیں پیدا ہوتا اور ہوتا ہے تو وہ عشق نہیں بلکہ ہوس پرستی ہے، عشق کے لئے معشوق میں حسن و جمال کے سوا اور بہت سی ادائیں ہونی چاہئیں، اسی نکتہ کو سلمان ساوجی نے بھی ادا کیا تھا،

شاہد آں نیست کہ دارد خط سبز و لب لعل — شاہد آں ست کہ ایں دارد و آنے دارد

لیکن سلمان نے آن کی تخصیص کردی، خواجہ صاحب بھی اسکو تسلیم کرتے ہیں،

شاہد آں نیست کہ موے و میانے دارد — بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

لیکن یہیں تک بس نہیں کرتے، بلکہ آگے بڑھتے ہیں،

ہزار نکتہ دریں کار و بار دلداری است — کہ نام آں نہ لب لعل و خط زنگاری است

عاشق جب عشق سے لطف اٹھاتا ہے تو عام فطرت انسانی کے لحاظ سے اوروں کو بھی اس مزہ کے اُٹھانیکی ترغیب دیتا ہے، اس جذبہ کو عجیب لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے،

مصلحت دید من آں است کہ یاراں ہمہ کار — بگذارند و سر زلف نگارے گیرند

شہرے پر از حریفاں و زہر طرف نگارے — یاراں صلائے عشق ست گر میکنید کارے

اس مستی کو دیکھو کہ "یار و کوئی کام کرنا ہے تو بس یہ (عشق) کرنے کا کام ہے"،

عاشق کو جب وصل کا تصور آتا ہے تو یہ جذبات پیدا ہوتے ہیں کہ معشوق کو طرح طرح سے

آراستہ کرونگا، پھولوں کے زیور پہناؤنگا تخت پر بٹھاؤنگا، اور عرض کرونگا کہ معشوقانہ انداز سے بیٹھے اور تماشائیوں پر بجلی گرائے، ان جذبات کی تصویر دیکھو،

بہ تخت گل بنشانم بتے چو سلطانے
زسنبل و سمنش ساز و طوق و یارہ کنم

کرشمہ کن و بازار ساحری بشکن
بہ غمزہ رونق بازار سامری بشکن

بہ بادہ سر و دستار عالمے، یعنی
کلاہ گوشہ بہ آئین سامری بشکن

چو عشاق سائی شود زلف سنبل از دم باد
تو قیمتش بہ سر زلف عنبری بشکن

بہ زلف گوئی کہ آئین دلبری بگذار
بہ غمزہ گوے کہ قلب ستمگری بشکن

بروں خرام و بہ بر گوی خوبی از ہمہ کس
سزای حور بدہ رونق پری بشکن

عام لوگ سمجھتے ہیں کہ وصل میں دل کے کانٹے نکلجاتے ہیں اور تسکین ہوجاتی ہے لیکن صاحب ذوق جانتا ہے کہ وصل میں آتش شوق اور بھڑکتی ہے اور دل کا ولولہ کسی طرح کم نہیں ہوتا، اسی بنا پر عرب کا شاعر کہتا ہے،

بِكُلٍّ تَدَاوَيْنَا فَلَمْ يَشْفِ مَا بِنَا
عَلَى أَنَّ قُرْبَ الدَّارِ خَيْرٌ مِنَ الْبُعْدِ

یعنی ہم سب کرکے دیکھ چکے کسی سے تسلی نہیں ہوتی تاہم ہجر سے وصل پھر اچھا ہے خواجہ صاحب اس نکتہ کو یوں ادا کرتے ہیں،

بلبلے برگ گلے خوش رنگ در منقار داشت
و ندراں برگ و نوا خوش نالہای زار داشت

گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست؟
گفت مارا جلوۂ معشوق دریں کار داشت

معشوق نے چند روز بیوفائی برتی ہے، پھر صاف ہوگیا ہے، عاشق کو پچھلی باتیں یاد آتی ہیں، لیکن قصداً بھلاتا ہے اور معشوق کو مطمئن کرتا ہے کہ مجھ کو کوئی شکایت نہیں، اتفاقیہ باتیں تھیں ہوگئیں، اس حالت کو دیکھو کس طرح ادا کیا ہے،

گر ز دست زلف مشکینت خطائے رفت رفت
ور ز ہندوے شما بر من جفائے رفت رفت

اس بلاغت کو دیکھو کہ ظلم و ستم کو معشوق کی طرف منسوب نہیں کرتا، بلکہ زلف کا نام لیتا ہے اور اسکو ہندو (چور ظالم) کہتا ہے کہ اس سے یہ کیا بعید ہے،

برق عشق از خرمن پشمینہ پوشی سوخت سوخت
جور شاہ کامران گر بر گدائے رفت رفت

گردلم از غمزۂ دلدار تابے برد برد   درمیان جان و جاناں ماجرائے رفت رفت

کبھی عاشق کے دل میں یہ جذبہ اُٹھتا ہے کہ معشوق کو اور لوگ بھی چاہتے ہونگے لیکن میری سی جانبازی کون کرسکتا ہے، اس خیال کو محبت کے انداز سے معشوق کے سامنے بھی ظاہر کردیتا ہے،

خواجہ صاحب اس جذبہ کو اس پیرایہ میں ادا کرتے ہیں،

شنے مجنوں بہ لیلی گفت کاے معشوق بے ہمتا   ترا عاشق شود پیدا و لے مجنوں نخواہد شد

اس موقع پر مجنوں کے لفظ نے کیا بلاغت پیدا کی ہے، یہ مضمون سیکڑوں نے باندھا ہے، لیکن یہ پیرایہ کسی کو نصیب نہ ہُوا،

بعض وقت جب معشوق کا ناز اور تمکنت حد سے گذر جاتی ہے تو عاشق تنگ آکر کہدیتا ہے کہ اتنا بھی حد سے نہ گذرے، دنیا میں اور ہزاروں صاحب جمال ہیں معشوق بھی جانتا ہے کہ بات سچ ہے لیکن سمجھتا ہے کہ عاشق کے منصب کے خلاف ہے، ان سچے جذبات کو خواجہ صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں،

صبحدم مرغ چمن باگل نوخاستہ گفت   ناز کم کن کہ دریں باغ بسے چوں تو شگفت

گل بخندید کہ از راست نہ رنجیم، و لے   ہیچ عاشق سخنے سخت بہ معشوق نہ گفت

عشق کے جذبات اگرچہ عالم شباب کے لئے خاص ہیں لیکن بڑھاپے میں بھی یہ آگ سرد نہیں ہوتی، عاشق پر اس زمانہ میں مختلف حالات گذرتے ہیں، کبھی کہتا ہے،

ع رندی و ہوسناکی در عہد شباب اولے،

کبھی خیال کرتا ہے کہ عشق کی گرمی خود جوان بنادیگی، اس حالت میں کبھی معشوق سے کہتا ہے،

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر   کہ سحر گہ ز کنار تو جواں برخیزم

کبھی کہتا ہے،

ہر چند پیر و خستہ دل و ناتواں شدم   ہر گہ کہ یاد روے تو کردم جواں شدم

اسی بنا پر کناسے کاشی نے کہا ہے ع عشق در ایام پیری چوں بہ سرما آتش است،

ان خیالات کے ساتھ یہ بھی سمجھتا ہے کہ یہ حالت عبرت انگیز ہے، اس حالت پر افسوس کرتا ہے اور عبرت کے لہجہ میں کہتا ہے،

دیدی دلا کہ آخر پیری و زہد و علم — بامن چہ کرد دیدۂ معشوقہ باز من

یہ سب اصلی واردا تیں ہیں جو عاشق کو پیش آتی ہیں، خواجہ صاحب نے ان کو بے کم و کاست ادا کیا ہے،

معشوق جب صاحب جاہ اور عاشق مفلس اور کم مایہ ہوتا ہے تو معشوق کو عاشق کی طرف التفات سے عار ہوتی ہے، لیکن عاشق میں یہ امتیاز ملحوظ نہیں، اس بنا پر قاصد سے خطاب کر کے کہتا ہے،

گردیگرت براں در دولت گذر بود — بعد از ادائے خدمت عرض دعا بگو

در راہ عشق فرق غنی و فقیر نیست — اے بادشاہ حسن سخن باگدا بگو

غرض اسطرح کے سیکڑوں جذبات ہیں جنکو خواجہ صاحب نے نہایت خوبی سے ادا کیا ہے اور جس کی مثال، اساتذہ کے کلام میں نہیں مل سکتی ہم سرسری طور پر یکجائی چند اشعار نقل کرتے ہیں،

معشوق کی نسبت بدگمانی،

خواب آں نرگس فتاں تو بے چیزے نیست — تاب آں زلف پریشاں تو بے چیزے نیست

ظلم کے بعد معشوق کے رحم کی داد،

آفریں بردل نرم تو کہ از بہر ثواب — کشتۂ غمزۂ خود را بنماز آمدۂ

رقیب سے چھپ کر سرگوشی،

خدارا اے رقیب امشب زمانے دیدہ برہم نہ — کہ من بالعل جاں بخشش نہانی یک سخن دارم

معشوق کی عام آمیزی کی شکایت،

زلف در دست صبا گوش بہ پیغام رقیب — ایں ہمہ باہمہ در ساختۂ یعنی چہ

عشق سے پارسائی میں فرق آنے کا خطرہ،

می ترسم از خرابی ایماں کہ می برد — محراب ابروے تو حضور نماز من

معشوق نے چارہ ساز ہو کر چارہ نوازی نہ کی،

چہ عذر از بخت خود گویم کہ آں عیار شہر آشوب | بہ تلخی کشت حافظ را و شکر در دہاں دارد

باکہ این نکتہ تواں گفت کہ آں سنگین دل | کشت ما را و دم عیسیٰ مریم با اوست

بوسہ کے ساتھ گالی کا مزہ،

قند آمیختہ با گل نہ علاج دل ماست | بوسۂ چند بیامیز بہ دشنامے چند

باوفا معشوق کی نظیر پیش کر کے معشوق سے التفات کی خواہش،

پروانہ و شمع و گل و بلبل ہمہ جمع اند | اے دوست بیا رحم بہ تنہائی ما کن

حیا اور رونے کی وجہ سے افشائے راز،

ترا حیا و مرا آب دیدہ شد غماز | وگرنہ عاشق و معشوق رازدار انند

اوروں کی کامیابی پر حسرت،

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی | بہ یاد آر حریفاں بادہ پیما را

داستان عشق کی دلچسپی،

یک قصہ بیش نیست غم عشق ایں عجب | از ہر کسے کہ می شنوم نامکرر است

معشوق پر فدا ہونے کا انتظار اور اسکا اعتراض،

می خواستم کہ میرمش اندر قدم چو شمع | او خود گذر بہ ما چو نسیم سحر نہ کرد

معشوق کی یاد میں شب گذاری کا لطف،

از صبا پرس کہ ما را ہمہ شب تا دم صبح | بوئے زلف تو ہماں مونس جان است کہ بود

معشوق نہ ڈر سے بات آتا اور نہ خود ملتفت ہوتا،

از بہر بوسۂ زلبش جاں ہمی دہم | اینم نمی ستاند و آنم نمیدہد

اہل تقوی برا مانیں تو مانیں، شاہد پرستی نہیں چھوڑی جا سکتی،

شراب لعل کش و روئے مہ جبیناں بیں | خلاف مذہب آناں جمال ایناں بیں

فلسفہ | خواجہ صاحب کا فلسفہ قریباً وہی ہے جو خیام کا ہے، خواجہ صاحب نے انہی مسائل کو زیادہ تفصیل، زیادہ توضیح اور زیادہ جوش کے ساتھ ادا کیا ہے چنانچہ ہم انکو بدفعات

بیان کرتے ہیں،

(۱) ان کا فلسفہ اس مسئلہ سے شروع ہوتا ہے کہ انسان کو کائنات کے اسرار اور انکی حقیقت کچھ معلوم نہیں اور نہ معلوم ہو سکتی! اس مضمون کو سقراط، فارابی، ابن سینا، خیام سب نے بیان کیا تھا، لیکن خواجہ صاحب جس بلند آہنگی اور جوش ادعا کے ساتھ کہتے ہیں وہ اُنکا خاص حصہ ہے؛

برو اے زاہد خود بیں! کہ ز چشم من و تو　　راز ایں پردہ نہان است و نہان خواہد بود

انداز بیان کی بلاغت کو دیکھو! کلام کی ابتدا ایسے لفظ سے کی ہے جس سے زاہد کی دعوے راز دانی کی سخت تحقیر ظاہر ہوتی ہے، خود بین کے لفظ سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ دعوے صرف خود بینی کی بنا پر ہوتا ہے، زاہد کے ساتھ اپنے آپ کو بھی شریک کر لیا ہے جس سے زاہد کی خاطرداری اور دعوے کی تعمیم مقصود ہے یعنی اس امر میں عارف و زاہد، عالم و جاہل سب برابر ہیں، دوسرے مصرع میں ماضی کے ساتھ آئندہ زمانہ کو بھی داخل کر لینے سے دعوے میں زیادہ زور اور تعمیم پیدا ہو گئی ہے،

عنقا شکار کس نشود دام باز چین　　کیں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

حدیث از مطرب و می گو و راز دہر کمتر جو　　کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معما را

دانا چو دید بازی ایں چرخ حقہ باز　　ہنگامہ باز چید و در گفتگو ببست

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجا است　　اینقدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

ساقیا جام میم دہ کہ نگارندۂ غیب　　نیست معلوم کہ در پردۂ اسرار چہ کرد

آں کہ پر نقش زد ایں دائرۂ مینائی　　کس ندانست کہ در گردش پرکار چہ کرد

نشوی واقف یک نکتہ ز اسرار وجود　　گر تو سرگشتہ شوی دائرۂ دوراں را

در کارخانہ کہ رہ عقل و علم نیست　　وہم ضعیف رائے فضولی چرا کند

ما از بروں در شدہ مغرور صد فریب　　تا خود دروں پردہ چہ تدبیر می کنند

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ　　چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

راز دروں پردہ چہ داند فلک خموش　　اے مدعی نزاع تو با پردہ دار چیست

یا ہیچ کس نشانے زاں دلستاں ندیدم	یا من خبر ندارم یا او نشاں ندارد
مُردم در انتظار دریں پردہ راہ نیست	یا ہست و پردہ دارنشانم نمی دہد

(۲) شاہد مطلق کا ظہور اگرچہ ہر جگہ ہے، اور ذرہ ذرہ میں اُسکی چمک موجود ہے، لیکن کوئی شخص اسکو پہچان نہیں سکتا،

(۳) اسرار کائنات اگرچہ حقیقت میں معلوم نہیں ہو سکتی، لیکن جو کچھ بھی معلوم ہو سکتا ہے وہ علوم درسیہ کی تحصیل اور بحث مباحثہ سے نہیں معلوم ہو سکتا، بلکہ مجاہدہ، ریاضت وجدان اور کشف سے معلوم ہو سکتا ہے، خواجہ صاحب نے ارباب ذوق اور مشاہدہ کا نام ساقی، بادہ فروش، رند، رکھا ہے اور اسی بنا پر ہر جگہ پیر مغاں اور بادہ فروش کے حلقہ بگوشی کا دعوے کرتے ہیں، اور اُنکے مقابلہ میں زہاد یعنی علماے ظاہری کو بے حقیقت سمجھتے ہیں،

راز درون پردہ، ز رندان مست پرس	کیں حال نیست صوفی عالیمقام را
سرخدا کہ عارف سالک بہ کس نگفت	در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید
مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز	ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست
اے کہ از دفتر عقل آیت عشق آموزی	ترسم ایں نکتہ بہ تحقیق ندانی دانست
سر زحیرت بہ در میکدہ ہا بر کردم	چوں شناسای تو در صومعہ یک پیر نبود
حلاج برسر دار ایں نکتہ خوش سراید	از شافعی مپرسید امثال ایں مسائل

مرزا غالب نے اس خیال کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے،

آں راز کہ در سینہ نہان است نہ وعظ است	بردار تواں گفت و بہ ممبر نتواں گفت

(۴) صوفیہ کے نزدیک علم حاصل ہونیکا ذریعہ بیرونی چیزوں کا مطالعہ نہیں ہے، اُنکے نزدیک دل پر جب ایک خاص طریقہ سے توجہ اور مدت تک اس پر مواظبت کی جاتی ہے تو دل خود ادراکات اور معلومات کا سرچشمہ بن جاتا ہے، جس طرح انبیا کا علم باہر سے نہیں آتا بلکہ فوارہ کی طرح اندر سے اچھلتا ہے، خواجہ صاحب نے اس مسئلہ کو نہایت پُر جوش اور بلیغ طریقہ سے ادا کیا ہے،

دیدمش خرم و خنداں قدح بادہ بدست	وندراں آئینہ صد گونہ تماشا می کرد

گفتم ایں جامِ جہاں بیں بتو کے داد حکیم　　گفت آں روز کہ ایں گنبد مینا می کرد

یعنی میں نے ساقی (عارف) کو دیکھا کہ خوشی سے کھلا جاتا ہے ہاتھ میں شراب کا پیالہ ہے اسکو بار بار دیکھتا ہے اور اُس میں اسکو گوناگوں عالم نظر آتے ہیں میں نے پوچھا کہ کارپردازِ فطرت نے تمکو یہ جامِ جہاں بین کس دن عنایت کیا تھا، بولا کہ جس دن یہ سبز گنبد (آسمان) تعمیر کر رہا تھا،

(۶) خواجہ صاحب کا میلان زیادہ تر جبر کی طرف معلوم ہوتا ہے یعنی انسان خود مختار نہیں ہے کوئی اور قوت ہے جو اس سے کام لے رہی ہے، اگرچہ بعض اسکے خلاف بھی اُن کے قلم سے نکل جاتا ہے، مثلاً

ع ۔ ہر عمل اجرے و ہر کار جزاے دارد،

لیکن انکا اصلی رحجان طبع جبر ہی کی طرف ہے یہ مسئلہ اگرچہ بظاہر خلاف عقل ہے لیکن فلسفہ کی انتہائی منزل یہی ہے، اور اربابِ فنا بھی اسی نشہ میں چور ہیں، خواجہ صاحب جب اس عالم میں آتے ہیں تو اُنکی سرمستی حد سے بڑھ جاتی ہے اور عجیب جوش و خروش کا عالم ہوتا ہے،

نقشِ مستوری و مستی نہ بہ دستِ من و تست　　آنچہ استادِ ازل گفت، بکن آں کردم

بارہا گفتہ ام و بارِ دگر می گویم　　کہ من دلشدہ ایں رہ نہ بخود می پویم

بروِ اے ناصح و بر دُرد کشاں خُردہ مگیر　　کارفرمائی قدر می کند ایں من چہ کنم

برقِ غیرت کہ چنیں می جہد از پردۂ غیب　　تو بفرما کہ من سوختہ خرمن چہ کنم

مرا مہرِ نکورویاں ز سر بیروں نخواہد شد　　قضاے آسمان است و دیگرگوں نخواہد شد

مرا روزِ ازل کارے بجز رندی نفرمودند　　ہر آں قسمت کہ آں جا شد کم و افزوں نخواہد شد

مستور و مست ہر دو چو از یک قبیلہ اند　　ما دل بہ عشوہ کہ دہیم، اختیار چیست

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　آنچہ استادِ ازل گفت ہماں میگویم

(۵) کمال اور ترقی کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں یہ غلط ہے کہ ع حریفاں با خوردند و رفتند،

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید　　دیگراں ہم بکنند انچہ مسیحا می کرد

(۲) بندگان خاص کی فطرت ہی جدا ہوتی ہے وہ بات ہر شخص کو نصیب نہیں ہو سکتی

گوہر جام جم از طینت خاکِ دگر است　　تو توقع زگل کوزہ گراں میداری

فلسفہ اخلاق

خواجہ صاحب کی اخلاقی تعلیم اعلیٰ درجہ کی فلسفہ انسانیت کی تصویر ہے ان کا طرز عمل خود اُن کی زبان سے یہ ہے،

مباش درپے آزار و ہر چہ خواہی کن　　کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

ع. فرض ایزد بگذاریم و بکس بد نہ کنیم

ما نہ گوئیم بد و میل بہ ناحق نہ کنیم　　جامۂ کس سیہ و دلق خود ازرق نہ کنیم

نہ صرف چھوٹوں بلکہ بڑوں کو بھی ہم بُرا کہنا پسند نہیں کرتے کیونکہ گو بُرے کو بُرا کہنا چنداں مضائقہ نہیں پھر بھی بُرائی سے خالی نہیں اسلئے سرے سے اس کام کو چھوڑ دینا بہتر ہے

عیب درویش و توانگر بہ کم و بیش بد است　　کار بد مصلحت آن است کہ مطلق نکنیم

ہم اپنے نکتہ چینوں اور مخالفوں سے بھی ناراض نہیں ہوتے اسلئے کہ اگر وہ حق کہتے ہیں تو حق کے بُرا ماننے کی کوئی وجہ نہیں اور اگر غلط کہتے ہیں تو غلط بات کا کیا رنج،

حافظ ار خصم خطا گفت نگیریم برو　　ور کہ حق گفت جدل با سخن حق نہ کنیم

ہماری مجلس عام ہے کسی کی تخصیص نہیں جو چاہے آئے ہم سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے ہیں واعظوں اور زاہدوں کی طرح ہمارا اخلاق دوست دشمن عزیز و بیگانہ کافر و مسلمان کی تفریق کی وجہ سے بدلا نہیں کرتا،

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو　　گیر و دار و حاجب و دربان دریں درگاہ نیست

بندۂ پیر خراباتم کہ لطفش دائم است　　ورنہ لطف شیخ و زاہد گاہ ہست و گاہ نیست

ہم کو صرف مہر و محبت سے کام ہے دشمنی، بغض اور کینہ ہمارا طرز عمل نہیں،

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم　　از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

تا نخوریم و ملامت کشیم و خوش باشیم　　کہ در طریقت ما کافری است رنجیدن

فرائض اور عبادات بہشت کے لالچ سے نہیں کرنی چاہئیں بلکہ اسلئے کرنی چاہئیں

کہ فرض انسانی ہیں بہشت بیشک معاوضہ میں ملیگی لیکن تمہارا مطمح نظر یہ نہیں ہونا چاہیئے،

تو بندگی چو گدایان بہ شرط مزد مکن | کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند
من آن نگین سلیمان بہ ہیچ نستانم | کہ گاہ گاہ برو دست اہرمن باشد

مشہور ہے کہ حضرت سلیمان کے پاس ایک انگوٹھی تھی جسکی تاثیر سے تمام جن اور انسان انکے تابع تھے ایک دفعہ ایک شیطان نے اسکو کسی طرح اُڑا لیا حضرت سلیمان کی سلطنت اور شان شوکت سب جاتی رہی یہانتک کہ مچھلیاں بیچ کر زندگی بسر کرتے تھے، خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ جس انگوٹھی پر کبھی کبھی شیطان کا قبضہ ہو جاتا ہے، میں اسکو کوڑی کے مول بھی نہیں خریدتا،

گرچہ گرد آلود فقرم شرم باد از ہمتم | گر بہ آب چشمۂ خورشید دامن تر کنم
بہ خرمن دو جہاں سر فرو نمی آرند | دماغ کبر گدایان خوشہ چینان من
ما ملک عافیت نہ بہ لشکر گرفتہ ایم | ما تخت سلطنت نہ بہ بازو کشادہ ایم

لیاقت جب تک نہ ہو بڑوں کی برابری نہیں کرنا چاہیئے،

تکیہ بر جائے بزرگاں نتواں زد بگزاف | مگر اسباب بزرگی ہمہ آمادہ کنی

ذاتی لیاقت درکار ہے، خاندانی شرف کافی نہیں،

تاج شاہی طلبی گوہر ذاتی بنما | ورخود از گوہر جمشید و فریدون باشی

تحصیل مقصد کے لئے کوشش درکار ہے،

در رہ منزل لیلےٰ کہ خطرہاست بہ جان | شرط اول قدم آن است کہ مجنوں باشی

ترغیب عمل،

اے دل بہ کوئے عشق گذاری نمی کنی | اسباب جمع داری و کارے نمی کنی
چوگان بدست داری و گوی نمی زنی | بازے چنیں بدست و شکارے نمی کنی

علما اور واعظین کی پردہ دری

اخلاقی تعلیم اس بات پر موقوف ہے کہ شاعر فطرت انسانی کا نکتہ شناس ہو جو عیب اور برائیاں کھلی کھلی ہوتی ہیں، انکو ہر شخص سمجھ سکتا ہے لیکن دقیق، مخفی، اور سربستہ عیوب تک ہر شخص کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی، اس لئے جو

شاعر فلسفہ اخلاق کی تعلیم دینا چاہتا ہے اسکے لئے فطرت کا نکتہ شناس ہونا سب سے
پہلی شرط ہے اسکے ساتھ یہ بھی ضرور ہے کہ لطیف اور دل آویز طریقوں سے یہ عیوب
ظاہر کئے جائیں تاکہ لوگوں کو گراں نہ گذریں بلکہ خود انکو سننے میں لطف آئے مخفی اور
دقیق عیوب جس قدر علماء واعظین اور زہاد میں پائے جاتے ہیں کسی فرقہ میں نہیں
پائے جاتے چنانچہ امام غزالی نے احیاء العلوم میں اسکو نہایت تفصیل سے لکھا ہے
لیکن چونکہ یہ فرقہ ہمیشہ با اقتدار رہا ہے اسلئے انکے عیوب کا ظاہر کرنا آسان بات
نہیں، امام غزالی نے اسکا جو نتیجہ اٹھایا، یہ تھا کہ انکی جان تک معرض خطر میں آگئی،
اسلئے کسی کو ہمت نہ ہوئی، شعراء میں سب سے پہلے خیام نے یہ جرأت کی اسکے بعد
شیخ سعدی نے دبی زبان سے کچھ کچھ کہا، مثلاً

محتسب در قفائے رندان است — غافل از صوفیان شاہد باز
برون نمی رود از خانقہ یکے ہشیار — کہ تا بہ شحنہ بگوید کہ صوفیان مستند
گر کند میل بہ خوبان دل من خردہ مگیر — کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

لیکن جس دلیری، آزادی اور بے باکی سے خواجہ صاحب نے اس فرض کو
ادا کیا آجتک کسی سے نہ ہو سکا،

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند — چوں بہ خلوت می روند آں کار دیگر می کنند
مشکلے دارم ز دانشمند محفل باز پرس — توبہ فرمایان چرا خود توبہ کمتر می کنند
گوئیا باور نمی دارند روز داوری — کیں ہمہ قلب و دغا در کار داور می کنند
دی دو بیتم چہ خوش آمد کہ سحرگہ میگفت — در میکدۂ با دف و نے ترسائے
گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد — وائے اگر از پس امروز بود فردائے

یعنی کل شرابخانہ کے دروازہ پر ایک عیسائی دف بجا کر یہ گاتا تھا کہ اگر اسلام اسی کا نام
ہے جو حافظ میں پایا جاتا ہے تو آج کے بعد اگر کل قیامت کا دن بھی آنیوالا ہے تو ہائے،"
اس شعر کا پیرایہ بیان بھی کس قدر بلیغ ہے، اول تو جو کہنا ہے اسکو ایک عیسائی کی
زبان سے کہا ہے جس سے علاوہ احتیاط کے مقصود یہ ہے کہ غیروں کو بھی ان بد عملیوں کے

افسوس اور رحم آتا ہے گانے اور بجانے کے شامل کرنے سے یہ غرض ہے کہ اس ذریعہ سے لوگ زیادہ جی لگا کر سُنتے تھے اور زیادہ تشہیر ہوتی تھی اپنا نام لینے سے علاوہ احتیاط کے یہ مقصد ہے کہ دوسروں کا عیب کہتے تو اُن کو توجہ نہ ہوتی،

سب سے بڑا عیب مولویوں اور واعظوں میں ریاکاری کا ہوتا ہے اس لئے دلیری سے اُنکی بُرائیاں بیان کی ہیں،

گرچہ بر واعظ شہر ایں سخن آساں نشود
تا ریا ورزد و سالوس، مسلمان نشود

یعنی گو واعظ کو یہ بات گراں گذریگی لیکن ہے یہ کہ جبتک وہ ریا کرتا رہیگا مسلمان نہیں ہو سکتا

غلام ہمت دُردی کشاں یک رنگم
نہ آں گروہ کہ ازرق لباس دل سیہ اند

بادہ نوشی کہ درو ہیچ ریائے نبود
بہتر از زہد فروشی کہ درو روی و ریاست

من از پیر مغاں دیدم کرامت ہائے مردانہ
کہ ایں دلق ریائی را بہ جامے در نمی گیرد

می خور کہ صد گناہ ز اغیار در حجاب
بہتر ز طاعتے کہ بہ روی و ریا کنند

ترسم کہ صرفہ نہ برد روز باز خواست
نان حلال شیخ ز آب حرام ما

بیا نہ کدہ و چہرہ ارغوانی کن
مرو بہ صومعہ کان جا سیاہ کارانند

نقد ہا را بود آیا کہ عیارے گیرند
تا ہمہ صومعہ (خانقاہ) داران پے کارے گیرند

یعنی اگر سکے پرکھے جاتے تو سب خانقاہ نشین اپنا راستہ لیتے،

مولویوں اور واعظوں کو اس میں بڑا کمال ہوتا ہے کہ تقدس کے پردہ میں اس طرح برائیاں کرتے ہیں کہ کسی کو اُن کی نسبت گمان بھی نہیں ہو سکتا خواجہ صاحب نے اس نکتہ کو اس لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے،

اے دل طریق مستی از محتسب بیاموز
مست ست و در حق او کس ایں گماں ندارد

خرقہ پوشاں ہمگی مست گذشتند و گذشت[1]
قصہ ماست کہ در کوچہ و بازار بماند

صوفیاں واستند (واپس لیا) از گرو می ہمہ رخت
دلق ما بود کہ در خانۂ خمار بماند

یعنی صوفیوں نے اپنا خرقہ شراب کی عوض میں رہن بھی کیا اور واپس بھی لے لیا کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی ہم رند یوں رسوا ہوئے کہ ہمارا خرقہ رہن پڑا رہ گیا،

[1] یعنی گئی گذری بات ہوئی،

داشتم دلقے وصد عیب مرامی پوشید — خرقہ رہن مے ومطرب شد وزنار بماند

عیب چھپانے کی ایک بڑی گہری چال یہ ہے کہ کوئی اور شخص اگر وہ عیب کرتا ہوا نظر آئے تو نہایت سختی سے اس پر دار وگیر کیجائے، اس راز کو خواجہ صاحب اس طرح فاش کرتے ہیں،

بادہ با محتسب شہر نہ نوشی زنہار — کہ خورد باتومی وسنگ بہ جام اندازد

یعنی محتسب کے ساتھ کبھی شراب نہ پینا، وہ تمہارے ساتھ شراب بھی پئیگا اور تمہارا پیالہ بھی توڑ ڈالیگا،

مولویوں اور واعظوں میں ریاکاری علانیہ نظر آتی ہے اور مذہبی گروہ بھی اسکے اثر سے خالی نہیں ہوتے، اس بناپر خواجہ صاحب فرماتے ہیں،

مے خور کہ شیخ وحافظ وقاضی ومحتسب — چوں نیک بنگری ہمہ تزویر می کنند

صوفیاں جملہ حریف اند نظر باز ولے — زاں ہمہ حافظ سودا زدہ بد نام افتاد

علما کے اوصاف اور اخلاق پر خوب غور کرو، تو نظر آئیگا کہ عوام کی عقیدتمندی اور نیازمندی کی وجہ سے ان میں نہایت عُجب اور غرور پیدا ہوجاتا ہے، اور اس وصف کو اسلئے ترقی ہوتی جاتی ہے کہ اُنکو یہ باتیں مذہبی پیرایہ میں نظر آتی ہیں، وہ کسی کو بُرا کہتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ امر بالمعروف کی تعمیل ہے، سلاطین اور حُکام کی دربارداری کرتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ احکام شرعی کے اجراء کے لئے اسکی ضرورت ہے، کسی سے ذاتی عناد کی وجہ سے دشمنی کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ بغض للّٰہ ہے، غرور اور فخر کرتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ عزت نفس ہے، اس بناپر یہ تمام عیوب اُن میں راسخ ہوتے جاتے ہیں، خواجہ صاحب ان تمام عیبوں کی نہایت بلیغ اور لطیف پیرایوں میں پردہ دری کرتے ہیں،

اگر از پردہ بروں شد دل من عیب مکن — شکر ایزد کہ نہ در پردۂ پندار بماند

درراہ ما شکستہ دلے می خرند وبس — بازار خود فروشی ازاں راہ دیگر است

یعنی ہمارے بازار میں صرف خاکساری کی قیمت ہے، باقی خود پرستی تو اسکا راستہ دوسری طرف سے نکلا ہے،

زاہد شہر چو مہر ملک و شحنہ گزید | من ہم از مہر نگارے بگزنیم چہ شود

یعنی جب زاہد نے بادشاہ پرستی اختیار کی تو ہم بھی اگر کسی خوشرو سے دل لگائیں تو کیا ہرج ہے، یعنی بادشاہ پرستی سے شاہد پرستی بہتر ہے،

اخفائے حق

عیب می جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو | نفی حکمت مکن از بہر دل عامے چند

علما کی عام حالت یہ ہے کہ امر حق کو عوام کی خاطر سے کبھی ظاہر نہیں کرتے بلکہ اگر اُس میں کوئی بُرائی کا پہلو ہے تو صرف اُسی پر زور دیتے ہیں، آجکل مغربی تعلیم قوم کیلئے کسقدر ضروری اور گویا شرط زندگی ہے لیکن صرف اس وجہ سے کہ عوام اس سے وحشت کرتے ہیں کبھی کوئی عالم اسکی ترغیب نہیں دے سکتا بلکہ ہمیشہ اسکی مخالفت کیجاتی ہے۔ خواجہ صاحب نے نہایت مؤثر طریقے سے اس عیب پر ملامت کی ہے، وہ کہتے ہیں، کہ عوام کی خاطر سے حکمت اور حقیقت سے انکار کرو، شراب میں فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی اور نقصان فائدہ سے زیادہ ہے قرآن مجید میں فرمایا فیھما اثم کبیر و منافع للناس و اثمھما اکبر من نفعھما یعنی قمار اور شراب میں فائدے بھی ہیں اور نقصان بھی لیکن نقصان زیادہ ہے، جب خدانے باوجود اسکے کہ شراب نہایت بُری چیز ہے، اسکے فائدوں کو چھپانا نہیں چاہا، البتہ یہ بتادیا کہ فائدہ سے نقصان زیادہ ہے، اور اسلئے اس سے پرہیز کرنا چاہئیے تو امر حق کو عوام کی خاطر سے چھپانا کیونکر جائز ہو سکتا ہے،

خواجہ صاحب نے اس بات کو جا بجا نہایت بلیغ اور لطیف پیرایوں میں ادا کیا ہے کہ مولویوں اور واعظوں کی نیکیاں بھی چونکہ ذاتی غرض پر مبنی ہوتی ہیں اسلئے درگاہ الٰہی میں مقبول ہونے کے قابل نہیں،

در میخانہ بہ بستند خدایا مپسند | کہ در خانۂ تزویر و ریا بکشایند

ترسم کہ صرفۂ نہ برد روز باز خواست | نان حلال شیخ ز آب حرام ما

ایں خرقہ کہ من دارم در رہن شراب اولے | ویں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولے

روزمرہ و محاورہ

خواجہ صاحب کی فصاحت کلام کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ انکے ہاں

کلام میں روزمرہ اور محاورے نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں جو الفاظ اور ترکیبیں رات دن استعمال میں آتے رہتے ہیں اور جن سے روزمرہ پیدا ہوتا ہے، عموماً وہی ہوتے ہیں جو فصیح سلیس، نرم اور رواں ہوں، اور اگر ان میں کسی قدر کمی ہوتی ہے تو وہ روزمرہ کے استعمال سے نکلجاتی ہے کیونکہ رات دن سنتے سنتے وہ الفاظ کانوں کو مانوس ہوجاتے ہیں، محاورات کا بھی یہی حال ہے، محاورہ اُسوقت بنتا ہے جب ایک گروہ کا گروہ کسی جملہ کو کسی خاص معنی میں استعمال کرتا ہے، اس لئے ضرور ہے کہ یہ جملہ خود فصیح سلیس، اور رواں ہو، ورنہ تحاوُر عام میں نہیں آسکتا،

ایک اور پہلو سے اس خصوصیت پر نظر ڈالو. فارسی زبان میں مفرد الفاظ بہ نسبت اور زبانوں کے نہایت کم ہیں، اس کمی کی تلافی زبان نے محاورات اور مصطلحات سے کی، شاعری کے لئے زبان پر قدرت تام حاصل ہونا سب سے ضروری شرط ہے، خواجہ صاحب کی قادر الکلامی کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے جسقدر محاورات اور مصطلحات برتے فارسی شعرا میں سے غالباً کسی نے نہیں برتے اور یہ اُن کی قادر الکلامی کی ایک بڑی دلیل ہے،

خواجہ صاحب کا تمام کلام اگرچہ روزمرہ محاورات اور مصطلحات سے لبریز ہے، لیکن مثال کے طور پر ہم چند اشعار نقل کرتے ہیں[1]،

ترسم کہ صرفۂ نہ برد روز بازِ خواست	نانِ حلال شیخ ز آبِ حرامِ ما
صلاحِ کار کجا و منِ خراب کجا (قیامت)	بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا (شراب)
عنقا شکارِ کس نہ شود دام باز چیں	کیں جا ہمیشہ باد بدست است دام را
اے صبا گر بہ جواناں چمن باز رسی	خدمت از ما برساں سرو و گل و ریحاں را

[1] جو محاورات ان اشعار میں آئے ہیں اُنکے معنی ہم یکجائی لکھدیتے ہیں،
[1] صرفہ نبردن، بازی لیجانا، [2] دام باز چیدن، جال کو سمیٹ لینا، باد بدست بودن، کچھ ہاتھ نہ آنا، [4] خدمت، سلام، [5] در سر کار چیزے کردن، صرف کردینا، یا لگا دینا، [6] ترا چہ افتادہ است، تمکو کیا پڑی ہے، [8] ہمت، توجہ اور ہمدردی، [9] بے اندام، بے ڈول، [10] از آں راہ دگر است، یعنی اسکا اور راستہ ہے،

ترسم آں قوم کہ بر دردکشاں می خوانند
در سر کار خرابات کنند ایماں را

برو بہ کار خود اے واعظ ایں چہ فریاد است
مرا فتادہ دل از کف تراچہ افتادہ است

روے خوب است و کمال ہنر و دامن پاک
لاجرم ہمت مردان دو عالم با اوست

ہر چہ ہست از قامت ناساز بے اندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالاے کس کوتاہ نیست

بندۂ پیر خراباتم کہ لطفش دائم است
ورنہ لطف شیخ و زاہد گاہ ہست و گاہ نیست

دانا چو دید بازی ایں چرخ حقہ باز
ہنگامہ باز چید و در گفتگو ببست

در راہ ما شکستہ دلے می خرند و بس
بازار خود فروشی ازاں راہ دیگر است

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است
بہ بانگ چنگ مخور می کہ محتسب تیز است

بیخواست گل کہ دم زند از رنگ و بوے دوست
از غیرت صبا نفسش در دہاں گرفت

آسودہ بر کنار چو پرکار می شدم
دوران چو نقطہ عاقبتم درمیان گرفت

فرصت نگر کہ فتنہ در عالم اوفتاد
عارف بجام می زد و از غم کراں گرفت

حافظ چو آب لطف ز نظم تو می چکید
غیرے چگونہ نکتہ تواند براں گرفت

مستم کن آں چناں کہ ندانم ز بیخودی
در عرصۂ خیال کہ آمد کدام رفت

در حق من لبت آں لطف کہ می فرماید
سخت خوب است ولیکن قدرے بہتر ازیں

ہمائے ہمتم عمرے ست کز جان
ہوائے آں قد و بالا گرفت است

دلم جز مہر مہرویاں طریقے بر نمی گیرد
ز ہر در می دہم پندش ولیکن در نمی گیرد

رخ و چشمے بدیں خوبی تو گوئی دل ازو برگیر
برو کیں وعظ بے معنی مرا در سر نمی گیرد

میان گریہ می خندم کہ چوں شمع اندریں مجلس
زبان آتشینم ہست لیکن در نمی گیرد

بدیں شعر تر و شیریں ز شاہنشہ عجب دارم
کہ سر تا پای حافظ را چرا در زر نمی گیرد

یا وفا یا خبر وصل تو یا مرگ رقیب
بازی چرخ ازیں یکدو سہ کاری بکند

نقد ہا را بود آیا کہ عیارے گیرند
تا ہمہ صومعہ داران پے کاری گیرند

تیز: تیجہ اور غصہ ور، دم زدن: دعوے کرنا، نفس در دہاں گرفتن: دم گھٹنا، درمیان گرفتن: گھیر لینا، زدن: کسی چیز پر ٹوٹ کر گرنا، نکتہ گرفتن: اعتراض کرنا، ہوا گرفتن: ہوا میں اڑنا، درگرفتن: اثر کرنا، یا لگ جانا، در زر گرفتن: سونے میں تلوار دینا، پے کارے گرفتن: کسی کام کے پیچھے پڑنا، لیکن ایسے موقعوں پر اپنا راستہ لینا" کے معنے میں آتا ہے،

خرقہ پوشاں ہمگی مست گذشتند و گذشت[1] — قصۂ ماست کہ در کوچہ و بازار بماند

مطرب عشق عجب ساز و نوائے دارد — نقش ہر پردہ کہ زد راہ بجائے[2] دارد

از راہ نظر مرغ دلم گشت[3] ہوا گیر — اے دیدہ نظر کن کہ بہ دام کہ درافتاد[4]

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات — با دردکشاں ہر کہ در افتاد برافتاد

چہ مستی است ندانم کہ رو بہ ما آورد — کہ بود ساقی؟ و ایں بادہ از کجا آورد

رسیدن گل و نسرین بہ خیر و خوبی باد — بنفشہ شاد و خوش آمد سمن صفا آورد[5]

از دیدہ خون دل ہمہ بر روے ما رود — بر روے ما ز دیدہ ندانم چہا رود[6]

من و انکار شراب! ایں چہ حکایت باشد — غالباً ایں قدرم عقل کفایت باشد

آں شد اے خواجہ کہ در صومعہ بازم بینی — کار ما بارخ ساقی و لب جام افتاد

رطل گرانم دہ اے مرید خرابات — شادیٔ شیخی[7] کہ خانقاہ نہ دارد

شراب و عیش نہاں چیست کار بے بنیاد — زدیم بر صف رندان، و ہرچہ باداباد

یارب بوقت گل گنہ بندہ عفو کن — ویں ماجرا بہ سرو لب جوئبار بخش

حاشا کہ من بہ موسم گل ترک مے کنم — من لاف عقل میزنم، ایں کار کے کنم

اے مگس عرصۂ سیمرغ نہ جولانگہ تست — عرض خود می بری و زحمت[8] ما میداری

دردمنداں بلا زہر ہلاہل نوشند — قتل ایں قوم خطا باشد، ہاں[9] تا نہ کنی

اکثر محاورے ایسے ہیں جو صرف بول چال اور بے تکلفی میں استعمال ہوتے ہیں' اہل قلم یہ سمجھ کر کہ وہ متانت کے خلاف ہیں' تصنیفات میں استعمال نہیں کرتے. مثلاً اردو میں یہ محاورات' جاؤ بھی، رہنے بھی دیجئے، دیکھ لیا' وغیرہ وغیرہ روزمرہ استعمال میں آتے ہیں لیکن ناسخ، خواجہ درد، سودا وغیرہ انکو نظم متانت کے خلاف سمجھتے ہیں لیکن اس سے زبان کی وسعت گھٹتی ہے' اسلئے جن شعرا کو زبان کا خیال زیادہ ہے مثلاً داغ وغیرہ

---

[1] گذشت، گئی گذری بات ہوئی، [2] راہ بجائی دارد، اصول اور قاعدہ کے موافق ہے' [3] درافتادن، اُلجھنا، [4] صفا آوردن، خیر مقدم کے وقت کہتے ہیں' [5] چہا رود، کیسے گذریگی' [6] شادیٔ شیخی، یعنی انکے آنر ہیں، بہ فلاں بخشیدن' انکے صدقہ میں' [7] زحمت کسے برداشتن' کسی کو ستانا، [8] ہاں تا نہ کنی' دیکھو ایسا کبھی نہ کرنا،

ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر یہ تمام محاورات لاتے ہیں، فارسی میں روزمرہ اور محاورہ کو خواجہ صاحب نے وسعت دی، انکے کلام میں ایسے بہت سے محاورات ملینگے جو کسی اَور کے کلام میں نہیں ملسکتے، یہانتک کہ بولچال کے لحاظ سے وہ محاورات بھی **خواجہ صاحب نے** لے لئے ہیں جو خاص لہجہ کے محتاج ہیں اور بغیر اس لہجہ کے سمجھ میں نہیں آسکتے، مثلاً،

ناصحم گفت کہ جز غم چہ ہنر دارد عشق　　گفتم اے خواجہٴ غافل! ہنرے بہتر ازیں

ہنرے بہتر ازیں، کو ایک خاص لہجہ سے پڑھنا چاہیئے، جس سے استفہام کے معنی پیدا ہوں یعنی کیا اس سے بڑھ کر کوئی اَور ہنر ہوگا، یا مثلاً یہ شعر ع

کنار و بوسہ و وصلش چگوئیم چوں نخواہد شد،

یعنی جب یہ ہونا نہیں ہے تو اسکا ذکر کیا کروں، اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں،

خوش نوائی | صاحب ذوق صاف محسوس کرتا ہے، کہ خواجہ صاحب کے کلام میں ایک خاص قسم کی خوشگواری پائی جاتی ہے، شاعری میں موسیقی بھی شامل ہے، اسلئے جو شعر موسیقی، اور خوش نوائی سے الگ ہوگا شاعری کے رتبہ سے گھٹا ہوگا، خواجہ صاحب کے کلام میں یہ وصف مختلف اسباب سے پیدا ہوتا ہے، اکثر وہ غزلوں کی بحریں ایسی رکھتے ہیں جو موسیقی سے مناسبت رکھتی ہیں، شعروں کے ارکان اور انکے ٹکڑے ایسے لاتے ہیں، جو تال اور سم کا کام دیتے ہیں، اس غرض کے لئے اکثر ہموزن الفاظ کا پے درپے آنا مدد دیتا ہے اور گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ بار بار تان آکر ٹوٹتی ہے مثلاً،

چو در دست رودے خوش بزن مطرب سرودے خوش　　کہ دست افشاں غزل خوانیم و پاکوباں سر اندازیم

یکے ز کفر می لافد دگر طامات می بافد　　بیا کیں داوری ہا را بہ پیش داور اندازیم

اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد　　من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

شراب ارغوانی را گلاب اندر قدح ریزیم　　نسیم عطر گرداں را شکر در مجمر اندازیم

سرو روان من چرا میل وطن نمیکند　　ہمدم گل نمی شود، یاد وطن نمی کند

دردم از یارست و درماں نیز ہم　　دل فدائے او شد و جاں نیز ہم

گر ز دست زلف مشکینت خطای رفت رفت　　ور ز ہندوی شما بر من جفای رفت رفت

ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے، قدما کے کلام میں صنائع لفظی یعنی صنعت اشتقاق، ترصیع، ایہام نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں مراعات النظیر کو (تناسب لفظی) جو حد سے گذر کر ضلع جگت بن جاتی ہے سلمان ساوجی نے رواج دیا اور کچھ زمانہ تک بڑے زور و شور سے جاری رہی، ان صنعتوں کو عموماً شعرا نے محض صنعت کی حیثیت سے استعمال کیا یعنی اس لحاظ سے کہ اسکا التزام دقت آفرینی ہے اور دقت آفرینی ایک کمال کی بات ہے، اس عام رو سے خواجہ صاحب بھی نہ بچ سکے، چنانچہ مراعات النظیر اور ایہام و طباق اُن کے ہاں بھی جا بجا پائے جاتے ہیں، مثلاً،

تا دل ہرزہ گرد من رفت بہ چین زلف او زاں سفر دراز خود قصد وطن نمی کند

سخا نماند سخن طے کنم شراب کجا است بدہ بہ شادی روح رواں حاتم طے

ع نان حلال شیخ ز آب حرام ما،

لیکن خواجہ صاحب نے زیادہ تر اُن لفظی صنعتوں کو لیا ہے جن سے خوش آہنگی اور خوش نوائی پیدا ہوتی ہے مثلاً،

ایں کہ می گویند آں بہتر ز حسن یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

اس شعر میں این و آں کا جو مقابلہ ہے اسکو ایک سطحی النظر یہ خیال کریگا کہ مراعات النظیر یا صنعت اضداد ہے لیکن ایک صاحب ذوق سمجھ سکتا ہے کہ ان دو لفظوں کی آواز کا تناسب ایسا ہے جو خود بخود کانوں کو خوش معلوم ہوتا ہے اور موسیقی کی حیثیت سے دیکھیں تو گویا گیت کے اجزا ہیں، مثلاً،

قاصد حضرت سلمےٰ کہ سلامت بادا چہ شود گر بہ سلامے دل ما شاد کند

اس میں سلمیٰ سلامت اور سلام جو ملتے جلتے الفاظ آئے ہیں ان سے عام آدمی کو صنعت اشتقاق کا خیال پیدا ہوگا، لیکن اصل میں یہ متناسب الفاظ ذرا ذرا سے فاصلہ پر بار بار آ کر کانوں کو خوش آیند معلوم ہوتے ہیں. یا مثلاً،

اے صبا گر بہ جواناں چمن باز رسی خدمت از ما برساں سرو و گل و ریحان را

اس شعر میں سرو و گل و ریحان جو الفاظ آئے ہیں، عام لوگ اسکا نام مراعات النظیر
یا صنعت اعداد وغیرہ رکھینگے لیکن اس شعر کی بحر اور اُس میں خاص ان متناسب الوزن
الفاظ کا اخیر میں آنا ایک خوش نوائی پیدا کرتا ہے جو دوسری صورت میں ممکن
نہی حالانکہ یہ ممکن تھا کہ وہ صنعتیں باقی رہتیں،

خواجہ صاحب کے کلام میں جہاں اس قسم کی صنعتیں نظر آئیں غور سے دیکھو
تو ان میں در اصل خوش نوائی اور خوش آہنگی کا وصف ملحوظ ہوتا ہے ملاحظہ ہو،

اعتمادے نیست بر دور جہاں　　بلکہ بر گردون گردان نیز ہم
از بہر بوسۂ ز لبش جہاں ہمی دہم　　اینم نمی ستاند و آنم نمی دہد
شیوۂ ناز تو شیریں خط و خال تو ملیح　　چشم و ابروی تو زیبا قد و بالای تو خوش
بدہ ساقی می باقی کہ در جنت نخواہی یافت　　کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلا ر
گر ز دست زلف مشکینت خطای رفت رفت　　ور ز ہندوی شما بر من جفای رفت رفت
برق عشق ار خرمن پشمینہ پوشی سوخت سوخت　　جور شاہ کامران گر بر گدائے رفت رفت
گر دلم از غمزۂ دلدار بارے برد برد　　در میان جان و جاناں ماجرائے رفت رفت

غور کرو ان اشعار میں جہاں جہاں مکرر الفاظ آئے ہیں کسقدر کانوں کو خوش
معلوم ہوتے ہیں، ظاہر بین انکو صنعت تکرار کہدیگا، لیکن کیا ہر جگہ کسی لفظ
کا مکرر آنا کوئی لطف پیدا کرتا ہے،

کاروان رفت و تو در خواب و بیابان در پیش　　کے روی؟ رہ ز کہ پرسی؟ چہ کنی؟ چوں باشی

مصرع اخیر میں تمکو خیال ہوگا کہ اسکی خوبی صرف یہ ہے کہ پے در پے سوالات آئے
ہیں جس سے صنعت استفہام پیدا ہوگئی ہے، لیکن اس سے قطع نظر کرکے دیکھو
یہ الفاظ کسطرح کانوں کو ایک خاص متناسب کھٹکا دیتے ہیں اور خوش آیند معلوم ہوتے ہیں

خدا را رحمے اے منعم کہ درویش سر کویت　　درے دیگر نمی داند، رہ دیگر نمی گیرد

بندش کی چستی

بندش کی چستی ایک وجدانی چیز ہے اسکی تعریف اور تحدید نہیں ہوسکتی
لیکن مذاق صحیح آسانی سے اسکو احساس کرتا ہے، مثلاً ان اشعار میں باوجود اتحاد

مضمون اورالفاظ کے بندش کی چستی کا جو فرق ہے ہر شخص محسوس کر سکتا ہے،

سلیم مشاطہ را جمال تو دیوانہ می کند | کائینہ راخیال پری خانہ میکند
صائب دل رانگاہ گرم تو دیوانہ می کند | آئینہ رارخ تو پری خانہ می کند
غنی ہرکس کہ دید روے تو دیوانہ میشود | آئینہ ازرخ تو پری خانہ میشود
صائب سرچشمۂ حیات لب می چکاں اوست | عمر دوبارہ سایۂ سرو رواں اوست
نظیرت عیش ابد بہ کام دل دردمند تست | عمر دوبارہ سایۂ سرو بلند تست
صائب ہمیشہ صاحب طول امل غمیں باشد | کہ چین بقدر بلندی در آستین باشد
بیدل دستگاہت ہر قدر بیش است کلفت بیشتر | در خور طول است چین جاے کہ دارد آستین

خواجہ صاحب جیسا کہ خود انھوں نے متعدد موقعوں پر تصریح کی ہے سلمان اور خواجو کی غزلوں پر غزلیں لکھتے ہیں، ان غزلوں کے مقابلہ کرنے سے بندش کے زور اور چستی کا فرق صاف نظر آجاتا ہے،

سلمان | حافظ
ہمچناں مہر تو ام مونس جان است کہ بود | گوہر مخزن اسرار ہمان است کہ بود
ہمچناں ذکر تو ام ورد زبان است کہ بود | حقۂ مہر بداں مہر ونشان است کہ بود

مونس جان کے قافیہ کے جواب میں خواجہ صاحب کا شعر ہے،

از صبا پرس کہ ما را ہمہ شب تا دم صبح | بوے زلف تو ہماں مونس جان است کہ بود

سلمان | حافظ
شوقم افزوں شدہ آرام کم وصبر نماند | عاشقان بندۂ ارباب امانت باشند
در فراق تو ولے عہد ہمان است کہ بود | لاجرم چشم گہر بار ہمان است کہ بود

اس شعر میں سلمان کی بندش کی سستی صاف ظاہر ہے "در فراق تو" کا موقع پہلے مصرع کے ابتدا میں ہے وہاں سے الگ ہو کر ولے کے ساتھ اسکی ترکیب بالکل بے مزہ ہو گئی ہے

سلمان | حافظ
کے بود کے کہ بگویند سراسر اغیار | طالب لعل وگہر نیست وگرنہ خورشید

کہ فلاں یار ہماں یار فلاں است کہ بود
ہمچناں درعمل معدن کان است کہ بود

در ازل عکس مئی لعل تو در جام افتاد
عکس روی تو چو در آئینۂ جام افتاد

عاشق سوختہ دل در طمع خام افتاد
عارف از پرتو می در طمع خام افتاد

جام کے قافیہ میں حافظ کے اور اشعار ملاحظہ ہوں،

آں شد اے خواجہ کہ در صومعہ بازم بینی
کار من بارخ ساقی ولب جام افتاد

سلمان | حافظ

عشق بر کشتن عشاق تفادل می کرد
صوفیان جملہ حریف اند و نظر باز ولے

اولیں قرعہ کہ زد بر من بدنام افتاد
زاں میان حافظ سودا زدہ بدنام افتاد

خال مشکیں تو در عارض گندم گوں دید
درخم زلف تو آویخت دل از چاہ زنخ

آدم آمد زپے دانہ و در دام افتاد
آہ کز چاہ بروں آمد و در دام افتاد

ان اخیر کے دونوں شعروں کے مقابلہ سے بندش کی چستی کا مفہوم تمکو علانیہ واضح ہو جائیگا، سلمان کا شعر اگرچہ معنی کے لحاظ سے بالکل ناموزوں ہے، چہرہ کو دام سے کوئی مناسبت نہیں بخلاف اسکے خواجہ صاحب نے ذقن کو چاہ اور زلف کو دام کہا ہے اور یہ عام مسلمہ تشبیہ ہے، لیکن سلمان کے شعر میں بندش کی جو چستی ہے خواجہ صاحب کے شعر میں نہیں' مصرع آدم آمد زپے دانہ و در دام اُفتاد، آدم، دانہ، دام، یہ الفاظ ایسی ترتیب اور خوبصورتی اور روانی سے جمع ہو گئے ہیں کہ مصرع میں نہایت برجستگی پیدا ہو گئی ہے، خواجہ صاحب کا مصرع پھُس پھُسا ہے' اور خصوصاً آہ کے لفظ نے مصرع کو بالکل کم وزن کر دیا ہے،

سلمان | حافظ

دام زلف تو بہر حلقہ طنابے دارد
آں کہ از سنبل او غالیہ تابے دارد

چشم مست تو بہر گوشہ خرابے دارد
باز با دل شدگان ناز و عتابے دارد

خون چشم من ازاں ریخت کہ تا ظن نبرم
چشم من کرد بہر گوشہ رواں سیل سرشک

کہ بہرش مردم صاحب نظر آبے دارد
تا سہی سرو ترا تازہ بہ آبے دارد

سلمان	حافظ
رسن زلف تو سر رشتۂ جان من وشمع	ماہ خورشید نمایش زپس پردہ زلف
ہر یکساز آتش رخسار تو تابے دارد	آفتابے است کہ درپیش سحابے دارد
آں کہ ز ابرو و مژہ تیر و کمانے دارد	شاہد آں نیست کہ موے ومیانے دارد
چشم با کردہ سیہ قصد جہانے دارد	بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

ان مقابلوں سے بندش کی چستی اور زور کا مفہوم اچھی طرح تمہاری سمجھ میں آگیا ہوگا، اب خواجہ صاحب کے اشعار ذیل کو اس نظر سے دیکھو،

آں شمع سر گرفتہ دگر چہرہ بر فروخت	واں پیر سالخوردہ جوانی ز سر گرفت
آں عشوہ داد عشق کہ مفتی ز رہ برفت	واں لطف کرد دوست کہ دشمن حذر گرفت
زنہار زاں عبارت شیرین و دلفریب	گوئی کہ پستۂ تو سخن در شکر گرفت
من ایستادہ تا کنمش جاں فدا چو شمع	او خود گذر بمن چو نسیم سحر نہ کرد
ماہی و مرغ دوش نہ خفت از فغان من	واں شوخ دیدہ بین کہ سر از خواب بر نہ کرد
بالا بلند عشوہ گر سرو ناز من	کوتاہ کرد قصۂ زہد دراز من
دیدمش خرم و خنداں قدح بادہ بدست	وندراں آئینہ صد گونہ تماشا می کرد
گفتم ایں جام جہاں بیں بتو کے داد حکیم	گفت آں روز کہ ایں گنبد مینا می کرد
زلفیں سیہ خم بہ خم اندر زدہ باز	بخت من شوریدہ بہم بر زدہ باز
بر شیشہ صبرم زدہ سنگ ولیکن	با تو چہ تواں گفت کہ ساغر زدہ باز

ہمارے نزدیک حسن کلام کا بڑا جوہر یہی حسن بندش ہے،

جاحظ کا قول ہے کہ مضمون بازاریوں تک کو سوجھتے ہیں، جو کچھ فرق اور امتیاز ہے، لطف ادا اور بندش کا ہے، سینکڑوں مثالیں موجود ہیں، کہ ایک مضمون کسی شاعر نے باندھا بعینہ وہی مضمون دوسرے نے باندھا الفاظ تک اکثر مشترک ہیں لیکن لفظوں کے الٹ پلٹ اور ترتیب سے وہی مضمون کہاں سے کہاں پہنچ گیا،

شوخی و ظرافت | خواجہ صاحب کے کلام میں جابجا شوخی اور ظرافت بھی ہے لیکن نہایت لطیف اور نازک ہے، شیخ سعدی اور خیام بھی ظرافت کرتے ہیں، لیکن زیادہ کھل جاتے ہیں، خواجہ صاحب کی شوخی طبع کی لطافت دیکھو،

واعظ شہر کہ مردم ملکش میخوانند — قول ما نیز ہمین است کہ او آدم نیست

یعنی واعظ کو لوگ فرشتہ کہتے ہیں، اسقدر تو ہمکو بھی تسلیم ہے کہ وہ آدمی نہیں ہے (باقی فرشتہ ہے! یا شیطان اس کا فیصلہ ہوتا رہیگا)

بہ کوے مے فروشانش بہ جامے در نمیگیرند — زہے سجادۂ تقوی کہ یک ساغر نمی ارزد

گر ز مسجد بہ خرابات شدم عیب مگیر — مجلس وعظ دراز ست و زمان خواہد شد

یعنی ہیں اگر مسجد سے اُٹھ کر شراب خانہ میں چلا گیا تو اعتراض کی کیا بات ہے وعظ تو ابھی دیر تک ہوتا رہیگا، میں پی کے چلا آؤ نگا،

اسی مضمون کو قائم نے اردو میں ادا کیا ہے،

مجلس وعظ تو تا دیر رہیگی قائم — یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

حافظ

محتسب خم شکست و بندہ سرش — سن بالسن والجروح قصاص

قرآن مجید میں قصاص کی آیت میں مذکور ہے کہ زخم کا بدلہ زخم ہے، مثلاً اگر کوئی کسی کا دانت توڑ ڈالے تو اسکا بھی دانت توڑ ڈالا جائیگا،

خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ محتسب نے خم شراب کو توڑ ڈالا تھا، میں نے قصاص کے حکم کے موافق اسکا سر توڑ دیا،

پدرم روضۂ رضوان بدو گندم بفروخت — ناخلف باشم اگر من بہ جوے نفروشم

میرے باپ (حضرت آدم) نے بہشت کو گیہوں کے بدلہ میں بیچ ڈالا تھا، میں اگر ایک جو کے بدلہ میں نہ بیچوں تو ناخلف ہوں،

من و انکار شراب! این چہ حکایت باشد — غالباً این قدرم عقل کفایت باشد

میں اور شراب کا انکار!! غالباً مجھے تو اتنی ہی عقل کافی ہے، یعنی یہ سمجھ لوں

کہ شراب چھوڑنا مجھکو زیبا نہیں، اس سے زیادہ عاقل اور دور اندیش ہونا مجھکو ضرور تھا۔

من ز بے عملی در جہاں ملولم و بس — ملامت علماہم ز علم بے عمل است

میں بیکاری سے (یعنی شراب وغیرہ کا مشغلہ نہیں ہے) دل گرفتہ ہوں، بے عمل ہونا برا ہے، اسی لئے عالم بے عمل بھی اچھا نہیں ہوتا،

نقدے کہ بود مرا صرف بادہ شد — قلب سیاہ بود بہ جائے حرام رفت

قلب دل کو بھی کہتے ہیں اور کھوٹے سکہ کو بھی، اس بنا پر کہتے ہیں کہ میرا قلب اگر شراب میں صرف ہوا تو ہونا ہی چاہیئے تھا، ع مال حرام بود بجائے حرام رفت

تسلسل مضامین ایشیائی غزل گوئی کا ایک بڑا عیب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی خیال کو مسلسل نہیں ظاہر کر سکتے، ہر غزل متحد اور مختلف بلکہ متناقض مضامین کا مجموعہ ہوتی ہے، غزل کے جو مہمات مضامین ہیں مثلاً حسن، عشق، سراپائے معشوق، وصل، ہجر، ہزاروں دفعہ بندھے ہیں لیکن ان میں سے کسی مضمون کی نسبت کوئی مسلسل اور تفصیلی بیان کہیں نہیں مل سکتا، اگرچہ حقیقت میں یہ چنداں اعتراض کی بات نہیں مسلسل خیالات کے لئے مثنوی کی صنف متعین کردی گئی ہے قصائد اور قطعات سے بھی یہ کام لیا جاتا ہے، غزل اس ضرورت کے لئے خاص کردی گئی ہے کہ چھوٹے چھوٹے مفرد خیالات جو شاعر کے دل میں آتے رہتے ہیں ضائع نہ جانے پائیں اس صنف کیلئے نہایت قادر الکلامی درکار ہے، یورپ کو اپنی شاعری پر ناز ہے، لیکن وہ کسی خیال کو دو چار شعروں سے کم میں نہیں ادا کر سکتے۔ بخلاف اسکے ہمارے شعراء نہ صرف چھوٹی چھوٹی باتیں بلکہ نہایت وسیع اور بڑے مضامین کو بھی ایک شعر میں ادا کردیتے ہیں، جو اختصار کی وجہ سے فوراً زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں، تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ بعض مضامین ایسے ہوتے ہیں جو نہ اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ انکے لئے مثنوی یا قصائد کی وسعت درکار ہو نہ اتنے مختصر کہ ایک دو شعروں میں سما جائیں، اسلئے اس قسم کے مضامین کے لئے غزلیں ہی مناسب ہیں، اس صورت میں ضرور ہے کہ غزل مسلسل ہو یعنی پوری

غزل یا غزل کے متعدد اشعار ایک ہی مضمون کیلئے خاص کر دئے جائیں، اس قسم کی غزل کا رواج اگرچہ عام نہیں ہوا تاہم جستہ جستہ پائے جاتے ہیں اور سب سے پہلے خواجہ صاحب نے اسکو ترقی دی انکی اکثر غزلوں میں ایک خاص خیال یا ایک خاص سماں دکھایا گیا ہے، اس قسم کی چند غزلوں کے مطلع ہم نقل کرتے ہیں،

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند ۔۔۔ وندران ظلمت شب آب حیاتم دادند

بود آیا کہ در میکدہا بکشایند ۔۔۔ گرہ از کار فرو بستۂ ما بکشایند

بامدادان کہ بہ خلوت گہ کاخ ابداع ۔۔۔ شمع خاور فگند بر ہمہ اطراف شعاع

ای پیک پی خجستہ چہ نامی فدیت لک ۔۔۔ ہرگز سیاہ چردہ ندیدم بدایں نمک

گر دست زلف مشکینت خطائے رفت رفت ۔۔۔ در زہندوی شما برمن جفائی رفت رفت

کنوں کہ درچمن آمد گل از عدم بوجود ۔۔۔ بنفشہ در قدم او نہاد سر بسجود

(بہار کے ذکر میں)

یاد باد آں کہ نہانت نظری بابا بود ۔۔۔ رقم مہر تو بر چہرۂ ما پیدا بود

پوری غزل میں پہلی دلچسپیوں کو یاد دلایا ہے، اور ہر شعر یاد باد سے شروع ہوتا ہے،

خوشا شیراز و وضع بے مثالش ۔۔۔ خداوندا نگہدار از زوالش

(شیراز کی تعریف میں ہے)

نسیم صبح سعادت بداں نشاں کہ تو دانی ۔۔۔ خبر بہ کوئے فلاں بربداں زماں کہ تو دانی

(قاصد سے پیغام کہا ہے)

ابن یمین فرلویدی

باپ کا نام محمود ہے، قوم کے ترک تھے، اور ترکستان وطن تھا،
سلطان محمد خدابندہ کے زمانہ میں خراسان میں آئے اور فرلوید میں جو
ایک قصبہ کا نام ہے قیام اختیار کیا، یہاں زمین اور جائدادیں خریدیں
یہ الجائتیو سلطان کا عہد حکومت تھا، اور علاء الدین محمد وزیر السلطنۃ تھے
علاء الدین نے انکی نہایت قدر دانی کی، شعر کہتے تھے یہ رباعی انکے انداز
کلام کا نمونہ ہے،

دارم زعتاب فلک بوقلموں — وزگردش روزگار خس پرور دوں
چشمے چو کنارۂ صراحی ہمہ اشک — جانے چو میانۂ پیالہ ہمہ خوں

ابن یمین فرلوید میں پیدا ہوئے، باپ نے شاعری کی تعلیم دی، اکثر جس طرحوں
پر خود کہتے تھے، بیٹے سے بھی کہلاتے تھے، چنانچہ اوپر کی رباعی پر انکی رباعی بھی ہے
دارم زجفای فلک آئینہ گوں — پر آہ وسے کہ سنگساز وگردوں خوں
روزسے بہ ہزار غم بہ شب روز آرم — تا خود فلک از پردہ چہ آرد بیروں

ابتدا میں سربداروں کی مداحی کرتے تھے،
بالآخر فقر و قناعت اختیار کی، اور شاہی تعلقات سے کنارہ کش ہوگئے
تھوڑی سی زمین قبضہ میں تھی اس کی کاشتکاری سے زندگی بسر کرتے
تھے، ۸ جمادی الثانی ۷۶۹ھ میں وفات پائی، مرتے وقت یہ رباعی
کہی تھی،

منگر کہ دل ابن یمیں پرخوں شد — بنگر کہ ازیں سرائے فانی چوں شد
مصحف بہ کف و چشم بہ رہ، روی بہ دوست — با پیک اجل خندہ زناں بیروں شد

کلام | ان کا دیوان سربداروں کے ہنگامہ میں ضائع ہوگیا،
ید بیضا میں لکھتے ہیں کہ میں نے ان کا دیوان دال کی ردی
ہے، لیکن یہ غالباً قطعات کا دیوان ہوگا، تذکروں
ہے کہ ابتداء میں وہ غزل اور قصائد سب کچھ کہتے تھے، ید
ان کی غزل کے بعض اشعار نقل کیے ہیں،

سرمہ اے دیدہ ہردم اشک غمازمرا — تا نسازد فاش پیش مردمان رازمرا

زخود بیگانہ بودن در رہ عشق — بہ آں معشوق طرح آشنائی است

عشق تا در دل آمد نہ در آمد نہ نمود — بادہ پرشور نشد تاکہ بہ مستاں نہ رسید[1]

ان اشعار سے اگرچہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ غزل میں کم مایہ نہیں، لیکن ان کا خاص رنگ اخلاقی شاعری اور اس میں قناعت اور خود داری ان کا خاص حصہ ہے، ان مضامین کو ان سے بہتر آجتک کوئی ادا نہ کر سکا، اور چونکہ ان کا قال، حال کی تصویر ہے، اس لئے ایک خاص اثر رکھتا ہے۔ جو ہر شخص کے کلام میں پیدا نہیں ہو سکتا،

دو قرص نان اگر از گندم است یا از جو — دو تای جامہ اگر کہنہ است یا خود نو
بہ چار گوشۂ دیوار خود بہ خاطر جمع — کہ کس نگوید ازیں جا بخیز و آنجا رو
ہزار بار فزوں تر بہ نزد ابن یمیں — ز فر مملکت کیقباد و کیخسرو

اگر دو گاؤ بدست آوری و مزرعۂ — یکے امیر و یکے را وزیر نام کنی

---

[1] یہ تمام حالات ید بیضا سے اور تذکرۂ دولت شاہ سے لیے گئے ہیں،

چو کفاف معاش تو، نشود روی و نان جوے از یہود، وام کنی
ان بہ کہ از پے خدمت کمر بہ بندی و بر مرد کے سلام کنی

رد روزے سوال سلیمان مرسل علیہ السلام
چوں بینی ایں سلطنت کز پدر مراماند با ایں ہمہ احتشام
چہ خوش گفت دیوانہ اوراجواب کہ چوں نیست ایں مملکت مستدام
پدر مدتے آہن سرد کوفت تو در باد پیمودے نے صبح وشام

حضرت داؤد زرہ بنایا کرتے تھے، اور حضرت سلیمان کی نسبت مشہور ہے کہ اُن کا تخت ہوا پر چلتا تھا، فارسی میں آہن سرد کوفتن، اور باد پیمودن کے معنے بیکار کام کرنے کے ہیں، دیوانہ نے حضرت داؤد کے زرہ بنانے اور حضرت سلیمان کے تخت ہوا پر چلنے کو آہن سرد کوفتن اور باد پیمودن سے تعبیر کیا ہے،

مرد آزادہ درمیان گروہ گرچہ خوش گوی و عاقل و دانا است
محترم آنگہے تواند بود کہ از ایشاں بہ مالش استغنا است
واں کہ محتاج خلق شد، خوار است گرچہ در علم بو علی سینا است

شنیدہ ام کہ یکے عقربے زخانۂ خویش بروں دوید وہمی زد ہر آنچہ آمد پیش
بہ پیشش آمد سنگے عظیم و بس منکر بزد بہ سنگ دو صد نیش تا بگرد وریش
سنگ نعرہ بر آمد کہ خویش رنجہ مدار کہ ضرب نیش تو ما را نہ کم کند و نہ بیش
اب دادش و گفتش کہ راست میگوئی ولے پدید کند ہر کہ ہست جوہر خویش

اعری نیست پیشہ کہ از اں رسدت نان و نیز ترہ بہ دوغ
تی سخت زشت و بے معنی است اجرتے خواستن براے دروغ

زاں بود کار شاعراں بے نور　　کہ ندارد چراغ کید[illegible]

قناعت اور توکل کے ساتھ یہ نکتہ بھی ابن یمین [illegible]
ہے کہ زر کے بغیر اطمینان نہیں حاصل ہوتا، چنانچہ فرما[illegible]

لالہ را گفتم اے پری پیکر　　سیرتت خوب و صورتت [illegible]
راست گو ایں سیہ دلی از چیست　　نگرت زحمتے رسید از دو [illegible]
گفت زیرا کہ من ندارم زر　　زر کہ اسباب شادکامی از وست
غنچہ را بیں کہ خردہ دارد　　مے نہ گنجد ز خرمی در پوست

کبھی کبھی فلسفہ کہہ جاتے ہیں،

زدم از کتم عدم خیمہ بہ صحرائے وجود　　از جمادے بہ نباتے سفرے کردم و رفت
بعد ازانم کشش نفس بہ حیوانی برد　　چوں رسیدم بوے از وے گذرے کردم و رفت
بعد ازاں در صدف سینۂ انساں بہ صفا　　قطرۂ ہستی خود را گہرے کردم و رفت
با ملائک پس ازاں صومعۂ قدسی را　　گرد بر گشتم و نیکو نظرے کردم و رفت
بعد ازاں رہ سوے او بردم و چوں ابن یمین　　ہمہ او گشتم و ترک دگرے کردم و رفت

تمام شد

Vol. 3

شعر العجم

حصّۂ سوم

فغانی سے ابو طالب کلیم تک

مادۂ تاریخ آغاز تصنیف
تاریخ عجم
سنہ ۱۳۲۴ھ

مادۂ تاریخ اختتام تصنیف
تذکرہ
سنہ ۱۳۲۵ھ

مصنفہ

شبلی نعمانی

بفرمائش
مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

سنہ ۱۹۴۶ء

ام حافظ محمد عالم عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپی

قیمت عہ/۸

شعر العجم

حصّہ سوم

فغانی سے ابوطالب کلیم تک

مادۂ تاریخ اختتام تصنیف	مادۂ تاریخ آغاز تصنیف
تذکرہ	تاریخ عجم
۱۳۲۵ ہجری	۱۳۲۴ ہجری

مصنفہ

شبلی نعمانی

بفرمایش
شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ
لاہور
باہتمام حافظ محمد عالم عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپی
سنہ ۱۹۴۶ء
قیمت ۲ روپے

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
فارسی شاعری کا دور آخر،		خانخاناں اور عرفی،	
تیموری دور میں شاعری،		جہانگیر کے دربار میں رسائی،	
اس دَور کی خصوصیتیں،		وفات	
فغانی شیرازی		اخلاق و عادات،	
فیضی		تصنیفات،	
فیضی کا خاندان اور ولادت،		دیوان کی ترتیب،	
دشمنوں کی مخالفت،		کلام پر رائے،	
اکبر کے دربار میں رسائی،		نظیری کی نکتہ چینی عرفی پر،	
ملک الشعرائی کا خطاب،		عرفی کی نسبت فیضی کی رائے،	
دکن کی سفارت،		عرفی کی شاعری کی خصوصیات،	
وفات		عشقیہ شاعری اور عرفی،	
عام حالات اور اخلاق و عادات		فلسفہ،	
فیضی کا مذہب،		**نظیری**	
تصنیفات،		عام حالات و عادات،	
شاعری،		نظیری کی خصوصیات،	
عرفی		پہلی خصوصیت،	
ابوالفتح کے دربار میں رسائی		دوسری خصوصیت،	
		تیسری خصوصیت	

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
چوتھی خصوصیت،		مرزا صائب اور ظفر خاں،	
پانچویں خصوصیت،		ایران کو واپس جانا،	
چھٹی خصوصیت،		عام حالات و عادات،	
ساتویں خصوصیت،		میرزا صائب کی بیاض،	
آٹھویں خصوصیت،		کلام پر رائے،	
طالب آملی		**ابوطالب کلیم**	
ہندوستان میں آنا،		عام حالات،	
عبداللہ خاں کا طلب کرنا،		شاعری،	
جہانگیر کے دربار میں رسائی،		قصائد،	
اعزہ و اولاد،		غزل،	
اخلاق و عادات،		قوت تخئیل،	
شاعری،		روزمرہ محاورہ،	
میرزا صائب		... ...	
ہندوستان میں آنا			

ایرانی شاعری
کا
دورِ آخر

ایران میں تیموری خاندان کا اخیر فرماں روا، سلطان حسین میرزا تھا اسکے آخری زمانے میں سلطنت صفویہ کا آغاز ہُوا جسکی اجمالی کیفیت یہ ہے، کہ شیخ صفی الدین آردبیلی ایک مشہور خاندان سادات کے سجادہ نشین تھے انکی اولاد میں سلطان حیدر ایک بزرگ پیدا ہوئے جنکے مرید ترمزی رنگ کی بارہ گوشے کی ٹوپی پہنتے تھے اور اس مناسبت سے قزلباش کہلاتے تھے جسکا لفظی ترجمہ سرخ سر ہے وہ ایک معرکہ میں شہید ہو گئے، انکے صاحبزادے شاہ اسمٰعیل نے محرم ۹۰۵ھ ہجری میں ستر آدمیوں کے ساتھ آذر بائیجان پر چڑھائی کی اور رفتہ رفتہ اپنی جماعت اس قدر بڑھائی کہ شروان پر حملہ آور ہو کر وہاں کے فرمانروا کو شکست دی، انہوں نے ۲۵ برس کی مدت میں ایک وسیع سلطنت قائم کر لی اور حکومت صفویہ کی

بنیاد ڈالی، ۹۳۰ھ ہجری میں ان کا انتقال ہوگیا،
ان کے بعد ان کے بیٹے طہماسپ نے سلطنت کو اور زیادہ ترقی دی چنانچہ فوج کی تعداد ایک لاکھ چودہ ہزار تک پہنچائی اور دُور دُور تک کے صوبے فتح کرکے ۵۵ برس حکومت کرکے ۹۸۴ھ ہجری میں وفات پائی، ان کے بعد ان کا بیٹا اسمٰعیل مرزا اور پھر اسکے بعد اسکا بیٹا شاہ عباس ۹۹۵ھ ہجری میں فرمانروا ہُوا شاہ عباس وسعت حکومت اور انتظامات ملکی میں دوسرا اکبر یا شاہجہان تھا اس نے ایران کو اس سرے سے اُس سرے تک زیر نگیں کیا، اُزبکوں سے خراسان چھینا، آئینیہ پر فتح حاصل کی، عراق عرب کو مسخر کیا، ترکوں سے برابر کی صلح کی، غرض خراسان سے لیکر عراق تک اسکی حدود حکومت میں آگیا، اس نے ملک کی امن و امان آبادی، اور سرسبزی کے لئے جو جو کام کئے، ہندوستان کا تیموری خاندان بھی نہ کرسکا، ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک کاروان سرائیں بنوائیں، جن میں مسافروں کے لئے سلطنت کی طرف سے تمام چیزیں مہیا رہتی تھیں، والہ داغستانی اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے،

جمیع عمارات معظمہ ایران بنا کردۂ آں شہریار است، چندیں شہر در مازندران و خراسان و عراق و آذربائجان ساختہ است، خصوصاً اصفہان را کہ رشک جنان نمودہ، تازنے بجہت مہمانداری مسافران بحر و بر بستہ بود کہ در جمیع مراحل و منازل از یک ہزار وا ز ہزار تا دہ ہزار از غریب و تونگر از رعیت و سپاہ کہ از بومی و غریب ہرکس و ہر قدر بودند، در کاروان سراہا کہ ساختہ است، ہرگاہ وارد می شدند ہماں لحظہ مایحتاج حتیٰ بستر و فراش در خور ہر کس ملازمان شاہی کہ بایں کار گماشتہ بودند، حاضر می کردند و ظروف در کمال تکلف از چینی و غوری وغیرہ در ہر منزل و مکان آں قدر بودہ کہ بہ مسافران را کفایت ہمی کرد و باز بہ تحویلداران مکان سپردہ می شد و ایں امر بیشتر از عراق تا مازندران بودہ و در اطراف و بلاد دیگر نیز رواج داشتہ لیکن نہ بایں افراط،

شاہ عباس نے ۴۴ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۰۳۸ھ ہجری میں وفات

پائی اس کے بعد شاہ صفی اور اسکے بعد شاہ عباس ثانی تخت نشین ہوا اور ۱۰۷۷ھ ہجری میں وفات پائی۔

اس خاندان نے اگرچہ سُنّی مذہب کو نہایت ظلم اور بے رحمی اور سفاکی کے ہاتھ ایران سے معدوم کر دیا، یعنی جو لوگ شیعہ مذہب قبول نہ کرتے تھے وہ قتل کر دیے جاتے تھے، چنانچہ ماثر الامراء وغیرہ میں اس کی متعدد داستانیں نقل کی ہیں۔

لیکن بہرحال تمام ملک میں یکسوئی پیدا ہو گئی، اتنا بڑا وسیع ملک جھگڑوں سے پاک ہو گیا تمدن و تہذیب[1] کو نہایت ترقی ہوئی، ہر چیز میں حد سے زیادہ نفاست اور تکلف شروع ہوا، اس کا اثر شاعری پر بھی پڑا، اور اس لئے شاعری میں نہایت لطافت اور نزاکت پیدا ہو گئی۔

صفوی خاندان خود صاحب علم و فضل اور سخن سنج اور سخن شناس تھا، اس لئے اس نے شعر کی نہایت قدر و منزلت کی۔

شاہ عباس ایک دفعہ کوکبۂ شاہی کے ساتھ جا رہا تھا، اُدھر سے حکیم شفائی مشہور شاعر آ رہا تھا، شاہ عباس نے سواری سے اُترنا چاہا، شفائی نے بڑے اصرار سے روکا تاہم امرا اور درباری گھوڑے سے اُتر پڑے[2]، شاہ عباس اکثر مسیح کاشی کے گھر اُن سے ملنے جایا کرتا تھا،

چونکہ اسی زمانے میں ہندوستان میں تیموری خاندان شاہانہ فیاضیوں کا دریا بہا رہا تھا اور ایران کے شعرا دولت کی کشش سے ادھر کھچے چلے آتے تھے اس لئے صفوی خاندان اور بھی رقیبانہ حوصلہ مندیوں پر مجبور ہوتا تھا، لیکن ایران سے اس معرکہ میں آخر ہندوستان ہی نے بازی جیتی

---

[1] خدانخواستہ اسکے یہ معنی نہیں کہ سُنّی مذہب کے مٹانے کو تہذیب و تمدن میں دخل ہے بلکہ غرض یہ ہے کہ اگر کسی ملک میں مذہبی نزاعیں مٹ جائیں تو ضرور ملک میں ترقی ہوگی، اگر ایران میں شیعہ مذہب بالکل مٹ جاتا تب بھی یہی نتیجہ ہوتا۔

[2] سرو آزاد۔

ہندوستان میں اگرچہ شاعری بابر کے ساتھ آئی، چنانچہ آتشی قندھاری جسکا یہ مطلع مشہور ہے۔

بیا در کشتی چشم نشین و سیر دریا کن
سرشکم رفتہ رفتہ بے تو دریا شد تماشا کن

بابر کے ساتھ ہندوستان میں آیا، لیکن شاعری کی تربیت بیرم خانخانان سے شروع ہوئی، وہ خود پختہ کار شاعر تھا اور ترکی اور فارسی، دونوں زبانوں میں کہتا تھا، اکثر شعرا اسکے دربار میں ملازم تھے **نظیری** سمرقندی نے اسکے اشارہ سے شاہنامہ ہمایونی لکھنا شروع کیا تھا اور کئی داستانیں نظم کیں، چنانچہ جب سکندر لودی کا معرکہ نظم کرکے سنایا تو بیرم خانخانان نے اس پر نکتہ چینی کی، نظیری نے بیرم خاں کی اصلاح اور ہدایت کے موافق ایک رات میں چارسو شعر لکھ کر سنائے اور بیش بہا صلہ حاصل کیا، بدایونی نے بعض اشعار نقل بھی کئے ہیں[1]،

اکبر گو اُمّی تھا لیکن نہایت خوش ذوق اور قدردان سخن تھا، اس نے ملک الشعرائی کا خاص عہدہ قائم کیا، جس پر سب سے پہلے **غزالی** مامور ہوا، اکبر کی فیاضیاں دیکھ کر ایران کے تمام شعرا ہندوستان میں اُمنڈ آئے۔ اکبری شعرا کی فہرست جو ابو الفضل نے آئین اکبری میں درج کی ہے حسب ذیل ہے،

حکیم ثنائی، غزالی، عرفی، نظیری نیشاپوری، حزنی اصفہانی، قاسم کاہی، میلی ہروی، جعفر بیگ قزوینی، خواجہ حسین مروی، حیاتی گیلانی، شکیبی صفاہانی، انیسی شاملو، صالحی ہروی، محوی ہمدانی، صرفی ساوجی، قراری گیلانی، عتابی نجفی، ملا صوفی مازندرانی، جدائی مرزی، وقوعی نیشاپوری، خسروی قاینی، دخائی سپاہانی، شیخ ساقی، رفیعی کاشانی، غیرتی شیرازی، حالتی، سنجر کاشی، جذبی، تشبیہی کاشی، اشکی قمی، اسیری رازی، فہمی رازی، قیدی شیرازی، پیروی ساوجی، کامی سبزواری، پیامی، سید محمد ہروی، قدسی کربلائی، حیدری تبریزی، سامری، فریبی شاہ پور، فسونی شیرازی، نادری ترشیزی، نوعی مشہدی، باباطالب اصفہانی، سرمدی اصفہانی، دخیل اصفہانی، قاسم ارسلان مشہدی،

---

[1] بدایونی جلد سوم صفحہ ۱۸۰،

غیوری[۴۹] حصاری، قاسمی[۵۰] ماژندرانی، رہی نیشاپوری[۵۱]،
یہ وہ لوگ ہیں جو دربار میں پہنچے،
ابوالفضل ان ناموں کو لکھ کر لکھتا ہے، ''د آنانکہ سعادت بازنہ یافتند واز دور دستہا گیتی خداوندرا ستایشگر، بس انبوہ'' چوں قاسم گونابادی، ضمیری سپاہانی، وحشی بافقی، محتشم کاشی، ملک قمی، ظہوری ترشیزی۔ ولی دشت بیاضی، نیکی، صبری نگاری، حضوری، قاضی نوری، صافی طوفی طبریزی، رشکی ہمدانی، ان میں سے بھی بجز دو تین کے سب ہندوستان میں آئے تھے۔
اکبر اور جہانگیر وغیرہ سلاطین، خود صاحب مذاق اور نکتہ سنج تھے اسلئے شعراء فن شعر میں ترقی کرنے کی کوشش کرتے تھے، اسکے ساتھ چونکہ تقرب حاصل کرنے کی غرض سے ہر شاعر دوسرے سے بڑھ جانا چاہتا تھا، اس لئے خود بخود ان سخن سنجوں کے کلام میں زور پیدا ہوتا جاتا تھا، اور ہر ایک اپنے کلام میں کوئی نہ کوئی جدت پیدا کرتا تھا،
اکبر نے بارہا اساتذہ کے اشعار پر نکتہ چینیاں کیں، اور نقادان فن نے اس کی تنقید کی داد دی، ایک دفعہ کسی نے فغانی کا یہ شعر پڑھا۔

مسیحا یار و خضرش ہمرکاب و ہم عنان عیسیٰ — فغانی آفتاب من بدیں اعزاز می آید

اکبر نے برجستہ اصلاح دی، **مصرع**
فغانی شہسوار من بدیں اعزاز می آید

جہانگیر کا ذوق شاعری اسی قدر صحیح تھا جس قدر ایک بڑے نقاد فن کا ہو سکتا ہے، جس شاعر کی نسبت اس نے جو کچھ لکھ دیا ہے، اس سے بڑھ کر اس کے متعلق ریویو نہیں کیا جا سکتا، طالب آملی ایک مدت تک اس کے دربار میں شاعری کرتا رہا، لیکن اس نے ملک الشعرائی کا خطاب اسکو اسوقت دیا جب وہ درحقیقت اس منصب کے قابل ہوا، چنانچہ خود لکھتا ہے،

دریں تاریخ (تخت نشینی کے چودھویں سال) طالب آملی بخطاب ملک الشعرائی خلعت امتیاز پوشیدہ، چوں رتبہ سخنش از ہمگناں درگذشت، در سلک

شعرائے پایہ تخت منتظم گشت، ایں چند بیت از دست،

پھر چند شعر طالب کے انتخاب کئے ہیں کہ خود طالب اس سے اچھا انتخاب نہیں کرسکتا تھا،

ایک دفعہ خانخانان نے یہ غزل طرح کی، ع ہر یک گل زحمت صد خار میباید کشید، مراد صفوی اور مرزا مراد نے بھی اس طرح میں غزلیں لکھیں، طرح کا مصرع چونکہ نہایت شگفتہ تھا جہانگیر نے فی البدیہ مطلع کہا،

ساغر مے بر رخ گلزار[1] می باید کشید　　ابر بسیار ست مے بسیار می باید کشید

طرح کا مصرع جامی کی غزل کا ہے، جہانگیر نے پوری غزل نکلوا کر دیکھی، لیکن چونکہ یہی ایک مصرع کام کا تھا، تزک میں لکھتا ہے۔

"ایں مصرع ظاہر شد کہ از مولانا عبد الرحمن جامی ست، غزل او تمام بہ نظر در آمد غیر ازاں مصرع کہ بطریق مثل زبان زد روزگار شدہ دیگر کارے نساختہ بغایت سادہ وہموار گفتہ بیک"

ایک دفعہ دربار میں امیر الامراء کا یہ شعر پڑھا گیا،

بگذر مسیح از سر ما کشتگانِ عشق　　یک زندہ کردن تو بصد خون برابرست

جہانگیر کے اشارے سے سب نے اس پر غزلیں لکھیں، جہانگیر نے ملا احمد مُہرکن کا شعر پسند کیا۔ چنانچہ یہ تمام واقعہ خود تزک میں لکھا ہے جو حسب ذیل ہے۔

"بہ تقریبے ایں بیت امیر الامرا، خواندہ شد، ع بگذر مسیح از سر ما کشتگان عشق. چوں طبع من موزون ست گاہے بہ اختیار و گاہے بے اختیار مصرعے ورباعی، یا بیتے در خاطرم سر میزند ایں بیت بر زبان گذشت"

از من متاب رخ کہ نیم بے تو یک نفس　　یک دل شکستن تو بصد خون برابر است

چوں خواندہ شد ہر کس کہ طبع نظمے داشت دریں زمین بیتے گفتہ گذرانید، علی احمد مُہرکن کہ احوال او پیش ازیں گذشت، بد نہ گفتہ بود،

---

[1] بر رخ گلزار یعنی گلزار کے سامنے،

[2] تزک جہانگیری مطبوعہ علی گڈھ صفحہ ۳۲۲،

اے محتسب[1] زگریۂ پیر مغاں بترس   یک خم شکستن تو بصد خون برابر است

فرہنگ جہانگیری جب جہانگیر کے سامنے اسکے مصنف نے پیش کی تو جہانگیر نے نہایت قدردانی کی چنانچہ لکھتا ہے۔

"میر عضد الدولہ از آگرہ آمدہ ملازمت نمود، فرہنگے کہ در لغت ترتیب دادہ بہ نظر درآورد، الحق محنت بسیار کشیدہ و خوب پیروی ساختہ و جمیع لغات را از اشعار علماء قدما مستشہد آوردہ، دریں فن کتابے مثل[2] ایں نمی باشد،

ایک دفعہ[3] ایک شاعر نے جہانگیر کی مدح میں قصیدہ لکھ کر پیش کیا، مطلع کا پہلا مصرع یہ تھا ع

اے تاج دولت برسرت از ابتدا تا انتہا

جہانگیر نے کہا تم عروض بھی جانتے ہو؟ شاعر نے کہا نہیں، جہانگیر نے کہا اچھا ہوا ورنہ تمہارے قتل کا حکم ہوتا، پھر مصرع کی تقطیع کر کے بتایا کہ دوسرا رکن یوں آتا ہے "دولت برسرت" اور یہ سخت بے ادبی ہے۔

اس زمانے میں مئی تخلص ایک شاعر تھا جو قوم کا کلال تھا، کلالوں کی قوم شاہی درباروں میں دربانی اور چاؤشی کے لئے مخصوص تھی، مئی نے بہ تقریب شاعری نور جہاں بیگم کے ذریعہ سے جہانگیر کے دربار میں رسائی پیدا کرنی چاہی جہانگیر نے کہا کہ ان لوگوں کا کام چاؤشی اور سواری کا اہتمام ہے، انکو شاعری سے کیا مناسبت، لیکن چونکہ نور جہان کی خاطر عزیز تھی، اجازت دی، مئی نے یہ شعر پڑھا،

مئی بگریہ سردار داے نصیحت گر   کنارہ گیر کہ امروز روز طوفان ست

جہانگیر نے کہا دیکھا وہی اپنے پیشے کی رعایت، دوسرے موقع پر پھر نور جہاں بیگم نے تقریب کی مئی نے مطلع پڑھا،

---

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۱۱۱، [2] تزک جہانگیری صفحہ ۵۹، [3] تذکرہ سرخوش ذکر جہانگیر،

من میروم و برق زنان شعلۂ آہم ـ اے ہمنفسان دور شوید از سرِ راہم

جہانگیر نے ہنس کر کہا وہ اثر کہاں جا سکتا ہے۔[۱]

سلسلۂ سخن میں ہم کہاں سے کہاں نکل آئے، جہانگیر کی لائف لکھنی مقصود نہیں، لیکن یہ دکھانا ہے، کہ ان سلاطین کے دربار میں شعر و شاعری کو جو ترقی ہوئی وہ صرف اسلئے نہ تھی کہ شاعری سے دولت ہاتھ آتی تھی بلکہ زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ یہ سلاطین خود موزون طبع تھے، نقادفن تھے، اچھے برُے کی تمیز رکھتے تھے، موقع بہ موقع شعرا کو ٹوکتے رہتے تھے، ان کو صحیح داد دیتے تھے۔ اسلئے اُن کے دربار حقیقت میں شاعری کی تعلیم گاہ تھے،

دکن میں ابراہیم عادل شاہ کی قدردانی اور فیاضی نے بیجاپور کو ایران کا ٹکڑا بنادیا تھا۔ ظہوری اور ملک قمی اسکے دربار کے ملازم تھے اور اکبری کشش بھی دلّی اور آگرے نہ کھینچ سکی، برہانپور میں نظام شاہ بحری گویا اس فن کا مربی تھا ظہوری نے ساقی نامہ اسی کی شان میں کہا ہے، جسکا بیش بہا صلہ عطا ہوا تھا،

ہندوستان کی یہی فیاضیاں تھیں جنکی بنا پر تمام ایران اِدھر کھچا چلا آتا تھا، خود شعرا کی زبان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے،

میرزا صائب

ہمچو عزم سفر ہند کہ در ہر دل ہست ـ رقص سودائے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

ابو طالب کلیم

اسیر ہندم و زیں رفتن بیجا پشیمانم ـ کجا خواہد رساندن پرفشانی مرغ بسمل را

بہ ایران میرود نالاں کلیم از شوق ہمراہان ـ بپائے دیگران ہمچوں جرس طے کردہ منزل را

زشوق ہند زاں ساں چشم حسرت بر قفا دارم ـ کہ روہم گر براہ آرم نمی بینم مقابل را

علی قلی سلیم

نیست در ایران زمین سامان تحصیل کمال ـ تانیامد سوئے ہندوستان حنا رنگین نشد

---

[۱] تذکرۂ سرخوش ذکرمُلّا،

دانش مشہدی

چوں حنا شب در میان رفتن بہندستان خوش ست ‏ راہ دور ہند پابست وطن دارد مرا

ہندوستان کی قوت کشش اس زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں ہمیشہ سے اسکی قدردانی کے شہرے ایرانیوں کیلئے دم تسخیر تھے، خواجہ **حافظ** کو بادشاہ بغداد نے باربار بلایا، لیکن جگہ سے نہ ہلے، شیراز ہی میں بیٹھے بیٹھے غزلیں لکھ کر بھیجدیں، لیکن دکن سے تحریک ہوئی تو جہاز میں سوار ہوکر ہرمز تک آئے، **جامی** ایران میں تھے لیکن قصیدے ہندوستان میں بھیجتے تھے،

جامی اشعار دلاویز تو جنسیست لطیف ‏ پود ش از حسن بود وز سر معنی تارش

ہمراہ قافلہ ہند رواں کن کہ رسد ‏ شرف عز قبول از **ملک التجارش**

علی نقی کمرہ نے ۳۵ شعروں کا قصیدہ فیضی کی مدح میں لکھ کر بھیجا جس میں کہتا ہے،

مرا فگند بر نظم امورم پرتو **فیضی** ‏ ابو الفیض آں گزیں اکبر و شیخ کبیر من

ہندوستان میں، سلاطین اور شہزادوں کے علاوہ امرا اکثر سخن فہم اور قدردان تھے ان میں **ابو الفتح** گیلانی اور عبد الرحیم **خانخانان** نے شاعری کی اکاڈیمی (بیت العلما) قائم کی، جس کی بدولت شعرا نے اس فن میں نہایت ترقی کی، ابو الفتح ایک خط میں خانخانان کو لکھتا ہے،

قصائدے کہ یاران آں جا گفتہ بودند بشعرا ے ایں جا فرسودہ شد، بنام نامی شماہر گاہ بہ اہتمام می رسد بہ ملازمت فرستادہ خواہد شد ملا عرفی و ملا حیاتی بسیار ترقی کردہ اند۔[۱]

عبد الباقی ماثر رحیمی میں لکھتا ہے،

اکثرے از اعیان دولت وارکان سلطنت بادشاہ مرحوم (اکبر) دست گرفتہ و تربیت کردہ وے (حکیم ابو الفتح) اند و ہر کہ تازہ از ولایت آمدہ

---

[۱] چہار باغ یعنی مکاتیب حکیم ابو الفتح:

بندگی و مصاحبت ایشان اختیار می نموده، چنانچہ خواجہ حسین ثنائی و
میرزا قلی میلی و عرفی شیرازی وحیاتی گیلانی وسائر مستعدان در خدمت
او بوده اند،

شعر کی تاریخی زندگی میں یہ واقعہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستان میں آکر فارسی
شاعری نے ایک خاص جدت اختیار کی، جس کی تفصیل ہم کسی آیندہ موقع پر
لکھینگے، یہ جدت حکیم ابو الفتح کی تعلیم کا اثر تھا، مآثر رحیمی میں ہے،

مستعدان وشعر سنجان این زمان را اعتقاد آن ست کہ تازہ گوئی کہ دریں
زمان درمیانہ شعراء مستحسن است و شیخ فیضی و مولانا عرفی شیرازی وغیرہ
بہ آں روش حرف زدہ اند، بہ اشارہ و تعلیم ایشاں (حکیم ابو الفتح) بودہ
(مآثر رحیمی تذکرہ حکیم حاذق)

اسی طرح خانخاناں کی شاہانہ فیاضیوں اور شاعرانہ نکتہ سنجیوں نے شعر و شاعری
کے حق میں ابر کرم کا کام دیا، خانخانان نے احمد آباد میں ایک عظیم الشان کتب خانہ
قائم کیا جس میں ہر فن کی نہایت نادر کتابیں جمع کیں، ایک عجیب خصوصیت اس
کتب خانے کی یہ تھی کہ جس قدر مشہور شعرا اس کے دربار میں تھے، ان کے
دیوان خود ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کتب خانے میں محفوظ تھے، اکثر شعرا
اس کتب خانے کی خدمت پر مامور تھے، یہیں غزلوں کی طرحیں دیجاتی تھیں
شعرا مشاعرے کرتے تھے، خانخانان خود بھی شریک صحبت ہوتا تھا اور قدردانی
سے دل بڑھاتا تھا، خود بھی ان طرحوں میں غزلیں کہتا تھا،[1]

رسمی قلندر ایک ایرانی درویش شاعر تھا، اس نے خانخانان کی تربیت شعر و
شعرا کا ذکر ایک قصیدے میں تفصیل سے کیا ہے، چنانچہ خانخانان کو مخاطب
کرکے کہتا ہے،

زمین مدح تو آں نکتہ سنج شیرازی (یعنی عرفی) رسید صیت کلامش بہ روم از خاور

[1] اس کتب خانے کا حال مآثر رحیمی کے مختلف مقامات میں درج ہے،

بطرز تازہ مدح تو آشنا گردید | چو روئے خوب کہ یابد زمانہ شطہ زیور
زفیض نام تو فیضی گرفت چوں خسرو | بہ تیغ ہندی اقلیم سبعہ را یکسر
زریزہ چینی خوانت نظیری شاعر | رسیدہ است بجائے کہ شاعران دگر
کنند بہر دہش قصیدۂ انشا ق | کہ خون رشک چکداز دل سخن پرور
سواد شعر شکیبی جو کحل اصفاہان | بہ تحفہ سوئے خراسان برند اہل نظر
زمدحت تو حیاتی حیات دیگر یافت | بلے متقوی طبع عرض بود جوہر
حدیث نوعی و کفوی بیان چہ سازم من | چو زندہ اند بمدح تو تا دم محشر
زنعمت تو بہ نوعی رسید آں مایہ | کہ یافت میر معزی زنعمت سنجر

خانخاناں اس درجے کا سخن سنج تھا کہ اگر وہ شاعری میں پڑتا، تو عرفی اور نظیری کا ہمسر ہوتا، اس طرح میں۔ چندست، بندست، فرزندست تمام مشہور شعرا نے زور آزمائیاں کی ہیں، نظیری اور خانخانان کی غزلیں ہم بالمقابل درج کرتے ہیں، دونوں کا خود موازنہ کرو،

خانخانان	نظیری
شمار شوق ندانستہ ام کہ تا چندست	بحرف اہل غرض قرب بعد ما بندست
جزایں قدر کہ دلم سخت آرزومندست	دل شکستہ ما را ہزار پیوندست
بہ کیش صدق و صفا حرف عہد بیکارست	ازاں ہوم کہ بحسرت نگندہ دیدن او
نگاہ اہل محبت تمام سوگندست	نگہ بگوشۂ چشم ہنوز در بندست
نہ دام دانم و نہ دانہ ایں قدر دانم	نظر دلیر نشد تا مژہ بہ پیش آمد
کہ پائے تا بسرش ہرچہ ہست دربندست	حجاب اگرچہ پر کاہ ست کوہ الوندست
مرا فروخت محبت و لے ندانستم	دو چشم ساکن بیت الحزن بن گردید
کہ مشتری چہ کس ست و بہائے من چندست	کہ من اسیر بمعشوقم او بہ فرزندست
ادائے حق محبت عنایتے ست ز دوست	دراز دستی حسن کہ گل بہ چشم ریخت
دگرنہ خاطر عاشق بہیچ خرسندست	کہ تا بدامنم از جیب در شکر خندست

ازاں خوشم بہ سخنہائے دلکش تو رحیم　　بہ کینہ جوئی افلاک عشق می بازم
کہ اندکے بہ اداہائے عشق مانندست　　کہ ہر کہ دشمن باشد بہ دوست مانندست

نظیری از تو بجاں کندن ست لب بکشاے
بایں قدر کہ بگوئی بمیر خرسندست

دونوں غزلوں کے موازنہ کرنے کا یہ موقع نہیں، لیکن صاحب ذوق سمجھ سکتا ہے کہ خانخاناں کے کلام میں جو صفائی، شُستگی، دلاویزی اور سوز و گداز ہے نظیری کی غزل اس سے بالکل خالی ہے، خانخاناں کی فیاضی اور قدردانی سے جو شعرا اور اہل کمال اسکے دربار میں جمع ہو گئے سلاطین کو بھی یہ بات نصیب نہیں ہوئی، مآثر رحیمی میں ان تمام شعراؤں کا مفصل تذکرہ ہے،

عُرفی نے جب یہ قصیدہ پیش کیا ع　　اے داشتہ درسایہ ہم تیغ و قلم را،
تو ایک لاکھ روپے دلوائے[1]،

عرفی خانخانان کی مدح میں خصوصیت کے ساتھ اپنے کمال سخن کی داد چاہتا ہے کیونکہ جانتا ہے کہ وہ خود اس فن کا حریف ہے، چنانچہ کہتا ہے،

سخن شناسا دیدی و دیدہ باشی ہم　　علو پایۂ من در مقام سحبانی
فلاں مربی و من تربیت پذیر ایں بس　　ز فضل خود چہ دہم لاف ہائے طولانی

مربیان سخن کے سلسلہ میں علی قلی خان، خان زمان، خان اعظم کوکلتاش، ظفر خان، اور غازیخان، کا نام بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، خان زمان، اکبری دربار کے امرائے کبار میں سے تھا، جو بالآخر حریف سلطنت بنکر مارا گیا، وہ خود شاعر اور قدردان سخن تھا، سلطان تخلص کرتا تھا، چنانچہ بدایونی نے شعرا کے ذیل میں اس کا حال لکھا ہے، اکثر شعرا اسکے دربار میں ملازم تھے، ایک دفعہ جب اس نے یہ غزل لکھی،

---

[1] کلمات الشعرا سرخوش ذکر خانخانان۔

باریک چو موئے ست میانے کہ تو داری　　گویا سر آں موست دہانے کہ تو داری

تو اکثر شعرا نے اسکا تتبع کیا، ایکمشاعر نے یہ مطلع لکھا،

گفتم کہ گمانے ست دہانے کہ تو داری　　گفتا کہ یقین ست گمانے کہ تو داری

غزالی جب ایران سے دکن میں آیا اور حسب دلخواہ اُسکی قدردانی نہیں ہوئی۔ تو
خان زمان۔ نے ہزار روپے اور چند گھوڑے بھیجکر بلایا اور یہ قطعہ لکھ کر بھیجا،

اے غزالی بحق شاہ نجف　　کہ سوئے بندگان بیچون آئے

چوں کہ بے قدر گشتہ آں جا　　سر خود گیر زود بیروں آئے

"سر خود گیر" سے ہزار روپے کا کنایہ تھا، کیونکہ غزالی کا پہلا حرف غ ہے جسکے عدد
ہزار ہیں، غزالی دکن سے **جون پور** میں آیا اور جب تک خان زمان زندہ رہا اس
نے اور کسی دربار کی طرف رخ نہیں کیا، جون پور میں آکر اُس نے ایک مثنوی نقش بدیع
لکھ کر پیش کی جس میں ایک ہزار شعر تھے، خان زمان نے وہ صلہ دیا جو سلطان محمود
نہ دے سکا تھا، (فی شعر ایک اشرفی) اس مثنوی کے چند شعر اس لحاظ سے نقل
کرتا ہوں کہ ناظرین خان زمان کی صحیح المذاقی کا اندازہ کرسکیں،

خاک دل آں روز کہ می بیختند　　شبنمے از عشق برو ریختند

دل کہ بہ آں رشحہ غم اندود شد　　بود کبابے کہ نمک سود شد

بے اثر مہر چہ آب و چہ گل　　بے نمک عشق چہ سنگ و چہ دل

ذوق جنون از سر دیوانہ پرس　　لذت سوز از دل پروانہ پرس

خان زمان کے مرنے کے بعد غزالی اکبر کے دربار میں آیا، اور ملک الشعراء
کے خطاب سے ملقب ہوا، خاندان تیموریہ میں یہ پہلا شخص تھا جو اس منصب پر ممتاز ہوا،[۳]
الفتی یزدی خان زمان ہی کے دربار میں ملازم تھا،

خان اعظم کوکلتاش اکبر کا رضاعی بھائی تھا اور اسکے ساتھ کھیلا کرتا تھا، اکبر اسکی

---

[۱] کلمات الشعرا سرخوش ذکر خانخانان۔

[۲] خزانہ عامرہ ذکر غزالی۔ [۳] بدایونی جلد سوم تذکرہ الفتی صفحہ ۱۸۹،

نازبرداریاں کرتا تھا، اور کہتا تھا "چہ کنم درمیان من وخان اعظم دریائے شیر حائل ست" خان اعظم نہایت قابل نہایت نکتہ سنج اور بہت بڑا مورخ تھا، جہانگیر اسکی نسبت لکھتا ہے،

درعلم سیر وفن تاریخ استحضار تمام داشت و در تحریر و تقریر بے نظیر بود، و در مدعا نویسی ید طولی داشت، و در لطیفہ گوئی بے مثل بود و شعر ہمواری میگفت ایں رباعی از واردات اوست۔

عشق آمد و از جنوں برومندم کرد | وارستہ ز صحبت خردمندم کرد
آزاد ز بند دین و دانش گشتم | تا سلسلہ زلف کسے بندم کرد

ملا صاحب بدایونی اسکی نسبت لکھتے ہیں "بانواع فضائل و ہنر موصوف ست و بفہم عالی و ادراک بلندا و کسے دیگر را از امرا نشان نمی دہند" ملا صاحب نے اسکا ذکر شعرا کے ذیل میں کیا ہے اور اسکے اشعار بھی نقل کئے ہیں، ایک مطلع سُننے کے قابل ہے،

گشت بیمار دل از رنج و غم تنہائی | اے طبیب دل بیمار چہ می فرمائی؟

خان اعظم نے اکثر شعرا کی تربیت کی جن میں سے جعفر ہروی، سہمی، مدامی، بدخشی، مقیمی، سبزواری کا ذکر بدایونی نے اپنی تاریخ میں کیا ہے،

میرزا غازی قندھار کا صوبہ دار تھا۔ ایران کے شعرا جو کابل اور قندھار کی راہ سے ہندوستان میں آتے تھے۔ پہلے میرزا غازی ہی کے خوان کرم سے فیضیاب ہوتے تھے،

ظفر خان صوبہ دار کشمیر اس رتبہ کا شخص تھا کہ کلیم اور مرزا صائب کو اُسکی اُستادی اور مربی گری کا اعتراف ہے، صائب ایک مدت تک اسکے دربار میں رہا اور اس کی بدولت شاعری میں ترقی کی، ظفر خان اسکے کلام میں موقع بموقع دخل اور تصرف کرتا تھا، صائب نے اپنے دیوان کی ترتیب بھی

سلہ تزک جہانگیری +

اسی کے اشارے سے[1] کی، چنانچہ صائب ان باتوں کا احسانمندی کے ساتھ اعتراف کرتا ہے،

حقوق تربیتت را کہ در ترقی باد ۔۔۔ زبان کجاست کہ در حضرتت فروخوانم
تو جان ز دخل بجا مصرع مرادادی ۔۔۔ تو در فصاحت دادی خطاب سحبانم
ز وقت تو بمعنی شدم چناں باریک ۔۔۔ کہ میتواں بہ دل مور کرد پنہانم
چو زلف سنبل ابیات من پریشان بو ۔۔۔ نہ داشت طرۂ شیرازہ روے دیوانم
تو غنچہ ساختی اوراق باد بردۂ من ۔۔۔ وگرنہ خار نہ ماند از گلستانم

صاحب مآثر الامرا ظفر خان کے حال میں لکھتے ہیں،

زر ہا بمردم ایران میداد خصوصاً در حق شعرا طرفہ بذل وکرم می فرمود ما سخنوران صاحب استعداد دل از اوطان بر داشتہ روی امید بدرگاہش می گزاشتند و بمنتہاے تمنامی رسیدند، افصح المتاخرین میرزا صائب تبریزی چوں از ایران بہ کابل رسید از گرمجوشی و دریا بخشی او دل بستہ محبتش گردید،[2]

ظفر خان نے ایک عجیب مرقع طیار کرایا تھا جو آج ہاتھ آتا، تو لاکھوں روپے کو ارزاں تھا یعنی ایک بیاض تیار کرائی تھی، جس میں ہر شاعر اپنا منتخب کلام خود اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا. اور صفحہ کی پشت پر اسکی تصویر ہوتی تھی،

---

[1] ظفر خان کا نام احسن اللہ خان اور احسن تخلص ہے ظفر خان کا باپ خواجہ ابو الحسن سنہ ۱۰۳۲ ہجری میں جہانگیر کا وزیر اعظم مقرر ہوا اور کابل کی حکومت مستزاد ملی ظفر خاں باپ کی نیابت میں کابل کا صوبہ دار ہو گیا، شاہجہان نے ابو الحسن کو سنہ ۱۰۴۱ ہجری میں کشمیر کا صوبہ دار مقرر کیا، جب وہ اسی سنہ میں انتقال کر گیا تو ظفر خاں کشمیر کا مستقل حاکم مقرر ہوا، ظفر خاں نے اپنے ایام حکومت میں تبت کو فتح کیا، اور سنہ ۱۰۸۱ ہجری میں وفات پائی، ظفر خاں صاحب دیوان ہے، ذیل کے شعر سے اسکی طبیعت کا اندازہ ہوگا،

دلم بکوے تو امیدوار می آید ۔۔۔ نگاہ دار کہ روزے بکار می آید

[2] مآثر الامرا،

اس زمانے میں شاعری کی ترقی کا ایک بڑا سبب یہ ہُوا کہ مشاعرہ کا رواج قائم ہُوا اس سے پہلے شعرا بطور خود، اساتذہ کی غزلوں پر غزل لکھتے تھے اب (یعنی نغانی کے زمانے سے) یہ طریقہ قائم ہُوا کہ کسی امیر صاحبِ مذاق کے مکان پر شعرا جمع ہوتے تھے پہلے سے کوئی طرح دیدی جاتی تھی، سب اس طرح میں غزلیں لکھ کر لاتے تھے اور پڑھتے تھے، کبھی کبھی سرِ محفل برابر کے دعویداروں میں چوٹ چل جاتی تھی، سوال جواب ہوتے تھے اور اس طرح مسابقت اور حریف پیشگی شاعری کو ترقی دیتی جاتی تھی،

ان تمام مجموعی حالات نے شاعری پر جو اثر کیا، اور جو خصوصیتیں پیدا کیں حسب ذیل ہیں،

(۱) غزل کی ترقی،

اگرچہ اس زمانے میں قصیدہ، مثنوی، غزل، رباعی ان تمام اصناف سخن کا بہت بڑا ذخیرہ پیدا ہوگیا، لیکن درحقیقت یہ عہد غزل کی ترقی کا عہد ہے، غزل میں مختلف اسٹائل (طرز) قائم ہوئے جن کی تفصیل یہ ہے،

واقعہ گوئی یا معاملہ بندی | یعنی اُن واقعات اور معاملات کا ادا کرنا جو عشق عاشقی میں پیش آتے ہیں ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ واقعہ گوئی کے موجد سعدی ہیں اور امیر خسرو نے اس پر معتد بہ اضافہ کیا لیکن اس عہد میں یہ ایک مستقل صنف ہوگئی جسکا بانی اول میرزا اشرف جہان قزوینی ہے جو شاہ طہماسپ صفوی کا وزیر تھا، مولوی غلام علی آزاد خزانہ عامرہ میں لکھتے ہیں،

چوں نوبت سخن سنجی بہ میرزا اشرف جہان رسید طبع او مائل وقوع گوئی بسیار افتاد و ایں طرز را بحد کثرت رسانید،

شرف جہان کا دیوان ہمارے کتب خانے میں ہے ہم اس سے اس کتاب کے چوتھے حصے میں کام لیں گے، یہاں ہم انکے بعض اشعار اس غرض سے نقل کرتے ہیں کہ وقوع گوئی کا مفہوم سمجھ میں آسکے،

بامہر کہ بنیمش چو بہ پرسم کہ کیست ایں   گوید کہ ایں ز عہد قدیم آشنای ماست

نہان از و بہ رخش داشتم تماشائی | نظر بجانب من کرد و شرمسار شدم
چناں گوید جواب من کزاں گرد د رقیب آگہ | بمجلس گر من بیدل از و حرفے نہاں پرسم

شرف جہان نے ۹۶۲ سنہ ہجری میں وفات پائی،

اس طرز کو جن لوگوں نے اپنا خاص موضوع بنالیا، وہ وحشی یزدی علی قلی میلی اور علی نقی کمرہ ہیں، وحشی یزدی چونکہ رند اور اوباش مزاج تھا اور بازاری معشوقوں سے اسکو زیادہ سروکار رہا، اسلئے اس طرز کو اسنے کسی قدر اعتدال سے بڑھادیا، واسوخت کی ابتدا بھی اسی نے کی اور اسی پر اسکا خاتمہ بھی ہوگیا،

فلسفہ | غزل میں فلسفہ کی آمیزش عرفی نے خاص طور پر کی، لیکن اس طرز کو بہت ترقی نہیں ہوئی، اسکے ہمعصروں اور مابعد کے شعرا نے بہت کم اس طرز میں کہا،

مثالیہ | یعنی کوئی دعویٰ کرنا اور اس پر شاعرانہ دلیل پیش کرنا، اس طرز کے بانی کلیم علی قلی سلیم میرزا صائب اور غنی ہیں، یہ طرز نہایت مقبول ہوا یہانتک کہ شاعری کے خاتمے تک قائم رہا،

تغزل | تغزل سے یہ مراد ہے کہ عشق اور عاشقی کے جذبات موثر الفاظ میں ادا کئے جائیں یہ وصف اگرچہ لازمہ غزل ہے لیکن نظیری نیشاپوری، حکیم شفائی اور علی نقی نے اسکو زیادہ نمایاں کیا، ان لوگوں میں اور وقوع گویوں میں یہ فرق ہے کہ وقوع گو شعرا ہوس پرست اور بازاری معشوقوں کے عاشق ہوتے ہیں، اور اسی قسم کے واقعات اور خیالات باندھتے ہیں، بخلاف اسکے متغزلین کا معشوق شاہد بازاری نہیں ہوتا، اور نہ ان کا عشق تبذل اور اوباشانہ ہوتا ہے،

خیال بندی اور مضمون آفرینی | یہ وصف تمام متاخرین میں ہے لیکن اس طرز خاص کا نمایاں کرنیوالا جلال اسیر ہے جو شاہ جہان کا ہمعصر ہے، شوکت بخاری، قاسم دیوانہ وغیرہ نے اسکو زیادہ ترقی دی اور ہمارے ہندوستان کے شعرا بیدل اور ناصر علی وغیرہ اسی گرداب کے تیراک ہیں،

قصیدہ، قصیدہ کا ایک خاص طرز عرفی نے قائم کیا جس کی کوئی تقلید نہ کرسکا، ظہوری

طالب آملی، حسین ثنائی نے بھی اس صنف کو کچھ کم ترقی نہیں دی،
مثنوی، مثنوی بالکل اپنے درجے سے گر گئی (فیضی اس سے مستثنیٰ ہے)، مثنوی میں عموماً تاریخی واقعات یا اخلاقی مضامین ادا کئے جاتے ہیں لیکن ان مضامین کے لئے سادگی اور پختگی درکار ہے، متاخرین ہر بات میں رنگینی کے عادی ہو گئے تھے۔ اسلئے مثنوی مثنوی نہیں رہی، بلکہ غزل بن گئی، کلیم کا شاہجہان نامہ پڑھو رزم لکھتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ بزم نشاط میں گانا ہو رہا ہے،
رباعی، یہ زمانہ اس امتیاز پر ناز کرسکتا ہے کہ رباعی نے فلسفہ کے تمام مسائل ادا کر دئے، سحابی استرآبادی جو اکبر کا ہمعصر اور نجف میں معتکف تھا اُسنے کم از کم سترہ ہزار رباعیاں لکھیں جو سرتاپا فلسفہ سے مملو ہیں، اسکا ایک انتخاب جس میں سات ہزار رباعیاں ہیں، ہمارے پاس ہے اور ہم شعر العجم کے چوتھے حصہ میں جہاں فلسفیانہ شاعری پر بحث کرینگے اسکے کلام کا انتخاب پیش کرینگے یہ تمام تفصیل خاص خاص انواع شاعری کے متعلق تھی، عام طور پر طرز ادا اور اسلوب بیان میں جو جدتیں پیدا ہوئیں، اُنکی تفصیل حسب ذیل ہے،
(۱) قدما اور متوسطین کسی خیال کو پیچیدگی سے نہیں ادا کرتے تھے، متاخرین کا یہ خاص انداز ہے کہ جو بات کہتے ہیں پیچ دیکر کہتے ہیں، یہ پیچیدگی زیادہ تر اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ جو خیال کئی شعروں میں ادا ہو سکتا تھا، اسکو ایک شعر میں ادا کرتے ہیں، مثلاً قدسی کہتا ہے۔

عیش ایں باغ باندازۂ یک تنگ دل ست   کاش گل غنچہ شود تا دل ما بکشاید

مطلب یہ ہے کہ دنیا کا باغ ایک نہایت مختصر باغ ہے اس میں اسی قدر وسعت ہے کہ صرف ایک تنگ دل آدمی خوش ہوئے اسلئے یہ نہیں ہو سکتا کہ میرا دل بھی شگفتہ ہو، اور پھول کی کلی بھی کھل سکے، اس بنا پر آرزو کرتا ہے کہ کاش پھول کلی بن جائے، تاکہ میرے دل کی شگفتگی کی گنجایش نکل سکے، اس مضمون کو فلسفیانہ نظر سے دیکھیں تو یہ خیال ادا کرنا مقصود ہے کہ دنیا میں جب کسی کو فائدہ پہنچتا ہے تو اسکے یہ معنی ہیں کہ دوسرے کو

نقصان پہنچا، کسی بادشاہ نے ملک فتح کیا، یعنی دوسرے کو شکست ہوئی،
یہ خیال کسی حیثیت سے دیکھا جائے ایک شعر میں سمانے کے قابل نہ تھا
اسلئے جب ایک ہی شعر میں اُسکو ادا کرنا چاہا تو خواہ مخواہ پیچیدگی پیدا ہوگئی،
کبھی یہ پیچیدگی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ کوئی مبالغہ، یا استعارہ یا تشبیہ
نہایت دور از کار ہوتی ہے، اسلئے سننے والے کا ذہن آسانی سے اُسکی طرف
منتقل نہیں ہو سکتا، مثلاً شوکت بخاری کہتا ہے،

گوش ہا را آشیاں مرغ آتش خوارہ کرد ‏ ‏ ‏ برق عالم سوز یعنی شعلہ غوغاے من

شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے جو آہیں کیں اس قدر گرم تھیں کہ اس سے شعلے نکلے، یہ
شعلے لوگوں کے کانوں میں پہنچے، یہانتک کہ لوگوں کے کانوں میں آگ بھر گئی، اس
بناء پر مرغ آتش خوار نے جس کی غذا آگ ہے کانوں میں اپنا گھونسلا بنا لیا کہ
ہر وقت غذا ملتی رہے،

چونکہ کسی شخص کا ذہن اس طرف نہیں جا سکتا کہ آہ کی گرمی سے کان آتشکدے
بن جائیں گے اسلئے مضمون آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتا،

(۲) اس زمانے کے اکثر مضامین کی بنیاد الفاظ پر اور صنعت ایہام پر ہے
یعنی لفظ کے لغوی معنی کو ایک حقیقی بات قرار دے کر اسپر مضمون کی بنیاد قائم کرتے
ہیں، مثلاً

بر زبان افتادن کے اصطلاحی معنے مشہور ہونا ہے، لیکن لغوی معنی "زبان پر پڑنا ہے" مضمون
کی بنیاد اسی لغوی معنی پر ہے لکھتا ہے کہ کمزوری اور ضعف میں میں کچھ آج سے مشہور نہیں
ایک مدت سے کہ میں زبانوں پر چڑھ گیا ہوں، زبان پر پڑنے کے معنے چونکہ اصطلاح
میں مشہور ہونے کے ہیں، اسلئے یہ دعوے صحیح ہے لیکن شاعر لغوی معنی لے کر
ضعف کو یوں ثابت کرتا ہے کہ میں اس قدر ضعیف ہوں کہ لوگوں کی زبانوں پر
چڑھا پھرتا ہوں +

متاخرین کی شاعری سے اگر ایہام کو الگ کر دیا جائے، تو انکی شاعری کا بہت بڑا

حصہ دفعۃً برباد ہوجائے گا،

(۳) اس دور کا بڑا امتیازی وصف، استعارات کی نزاکت اور جدت تشبیہ ہے، تمدن کی ترقی میں جس طرح تمام اسباب معاشرت و تمدن میں تکلفات پیدا ہوجاتے ہیں، اسی طرح زبان اور خیالات میں بھی نزاکت اور تکلفات پیدا ہوجاتے ہیں مثلاً "آنکھیں فرش راہ ہیں"، گو بجائے خود اچھا استعارہ ہے لیکن **نظیری** کہتا ہے۔

می خواست بوسہ رخصت اقامت بگسترد　　　　از فرش جبہہ راہ بر آں خاک کو نہ بود

بوسہ چاہتا تھا کہ بستر اڈا لے لیکن اُس کی گلی میں اس قدر پیشانیوں کا فرش بچھا ہُوا تھا کہ جگہ نہ تھی،

یا مثلاً **شانی** کہتا ہے،

شانی دلت بکجکلہان مائل ست باز　　　　ایں لالہ را بطرف کلاہ کہ میسزنی

یعنی اے شانی تیرا دل کجکلاہوں پر مائل ہو رہا ہے۔ اس پھول کو کس کی ٹوپی میں لگانا چاہتا ہے۔

استعارات کی جدت و نزاکت، متاخرین کا عام انداز ہے، لیکن اس خاص وصف میں **طالب آملی** سب سے زیادہ ممتاز ہے،

(۴) اس زمانے میں الفاظ کی نئی تراشیں اور نئی نئی ترکیبیں کثرت سے پیدا ہوئیں، مثلاً پہلے میکدہ، آتشکدہ وغیرہ مستعمل تھے، اب نشترکدہ، مرہم کدہ وغیرہ ترکیبیں پیدا ہوئیں، یا مثلاً پہلے یک گلشن گل یک چمن گل کہتے تھے اب ایک خندہ لب یک آغوش گل، یک دیدہ نگاہ وغیرہ کہنے لگے، اس قسم کی ترکیبیں **عرفی، فیضی، نوعی**، نے کثرت سے پیدا کیں، ان ترکیبوں سے اکثر جگہ مضمون کا اثر بڑھ جاتا ہے، مثلاً

ع، شکن بروی شکن خم بروی خم چینید،

ع، موج بر موج شکستم چو بہ عمان رفتم،

ع، بہر یک لب خندہ نتواں منت شادی کشید،

ع، روئے بروئے حسن کن دست بدست ناز دہ،

اس سے زیادہ یہ کہ ایک بڑا خیال، ایک چھوٹے سے لفظ سے ادا ہو جاتا ہے مثلاً یہ شعر،

بہ دور گردی من از غروری خسند حریف سخت کمانے کہ در کمین دارم

کنایہ یہ تھا کہ میں معشوق سے محبت کرتا ہوں لیکن الگ، الگ رہتا ہوں کہ تیر عشق کا گھائل نہ ہو جاؤں، لیکن معشوق میرے اس کترائے پھرنے پر ہنستا ہے کہ میری زد سے بچ کر کہاں جائیگا، اس خیال کے ادا کرنے کے لئے دور گردی کا لفظ نہ ہو تو ایک شعر میں یہ مطلب ادا نہیں ہو سکتا تھا،

چونکہ ان تمام خصوصیات کی زیادہ تفصیل ان شعرا کے کلام کے ذیل میں آئے گی جن کے ہاں یہ خصوصیات زیادہ پائے جاتے ہیں، اس لئے اس موقع پر ہم گرہ کو زیادہ نہیں کھولتے۔

فغانی شیرازی

تمام اہل فن اور ارباب تذکرہ کا اتفاق ہے کہ متوسطین کی شاعری میں انقلاب پیدا ہو کر جو نیا دور قائم ہوا جو متاخرین اور نازک خیالوں کا دور کہلاتا ہے، اس کا بانی فغانی ہے لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ ایسے شخص کے حالات بھی ارباب تذکرہ دو چار سطر سے زیادہ لکھنا گوارا نہیں کرتے، بہر حال ایک ایک نکتہ کا سراغ لگا کر جو سرمایہ ہاتھ آیا ہے وہ نذر احباب ہے،

فغانی کا وطن شیراز ہے، سام میرزا نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "پہلے چاقو بنایا کرتے تھے" شاعری کا آغاز تھا کہ ہرات میں آئے اس زمانے میں شاعری کا جو انداز مقبول عام تھا، سلطان حسین میرزا کے شعرا کا انداز تھا، چونکہ فغانی کا رنگ ان سے الگ تھا، اسلئے کسی نے انکی قدر نہ کی بلکہ ان کے کلام کو اس قدر لغو سمجھتے تھے کہ جب کسی کا کوئی مہمل شعر پڑھا جاتا تھا تو کہتے تھے فغانیہ ہے، جامی اسوقت تک زندہ تھے، فغانی اُن سے ملے، لیکن اُن سے بھی فغانی کو داد نہ ملی، بالآخر تبریز میں آئے، یہاں سلطان یعقوب فرمانروا تھا، اس نے انکی نہایت قدر دانی کی، چنانچہ انہوں نے اسکی مدح میں قصیدے لکھے جو دیوان میں موجود ہیں، سلطان نے ان کو باباکا خطاب[۲] دیا، سلطان یعقوب کے انتقال کے بعد ابیورد میں آکر قیام کیا،

نہایت لاابالی مزاج اور رند تھے، شراب حد سے زیادہ پیتے تھے اکثر میخانوں میں گذرتی تھی اسی بناپر ابیورد کے حاکم نے انکا روزینہ شراب اور گوشت مقرر کر دیا تھا اخیر عمر میں توبہ کی اور مشہد میں معتکف ہو گئے، ۹۲۵ھ ہجری میں وفات پائی،

شروع میں جب اپنے بھائی کی دکان میں چھری بنایا کرتے تھے تو اس مناسبت سے سکاکی تخلص[۳] رکھا تھا، پھر فغانی رکھا،

---

[۱] تذکرہ عرفات اوحدی، [۲] ید بیضا، [۳] عرفات اوحدی،

ان کا دیوان ایک لڑائی کے ہنگامے میں ضائع ہو گیا تھا، بھائی کو خط لکھا، کہ جہاں کہیں سے جو کچھ مل سکے جمع کرو، چنانچہ جگہ جگہ سے تلاش کر کے وہ مجموعہ مرتب ہوا جو آج موجود ہے، لیکن اصل مرتب شدہ دیوان جاتا رہا،

کلام پر رائے | انکو تمام اہل سخن مجدد فن مانتے ہیں، والہ داغستانی لکھتے ہیں، بابائے مغفور مجتہد فن تازہ ایست کہ پیش ازوے احدی بآں روش شعر نہ گفتہ و پایہ سخنوری را بجائے رسانیدہ کہ عنقاے اندیشہ پیرامون او نمی تواند پرید اکثر اُستادان زمان مولانا وحشی یزدی و مولانا نظیری نیشاپوری و مولانا ضمیری اصفہانی و خواجہ حسین ثنائی و مولانا عرفی شیرازی و حکیم شفائی اصفہانی و حکیم مسیحا رکنائے کاشی و مولانا محتشم وغیرہم متتبع و مقلد و شاگرد و خوشہ چین خرمن طرز و روش او یند،

متاخرین کی جو خصوصیتیں ہیں اُنکو ہم تمہید میں لکھ چکے ہیں فغانی کے کلام میں وہ خصوصیتیں متوسط حد تک موجود ہیں، ورنہ اصلی ترقی عرفی، نظیری، شرف قزوینی وغیرہ نے دی ہے، ہم صرف کلام کے نمونے پر اکتفا کرتے ہیں،

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست   بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

اے کہ می گوئی چرا جامے بجانے می خری   ایں سخن با ساقی ما گو کہ ارزاں کردہ است

طرز ادا کا لطف دیکھو، معترض کو یہ اعتراض تھا کہ شراب ایسی کیا چیز ہے جو جان کے عوض میں خریدی جائے لیکن اسنے اختصار کیلئے صرف اسقدر کہا کہ تم ایک پیالہ جان کے عوض میں کیوں خریدتے ہو، مے خوار شراب کے لطف کا اسقدر گرویدہ ہے کہ وہ یہ سمجھا کہ اعتراض اس پر ہے کہ شراب اتنی ارزاں کیوں خریدتے ہو، اسکی قیمت تو جان سے بڑھ کر کوئی چیز دینی چاہیئے، اسکا جواب دیتا ہے کہ میں کیا کروں، یہ اعتراض تو ساقی پر کرنا چاہیئے، اُس نے قیمت گھٹا کیوں دی،

بد گفتن من شد ہنر حاسد منکر   صد شکر کہ عیبم ہنر بے ہنران است

خراب آں کمر نازکم کہ چوں مہ نو
بہ شیوہ ہائے بلند از میان زیں پیدا است

ساقی مدام بادہ باندازہ میدہد
ایں بیخودی گناہ دل زود مست ماست

آں کہ ایں نامہ سر بستہ بنشت است نخست
گرہے سخت بسر رشتۂ مضمون زدہ است

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عین اوست
اما نمی تواں کہ اشارت بہ او کنند

بروں خرام کہ بسیار شیخ و دانشمند
خراب آں شکن طرہ و بناگوشند

مقصود صحبت است زگل ورنہ بوئے گل
انصاف اگر بود ز صبا می تواں شنید

آلودۂ شراب فغانی بہ خاک رفت
آہ ار بلا کشش کفن تازہ بو کنند

تا می تواں شکست دل دوستاں مخواہ
کیں خانہ را بہ کعبہ مقابل نہادہ اند

درماندۂ صلاح و فسادیم الحذر
زیں رسمہا کہ مردم عاقل نہادہ اند

با آہ و نالہ گرچہ سر آمد زمان وصل
از نقد عمر آں دو نفس در حساب بود

ہزاراں چارہ ضائع گشت و یکدم نشد ساکن
کنوں درد دگر از پہلوئے ہر چارۂ دارم

تو اے گل بعد ازیں با ہر کہ میخواہد دلت بنشیں
کہ من چوں لالہ با داغ جفایت زیں چمن رفتم

مے میباید و صبرے کہ آرد تاب دیدارش
فغانی گر مے داری تو باش ایں جا کہ من رفتم

از فریب نقش نتواں خامۂ نقاش دید
ورنہ در ایں سقف رنگین جز یکے در کار نیست

ملک الشعرا فیضی

تولد ۹۵۴ھ ہجری، وفات ۱۰ صفر ۱۰۰۴ھ ہجری

فارسی شاعری نے چھ سو برس کی وسیع مدت میں ہندوستان نے صرف دو شخص پیدا کئے، جنکو اہل زبان کو بھی چار و ناچار ماننا پڑا، خسرو اور فیضی میرزا صائب فیضی کی طرح پر غزل کہتے ہیں، اور مقطع میں لیتے ہیں،

ایں آں غزل کہ فیضی شیریں کلام گفت ۔۔۔ در دیدہ ام خلیدہ و در دل نشستہ

علی نقی کمرہ، ایران کے مشہور شاعر نے ایک قصیدہ ۲۵ شعروں کا فیضی کی طرح میں اصفہان سے لکھ کر بھیجا، جس کے چند شعر یہ ہیں[۱]

مرا فگندہ بر نظم مورم پر تو فیضی ۔۔۔ ابو الفیض آں گزیں اکبر و شیخ کبیر من

اگر ہستم مجیر اندر سخن او ہست خاقانی ۔۔۔ وگر من مستجیر آستان او مجیر من

کہم با او رسد در شاعری دعوائے ہمچشمی ۔۔۔ کہ دراں خانقاہم من مرید و اوست پیر من

افسوس یہ ہے کہ شاعری کی شہرت نے فیضی کے اور تمام کمالات پر پردہ ڈال دیا وہ کہتا ہے اور سچ کہتا ہے،

امروز نہ شاعرم نہ حکیم ۔۔۔ دانندہ حادث و قدیم

لیکن شاعری کی شہرت عام اور تصنیفات علمی کی گمشدگی نے اس دعویٰ کو بے دلیل کر دیا فیضی مذہبی اور علمی خیالات کا برائے نام کچھ پتہ چلتا ہے تو ان اتہامات سے جو بدایونی نے نہایت بیدردی سے اُس پر لگائے ہیں، تاہم ایک نکتہ دان کو اس غلط اور جھوٹی تصویر میں بھی اصلیت کے خط و خال نظر آتے ہیں، لیکن ابھی ان بحثوں کے چھیڑنے کا موقع نہیں، ابھی اُسکے سرسری حالات زندگی سننے چاہئیں،

---

[۱] سرو آزاد،

فیضی عربی النسل ہے، اسلاف یمن میں رہتے تھے، شیخ موسیٰ جو فیضی کی پانچویں پشت میں ہیں، وطن سے ترک تعلق کرکے سیاحت کو اُٹھے، اور چلتے پھرتے سندھ کے علاقے میں آئے، ریل ایک قصبہ ہے، یہاں قیام کیا، اور شادی کرلی، دسویں صدی ہجری میں شیخ خضر، فیضی کے دادا وطن چھوڑکر ناگور میں آئے، یہاں ایک عربی خاندان میں شادی کی، جس سے شیخ مبارک پیدا ہوئے، فیضی اسی نخل کمال کا نونہال تھا،
شیخ مبارک بڑے پایہ کا شخص تھا، علوم ظاہری اور باطنی دونوں میں کمال رکھتا تھا، چار جلدوں میں تفسیر کبیر کے انداز پر ایک تفسیر لکھی، جسکا نام منبع العیون رکھا، نہایت سیر چشم اور قانع تھا، شیر شاہی حکومت میں سلطنت کی طرف سے جاہ و عزت کی ترغیبیں دلائی گئیں، لیکن اسکی چشم استغنا نے نظر اُٹھاکر نہ دیکھا، انکے مفصل حالات، ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھے ہیں،
شیخ مبارک، ناگور سے گجرات، اور گجرات سے آگرہ میں آئے، جمنا کے کنارے میر رفیع الدین حسینی کے ہمسایہ میں قیام اختیار کیا، اور یہیں ایک معزز خاندان میں شادی کی، خدا نے کثرت سے اولاد دی، جن میں سب سے پہلا فیضی تھا جو ۹۵۴ھ میں پیدا ہوا، فیضی نے ابتدائی اور انتہائی تعلیم باپ سے حاصل کی،
بدایونی خواجہ حسین مروی کے حال میں لکھتا ہے کہ فیضی اسکا تربیت یافتہ تھا خواجہ حسین مروی، شیخ علاء الدولہ سمنانی کے خاندان سے تھے، معقولات میں ملا عصام الدین کے شاگرد تھے، دینیات، شیخ ابن حجر مکی سے حاصل کی تھی، شاعری انشاپردازی، حسن تقریر، اور ظرافت و لطیفہ گوئی میں کمال رکھتے تھے، اکبر کے حکم سے سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ نظم میں کرنا شروع کیا تھا، ۹۷۹ھ ہجری میں وفات پائی فیضی نے دام ظلہ سے مادہ تاریخ نکالا،
بدایونی نے یہ نہیں لکھا کہ فیضی نے کس فن میں ان سے تربیت پائی تھی، لیکن غالباً یہ شاعری کا فن ہوگا، شباب کو پہنچا تو اس کا دامن کمالات کے پھولوں سے بھرا تھا لیکن قسمت نے مدتوں عجیب عجیب مصیبتوں میں مبتلا رکھا، جسکی

داستان نہایت لمبی ہے لیکن چونکہ دلچسپ بھی ہے اس لیئے بالکل قلم انداز بھی نہیں کر سکتا،

شیخ مبارک کو وسعت نظر اور ہمہ دان ہونے نے تقلید اور تعصب کی بندشوں سے آزاد کر دیا تھا خود حنفی تھا لیکن شیعی، سنی، مسلمان، کافر سب سے ملتا تھا، اس زمانے میں مہدوی فرقہ نہایت مطعون خلائق تھا، شیخ کو ان سے ملنے میں بھی دریغ نہ تھا، عوام میں شہرت پھیلی کہ شیخ رافضی ہے، مہدوی ہے، دہری ہے، سو، اتفاق یہ کہ اسی زمانے یعنی ۹۷۰ھ ہجری میں کہ اکبر کی سلطنت کا چودھواں برس تھا، شیخ گوشہ عزلت سے نکل کر افادۂ عام کی مسند پر بیٹھا اکبر اس زمانے تک متعصب مولویوں کے قبضے میں تھا، اسکے بل پر درباریوں کو شیخ کے ستانے کا موقع ملا، ان میں سے ایک شخص آدھی رات کے وقت ہانپتا کانپتا فیضی کے پاس آیا، کہ امرائے دولت سب کے سب آپ کی مخالفت پر کمر بستہ ہیں، مصلحت یہ ہے کہ شیخ کو لیکر کہیں نکل جائیے، جب یہ فتنہ فرو ہو جائے تو پھر اختیار ہے، فیضی گھبرایا ہوا باپ کے پاس آیا، شیخ مبارک نے بڑے استقلال سے جواب دیا کہ میں جگہ سے نہیں ہلتا، جو ہونا ہے ہوگا، لیکن فیضی اس قدر حواس باختہ تھا کہ تلوار نکال کر کہا آپ کو اختیار ہے، چلیئے یا نہ چلیئے، میں تو اپنے آپ کو ہلاک کیئے ڈالتا ہوں،

باپ کو محبت نے مجبور کیا، ابوالفضل کو سوتے سے جگایا، تینوں باپ بیٹے گھر سے نکل کھڑے ہوئے، لیکن کچھ معلوم نہ تھا کہ کہاں جاتے ہیں، چلتے چلتے فیضی کو ایک آشنا کا خیال آیا، اسکے گھر پہنچے، وہ ان لوگوں کو دیکھ کر سخت گھبرایا، مکان کے اندر گئے تو وحشت کدہ دیکھا، وہاں سے بھی چل کھڑے ہوئے، ابوالفضل نے واپس چلنے کی رائے دی لیکن فیضی نے نہ مانا، ایک شخص کا نام لیا کہ اس کے ہاں ضرور امن ملیگا، غرض اسکے گھر پہنچے، اس نے نہایت گرمجوشی کا اظہار کیا دو

۱ھ آئین اکبری میں یہی سنہ ہے، لیکن تعجب ہے کہ خود ابوالفضل نے اکبرنامہ میں فیضی کے اول مرتبہ دربار میں پہنچنے کو بارھویں سال کے واقعات میں بیان کیا ہے،

دن تک یہاں ٹھہرے، اُدھر مخالفوں نے اکبر کو برہم کرکے فرمان شاہی صادر کرایا تھا کہ شیخ مبارک کا سارا خاندان دربار میں حاضر کیا جائے، شاہی چوبدار شیخ مبارک کے گھر پہنچے، اور چاروں طرف پہرے بیٹھ گئے[۱]، ابوالخیر فیضی کا چھوٹا بھائی گھر میں تھا، اسکو پکڑ کر بادشاہ کے سامنے لے گئے، شیخ کے دشمنوں کو اکبر کے بھڑکانے کا موقع ملا کہ شیخ کے دل میں چور نہ ہوتا، تو روپوش کیوں ہو جاتا، اکبر کو مخالفوں کی سختی اور جوش انتقام دیکھ کر رحم آیا، درباریوں سے کہا، ایک غریب گوشہ نشین کی جان کا دشمن بننا کیا ضرور ہے شیخ اکثر سیر کو نکل جاتا ہے، اسوقت بھی کہیں چلا گیا ہوگا، اس بیچارے لڑکے (ابوالخیر) کو کیوں پکڑ لائے ہو، غرض ابوالخیر چھوڑ دیا گیا، اور پہرا بھی اُٹھ گیا،

دشمنوں نے اب بادشاہ کی زبان سے جھوٹی خبریں مشہور کرنی شروع کیں، کہ شیخ مبارک اور فیضی معتوبان بارگاہ ہیں، چند روز کے بعد صاحبخانہ نے بے اعتنائی شروع کی، شیخ کو کھٹکا ہوا، کہ خود صاحب خانہ کہیں پکڑوا نہ دے، رات کو بے سروسامانی کے ساتھ وہاں سے نکلے، اتفاق سے ایک شاگرد راہ میں مل گیا، اُس نے بیجا کر مہمان رکھا لیکن اُسکی طرف سے بھی اطمینان نہ تھا، بالآخر یہ رائے ٹھہری کہ اس شہر سے نکل جانا چاہئے، فیضی بھیس بدل کر نکلا اور ایک امیر کے پاس جس سے قدیم ملاقات تھی گیا، اُس نے میزبانی کو اپنا فخر سمجھا، کچھ ترک جوان ساتھ کر دئے کہ شیخ کو ساتھ لائیں، آدھے بجے فیضی نے جاکر باپ بھائی کو یہ مژدہ سنایا، سب نے بھیس بدلے اور غیر معروف راستوں سے امیر کے پاس پہنچے، دس دن تک یہاں اطمینان سے گذرے لیکن دشمنوں نے امیر کو دربار میں پکڑوا بلایا، مجبوراً یہاں سے بھی نکلنا پڑا، چلتے چلتے ایک باغ نظر آیا ٹھہر گئے کہ ذرا آرام لے لیں، بدقسمتی سے جاسوسوں کا ایک گروہ، جو شیخ کی تلاش میں ہر طرف پھرتا تھا۔ باغ کے پاس اُترا ہوا

---

[۱] اکبر نامہ میں اس واقعہ کی تاریخ ۲. ربیع الاول ۹۷۴ھ

تھا، یہاں سے بھی گھبرا کر نکلے، راستہ میں ایک باغبان نے پہچانا، اور دلدہی کر کے اپنے گھر لے گیا، باغبان کا آقا باہر سے آیا، تو اُس نے شیخ سے شکایت کی کہ میرے ہوتے آپنے کیوں اس قدر تکلیف اُٹھائی، چونکہ شیخ کے قیافے سے بے اطمینانی ظاہر ہوتی تھی، اُس نے چور گھر میں لیجا کر رکھا کہ آپ اطمینان سے رہیئے، مہینے سے کچھ اوپر یہاں قیام کیا،

چونکہ اکبر اس زمانے میں فتحپور میں رہتا تھا، فیضی آگرہ سے فتحپور گیا۔ کہ ان مصیبتوں سے بچنے کی کوئی تدبیر نکالے، لیکن قسمت کی گردش یہاں ساتھ تھی، فیضی نے جب اپنی مظلومی کی داستان سُنائی، تو درباریوں میں سے ایک نیک دل امیر کو اس قدر جوش آیا کہ اُسی وقت اُٹھا اور دربار میں بغیر اسکے کہ شاہی آداب بجالائے، گستاخانہ لہجے میں کہا، کہ اس ظلم کی کچھ انتہا ہے، اکبر نے کہا خیر ہے؟ امیر نے کیفیت واقعہ بیان کی، اکبر نے کہا تم کو خبر بھی ہے؟ تمام علماء نے فتوے تیار کئے ہیں، اور مجھ کو چین لینے نہیں دیتے کہ جہاں سے ہو شیخ مبارک کا خاندان ڈھونڈھ کر پیدا کیا جائے اور اُسکو سزا دی جائے، مجھ کو شیخ کا قیام گاہ معلوم ہے (یہ کہکر اکبر نے خاص چور محل کا پتا دیا، جہاں شیخ کا قیام تھا) لیکن دانستہ ٹالتا ہوں، کل جا کر کوئی شیخ کو دربار میں لائے،

فیضی یہ واقعہ سن کر سخت گھبرایا، راتوں رات گرتا پڑتا باپ کے پاس آیا، اُسی وقت سب نے بھیس بدلے، اور گھر سے نکلے، جس مصیبت اور پریشانی میں گھر سے نکلے ہیں، اُس کی تصویر ابوالفضل نے ان لفظوں میں کھینچی ہے،

نورستان آفتاب، و تاریک ہائے بدگوہر، و ہجوم مسالک شہر، دہنگامہ پژدہندگانِ نافرجام، و یاور ناپدید، و بار انداز نایافت، قلم چوبیں (مزدور) یارا کہ قدرے ازاں حال گزارد،

غرض ایک ویرانے میں جاکر پناہ لی، چونکہ یہ معلوم ہوچکا تھا کہ بادشاہ اپنی ذات سے مہربان ہے اس لئے یہ رائے ٹھہری کہ پائے تخت میں چل کر بادشاہ تک رسائی کے سامان پیدا کئے جائیں، ایک امیر سے پرانی ملاقات تھی، اُس کے پاس گئے، اُس نے کہا کہ پہلے آتے تو معاملہ آسان تھا، اب حضور کے دل میں بھی رنج آگیا ہے، یہاں رہنا کسی طرح مناسب نہیں، یہ کہکر گاڑی منگوائی اور اس میں بٹھا کر ایک گاؤں میں بھجوا دیا، وہاں پہنچکر معلوم ہُوا کہ گاؤں کا رئیس اس خاندان کا قدیمی دشمن ہے، غرض یہاں سے بھی نکلے، اور ایک گاؤں میں پہنچے،

یہاں بھی ایک مفسد کا سامنا ہُوا، اب پھر پھرا کر آگرے میں آئے، اور ایک دوست کے گھر ٹھہرے، دو مہینے تک یہاں قیام رہا، صاحب خانہ نیکدل اور نیک طینت تھا، اور چند لوگ بھی شیخ کے طرفدار پیدا ہو گئے، دربار شاہی میں تقریب ہوئی سنہ ۹۸۱ھ جلوس ہجری میں اکبر نے بڑے احترام سے بلایا، ابوالفضل کی طبیعت میں اس وقت تک نہایت آزادی اور بے پروائی تھی، اس نے دربار میں جانے سے انکار کیا، فیضی گئے اور شاہانہ نوازش سے بہرہ یاب آئے، آئین اکبری میں اس موقع پر پہنچکر ابوالفضل پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور بے اختیار یہ رباعی اس کی زبان سے نکلتی ہے،

رازِ دل من چناں مکن فاش کہ دوش	اے شب نہ کنی آں ہمہ پرخاش کہ دوش
ہاں اے شب وصل آں چناں باش کہ دوش	دیدی چہ دراز بود دوشینہ شبم

فیضی جس شان سے دربار میں پہنچا ہے، شہنشاہ نے جس طرح اُسکی قدر افزائی کی ہے حاسدوں نے جس نگاہ رشک سے اسکو دیکھا ہے، دربار کی جو خدمتیں اُسکو سپر

ملہ یہ تمام تفصیل آئین اکبری میں ہے، تعجب یہ ہے کہ ابوالفضل نے فیضی کے پہلی مرتبہ دربار میں پہنچنے تذکرہ میں ان واقعات کو لکھا ہے، لیکن اس قدر اختصار کیا ہے کہ واقعہ کی صورت بدل گئی ہے، اور بعض بعض بات میں مطلوب بیان مختلف اور متناقض معلوم ہوتے ہیں،

ہوئی ہیں، ان سب حالات کو فیضی نے ایک قصیدے میں لکھا ہے، ہم اسکے جستہ جستہ اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہیں،

سحر نوید رساں قاصد سلیمانی ... رسید ہمچو سعادت کشادہ پیشانی
مبشران سعادت ندا کنان، کہ بخوان ... نجات نامۂ خود اے حزین زندانی
مرا نظارہ اش از دور، بیقراری داد ... چہ بیقراری باصد قرار ارزانی
بہ بوسہ کردم پایش فگار، ازاں غافل ... کہ کار گردد دشوار در قدم ارزانی
شدم سوار سُبک گام توسنے چالاک ... کہ گردی از سرِ دانشں سپہر جولانی
بہ بارگہ شہریار رشد کا نیک ... رسید بر درِ فردوس مرغ بستانی
خطاب شد کہ تلطف کناں رسانندش ... بہ آسمانِ سعادت زینۂ ظلمانی
نخست بوسہ زدم خاک آستاں یعنی ... بہ چشمہ سار رساندم شفاہ عطشانی
اشارہ رفت کہ در پیش گاہ مجلس اُنس ... شگفتہ دل بنشینی وشوق بنشانی
بہ پیش پایۂ اورنگ شاہ بنشستم ... زبان ناطقہ لب ریز در ثنا خوانی
بگونہ گونہ تفقد شہنشہم بنواخت ... کہ پایہ پایہ فرود آمدم ز حیرانی
حدیثِ من بشہنشاہ بندہ پرور بود ... چو با خدائے، کلام کلیم عمرانی
بگفت خیز و علم از قلم بکش کایں روز ... مسلّم است ترا کشور سخن رانی
زبان بنکتہ بجنباں کہ در بدائع نظم ... فرزدقی بتو ارزانی ست وحسّانی
رسید حکم کہ از نکتہ سنجی شعرا ... بہ عرض ما برساں آں قدر کہ بتوانی
زبان دری کہ دگر باتو در سخن پیچد ... سزد بدست ادب گردنش بہ پیچانی
چہ گویم آں کہ ز لطفش چہ طرف بربستم ... ز ہرچہ لازمہ خانی است و ترخانی

یہ تمام داستان (قصیدہ کو چھوڑ کر)، ابوالفضل نے آئین اکبری کے خاتمہ میں لکھی ہے لیکن اس تصریح کو دانستہ قلم انداز کر گیا، کہ شیخ کے خاندان پر یہ تمام آفتیں کس کی بدولت آئیں؟ اور دربار کے تقرب کا سبب کون ہوا؟ اسکے علاوہ ابوالفضل کے بیان سے یہ بھی نہیں کھلتا کہ اسقدر مخالفت اور کینہ پروری کے اسباب کیا تھے؟ اسلئے ان اسباب

کی تفصیل ذیل میں کی جاتی ہے،

اکبر کے ابتدائی دور میں دو شخص مذہبی حیثیت سے نہایت جاہ و اقتدار رکھتے تھے مخدوم الملک اور شیخ عبد النبی، مخدوم الملک کا نام عبد اللہ انصاری ہے، شیر شاہ نے اپنے عہد سلطنت میں انکو صدر الاسلام کا خطاب دیا تھا، سلیم شاہ انکو اپنے تخت پر بٹھاتا تھا، ہمایوں نے شیخ الاسلام کا خطاب دیا تھا، بیرم خان نے لاکھ روپے سالانہ تنخواہ مقرر کی تھی،[۱]

شیخ عبد النبی جو شیخ عبد القدوس گنگوہی کے نواسے تھے، صدارت پر ممتاز تھے، یعنی جسقدر مذہبی اوقاف اور جاگیریں تھیں، سب کا انتظام انکے ہاتھ میں تھا، انہوں نے اکبر کو اس قدر اپنا گرویدہ کیا تھا کہ اکبر انکے گھر پر جاکر ان سے حدیث پڑھتا تھا، انکے فیض صحبت سے اکبر کی مذہبی خود رفتگی کی یہ نوبت پہنچی کہ اپنے ہاتھ سے مسجد میں جھاڑو دیتا تھا،

ایک دفعہ سالگرہ کی تقریب میں اکبر نے کپڑوں پر زعفران کا رنگ چھڑکا، شیخ عبد النبی نے دیکھا تو اس قدر برہم ہوئے کہ لکڑی اٹھا کر ماری، اکبر کو ناگوار ہوا، محل میں جاکر مریم مکانی (اکبر کی والدہ) سے شکایت کی کہ بھرے دربار میں ذلیل کرنا مناسب نہ تھا، مریم مکانی نے کہا کہ بیٹا دل پر میل نہ لانا، یہ نجات اُخروی کا سبب ہے قیامت تک چرچا رہیگا کہ ایک مفلوک الحال نے بادشاہ کے ساتھ یہ برتاؤ کیا، اور اُس نے برداشت کیا،[۲]

یہ دونوں بزرگ جس قدر دیندار تھے، اُسی قدر جاہلانہ تعصب رکھتے تھے، جیسا کہ عام طور پر دینداری کا مقتضی سمجھا جاتا ہے، ان لوگوں نے اکبر کو آمادہ کیا کہ ملک میں جو بدعقیدہ لوگ ہیں، ان کا استیصال کر دیا جائے، چنانچہ عام دار و گیر شروع ہوئی، اور بہت سے لوگ قتل اور قید کئے گئے، مخدوم الملک

---

[۱] مآثر الامراء، تذکرہ مخدوم الملک

[۲] مآثر الامراء، جلد دوم، صفحہ ۵۶۰، حالات شیخ عبد النبی، صدر الاسلام،

اور شیخ عبد النبی نے اکبر سے کہا کہ شیخ مبارک بھی بدعتی ہے، اس کو سزا ملنی چاہیئے، چنانچہ اسی وقت محتسب متعین ہوئے کہ شیخ کو پکڑ لائیں، شیخ گھر میں نہ تھا اس کی مسجد کا منبر توڑ کر چلے آئے[۱]

ایک دفعہ ایک مجلس میں شیخ عبد النبی، یا مخدوم الملک (ابو الفضل نے آئین اکبری میں صاف نام نہیں لیا، بلکہ لکھا ہے کہ سرآمد فتنہ جویان) سے اس قسم کی سختیوں کے متعلق ابو الفضل سے بحث ہو گئی، ابو الفضل نے دلائل سے ان کو بند کر دیا،

اسی زمانہ میں یا اس سے کچھ پہلے فیضی شیخ مبارک کو ساتھ لیکر شیخ عبد النبی کے پاس گیا، اور اپنی شکستہ حالی کا اظہار کر کے کچھ مدد معاش کی درخواست کی شیخ نے شیعیت کا الزام لگا کر، نہایت ذلت کے نکلوا دیا[۲]،

اب یہ دونوں بزرگ اس خاندان کے استیصال پر آمادہ ہوئے، علما سے فتوے لیجا کر جاسوس متعین کئے کہ شیخ کو ڈھونڈھ لائیں، تمام ملک میں مشہور کرا دیا کہ شیخ کے خاندان کے لئے دربار سے قتل کا حکم ہو چکا ہے، شیخ نے پہلے شیخ سلیم چشتی کی خدمت میں التجا کی کہ میری جان بچائیے، شیخ سلیم نے کچھ زاد راہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ سر دست مصلحت یہی ہے کہ کہیں نکل جائیے یہاں سے نا امیدی ہوئی تو میرزا عزیز کے پاس[۳] گیا، مرزا عزیز کی ماں کا دودھ اکبر نے پیا تھا، اسلئے وہ اکبر کی خدمت میں نہایت گستاخ تھا، ابو الفضل نے آئین اکبری میں جو لکھا ہے کہ، ایک امیر نے اکبر کے سامنے نہایت گستاخانہ سفارش کی، اس سے مرزا عزیز ہی مراد ہے، مرزا عزیز نے بارہا اکبر کو سر دربار سخت و سست کہا اور اکبر یہ کہکر چپ ہو جاتا تھا کہ کیا کروں میرے اور عزیز مرزا کے بیچ میں دودھ کا دریا حائل ہے، (دودھ بھائی

---

[۱] بدایونی، صفحہ ۱۹۸،

[۲] مآثر الامرا، جلد دوم، صفحہ ۵۷۵ و ۵۷۶، [۳] بدایونی ۱۹۶،

ہونے کا یہ پاس ہوتا تھا) میرزا عزیز ہی کے توسل سے فیضی کے خاندان کو دربار میں رسائی ہوئی،

اکبر مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی کی تنگ خیالیوں سے تنگ آچکا تھا اور ان لوگوں کے زور کو گھٹانا چاہتا تھا، لیکن خود جاہل تھا اسلئے مذہبی فتووں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، فیضی اور ابوالفضل دربار میں پہنچے تو اکبر کو گویا اوزار ہاتھ آگئے، ان لوگوں نے ہر موقع پر ان متعصبوں کو شکستیں دیں اور ان کا سارا بھرم کھل گیا، چنانچہ تفصیل اس کی آگے آئیگی،

فیضی کا تقرب روز بروز بڑھتا گیا، لیکن اس نے دربار کی کوئی خدمت اختیار نہ کی، طبیب تھا، مصنف تھا، شاعر تھا، اور انہیں مشغلوں میں بسر کرتا تھا، شہزادوں کی تعلیم و تربیت کا کام بھی اس سے متعلق تھا، چنانچہ ۲۴ سنہ جلوس میں شہزادہ دانیال کی تعلیم و تربیت سپرد ہوئی، اور تھوڑے ہی دنوں میں فیضی نے اسکو ضروری مراتب سکھادئیے، جہانگیر نے تزک میں لکھا ہے کہ شہزادہ دانیال ہندی (برج بھاکا) کی شاعری سے واقف تھا اور خود بھی کہتا تھا یہ فیضی ہی کی صحبت کا اثر ہوگا، اسی سنہ میں اکبر نے اجتہاد و امامت کے دعوے سے مسجد میں جاکر خطبہ پڑھا، یہ خطبہ فیضی نے لکھا تھا، چنانچہ تفصیل اس کی آگے آئیگی،

۲۵ سنہ جلوس میں اکبر نے اظہار عقیدت کے لئے شہزادہ دانیال کو اجمیر کی زیارت کے لئے بھیجا تو فیضی کو بھی اسکے ساتھ متعین کیا۔

اکبر نے شیخ عبدالنبی کا زور توڑ کر صدارت کے ٹکڑے کر دئے تھے، چنانچہ ۹۹۰ سنہ ہجری میں آگرہ، کالنجر اور کالپی کی صدارت فیضی کو دی گئی ۹۹۳ سنہ ۳۰ جلوس ہجری میں جب یوسف زئی پٹھانوں پر اکبر نے فوجیں بھیجیں تو فیضی بھی اس مہم پر مامور کیا گیا،

۹۹۶ سنہ ہجری میں جو اکبر کی تخت نشینی کا تینتیسواں سال تھا فیضی کو ملک الشعرا

اور اکبر نامہ (نولکشور) صفحہ ۔ جلد سوم،

کا خطاب ملا، عجیب اتفاق یہ کہ اس سے دو ہی تین دن پہلے فیضی نے ایک قصیدہ لکھا تھا

آں روز کہ فیض عام کردند | مارا ملک الکلام کردند
از بہر صعود فکرت من | آرائش ہفت بام کردند
مارا بہ تمام در ربودند | تا کار سخن تمام کردند

۹۹۷ھ ہجری میں اکبر نے کشمیر کا سفر کیا تو فیضی بھی ساتھ تھا، قصیدہ کشمیر یہ اسی سفر میں لکھا ہے جسکا مطلع یہ ہے،

ہزار قافلۂ شوق میکند شبگیر | کہ بار عیش کشاید بہ خطۂ کشمیر

دکن کی حکومتوں کو جب اکبر نے فتح کرنا چاہا، تو ۳۷ سنہ جلوس مطابق ۹۹۹ھ ہجری میں پہلے ایک ایک کے پاس سفارتیں بھیجیں خاندیس کی سلطنت کا فرمانروا، راجہ علی خان تھا، فیضی کو اسکی سفارت پر متعین کیا، فیضی کو اگرچہ یہ خدمت ناگوار تھی، لیکن قبول کرنیکے سوا چارہ نہ تھا، اس نے سفارت کے معاملات اس خوبی سے انجام دئے کہ راجہ علی خاں نے حلقہ بگوش بن کر آنے کی اطلاع دی فیضی نے برہانپور میں دربار آراستہ کیا، تخت پر شاہی تلوار، خلعت اور فرمان شاہی رکھا گیا، راجہ علی خان دور سے پیادہ ہوا، تخت کے قریب آکر جوتیاں اُتاریں کھڑے ہو کر تین تسلیمیں بجالایا فیضی نے فرمان شاہی دونوں ہاتوں میں ادب سے لیکر کہا کہ حضور نے تمہارے نام فرمان بھیجا ہے، راجہ علی خان نے فرمان دونوں ہاتوں سے تھام کر سر پر رکھا اور تین تسلیمیں بجالایا، اسی طرح خلعت اور تلوار عطا کئے جانے پر تسلیمیں کیں، چنانچہ فیضی نے اپنی عرضداشت میں یہ تمام امور تفصیل سے بیان کئے ہیں، یہاں کی مہم سے فارغ ہو کر احمد نگر میں برہان نظام شاہ سے ملا، اور سفارت کے مراتب انجام دئے،

اس سفر میں اصلی خدمت اگرچہ سفارت کا انجام دینا تھا، لیکن فیضی نے ملک کی ایک چیز پر مبصرانہ نظر ڈالی، اور بادشاہ کو عرضداشت میں مفصل رپورٹ بھیجی، مثلاً راستوں کا کیا انتظام ہے، عہدہ دار اپنی خدمتوں کو کیونکر انجام دیتے ہیں شہروں میں غلہ عام کی

کیا کیا عمارتیں ہیں، قلعوں کی کیا حالت ہے، زمین کیسی ہے پیداوار کیا کیا ہے پھل کیا کیا پیدا ہوتے ہیں، صنعت کے کارخانے کہاں کہاں ہیں، چنانچہ اس رپورٹ کے جستہ جستہ فقرے ہم درج کرتے ہیں،

بلوچی کہ بہ فوجداری مقرر شدہ نزدیک بہ تنگی کوہ درمیان لدھیانہ و سرہند چسپیدہ است، دزدانے کہ از کوہ فرود می آیند، بہ او ہم حق نذری می دہند، یعقوب بدخشی خدمت فوجداری و عملداری تھانیدار و پرگنات ہر دو بواجبی می تواند کرد،

چوں بہ دھول پور رسید، سرائے دیدہ از سنگ بغایت رفیع کہ صادق خان ساختہ، و متصل آں حمام گرمے می باشد، و باغے دلکشا مشتمل بر عمارت دلکش، پسرش رشید آں جا بود، سیر قلعہ گوالیار نیز کردہ شد، و سجاول پور خواجہ امین خویش وزیر خان بہ رعایا سلوک خوب کردہ و تقاوی دادہ و پرگنہ معمور ساختہ، کارخانہائے پارچہ بافی ترتیب دادہ کہ چیرہ و فوطہ (یعنی لنگی)، برائے حضرت می بافتند، برہان پور و حوالی او اندک جائے ست بغایت تنگ، اکثرے بوستان، ہر جا قطعہ زمینے بودہ و مزروع شدہ، از میوہ انجیر خوب میشود، خربزہ فرنگی بشاخ درخت بست، بست و سی، سی خوشہ جنبان ست، خربزہ ہندوستانی ہم ہفتہ باشد کہ رسیدہ"

یہ تو خاص ہندوستان کے حالات تھے، غیر ملکوں کے بھی ہر قسم کے مفید اور ضروری اور قابل اعتنا حالات بہم پہنچائے، اور حسن داشتوں میں اکبر کو لکھے، مثلاً ایک عرضداشت میں لکھتا ہے،

اب کی چھ جہاز ہرمز سے چلے، خواجہ معناے عمدۃ التجار، عراقی گھوڑے لیکر آرہا تھا، فرنگیوں کا قاعدہ ہے، کہ گھوڑے چھین لیجاتے ہیں، اور جو پسند آتا ہے رکھ لیتے ہیں، تین جہاز سدرگاہ چول

غیوری[49] حصاری، قاسمی[50] ماژندرانی، رہی نیشاپوری[51]،
یہ وہ لوگ ہیں، جو دربار میں پہنچے،

ابوالفضل ان ناموں کو لکھ کر لکھتا ہے، "آنانکہ سعادت بازنہ یافتند واز دور دستہا گیتی خداوندرا ستایشگر، بس انبوہ" چوں قاسم گونابادی، ضمیری سپاہانی، وحشی بافقی، محتشم کاشی، ملک قمی، ظہوری ترشیزی، ولی دشت بیاضی، نیکی، صبری ذگاری، حضوری، قاضی نوری، صافی طوفی طبریزی، رشکی ہمدانی، ان میں سے بھی بجز دوتین کے سب ہندوستان میں آئے تھے۔

اکبر اور جہانگیر وغیرہ سلاطین، خود صاحب مذاق اور نکتہ سنج تھے اسلئے شعراء فن شعر میں ترقی کرنے کی کوشش کرتے تھے، اسکے ساتھ چونکہ تقرب حاصل کرنے کی غرض سے ہر شاعر دوسرے سے بڑھ جانا چاہتا تھا، اس لئے خودبخود ان سخن سنجوں کے کلام میں زور پیدا ہوتا جاتا تھا، اور ہر ایک اپنے کلام میں کوئی نہ کوئی جدت پیدا کرتا تھا،

اکبر نے بارہا اساتذہ کے اشعار پر نکتہ چینیاں کیں، اور نقادان فن نے اس کی تنقید کی داد دی، ایک دفعہ کسی نے **فغانی** کا یہ شعر پڑھا۔

مسیحا یار و خضر ش ہم رکاب و ہم عنان عیسیٰ ۔۔۔ فغانی آفتاب من بدیں اعزاز می آید

اکبر نے برجستہ اصلاح دی، مصرع

فغانی شہسوار من بدیں اعزاز می آید

جہانگیر کا ذوق شاعری اسی قدر صحیح تھا جس قدر ایک بڑے نقاد فن کا ہو سکتا ہے، جس شاعر کی نسبت اس نے جو کچھ لکھ دیا ہے، اس سے بڑھ کر اس کے متعلق ریویو نہیں کیا جا سکتا، طالب آملی ایک مدت تک اس کے دربار میں شاعری کرتا رہا، لیکن اس نے ملک الشعرائی کا خطاب اُسکو اُسوقت دیا جب وہ درحقیقت اس منصب کے قابل ہوا، چنانچہ خود لکھتا ہے،

دریں تاریخ (تخت نشینی کے چودھویں سال) طالب آملی بخطاب ملک الشعرائی خلعت امتیاز پوشیدہ، چوں رتبہ سخنش از ہمگناں درگذشت، در سلک

شعرائے پایہ تخت منتظم گشت، ایں چند بیت از دست،

پھر چند شعر طالب کے انتخاب کئے ہیں کہ خود طالب اس سے اچھا انتخاب نہیں کر سکتا تھا،

ایک دفعہ خانخانان نے یہ غزل طرح کی ع ہر یک گل زحمت صد خار میباید کشید،

مراد صفوی اور مرزا امرا دنے بھی اس طرح میں غزلیں لکھیں، طرح کا مصرع چونکہ نہایت شگفتہ تھا جہانگیر نے فی البدیہ مطلع کہا،

ساغرِ مے بر رخ گلزار[1] می باید کشید — ابر بسیار ست مے بسیار می باید کشید

طرح کا مصرع جامی کی غزل کا ہے، جہانگیر نے پوری غزل نکلوا کر دیکھی، لیکن چونکہ یہی ایک مصرع کام تھا، تزک میں لکھتا ہے،

"ایں مصرع ظاہر شد کہ از مولانا عبد الرحمٰن جامی ست، غزل او تمام بہ نظر در آمد غیر ازاں مصرع کہ بطریق مثل زبان زد روزگار شدہ دیگر کارے نساختہ بغایت سادہ و ہموار گفتہ"[2]

ایک دفعہ دربار میں امیر الامراء کا یہ شعر پڑھا گیا،

بگذر مسیح از سرِ ما کشتگانِ عشق — یک زندہ کردن تو بصد خون برابر ست

جہانگیر کے اشارے سے سب نے اس پر غزلیں لکھیں، جہانگیر نے ملا احمد مُہرکن کا شعر پسند کیا۔ چنانچہ یہ تمام واقعہ خود تزک میں لکھا ہے جو حسب ذیل ہے۔

"بہ تقریبے ایں بیت امیر الامراء خواندہ شد: ع بگذر مسیح از سرِ ما کشتگان عشق

چوں طبع من موزوں ست گاہے بہ اختیار و گاہے بے اختیار مصرعے و رباعی، یا بیتے در خاطرم سر میزند ایں بیت بر زبان گذشت"

از من متاب رخ کہ نیم بے تو یک نفس — یک دل شکستن تو بصد خون برابر ست

چوں خواندہ شد ہر کس کہ طبع نظمے داشت دریں زمین بیتے گفتہ گذرانید، علی احمد مُہرکن کہ احوال او پیش ازیں گذشت، بدنہ گفتہ بود،

---

[1] بر رخ گلزار یعنی گلزار کے سامنے،

[2] تزک جہانگیری مطبوعہ علی گڈھ صفحہ ۳۲۳،

اے محتسب[1] زگریۂ پیر مغاں بترس یک خم شکستن تو بصد خون برابر است

فرہنگ جہانگیری جب جہانگیر کے سامنے اسکے مصنف نے پیش کی تو جہانگیر نے نہایت قدردانی کی چنانچہ لکھتا ہے۔

"میر عضد الدولہ از آگرہ آمدہ ملازمت نمود، فرہنگے کہ در لغت ترتیب دادہ بہ نظر در آورد، الحق محنت بسیار کشیدہ و خوب پیروی ساختہ و جمیع لغات را از اشعار علمائے قدما مستشہد آوردہ، دریں فن کتاب بے مثل[2] ایں نمی باشد،

ایک دفعہ[3] ایک شاعر نے جہانگیر کی مدح میں قصیدہ لکھ کر پیش کیا، مطلع کا پہلا مصرع یہ تھا ع

اے تاج دولت بر سرت از ابتدا تا انتہا

جہانگیر نے کہا تم عروض بھی جانتے ہو؟ شاعر نے کہا نہیں، جہانگیر نے کہا اچھا ہوا ورنہ تمہارے قتل کا حکم ہوتا، پھر مصرع کی تقطیع کر کے بتایا کہ دوسرا رکن یوں آتا ہے "دولت بر سرت" اور یہ سخت بے ادبی ہے۔

اس زمانے میں مُیؔ تخلص ایک شاعر تھا جو قوم کا کلال تھا، کلالوں کی قوم شاہی درباروں میں دربانی اور چاؤشی کے لئے مخصوص تھی، مُیؔ نے بہ تقریب شاعری نورجہاں بیگم کے ذریعہ سے جہانگیر کے دربار میں رسائی پیدا کرنی چاہی جہانگیر نے کہا کہ ان لوگوں کا کام چاؤشی اور سواری کا اہتمام ہے، انکو شاعری سے کیا مناسبت، لیکن چونکہ نورجہاں کی خاطر عزیز تھی، اجازت دی، مُیؔ نے یہ شعر پڑھا،

مئی بگیر یہ سردارد اے نصیحت گر کنارہ گیر کہ امروز روز طوفان ست

جہانگیر نے کہا دیکھا وہی اپنے پیشے کی رعایت، دوسرے موقع پر پھر نورجہاں بیگم نے تقریب کی مُیؔ نے مطلع پڑھا،

---

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۱۱۱، [2] تزک جہانگیری صفحہ ۹۵، [3] تذکرہ سرخوش، ذکر جہانگیر،

من میروم و برق زنان شعلۂ آہم ‌ ‌ ‌ ‌ اے ہمنفسان دور شوید از سرِ راہم

جہانگیر نے ہنس کر کہا وہ اثر کہاں جا سکتا ہے۔

سلسلۂ سخن میں ہم کہاں سے کہاں نکل آئے، جہانگیر کی لائف لکھنی مقصود نہیں، لیکن یہ دکھانا ہے، کہ ان سلاطین کے دربار میں شعر و شاعری کو جو ترقی ہوئی وہ صرف اسلئے نہ تھی کہ شاعری سے دولت ہاتھ آتی تھی بلکہ زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ یہ سلاطین خود موزون طبع تھے، نقادفن تھے، اچھے برُے کی تمیز رکھتے تھے، موقع بہ موقع شعرا کو ٹوکتے رہتے تھے، ان کو صحیح داد دیتے تھے۔ اسلئے اُن کے دربار حقیقت میں شاعری کی تعلیم گاہ تھے،

دکن میں ابراہیم عادل شاہ کی قدردانی اور فیاضی نے بیجا پور کو ایران کا ٹکڑا بنادیا تھا۔ ظہوری اور ملک قمی اسکے دربار کے ملازم تھے اور اکبری کشش بھی دلی اور آگرے نہ کھینچ سکی، برہانپور میں نظام شاہ بحری گویا اس فن کا مربی تھا ظہوری نے ساقی نامہ اسی کی شان میں کہا ہے، جسکا بیش بہا صلہ عطا ہوا تھا،

ہندوستان کی یہی فیاضیاں تھیں جنکی بنا پر تمام ایران اِدھر کھچا چلا آتا تھا، خود شعرا کی زبان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے،

میرزا صائب

ہمچو عزم سفر ہند کہ در ہر دل ہست ‌ ‌ ‌ ‌ رقص سودائے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

ابوطالب کلیم

اسیر ہندم وزیں رفتن بیجا پشیمانم ‌ ‌ ‌ ‌ کجا خواہد رساندن پرفشانی مرغ بسمل را

بہ ایران میرود نالاں کلیم از شوق ہمراہان ‌ ‌ ‌ ‌ بپائے دیگراں ہمچوں جرس طے کردہ منزل را

ز شوق ہند زاں ساں[1] چشم حسرت بر قفا دارم ‌ ‌ ‌ ‌ کہ رو ہم گر براہ آرم نمی بینم مقابل را

علی قلی سلیم

نیست در ایران زمیں سامان تحصیل کمال ‌ ‌ ‌ ‌ تا نیامد سوئے ہندوستان حنا رنگین نشد

[1] تذکرۂ سرخوش ذکر مئی،

دانش مشہدی

راہ دور ہند پا بست وطن دارد مرا — چوں حنا شب در میان رفتن بہندستان خوش ست

ہندوستان کی قوت کشش اس زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں ہمیشہ سے اسکی قدردانی کے شہرے ایرانیوں کیلئے دم تسخیر تھے، خواجہ **حافظ** کو بادشاہ بغداد نے باربار بلایا، لیکن جگہ سے نہ ہلے، شیراز ہی میں بیٹھے بیٹھے غزلیں لکھ کر بھیجدیں، لیکن **دکن** سے تحریک ہوئی تو جہاز میں سوار ہوکر ہرمز تک آئے، **جامی** ایران میں تھے لیکن قصیدے ہندوستان میں بھیجتے تھے،

جامی اشعار دلاویز تو جنسیست لطیف. — پودش از حسن بود و ز سر معنی تارش
ہمراہ قافلہ ہند رواں کن کہ رسد — شرف عز قبول از **ملک التجارش**

علی نقی کمرہ نے ۳۵ شعروں کا قصیدہ فیضی کی مدح میں لکھ کر بھیجا جس میں کہتا ہے،

مرا فگند بر نظم امور مرپر تو **فیضی** — ابوالفیض آں گزیں اکبر و شیخ کبیر من

ہندوستان میں، سلاطین اور شہزادوں کے علاوہ امرا اکثر سخن فہم اور قدردان تھے ان میں **ابوالفتح** گیلانی اور عبدالرحیم **خانخانان** نے شاعری کی اکاڈیمی (بیت العلما) قائم کی، جس کی بدولت شعرا نے اس فن میں نہایت ترقی کی، ابوالفتح ایک خط میں خانخانان کو لکھتا ہے،

قصائدے کہ یاران آں جا گفتہ بودند بشعراے ایں جا فرسودہ شد، بنام نامی شما ہرگاہ بہ اتمام می رسد بہ ملازمت فرستادہ خواہد شد ملا عرفی و ملا حیاتی بسیار ترقی کردہ اند۔[1]

عبدالباقی ماثر رحیمی میں لکھتا ہے،

اکثرے از اعیان دولت و ارکان سلطنت بادشاہ مرحوم (اکبر) دست گرفتہ و تربیت کردہ وے (حکیم ابوالفتح) اند و ہرکہ تازہ از ولایت آمدہ

---

[1] چہار باغ یعنی مکاتیب حکیم ابوالفتح،

بندگی و مصاحبت ایشان اختیار می نموده، چنانچه خواجہ حسین ثنائی و میرزا قلی میلی و عرفی شیرازی و حیاتی گیلانی و سائر مستعدان در خدمت او بوده اند،

شعر کی تاریخی زندگی میں یہ واقعہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستان میں آکر فارسی شاعری نے ایک خاص جدت اختیار کی، جس کی تفصیل ہم کسی آیندہ موقع پر لکھینگے، یہ جدت حکیم **ابو الفتح** کی تعلیم کا اثر تھا، مآثر رحیمی میں ہے،

و مستعدان و شعر سنجان این زمان را اعتقاد آن ست کہ تازہ گوئی کہ دریں زمان درمیانہ شعرا مستحسن است و شیخ فیضی و مولانا عرفی شیرازی و غیرہ بہ آں روش حرف زدہ اند، بہ اشارہ و تعلیم ایشان (حکیم ابو الفتح) بودہ (مآثر رحیمی تذکرہ حکیم حاذق)

اسی طرح **خانخاناں** کی شاہانہ فیاضیوں اور شاعرانہ نکتہ سنجیوں نے شعر و شاعری کے حق میں ابر کرم کا کام دیا، خانخاناں نے احمد آباد میں ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا جس میں ہر فن کی نہایت نادر کتابیں جمع کیں، ایک عجیب خصوصیت اس کتب خانے کی یہ تھی کہ جس قدر مشہور شعرا اس کے دربار میں تھے، ان کے دیوان خود ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کتب خانے میں محفوظ تھے، اکثر شعرا اس کتب خانے کی خدمت پر مامور تھے، یہیں غزلوں کی طرحیں دیجاتی تھیں شعرا مشاعرے کرتے تھے، خانخاناں خود بھی شریک صحبت ہوتا تھا اور قدردانی سے دل بڑھاتا تھا، خود بھی ان طرحوں میں غزلیں کہتا تھا[1]،

رسمی قلندر ایک ایرانی درویش شاعر تھا، اس نے خانخاناں کی تربیت شعر و شعرا کا ذکر ایک قصیدے میں تفصیل سے کیا ہے، چنانچہ خانخاناں کو مخاطب کرکے کہتا ہے،

زمین مدح تو آں نکتہ سنج شیرازی (یعنی عرفی) رسید صیت کلامش بہ روم از خاور

---

[1] اس کتب خانے کا حال مآثر رحیمی کے مختلف مقامات میں درج ہے،

بطرز تازہ مدح تو آشنا گردید
چو روئے خوب کہ یابد زمانہ شطہ زیور

زفیض نام تو فیضی گزشت چوں خسرو
بہ تیغ ہندی اقلیم سبعہ را یکسر

زریزہ چینی خوانت نظیری شاعر
رسیدہ است بجائے کہ شاعران دگر

ق
کنند بہر بدیحش قصیدہ انشا
کہ خون رشک چکد از دلِ سخن پرور

سواد شعر شکیبی جو کحل اصفاہان
بہ تحفہ سوے خراسان برند اہل نظر

زمدحت تو حیاتی حیات دیگر یافت
بلے مقوی طبع عرض بود جوہر

حدیث نوعی و کفوی بیان چہ سازم من
چو زندہ اند بمدح تو تا دم محشر

زنعمت تو بہ نوعی رسید آں مایہ
کہ یافت میر معزی زنعمت سنجر

خانخاناں اس درجے کا سخن سنج تھا کہ اگر وہ شاعری میں پڑتا، تو عرفی اور نظیری کا ہمسر ہوتا، اس طرح میں، چندست، پندست، فرزندست تمام مشہور شعرانے زور آزمائیاں کی ہیں، نظیری اور خانخاناں کی غزلیں ہم بالمقابل درج کرتے ہیں، دونوں کا خود موازنہ کرو،

خانخانان

شمار شوق ندانستہ ام کہ تا چندست
جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزومندست

بہ کیش صدق و صفا حرف عہد بیکارست
نگاہِ اہل محبت تمام سوگندست

نہ دام دانم و نہ دانہ ایں قدر دانم
کہ پائے تا بسرش ہر چہ ہست در بندست

مرا فروخت محبت ولے ندانستم
کہ مشتری چہ کس ست و بہائے من چندست

ادائے حق محبت عنایتے ست ز دوست
وگرنہ خاطر عاشق بہیچ خرسندست

نظیری

بحرف اہل غرض قُرب بعد ما بندست
دل شکستہ ما را ہزار پیوندست

ازاں ہمم کہ بحسرت نگندہ دیدن او
نگہ بگوشۂ چشمم ہنوز دربندست

نظر دلیر نشد تا مژہ بہ پیش آمد
حجاب اگر پرکاہ ست کوہ الوندست

دو چشم ساکن بیت الحزان من گردید
کہ من اسیر بعشق تو او بہ فرزندست

دراز دستی حسن، کہ گل بہ چشم ریخت
کہ تا بدامنم از جیب در شکر خندست

ازاں خوشم بہ سخنہائے دلکش تو رحیم | بہ کینہ جوئی افلاک عشق می بازم
کہ اندکے بہ اداہائے عشق مانندست | کہ ہر کہ دشمن ما شد بہ دوست مانندست

نظیری از تو بجاں کندن ست لب بکشائے
بایں قدر کہ بگوئی بمیر خرسندست

دونوں غزلوں کے موازنہ کرنے کا یہ موقع نہیں، لیکن صاحب ذوق سمجھ سکتا ہے کہ خانخاناں کے کلام میں جو صفائی، شستگی، دلاویزی اور سوز و گداز ہے نظیری کی غزل اس سے بالکل خالی ہے، خانخاناں کی فیاضی اور قدردانی سے جو شعرا اور اہل کمال اسکے دربار میں جمع ہو گئے سلاطین کو بھی یہ بات نصیب نہیں ہوئی، مآثر رحیمی میں ان تمام شعراؤں کا مفصل تذکرہ ہے،

عُرفی نے جب یہ قصیدہ پیش کیا ع | اے داشتہ در سایہ ہم تیغ و قلم را،

تو ایک لاکھ روپے دلوائے[1]،

عرفی خانخاناں کی مدح میں خصوصیت کے ساتھ اپنے کمال سخن کی داد چاہتا ہے کیونکہ جانتا ہے کہ وہ خود اس فن کا حریف ہے، چنانچہ کہتا ہے،

سخن شناسا دیدی و دیدہ باشی ہم | علو پایۂ من در مقام سحبانی
فلاں مربی من تربیت پذیر ایں بس | ز فضل خود چند نکم لاف ہائے طولانی

مربیان سخن کے سلسلہ میں علی قلی خان، خان زمان، خان اعظم کوکلتاش، ظفر خان، اور غازیخان، کا نام بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، خان زمان اکبری دربار کے امرائے کبار میں سے تھا، جو بالآخر حریف سلطنت بنکر مارا گیا، وہ خود شاعر اور قدردان سخن تھا، سلطان تخلص کرتا تھا، چنانچہ بدایونی نے شعرا کے ذیل میں اس کا حال لکھا ہے، اکثر شعرا اسکے دربار میں ملازم تھے، ایک دفعہ جب اس نے یہ غزل لکھی،

---

[1] کلمات الشعرا سرخوش ذکر خانخاناں۔

میں ایک محضر نامہ طیار کرایا، جس کا مطلب یہ تھا کہ بادشاہ ظل اللہ ہے، اسکو یہ منصب حاصل ہے کہ مسائل مختلفہ میں جس مجتہد کے قول کو چاہے اختیار کرے، اور وہی حجت ہوگا" اس محضر کی عبارت شیخ مبارک نے لکھی، اور فیضی اور ابوالفضل نے اُس پر دستخط کئے، لطف یہ کہ شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کو بھی دستخط کرنے پڑے، اکبر نے یہ بھی چاہا، کہ اعلان عام کی غرض سے جمعہ کی نماز بھی پڑھائے، تاکہ منصب امامت مسلم ہوجائے، فیضی نے خطبہ لکھدیا،

بنام آن کہ ما را سروری داد — دلے دانا و بازوئے قوی داد
بود وصفش ز حد فہم برتر — تعالے شانہ، اللہ اکبر

ان کارروائیوں نے متعصب مولویوں کا زور توڑ دیا اور اکبر کو موقع ملا کہ وہ ایک ایسی وسیع اور آزادانہ حکومت قائم کرے، جسکے سایہ میں ہندو، مسلمان، یہود نصاریٰ، سب آزادی کے ساتھ اپنے اپنے فرائض مذہبی ادا کرسکیں اور یہی طرز حکومت خلفائے راشدین نے قائم کیا تھا،

اس میں شبہ نہیں کہ اکبر اس عالم میں حد سے تجاوز کر گیا تھا، درباریوں نے اسکو بنانا شروع کیا، اور وہ بنتا گیا، وسعت مشرب میں اُس نے آتش پرستی اور آفتاب پرستی تک کی، لیکن اس میں فیضی کا کیا قصور ہے، فیضی سے جہانتک ہوسکا اُس نے ہر موقع پر مذہبی پہلو قائم رکھا، یاد ہوگا جب اکبر کے حکم سے ابوالفضل نے توریت کا ترجمہ سنانا شروع کیا اور یہ مصرع پڑھا،

اے نامی وے ژژو کرسٹو، (جنیرس کرائسٹ)

تو فیضی برابر سے بولا ع سُبحٰنکَ لا سواک یاہو،

فیضی نے تفسیر ان واقعات کے بعد لکھی ہے، لیکن ایک ذرہ مسلمات عام کی شاہراہ سے نہیں ہٹا، حالانکہ تفسیر میں ہر قدم پر اُسکو آزاد خیالی دکھانیکا موقع حاصل تھا، ملا صاحب تو فرماتے ہیں کہ وہ تمام عقائد اسلام کا منکر تھا، لیکن وہ اُن تمام عقائد کا معترف نظر آتا ہے جنکو معتقدات

عوام کہتے ہیں معراج کی نسبت اکثر علمائے اسلام کا خیال ہے کہ روحانی تھی لیکن فیضی اس پر راضی نہیں چنانچہ کہتا ہے،

راہ راست برو کہ راہ کج نیست   حاجت بہ دلائل و حجج نیست
آں را چہ وقوف ازیں مقام ست   کو منکر خرق و التیام است

سچ تو یہ ہے کہ فیضی کی مذہبی آزادی ہم جو کچھ سنتے ہیں تصنیفات میں تو وہ ملائے مسجدی نظر آتا ہے،

فیضی اگرچہ ریاکار مولویوں کو نہایت برا سمجھتا تھا، لیکن اصلی مقدس بزرگوں سے نہایت عقیدت رکھتا تھا، شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی سے اسکو نہایت خلوص تھا ایک مدت تک فتح پور میں بلاکر ان کو مہمان رکھا، پھر جب دربار کی مذہبی بدنامی پھیلی تو شیخ دلی چلے گئے، فیضی نے بار بار بلایا لیکن شیخ نے عذر کیا، بالآخر شیخ نے ایک خط لکھا، جس میں اُن کو آئندہ تکلیف نہ دینے کا اظہار کیا، لیکن یہ بھی لکھا کہ خط کتابت سے دریغ نہ کیجئے گا[1]، اخیر کے فقرے یہ ہیں،

اگر بال و پرے داشتم ہر روز برباماں حجرہ می نشستم و دانہ چین نکات محبت می شدم، دیگر چہ نویسم، طلب ہائے درد ازاں جا دیر می رسد از برائے خدا بر من قافلۂ اسرار خود را راہ نہ بندند،

ملا صاحب ان تمام باتوں کو فیضی کی ستم ظریفی سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ گرمی محفل کے لئے ان بزرگوں کو اپنے یہاں بلاتا تھا،

اس زمانے میں نشانی صاحب ایک فہرکن ملا صاحب کے ساختہ پرداختہ تھے، وہ فیضی کے عروج کو دیکھ کر سخت جلتے تھے، اور اسکی شان میں ہجو آمیز اشعار کہا کرتے تھے، فیضی نے ایک قصیدہ لکھا تھا،

شکر خدا کہ عشق بتان ست رہبرم   بر ملت برہمن و بر دین آذرم

[1] تاریخ بدایونی، تذکرۂ شیخ عبدالحق دہلوی،

اگرچہ فیضی نے اس شعر کے بعد بت اور برہمن کے معنی بتا دئے تھے۔ کہ متداول معنی مراد نہیں،

بُت چیست؟ رخ نگاشتہ معنی یقین
کاندر کلیسیائے ضمیرست مضمرم

استاد، برہمن کز بت خانۂ خیال
در سجدۂ حضور فرود آورد سرم

لیکن نشانی صاحب اس لطف کو کیا سمجھ سکتے تھے، انھوں نے اس کی چوٹ پر فوراً ایک قصیدہ لکھ ڈالا،

شکر خدا کہ پیروِ دین پیمبرم
حب رسول و آل رسول ست رہبرم

قائل بہ روز حشر و قیام قیامتم
امیدوار جنت و حوری و کوثرم

یہانتک بھی غنیمت ہے لیکن ایک مثنوی میں فیضی کے کمال شاعری کا بھی انکار کرتے ہیں،

دعوے ایجاد معانی مکن
شمع نہ چرب زبانی مکن

طبع تو ہر چند درِ ہوش زد
یک سخن تازہ نشد گوش زد

انچہ تو گفتی دگراں گفتہ اند
در کہ تو سفتی دگراں سفتہ اند

خانہ کہ از نظم بیاراستی
آب و گلش از دگراں خواستی

تازگی آں نہ ز باراں تست
از خوے پیشانی یاران تست

چند پئے نقد کساں سوختن
چشم بہ مالِ دگراں دوختن

شربتِ بیگانہ فراموش کن
آب ز سرچشمۂ خود نوش کن

گر خضرے آب حیات تو کو؟
در شکرے شاخ نبات تو کو؟

ملا صاحب نے ان اشعار کو (نشانی کے حال میں) نہایت جوش سے نقل کیا ہے خود بھی فیضی کے حال میں فرما چکے ہیں کہ چالیس برس تک استخوان بندی کرتا رہا، لیکن ایک شعر مزہ کا نہ نکلا، لطف یہ کہ نل دمن کے ذکر میں خود لکھ چکے ہیں، کہ تین سو برس سے ایسی مثنوی نہیں لکھی گئی، ملا صاحب کی ان دو رنگیوں پر بے ساختہ یہ شعر یاد آتا ہے،

ازاں پس ددگر ہر زماں گرفتارم | کہ شیوہ ہائے شما باہم آشنائی نیست

فیضی کو اپنے خاندان سے نہایت محبت تھی، تفسیر میں کوئی موقع نہ تھا، لیکن اپنے آٹھوں بھائیوں کا ذکر کیا ہے، خطوط میں ابوالفضل کو علامی اخوی، نواب اخوی، لکھتا ہے اور اس انداز سے لکھتا ہے کہ محبت کا نشہ ٹپکتا قصیدہ فخریہ میں ابوالفضل کی نسبت لکھتا ہے،

بااین چنیں پدر کہ نوشتم مکارمش | در فضل مفتخر ز گرامی برادرم

صد سالہ درمیان من و او ست در کمال | در عمر اگر چہ یک دو سہ سالے فزوں ترم

۹۹۷ھ ہجری میں اکبر کے ساتھ پشاور میں تھا کہ خبر پہنچی کہ والدہ بیمار ہیں، پادشاہ کا ساتھ چھوڑ کر لاہور پہنچا، یہاں اُنکا انتقال ہو چکا تھا بے تاب ہو گیا، اس عالم میں جو خط لکھے ہیں اُن سے خون ٹپکتا ہے، ایک دوست کو لکھتا ہے

بالفعل حالے دارد کہ بندہ راتمی تواں شناخت ابدن در کاہش افتادہ و اندوہ کارگر آمدہ، ضعف و اسہال روئے نمودہ، و دل از حیات سرد شدہ بخدائے خدا سوگند کہ از ہزار یکے نوشتہ است"

تین برس کا بچہ مر گیا ہے اُس کے غم میں جانگداز مرثیہ لکھا ہے،

شد وقت آں کہ دیدہ چو دل غرق خوں کنم | خوں نالۂ گرہ شدہ از دل بروں کنم

آں غصہ کہ پیش نخوردم کنوں خورم | واں نالہ کہ پیش نہ کردم کنوں کنم

گویند غافلاں رہ صبر اختیار کن | چوں اختیار در کف من نیست چوں کنم

اے روشنی دیدۂ روشن چگونۂ | من بے تو تیرہ روز تو بے من چگونۂ

ماتم سراست خانۂ من در فراق تو | تو زیر خاک ساختہ مسکن چگونۂ

بر خار و خس کہ بستر و بالین خواب تست | اے یاسمین عذار سمن تن چگونۂ

تصنیفات | صاحب مآثر الامراء نے لکھا ہے کہ فیضی نے ایک سو ایک کتابیں تصنیف کیں، ان میں سے جن کتابوں کا پتہ چلتا ہے اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

خمسہ، یعنی نظامی کی پانچوں مثنویوں کا جواب، ان کی تفصیل خود ایک خط میں کی ہے چنانچہ لکھتے ہیں،

اسامی کتب خمسہ این است اول مرکز ادوار کہ اکثرے در فتح پور گفتہ شد بود، دوم سلیمان و بلقیس کہ پیش ازیں ہفت سال در لاہور بنیاد کردہ بود، و چیزے چند ازاں گفتہ، سوم نلدمن کہ تمام شد چہارم ہفت کشور کہ در احوال ہفت اقلیم گفتہ خواہد شد، پنجم اکبر نامہ کہ آں ہم جستہ جستہ وقتے گفتہ بود،

ان میں سے دو کتابیں یعنی نلدمن اور مرکز ادوار انجام کو پہنچیں اور آج بھی ملتی ہیں، مرکز ادوار کی ترتیب شیخ ابوالفضل نے فیضی کے مرنے کے بعد کی، مرکز ادوار کا عمدہ نسخہ ہمارے کتب خانہ میں جواب ندوہ پر وقف کر دیا گیا موجود ہے،

سنہ ۳۰ جلوس میں فیضی کو خمسہ کا خیال پیدا ہوا، اور سب سے پہلے مرکز ادوار شروع کی اسکے ساتھ اور مثنویوں کی بھی بنیاد ڈالی، اور سب کے کچھ کچھ شعر کہے، لیکن چونکہ بہت سے مشغلے پیش آتے رہتے تھے، کوئی کتاب انجام کو نہ پہنچ سکی سنہ ۳۹ جلوس[۱] میں اکبر نے اصرار کے ساتھ کہا کہ خمسہ کو پورا کرنا چاہیئے، اور سب سے پہلے نلدمن انجام پائے، چونکہ ہندوؤں کا قصہ تھا، اکبر کی میلان طبع نے اسکو مقدم رکھا، چنانچہ چار مہینے میں تمام ہوئی چار ہزار شعر ہیں، چنانچہ خود کہتے ہیں،

ایں چار ہزار گوہر ناب کانگیختہ ام بہ آتشیں آب

فیضی نے یہ مثنوی اکبر کی خدمت میں پیش کی اور دستور کے موافق اشرفیاں نذر کیں، اکبر نہایت محظوظ ہوا، اور حکم دیا کہ خوشخط لکھوا کر جا بجا مرقعے اور تصویریں شامل کی جائیں، نقیب خاں کو حکم ہوا کہ وہ پڑھ کر سنایا کرے،

ملا عبدالقادر صاحب بدایونی، ہر جگہ جہاں فیضی کا ذکر آتا ہے بے نقط سناتے

---

[۱] یہ پوری تفصیل اکبر نامہ واقعات سنہ ۳۹ جلوس میں ہے،

ہیں لیکن یہاں انکو بھی مجبور ہو کر تعریف کرنی پڑی چنانچہ فرماتے ہیں،
والحق مثنوی ست کہ دریں سنہ صد سال، مثل آں بعد از امیر خسرو، شاید در ہند کسے دیگر گفتہ باشد،

ابو الفضل نے اکبر نامہ میں لکھا ہے کہ سب مثنویاں پوری ہوئیں، لیکن کوئی عینی شہادت پیش نہیں کی، بلکہ فیضی کے اشعار سے استدلال کیا ہے لیکن جو شعر استدلال میں نقل کئے ہیں اُن سے یہ ثابت نہیں ہوتا، اشعار یہ ہیں،

زیں ہفت رباط و چار منزل — بندم بہ جمازہ پنج محمل،
آں چار عروس ہفت خرگاہ — کادرد میسان بہ نیمۂ راہ
چندیں اگرم امان دہد بخت — یک یک ببرم بپایۂ تخت
گر نشکندم سپہر پیمان — بلقیس برم بر سلیمان

نلدمن اور مرکز ادوار پر ریویو آگے آئیگا، سلیمان بلقیس کا یہ انداز ہے

الہی پردۂ تقدیس بکشائے — سلیمان مرا بلقیس بنمائے
دل من با بتانِ آذری چند — سلیمانے گرفتار پری چند
چنانم از بلندی در دہ آواز — کہ آید ہُد ہُد شوقم بہ پرواز
گرہ شد ہفت دریا در گلویم — کشایش نیست ممکن تا نہ گویم
وگر رفتم کہ بگذارم مقابل — شگافِ خانہ را بارو زنِ دل

اکبر کی مہم گجرات پر ایک مثنوی لکھی تھی وہ بھی ناپید ہے، چند شعر ایک خط میں نقل کئے ہیں، ملاحظہ ہوں،

نہاندم اہالی و حکامِ شہر — کہ در شہر بودند مشہور دہر
ہمہ کردہ آدیزۂ دست خویش — کلیدِ در گنج شاہان بہ پیش
رسیدند از سر قدم ساختہ — زشادی سراپائے نشناختہ
سرِ خود نہادند بر پائے شاہ — کہ مائیم سر تا قدم در گناہ
زعمرے کہ بگذشتہ در بندگی — بصد گونہ داریم شرمندگی

رسیدیم در خدمت بندۂ او   بجز بندگی بندگان را چہ کار

نہایت پھُس پھُسی اور ہندیانہ ترکیبیں ہیں، اس لئے قلم انداز کرتا ہوں،
موارد الکلم، تفسیر غیر منقوط لکھنے کا جب ارادہ کیا، تو مشق کے طور
پر پہلے یہ کتاب لکھی کہ ہاتھ صاف ہو جائے، کلکتہ میں چھپ گئی ہے، فیضی کے
ایک رقعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ ۹۸۵ھ ہجری کی تصنیف ہے، فیضی نے
اسکو بلاد عرب میں بھیجا تھا، اور لوگوں نے حسب دستور اسکو بہت کچھ داد دی،
سواطع الالہام یعنی تفسیر غیر منقوط ۱۰۰۲ھ ہجری میں تمام ہوئی، کل مدت
تصنیف دو ڈھائی برس ہے، اس تفسیر پر فیضی کو بڑا ناز ہے، دوستوں کو جو
خطوط لکھے ہیں، ان میں اکثر فخر سے اسکا تذکرہ کرتا ہے، جن لوگوں نے تاریخیں
اور تقریظیں لکھیں، ان کے نام بھی لکھے ہیں، ایک خط میں لکھتا ہے،
در عاشر ربیع الثانی ۱۰۰۲ھ اثنین والف کہ سال حال ست، تمام شد،
ایں عطیہ غیبی مخصوص فقیر بود، غرائبش زیادہ ازاں ست، کہ
حیرت افزائے اہل ایں فن نہ گردد،

دیباچہ میں لکھا ہے کہ جب ابتدا کی تو والد کو دکھایا، وہ بہت خوش ہوئے
اور بعض فقرے بدل دئے، چھٹا حصہ تمام ہوا، تو اکبر نے فیضی کو دکن کی مہم پر
بھیجدیا، اس مہم میں ایک سال سے زیادہ توقف ہوا، اسی اثنا میں شیخ مبارک
کا انتقال ہو گیا، پھر تفسیر رک گئی، اور ایک سال سے کچھ کم رکی رہی، دوسرے
سال کے آغاز میں شروع کی، اور انجام کو پہنچائی تفسیر خیر جو کچھ ہے، ہے لیکن
تاریخیں اور تقریظیں خوب لکھی گئی ہیں، ملا حیدر کاشانی نے پوری قل ہو اللہ
سے تاریخ نکالی، یعنی اس سورۃ کے حرفوں کے عدد شمار کئے جائیں تو ۱۰۰۲ ہوتے
ہیں، ایک اور شخص نے اس آیت سے تاریخ نکالی لا رطب ولا یابس الا فی کتاب
مبین، ظہوری اور ملک قمی نے قصیدے اور رباعیاں لکھیں، چند رباعیاں
درج کرتا ہوں، جن میں غیر منقوط ہونے کی توجیہ شاعرانہ طریقہ سے کی ہے،

دانای ازین دفتر کل دریا شد — پیداست نقاطش ز چہ ناپیدا شد
شد وقت حصاد، دانہا خرمن گشت — شد سیر تمام قطرہ ہا دریا شد

ازچین سخن گران سخن نتواں ساخت — بوی بوزید صفحہ مشک افشان ساخت
صیاد خیال از پے، آہوئے قلم — ہر نافہ کہ چید در بغل پنہاں ساخت

ایں نسخہ کہ شاد کرد ناشادان را — رد ساختہ شاگردی اُستادان را
بر نقطہ ز تار خط نیفگسند کمند — در بند ردا نداشت آزادان را

اے بخت بیا یاری ایں بیکس کن — تا پیش رو م موانع رہ پس کن
ہر نقطہ کہ کردند ازیں نسخہ بروں — شد مہر لب سخن ظہوری بس کن

ایں خردہ چہ خردہا کہ نایاب شدند — ذرات دریں شعشعہ سیماب شدند
از پردۂ لفظ حُسن معنی بدمید — خورشید بر آمد، اختراں آب شدند

فیض ازل از چہرہ برافگند نقاب — از لوح خرد، سترد آثار حجاب
سرزد خورشید معنے از مشرق لفظ — نیلوفر نقطہ سرفرو برُد بہ آب

سخت تعجب ہے کہ فیضی جیسے حکیم اور فلسفہ پسند شخص نے کیونکر یہ بیہودہ مغز کاوی گوارا کی تفسیر کو پڑھ کر بجز اسکے، کہ جابجا مہمل الفاظ جمع کر دئیے ہیں، اور کچھ اثر طبیعت پر نہیں ہوتا، یہ سچ ہے کہ اور کوئی شخص اس کمان کو زہ نہیں کر سکتا، لیکن بہرحال ایک لغو کام ہے، کسی سے بن آئے یا نہ آئے طرّہ یہ کہ فیضی کے مخالفین نے اس موقع پر بھی اعتراض کیا تو یہ کیا کہ آج تک کسی نے بے نقط تفسیر نہیں لکھی، اس لئے یہ بدعت ہے۔ اور اس لئے

خلاف شریعت ہے، فیضی نے برجستہ جواب دیا، کہ خود کلمۂ توحید لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، سر تا پا غیر منقوط ہے۔

انشائے فیضی، نور الدین محمد عبد اللہ بن حکیم عین الملک کہ نسلاً ایرانی اور خود ہندوستان زاد تھے، فیضی کے بھانجے اور شاگرد تھے، انہوں نے فیضی کے تمام مکاتیب و خطوط مہیا کر کے ایک مجموعہ مرتب کیا اور لطیفہ فیضی نام رکھا اسوقت تک خطوط اور مراسلات سے بیان واقعہ کے بجائے زیادہ تر اظہار انشا پردازی مقصود ہوتا تھا فیضی پہلا شخص ہے جس نے سادہ نگاری کی ابتدا کی، اس طرز میں اس کا کوئی نظیر ہے تو حکیم ابو الفتح ہے، جس کے رقعات چار باغ کے نام سے مشہور ہیں،

فیضی کے خطوط سے اس زمانے کے تمدن، تہذیب معاشرت، آداب رسوم، ہر قسم کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں، بعض بعض جگہ ہندی الفاظ بھی بول جاتا ہے، مثلاً والدہ کو "بواجیو" کہا کرتا تھا، خط میں اُن کا ذکر آ گیا ہے تو یہی لفظ لکھ دیا ہے،

دیوان غزلیات کچھ اوپر نو ہزار شعر ہیں، خود دیباچہ لکھا ہے اور یہ تعداد بھی اس میں لکھی ہے، دیباچہ میں یہ بھی عذر کیا ہے، کہ اس میں پست و بلند ہر قسم کا کلام ہے، خاتمہ میں چند رباعیاں لکھی ہیں، ایک یہ ہے،

این قصر سخن یافت عمارت از من | دریافت ز احباب اشارت از من
ہر نکتہ کہ میسر بخت ز نوک قلمم | معنی ز خدا بود عبارت از من

دیوان کا نام طباشیر الصبح رکھا، ایک خط سے جو ایک دوست کو لکھا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان جب مرتب ہوا ہے، تو فیضی کی عمر ۴۰ سے کچھ اوپر تھی، اسی خط سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ غزل گوئی کا سلسلہ بند نہیں ہوا بلکہ دوسرے دیوان کی طیاری کی ہے،

قصائد، مختصر سا مجموعہ ہے حمد، نعت، مدح، فخر، تصوف، اخلاق وغیرہ

مضامین پر الگ الگ قصیدے لکھے ہیں، قصیدوں کی تعداد کم ہے، قصائد کئی کئی سو شعر کے ہیں، طرحیں بھی اپنے معاصروں سے الگ اختیار کی ہیں، بیٹے کا ایک مرثیہ بھی ہے اور نہایت پُر درد ہے، نماتہ میں قطعات بھی ہیں، لیکن یہ قطعات دیوان میں بھی شامل ہیں، بعض قصائد الحاقی معلوم ہوتے ہیں، مثلاً یہ قصیدہ،

وصیِ نبی آں کہ از صلبِ فطرت — بہ شاہِ اولوالعزم توام نشیند
اماممے کہ روز وفاتِ پیمبر — خلافت گذارد بہ ماتم نشنید
گر فتم معاند دریں تنگ میدان — براشہب خبر اند بر ادہم نشیند
کجا رتبۂ کعبہ یابد سفیہے — کہ فردا بہ قعر جہنم نشیند
جہاں پُر شد از فتنہ یا شاہِ مرداں — تو برخیز کاشوب عالم نشیند

ابوالفضل کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ فیضی کے کل کلام کی تعداد ۵۰ ہزار کے لگ بھگ ہے۔

تذکرہ شعرا کا تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا، لیکن اسکے سوا کہیں اُسکا پتہ نہیں چلتا، کہ ایک خط میں ایک دوست کو لکھتے ہیں،

کتاب مقاصد الشعرا را البتہ — چوں تشریف آرند ہمراہ آرند
کہ اختتام تذکرہ موقوف بہ آں ماندہ، واز کتب دیگر ہم آنچہ توانند
استنباط فرمودہ فرمایند کہ فقیر میخواہم، در خطبۂ آں ذکر شریف کنم،

مہابھارت ۹۰۹ھ ہجری میں اکبر نے حکم دیا کہ مہابھارت کا ترجمہ کیا جائے بڑے بڑے گنوان پنڈت جمع ہوئے، اکبر خود عبارت کا مطلب نقیب خاں کو سمجھاتا جاتا تھا، اور وہ فارسی میں ترجمہ کرتا تھا، پھر عبدالقادر بدایونی، ملا شیری وغیرہ کو الگ الگ ٹکڑے سپرد کئے، دو فن فیضی کے حصے میں آئے۔

اتھروَن بید اس کا ترجمہ بھی فیضی کی طرف منسوب ہے لیکن عبدالقادر بدایونی

ملہ بدایونی واقعات ۹۹۰ھ ہجری،

کی تحریر سے صرف اسقدر ثابت ہوتا ہے کہ ۹۸۳ھ ہجری میں بھاون نام ایک برہمن جو دکن کا رہنے والا تھا، اسلام لایا، اور دربار میں حاضر ہُوا، اکبر نے اسکو حکم دیا، کہ اتھرون بید کا ترجمہ کرائے اول اول یہ کام ملا عبدالقادر بدایونی کے سپرد ہُوا، یعنی بھاون مطلب سمجھاتا جائے اور یہ فارسی میں لکھتے جائیں، لیکن چونکہ اسکی عبارت نہایت پیچیدہ تھی، ملا صاحب نے عذر کیا، اکبر نے ملا صاحب کے بجائے ابراہیم سرہندی کو ترجمہ کا حکم دیا، فارسی رامائن کو بھی عام لوگ فیضی کی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن یہ محض غلط ہے، رامائن کا ترجمہ اصل میں بدایونی نے ۹۹۹ھ ہجری میں چار برس کی محنت میں کیا تھا، پھر مسیحائے پانی پتی نے نظم میں لکھا، جو آج عام طور پر مشہور ہے،

لیلاوتی - حساب میں ہے، فیضی نے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی،

فیضی کی شاعری فیضی فطرۃً شاعر تھا، اسکا خاندان شاعری سے کچھ تعلق نہیں رکھتا تھا، تعلیم و تربیت بھی شاعری کی حیثیت سے نہیں ہوئی تھی، تاہم وہ بچپن ہی سے شعر کہتا تھا، لیکن چونکہ طبیعت مشکل پسند تھی اور عربیت کا زور تھا اس لئے طبیعت زیادہ تر صنائع کی طرف مائل تھی، اپنا بچپن کا کلام کوئی شاعر محفوظ نہیں رکھتا، فیضی نے بھی ضائع کر دیا ہوگا، لیکن ملا عبدالقادر بدایونی کی بدولت ہم کو ایک غزل ہاتھ آئی ہے[1]

اے قدِ نیکوے تو سروِ روان   وے خمِ ابروے تو شکلِ کمان

حلقۂ گیسوے تو دامِ جنون   طرۂ ہندوے تو کامِ جنان

ہم لبِ جادوے تو آبِ حیات   ہم خطِ دلجوے تو خضرِ زمان

پانچ شعروں کی غزل ہے اور صنعت یہ ہے کہ باوجود صنعت ترصیع کے ہر شعر چار بحروں میں پڑھا جاتا ہے،

ابتدا میں جو قصیدے ہیں اُن میں عربی نامانوس الفاظ کثرت سے ہیں اور

---

[1] بدایونی جلد ۳، تذکرہ محوی شاعر،

یہ وہی ملائیت کا زور ہے مثلاً

یکے معلّے شاہزادہ ہائے عظام — کہ بر ہلال فلک می کنند اغسانی

کشمیر کا پورا قصیدہ دیکھو،

ایک قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالفرج رونی کا تتبع کرتا تھا،

فیضی منم آں کہ در معانی — گامے بہ دو صد گہنج گرفتم
تا کرد دلم عروج مستی — نہ چرخ درج درج گرفتم
ذوقے کہ تواں گرفت از شعر — از شعر ابوالفرج گرفتم

لیکن جس قدر اہل زبان سے اختلاط بڑھتا گیا زبان سادہ اور صاف ہوتی گئی، عرفی، ظہوری، ملک قمی سے اکثر صحبتیں رہتی تھیں، خصوصاً عرفی کی زورطبع اور چاشنی سخن کا نہایت معترف ہے،

محتشم کاشانی کی تعریف میں لکھتا ہے،

حریر باف سخن محتشم کہ در کاشان — بہ طرز تازہ طرز سخنوری دارد
یکے ز نکتہ وراں گفت دیدم اشعارش — عبارتے ست کہ معنی اسرسری دارد
بگفتمش سخن او عبارتے ست ولے — عبارتے کہ بہ معنی برابری دارد

ان باتوں سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اسکی شاعری پر کن چیزوں کا اثر پڑتا ہے،

فیضی نے قصیدہ، مثنوی، غزل سب کچھ کہا ہے، لیکن قصیدے بے مزہ ہیں ابتدائے کلام ایک طرف اخیر کے قصائد سے بھی ملائیت کی بو آتی ہے، البتہ مثنوی اور غزل لاجواب ہے اور انہیں دونوں صنف پر ہم ریویو کرنا چاہتے ہیں،

جوش بیان

فیضی کی خصوصیات میں سب سے بڑھ کر جوش بیان ہے، جسکا وہ موجد بھی ہے اور خاتم بھی، جوش بیان خواجہ حافظ میں بھی ہے اور اعلیٰ درجہ پر ہے، لیکن رندانہ مضامین اور دنیا کی بے ثباتی کے ساتھ مخصوص ہے، فیضی کے ہاں فخریہ، عشقیہ، فلسفیانہ، ہر قسم کے مضامین میں وہی جوش پایا جاتا ہے، جوش بیان اس کے ذاتی حالات کا خاص اثر ہے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکتا تھا،

غور کرو ایک شخص جسکے سینے میں تمام علوم و فنون کے خزانے بھرے ہوئے ہیں
فلسفہ اور حکمت کے نہایت دقیق نکتوں تک اسکی نظر پہنچتی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ
اور حریف معمولی سطح سے آگے نہیں بڑھ سکتے آزاد خیالی اور بلند نظری اسکو آسمان
تک پہنچائے دیتی ہے سب باتوں کے ساتھ قسمت کی یاوری نے اسکو تخت
شاہنشاہی کے برابر کھڑا کر دیا ہے ایسے شخص کے جوش مضامین کا کیا اندازہ
ہو سکتا ہے، جب وہ تخت شاہی کے پاس کھڑے ہو کر اکبر کو مخاطب کرتا ہے
تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک سیہ مست جوش مستی میں آپے سے باہر ہوا جاتا
ہے اور ہنکار رہا ہے،

شاہنشاہا! خسرو پژوہا! — دریا گہرا! فلک شکوہا!
بزم طرب جہاں بہ عیش پیوست — دور تو شراب و آسمان مست
امروز بر این نوائے چوں شہد — من باربدم تو خسرو عہد
زیں خامہ کہ کردہ ام فلک سائے — پیش تو ستادہ ام بیک پائے
این نامہ کہ عشق بر زباں برد — طغرائے ترا بہ آسماں برد
این چار ہزار گوہر ناب — کانگیختہ ام بہ آتشین آب
بپذیر کہ آب گوہر تست — از بہر نثار افسر تست
پیمانۂ من اگر نشد پر — دریا کم ست نثار نہ دُر
گر عشق چنیں بسوزدم پاک — مہتاب بروں برآرم از خاک
بگداختہ آبگینۂ دل — آئینہ و ہم بدست محفل
آنم کہ بہ سحر کاری ژرف — از شعلہ تراش کردہ ام حرف
بانگ قلمم دریں شب تار — بس معنی خفتہ کرد بیدار
ہر صبح بہ فیض بادشاہی — من بودم و باد صبح گاہی

اکبر نے جب نلدمن کی فرمایش کے لئے دربار میں بلایا ہے، اس حالت کو
دیکھو کس جوش سے بیان کرتا ہے،

برخاستم از زمین فلک تاز ـ برخاسته موبمو بہ پرواز
چشمے کہ برہ گذار کردم ـ چشم دگرش نثار کردم
بگذشتم ازاں دراد ب نیز ـ کونین گذاشتہ بہ دہلیز
دیدم دو جہاں بیک جہان در ـ صد عمر ابد بیک زمان در
پیوند زمینیان گسستم ـ نزدیک بہ آسمان نشستم

یہی جوش فلسفیانہ اور عشقیہ مضامین میں بھی قائم ہے،

اے عشق! رخصت ست کہ از دوش آسمان ـ بردوش خود نہم علم کبریائے تو
نظر فیض چو بر خاک نشینان فگنم ـ مور را مغز سلیمان رسد از قسمتِ ما
از تفِ بادۂ ما بال ملائک بگداخت ـ وائے آں روز کہ برقے جہد از شیشۂ ما
روے کشادہ باید و پیشانی فراخ ـ آں جا کہ لطمہ ہاے یداللہ می زنند
ایں چہ می بود کہ ساقی بقدح ریخت فرو ـ کہ مسیح و خضر از رشک کشاکش کردند
مپرس اہل نظر چوں بعرش پیوستند ـ کہ پا بکنگرۂ دل نہادہ برجستند
عشق، صبر و خرد و ہوش ز فیضی بربود ـ دزدرہ بین کہ بآن قافلہ سالار چہ کرد
شدیم خاک و لیکن ببوئے تربتِ ما ـ تواں شناخت کزیں خاک مردمی خیزد
عشق تا پاے بیفشرد در اندیشۂ ما ـ ہمہ معشوق تراود ز رگ و ریشۂ ما
بادہ در جوش ست و یاراں منتظر ـ ساقیا! خُذ ما صَفَا دَعْ ما کَدَر
می کشد شعلہ سرے از دل صد پارۂ ما ـ جوش آتش بود امروز بفوارۂ ما
ہیچدانی دل ما خورد چرا بشکستند ـ آسمان آئینہ ہا ساخت ز سیارۂ ما
دریں دیار گروہے شکر لباں ہستند ـ کہ بادہ با نمک آمیختند و بدمستند
فیضی کہ فہم تہی ورہِ عاشقی بہ پیش ـ دیوان خود مگر بدو عالم گرو کنم

اقسام سخن میں فیضی فخریہ خوب کہتا ہے، اور اس عالم میں اسکا جوش بیان حد سے گذر جاتا ہے، ملاحظہ ہو،

امروز نہ شاعرم حکیمم ـ دانندۂ حادث و قدیم

ہر موے زمن تمام گوش ست   خاموشی من بصد خروش ست
تا تازہ و تر زنم رقم را   در بادہ کشیدہ ام قلم را
ایں شیشہ نہادہ ام براں طاق   کاں جا نرسیدہ دست عشاق
اسراف معانیم نظر کن   زیں گنج بہ مفلسان خبر کن
می ریخت ز سحر کاری ژرف   از صبح ستارہ دزمن حرف
دروازۂ صبح بر رخسم باز   کلکم ز شگاف پرتو انداز
ایں بادہ کہ جوشد از ایاغم   خونے ست چکیدہ از دماغم
صد دیدہ بورطۂ دل افتاد   کیں موج گہر بہ ساحل افتاد
دکانِ ہنر چنیں کشودن   سامان سخن چنیں نمودن
ایں کار من ست کار کس نیست   اندازۂ اختیار کس نیست
چوں بر سپہم نظر فگندند   در معرکہ ام سپر فگندند
برتافتسم از دم سبک سیر   ناقوس برہمناں ز دیر
بنگر کہ چساں بصد تگ و تاز   بر تار معانیم رسن باز
ہر نغمہ کہ بستہ ام بریں تار   ناقوس نہفتہ ام بہ زنار
ایں گل کہ بہ بوستاں نثاری است   از من بہ بہار یادگاری است

(۲) فیضی کی ممتاز خصوصیات شاعری میں سے استعارات کی شوخی اور تشبیہات کی ندرت ہے، اکبری دور کے شعرا میں یہ خصوصیت عام ہے، لیکن نوعی شیرازی اور عرفی اس وصف میں اپنے معاصرین سے ممتاز ہیں، اور فیضی ممتاز تر ہے، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس خاص وصف میں فیضی پر عرفی کا اثر پڑا ہے، یا خود عرفی نے فیضی سے یہ شوخیاں سیکھی ہیں، ایک مستند ایرانی تذکرہ نویس نے فیضی کے حق میں یہ فیصلہ کیا ہے، لیکن چونکہ تذکرہ نویس صاحب فیضی کے معاصر ہیں اور فیضی دربار کا ملک الشعراء تھا، اس لئے خوشامد کے سوء ظن کا موقع باقی رہتا ہے،

بہر حال استادی وشاگردی کی بحث نہیں لیکن فیضی کی شوخی استعارات اور جدت تشبیہات سے انکار نہیں ہو سکتا، مثالیں ملاحظہ ہوں،

بزمے ست جہان بہ عیش پیوست　　دور تو شراب و آسمان مست
زیں خامہ کہ کردہ ام فلک سائے　　پیش تو ستادہ ام بیک پائے
گر عشق چنیں بسوزدم پاک　　مہتاب بروں برآرم از خاک
بگداختہ آبگینۂ دل　　آئینہ دہم بدست محفل
بگداختہ ام دل و زبان را　　کیں نقش نمودہ ام جہان را
امروز بدود مان ایام　　زد نوبت من سپہر بربام
آنم کہ بہ سحر کاری ژرف　　از شعلہ تراش کردہ ام حرف
بانگ قلم دریں شب تار　　بس معنی خفتہ کرد بیدار
برخاستم از زمین فلک تاز　　برخاستہ مو بمو بہ پرواز

(۳۳) وہ اکثر فلسفیانہ مضامین باندھتا ہے، جن کے ساتھ ادعا اور غرور کی جھلک بھی ہوتی ہے،

گویند ہمرہان طریقت کہ اے رفیق　　آگاہ شو کہ قافلہ ناگاہ می زنند
روئے کشادہ باید و پیشانیٔ فراخ　　آں جا کہ لطمہ ہائے ید اللہ می زنند

اس شعر کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ جہاں خدا کے ہاتھ کے طمانچے پڑتے ہیں وہاں شگفتہ روئی اور کشادہ جبینی درکار ہے، مطلب یہ ہے کہ صدمات قضا و قدر کی برداشت، یا تجلیات کی برق افگنی کے لئے نہایت صبر و استقلال درکار ہے،

عجب تر از دل فیضی ندیدہ ام طلسم　　کہ ہم گہر بود و ہم محیط و ہم غواص
چہ کشتہ ہاست کہ در زلف بتان تعبیہ شد　　کز حقیقت دو جہاں رو بہ مجاز آوردند
گر دلے گم شود از حلقۂ عشاق بپرس　　ہر چہ بردند دریں قافلہ باز آوردند
عشق تا پائے بیفشرد در اندیشۂ ما　　ہمہ معشوق تراود ز رگ و ریشۂ ما

مسافرانِ طریقت زمن جب اندیشو ۔ کہ دور بینم و چشم بہ منزل افتادہ است،
غافل نیم زراہ ولے آہ چارہ چیست ۔ زیں رہزناں کہ بردل آگاہ می زنند
اگر سرے نہ کشم سوے بیخودی چہ کنم ۔ مراز ہمدمئے خود ملال میگیرد
بگریز کہ دورانِ فلک عربدہ خیز ست ۔ آئین حریفاں ہمہ کج دارد مریز ست
در دشت آرزو نبود ہیچ دام و دد ۔ راہے ست ایں کہ ہر زتو خیزد بلائے تو
خاک بیزان رہ فقر بہ جلئے نروند ۔ گوئی ایں طائفہ ایں جا گہرے یافتہ اند

فیضی کے دل میں فلسفیانہ خیالات کا جب زور ہوتا ہے اور اُنکے اظہار میں جب وہ مجبور ہوتا ہے تو اس مجبوری کو عجب انداز سے ظاہر کرتا ہے،

فلسفیانہ مسائل اُسکے دل و دماغ میں بھر گئے ہیں چاہتا ہے کہ ظاہر کرے لیکن جانتا ہے کہ لب ہلے اور ظاہر بین علما قابو سے جاتے رہے، چونکہ علما ہی کے گروہ میں زندگی بسر کی ہے اور اپنے آپ کو اس دائرہ سے باہر نکالنا نہیں چاہتا اس لئے چاہتا ہے کہ اصل حقیقت بھی ظاہر کی جائے اور ہم فنون کا ساتھ بھی نہ چھوٹنے پائے، لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے مجبوراً ساتھیوں سے انقطاع پر آمادہ ہوتا ہے، اور کہتا ہے،

آں نیست کہ من ہم نفساں را بگذارم ۔ باآبلہ پایاں چہ کنم قافلہ تیز است

اسی مضمون کو ایک اور پیرایہ میں ادا کرتا ہے،

فیضی ازقافلہ کعبہ روان نیست بروں ۔ ایں قدر ہست کہ از ماقدمے در پیش ست

بعض وقت اسکو خیال آتا ہے کہ مسلمان بت پرستی کے سخت دشمن ہیں، لیکن کعبہ کی در و دیوار کی تعظیم میں انکا جو طریق عمل ہے، اس میں ظاہر پرستی کا صاف شائبہ پایا جاتا ہے، اس خیال کو یوں ادا کرتا ہے،

آں کہ می کرد مرامنع پرستیدن بت ۔ در حرم رفتہ طواف در و دیوار چہ کرد

پھر غور کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ نہیں کعبہ پرستوں کی یہ اخیر منزل نہیں، مقصود اصلی وہی ذات بحت ہے لیکن مبتدیوں کو ان ابتدائی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے، اس بنا پر کہتا ہی،

کعبہ را ویران مکن اے عشق کانجا یک نفس ۔۔۔ گہ گہے پس ماندگان راہ منزل می کنند

(۴) غزل میں عام شعرا کا قاعدہ ہے کہ کوئی قدیم طرح سامنے رکھ لیتے ہیں، پھر ایک ایک قافیہ پر نگاہ ڈالتے ہیں اور جو قافیہ جس انداز سے بندھ سکتا ہے باندھتے جاتے ہیں، رفتہ رفتہ غزل پوری ہو جاتی ہے، یہ بہت کم ہوتا ہے کہ پہلے کوئی مسلسل یا مفرد خیال دل میں آئے اسکو شعر میں ادا کریں، پھر غزل پوری کرنیکے لئے اور اشعار بھی لکھتے جائیں لیکن فیضی کی اکثر غزلوں میں صاف نظر آتا ہے کہ کسی واقعہ کے اثر سے کوئی خیال دل میں آتا ہے اور اسی کو وہ ادا کر دیتا ہے، خطوط میں جا بجا لکھتا ہے کہ فلاں واقعہ نے یہ خیال پیدا کیا، اور وہ غزل کی صورت میں ادا ہوا، مثلاً دکن کے سفر میں ایک دفعہ کچھ ہنگامہ ہوا، لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے، فیضی نے بہت رو ہا، کسی نے نہ سنا اُس وقت بے اختیار اُس کی زبان سے یہ غزل ادا ہوئی،

بازیارانِ طریقت سفرے درپیش است ۔۔۔ رہ نوردان بلا را خطرے درپیش است
کس نمی گویدم از منزلِ اول خبرے ۔۔۔ صد بیابان بگذشت و دگرے درپیش است
ہمرہان ایں ہمہ نومید نباشید از من ۔۔۔ کہ دعائے سحرم را اثرے درپیش است
ما نہ آنیم کہ نادیدہ قدم بگذاریم ۔۔۔ شکر کن قافلہ را راہبرے درپیش است
اے صبا! برسر آفاق گُل مژدہ بریز ۔۔۔ کہ شب تیرۂ ما را سحرے درپیش است
فیضی از قافلۂ کعبہ روان بیرون نیست ۔۔۔ ایں قدر ہست کہ از ماقدرے درپیش است

اسی طرح اکبر جب گجرات کی مہم سے آیا ہے، تو ایک غزل لکھی ہے، جس کا مطلع یہ ہے،

نسیم خوشدلے از فتحپور می آید ۔۔۔ کہ بادشاہ من از راہ دور می آید

احمد آباد گجرات میں پہنچا ہے تو وہاں کے دلفریب حسن نے اسپر ایک خاص اثر کیا ہے، وہی غزل میں ادا کرتا ہے،

منم کہ کشتۂ گجراتیاں بیدادم ۔۔۔ خراب عشوۂ خوباں احمد آبادم
سہی قدے زسر ناز جلوۂ ننمودہ ۔۔۔ کہ ہمچو سایہ بدنبال آن نیفتادم

بهر طرف کہ خرامید سرو آزادی | غلام او شدم و خط بندگی دادم
چو رشک گلشن فردوس احمد آباد است | از دم مباد برونم کشند چون آدم
بہ حسن مردم گجرات باد نیست ولے | نمی روند جوانان دہلی از یادم

لیکن انصاف یہ ہے کہ ایک حکیم، ایک فلسفی، ایک ادیب عشق کی کڑیاں نہیں جھیل سکتا،

بہ سوز عشق، شاہان را چہ کار است | کہ سنگ لعل خالی از شرار است

اس بناء پر فیضی کے عشقیہ اشعار میں وہ سوز و گداز نہیں، جو عاشق تن شعرا کا خاصہ ہے نظیری فتنہ گراں گجرات کی شان میں کچھ کہتا، تو تم دیکھتے کہ سننے والے دل تھام کر رہ جاتے،

بہر حال فیضی کے تغزل کا اندازہ کرنا چاہو تو اشعار ذیل سے کر سکتے ہو،

آنچہ بہ فیضی نظر دوست کرد | مشکل اگر دشمن جانی کند
ناشکری عشق چوں تواں کرد | غم بر سر غم فزود ما را
حیران فسوں سازی عشقم کہ خیالت | از دیدہ دروں آید و در سینہ نگنجد

شب وصل کے ذکر میں ایک غزل لکھی ہے، دو شعر سننے کے قابل ہیں

نگویم اے فلک از ہجر بے نہایت تو بر گردی | شب وصل است خواہم اندکے آہستہ تر گردی
زمہتاب رخش کاشانۂ من روشن است امشب | اگر وقت طلوعت آید اے خورشید بر گردی

عرفی شیرازی[1]

عرفی کا نام ونسب | محمد نام، جمال الدین لقب، عرفی تخلص باپ کا نام زین الدین بلوی اور دادے کا جمال الدین چادر باف تھا، ایران میں اُن محکمہ جات اور عدالتوں کو جو مذہبی صیغہ سے تعلق نہیں رکھتیں "عرف" کہتے ہیں، عرفی کا باپ شیراز کی دار الحکومت میں ایک معزز عہدہ پر ممتاز تھا، عرفی نے اسی مناسبت سے اپنا تخلص عرفی رکھا تھا، مآثر رحیمی میں ہے،

چوں پدرش بعض اوقات در دیوانِ حکّام فارس بامر وزارت داروغہ دار الافاضل شیراز مشغولی می نمود مناسبت شرعی عرفی رامنظور داشتہ تخلص خود عرفی کرد،

اس تخلص کے اختیار کرنے کے متعلق اس قدر اور کہنا ضرور ہے کہ عرفی فطرۃً مغرور اور خود ستا تھا، چونکہ ایران کے اکثر شعرا معمولی خاندانوں سے تھے مثلاً خاقانی بڑھئی تھا، فردوسی باغبانی کرتا تھا، باقر کاشانی خردہ فروش تھا، برخلاف اسکے عرفی ایک معزز خاندان کا آدمی تھا، اور اس کا باپ سرکاری محکمہ سے بھی تعلق رکھتا تھا، اس لئے تخلص میں بھی فخر کی ادا قائم رکھی، عرفی نے نام ونسب پر اکثر فخر کیا ہے

---

[1] عرفی کے حالات اگرچہ مختصراً عام تذکروں میں ملتے ہیں لیکن مستند اور دلچسپ واقعات مآثر رحیمی اور تذکرہ عرفات اوحدی کے سوا اور کسی تذکرہ میں نہیں پائے جاتے، مآثر رحیمی اصل میں عبد الرحیم خانخاناں کی سوانح عمری ہے، لیکن اس میں تمام اُن شعرا اور اہل فن کا تذکرہ ہے، جو خانخاناں کے دربار سے تعلق رکھتے تھے اس کتاب کا مصنف خود اُن شعرا کا ہمعصر تھا، اس لئے دلچسپ حالات بہم پہنچائے ہیں، اور اکثر واقعات چشمدید لکھے ہیں، عرفات کا مصنف بھی قریب قریب اسی زمانہ میں تھا، اور اس نے عرفی کو تیس برس کی عمر میں دیکھا تھا، یہ دونوں کتابیں میرے پیش نظر ہیں،

اور یہ بھی اُسکے خصوصیات میں ہے، ورنہ ایران کے شعرا میں نسب کا فخر بہت ہی شاذو نادر پایا جاتا ہے،

عرفی کی تعلیم و تربیت شیراز میں ہوئی، شاہ نواز خاں (مصنف مآثر الامرا) نے تذکرۂ بہارستانِ سخن میں لکھا ہے کہ عرفی نے علاوہ معمولی علوم کے مصوری و نقاشی کی بھی تعلیم پائی تھی، عرفی نے جب ہوش سنبھالا تو سلطنت صفویہ کا شباب تھا، اور طہماسپ و عباس کی علم پروری نے تمام ایران کو علم و ہنر کی نمائشگاہ بنادیا تھا، بالخصوص شاعری بڑے زوروں پر تھی، محتشم کاشی وحشی یزدی، غیرتی وغیرہ نے فغانی کی طرز کو اور زیادہ شوخ کردیا تھا اور تمام ملک انکی زمزمہ سنجیوں سے گونج اُٹھا تھا، عرفی نے بھی اپنے اظہار کمال کے لئے یہی میدان پسند کیا، اور باوجود کم سنی کے بڑے بڑے پُرانے اُستادوں کے ساتھ معرکہ آرائی شروع کردی، اس زمانے میں فغانی کی اکثر غزلیں طرح کی جاتی تھیں، اور محتشم کاشی وغیرہ ان میں غزلیں لکھتے تھے، عرفی بھی انہیں طرحوں پر غزلیں لکھتا تھا اور عام مشاعروں میں بے باکانہ پڑھتا تھا، وحشی یزدی یزد میں سکونت رکھتا تھا، اسلئے اس سے تحریری مناظرات رہتے تھے، اوحدی نے لکھا ہے کہ جب میں شیراز گیا تو مشہور شعراء کے نام دریافت کئے لوگوں نے غیرتی کا پتہ دیا، شیراز میں ایک دکان تھی جو شعرا کا دنگل تھا، یہاں عارف لاہجی، حسین کاشی مورخ، میرابوتراب، تقیای شبستری مخاطب بہ مورخ خاں، رضای کاشی وغیرہ مشاعرے کرتے تھے، مشاعرہ میں غیرتی اور عرفی سے مباحثہ ہوا، عرفی نے دعوے کے دونوں پہلو مخالف اور موافق لئے اور دونوں میں غیرتی پر غالب آیا،

عرفی کی قدردانی کے لئے اگرچہ ایران میں بھی کچھ کم سامان نہ تھا، تاہم ہندوستان کی سی بات کہاں نصیب ہوسکتی تھی، جس کی بدولت ایران کے ہر ہر گوشے سے اہل فن کھنچے چلے آتے تھے،

بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ عرفی شہزادہ سلیم کے حسن پر غائبانہ عاشق

ہوکر آیا، بہرحال اس نے ہندوستان کا رخ کیا، راستہ میں ڈاکہ پڑا اور اسکی کل کائنات جاتی رہی، اس پر یہ رباعی لکھی،

دو شنبہ کہ بُرد بر دبر دو شم بود زانو چو عروسِ تو در آغوشم بود
پوشیدنیئے نہ داشتم غیر از چشم چیزے کہ بزیر سر نہم گوشم بود

ہندوستان میں اگرچہ سیکڑوں امراء اور اہل دول تھے، لیکن عرفی نے ان سب میں فیضی کو انتخاب کیا جس کی وجہ یہ تھی کہ اسکے دربار تک پہنچنا آسان تھا، یا یہ کہ سخن شناسی کی توقع جو فیضی سے ہو سکتی تھی اور کسی سے نہیں ہو سکتی تھی عرفی فتح پور سیکری میں فیضی سے ملا، فیضی نے اسکی پوری قدر دانی کی پنجاب کے سفر میں وہ اٹک تک فیضی کے ہمرکاب رہا اور اُسکی تمام ضروریات فیضی ہی کی سرکار سے انجام پاتی رہیں[1]، لیکن عرفی کی نخوت پرستی کی وجہ سے صحبت برآء نہ ہو سکی اور بالآخر اس دربار سے قطع تعلق کرنا پڑا،

اس زمانہ میں اکبری دربار کے نورتن سب موجود تھے ان میں حکیم ابوالفتح گیلانی اگرچہ ظاہری منصب و اقتدار کے لحاظ سے سب سے کم پایہ تھا، یعنی صرف ہزاری منصب رکھتا تھا، لیکن بہت بڑا عالم اور علم و فضل کا بڑا قدردان تھا، اسکے ساتھ عرفی کا ہموطن اور ہم مذہب تھا، ان خصوصیات کی بنا پر اس نے اسی کو ترجیح دی اور قصیدہ مدحیہ لکھ کر پیش کیا، یہ پہلا دن تھا کہ عرفی کے غرور کی آن ٹوٹی، غالباً خود عرفی کو بھی اسکا سخت صدمہ ہوا، چنانچہ قصیدہ میں اسکے اشارے پائے جاتے ہیں، چونکہ حکیم ابوالفتح بڑا نکتہ شناس اور نقاد فن تھا، عرفی نے اسکے فیض صحبت سے بہت ترقی کی، حکیم ابوالفتح نے ایک رقعہ میں جو خانخاناں کے نام ہے یہ الفاظ لکھے ہیں، ملا عرفی و ملا حیاتی بسیار ترقی کردہ اند[2]"

اللہ اکبر! ایک وہ زمانہ تھا کہ امراء اور اہل دول علم و فضل میں یہ پایہ رکھتے تھے کہ عرفی جیسے اہل کمال اُنکی صحبت سے مستفید ہو سکتے تھے، عرفی نے بھی حکیم ابوالفتح کی

[1] تاریخ بدایونی، [2] خزانہ عامرہ ذکر حیاتی گیلانی،

احسانمندی کا پورا حق ادا کیا، جس زور کے قصیدے حکیم صاحب کی شان میں لکھے اکبر و خانخانان کی مدح میں بھی نہیں لکھے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب تک ابوالفتح زندہ رہا، اس نے خود اپنی خواہش سے کسی دربار کی طرف رُخ نہیں کیا،

حکیم ابوالفتح اور خانخانان سے نہایت درجہ کا اتحاد تھا، حکیم موصوف کی فرمایش سے عرفی نے خانخانان کی مدح میں قصیدہ لکھا، جسکا مطلع یہ ہے۔ ع، بیا کہ باد لم آں می کند، پریشانی اس قصیدہ میں اس واقعہ کا نہایت لطیف پیرایہ میں ذکر کیا ہے، چنانچہ کہتا ہے،

ازاں نہ دیدہ ثنا گو میت کہ می بینم	ترا و اورا یک تن بچشم روحانی
دلیل وحدتم ایں بس کہ مدح خود میخواست	مرا بمدح تو فرمود گوہر افشانی

حکیم ابوالفتح نے ۹۹۷ھ ہجری میں انتقال کیا، عرفی پر اس واقعہ کا سخت اثر ہوا، چنانچہ اس زمانہ میں خانخانان کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے، اسمیں کہتا ہے،

چہ احتیاج کہ گویم کہ مُردہ عرفی را	چہ بر سر از ہوس مرگ ناگہاں آمد
برفت و لطف تو بر من گذاشت این مدی است	بہ نزد عقل کہ تاوان آں زیاں آمد
تو آگہی کہ مرا از غروب ایں خورشید (یعنی ابوالفتح)	چہ گنجہائے سعادت زیان جان آمد

حکیم ابوالفتح کے مرنے کے بعد عرفی خانخانان کے درباریوں میں داخل ہوا، اور پھر خاندان شاہی کے سوا اور کسی کے آستانہ پر کبھی سر نہیں جھکایا، چنانچہ خود فخریہ کہتا ہے،

یک منعم و یک نعمت و یک منت و یک شکر	صد شکر کہ تقدیر چنیں راندہ قلم را

خانخانان امرائے اکبری کا گل سرسبد تھا، اس زمانے میں وہی ایک شخص تھا جسکے تاج فخر پر صاحب السیف والقلم کا طرہ زیب دیتا تھا، گجرات کی فتح جس میں اس نے دس ہزار فوج سے چالیس ہزار کی جمعیت کو شکست دی، اسکی شجاعت کا ایک معمولی کارنامہ ہے، خود شاعر اور شعرا کا بڑا قدردان تھا عبدالباقی نہاوندی نے اسکے مفصل حالات دو جلدوں میں لکھے ہیں، ایک جلد میں صرف اس کے دربار کے شعرا اور اہل کمال کا تذکرہ ہے،

عرفی نے خانخاناں کے دربار میں پہنچکر خاطر خواہ ترقی حاصل کی ماثر رحیمی میں لکھا ہے۔

بہ اندک فرصتے بہ یمن تربیت وشاگردی ومداحی این دانای رموز پختگی تمام وترقی الاکام در منظوماتش بہم رسید،

چونکہ خانخاناں کے دربار میں بڑے بڑے نامور شعرا مثلاً نظیری نیشاپوری شکیبی اصفہانی انیسی، ظہوری وغیرہ سے مقابلہ رہتا تھا۔ عرفی کا کلام روز بروز ترقی کرتا جاتا تھا، یہانتک کہ تقرب اور اختصاص میں بھی وہ حریفوں کی صف کو چیرتا ہوا آگے نکل گیا، یہ بات اسی کو نصیب ہوئی کہ دربار میں جاتا تھا۔ تو عام طریقہ پر آداب وکورنش نہیں بجالاتا تھا، اور جس جگہ جس طرح چاہتا تھا بیٹھ جاتا تھا، ماثر رحیمی میں ہے،

درایام ملازمت تسلیم وکورنشے کہ در ہندوستان متعارف ست کہ بعوض سلام بصاحبان می کنند بہ صاحب خود نمی کرد، وبہر طرز وطور روشے کہ میخواست درمجالس می نشست واہل عالم تقدیم ادراقبول می نمودند

خانخاناں نے عرفی کے ساتھ وقتاً فوقتاً جو فیاضیاں کیں، اسکی ایک ادنےٰ مثال یہ ہے کہ ایک قصیدے پر ستر ہزار روپے انعام دلوائے،

عرفی نے اگرچہ خانخاناں کے سوا امراء اور اہل دربار میں سے کسی کی مدح سرائی گوارا نہ کی، لیکن فرمانروائے وقت سے یہ بے نیازی ممکن نہ تھی؛ اسلئے خود اپنی خواہش یا خانخاناں کی فرمایش سے اکبر کی مدح میں اس نے متعدد قصائد لکھے، لیکن ابوالفضل اور فیضی کے آگے اسکا چراغ جل نہیں سکتا تھا۔ ابوالفضل نے اکبر نامہ اور آئین اکبری دونوں میں اسکا تذکرہ کیا ہے لیکن اس طرح کہ نہ کرتا تو اچھا تھا، اکبر نامہ میں لکھتا ہے۔

درے از سخن سرائے بر دکشودہ بود ندر خودنگریست وبرباستانیان

لہ خزانۂ عامرہ تذکرۂ عرفی۔

زبانِ طعن کشود، غنچہ استعداد نشگفتہ پژمرد،

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عرفی حد سے زیادہ مغرور اور خود ستا تھا اور اساتذہ سلف کا نام اپنے مقابلہ میں تحقیر سے لیتا تھا، چنانچہ کہتا ہے،

انصاف بدہ بوالفرج و انوری امروز | بہر چہ غنیمت نشمارند عدم را
روح اللہ ز اعجاز سخن دشمن شاں باد | تا من قلم از رازم و گیرند قلم را
تفرجے کہ من از بہر روح سازدہم | نہ انوری نہ غلانی دہد نہ بہمانی
نازش سعدی بہ مشت خاک شیراز ار چہ بود | گر نمی دانست باشد مولد و ماوائے من
دم عیسیٰ تمنا داشت خاقانی کہ برخیزد | بہ امداد صبا اینک فرستادم بشیر دانش

اسکے فخر و غرور سے تمام ہمعصر نالاں تھے، یہانتک کہ نظیری نیشاپوری جو ایک مرنج مرنجان شاعر تھا اس سے بھی ضبط نہ ہو سکا، چنانچہ ایک قصیدہ میں جو عرفی کے مرنے کے بعد اسکے جواب میں لکھا ہے کہتا ہے،

دریں قصیدہ بگستاخی ار چہ عرفی گفت | بداغ رشک پس از مرگ سوخت نماقانی
کنوں بگور چناں او برشک می سوزد | کہ در تنور تواں گوسفند بریانی

قصیدہ کشمیریہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اکبر نے ۹۹۷ھ ہجری میں کشمیر کا جو سفر کیا تھا اس میں عرفی بھی ہمرکاب تھا۔ ایک قطعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اکبر نے کسی موقع پر ایک گھوڑا بھی انعام میں دیا تھا، لیکن عرفی نے بجائے اسکے کہ شکر کا اظہار کرتا، اُلٹے گھوڑے کی ہجو لکھی،

شاہنشہا حقیقت اسپے کہ دادۂ | بشنو ز لطف تا برسانم بعز عرض
ہستم براد سوار و معنی پیادہ ام | گاہے بطول نیز دم اکنوں دم بعرض

خانخاناں اور اکبر کے سوا عرفی نے کسی در آستانہ کی ناصیہ سائی کی تو وہ شاہزادہ سلیم تھا اور عرفی کی تاریخ زندگی میں یہ واقعہ ایک خاص حیثیت رکھتا ہے تمام تذکرے متفق ہیں کہ عرفی شہزادۂ مذکور کا جان دادہ تھا، یہ امر اگرچہ بظاہر بالکل خلاف قیاس ہے، لیکن عرفی کے قصائد میں بے شبہہ یہ جھلک پائی جاتی ہے، شاہزادۂ

موصوف کی شان میں اسکے جو قصیدے ہیں انکے دیکھنے سے صاف نظر آتا ہے، کہ یہ اور کوئی جوش ہے جسکا رنگ مداحی کے لباس میں بھی جھلک رہا ہے عرفی کو اس خوش قسمتی پر ناز ہو سکتا ہے کہ شہزادہ نے خود اُسکو یاد کیا اور دربار میں بلاکر قصیدہ لکھنے کی فرمایش کی عرفی جس شان سے دربار میں پہنچا ہے اور شہزادہ نے جس طرح اس سے نگاہ پنہاں کی زبان سے باتیں کی ہیں، اسکی تصویر خود عرفی نے نہایت خوبی سے کھینچی ہے،

کہ ناگہاں زدرم دررسید مژدہ دہے	چناں کہ از چمن طالعم بمغز شمیم
چہ گفت، گفت کہ، اے مخزن جواہر قدس"	چہ گفت، گفت کہ اے مطلب بہشت نعیم
بیا کہ از کرت یادی کند دریا	بیا کہ تشنہ لبت راطلب کند تسنیم
بہ رہ فتادم دگشتم چناں شتاب زدہ	کہ دست اہل کرم در نثار گوہر و سیم
مرا چو دوش بدوش ادب بدید، استاد	بلطف خاص بدل کرد التفاتِ عمیم
رموز کورنش وتسلیم را ادا کردم	بہ داب مردم دانا و بذلہ سنج ندیم
نگفت و من بشنودم ہر آنچہ گفتن داشت	کہ در بیان نگہش کرد بر زبان تقدیم
لبش چو نوبتِ خویش از نگاہ باز گرفت	فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم

اخیر کے دونوں شعروں کا مطلب یہ ہے،

شہزادہ نے کچھ نہیں کہا اور میں نے سُن لیا، کیونکہ تقریر کرنے میں اُسکی نگاہ نے زبان پر پیش دستی کی، پھر جب نگاہ سے گزر کر ہونٹوں کی باری آئی تو میرے کان کوثر و تسنیم کی موجوں میں ڈوب گئے،

شیخ سعدی نے ایک قطعہ میں یہ مضمون باندھا تھا کہ اُس شاعر کو عشق کا نام نہ لینا چاہیئے جو قصیدہ میں دو چار شعر عشقیہ کہکر مداحی شروع کر دیتا عرفی نے اس پر ایک قطعہ لکھا ہے اس میں شہزادہ سلیم کی معشوقی کی طرف نہایت لطیف اشارہ کیا ہے،

دے کسے گفت کہ سعدیؔ گہر افروزِ سخن	قطعہ گفت کہ اندیشہ بر آں بے

سخن عشق حرام است بران بیهده گوے | کہ چو دہ بیت غزل گفت مدیح آغاز د
گفتیم ایں خود ہمہ عیب ست کہ در راہ تمیز | ہر کہ ایں لاف زند رخش دوئی می تازد
وحش اللہ زیک اندیشی عرفی کورا | آنکہ ممدوح بود عشق بر او می بازد

یعنی سعدی کو ممدوح کو معشوق پر ترجیح نہیں دیتے لیکن بہر حال معشوق کے علاوہ اُنکا کوئی ممدوح بھی ہے، لیکن میرا تو ممدوح بھی وہی ہے جو معشوق ہے،

وفات تذکرہ داغستانی وغیرہ میں لکھا ہے کہ حاسدوں نے اسکو زہر دیدیا بعضوں نے لکھا ہے کہ زہر دینے کی وجہ شہزادہ سلیم کے ساتھ عشق کا اظہار تھا، ابوالفضل نے اکبرنامہ میں سنہ ۹۹۹ ہجری کے واقعات کے ذیل میں لکھا ہے،

سیزدہم، عرفی شیرازی رخت ہستی بربست، درے از سخن سرائے بروے کشودہ بود تند، اگر در خود نہ نگرستے زندگی را بشائستگی، سپرے و زمانہ نجتے فرصت دادے، کار او بلند، دریں نزدیکی ایں رباعی بر سنجیدہ بود،

عرفی دم نزع است و ہمان مستی تو | آیا بچہ مایہ رخت بربستی تو
فردا است کہ دوست نقد فردوس بکف | جویائے متاع ست و تہیدستی تو

انتقال کے وقت اسکی عمر ۳۶ برس کی تھی،

تذکرہ داغستانی میں لکھا ہے کہ لاہور میں مدفون ہوا، اور چند روز کے بعد کوئی درویش کسی اور بزرگ کے دھوکے میں اُسکی ہڈیاں قبر سے نکال کر نجف میں لے گیا اور وہاں دفن کردیں، لیکن یہ غلط ہے، عبد الباقی نے جو خود عرفی کا معاصر تھا مآثر رحیمی میں لکھا ہے کہ میر صابر اصفہانی نے، جو اعتماد الدولہ غیاث بیگ وزیر اور خسر و جہانگیر بادشاہ کا درباری تھا ایک قلندر کو رقم کثیر دی کہ عرفی کی ہڈیاں لاہور سے **نجف** لیجائے، بہر حال عرفی کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی،

بکاوش مژہ از گور تا نجف بروم | اگر بہند ہلاکم کنی وگر بہ تتار

ملا رونقی ہمدانی نے اس واقعہ کی تاریخ میں یہ قطعہ لکھا،

یگانہ گوہر دریائے معرفت عرفی | کہ آسمان پے پرورد نش صدف آمد

بکاوش مژہ از گور تا نجف بردم | زدہ است تیر دعاے وبرہدف آمد
رقم زد از پے تاریخ رد نقی کلکم | بکاوش مژہ از گور تا نجف آمد

اخلاق وعادات عرفی کے اخلاق وعادات میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے، وہ فخر، غرور، کمزبینی، خودستائی ہے، اسکے معتقدین خاص تک اسکے غرور سے نالاں ہیں، بدایونی نے فیضی کے توڑ پر اسکو بہت چمکایا ہے تاہم یہ لکھنا پڑا۔

اما از بس عجب ونخوت کہ پیدا کردا از دلہا افتاد،

معلوم ہوتا ہے کہ اس رعونت نے تمام لوگوں کو اسکا دشمن بنادیا تھا ایک دفعہ بیمار ہوا اور شاید یہ وہی مرض الموت کی بیماری تھی، لوگ عیادت کو آئے لیکن چونکہ دل صاف نہ تھے غمخواری کے لہجہ میں جو بات کہتے تھے اسمیں دل آزاری کا پہلو ہوتا تھا، عرفی بھی سمجھتا تھا اور دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتا تھا، اسی حالت میں ایک قطعہ کہا جس میں مرض کی شدت بیان کرکے لوگونکی ستم ظریفانہ بیمارپرسی کی تصویر کھینچی ہے، عرفی عالم تخیل کی بلندی سے نیچے نہیں آتا لیکن اس قطعہ میں واقعہ نگاری اختیار کی ہے اور سماں باندھ دیا ہے،

تن اوفتاد دریں حال و دوستان فصیح | بہ دور بالش وبستر ستادہ چون منبر
یکے بہ ریش کشد دست وکج کند گردن | کہ روزگار وفا باکہ کرد؟ جان پدر
بہ جاہ ومال خردمایہ دل نبایدبست | کجا است دولت جمشید ونام اسکندر
یکے بہ نرمی آواز وگفتہ دگوی حزیں | کند شروع وکشد آستین بدیدۂ تر
کہ جان من! ہمہ را ایں رہ است وباید رفت | تمام راہ روانیم ودہر راکب بر
یکے بہ چرب زبانی سخن طراز شود | کہ اے وفات تو تاریخ انقلاب خبر
فراہم آی وپریشان مدار دل زنہار | کہ نظم ونثر تو من جمع میکنم یکسر
پس از نوشتن وتصحیح می کنم انشا | بہ مدعاے تو دیباچہ چو درج گہر
چنانچہ ہستی فہرست دانش وفرہنگ | چنانچہ ہستی مجموعۂ صفات وہنر

اگرچہ شعر کمال تو نیست حد بشر ‏ ‏ ‏ بہ نظم و نثر در آویزم و فرو ریزم

ان سب کے جواب میں عرفی جل کر کہتا ہے۔

کہ این منافقگان را چہ آدرم برسر ‏ ‏ ‏ خدائے عز و جل صحتم دہد، بینی

نہایت حاضر جواب اور ظریف الطبع تھا، ایک دفعہ ابوالفضل کے گھر پر اُس سے ملنے گیا، دیکھا تو ابوالفضل قلم دانتوں میں دابے ہوئے سوچ میں بیٹھا ہے، سبب پوچھا، ابوالفضل نے کہا بھائی صاحب کی تفسیر بے نقط کا دیباچہ اُسی صنعت میں لکھ رہا ہوں، ایک موقع پر والد کا نام آگیا ہے چاہتا ہوں، نام بھی آئے اور صنعت کا التزام بھی ہاتھ سے نہ جائے، عرفی نے کہا تردد کی کیا بات ہے، اپنے لہجہ میں ممارک لکھ دیجئے (مبارک نام تھا، جسکو گنوار ممارک کہتے ہیں)

ایک دفعہ فیضی بیمار تھا، عرفی عیادت کو گیا، فیضی کو کتوں سے بہت شوق تھا، چند سگ بچے گلے میں سونے کے پٹے ڈالے پھر رہے تھے، عرفی نے کہا

مخدوم زادہا بہ چہ اسم موسوم اند

فیضی نے کہا یہ اسم عرفی، یعنی معمولی نام ہیں،

عرفی نے کہا مبارک باشد،

ظہوری سے اکثر دوستانہ خط و کتابت رہتی تھی، ایک دفعہ ظہوری نے کشمیر کی شال تحفہ میں بھیجی، غالباً شال معمولی درجہ کی تھی، عرفی نے جواب میں رقعہ لکھا جس میں تین رباعیاں شال کی ہجو میں تھیں، ایک یہ ہے،

آیات رعونت مرا تفسیر ست ‏ ‏ ‏ این شال کہ وصفش نہ حد تقریر ست

صد رخنہ بکار مردم کشمیر ست ‏ ‏ ‏ نالش نہ کنی قماشش کشمیر گزد

عرفی کی بد اخلاقی کے سبب شاکی ہیں، لیکن تعجب ہے کہ فیضی نے جو ملک سب سے

سلہ یہ دونوں واقعات خافی خاں نے حالات اکبر واقعات سنہ ۱۰۰۱ ہجری میں لکھے ہیں (خافی خان صفحہ ۲۰۰) دوسرا واقعہ بدایونی میں بھی مذکور ہے، سلہ خزانہ عامرہ ذکر ظہوری،

بڑا حریف کہا جاتا ہے، عرفی کی شریف النفسی کی نہایت تعریف کی ہے چنانچہ اپنے رقعہ میں جسکی پوری عبارت آگے چل کر آئے گی لکھتا ہے،

واز تہذیب اخلاق چگوید کہ در خاکی نہاد شیراز ذاتی می باشد نہ کسبی

شاید یہ ابتدائی ملاقات کا حال ہوگا جب فیضی کو پورا تجربہ نہیں ہوا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ عرفی بخلاف اور شعرا کے رند اور اوباش نہ تھا، کسی نے اسکو فسق کا الزام دیا تھا، اس پر اسکو سخت صدمہ ہوا، ایک قطعہ میں اسکا اظہار کیا ہے اور خاتمہ میں اپنے دل کو اس طرح تسلی دی ہے،

اہل دنیا ہمگی تہمت گیرند و فساد ‌ ‌ ‌ ‌ عیسی ایں را متحمل شد و مریم برداشت

باوجود بدمزاجی اور غرور کے عرفی نے کسی کی ہجو سے زبان آلودہ نہیں کی، یا کسی کو اس قابل نہیں سمجھتا ہوگا، ایک قصیدہ میں بہت جل کر کہا ہے تو صرف اس حد تک اکتفا کیا ہے۔

بامن از جہل معارض شدہ نا منفعلے

تصنیفات نفسیہ، تصوف میں ہے، نام سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس کے متعلق کوئی رسالہ ہے، مآثر رحیمی میں اسکی نسبت لکھا ہے،

درسالہ نیز موسوم بہ نفسیہ در نثر نوشتہ کہ صوفیان و درویشان را سرلوحہ دفتر تصوف و تحقیق می تواند شد،

مثنوی، بجواب مخزن اسرار، دیوان کے ساتھ چھپی ہے،

مثنوی بجواب شیریں خسرو، آتشکدہ اور مجمع الفصحا میں اسکے اشعار نقل کئے ہیں،

کلیات قصائد و غزلیات ۹۹۶ سنہ ہجری میں ایک دیوان ترتیب دیا تھا جس میں ۲۶ قصیدے ۲۷۰ غزلیں اور ۷۰۰ شعر کے قطعات اور رباعیاں تھیں، اس دیوان کی خود ہی تاریخ کہی تھی،

ایں طرفہ نکات سحری و اعجازی	چوں گشت مکمل برقم پردازی
مجموعۂ طراز قدس تاریخش یافت	اول دیوان عرفی شیرازی

اس رباعی میں عجیب و غریب صنعت رکھی ہے، چوتھا مصرع جس سے تاریخ نکلتی ہے اس میں اکائیوں کے عدد لئے جائیں تو قصائد کی تعداد کے موافق ہوتے ہیں یعنی ۲۶ دہائیوں کے عدد حساب کئے جائیں تو غزلوں کی تعداد کے برابر ہوتے ہیں یعنی ۲۷۰ - اور سیکڑوں کو لیا جائے تو قطعات اور رباعیوں کی تعداد ظاہر ہوتی ہے یعنی ... مختصر یہ کہ اسی مصرع میں تاریخ بھی ہے اور ہر قسم کے اشعار کی الگ الگ تعداد بھی،

یہ اخیر کا کلام ہے، اس سے پہلے چھ ہزار شعر کہے تھے، وہ بدقسمتی سے ضائع ہوگئے، چنانچہ اس کے ماتم میں ایک پُردرد غزل لکھی، جو دیوان میں موجود اور ذیل میں درج ہے،

عمر در شعر بسر کردہ و در باختہ ام	عمر در باختہ را بار دگر باختہ ام
ساقی مصطبۂ لطفم و می ریختہ ام	طائر باغچۂ قدسم و پر باختہ ام
العطش می زند از تشنہ لبی ہر ہویم	کہ قدح ہای پُر از خون جگر باختہ ام
زِ صد بشرع ہنر چوں نہ شود محو کہ من	شش ہزار آیت احکام ہنر باختہ ام

اسی رنج و غم میں دفعۃً بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کے جوش میں آکر کہتا ہے اور کیا خوب کہتا ہے،

گفتہ گر شد ز کفم، شکر کہ ناگفتہ بجاست	از دو صد گنج یکے مشت گہر باختہ ام

اس خیال کو کہ "اگر پچھلا کلام جاتا رہا تو مضائقہ نہیں پھر کہہ لونگا"، کس لطیف شاعرانہ پیرایہ میں ادا کیا ہے، یعنی "اگر کہا ہوا جاتا رہا تو پروا نہیں، شکر ہے کہ بن کہا ہوا تو موجود ہے"،

مرنے کے وقت اپنا دیوان جو اس کے ہاتھ کا مسودہ تھا، عبدالرحیم خانخانان کے کتب خانے میں بھیجدیا تھا، کہ مدوّن کر دیا جائے۔ چنانچہ خانخانان نے محمد قاسم مشہور بہ سراج کو اس کام پر مامور کیا، سال بھر کی

سلہ ماثر رحیمی،

شبانہ روز کی محنت میں دیوان کی ترتیب پوری ہوئی، کل چودہ ہزار شعر تھے، خانخاناں نے اس محنت کے صلے میں سراج کو انعام و اکرام سے مالامال کر دیا قاسم نے ایک قطعہ میں ان واقعات کا ذکر بھی کیا ہے،

عرفی آں واضح سخن کہ بر او
رشک دارد، رواں شروانی

نہ کہ شروانی ست در رشکش
بلکہ ہم رونی و صفاہانی

بعد چندے جو جلئے بودن نیست
رفت ازیں دیر ششدر رفانی

ماند از و دُرِ شاہوارے چند
کش قرین نیست بحری و کانی

صورتے چند جملہ با معنی
خلفے چند جملہ روحانی

لیک آں جملگی پراگندہ
ہمہ از بے سری و سامانی

آں قدر مہلتش نہ داد اجل
کہ بہ ترتیب شاں شود بانی

گفت با دوستاں بہ گاہ وداع
کائے عزیزان جسمی و جانی

بہ رسانید زادہائے مرا
بہ جناب معظم ثانی

صاحب حلم و علم وسیف و قلم
خان خاناں سکندر ثانی

دید چوں زادہائے عرفی را
ہمہ محمود نعل پیکانی

بعد یک چند، بندہ را فرمود
کہ دہم شاں نظام دیوانی

مدتے چند خون دل خوردم
تا کہ جمع آمد از پریشانی

از خرد خواستم چو تاریخش
گفت ترتیب دادہ نادانی

ترتیب دادہ سے ترتیب کی تاریخ نکلتی ہے، عبدالباقی نے اس پر ایک دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں عرفی کے حالات اور واقعات درج کئے چنانچہ مآثر رحیمی میں اسکا ذکر کیا ہے، افسوس یہ نسخہ آج بالکل نایاب ہے ورنہ غالباً بہت ہی دلچسپ باتیں معلوم ہوتیں، صمصام الدولہ شہنواز خان نے تذکرۂ بہارستان سخن میں لکھا ہے کہ عرفی کا ضائع شدہ کلام بھی آخر ہاتھ آیا اور دیوان میں داخل کر دیا گیا، لیکن جو نسخے اس سے پہلے شائع

ہو چکے تھے وہ ناقص ہے یہ بیان قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، میں نے عرفی کے دیوان کے نسخے باہم مختلف دیکھے ہیں، میرزا صائب نے اپنی بیاض میں عرفی کے اکثر اشعار انتخاب کئے ہیں، جو موجودہ دیوانوں میں نہیں ملتے،

کلام پر رائے اس قدر مسلم ہے کہ اصناف سخن میں سے عرفی مثنوی اچھی نہیں کہتا تھا، چنانچہ اسکے ایک معتقد خاص نے بھی تسلیم کیا،

مثنویش رنگ فصاحت نداشت کان نمک بود و ملاحت نداشت

اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اسکے کلام میں جا بجا خامی پائی جاتی ہے لیکن ان سب باتوں کے ساتھ وہ ایک طرز خاص کا موجد ہے، اور آج تک تمام شعرا اسکی تقلید کرتے آئے ہیں، ماٰثر رحیمی میں ہے،

مخترع طرز تازہ ایست کہ الحال مستعدان و اہل زبان و سخن سنجان تتبع اومی نمایند،

ایک عجیب بات یہ ہے کہ اسکی شاعری کی شہرت قصیدے میں ہے لیکن وہ خود کہتا ہے،

قصیدہ کار ہوس پیشگان بود عرفی تو از قبیلۂ عشقی وظیفہ ات غزل است

میرزا صائب نے اسکا رتبہ نظیری سے کم قرار دیا ہے چنانچہ کہتے ہیں،

عرفی کی نسبت معاصرین کی رائے

صائب چہ خیال ست شوی ہمچو نظیری عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

نظیری نے ایک ہم طرح قصیدے میں عرفی کے اشعار کا رد لکھا ہے ہم انکو اس موقع پر نقل کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوگا کہ نظیری جیسا شخص باوجود پوری کوشش کے عرفی کی شاعری پر اعتراض کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا،

دگر کہ گفت مباد از راوی شعرم دریں قصیدہ بروز کمال بنشانی

ترا کہ فضل بحدے بود کہ در بہ مت طیور وقت ترنم کنند سحبانی

کمال جہل و بلاہت بود کہ طعنہ زند بہ نقص مایہ کج فہمی و غلط خوانی

عرفی نے اپنے قصیدہ میں کہا تھا کہ میرا قصیدہ کسی غلط خواں سے نہ پڑھوایا جائے ورنہ میرا بھی وہی حال ہوگا جو کمال اسمٰعیل کا ہوا تھا، اسپر نظیری اعتراض کرتا

ہے کہ خانخاناں کی مجلس میں جانور بھی سحبان ہیں، اسلئے یہ اندیشہ کرنا کمال حماقت ہے،

دگر نبود ز شرط ادب در آوردن ۔۔۔ بسلک مدح تو مدح حکیم گیلانی

گر او بہ فضل فلاطون ہست بر کشیدہ تست ۔۔۔ بود بقرب کیان اعتبار یونانی

اگرچہ سایہ ز رفعت زمین فرد گیرد ۔۔۔ ولے نہد ہپے آفتاب پیشانی

عرفی نے خانخاناں کے مدحیہ قصیدہ میں حکیم ابوالفتح کی مدح بھی لکھی تھی، اس پر نظیری اعتراض کرتا ہے کہ ابوالفتح کی آپ کے سامنے کیا حقیقت ہے، وہ آپ ہی کا ساختہ پرداختہ ہے، اسلئے آپکے ذکر کے ساتھ اسکا ذکر موزوں نہیں،

دگر چہ ابر درافشاں شود کسے نہ کند ۔۔۔ کلاہ بادشہے را کلاہ بارانی

عرفی نے خانخاناں کی مدح میں لکھا تھا کہ ابوالفتح کے غصہ کا بادل جب برستا ہے تو لوگ تیری محافظت کی بارانی ٹوپی ڈھونڈھتے ہیں، نظیری کا یہ اعتراض ہے کہ خانخاناں کے پادشاہانہ تاج کو کلاہ بارانی نہیں کہنا چاہیئے تھا،

اگرچہ کشور چین پر ز نقش مانی بود ۔۔۔ خراب گشت نہ صورت بجاست نہ مانی

یہ شعر عرفی کے اس شعر کے جواب میں ہے،

ذخیرہ نہاد از من کہ مانی از صورت ۔۔۔ تمتّعے برم از وے کہ صورت از مانی

اعتراض یہ ہے کہ اب نہ مانی موجود ہے، نہ اُسکی بنائی ہوئی تصویریں اس لئے عرفی نے ممدوح کو مانی سے کیوں تشبیہ دی، ان اعتراضات کی جو وقعت ہے، ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں، لطف یہ ہے کہ ان اعتراضات کے ساتھ نظیری نے خود اخیر میں عرفی کے تتبع کا قصد کیا ہے، چنانچہ کہتا ہے،

بطرز وے دو سہ بیتے دگر ادا سازم ۔۔۔ کہ بہر دعوی او قاطع ست برہانی

عرفی کیلئے یہ فخر کیا کم ہے کہ نظیری جیسا شخص اسکی تتبع کا قصد کرتا ہے، نظیری کو عرفی کے کمال سے انکار ہے تو ہو، لیکن ملک الشعرا فیضی اسکی نسبت ایک خط میں لکھتا ہے،

از یارانِ دمساز و غمخواران ہمراز کہ دل از صحبت او آب میخورد مولانا عرفی شیرازی ست کہ دریں نوروز بہ قدم خود بر خاک نشینان ایں دیار منت نہادہ اند، بہ حق دوستی کہ ازیں عظیم تر سوگندے نمی دانند کہ بہ بلندی دوفور قدرت، و ایجاد معانی، و چاشنی الفاظ، و سرعت فکر و دقت نظر فقیر کسے راچوں او ندیدہ و نشنیدہ، واز تہذیب اخلاق چہ گوید کہ در خاکی نہاد شیراز ذاتی می باشد نہ کسبی، چند بیت ایشاں بالفعل حاضر بود در حاشیہ ایں صحیفہ نوشتہ آمد"

بعد مُردن ببرائے باد! بجائے خاکم | کہ فشانند مصیبت زدگان بر سر خویش
اے زلف عروس شادمانی شب تو | آرایش بزم بیغمی، مشرب تو
انباشتہ ہجران بہ نمک، داغ دلم | امانہ ازاں نمک کہ دارد لب تو
عشق آمد و رفت خونچکان در بازار | زہد آمد و کرد نقد تزویر نثار
آں پنبۂ داغ جُست و ایں پنبۂ گوش | زاں جبل متین تافتہ شد زیں زنار

ملا عبد القادر بدایونی لکھتے ہیں کہ عرفی کا کلام گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں کتب فروش بیچتے پھرتے ہیں، اور اہل عراق اور ہندوستانی تبرکاً لیتے ہیں" اس سے بڑھکر حسن قبول کی کیا دلیل ہوگی،

عرفی کا کلام عرفی کی عمر ۳۶ برس سے زیادہ نہیں ہونے پائی ابو الفضل کی در اندازی نے اسکو دربار میں کامیاب نہیں ہونے دیا، تمام ہمعصر شعرا اس سے ناراض تھے اسکے کلام میں کثرت سے ناہمواریاں اور خامیاں ہیں، ان سب باتوں پر بھی اکبری دور میں جس قدر اس کا نام روشن ہوا کسی کا نہ ہو سکا، اور اب بھی اسکے قصائد، تمام ہندوستان کے مکاتب میں داخل نصاب ہیں، اس سے خود بخود قیاس ہو سکتا ہے کہ اسکے کلام میں ایسے جوہر ہیں جن کی چمک کو کوئی چیز نہیں مٹا سکتی،

حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک طرز خاص کا موجد ہے، عبد الباقی جو خود اسکا معاصر

ہے لکھتا ہے،

مخترع طرز تازہ ایست کہ الحال درمیانۂ مستعدان و اہل زبان معروف ست و سخن سنجان تتبع ادمی نمایند،

اسکے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں،

زور کلام

۱- زور کلام جسکی ابتدا نظامی نے کی تھی، عرفی نے اسکو کمال کے درجہ تک پہنچا دیا، زور کلام ایک جدانی چیز ہے جسکا اندازہ صرف مثالوں سے ہو سکتا ہے، مجملاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ الفاظ کی شان و شوکت، بندش کی چستی، فقروں کا دروبست، خیالات کی رفعت، مضامین کا زور، اسکے ضروری عناصر ہیں، عرفی کے کلام میں یہ تمام باتیں موجود ہیں، مثلاً

آہنیں پنجہ تیغش بہ اجل گفت کہ من | موج بر موج شکستم چو بہ عمان رفتم
اگر نہیب بہ ہر چرخ واژگوں گردد | دگر عتاب کند آفتاب نگوں گردد
دوش بر دوش قضا دست در آغوش قدر | آمد از پردہ برون پردگی صنع خدا
چمن آید بہ چمن بہر تماشائے جمال | بلبل آید بہ سر بلبل بہ تمنائے غزل
مرحبا اے لنگر بخت تو کیوان پرور | مرحبا اے گہر ذات تو امکان آرا
ہر سر مویش اگر باز شگافی بنگرد | سو منائے ست کہ چیدست در ولات و ہبل

اس مضمون کو کہ ممدوح بڑے بڑے سلاطین کو شکست دیتا ہے، اس انداز سے ادا کرتا ہے،

رمح او گوید اگر جنگ و گر صلح کہ من | بہ کشاد گرہ جبہۂ خاقان رفتم

یعنی اسکا نیزہ کہتا ہے کہ لڑائی ہو یا صلح میں ہمیشہ خاقان چین کی پیشانی کے بل کھول دیا کرتا ہوں،

اس مضمون کو کہ میں معشوق پرستی کی وجہ سے ذلتیں اٹھاتا ہوں یوں ادا کرتا ہے،

زاں شکستم کہ بدنبال دل خویشم مدام | در نشیب شکن زلف پریشان رفتم

دشمن کے مرعوب ہونے کو اس طرح ظاہر کرتا ہے،

ز رعشہ باطن خصمت چو جعد حور وشان   شکن بروئے شکن خم بروئے خم چنید

ممدوح کے جود وکرم، جاہ جلال، حکومت واقتدار کو یوں ادا کرتا ہے،

فارس حکمش، بہ جولان رفت وگفت   آفتابم گو ست، چوگان میزنم

یعنی اُسکے حکم کا سوار میدان میں گیا اور بولا کہ آفتاب ایک گیند ہے جس سے میں کھیل رہا ہوں،

گفت جاہش دہر بر من تنگ شد   چاک در افلاک ارکان میزنم

یعنی اُسکے دبدبہ نے کہا کہ زمانے میں اب میں سما نہیں سکتا، اسلئے افلاک اور عناصر کو چاک کئے دیتا ہوں،

گفت جودش سیم وزر در کان نماند   سکہ بر پیشانی کان میزنم

یعنی اُس کی سخاوت نے کہا کہ چاندی اور سونا کان میں نہیں رہا، اس لئے خود کان کی پیشانی پر سکہ لگاتا ہوں،

اس بات کو کہ اگر ممدوح کے خلاف مزاج کوئی شخص بات کہے، تو فوراً واپس لیگا، یوں ادا کرتا ہے،

ہر حدیثے کہ رضایت بسماعش نبود   از درِ گوش سراسیمہ، بلب گردد باز

یعنی جو بات کہ اسکے سامعہ کے خلاف مرضی ہو، وہ کان تک آکر سخت بدحواسی کے ساتھ بولنے والے کے ہونٹوں کی طرف پلٹ جائیگی،

اس بات کو کہ حریف کس برتے پر میرا مقابلہ کرسکتا ہے اس طرح ادا کرتا ہے،

خصم وطرز سخن من، بچہ فہم وبچہ درک   غیر دنظم گہر من بچہ برگ وبچہ ساز

ممدوح کی تحریض اور نعرۂ جنگ سے بہادری کے عام اثر پیدا ہو جانے کو اس طرح ادا کرتا ہے،

اگر بصحن چمن فی المثل شجاعت او   دہد نہیب کہ ہین یاسمین وہان نرگس

چو عکس لالہ زند، یاسمین در آب آتش   ق   چو شاخ بید کشد، خنجر از میان نرگس

یعنی اگر اسکی شجاعت باغ میں ڈپٹ کر چنبیلی اور نرگس سے کہے کہ ہاں لینا، تو

چنبیلی لالہ کے عکس کی طرح پانی میں آگ لگا دیگی، اور نرگس، بید کی شاخ کی طرح کمر سے تلوار کھینچ لے گی،

نہیب، ہین وہان، آتش در آب زدن، خنجر از میان کشیدن یہ الفاظ اور عکس لالہ اور شاخ بید کی تشبیہ، ان سب باتوں نے مل کر کلام میں کس قدر زور پیدا کر دیا ہے،

چونکہ اسکا کلام عموماً پُرزور ہوتا ہے اس لئے چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا، آگے اور اور عنوانوں کے ذیل میں جو اشعار آئینگے اُن پر زور کلام کی حیثیت سے بھی نظر ڈالنی چاہئیے

۲۔ الفاظ کی نئی نئی ترکیبیں، عرفی نے سیکڑوں نئی نئی ترکیبیں اور نئے نئے استعارے پیدا کئے جن سے جدت اور طرفگی کے علاوہ نفس مضمون پر خاص اثر پڑتا ہے مثلاً،

خیزو شراب حیرتم زاں قدِ جلوہ ساز دہ — روے بروے حُسن کن، دست بدست ناز دہ
مرہمی کن تو کہ فرزند مسیح است و مسیح — حاتمی کن تو کہ اقبال گیجے ست گدا ے
مرحبا اے زعنایاتِ ازل رمز فروش — مرحبا اے بہ علامات ہُنر خویش ستاے
ناخنِ قدرت او پردہ تحقیق شگاف — خامۂ دولتِ او چہرہ توفیق کشاے
گُلِ اندیشۂ من ہجر غلط معجزہ رنگ — بلبل نطق من الہام، غلط، وحی سراے
بہ برقع مہ کنعان کہ بود حسن آباد — بہ حجلہ گاہ زلیخا کہ بود یوسف زار
بہ تیشۂ کہ براطراف صورتِ شیریں — ہمہ کرشمہ تراشید و ریخت بر کہسار

بہ نخل وعدہ تراش و قناعت عیاشش

کہ گرہ شود، رہِ کوی تو جملہ نشتر خیز — کنم بمردمک دیدہ طے نشتر زار
بہ روش مہر فزا و بہ نگہ صبر گداز،

یہ ترکیبیں جس قدر بدیع ہیں، اُسی قدر مضمون میں زور اور وسعت پیدا کرتی ہیں، فرض کرو اگر یہ کہنا چاہیں کہ مجلس میں کثرت سے خوش جمال جمع تھے

تو یہ مضمون جس وسعت کے ساتھ صرف اس لفظ سے ادا ہو سکتا ہے
کہ "مجلس" "یوسف کدہ بن گئی تھی" سیکڑوں الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا،
اسی طرح نشتر خیز، معجزہ رنگ، رمز فروش، کیوان پرور، امکان آرائے
حسن آباد صبر گداز، وغیرہ ترکیبوں سے مضمون میں جو زور، وسعت، اور
رنگینی پیدا ہوتی ہے، محتاج اظہار نہیں، اسی قسم کی ترکیبیں، متوسطین
اور متاخرین کی خاص ایجاد ہیں، عرفی اگر ان کی ایجاد کا خدائے یکتا نہیں
تاہم خدا ضرور ہے،

جدت استعارات و تشبیہ

۴۔ عرفی کے کلام کی خصوصیات میں سے ایک بڑی خصوصیت استعارات
کی جدت اور طرفگی ہے، یہ مسلم ہے کہ انشا پردازی اُسی قدر لطیف اور پُر زور ہوگی
جسقدر استعارات، لطیف اور پُر زور ہونگے، عرفی نے استعارات کی جدّت
اور تنوع سے ایک گوناگوں عالم پیدا کر دیا، ان میں بعض بے مزہ اور دور از کار
ہیں، جیسا کہ صاحب آتشکدہ اور مجمع الفصحا کا خیال ہے، لیکن زیادہ تر
ایسے ہیں، جو ایوانِ شاعری کے نقش و نگار ہیں، مثلاً

میر ابو الفتح کز سیاستِ او | غمزہ زہرہ، خنجر اندازد
زاں طفل اشک من ہمہ خون شد کہ اوفتاد | دوش از دریچہ دل و امشب زبام چشم
دلم چو رنگ زلیخا شکستہ در خلوت | غمم چو تہمتِ یوسف دیدہ در بازار
بر حریم رُخ تو در آشوب گاہِ محشر کہ | لیلۃ القدر است در ہنگامہ یوم الحساب

ع۔ بہ بر شگفتن امروز و غنچہ گشتن دی،
یعنی آج کا دن گویا پھول ہے، جو کھل رہا ہے، اور کل کا دن کھل کر مرجھا
گیا اور غنچہ بن گیا،

بہ خوی فشانی شبنم بہ خود فروشی گل | بہ نیزہ بازی سوسن بہ تشنہ سازی خاک
ز نور ناصیہ ات ماہ گر ضیا گیرد | بہ آفتاب دہد نسخہ سنین و شہور
ع۔ ہچو صبح ابیضۂ خورشید پرورد بہ شکم،

ع، کہ بتابیدن سر پنجۂ مرجان رفتم،

برزم گاہ تو حجلۂ یوسف | رزم گاہِ تو شاہ ضحاک
دست مظلوم را چو کرد دراز | صد شبیخون بہ شعلۂ زد خاک
از خمِ مدتِ تو جامِ نخست | جرعۂ دورِ آخرِ افلاک

یعنی تیری درازی عمر کی شراب کا پہلا جام، آسمان کا اخیر دور ہے،

حلۂ لفظ بر قدِ معنی | صد روش دوختی و کردی چاک
آسمان دریوزہ کرد و آفتابش کرد نام | لعلے از آویزۂ گوش شبِ یلدائے من
خوردہ ہر دم صد شکست از فوج قدش شوخ حسن | شوق بے ہنگام ناز مست بے پروائے من

مسلسل مضامین

۴- عرفی کا زورِ طبع اور فصاحت و بلاغت کا زور شور وہاں نظر آتا ہے جہاں وہ قصائد میں کوئی مسلسل مضمون ادا کرتا ہے اور یہ اسکا خاص انداز ہے مثلاً خانخاناں کے بیٹا پیدا ہونے پر جو قصیدہ لکھا ہے، اس کی تمہید اسطرح شروع کی ہے

بود در کتم عدم بکرِ طبیعت را جائے | کہ خرد بر سرش استادہ ہمی گفت برآئے
چند در پردہ نشیند خلف دودۂ کون | محرمی نیست مگر ہم تو شوی پردہ کشائے
مربیِ کن تو کہ فرزند مسیح است و مسیح | حاتمی کن تو کہ توفیق گدا ئی ست و گدائے
ایں سخن گوش زد بکرِ طبیعت چوں گشت | خندہ زد گفت کہ رو صبر کن و ژاژ مخائے
گوشۂ گیر و جگرمی خور و تلخی و می کش | تا بعہدے کہ شود صاحب تو ملک آرائے
خلق از مژدہ بر و مژدہ شنو، جمع شوند | ہمہ جوہر طلب و جوہری و گنج ستائے
فلک آمادہ شود زہرہ مہیا گردد | آں یکے حلہ طراز آید و ایں غالیہ سائے
من بصد ناز و کرشمہ ہمہ رنگ و ہمہ بوئے | بر سر حجلۂ ارکان نہم از خلوت پائے
پس درآید بہ برم آں کہ بنش نام زدم | او کشد بندِ نقاب من و من بند قبائے

لغت کی تمہید اس طرح لکھتا ہے،

آمد آشفتہ بخوابم شبے آں مایۂ ناز | بہ رَوِش جلوہ فزا و بہ نگہ صبر گداز
چہ پری چہرہ نگارے کہ ندارد مثلش | در پس پردۂ فطرت، فلک لعبت باز

دیدم القصہ کہ خوش گرم عنان ست و روان　　سُودم اندر قدمش چہرہ بصد عجز و نیاز
گفتم اے عربدہ جو چیست گناہم؟ کہ دگر　　بہ تعرض ہمہ خشمی، بہ تغافل ہمہ ناز
گفت این خود نہ گناہ ست کہ ساکت شدہٗ　　از ثنا گستری شاہ سریر اعجاز
منفعل گشتم و فی الحال بہ وادی مدیح　　مرکب طبع جہاندم، بہ ہوائے تگ و تاز
رہ نبردم بہ سر کشور معنی ہر چند　　کہ دراں بادیہ راندم، بہ نشیب و بہ فراز
گریہ آلود فتادم دگر اندر قدمش　　گفتم اے مایۂ آرام دل اہل نیاز
از جبین چین بگشا تا دل من جمع شود　　کہ پراگندہ کند مرغ خیالم پرواز
این سخن در دلش از درد اثر کرد و سرم　　برگرفت از قدم خویش و بلطف آمد باز
بے حجابانہ زدم بوسہ بدستش از شوق　　گفتم اکنون چہ اجازت کہ شوم وحی طراز

جہانگیر نے شاہزادگی کے زمانہ میں عرفی کا شہرہ سُنکر دربار میں بلایا چونکہ عرفی جہانگیر کا عاشق تھا ہمہ تن شوق اور بیتابی کے عالم میں گیا، جہانگیر نے نگاہ لطف سے دیکھا اور اشاروں میں باتیں کیں، پھر مُسکرا کر قصیدے کی فرمائش کی، اس دلچسپ داستان کو قصیدۂ مدحیہ میں ادا کرتا ہے۔

صباح عید کہ در تکیہ گاہِ ناز و نعیم　　گدا کلاہِ نمد، کج نہاد و شہ دیہیم
جہاں چنیں خوش و من خوشتر آنچناں کہ ز ذوق　　نشستہ با خردِ اندر تعلم و تعلیم
کہ ناگہاں ز درم در رسید مژدہ دہے　　چناں کہ از چمن طالعم زمغز شمیم
چہ گفت؟ گفت کہ "اے مخزنِ جواہر قدس"　　چہ گفت؟ گفت کہ "اے مطلب بہشت نعیم
"بیا کہ از کہرت یاد می کند (یعنی جہانگیر) دریا　　بیا کہ تشنہ لبت را طلب کند تسنیم" (چشمہ بہشت کا)
ازیں پیام دلم شد شگفتہ و شتاب زدہ　　کہ دستِ اہلِ کرم در نثار گوہر و سیم
چو روزگار رسیدم بہ درگہے کہ کند　　زمانہ طوف حریمش بہ دیدۂ تعظیم
رسیدن من و اقبال آں ہمایوں فال　　چناں فتاد مطابق دراں خجستہ حریم
کہ گر ادب نکشیدی عنان من قدمش　　بہ بوسہ گاہ ہمی کرد بر لبم تقدیم

یعنی میرا وہاں پہنچکر زمین بوس کے لئے گرنا، اور شاہزادہ کا سامنے سے

آنا اس قدر مطابق پڑا کہ اگر میں ادب سے رُک نہ جاتا تو بجائے اسکے کہ میرے لب اسکے قدم چومتے اسکے قدم میرے لب کو چوم لیتے،

مرا چو دوش بدوش ادب بدید استاد — بہ لطف خاص بدل کرد التفات عمیم
رموزِ گرنش و تسلیم را ادا کردم — بہ دابِ مردم دانا و بذلہ سنج ندیم
نگفت و من بشنودم ہر آنچہ گفتن داشت — کہ در بیان نگہش کرد بر زبان تقدیم

یعنی اُس نے کچھ نہیں کہا، لیکن میں نے سُن لیا کیونکہ اظہار مطلب میں اُسکی نگاہوں نے زبان سے پیشدستی کی، مطلب یہ کہ پہلے اشاروں میں باتیں ہوئیں،

لبش چو نوبت خویش از نگاہ باز گرفت — فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم

یعنی جب ہونٹوں کی باری آئی (یعنی اُس نے تقریر شروع کی) تو میرا سامعہ کوثر کی موجوں میں ڈوب گیا،

بخندہ گفت کہ در عذر ایں گناہِ بزرگ — کہ رفتہ نام تو بے حکم ما بہ ہفت اقلیم
ہمیں کہ رفتی ازیں آستان نوشتہ بیار — گزیدہ نسخہٗ از زادہائے طبع سلیم

ابو الفتح کے دربار میں جب ملازمت کا تعلق کرنا چاہاہے تو قصیدہ لکھ کر لیگیا ہے اور عجیب لطیف پیرایہ میں اپنی ملازمت کی خواہش ظاہر کی ہے،

خدایگانا! دارم حکایتے برلب — کہ چوں مدیح تو نتواندم بہ لب استاد
خیال بندگیت دوش نقش می بستم — زروے کسب شرف نے زروے استعداد
کہ ناگہ از درِ اندیشہٗ خانہ، شاہدِ عقل — کہ شمع خلوت اسرارِ مبدست و معاد
کرشمہ سنج و تبسم کناں درآمد و گفت — کہ عیدِ بندگی صاحبت مبارکباد
من از تعجب ایں حرف دلکشا گفتم — کہ اے زلطف کلام تو ملک ہزل آباد
نہ آسمانم و نے آفتاب و نے بہرام — کزیں مطایبہ (ظرافت) گردم زسادہ لوحی شاد
تو ہم زحرف تنک مایہ (عطارد) تر زباں نشوی — بگو کہ صورت ایں مژدہ از چہ معنی زاد؟
جواب داد کہ ایں مژدہ را دلیلے ہست — کہ دستِ فطرتم آں را بطاقِ حصر نہاد
ہمیں نفس ادب آموز قدسیان جبریل — دریچہٗ حرم قدس را بدیدہ کشاد

بسوی کاتب اعمال بانگ برزد و گفت — کہ اے رقم کش کردارِ خوب و زشتِ عباد
بشوی نامۂ عرفی کہ ایزدِ متعال — ز بندگانِ خودش برگزید و کرد آزاد
اگرنہ بندگی صاحبت بہ فال آمد — سبب چہ بود کہ جبریل این ندا در داد
من از متانتِ برہان بشرم غوطہ زدم — شکست بر رخِ اندیشہ رنگ استعداد
بخدمت آمدم اینک بگو چہ مصلحت ست — بر آستانِ تو باید نشست ؟ یا استاد

ان اشعار کا خلاصہ یہ ہے، ابوالفتح کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ اے مخدوم! کل میں آپکی نوکری اور ملازمت کا خیال دل میں پکا رہا تھا وہ بھی اس بنا پر نہیں کہ میں اس قابل ہوں بلکہ اسلئے کہ یہ میری عزت کا سبب ہے، اسی حالت میں عقل نے مجھ سے آکر کہا کہ لو مبارک، تم سرکار میں ملازم ہو گئے، میں نے متعجب ہو کر کہا کہ میں آسمان اور عطارد کی طرح سادہ لوح نہیں کہ اس مذاق پر یقین کر لونگا، آخر اسکا کوئی ثبوت بھی، عقل نے کہا ابھی ابھی جبریل نے حرمِ قدس کے دریچے کھول دیے اور کاتب اعمال کو حکم دیا کہ عرفی کا نامۂ اعمال دھو ڈالو کیونکہ خدا نے اسکو اپنے برگزیدہ بندوں میں داخل کر لیا، میں اس دلیل کی متانت سے شرمندہ ہو گیا اور اب خدمت عالی میں حاضر ہوا ہوں، کیا ارشاد ہے؟ آستانۂ عالی پر بیٹھنے کی اجازت ہے یا مودب کھڑا رہوں،

اس قسم کی اور بہت سی مثالیں اسکے کلام میں موجود ہیں، جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک واقعہ کو کس ترتیب اور کس تسلسل اور کس شاعرانہ انداز سے ادا کر سکتا ہے،

۵۔ قصاید میں شعرا کی یہ مجال نہ تھی کہ بادشاہ کی مدح و ثنا کے سوا اپنا ذکر کر سکیں اور کبھی ایسا کرتے تھے تو صرف اپنی بیچارگی اور بیکسی کا اظہار کرتے تھے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ حضور اور شعرا کی زیادہ قدر کرتے ہیں، حالانکہ میں اُن سے بڑھ کر ہوں عرفی چونکہ بالطبع نہایت غیور اور خوددار تھا، اسلئے مجبوری اور ضرورت کی وجہ سے امراء اور سلاطین کی مدح کرتا تھا لیکن ساتھ ہی اپنے

فضائل اور اوصاف بھی جی کھول کر بیان کرتا، اور مزے لے لے کر کہتا تھا شاید ہی کوئی ایسا قصیدہ ہو جس میں ایک دو شعر فخریہ نہ ہوں، شہزادہ سلیم کی مدح میں خودستائی کا بالکل موقع نہ تھا، تاہم کہتا ہے،

خدایگانا! گویم بہ مدح خویش دو بیت ۔۔۔ کزاں نیارد پرہیز کرد طبع سلیم

(یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ کم سے کم دو شعر بھی اپنی مدح کے نہ کہوں اسکے بعد دو شعر فخریہ لکھے ہیں)

اہل ادب نے انواع شاعری میں فخریہ کو ایک خاص صنف قرار دیا ہے فارسی میں اس خاص صنف میں عرفی کا کوئی ہمسر نہیں، عجیب عجیب نئے اسلوب سے فخریہ لکھتا ہے، اور اس جوش سے لکھتا ہے کہ آپے سے باہر ہوا جاتا ہے ایک قصیدہ میں ممدوح کو خطاب کر کے کہتا ہے عرفی کا غرور اب حد سے بڑھ گیا، آپ کبھی اسکے شعروں کی تحسین نہ کیجئے پھر اپنی تمام خوبیوں کو عیب کے پیرایہ کے بہانہ سے ذکر کر جاتا ہے۔

دادِ یک شہر زعرفی بستاں کیں مغرور ۔۔۔ کبر و نازش نہ باندازۂ قدر است و محل

نیم تحسین مکن ار گوید صد بیت بلند ۔۔۔ کہ دماغش شدہ از حسنِ طبیعت مختل

عرفی اگر سیکڑوں عمدہ شعر کہ جائے تب بھی اسکی تعریف نہ کیجئے، کیونکہ اُسکا دماغ، حسن طبیعت کے غرور سے مختل ہو گیا ہے،

ہر سر مویش اگر باز شگافی بخرد ۔۔۔ سومناتیست کہ چیدہ است درو لات و ہبل

عرفی کا ایک ایک بال چیر کر دیکھا جائے تو ایک سومنات نظر آئیگا جس میں بت چنے ہوئے ہیں،

بہر اصل و نسب خویش نویسد بیروں ۔۔۔ ہر چہ خواہد ز نسب نامۂ ارباب دول

عرفی تمام ارباب دول کے نسب نامے، اپنے نسب میں ملا لیتا ہے،

گوہر آمای رموز ست نہ دریا و نہ کان ۔۔۔ حکمت آموز عقول ست نہ علم و نہ عمل

دریا ہے اور نہ کان، باوجود اسکے دعویٰ کرتا ہے کہ راز کے موتی میرے خزانہ میں سما ہیں، نہ علم ہے نہ عمل، باوجود اسکے عقول عشر کو حکمت سکھاتا ہے،

چہ بلا عیب تراشم کہ حسد کم بادا ۔۔۔ مشنو عیب زر دہر ہی از سیم و غل

ہیں کس بلا کا عیب جو ہوں آپ خالص سونے کا عیب، کھوٹی چاندی سے نہ سنئے،

آنچہ ذرات معانی ست کہ بروے جوشند ۔۔۔ ہمہ خورشید شود گر بشناسند محل

مضامین کے ذرے جو اُسکے دل میں چمکتے ہیں وہ اگر اپنا رُتبہ پہچانیں تو سب آفتاب بن جائیں،

داردازعزتِ اصلِ خاندانی گہر و ذلت شعر ۔۔۔ پاے در تحت ثری دست در آغوش زحل

یعنی خاندانی اعزاز اور شعر کی ذلت کی وجہ سے اسکے پاؤں تو تحت الثریٰ میں ہیں، لیکن ہاتھ زحل کی آغوش میں ہے،

عزت او نہ شہیدی ست کہ حسرتش باشد ۔۔۔ ورنہ نگریستمے از ستم مدح و غزل

اگر او نامزد تنگ شد از ذلت شعر ۔۔۔ شعر از عزت او نیک بر آید ز ذلل

یعنی عرفی تو شعر کی وجہ سے ذلیل ہوا، لیکن فنِ شعر معزز ہو گیا،

اکبر کے دربار میں خودستائی کی کس کو جرأت ہو سکتی تھی تاہم کہتا ہے،

شہا! بہ بزم تو چوں ایں قصیدہ برخوانم ۔۔۔ کہ مُلکِ نظم زفیضش گرفتہ است نظام

سزد بجایزہ باجیب پُرگہر گردوں ۔۔۔ بدوشم افگند ایں جامۂ زمرد فام

عرفی نے قصائد میں جس قسم کی خودداری کے خیالات کی ابتدا کی تھی، اگر اُسکی طرف عام خیالات کا میلان ہو گیا ہوتا تو شاید یہ صنف کسی اچھے کام کا مصرف بن جاتی،

۶۔ عرفی کی مضمون آفرینی اور نازک خیالی کا دوست اور دشمن دونوں نے مضمون آ[illegible] اقرار کر لیا ہے اس میں مطلق شبہہ نہیں ہو سکتا کہ اُسکی قوت تخیل نہایت زبردست تھی، لیکن اس زمانہ کا مذاق یہ تھا کہ یہ قوت صرف مبالغہ، جدت تشبیہ، اور حسن تعلیل وغیرہ پر صرف کیجاتی تھی، عرفی کا زور بھی انہیں فضول چیزوں پر ضائع ہوا، تاہم جو نمونے موجود ہیں اُن سے یہ قطعی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اگر اس سے بجا طور پر کام لیا جاتا تو شاعری کی سرحد کہیں سے کہیں پہنچ جاتی، ہم چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں:

آن کہ چوں درکنف چتر ہمایوں آثار | ہم عنان ظفر از راہ غزا گردد باز
زہرہ گیسو بکشاید کہ شود گرد فشان | از رکابش کہ پذیرفتہ غبار از تگ و تاز
فتح گوید چہ کنی چشم من ست ایں نہ رکاب | سرمۂ چشم جہاں بیں مرا پاک مساز

یعنی جب رسول اللہ چتر کے سایہ میں میدان غزا سے واپس آتے ہیں. تو زہرہ چوٹی کھول کر چاہتی ہے کہ رکابوں پر جو گرد پڑ گئی ہے اسکو جھاڑ دے فتح کہتی ہے ایں! یہ کیا کرتی ہے؟ یہ رکاب تھوڑی ہی ہے یہ تو میری آنکھیں ہیں، اسکے سرمہ کو د گرد کو سرمہ قرار دیا ہے، کیوں چھڑاتی ہے،

احتساب تو اگر عارض نہی افروزد | اے سراپردۂ عصمت ز تو با زینت و ساز
زخمہ ہر چند کہ انگشت زند بر لب تار | نغمہ از بیم نیارد کہ برآرد آواز

یعنی اگر آپ کا احتساب ظہور میں آئے تو مضراب گو کتنا ہی تار کو چھیڑے لیکن نغمہ کبھی ڈر کے مارے آواز اونچی نہ کر سکے،

ہر حدیثے کہ رضایت بسماعش نبود | از درِ گوش سراسیمہ بلب گردد باز

گھوڑے کی تعریف.

لوحش اللہ ز شبگیر سمند تو کہ ہست | دود مان کسل از شوخی او متاصل
سبحان اللہ گھوڑا
آں سبک سیر کہ گر گرم عنانش سازی | از ازل سوے ابد و ز ابد آید بہ ازل
قطرہا کش دم رفتن چکد از پیشانی | شبنم آساش نشیند گہ رجعت بکفل

یعنی گھوڑا اس قدر تیز رفتار ہے کہ اگر تو اسکو دوڑائے تو ازل سے ابد اور ابد سے ازل تک کا چکر اتنی دیر میں لگا آئیگا کہ جاتے وقت اسکی پیشانی سے جو قطرے ٹپکیں گے وہ واپسی میں اسکے پٹھوں پر ٹپکیں گے اور زمین پر نہ گرنے پائیں گے.

طرزِ ادا کی جدّت | عرفی جدّت ادا کا گویا موجد ہے، اور اسکا ہر شعر جدّت کی ایک نئی مثال ہے، جو اشعار اوپر گذر چکے اُن میں بیسیوں مثالیں ملیں گی، اسلئے ہم صرف چند اشعار پر اکتفا کرتے ہیں،

موبمویم دوست شد ترسم کہ استیلاے عشق | یک انا الحق گوے دیگر بر سرِ دار آورد
اے برہمن چہ زنی طعنہ کہ در معبد ما | سبحہ نیست کہ آں غیرت زنار تو نیست

در دل شکنی آفت دهر ست نگاهش
طفلے کہ پدر می شکند طرفِ کلاهش

ساقی توی و ساده دلے بین کہ شیخ شهر
باور نمی کند کہ ملک می گسار شد

زخمها برداشتیم و فتح ها کردیم لیک
هرگز از خون کسے رنگین نشد دامانِ ما

فارغ ز خیرگی نکرد، روے آفتاب
این دیده آزمودهٔ نظارهٔ کسے ست

گوش معز دل ست در خلوت گه ارباب راز
دودِ شمع خلوتِ ایشاں بروزن دشمن ست

لباسِ صورت اگر واژگوں کنم، ببنید
کہ خرقهٔ خشنم مایهٔ طلا باف ست

ایما و اشارت نه باندازهٔ راز ست
این رشته بانگشت نه پیچی کہ دراز ست

نسبت سبحهٔ و زنار دو صد رنگ آمیخت
ورنه این رشته همان ست کہ آدم می رشت

عشق اگر غم داد و جان و دل شد عیش بکن
بیع اول بود و آشوبِ خریدارے نبود

زنند طعنه بمحشر بهشت جویاں را
کہ این گروه رعایاے همتِ پستند

شهید مضطرب بے خاک شد، مگر برهت
کہ بے نسیم براهِ تو گردے خیزد

هلاک جوهرِ شمشیر نازِ خوبانم
کہ تا ز زخم جدا گشته زنگ می گیرد

مدار جلوه دریغ از دلم کہ خرمنِ حسن
بخوشه چینی آئینه کم نمے گردد

دل نشد فرزانه و عقل از فسون دلگیر شد
بر جنون افزودمش تا قابل زنجیر شد

فسانها کہ ببازیچه، روزگار سرود
کنون بمسند جمشید و تاج کے بستند

کمند کوته، و بازوے سست، و بام بلند
بمن حواله و نومیدیم گنه گیرند

کلیدِ میکده ها را بمن دهید کہ من
نه آں کسم کہ باندازه مست می گردد

چه بطاعت طلبی، برهمناں را زاهد!
تو رها ور زکه این طائفه کارے دارند

بساطی کاندر و طرح دو عالم میتواں کردن
بدست آورده ام، اندازهٔ پرکار میباید
علوئی همت

به طورِ ما نه گنجد، منع دیدار
ولے این راز، با موسے مگوئید

دهر مرد افگن برمیدانم کند تکلیف و من
این متاع افتاده بر بالاے بستر می خرم
صدق دوستی

تمام بود بیک حرفِ گرم دما غافل
حکایتے کہ همه ناتمام مے گفتند

به آفتاب ازاں ذره را در اندازند
کہ عذر مردم کاهل نه ناکسے نه نهند
بلند همتی

درخرابات مغان بدنام اسلامم ہنوز — موہوم رشتہ زنار شد از نا کسے

عشقیہ شاعری عرفی ایک طرف تو نکتہ سنج اور نکتہ شناس اور ذوق عرفان سے آشنا تھا، دوسری طرف شباب میں نہایت خوش رو اور حسین اور لوگوں کا منظور نظر رہ چکا تھا، ہندوستان میں آیا تو شہزادہ جہانگیر پر عاشق ہوا، ان اسباب کی بناء پر وہ عشق اور محبت کی ایک ایک ادا سے واقف تھا، وہ کہیں عشق حقیقی کے اسرار اور دقائق بیان کرتا ہے اور کہیں مجازی عشق میں جو واردات اور معاملات پیش آتے ہیں، اُنکو ظاہر کرتا ہے، لیکن اس عالم میں بھی وہ اپنے تمام ہمعصروں سے اس بات میں ممتاز ہے کہ وہ سطحی اور سرسری واردات نہیں بیان کرتا بلکہ گہرے اور دقیق معاملات پر اُس کی نظر پڑتی ہے اور انہیں کو شاعرانہ انداز میں ادا کرتا ہے،

شوق دیدار میں عاشق ہمہ تن نظارہ بن جاتا ہے، اس حالت کو یوں ادا کرتا ہے،

زشوق روئے تو، سرتا قدم نگہ خیز ست — چگونہ مانع نظارہ ام شوی کہ مرا

استیلائے عشق کی حالت میں ہر قسم کے عام جذبات بھی عشق ہی کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں، مثلاً عشق کی حالت میں اگر کوئی دنیوی صدمہ بھی پیش آتا ہے تو وہی مزہ دیتا ہے جو عشقیہ صدمات سے حاصل ہوتا ہے، اس حالت کو ادا کرتا ہے،

بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما — در دل ماغم دنیا غم معشوق شود

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ معشوقوں کے سامنے جب کوئی انکا ناز بردار نہیں ہوتا تو آپ ہی آپ بگڑتے ہیں، اور گویا خود اپنے آپ پر ناز افشانیاں کرتے ہیں۔ اس مخصوص اور مخفی حالت کو بیان کرتا ہے،

فغان زغمزۂ شوخی کہ وقت تنہائی — بہانہ بخود آغاز کردہ و رجنگ ست

جوش حسن میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ معشوق آئینہ دیکھ کر، خود اپنے آپ کو پیار کرنے لگتا ہے اس حالت کو دکھاتا ہے،

چوں در آئینہ بینند بتان صورت خویش — دہن خویش ببوسند دلب خویش مکند

معشوق لطف اور نوازش کے ذریعہ سے عاشق کا دل مسخر کر سکتے ہیں لیکن عموماً وہ ایسا نہیں کرتے، بلکہ ظلم پسندی کی وجہ سے اسکے بجائے ناز اور قہر و عتاب سے کام لیتے ہیں، اس معاملہ کو عجیب لطف سے بیان کیا ہے،

بہ ملک ہستی من رو نہادہ سلطانی　　　　کہ ما بصلح دہیم او بجنگ می گیرد

یعنی ہمارے ہستی کے ملک پر ایسے بادشاہ نے چڑھائی کی ہے کہ ہم صلح سے دیتے ہیں لیکن وہ خواہ مخواہ لڑ کر لیتا ہے،

معشوق یوں تو ہر وقت جلوہ فروشی کیا کرتے ہیں، لیکن کوئی تقاضا کرے تو رُک جاتے ہیں اور ترساتے ہیں، اس کیفیت کو ادا کرتا ہے،

حسن را از شیوہ ہا گاہے بود میلے بناز　　　　ورنہ موسیٰ بی طلب صد رہ تماشا کردہ بود

عاشق ہجر کے زمانہ میں معشوق کی ایک ایک بات اور خصوصاً اسکی معشوقانہ نگاہوں کو حافظہ کے خزانے سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتا ہے، اور اُس سے مزے لیتا ہے یا اُس پر حسرت کرتا ہے اس واقعہ کو یوں بیان کرتا ہے،

ہر متاعے کز نگاہش می خرم در روز وصل　　　　می نشینم گوشۂ و از خود بکر رمے خرم

ابتدائے عشق میں ہمہ وقت جوش اور درد و گداز ہوتا ہے اسکی تصویر کھینچتا ہے،

عشق می گویم و مے گریم زار　　　　طفل نادانم و اول سبق ست

معشوق سے خواہش کرتا ہے کہ ستانا ہے تو ہمکو ستا کہ ہم پہلے ہی سے زخمی ہیں اور ہمارے ستانے میں تجھ کو اور خود ہمکو زیادہ مزہ آئیگا،

ہر گاہ کہ از لطف بہ کیں میل تو بیش ست　　　　اول نمک سینۂ ما پاش کہ ریش ست

یعنی چونکہ تمہارا میلان بہ نسبت لطف کے ظلم کی طرف زیادہ ہے اس لئے پہلے ہمارے سینہ پر نمک چھڑکو کہ وہ پہلے ہی سے زخمی ہے،

معشوق اگر ہمیشہ ظلم اور بے اعتنائی ہی کیا کرے، تو عاشق اسکا خوگر ہو کر ایک اطمینانی حالت پیدا کرے لیکن مصیبت یہ ہوتی ہے کہ معشوق کبھی کبھی لطف اور نوازش کی بھی چاشنی چکھا دیتے ہیں، اس کے بعد سرد مہری،

اور زیادہ چرکے دیتی ہے اس کیفیت کو ادا کرتا ہے،

ازاں بہ دردِ دگر ہر زماں گرفتارم کرشیوہ ہاے تُرا باہم آشنائی نیست

یعنی اس لئے ہر وقت میں ایک نئی مصیبت میں گرفتار رہتا ہوں کہ تیری ادائیں ایک دوسرے سے نہیں ملتیں،

شفائی نے اس مضمون کو زیادہ صاف اور واضح کر دیا ہے، لیکن وہ ابہام کا مزہ جاتا رہا وہ کہتا ہے،

ایں جور دیگرست کہ آزار عاشقان چنداں نمی کند کہ بہ بیداد خو کنند

معشوق جب بلند پایہ ہوتا ہے اور وہاں تک رسائی ناممکن ہوتی ہے تو عاشق اپنی پستی حالت کا اندازہ کرتا ہے اور اُس وقت یہ رنج کم ہو جاتا ہے کہ دیدار سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا، عرفی اس حالت کو حسرت کے لہجہ میں دکھاتا ہے

آہ ازاں حوصلۂ تنگ و ازاں حسن بلند کہ دلم را گلہ از حسرتِ دیدار تو نیست

نہ باندازہ بازوست کمندم ہیہات ورنہ با گوشۂ بامیم سرو کالے ہست

معشوق کی عام دلفریبی کو یوں ظاہر کرتا ہے،

یارب تو نگہ دار دلِ خلوتیاں را کان مغبچہ مست ست و درِ صومعہ باز ست

ناز کی بے اعتنائی کا مضمون کس خوبی سے پیدا کیا ہے،

طغیان ناز بین کہ جگر گوشۂ خلیل (یعنی حضرت اسمٰعیل) در زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

بیگانوں کے ساتھ معشوق کی صحبت بدمزہ ہے،

میروی با غیر دی گوئی بیا عرفی تو ہم لطف فرمودی برو کیں پای را رفتار نیست

یعنی غیروں کے ساتھ جا رہے ہو اور کہتے ہو کہ عرفی تو بھی آ، آپ کی عنایت لیکن مجھ سے چلا نہیں جاتا،

عشق میں، عقل اور سمجھ سے کام لینا نہیں چاہیئے،

گفتگو ہاے حکیمانہ نیا لاید عشق بگذارید کہ ایں نکتہ مُسلم باشد

حسن کی رونق عشق سے ہے اور عشق کی حسن سے،

این صفا عشق و محبت زہم اندوختہ اند ۔ این دو شمعے ست کہ از یکدگر افروختہ اند

تھوڑا سا غم، دل کی عالی ظرفی کے قابل نہیں اور زیادہ سما نہیں سکتا،

فریاد کہ غمہائے تو در سینۂ تنگم ۔ اندک نبود لائق و بسیار نہ گنجد

اب ہم عرفی کے ہر قسم کے چند عشقیہ اشعار درج کرتے ہیں،

دہ، کہ از دوختن این چاک گریبان رفتہ است ۔ این شگافے ست کہ تا دامن ایمان رفتہ است

رفت آں آفت جان از برم اے ہوش بیا ۔ تا بہ بینم کہ چہا بر سر ایمان رفتہ است

یعنی وہ آفت جان چلا گیا، اے ہوش اب آ، تاکہ دیکھوں کہ ایمان پر کیا گذری،

عرفی ز ہر دو جہاں می مدالا در دوست ۔ ہمہ جا وحشی ازان ست کہ رام ست اینجا

بحث در رد و قبول بت ترسا بچہ است ۔ ورنہ از کفر زبونی نبود ایمان را

یعنی ایمان کفر سے کم رتبہ نہیں لیکن گفتگو یہ ہے کہ کافر بچہ اسکو قبول بھی کریگا یا نہیں

ز وصلش یافتم ذوقے کہ نبود انتقام آں را ۔ کسے ہرگز چنیں داغے بدل ننہادہ ہجران را

یعنی اسکے وصل میں میں نے وہ مزہ پایا کہ اسکا کچھ جواب نہیں ہو سکتا، کسی شخص نے ہجر کو اسطرح نہ جلایا ہوگا جس طرح میں نے جلایا ہے،

قبول خاطر معشوق، شرط دیدار است ۔ بحکم شوق تماشا مکن کہ بی ادبی ست

یعنی معشوق جس حد تک پسند کرے اسی حد تک نظارہ کرنا چاہیئے، اپنے شوق کے موافق نظارہ بازی کرنا بے ادبی میں داخل ہے،

عرفی، بہ حال نزع رسیدی و بہ شد ی ۔ شرمت نیامد از دل امیدوار دوست

بہانہ جوئی تو، عرفی، بناز عادت کرد ۔ بآشتی مرد اکنوں کہ صلح ہم جنگ ست

ز شکوہ ہائے جفایت، دو کون پر شد لیک (یعنی معشوق) ۔ ہنوز رنگ ادب بر رخ سخن باقی ست

یعنی باوجود انتہائے شکایت کے پاس ادب نہیں گیا،

حسنش نیازمند تماشا زناز نیست ۔ آما ز ذوق جلوۂ خود بے نیاز نیست

دو عالم سوختن نیرنگ عشق ست ۔ شہادت ابتدائے جنگ عشق ست

دماغ آشفتۂ داریم دل نام ۔ کہ سر تا پائے صلح و جنگ عشق ست

آں چناں مست جمال ست کہ شب تا بسحر — می کشد جام و ز کیفیت مے آگہ نیست
بر و لے عقل منہ منطق و حکمت در پیش — کہ مرا نسخۂ غمہاے فلاں در پیش ست
ہاں رہ عشق ست کہ رفتن ندارد بازگشت — جرم را اینجا عقوبت ہست استغفار نیست
تا فریبد ابلہاں را از متاع روی دست — آسمان پیش از تو یوسف را ببازار آورد
ز بتاں نہ گوشۂ چشمے نہ چین ابروے — بحیرتم کہ دلِ برہمن ز کفر چوں شد
چو برد پیام، قاصد کنم ایں خیال دگریم — کہ برش حکایت من بکجا رسیدہ باشد
تا چند بزنجیر خرد بند تواں بود — بے مستی و آشوب جنوں چند تواں بود
اے اجل! جاں ندہند اہل وفا سعی مکن — یا ببرو، رخصت از آں غمزدۂ خونخوار بیار
ای آنکہ نرفت ست عنان دلت از دست — یک لحظہ تماشائی آں دست و عنان باش
بشکنم ناقوس و تسبیحے بدست آرم ولے — چوں کنم یا آں کہ زنار از میان می رویدم
می روی با غیر و می گوئی بیا عرفی تو ہم — لطف فرمودی برو کیں پای را رفتار نیست
بیا ای عشق! رسوای جہانم کن کہ یک چندے — نصیحت ہای بیدرداں شنیدن آرزو دارم
داغ بر ہم بس کہ پیوستم نشان از دل نماند — پیش ازیں صد داغ بر دل داشتم اکنوں یکی ست
عالمے در جلوہ و عاشق نہ بیند غیر دوست — گر ز مجنوں پرسی اندر کاروان محمل یکی ست

(فلسفہ) عرفی نے غزل میں جس قدر فلسفیانہ خیالات ادا کئے کسی شاعر نے ادا نہیں کئے،

اسکے ساتھ یہ خصوصیت ہے کہ شاعرانہ طرز ادا ہاتھ سے نہیں جاتا، سحابی، ناصر خسرو وغیرہ نے بھی دقیق فلسفی مسائل بیان کئے ہیں، لیکن وہ محض فلسفہ ہے جو نظم میں ادا کر دیا گیا ہے، شاعری نہیں، بخلاف اسکے عرفی اس انداز سے ان باتوں کو ادا کرتا ہے کہ اگر کوئی شخص فلسفہ کی حیثیت سے اُس سے لطف نہ اُٹھائے، تاہم شاعرانہ ذوق سے محروم نہ رہیگا، مثالوں سے اسکا اندازہ ہوسکیگا،

یہ سب کہتے آئے ہیں کہ حقائق اشیاء ہمکو معلوم نہیں، سقراط نے کہا تھا

کہ "مجھکو صرف اسی قدر معلوم ہُوا کہ کچھ معلوم نہیں ہُوا" بعینہٖ اسی خیال کو فارابی ابن سینا وغیرہ نے اشعار میں ادا کیا، لیکن عرفی نے اس فلسفہ کا ایک قدم اور آگے بڑھا دیا، وہ کہتا ہے،

کُنہِ تو بہ ادراک نشاید دانست   ویں سخن نیز باندازۂ ادراکِ من ست

خدا کی ذات اور صفات کی جو تفسیر تمام اہل مذاہب نے کی ہے خوب غور کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے اُنہیں حالات، اُنہیں اوصاف اُنہیں اخلاق کو جو اُس نے انسانوں میں دیکھے ہیں زیادہ وسیع زیادہ پاک زیادہ بلند فرض کر کے ایک ذات کا تصور باندھ لیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر قوم میں خدا کے اوصاف کی نسبت مختلف خیال ہیں، اس بنا پر عرفی کہتا ہے

فقیہان دفترے را می پرستند   حَرَم جویان دری را می پرستند

برافگن پردہ تا معلوم گردد   کہ یاران دیگرے را می پرستند

یعنی خدا اگر اپنے چہرے سے پردہ اُٹھادے تو لوگوں کو نظر آئیگا کہ ہم خدا کو نہیں بلکہ کسی اور چیز کو پوج رہے تھے، اسی طرح مضمون کو ایک اور لطیف طریقہ سے ادا کیا ہے،

آناں کہ وصفِ حُسنِ تو تفسیر میکنند   خواب ندیدہ راہمہ تعبیر می کنند

حقائق اشیاء یا عقائد مذہبی کی نسبت یا تو انسان کو نہایت اعلیٰ درجہ کا فلسفی ہونا چاہیئے کہ تمام راز اُس پر منکشف ہو گئے ہوں، یا محض تقلید پر عمل کرنا چاہیئے، بیچ کی جو حالت ہے یعنی نہ تقلید، نہ اجتہاد کامل، یہ نہایت خطرہ کی حالت ہے، اور افسوس ہے کہ تمام عالم اسی میں مبتلا ہے، عرفی کو تین سو برس پہلے یہ نکتہ معلوم ہو چکا تھا، چنانچہ کہتا ہے،

قدم بروں منہ از جہل یا فلاطون شو   کہ گرمیانہ گزینی سراب و تشنہ لبی ست

یعنی یا تو بالکل جاہل رہو یا فلاطون بنو، ورنہ بیچ میں رہوگے تو سراب اور تشنہ لب کا حال ہوگا،

عرفی اپنی وسیع المشربی سے عرفان اور ذوق کو اسلام یا کفر میں محدود نہیں سمجھتا اسکے نزدیک ہر جگہ حقیقت کا پرتو نظر آتا ہے اس خیال کو اوروں نے بھی ادا کیا تھا، لیکن عرفی نے ایک عجیب تشبیہ سے اسکو صاف دکھادیا

عارف، ہم از اسلام خراب ست وہم از کفر — پروانہ چراغ حرم و دیر نداند

یہ ظاہر ہے کہ پروانہ صرف چراغ ڈھونڈھتا ہے، وہ خواہ حرم میں جلتا ہو یا بتخانہ میں،

بت شکنی پر لوگ ناز کرتے ہیں لیکن ایک عارف کو نظر آتا ہے کہ بت شکنوں میں بھی وہی تمام اخلاق موجود ہیں، جو بت پرستوں میں پائے جاتے ہیں، اس لئے ایسی بت شکنی سے کیا فائدہ اس بنا پر عرفی کہتا ہے،

رفتم بہ بت شکستن و ہنگام بازگشت — با برہمن گذاشتم از ننگ دین خویش

یعنی بت توڑنے تو گیا تھا لیکن جب واپس چلا تو اپنا دین برہمن ہی کے یہاں چھوڑ آیا،

عام مسلمان جس طرح کعبہ کے ساتھ پیش آتے ہیں اُس میں اور بُت پرستی میں مشکل سے فرق کیا جا سکتا ہے اس بنا پر فیضی نے کہا تھا،

آں کہ می کرد مرا منع پرستیدن بُت — درحرم رفتہ، طواف در و دیوار چہ کرد

عرفی اس مضمون کو زیادہ لطیف پیرایہ میں ادا کرتا ہے،

ساکنِ کعبہ کجا دولتِ دیدار کجا — ایں قدر ہست کہ در سایۂ دیوارے ہست

عالم میں جو کچھ نظر آتا ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو سب راز ہے،

ہر کس نشناسندۂ راز ست، وگرنہ — ایں ہا ہمہ راز ست کہ مفہوم عوام ست

چو دل شناخت سر رشتہ، گشت معلومش — کہ دم بدم بکف آوردہ در ہا کردست

انسان عالم اکبر ہے،

از کتابے کہ منش خاتمہ ام — لوح محفوظ، نخستیں ورق ست

سالک کو طلب چاہیئے، تقاضا نہیں،

زبان بہ بند و نظر باز کن کہ منع کلیم   کنایت از ادب آموزی تقاضائیست

یعنی آنکھیں کھولو اور زبان بند کرو کیونکہ کلیم کو جو منع کیا تھا تو یہ بتانا تھا کہ ادب ملحوظ رکھنا چاہیئے،

حصول معرفت کیلیئے وہم اور شکوک کی جولانیاں مفید نہیں، بلکہ سکون اور صبر درکار ہے،

چندانکہ دست و پا زدم آشفتہ تر شدم   ساکن شدم میانۂ دریا کنار شد

تہ رسی اور غور کی ترغیب،

خمیر مایۂ آسایش ست لای شراب   بگو کہ صاف کشاں جرعۂ زتہ گیرند

لوگ نیک و بد میں تمیز نہیں کر سکتے،

چہ ظلمت ست کہ بینندگان نمی دانند   کہ شب چراغ ستانند یا شبیہ گیرند

کسی قوم کی ترقی کے یہ معنی ہیں کہ دوسری قوم نے تنزل کیا ہے،

زمانہ گلشنِ عیش کرا؟ بہ یغما داد   کہ گل بدامنِ ما دستہ دستہ می آید

چونکہ مذہب کا مقصد زیادہ تر جمہور عام کی ہدایت کرنا ہوتا ہے اسلئے مذہبی دلائل اکثر فلسفیانہ نہیں ہوتے، بلکہ خطابیات اور عام فہم ہوتے ہیں جن لوگوں کی فطرت میں خدا نے مذہبی میلان رکھا ہے انکو انہیں دلائل سے تشفی ہوجاتی ہے، لیکن جنکو مذہب کا درد نہیں اُنکو فوراً نظر آجاتا ہے کہ یہ دلائل قطعی نہیں، بلکہ عام پسند ہیں اس بنا پر ان لوگوں کو ناز ہوتا ہے کہ ہم کس قدر حقیقت شناس ہیں، عرفی کہتا ہے کہ یہ ناز کی بات نہیں بلکہ مذہبی بیدردی کی دلیل ہے، اسکو یوں ادا کرتا ہے،

زنقص تشنہ لبی دان، بعقل خویش مناز   دلت فریب گر از جلوۂ سراب نخورد

سراب اُس ریتے کو کہتے ہیں جو دُور سے پانی کی طرح نظر آتا ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ فرض کرو تمہارا گذر سراب پر ہوا، اور تم نے فوراً سمجھ لیا کہ یہ سراب ہے پانی نہیں، تو تم اپنی عقل پر ناز نہ کرو، بلکہ یہ سمجھو کہ تم پیاسے نہ تھے، ورنہ اگر پیاس کا غلبہ ہوتا تو قطعاً سراب پانی نظر آتا، سراب کی تشبیہ شاعر نے

علی سبیل التنزل دی ہے، ورنہ یہ ظاہر ہے کہ مذہبی دلائل سراب نہیں ہوتے،

عام لوگ سمجھ نہیں رکھتے ورنہ عرفا کنایوں میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں،

گو لکتہ سرایان عشق خاموش اند	کر حرف نازک اصحاب پنبہ در گوش اند

کفر اور دین دونوں اپنی گرم بازاری کے لئے لوگوں کو لڑاتے ہیں،

کفر و دین را ابر از یاد کہ ایں فتنہ گراں	در بد آموزی ما مصلحت اندیش اند

تعلق، ہر قسم کا حجاب پیدا کرتا ہے،

گر تعلق نیست اسباب جہاں مردود باش	صد ہزاراں پردہ پیش پردہ حائل یکی ست

اخلاق عرفی نے اخلاق کے اکثر مسائل بیان کئے ہیں، لیکن وہ صرف اُن اخلاقی اوصاف کو لیتا ہے جو عزت نفس اور علو حوصلہ سے تعلق رکھتے ہیں یہاں تک کہ اگر یہ اوصاف غرور و نخوت کی حد تک بھی پہنچ جائیں تو اُسکے نزدیک اُن اوصاف سے بہتر ہیں جنکی سرحد پست ہمتی سے ملجاتی ہے مثلاً تواضع، انکسار، فروتنی، توکل، قناعت وغیرہ وغیرہ، اس بنا پر کہتا ہے،

کفران نعمت گلہ مندان بے ادب	در کیش من ناشکر گدایانہ بہتر ست

وہ اعمال نیک کی تعلیم دیتا ہے، لیکن اسلئے نہیں کہ دوزخ سے بچنے کا ذریعہ ہیں بلکہ اسلئے کہ گناہگار نادم ہوتا ہے اور بسا اوقات ندامت نجات کا باعث ہوجاتی ہے، اسلئے وہ مفت خواری کی نجات کو عالی حوصلگی کے خلاف سمجھتا ہے،

بضاعتے بکف آور کہ تر سمت فردا	بجوے فشانی پیشانی حیا بخشند

یعنی عمل کا سرمایہ جمع کرو، ایسا نہ ہو کہ تم کو قیامت میں اس لئے بخش دیں کہ تمہاری پیشانی سے ندامت کا پسینہ ٹپکا تھا،

اس سے زیادہ صاف اور واضح کہتا ہے،

گرفتم آں کہ بہشتم دہند بے طاعت	قبول کردن و رفتن نہ شرط انصاف ست

یعنی یہ مان لیا کہ مجھ کو بہشت بغیر عمل کے مل جائیگی، لیکن اسکو قبول کرنا انصاف کے خلاف ہے،

وہ عالی حوصلگی کا یہ نمونہ پیش کرتا ہے کہ مخالف، گو ہماری غلطی کو صحیح سمجھ لے، تاہم ہمکو مطمئن نہیں ہونا چاہیئے،

رُستم زمدعی بقبول غلط ولے در تاہم از شکنجۂ طبع سلیم خویش

وہ یہ سکھلاتا ہے کہ گفتگو اور مباحثہ کی معرکہ آرائیوں میں فتح حاصل کرو، لیکن اس طرح کہ فریق مقابل کا دل نہ دکھنے پائے،

زخمہا بر داشتیم و فتح ہا کردیم لیک ہرگز از خون کسے رنگین نشد دامان ما

وہ تجرد، صحرانوردی، ترک لباس کو ریا کا شائبہ بتاتا ہے،

مرو ببادیہ گردی کہ زرق و شیدای ست برہنگی مطلب کاں لباسِ رعنائی ست

وہ سکھاتا ہے کہ اپنے آپ کو عزیز الوجود نہ سمجھو، دنیا کا کارخانہ تم پر بند نہیں

گمان مبر کہ تو چوں بگذری جہاں بگذشت ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی ست

وہ بتاتا ہے کہ اگر اپنا عیب دیکھنا چاہو تو اپنے آپکو اپنا دشمن اور منافق دشمن بنا کر دیکھو،

خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا یک دم، منافقانہ نشیں در کمین خویش

منافق اُسکو کہتے ہیں، جسکے دل میں مخالفت ہو اور زبان سے دوستی کا اظہار کرتا ہو، شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر اپنے عیب سے واقف ہونا چاہتے ہو تو اُسکی ترکیب یہ ہے کہ اپنے آپ کو ایک الگ شخص فرض کرو اور اُس سے بظاہر دوستی کا اظہار کرو، چونکہ انسان اپنے دوست سے کسی بات کا پردہ نہیں رکھتا اسلئے وہ شخص اپنے تمام راز تمہارے سامنے کھول کر رکھدے گا اس طرح تمام عیب ظاہر ہو جائینگے،

وہ کہتا ہے کہ اگر ایک مسلمان کے روحانی اخلاق ایک کافر کے اخلاق سے بالاتر نہیں، تو اُسکے اسلام کو کفر پر کوئی ترجیح نہیں،

رفتم بر بت شکستن و ہنگام بازگشت با برہمن گذاشتم از شرم دین خویش

اس نے نہایت عمدہ تشبیہ سے اس بات کو علانیہ دکھایا کہ جو لوگ خود آلودہ ہیں اُنکی نصیحت کچھ اثر نہیں کر سکتی،

واعظِ من گر دفشانندۂ عصیاں نشود　　آستینِ شکر آلود مگس راں نشود

وہ کہتا ہے کہ ریاکاری اس قدر عام ہوگئی ہے کہ کھلے ڈے رندوں پر بھی اعتماد نہیں رہا،

از صدقِ اہلِ بُت کدہ ہم اعتماد رفت　　از بس کہ اہلِ صومعہ تزدیر می کنند

زاہد اور برہمن میں اسکے نزدیک جو فرق ہے یہ ہے،

کافر تر ست زاہد از برہمن، ولیکن　　او را بُت ست در سر، در آستین ندارد

یعنی زاہد برہمن سے بھی زیادہ کافر ہے، فرق یہ ہے کہ زاہد کے ہاتھ میں بُت نہیں ہے بلکہ سر میں ہے،

آزادی اور خود مختاری کا وہ اس قدر شیفتہ ہے کہ اگر کوئی شخص نام کو بھی آزاد ہو تو اُس کے نزدیک رشک کے قابل ہے،

حسدِ تہمتِ آزادیِ سرو م بگداخت　　کیں ہرا دے ست کہ بر تہمتِ آں ہم حسد ست

سرو کو شعرا، آزاد باندھتے ہیں، عرفی کہتا ہے کہ گو یہ تہمت ہے لیکن میں اس پر بھی رشک کرتا ہوں، کیونکہ آزادی وہ نعمت ہے کہ جھوٹوں بھی کوئی شخص آزاد کہلائے تو رشک کے قابل ہے،

وہ سکھلاتا ہے کہ اصلی لذت اور آرام، روحانی لذت اور آرام ہے، اور یہ حاصل ہو تو ظاہری تکلیفات سے مطلقاً متاثر ہونا نہیں چاہیئے،

معشوق در میانۂ جان مدعی کجا است　　گل از دماغ میدمد آسیب خار چیست

وہ ہر بات میں میانہ روی اور اعتدال کی تعلیم دیتا ہے اور اس مضمون کو اس لطیف پیرایہ میں ادا کرتا ہے،

مرا د خضرِ عناں گیر باید از چپ و راست　　کہ کجروی نہ کنم ورنہ عزمِ راہِ خطا ست

امامِ شہر ز سر جوشِ خُم نہ پرہیزد　　نزاعِ بر سرِ تہ شیشہ ہای ناصاف ست

یعنی مالِ حرام، اگر بھر پور ملے تو امامِ شہر کو دریغ نہ ہو، یہ جو انکار ہے اس لحاظ سے ہے کہ اُس کی مقدار تھوڑی ہے،

علو نفس، بلند ہمتی اور حوصلہ مندی کے خیالات، جو عموماً شاعری میں نہایت کم تھے، عرفی نے کثرت سے ادا کئے، چونکہ خود نہایت غیور اور عالی حوصلہ تھا، اسلئے وہ عادات اور اخلاق جو بظاہر علو نفس کے خلاف نہ تھے، لیکن دراصل انکی بنیاد دناءت پر تھی۔ اُن کی تہ تک اُسکی نگاہ پہنچتی تھی، مثلاً تمام ایشیا میں حاتم کی فیاضی اور سخاوت کے چرچے پھیلے ہوئے ہیں اور تمام لوگ اُسکی فیاضی کے افسانوں کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں، یہ امر بظاہر کوئی بُری بات نہیں بلکہ سچی قدردانی کی دلیل ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ چونکہ ایشیا میں اکثر مفت خوری کا طریقہ جاری رہا، یعنی لوگ سلاطین اور امراء سے مفت کے صلے اور انعامات حاصل کرتے تھے، اس لئے اس قسم کی فیاضیوں کی نہایت مدح سرائی کرتے تھے، عرفی نے دیکھا کہ اس قدردانی کی تہ میں اس مفت خوری کا اثر ہے، اس لئے کہتا ہے،

بیا بہ ملک قناعت کہ در دسر نہ کشی ز قصہ ہا کہ بہمت فرودش ~~طے~~ بستند ~~حاتم طائی~~

یعنی اگر قناعت اختیار کرو تو تم کو ان کہانیوں میں کچھ مزہ نہ آئیگا جو حاتم طائی کی طرف منسوب ہیں،

اس سے زیادہ صاف کہتا ہے،

کفرانِ نعمتِ گلہ مندانِ بے ادب در کیش من ز شکر گدایانہ بہتر ست

یعنی میں کفرانِ نعمت کو بھی گدایانہ شکر گزاری سے زیادہ پسند کرتا ہوں،

زمانہ کے ہاتھ سے مجبور ہو کر معمولی چیز کی خواہش کرتا ہے، اس پر خود اسکو افسوس آتا ہے اور کہتا ہے،

کشادم دام بر گنجشک و شادم یاد آں ہمت کہ گر سیمرغ می آمد بدام آزاد میکردم

یعنی اب تو میں گنجشک پر جال ڈالتا ہوں اور اسی پر راضی ہوں، لیکن ایک وہ بھی وقت تھا کہ سیمرغ جال میں پھنسا ہے اور میں نے چھوڑ دیا ہے،

بساطے کاندر و طرح دو عالم می تواں کردن بدست آوردہ ام اندازہ و پرکار می باید

گرفتم آں کہ بہشتم دہند بے طاعت — قبول کردن و رفتن نہ شرطِ انصاف ست
وقتِ عرفی خوش کہ نکشود نداگر در برخش — بر درِ نکشودہ ساکن شد درِ دیگر نہ زد

عاشقانہ جذبات او خیالات میں بھی اسکی عالی حوصلگی نہیں جاتی،

من ازیں درد گرانبار چہ لذت یابم — کہ بہ اندازۂ آں صبر و ثباتم دادند

یعنی اس غم سے مجھکو کیا لذت مل سکتی ہے جبکہ اسکی برابر مجھکو صبر و استقلال بھی عنایت ہوا ہے،

تذکرۂ سرخوش میں لکھا ہے کہ "ناصر علی اس شعر کو زیادہ پسند کرتا تھا" اگر یہ صحیح ہے تو ناصر علی کی اس بد مذاقی کا کفارہ ہوگیا جو اُس نے نظامی اور ظہوری کے موازنہ میں ظاہر کی تھی،

بادہ خواہی باش تا از خون دل بیروں دہم — ایں کہ در جام و سبو دارم مہیا آتش ست
ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در جیحون عشق — روی دریا سلسبیل و قعر دریا آتش ست
عشق اگر مرد ست مردے تاب دیدار آورد — ورنہ چوں موسیٰ بسے آورد بسیار آورد
مدہ عنان تعلق بحسن ہر ذرہ — بر آر دستی و بر دوش آفتاب انداز م

آسمان کی نو مجلسوں میں ایک ذرّہ (انسان) وجد کر رہا تھا، لیکن ان مجلسوں کی مجموعی فضا میں بھی یہ وسعت نہ تھی کہ وہ ذرّہ ہاتھ پھیلا کر ناچ سکتا،

ل۱ عوام کے اعتقاد میں ایک کیڑا ہے جو آگ میں پیدا ہوتا ہے اور آگ ہی میں زندہ رہتا ہے،

نظیری نیشاپوری

محمد حسین نام، نظیری تخلص، اور نیشاپور وطن تھا، شاعری کا ابتدا سے شوق تھا اور ابتدائے مشق ہی سے شہرت ہو چلی تھی، خراسان میں جب اس کی شاعری مسلم ہو چکی تو کاشان میں آیا، یہاں حاتم، فہمی، مقصود خردہ، شجاع، رضائی شاعری میں اُستاد تسلیم کئے جاتے تھے، انکے مشاعروں میں جو طرحیں ہوتی تھیں، نظیری بھی اُن میں طبع آزمائی کرتا تھا۔ اسی زمانہ میں ایک قدیم غزل طرح ہوئی جاے تو باشد، ایماے تو باشد، نظیری نے غزل لکھی،

فلک مزدور ایماے تو باشد نوازد ہر کرا راے تو باشد

"جاے" کا قافیہ اُستادوں کی غزل میں اس پہلو سے بندھ چکا تھا کہ اسکا جواب نہیں ہو سکتا تھا، مثلاً

دو عالم را بیکبار از دل تنگ برون کردیم تا جاے تو باشد

نظیری نے اس پامال قافیہ کو بالکل نئے پہلو سے باندھا[1]،

نیازارم زخود ہرگز دلے را کہ می ترسم درو جاے تو باشد

اسی قافیہ میں ایک اور اُستاد کا شعر یاد آیا،

جہانے مختصر خواہم کہ دروے ہمیں جاے من و جاے تو باشد

اس زمانہ میں عبد الرحیم خانخانان کی فیاضیوں کا شہرہ دور دور پھیل چکا تھا نظیری نے اسکے دربار کا قصد کیا، اور آگرہ میں خانخانان سے ملا، چنانچہ جو قصیدہ اس موقع پر لکھا اور جو دیوان میں موجود ہے، اُس کا عنوان یہ لکھا ہے،

این قصیدہ در مدح صاحبیم ابو الفتح بہادر عبد الرحیم خانخانان بن بیرم خان

---

[1] شعراے مذکور کا مشاعرہ اور غزل کا یہ شعر مآثر رحیمی میں نقل کیا ہے،

ہنگامیکہ بایلغار از گجرات بدار السلطنت آگرہ آمدہ بودند داول مداحی و ملازمت ایں جا کردہ بود گفتہ شد،

غالباً یہ ۹۹۲ھ ہجری ہوگا کیونکہ اسی سنہ میں خانخانان گجرات سے آگرہ گیا ہے اور مظفر گجراتی کے شکست دینے کے صلہ میں، اسکو خانخانان کا خطاب ملا ہے،

غالباً خانخانان ہی کی تقریب کرنے سے اکبر کے دربار تک رسائی ہوئی، اوّل اوّل جب وہ دربار میں پہنچا ہے تو جہانگیر کے بیٹے پیدا ہونیکا جشن تھا، نظیری نے جو قصیدہ اس موقع پر پیش کیا ہے، اسکے عنوان میں صرف اسی قدر لکھا ہے نام کی تصریح نہیں کی، قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خسرو کی ولادت کا جشن ہوگا جو ۹۹۶ھ ہجری میں پیدا ہُوا تھا، اس قصیدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ نظیری کے بہت سے حاسد پیدا ہوگئے تھے، جو اُس کی رسائی میں خلل انداز ہوتے تھے چنانچہ خاتمہ میں کہتا ہے،

جماعتے ز سفیہانِ تیرہ طبع دنی — مدام در پیش افتادہ اند، ہمچو دبال

ز بے تمیزی ایں ناقدان کم مایہ — گہر بقدر خزف گشتہ زر بسرخ سفال

سزد کہ اخترِ نظم مرا بیک ساعت — توجہ تو بروں آرد از ہبوط وبال

اکبر کی مدح میں اس نے وقتاً فوقتاً اور بھی قصیدے لکھے اور غالباً مقبول بھی ہوئے لیکن دربار میں اسکو کوئی خاص امتیاز نہیں حاصل ہُوا، اسلئے اسنے اپنا مستقل تعلق خانخانان کے دربار سے قائم رکھا اور احمد آباد گجرات میں سکونت اختیار کی، چند برس کے بعد حج کا ارادہ کیا اور اس تقریب میں ایک قصیدہ لکھ کر خانخانان کی خدمت میں پیش کیا جسکا مطلع یہ ہے،

زہنر بخود نگنجم چو بہ خُم مے مُغانی — بدرد لباس بر تن چو بجوشدم معانی

اس میں شاعرانہ طریقہ سے مصارف سفر کی درخواست کی،

ہمہ عیش ایں جہانی بعنایتِ تو دیدم — چہ عجب اگر بیابم ز تو زاد آنجہانی

خانخانان نے سفر کا سامان کردیا، چنانچہ سورت سے جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ کو روانہ[1]

---

[1] ماثر رحیمی،

ہوا، راستہ میں بدؤں نے لوٹ لیا، تاہم اس نے حج اور زیارت دونوں حاصل کی، مآثر رحیمی میں نظیری کا سفر سنہ ۱۰۱۲ ہجری میں لکھا ہے، لیکن یہ سخت تعجب کی بات ہے، نظیری کے دیوان میں ایک قصیدہ سلطان مراد (ابن اکبر شاہ) کی مدح میں ہے، اسکے عنوان میں خود نظیری لکھتا ہے،

ایں قصیدہ نیز بعد از معاودت مکہ معظمہ بہ احمد آباد گجرات در مدح شاہزادۂ ہمایوں نژاد شاہ مراد گفتہ شد،

یہ مسلم ہے کہ مراد سنہ ۱۰۰۷ ہجری میں مرا ہے اس لئے نظیری کا سفر حج سنہ ۱۰۱۲ ہجری میں محال ہے، زیادہ تعجب اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ماثر رحیمی کا مصنف نظیری کا ہمعصر اور اسکا خواجہ تاش ہے قیاس یہ ہے کہ نظیری نے سنہ ۱۰۰۲ ہجری میں حج کیا ہے، علاوہ اور قرائن کے ایک قرینہ یہ ہے کہ خان اعظم میرزا کوکا اکبر کا رضاعی بھائی اسنے اسی سال میں حج کا سفر کیا تھا، اور نظیری کے دیوان میں ایک قصیدہ خان اعظم کی مدح میں ہے جسکا عنوان یہ ہے،

ایں قصیدہ در راہ مکہ مکرمہ بعد از غارتِ سارقان و حرامیان مذیل مدح نواب محمد عزیز اعظم خان منظوم شد،

اس قصیدہ میں اپنی حالت بیان کرکے درخواست کی ہے کہ میرے زاد راہ کا سامان کردیا جائے،

بہ گوشۂ نظر التفات، محتاجم — بزاریِ کہ تواں کشتنم بہ نیم نگاہ
زبے بضاعتی خود چناں ہراسانم — کہ بہر توشۂ رہ باز گردم از درگاہ
بسیل مرحمت از خاکِ ذلتم بردار — کہ ہمچو غلبۂ عطشان فتادہ ام برراہ

حج سے واپس آکر اس نے مراد کے دربار میں رسائی حاصل کی، اکبر نے شہزادہ مراد کو دکن کی مہم پر بھیجا تھا، وہ ان اطراف میں فوجیں لئے ہوئے پڑا تھا، نظیری چلتا پھرتا اس طرف جانکلا، دربار میں جانا چاہتا تھا کہ راہ میں ایک قدردان سخن کی نظر پڑگئی اس نے بڑھ کر کہا کہ خوب موقع پر آئے، نوروز کا جشن ہے، قصیدہ لکھ کر پیش کیجئے

خود جاکر شاہزادہ سے تقریب کی، چوبدار آکر لوا گیا، دربار میں سجدہ بجا لانے کا دستور تھا، لیکن دربار کی شان وشوکت دیکھ کر نظیری کے حواس جاتے رہے اس لئے آداب اور آئین سب بھول گیا نقیبوں نے باز پرس کی تو جواب دیا کہ میں نے آجتک یہ شان وشوکت نہیں دیکھی تھی، اسلئے حواس ٹھکانے نہ رہے یہ تمام واقعات، نظیری نے خود قصیدۂ مدحیہ میں لکھے ہیں، موقع کے خاص خاص اشعار ہم نقل کرتے ہیں،

دراں بساط کہ بر خود مرا شعور نبود	ز دور، دیدۂ دانا دلے بمن افتاد
بمہر گفت کہ ای زیب بخش مجمع اُنس	بیا بیا کہ بوقت آمدی مبارکباد
بساط مجلس و آئین جشن فرور دی ست	تو نیز جلوۂ آئین نظم خواہی داد
ہمیں دوید و بگفت و ہنوز پیدا بود	کہ شد غریو کزیں قطرہ کرد دریا یاد
چناں بپایۂ دولت شدم شتاب زدہ	کہ چند بار سرم در مقام پا افتاد
ز بس کہ تیز بہ آں بارگاہ در رفتم	ادب ز پایۂ خود پای برفراز نہاد
ز دلفریبی آئین و فرّ سلطانی،	بگاہ تہنیتم، رسم سجدہ رفت از یاد
چو خوب رسم ادب را بجا نیاوردم	ندا رسید کہ اے روستاے مادر زاد
بساط عرش و تکبر، ترا چہ پیش آمد	حریم کعبہ و غفلت، ترا چہ حال افتاد
جواب دادم و گفتم بجرم معذورم	کہ تا منم بچنیں دولتے نگشتم شاد

۱۰۱۴ سنہ ہجری میں اکبر نے دفات پائی اور جہانگیر تخت پر بیٹھا، وہ نہایت سخن شناس اور صاحب ذوق تھا، نظیری کا شہرہ سُن کر دربار میں طلب کیا، چنانچہ ۵ سنہ تخت نشینی مطابق ۱۰۱۹ سنہ ہجری میں نظیری، دربار میں حاضر ہوا اور انوری کے قصیدہ پر قصیدہ لکھ کر پیش کیا، جہانگیر خود تزک میں اس واقعہ کو لکھتا ہے،

نظیری نیشاپوری کہ در فن شعر و شاعری از مردم قرار دادہ بود و در گجرات بعنوان تجارت بسر می برد قبل ازیں طلبیدہ بودم دریں ولا آمدہ ملازمت کرد قصیدۂ انوری را کہ

ع، بازایں چہ جوانی وجمال ست جہاں را،
تتبع نمودہ قصیدہ بجہت من گفتہ بود گذرانید، ہزار روپیہ واسپ خلعت
بصلہ ایں قصیدہ بدو مرحمت نمودم،
نظیری نے قصیدہ میں دربار کی رسائی کی پوری تفصیل لکھی ہے،

ناگاہ درآمد زدرم بانگ کہ گویند	فرمان طلب آمدہ از شاہ جہان را
بے کفش و عمامہ بدار زخانہ دویدم	نے کردہ قبا در بر و نی بستہ میان را
تا حاکم دیوان و بلا بُر در سولم	دیدم ہمہ جا مژدہ دہاں مژدہ رساں را
اصحاب چساں مصحف از اصحاب ستانند	بگرفتم از احباب بہ تعظیم نشان را

یعنی جس طرح لوگ قرآن[1] لے لیتے ہیں اسی طرح میں نے بادشاہ کا خط تعظیم سے ہاتھوں میں لیا

بوسیدم و برفرق بہ تسلیم نہادم	بکشادم و برناصیہ سودم رخ آن را
می یدم و می سودم ازاں سرمہ نظر را	برخواندم و لیسیدم ازاں شہد زبان را
فی الحال دویدم زپے مرکب و سامان	کردم زہمہ روی وداع اہل مکان را
امروز سہ ماہ است کہ پویان سرانجم	گلشن بہ دماغ و بہ بغل حاصل کان را
چوں بحر تو در جزر و مد شیر شکاری	چوں گنج روا ہن بطلب گنج رواں را

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کے فرمان طلبی کے بعد تین مہینے نظیری کو دوڑ دھوپ میں گذرے، جس کی وجہ یہ تھی کہ جہانگیر شکار میں مصروف تھا،
یہ وہ زمانہ ہے جب نظیری تارک الدنیا سوچکا تھا، لیکن غلامی اور طماعی کی جو عادت راسخ ہوچکی تھی اسکا اقتضا یہ تھا کہ تین مہینے تک خاک چھانتا پھرا، اور شاہی فرمان کو قرآن سے تشبیہ دی،
جہانگیر نے ایک دفعہ اس سے ایک عمارت کے کتابہ کی فرمائش کی؛ اُس نے یہ غزل لکھ کر پیش کی،

اے خاک درت صندل سرگشتہ سراں را	بادا مژہ، جاروب رہت، تاجوراں را

جہانگیر نے اسکے صلہ میں تین ہزار بیگہ زمین انعام میں دی۔

[1] سرو آزاد اور ید بیضا،

گلزار ابرار میں لکھا ہے کہ نظیری نے مرنے سے بارہ برس پہلے ترک دنیا کرکے گوشۂ عزلت اختیار کیا، نظیری ۱۰۲۱ھ ہجری میں مرا ہے اس لئے ۱۰۰۹ھ ہجری میں وہ گوشہ نشین ہوا ہے، دو تین قصیدوں کے شان نزول میں اس نے خود بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے. لیکن امراء کی مداحی اس حالت میں بھی جاری تھی. چنانچہ یہ قصیدہ بھی اسی زمانہ کا ہے،

چندے بہ غلط بتکدہ کردیم حرم را وقت ست کہ از کعبہ برآریم صنم را

اخیر میں اسکو علوم دینیہ کی تحصیل کا شوق ہوا، ۱۰۰۰ھ ہجری میں جب وہ خانخانان کی ہمرکابی میں دکن گیا ہے تو راہ میں مندو سے گذرا، یہاں شیخ غوثی مندوی سے ملاقات ہوئی نیسی، شریف کاشی، کافی سبزواری، ملابقائی وغیرہ بھی اس سفر میں ساتھ تھے، نظیری کو جب دینیات کا شوق ہوا تو انہیں شیخ غوثی سے پہلے عربیت کی تحصیل کی، پھر مولانا حسین جوہری سے تفسیر اور حدیث پڑھی[1]

۱۰۲۰ھ ہجری میں گجرات سے آگرہ میں آیا اور خانخانان کو اپنا دیوان حوالہ کرکے پھر گجرات واپس آگیا[2]،

۱۰۲۰ھ ہجری میں بمقام احمد آباد گجرات وفات پائی، مکان کے قریب ایک مسجد بنوائی تھی، اسی میں دفن ہوا، یہ مآثر رحیمی کی روایت ہے ورنہ اور تمام تذکروں میں سال وفات ۱۰۲۰ھ ہجری ۱۰۲۱ھ ہجری لکھا ہے،

نظیری کی قبر جس محلہ میں ہے اسکا نام تاجپورہ ہے، قبر پر ایک گنبد بھی ہے،

عام حالات اور اخلاق وعادات

نظیری نے اگرچہ بہت سے درباروں کی آستان بوسی کی لیکن اسکا اصلی تعلق خانخانان کے دربار سے تھا، خانخانان کو خان اعظم کوکہ (اکبر کا رضاعی بھائی) کی بہن بیاہی تھی اس تعلق سے خان اعظم کی مداحی بھی کی ہے، اور باقی اکبر اور جہانگیر اور مراد تو حکمران وقت تھے، ان کی

---

[1] نسخہ موجودہ کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی،

[2] گلزار ابرار و خزانۂ عامرہ تذکرۂ نیکمی، ۵۳ مآثر رحیمی،

مداحی نہ کرتا تو کیا کرتا، معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ مراد سے اسکو دلی محبت تھی، شہزادۂ موصوف کا جو مرثیہ لکھا ہے اس میں دلی جذبات نظر آتے ہیں:

شہزادہ مراد سے محبت

اے بزم تیرہ، رخ چوں ارغواں کجاست — دے رزم! درہمی، شہ گیتی ستاں کجاست
شوق سجود حرمتِ تعظیم کمتر است — آں نازِ صد در سرکشی آستان کجاست
برگ و شگوفہ ریخت ثمر از کجا خورم — بشکست شاخ برگ ہمہ آشیاں کجاست
کس راسرود در خورِ ایں تعزیت نبود — پیدا کنید کا دل ایں داستان کجاست
خلقے بہ شیون اند، و نگویند حال چیست — صبر سخن شنیدن، و تاب بیان کجاست

آفاق در مصیبت او ممتحن شدہ
ایں مرگ باعث الم مرد و زن شدہ

غم خاست در پیالہ می از ساغر افگنید — شد بزم تیرہ، پردہ ازاں رخ بر افگنید
شمعے کہ دہر روشن ازو بود، مردہ است — پروانہ را بہ رو بخس باکستر افگنید
در بزم او ز حلقۂ ماتم، حرام نیست — ایں حلقہ را ز صحن سرا بر در افگنید
ریحانِ جلوہ، یاسمن عشوہ، ریختہ — چینید و ہم بران قدِ جان پرور افگنید
رفت آں سرے کہ تاج باو سرفراز بود — بر سر کنید خاک و کلاہ از سر افگنید

خیزید تا بہ آں سرِ تابوت دم زنیم
عرضی کنیم و کار و داعش بہم زنیم

خانخاناں کے دربار میں جسقدر شعرا تھے، یعنی عرفی، شکیبی، انیسی وغیرہ سب اسکے معترف رہتے تھے، ایک دفعہ خانخاناں نے انیسی کو ایک خط لکھا جسکے حاشیہ پر نظیری کو بھی سلام لکھا تھا، نظیری کو نہایت ناگوار ہوا، ایک قصیدہ لکھا جسمیں شکایت کا اسطرح اظہار کیا[1]

مدّے دوستہ مخصوص دل بانکشیدے — مخدوم ہم چنیں یاد نہ کردست خدم را
مانا ہم خود از حاشیہ نشینم گزیں بیش — مہمان طفیلی نتواں بود قلم را

ایک دفعہ نظیری نے خانخاناں سے کہا کہ لاکھ روپے کا ڈھیر لگایا جائے تو کس قدر

اکھ روپیہ

---

[1] مآثر رحیمی،

ہوگا؟ میں نے کبھی نہیں دیکھا، خانخانان نے لاکھ روپے منگوا کر سامنے رکھوا دئے، نظیری نے کہا خدا کا شکر ہے آپ کی بدولت میں نے لاکھ روپے تو دیکھ لئے، خانخانان نے روپے اُس کے گھر بھجوا دئے،

نظیری کو زرگری میں کمال تھا، اسکے ساتھ تجارت بھی کرتا تھا، شاعری کی فتوحات الگ تھی، اس بنا پر امیرانہ زندگی بسر کرتا تھا، اور امرا میں اسکا شمار ہوتا تھا، لیکن مزاج میں عرفی کی آن بان نہ تھی، اس لئے مرتے مرتے بھی مداحی کا شغل نہ چھوٹا،

بخلاف اور شعرا کے مذہب میں سخت تھا، اکبر کے دربار میں جن آزادانہ خیالات کے چرچے رہتے تھے، اُن سے بہت جلتا تھا، شاہزادہ مراد کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے، اُس میں اسکا خاص ذکر کیا ہے اور ابو الفضل یا مبارک کا نام بھی کنایۃً لیا ہے،

طبیعت ہمہ ابنائے دہر ملحد شد	ز بے زفطنت تو برطرف فتاد الحاد
اگرچہ فضلہ از فاضلان حاملِ دہر	بطمع جاہ و غنا کرد، مذہبے ایجاد
پس از حصولِ مرادات حالِ این زاہد	مثل چو باغ گشت و حسرت شداد

سفر حج جس ذوق شوق سے کیا ہے اس سے بھی اسکے مذہبی جوش کا اندازہ ہوتا ہے،

جہانگیر اور شاہ عباس صفوی دونوں نے تنباکو کے استعمال کو منع کرا دیا تھا،[۲] لیکن ع چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی،

لوگ باز نہیں آتے تھے، نظیری بھی اسکا جان دادہ تھا، چنانچہ تنباکو کی تعریف میں ایک غزل لکھی جو دیوان میں موجود ہے،

نے سنبل تنباکو ہے نہ آتش رخسارہ	دل بلوئے خاطر امید ہے داغ آتش پارہ
در نخل تنباکو نگر صوفی شدہ باز آمدہ	در کوے خود سرگشتہ در شہر خود آوارہ

[۱] مآثر الامرا، تذکرۂ خانخانان و خزانۂ عامرہ، [۲] مآثر رحیمی،

چوں بید مجنوں ہر طرف افگندہ از سر طرۂ   چوں نی ساگر بہر کجا افگندہ از بر پارۂ

پوری غزل تنہا کو کی تعریف میں ہے،

"اس زمانہ میں نظیر نام ایک شاعر تھا، نظیری نے اسکو لکھا کہ اپنا تخلص بدل دو تاکہ دونوں تخلصوں میں اشتباہ نہ ہو، چونکہ نظیری دراصل نظیر سے ماخوذ ہے صرف ایک حرف زائد ہے، اسلئے سرقہ کا الزام نظیری ہی پر عاید ہو سکتا تھا، نظیری نے دس ہزار روپے دے کر یہ حرف زائد (ی) خریدا اور نظیر نے اپنا تخلص بدل دیا"[1]

شعرا میں سے خاص جن لوگوں سے نظیری کے معرکے رہتے تھے، عرفی، ظہوری اور ملک قمی تھے عرفی نے تو نظیری کو قابل خطاب نہیں سمجھا، لیکن نظیری نے اُسکے مرے پیچھے قصیدہ میں اُسکو گالیاں سُنائیں چنانچہ عرفی کے حال میں ہم نے وہ اشعار نقل کر دئے ہیں، ظہوری اور قمی نے ۱۰۲۰ہجری میں نظیری کے پاس اپنے دیوان بھیجے، اور نظیری نے ایک ایک غزل کا جواب لکھا، یہ اوحدی کا بیان ہے (ماخوذ از عرفات) لیکن اس میں کسی قدر مبالغہ معلوم ہوتا ہے، نظیری اس زمانہ کے دو ہی ایک سال کے بعد مرا ہے، اس لئے اتنے کم زمانہ میں ظہوری اور قمی کی ہزاروں غزلوں کا جواب کیونکر لکھ سکتا تھا،

نظیری کی خصوصیات ا۔ تمدن جب ترقی کرتا ہے تو ہر چیز میں نئے نئے تکلفات پیدا ہوتے ہیں اور انکے لئے جدت پسند صناع نئے نئے سامان پیدا کرتے ہیں، یہ اثر جس طرح مادی چیزوں پر عمل کرتا ہے۔ غیر مادی اشیاء یعنی خیالات، جذبات، محبت، راز و نیاز، سوز و گداز سب چیزوں پر عمل کرتا ہے، مثلاً ابتدائے تمدن میں معشوق کے صرف رنگ و روپ اور مناسب اعضا کا خیال آیا، اور اُسکے لئے حُسن ایک عام لفظ ایجاد کیا گیا، لیکن جب رنگین طبعی اور نکتہ سنجی زیادہ بڑھی تو معشوق کی ایک ایک ادا الگ الگ نظر آئی اور وسعت زبان نے انکے مقابلہ میں نئے نئے الفاظ مثلاً کرشمہ، غمزہ، ناز، ادا وغیرہ وغیرہ تراشے

---

[1] سرو آزاد او یدِ بیضا،

اس قسم کے الفاظ اور ترکیبیں جدت پسند طبیعتیں ایجاد کرتی ہیں جن کو اس شریعت کا پیغمبر کہنا چاہیئے، ان الفاظ کی بدولت آئندہ نسلوں کو سیکڑوں ہزاروں خیالات اور جذبات کے ادا کرنے کا سامان ہاتھ آجاتا ہے **نظیری** اس شریعت کا اولوالعزم پیغمبر ہے۔ اُس نے سیکڑوں نئے الفاظ اور سیکڑوں نئی ترکیبیں ایجاد کیں، یہ الفاظ پہلے سے موجود تھے، لیکن جس موقع پر اس نے کام لیا، یا جس انداز سے اُن کو برتا، شاید پہلے اس طرح برتے نہیں گئے تھے، مثلاً

از کف نمی دہد دل آساں ربودہ را — دیدیم زور بازوے ناآزمودہ را

آسان ربودہ کی ترکیب نئی ہے اور اس سے ایک وسیع خیال ادا ہوگیا، دوسرے مصرع میں زور بازو، ناآزمودہ، سب مستعمل الفاظ ہیں لیکن ان سے نئی طرح سے کام لیا ہے، کہنا یہ تھا کہ معشوق کمسن ہے اور اسکو کسی طرح کا تجربہ نہیں تاہم جس شخص کا دل ایک دفعہ اُس پر آجاتا ہے پھر اُسکے پنجہ سے چھوٹ نہیں سکتا، اس مضمون کو یوں ادا کرتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ ایک ناآزمودہ بازو میں کس قدر زور ہے،

تا منفعل ز رنجش بیجا نہ سازمش — می آرم اعتراف، گناہ نہ بودہ را

چہ خوش ست از دو یک دل سر حرف باز کردن — سخن گذشتہ گفتن گلہ دراز کردن

اثر عتاب بردن، ز دل ہم اندک اندک — بہ بدیہہ آفریدن بہ بہانہ ساز کردن

شعر کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی لطف کا کیا موقع ہوتا ہے جب دو یک دل دوست آپس میں مل بیٹھتے ہیں، گفتگو چھیڑتے ہیں پرانے تذکرے کرتے ہیں شکایتیں شروع ہوتی ہیں ایک دوست روٹھا ہوا ہے، دوسرا اسکو اس طرح آہستہ آہستہ مناتا جاتا ہے کہ جب وہ کوئی شکایت پیش کرتا ہے تو یہ جھٹ کوئی تاویل گڑھ لیتا ہے، فوری تاویل کرنے کے لئے "بدیہہ آفریدن" کس قدر موزوں لفظ ہے جو ایک بڑے خیال کو کس قدر مختصر لفظ میں ادا کردیتا ہے۔ زدل ہم اور اندک اندک کی ترکیب کس

نیست لذت ز نظر بازی پنہاں کردن — خندۂ زیر لب و گریہ پنہانے نیست

یہ اُس حالت کی تصویر ہے کہ معشوق زیب مجلس ہے، ہر طرح کے لوگ جمع ہیں ہنسی

بیں عاشق غمزدہ بھی ہے، وہ لوگوں کی آنکھ بچا کر روتا ہے، معشوق دیکھ رہا ہے اور مسکراتا ہے اس خیال کے ادا کرنے کے لئے، خندۂ زیرلب اور گریۂ پنہاں کس قدر موزوں ہیں،

چناں وقت شکایت از نگاہش مضطرب گشتم
کہ مضمونِ سخن صد بار از دل تا زباں گم شد

کہنا یہ تھا کہ میں معشوق سے شکایت کر رہا تھا، دفعۃً اُس نے میری طرف نگاہ غضب سے دیکھا جس کی وجہ سے میرا یہ حال ہوا کہ سو سو دفعہ دل سے بات نکلتی تھی لیکن ہونٹوں تک آآکے رہ جاتی تھی،

شرم از میاں برخاستہ، مُہر از دہاں برداشتہ
گفتار بے ترسش بہ بیں، رفتار بے باکش نگر

شمارے تا سحر دستم بزلف درہمی دارد
گریبانم گریباں ست و داماں داماں ست امشب

شمار داشتن، یعنی مصروف بودن، مطلب یہ ہے کہ آج میرا ہاتھ زلف پریشان میں مصروف رہا (یعنی میں اسکو سلجھاتا رہا)، اور میں اپنے گریبان اور دامن کو نہ پھاڑ سکا، اس لئے آج میرا گریبان گریبان ہے اور دامن دامن ہے یعنی دونوں اصلی حالت پر ہیں، گریبان اور دامن کے سلامت رہ جانے کو صرف ان دو لفظوں کے مکرر لانے سے ادا کر دیا ہے، اور کس قدر خوشنما طرز ادا ہے،

۲۔ وہ اکثر وجدانی باتوں کو ایسے طریقہ سے ادا کرتا ہے کہ مجسم بن کر سامنے آجاتی ہیں اور اس سے عجیب خاص لطف پیدا ہوتا ہے، مثلاً یہ امر کہ معشوق کا ایک ایک عضو یا ایک ایک ادا دلربا ہوتی ہے، یعنی ہر عضو اور ہر ادا کی طرف دل کھنچتا ہے، اسکو اس طرح ادا کرتا ہے،

ز پائے تا بسرش ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

اس شعر سے یہ تصویر پیش نظر ہوتی ہے کہ معشوق کا سراپا ایک مجلس ہے جس میں بہت سے تماشائی جمع ہیں، انہیں میں دل بھی ہے، کرشمہ، معشوق کے پیش خدمتوں میں ہے، دل اس مجلس میں جب آجاتا ہے تو جدھر اسکا گذر ہوتا ہے، کرشمہ دامن پکڑ کر کھینچتا ہے کہ یہیں بیٹھ جاؤ،

دو نیم گشتہ دل از کفر و دین نمیدانم   کزیں دو پارہ دل آید ترا بکار کدام

مقصد یہ تھا کہ دل میں کفر اور ایمان دونوں قسم کے خیالات جمع ہیں یا دونوں طرف اُسکا میلان ہے، معلوم نہیں تجھے کو کیا پسند ہے، اس خیال کو اس صورت میں پیش نظر کرتا ہے کہ کفر اور اسلام نے دل کے دو ٹکڑے کر دئے ہیں، معلوم نہیں کہ ان دونوں ٹکڑوں میں تیرے کام کا کون ہے،

کو زخم عاشقانہ کہ در جلوہ گاہِ حُسن   صد چاک دل بہ تارِ نگاہے رفو کنند

دل شکستہ دراں کوے می کنند درست   چناں کہ خود نشناسی کہ از کجا بشکست

کہنا یہ تھا کہ معشوق کی گلی میں جانے سے رنج و غم اس طرح دُور ہو جاتے ہیں گویا کبھی تھے ہی نہیں اس خیال کو یوں ادا کرتا ہے کہ دل گویا ایک شیشہ ہے معشوق کی گلی میں شیشہ سازی کا کارخانہ ہے وہاں یہ شیشہ اس طرح جوڑ دیا جاتا ہے کہ یہ کبھی نہیں معلوم ہو سکتا کہ کہاں سے ٹوٹا تھا،

دیدنش بر دیدنِ من حسرت دیگر فزود   خواستم پیکان بر آرم از جگر، نشتر شکست

می روم جائے کہ غم آں جا زد لہا می رود   نالہ از ہر جا کہ بر می خیزد آں جا می رود

دل بردہ در دل باختن معشوق عاشق پیشہ بیں   بگرفتہ در اند اختن بازوے چالاکش نگر

شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق کسی اور معشوق پر عاشق ہو گیا لیکن معشوقی کی ادائیں اب بھی قائم ہیں اسلئے عین اُسوقت جبکہ اسکا دل ہاتھ سے جاتا رہا اُس نے معشوق کو اپنا عاشق بنالیا، اس مطلب کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے کہ گویا دو پہلوان لڑ رہے ہیں ایک پہلوان نے گرتے گرتے داؤں کرکے حریف کو پچھاڑ لیا،

از یک حدیث لطف کہ آں ہم دروغ بود   امشب ز دفتر گلہ صد باب شستہ ایم

ادراک حال ما زنگہ می تواں نمود   لختے ز حال خویش بسیما نوشتہ ایم

من دپے رہائی داد از پے فریب   بر سر گرہ زنند گرہ ناکشودہ را

کنایہ تھا کہ عشق چھوڑنا چاہتا ہوں، لیکن معشوق لطف اور مہربانی کی

ایسی لگاوٹیں کرتا جاتا ہے اور عشق بڑھتا جاتا ہے۔ اس مضمون کو یوں مجسم کرکے دکھاتا ہے کہ ایک دھاگے میں گرہ پڑگئی ہے، ایک شخص اسکو کھولنا چاہتا ہے لیکن حریف ایسا تیز دست ہے کہ ابھی ایک گرہ کھلنے نہیں پاتی کہ اور دوسری لگا دیتا ہے،

دیدہ ام دفتر پیمان وفات حرف بحرف — نام خوباں ہمہ ثبت ست ہمیں نام تو نیست
زبید اوتو حرف مہر را نام و نشاں گم شد — کتاب حسن را جز و محبت از میان گم شد
نہ چناں گرفتہ جا بمیان جان شیریں — کہ تواں ترا و جان را زہم امتیاز کردن

یعنی معشوق اور جان دو چیزیں ہیں جو اس طرح رل مل گئے ہیں کہ یہ پتا لگانا مشکل ہے کہ جان کہاں ہے اور معشوق کہاں،

بہر نرخے کہ بگیر ند کالائے فاخوب ست — پس از عمرے گذر افتاد بربا کاروانے را

۴۔ اسی خصوصیت کے سلسلہ میں یہ بھی داخل ہے کہ **نظیری** اکثر حالات اور کیفیات کی تشبیہ مادیات اور محسوسات سے دیتا ہے اور اسلئے اس سے ایک خاص استعجاب کا اثر پڑتا ہے کیونکہ جب دو مخالف چیزوں میں تناسب اور تشابہ نظر آتا ہے تو طبیعت میں استعجاب پیدا ہوتا ہے، اس قسم کے اشعار نظیری کے ہاں کثرت سے ہیں، مثلاً

شکوہ نقصان داشت فصلے از میان انداختم — نرخ ارزان بود، کالا در دکان انداختم

یعنی میں معشوق کی شکایت کرتا تھا تو ناراض ہوتا تھا، اسلئے میں نے تقریر کا یہ حصہ حذف کر دیا، اسکو یوں تشبیہ دی کہ چونکہ دام اچھے نہیں اُٹھتے تھے اسلئے میں نے سودا اُٹھا کر دکان میں ڈال دیا،

بس غنچۂ ناشگفتہ بتاراج خزاں رفت — رسم ست کہ رہزن زند از قافلہ پس را
حسن چندے سر بدل شوخی و رعنائی دہد — شہ چو گیرد مملکت ادل بہ یغمائی دہد

یعنی حسن ابتدا میں شوخی اور رعنائی سے زیادہ کام لیتا ہے کیونکہ بادشاہ جب کوئی ملک فتح کرتا ہے تو پہلے لوٹنے والوں کے حوالے کرتا ہے کہ لوٹ لیں،

حسن بادشاہ ہے اور شوخی و رعنائی فوج کے ساتھ کے لٹیرے ہیں،

زاظہار محبت برزبان خلق افتادم
چو محتاجے کہ گنجے یابد و ظاہر کند ز ددش

بوصلش تار سیم صد بار در خاک افگند شوقم
کہ نو پرواز م و شاخے بلندے آشیاں دارم

آں دہد در گریہ پند ماکہ باباد شمن ست
ہر کہ می گیرد شناور را بدریا دشمن ست

پس از وارستگیہا، بیشتر گشتم گرفتارش
چو صیدے جست صیادش ز اول سخت ترگیرد

یعنی ایکمرتبہ دل معشوق سے چھڑا کر پھر جو گرفتار ہوا تو سخت گرفتار ہوا، قاعدہ ہے کہ شکاری کے ہاتھ سے جب شکار چھوٹ جاتا ہے اور پھر ہاتھ آتا ہے۔ تو شکاری اسکو خوب مضبوط پکڑتا ہے کہ پھر چھوٹنے نہ پائے،

از شوق شہیدان حریم سر کویش
چوں دانہ در آغوش تنگ بند زمین را

ہمہ شب برلب رخسار و گیسو می زنم بوسہ
گل و نسرین و سنبل را صبا در خرمن ست امشب

یعنی میں لب رخسار، اور بالوں کو چومتا ہوں، گویا نسرین اور سنبل۔ کے خرمن میں صبا گھس گئی ہے،

محبت در دل غم دیدہ الفت بیشتر گیرد
چراغے را کہ دودے ہست در سر زود در گیرد

یعنی جو دل ایکمرتبہ عشق میں گرفتار ہو چکا ہے، بہت جلد عشق سے متاثر ہو جاتا ہے، جس طرح وہ بجھا ہوا چراغ جس سے ابھی دھواں نکل رہا ہے جلانے سے بہت جلد جل اٹھتا ہے،

زبس بوالہوس گرد دلت عاشق نمی گردد
طفیلی جمع شد چنداں کہ جائے میہماں گم شد

یعنی ہوس پرستوں سے معشوق کو اس قدر انس ہے کہ عاشقوں کو نہیں پوچھتا طفیلی اتنے جمع ہو گئے ہیں کہ مہمان کی جگہ نہیں رہی،

بغیر دل ہمہ نقش و نگار، بے معنی ست
ہمیں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا ایں جا ست

یعنی گو سب کچھ ہو، اگر دل صاف نہیں تو کچھ نہیں، گویا ایک کتاب میں بہت سے ورق تھے لیکن جس ورق پر سیاہی گر گئی ہے اصلی مطلب وہیں تھا،

تا کے چو موج آب بہر سو شتافتن
در عین بحر پاے چو گرداب بند کن

برنمی آید ہلال عیدم از ابر امید   عمر رفت و ہمچو طفلاں بر درو بامم ہنوز

دلم از نالہ خوش گردید، امید اثر باشد   بسے آسودہ شستم ایں خدنگم کارگر باشد

شکاریوں کا خیال ہے کہ جب تیر نشانہ پر لگتا ہے تو چٹکی کو آرام معلوم ہوتا ہے
شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اب کے جو نالہ کیا اُس سے میری طبیعت بہت محظوظ ہوئی، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ نالہ میں اثر ہوگا، جس طرح چٹکی کو جب لطف محسوس ہوتا ہے تو ضرور وہ تیر نشانہ پر لگتا ہے،

چو خانۂ سر کشت ست عہد را بنیاد   زہر طرف کہ نسیمے وزید روزن شد

کھیت کی حفاظت کے لئے جو چھپر وغیرہ بنا لیتے ہیں، اسکو خانۂ کشت کہتے ہیں کہتا ہے کہ معشوق کے وعدے ایسے ہیں، جیسے خانۂ کشت کہ جدھر سے ہوا کا ذرا جھونکا آیا سوراخ ہوگیا،

خدنگ جعبۂ توفیق امشب در کمانم بود   غزالم در نظر بسیار خوب آمد خطا کردم

کنایہ یہ تھا کہ آج میں معشوق کے ظلم سے تنگ آکر اسکے حق میں بد دعا کرنی چاہتا تھا لیکن اسکے حسن کا خیال آیا اور رُک گیا، اسکو یوں ادا کرتا ہے کہ ہرن سامنے آیا، میں تیر چلہ میں جوڑ چکا تھا، لیکن ہرن کی ادائیں اس قدر آنکھوں میں کھپ گئیں کہ میں نے دانستہ چھوڑ دیا،

۴۔ وہ اکثر عشق اور عاشقی کی سچی اور صحیح واردا تیں بیان کرتا ہے، اسلئے دل پر اُن کا خاص اثر ہوتا ہے،

خواہی کہ بتو بیش شود عشق نظیری   گاہ از نظر خویش بران گاہ نگہ دار

معشوق سے کہتا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ نظیری کا عشق اور بڑھے تو کبھی اُسکو اپنی نظر سے گرا دو، اور کبھی محبت کی نظر سے دیکھ لو،

قاصد جگرم سوخت چہ پیغام و چہ نامہ   دل بود ہماں خوش کہ بامید خبر بود

باوجود نا امیدی بس کہ مشتاق توام   مدعی گر مژدۂ وصلم دہد باور کنم

سلہ یعنی میری چٹکی کو بہت آرام اور لطف محسوس ہوا،

کس قدر عجیب لیکن سچی بات ہے انسان جب کسی بات کا نہایت مشتاق ہوتا ہے تو اُسکے ہونے کی خبر اگر دشمن بھی آکر بیان کرے تو انسان شوق کی وجہ سے یقین کر لیتا ہے اس بنا پر کہتا ہے کہ معشوق کے وصل کی خوشخبری خود رقیب بھی آکر دے تو مجھ کو یقین آجائے،

بمہربانی او اعتماد نتواں کرد — کہ تازہ عاشقم و خاطرش بمن صاف است
ایں دل کہ در وصال تسلی از و نبود — خرسندش از تغافل و دشنام کردہ ایم

یعنی ایک وہ وقت تھا کہ وصل حاصل تھا لیکن تسلی نہیں ہوتی تھی اور اس سے بھی زیادہ کسی چیز کو دل چاہتا تھا، یا یہ حالت ہے کہ وصل کا کیا ذکر ہے معشوق نظر تک اُٹھا کر نہیں دیکھتا، اس مایوسی کی حالت میں اگر اتفاقاً اُس نے کبھی گالی بھی دیدی تو خوش ہوتا ہوں کہ آگے کے لئے امید بندھتی ہے،

کس از معانقۂ روز وصل یابد ذوق — کہ چند شب ہم آغوش خود جدا خفت است
شد عمر و سرگرانی او برطرف نشد — با ما بقدر مرتبۂ عشق ناز کرد
پایم بہ پیش از سر ایں کو نمے رود — یاران خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست
مُردم از شرمندگی تا چند با ہر ناکسے — مردمت از دور بنمایند و گویم یار نیست

ایک خاص واقعہ کی تصویر کھینچی ہے، حالت یہ ہے کہ معشوق اکثر کمینوں اور ہوس پرستوں کے ساتھ رہتا ہے، لوگ جب اسکو کہیں راستہ میں کمینوں کے ساتھ جاتا ہوا دیکھتے ہیں تو دور سے عاشق [illegible] کو دکھا کر کہتے ہیں دیکھو تمہارا یار جاتا ہے، عاشق غیرت کے مارے کہتا ہے کہ نہیں میرا معشوق نہیں کوئی اور ہوگا،

مشاطہ را بگو کہ براسباب حسن یار — چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید
با [illegible] راندم از بزم بجز [illegible] نبود — ورنہ کس را بمن و بودن من کار نبود
از یک حدیث [illegible] ہم [illegible] بود — امشب از دفتر گلہ صد باب شستہ ایم

یعنی معشوق نے ذراسی مہربانی سے بات کہی اور تمام شکایتیں جاتی رہیں،

مرا بسادہ دلیہای من توان بخشید | خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

می گریم واز گریہ چو طفلاں خبرم نیست | در دل ہوسے ہست و ندانم کہ کدام ست

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں عشق یہ درد اور گداز پیدا ہوتا ہے، لیکن ابھی کوئی معشوق متعین نہیں، اسلئے وہ سمجھ نہیں سکتا کہ یہ حالت کیوں ہے اور اسکی تمثیل کس قدر عمدہ دی ہے، بچے روتے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ کیوں روتے ہیں؟ کیونکہ ان کو جو تکلیف ہے، اسکے سمجھنے کی انکو عقل نہیں،

ہماں عشق ست برخود بستہ چندیں داستان ورنہ | کسے برمعنی یک حرف صد دفتر نمی سازد

بغل از نامۂ احباب پُر کردہ نمے خواند | کہ می ترسد شود مکتوب من ہم از میان پیدا

عاشقوں کے خطوط کا چُنگ ہاتھ میں ہے لیکن کھول کر پڑھتا نہیں کہ کہیں میرا خط نہ نکل آئے،

من نخواہم رفت اما بہر تسکین دلش | ہر کجا بینید گوئیدش کہ فردا می رود

یعنی میں اُسکی گلی سے جاؤنگا تو نہیں لیکن تم لوگ اُس سے ملنا تو کہدینا کہ کل چلا جاؤنگا

غنچ دافسون زلیخا کار در یوسف نہ کرد | ہر کہ دل در باختن دل بردن نمیداند کہ چیست

نوازشے زکرم می کنند محبت نیست | تواں شناختن از دوستی مدارا را

یعنی معشوق جو مہربانی کرتا ہے انسانیت کے لحاظ سے کرتا ہے، محبت نہیں، محبت اور مدارا میں جو فرق ہے اسکی تمیز خود ہو سکتی ہے،

نظیری کوی عشق ست این شاہد بازی رندی | کہ گر یارے رود از دست کس یارے دگر گیرد

مشو از حال من غافل کہ زخمے کارئے دارم | مبادا دیگرے صید ترا از خاک برگیرد

بہر زخمے کہ می گیرند کالائے فاخوب ست | پس از عمرے گذر افتاد بر من کاروانے را

سوائے کن زمن امروز تا غوغا بشہر افتد | کہ اعجاز تلانی کرد گویائے زبانی را

مجلس چو بر شکست، تماشا بما رسید | در بزم چوں نماند کسے جا بما رسید

۵- نظیری کے کلام میں فلسفہ کم ہے لیکن جس قدر ہے نہایت خوبی سے ادا

بر بہرۂ حقیقت اگر ماند پردۂ
جُرم گناہِ دیدۂ صورت پرست ماست

چند از موذن بشنوم توحید شرک آمیز را
کو عشق تا یکسو نہم شرع خلاف انگیز را

خضر صد منزل بہ پشم آمد و نشناختم
باز می باید ز سر گیرم رہِ پیمودہ را

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو دلیلیں ہمارے سامنے پیش کیگئیں، یا جو مسائل ہمارے سامنے آئے وہ صحیح تھے لیکن ہم نے اپنی بے پروائی یا کج طبعی یا اکڑ پنی کی وجہ سے اُس سے فائدہ نہیں اُٹھایا، اسلئے ہمکو نئے دلائل کی ضرورت نہیں، اُنہیں دلائل کو غور سے پھر دیکھنا چاہیئے اسی خیال کو اس شعر میں ادا کیا ہے۔

ہرگز عطائے ساقی ما را گرانہ نیست
از تنگ ظرفی ست کہ پیمانہ پُر شدہ است

زیں پیش شیشۂ دل ما ہم ز سنگ بود
بے نسبت آشنا دل ما با دلِ تو نیست

شیشہ پتھر سے بناتے ہیں اس بنا پر کہتا ہے کہ میرے دل کو جو تیرے دل سے ربط ہے بے وجہ نہیں ہے، یہ شیشہ بھی (عاشق کا دل) پہلے پتھر تھا، معشوق کا دل پتھر ہوتا ہے، اس لئے ایک قسم کی مناسبت ہے،

اس شعر میں میلان جنسیت کے مسئلہ کو عاشقانہ پیرایہ میں ادا کرتا ہے،

ہیچ کس نامۂ سربستۂ ما فہم نہ کرد
نہ ہمیں خاتمہ اش نیست کہ عنوانش نیست

یعنی دنیا کے آغاز و انجام کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی،

تو مپندار کہ ایں قصہ ز خود مے گویم
گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

یعنی جو کچھ کہتا ہوں دل میں القا ہوتا ہے تب کہتا ہوں،

گر عکس روے خویش در آئینہ دیدۂ
توحید شیخ و شرک برہمن بجا شناس

یعنی توحید اور شرک دونوں صحیح ہیں، کیونکہ بت میں بھی کوئی ہے جس پر برہمن نثار ہے۔

حور و جنت جلوہ بر زاہد دہد در راہ دوست
اندک اندک عشق بر راہ آورد بیگانہ را

یعنی خشک طبع زاہد، معرفت الٰہی کی طرف یوں نہیں مائل ہو سکتے، اسلئے اُنکو حور اور جنت کی چاٹ دلائی جاتی ہے، اس لالچ سے جب وہ ذکر اور شغل میں مصروف ہوتے ہیں

تو رفتہ رفتہ جذب الٰہی بھی پیدا ہو جاتا ہے،

ہیچ اکسیر بہ تاثیر محبت نرسد ‎ ‎ کفر آوردم و در عشق تو ایماں کردم

کفر و ایماں نبود شرط نظیری در عشق ‎ ‎ بتو کافر بنمایم کہ ولایت دارد

روے نکو معالجۂ عمر کوتہ است ‎ ‎ ایں نسخہ از بیاض مسیحا نوشتہ ایم

مارا چہ اعتبار و اثر با وجود دوست ‎ ‎ جائے کہ جلوہ کرد حقیقت مجاز نیست

حسن ہر سو در لباس دیگرے پنہاں شود ‎ ‎ عشق ہر ساعت در آویزد بداماں دگر

بہر کارے کہ ہمت می گماری نصرت از حق جو ‎ ‎ کہ بر کنجشک دام افگندم و صید ہما کردم

تا کسے چو موج آب بہر سو شتافتن ‎ ‎ در عین بحر پاے چو گرداب بند کن

دریں میدان پر نیرنگ حیران ست دانائے ‎ ‎ کہ یک ہنگامہ آرائی ست و صد کشور تماشائے

در طبع دوستاں زحسد راستی نماند ‎ ‎ انصاف اگر طلب کنی از دشمناں طلب

تعجب یہ ہے کہ نظیری اگرچہ نہایت مذہبی آدمی تھا اور اکبر اور ابوالفضل کی لامذہبی پر نہایت لعن طعن کرتا ہے لیکن خود وہی خیالات ظاہر کرتا ہے جو اس زمانے میں ابوالفضل وغیرہ کی طرف منسوب تھے، چنانچہ کہتا ہے،

بوالبشر را تو ے ملائکہ اند ‎ ‎ جزو کل راست در سجود ایں جا

حضرت آدم کے تو ی بھی فرشتہ ہیں ‎ ‎ اور جزو، کل کو سجدہ کر رہا ہے

نزد تو جبریل وحی آورد ‎ ‎ عقل بر تیغ ز رخ کشود ایں جا

تمہارے نزدیک تو جبریل وحی لائے، ‎ ‎ لیکن در اصل وہ خود عقل تھی

۶- اس زمانے کے تمام نامور شعرا کا اصلی جوہر، طرز ادا کی جدت ہے نظیری اس میدان میں اکثر حریفوں سے آگے ہے،

عشق را کام بعہد دل خود کام تو نیست ‎ ‎ صبح امید دشب وصل در ایام تو نیست

(گویا اس میں ایک صبح اور ایک رات کم ہے،

از کف نمید ہد دل آساں ربودہ را ‎ ‎ دیدیم زور بازوے ناآزمودہ را

بازم بہ کلبہ کیست نہ شمع و نہ آفتاب ‎ ‎ بام و درم زذرہ و پروانہ پر شدہ است

میرے گھر میں کون آیا ہے کہ دھوپ ہے نہ شمع، باوجود اسکے در و دیوار پر ذرے اور پروانے ٹوٹ پڑے ہیں (یعنی معشوق آفتاب بھی ہے اور شمع بھی)

بے تو دو شمع در درازی از شب یلدا گذشت　　آفتاب امروز چوں برق از سرائے ما گذشت

ہیبت جنبش کسے را رخصت آہے نداد　　گرچہ ہر سودا و خواہی بود، او تنہا گذشت

در آرزوے نثار قدوم تو ہمہ شب　　گہر فروش دو چشم مرادکان باز ست

دعا کنید بوقت شہادتم او را　　کہ ایں دمے ست کہ درہای آسمان باز ست

اس شعر میں جدت ادا کے ساتھ ایثار نفس کے مضمون کو نہایت بلاغت کے ساتھ ادا کیا ہے عاشق قتل کیا گیا ہے اس تقریب میں آسمان کے دروازے کھل گئے ہیں، اس حالت میں عاشق کو سب سے پہلے جو خیال آتا ہے وہ یہ ہے کہ معشوق کے حق میں لوگوں کو دعا کرنی چاہیئے کیونکہ یہ قبول دعا کا وقت ہے،

عارفاں گوشۂ چشمے بدو عالم ندہند　　ہر کجا یار نقاب از رخ زیبا برداشت

ع - ایں قبلۂ کج شدہ، طرفِ کلاہ کیست

گرچہ میدانم قسم خوردن بجانت خوب نیست　　ہم بجان تو کہ یادم نیست سوگندِ دگر

اس شوخی کو دیکھو، کہتا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ تمہاری جان کی قسم کھانا اچھی بات نہیں، لیکن تیری جان ہی کی قسم کہ مجھکو اور کوئی قسم یاد ہی نہیں، خوبی اور بلاغت یہ ہے کہ قسم نہ کھانے پر بھی قسم کھائے جاتا ہے، اور اس لطف سے کہ گویا اسکو خبر نہیں کہ اُس نے قسم کھائی اسی میں یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ اُسکو اور کوئی قسم یاد نہیں،

قسمت چنیں فتاد کہ ترکان مست او　　در دورِ ما بطاق نہادند جام را

کہنا یہ تھا کہ ہم معشوق کی نگاہ سے محروم ہیں، اسکو یوں کہتا ہے کہ ہماری قسمت ایسی واقع ہوئی کہ ہمارے زمانے میں ان ترکوں (معشوق کی آنکھیں) نے پیالہ اُٹھا کر طاق پر رکھ دیا اور شراب پینی پلانی چھوڑ دی،

ہیچ دل را ستم حادثہ مجروح نہ کرد　　کہ نہ لعل تو برو ریخت نمکدانے چند

تو گر برہم زنی سودائے دل نازے زیاں داری　　مرا سرمایۂ دنیا و دین نابود ــے گردد

یعنی دل کی خرید و فروخت کا جو معاملہ طے ہو چکا ہے، اُسکو تو اگر توڑ دے تو تیرا صرف ایک ناز ہی کا نقصان ہوگا، لیکن میرا تو دین اور دنیا کا جو کچھ سرمایہ ہے (یعنی دل) سب جاتا رہیگا،

چناں برہم زدی ہنگامۂ شور قیامت را　　کہ اکثر نامۂ اعمال ہر دم از میاں گم شد

با تو گستاخی ست گفتن ترک بد خوے نما　　با دل خود گفتہ ام آئینہ را بے زنگ ساز

مقصد یہ ہے کہ معشوق تو بد مزاجی چھوڑ نہیں سکتا؛ اس لئے میں نے اپنے دل کو برداشت کرنے کی عادت ڈال دی ہے، اس مطلب کو یوں ادا کرتا ہے (معشوق سے مخاطب ہو کر) تم سے یہ کہنا تو گستاخی ہے کہ بد مزاجی چھوڑ دو، لیکن میں نے اپنے دل سے کہہ دیا ہے کہ آئینہ ایسا بناؤ جسکو زنگ نہ لگنے پائے،

بدل طرح وصالِ جاودانی نقش می بندم　　اگر خود دوست می آید بخلوت دشمن ست امشب

عشق بازیم بمعشوق مزاجی انداخت　　زاں نیازے کہ بہ او ہست مرا نازے ہست

یعنی عشق کرتے کرتے مجھ میں معشوق مزاجی آگئی، مجھکو اس پر ناز ہے کہ میں اُسکا نیاز مند ہوں،

میخواست بوسہ زحمت اقامت بگسترد　　از فرش جبہہ راہ براں خاک کو نبود

مقصد یہ ہے کہ میں اُسکی گلی کی خاک کو بوسہ دینا چاہتا تھا، لیکن اس قدر کثرت سے لوگ پیشانی رگڑ رہے تھے کہ جگہ نہ تھی، اس مطلب کو یوں ادا کرتا ہے کہ بوسہ نے چاہا کہ وہاں قیام کے لئے بستر بچھائے، لیکن پیشانیوں کا فرش بچھا ہوا تھا، اس لئے جگہ نہ تھی،

دہر چوں در دشمنی سست ست افگندم سپہر　　دشمن نامرد را من مرد میدان نیستم

دریں عشرت کہ من جاں می سپارم　　نمی گرید بہ ہر گم مادر امروز

قاصد کہ میفرستی رطل گرانش وردہ　　کز ما خبر نیابد تا بے خبر نباشد

یعنی قاصد جو بھیجنا تو خوب شراب پلوا کے بھیجنا، کیونکہ جب تک خود بیخبر نہ ہوگا، میری خبر اسکو نہ معلوم ہو سکے گی، مطلب یہ ہے کہ جب تک عشق آشنا نہ ہوگا، میرے عشق کا حال کیا جان سکے گا،

دردیارے کہ سجود خم ابرو رسم ست　　　غیر محراب کج و قبلۂ ویران مطلب

مقصد یہ ہے کہ جہاں عشق کا چرچا ہوگا، وہاں زہد و عبادت کرنا بے فائدہ ہے،

گرہ بر جبین ابرد از چہ داری　　　سر این نامۂ پیچیدہ بکشا

اگر بمعرکہ در خون فتادہ ام چہ عجب　　　ہمیشہ رزم بنجود چوں تہمتنی است مرا

ایک دقیق خیال کو ادا کیا ہے، کنایہ یہ ہے کہ میں دوسروں کی رائے پر تو غالب آجاتا ہوں لیکن خود میرا دل میرا مخالف رہتا ہے اور اُسکی خواہشوں کو مغلوب کرنا پڑتا ہے اس میں مجھ کو اکثر ناکامی ہوتی ہے اور نقصان اُٹھاتا ہوں اس خیال کو یوں ادا کرتا ہے، کہ اگر میں معرکے میں زخمی ہوں تو کیا تعجب کیونکہ مجھ کو اپنے جیسے رستم سے لڑنا پڑتا ہے، یعنی میں خود رستم ہوں اور اپنے آپ سے لڑتا ہوں،

کمر در خدمت غمے است می بندم چہ شد قدرم　　　برہمن می شدم گر این قدر زناری بستم

۷- وہ غزلوں میں کسی حالت کو مسلسل لکھتا جاتا ہے اور غزل کی غزل اسی ایک حالت کے بیان میں تمام ہو جاتی ہے، ان موقعوں پر اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ ایک، مضمون کی تمام جزئیات کو کس طرح احاطہ کرتا ہے، کس خوبی سے تسلسل بیان کو قائم رکھتا ہے، کس طرح عشق و عاشقی کی ایک ایک ادا سے واقف ہے، اسکے ساتھ رنگینی استعارات، جدت اسلوب، اور شیریں زبانی، کلام کو سحر سامری بنا دیتی ہے، مثلاً ایک غزل میں وصل کی حالت ادا کرتا ہے،

دارم درین دیار مغاں شیوہ دلبری　　　بیخود خوش و میانہ خوش و ہوشیار خوش

اس شہر میں میرا ایک معشوق ہے جسکی ادائیں مغبچوں کی سی ہیں، وہ مستی میں بھی، ہوش میں بھی، اور درمیانی حالت میں بھی خوش ادا ہے،

دستار افگند خم کاکل پراگند — کاین ست وضع صحبت و زیں ساں نگار خوش

ٹوپی اتار کر رکھ دیتا ہے اور بالوں کو بکھرا دیتا ہے، اس لئے کہ صحبت کا یہی انداز ہے اور معشوق اسی رنگ میں دلکش معلوم ہوتا ہے،

شاد و شگفتہ مطرب و ساغر طلب کند — یک سو نہد حجاب و در آید بکار خوش

خوشی سے کھل جاتا ہے اور مطرب اور شراب طلب کرتا ہے، شرم اٹھا دیتا ہے اور کام میں لگ جاتا ہے،

ہر گہ کند شتاب بہ رفتن کہ دیر شد — تسکینش دہم دلش کہ سکون و قرار خوش

جب جانے کے لئے جلدی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دیر ہوئی جاتی ہے تو میں اسکو روکتا ہوں کہ سکون اور قرار اچھی بات ہے،

تا دم زند کہ روز چہ رفت و ز ہفتہ چیست — نگذارمش شمار کہ نبود شمار خوش

جب یہ پوچھنا چاہتا ہے کہ کون سا ہفتہ ہے؟ اور دن کتنا چڑھا؟ تو میں اسکو یہ پوچھ گچھ کرنے نہیں دیتا، کیونکہ پوچھ گچھ اچھی بات نہیں،

او در وداع و من بجزع کز مے و بہار — رطلے سہ چار ماندہ و روزے سہ چار خوش

وہ رخصت ہونا چاہتا ہے اور میں روتا ہوں کیونکہ شراب اور بہار میں سے یہی دو تین پیالے اور دو تین دن مزے کے رہ گئے ہیں،

ساغر کنم لبالب و گویم سبک بنوش — در موسم بہار نہ باشد خمار خوش

میں پیالہ بھرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ آہستہ سے چڑھا جا، کیونکہ بہار میں خمار اچھی چیز نہیں،

چنداں کہ گویمش گذران ست عمر باش — گوید صبا روانہ بہ و گل سوار خوش،

میں ہر چند کہتا ہوں کہ عمر گذری جاتی ہے، ذرا ٹھہر جاؤ، وہ کہتا ہے کہ صبا کا روانہ ہونا ہی اچھا ہے اور پھول کا سفر کرنا ہی بہتر ہے،

کارے ازاں بہ پیش نظیری نمی رود — باشد باد گذاشتن اختیار خوش،

اے نظیری! اب خوشامد کچھ پیش نہیں جاتی اس لئے اب اسی کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہیئے،

ایک غزل میں یہ حالت بیان کی ہے کہ معشوق خود کسی حسین پر عاشق

ہوگیا ہے، اس حالت میں جو جو واقعات پیش آسکتے ہیں انکو بیان کیا ہے اور کس دلآویزی سے بیان کیا ہے،

چشمش برا ہے میرو مژگان ننا کش نگر | در سینہ دار د آتشے، پیراہن حیاکش نگر
دامے کہ زلف انداختہ در گردن سمینش بین | خونے کہ مژگان ریختہ بر دامن پاکش نگر

زلف نے جو جال ڈالا تھا اب خود اسکی سیمیں گردن میں ہے، مژگان نے جو آنسو گرائے ہیں اسکے پاک دامن پر پڑے ہوئے ہیں،

شرم ازمیان برخاستہ مہر از دہان برداشتہ | گفتار بے ترسش ببین رفتار بیباکش نگر

شرم اور حجاب جاتا رہا، زبان کھل پڑی، اسکی بے جھجک باتیں اور بیباکانہ رفتار دیکھنے کے قابل ہے،

از کوے معشوق آمدہ شوریدگان در حلقہ اش | از صید آہو می رسد شیران بفتراکش نگر

معشوق کی گلی سے آیا ہے اور عاشقوں کا جھرمٹ ساتھ ہے، ہرن کو شکار کرکے آیا ہے اور فتراک میں شیر ہیں

دل بردہ در دل باختن معشوق عاشق پیشہ بین | بگرفتہ در انداختن بازوے چالاکش نگر

عاشقی میں معشوق دیکھو کہ دوسرے کو دل دیتے دیتے خود اسکا دل اڑا لیا،

۸۔ نظیری نے روزمرہ اور محاورات نہایت کثرت سے برتے ہیں جس سے زباندانی میں بہت مدد ملتی ہے اسکے ساتھ اکثر محاورات وہ ایسے استعمال کرتا ہے کہ جس مطلب کو ادا کرنا چاہتا ہے بغیر اس محاورہ کے وہ اس خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہوسکتا مثالوں سے اسکا اندازہ ہوگا،

ع، طفل بودیم کہ باز از شکر و شیر شدیم | از شیر باز شدن، دودھ چھڑایا جانا،
ع، سخت است حال مشکل اگر تا سحر کشیم | حالت سخت ہے مشکل ہے کہ صبح تک بچ جاؤں،
ع، شبنم بروی بستر و نرگس بخواب گیر | بخواب گرفتن، سوتے میں جالینا،
ع، نیم بسمل شدہ بر سر پرواز ے ہست | بر سر پرواز، اڑنے کو ہے،
ع، شرح سودا ے ترا نسخہ ز سیما بر داشت | نسخہ برداشتن، کتاب کا نقل کرنا،
ع، شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد | افسانہ از افسانہ میخیزد، بات میں سے بات نکلتی ہے،

اس قسم کے سیکڑوں روزمرے اور محاورے اسکے کلام میں مل سکتے ہیں،

طالب آملی

ملک الشعرائے دربار جہانگیری

سلسلۂ تیموریہ میں یوں تو ہر فرمان روا سخن فہم و داد شناس گذرا ہے لیکن جہانگیر اس فن میں اجتہاد کا درجہ رکھتا تھا، وہ فطرۃً محبت کیش تھا اور ازل سے دردمند دل لیکر آیا تھا اسکا اثر اگرچہ اُس نے آئین و نظام سلطنت میں چنداں نمایاں نہ ہونے دیا، یہانتک کہ تزک میں نورجہان کا جہاں جہاں ذکر آیا ہے مطلق نہیں معلوم ہوتا کہ یہ نام اسکی زبان سے لذت لیکر نکلتا ہے، تاہم عشق اسکا خمیر تھا اور چونکہ فیضی کا شاگرد رشید تھا، اس لئے شعر و شاعری کا نکتہ داں اس سے بڑھ کر کون ہو سکتا تھا، شہزادگی کے زمانہ سے شعرا اسکے دربار میں ملازم رہتے تھے تخت سلطنت تو دربار شعرا سے بھرا ہوا تھا لیکن ملک الشعرائی کا تاج اس نے طالب آملی کے سر پر رکھا، جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ شاعر کس پایہ کا ہوگا' یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ اسوقت طالب کا سن ۲۰ برس سے زیادہ نہ تھا۔ اس عمر میں یہ اعزاز، خاص اسی شاعر کا کارنامۂ اقبال ہے،

طالب آمل کا رہنے والا تھا، جو مازندران کا ایک شہر ہے، بچپن میں درسی علوم و فنون کی تعلیم پائی، اور اگر اسکے دعوے پر اعتبار کیا جائے تو ۱۵، ۱۶ برس کی عمر میں اس نے مہندسہ، منطق، ہیئت، فلسفہ، تصوف اور خوشنویسی میں کمال حاصل کر لیا تھا، چنانچہ ایک قصیدہ میں لکھتا ہے،

پابردۂ میں[1] پایۂ اوج عشر اتم   واینک عدد فہم از آلات زیادات

---

[1] یعنی ابھی میں نے دوسری دہائی میں قدم رکھا ہے،

بر ہندسی و منطقی و ہیئت و حکمت | دستی است مرا کش ید بیضا ز عباد است
دیں جملہ چو طی شد نمکین علم حقیقت | کاُستاد علوم ست بریں جملہ مزاد است
در سلسلۂ وصف خط ایں بس کہ ز کلکم | ہر نقطہ سویدائے دل اہل سواد است
پوشم نسب شعر، چو دانم کہ تو دانی | کایں پایہ مرا تا من ایں سبع شداد است

گو رواج عام کے لحاظ سے اس نے یہ تمام علوم حاصل کیئے، لیکن وہ دراصل شاعری کے لئے پیدا ہُوا تھا، اس لئے اسی کو اپنا فن قرار دیا،

اس زمانہ میں مازندران کا حاکم جسکو ایران کی اصطلاح میں وزیر کہتے تھے، میر ابوالقاسم تھا اسکی مدح میں متعدد قصائد لکھے، ایک قصیدہ کا یہ مطلع ہے اور غالباً یہ پہلا قصیدہ ہے،

سحر کہ غنچہ کشاید گرہ ز پیشانی | زند دم از دم عیسی نسیم بستانی
سحر کہ طرۂ پیچاں مشک سای نسیم | بطرف عارض گلبن کند پریشانی

معلوم نہیں کہ کن اسباب سے یہاں طبیعت سیر ہوئی اور کاشان میں آیا۔ یہاں مستقل سکونت اختیار کی اور شادی بھی کرلی تذکرہ میخانہ میں لکھا ہے کہ اسکی شاعری کا نشوونما یہیں ہوا، لیکن چند روز کے بعد یہاں سے بھی برداشتہ خاطر ہو کر مرو میں آیا۔ یہ عباس صفوی کا زمانہ تھا، اور بلکش خاں صوبے کا گورنر تھا، طالب نے بلکش خاں کے دربار میں رسائی حاصل کی اور مدحیہ قصائد لکھے، دو برس تک یہاں قیام رہا بلکش خاں نے قدردانی میں کمی نہ کی ہو گی لیکن طالب ہندوستان کی فیاضیوں کا خواب دیکھا کرتا تھا، ایک مثنوی لکھ کر بلکش خاں سے وطن جانیکی اجازت حاصل کی، ابتدا میں لمبی چوڑی تمہید لکھی، پھر حرف مطلب اس طرح ادا کیا،

یکے بر حرف طالب گوش بخشا ے | صدف از ابر گوہر آغوش بخشا ے
دو سال آمد کہ از محنت کشان است | ترا چوں بوسہ فرش آستان است
بکلی کردہ از مسکن فراموش | یکے گردیدہ رندے خانہ بردوش
نہ از خویشان کند نز اقربا یاد | بدیدار تو از خویش را شاد

اگر لطف تواش دستور بخشد — چو خور کو ذرہ را نور بخشد
عناں سوے وطن تابیدہ چندی — کند خویشان خود را ریشخندی
دو روزے با غم آشنایاں سر آرد — دگر رہ سوے طوف ایں در آرد
بدیں درگہ رساند خویشتن را — ز سر بیروں کند شور وطن را

وطن کا بہانہ تو اس لئے تھا کہ ہندوستان کا نام لیتا تو اجازت کیونکر ملتی ملکش خاں سے رخصت ہوکر طالب نے سیدھا ہندوستان کا راستہ لیا اور اسوقت یہ رباعی لکھی[۱]

طالب اگل ایں چمن بہ بستہ ان بگذار — بگذار کہ می شوی پریشان بگذار
ہندو نہ برد تحفہ کس جانب ہند — بخت سیہ خویش بہ ایران بگذار

مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں کالی چیز تحفہ لیکر نہیں جاتے، اسلئے سیہ بختی یہیں چھوڑ کر چلنا چاہیئے،

میخانے کے مصنف نے جو خود طالب کا ہمعصر اور ہمصحبت تھا، لکھا ہے کہ طالب مرو سے نکل کر سیدھا قندھار پہنچا، لیکن یہ تعجب انگیز غلطی ہے قندھار جانیکا حال طالب نے خود ایک قصیدہ میں لکھا ہے، اس سے صراحۃً ثابت ہے کہ وہ ہندوستان میں برسوں رہ کر قندھار گیا ہے، چنانچہ تفصیل آگے آتی ہے،

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اول جب وہ ہندوستان میں آیا تو یہاں اس کو کامیابی نہیں ہوئی، اور اسوجہ سے وہ تمام مشہور مقامات میں بہ تلاش معاش پھرتا رہا، دلی، لاہور، ملتان، سرہندان مقامات کا ذکر اس نے بہ تخصیص لیا ہے لاہور میں زیادہ دل لگا۔ چنانچہ لاہور کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے، جسکے چند اشعار یہ ہیں،

گمانم نیست کاندر ہفت کشور — بود شہرے بہ آب و تاب لاہور
میان بکشاد خوش واکش کہ در ہند — فراغت نیست جز در خواب لاہور

---

[۱] تذکرہ میخانہ،

یہاں اس نے شاہ ابوالمعالی کی خدمت میں بیعت حاصل کی چنانچہ کہتا ہے

کنم زاں رو مرید آسا شب و روز | کرامتہا بیان در باب لاہور
کہ پیر و دستگیر و مرشد من | یکے قطب است از اقطاب لاہور
خدایا زندۂ جاوید دارش | بہ آبِ خضر یعنے آبِ لاہور

ان شہروں میں وہ رندانہ وضع سے رہا اور خرمنِ حسن کی خوشہ چینی کرتا رہا خوش قسمتی سے حسینوں نے بھی اپنے پہلو میں اسکو جگہ دی، چنانچہ جب ہندوستان چھوڑ کر قندھار جانے لگا ہے تو جس گرمجوشی سے ان فتنہ گروں نے اسکو روکا ہے، اسکی تصویر اس طرح کھینچی ہے،

نگارانِ لاہور و خوبانِ دہلی | بدل کردہ بودند پیوند جانم
یکے چہرہ سودے بچشم رکابم | یکے بوسہ دادے بزلفِ عنانم
فشاندی یکے در بغل، یاسمینم | نہادے یکے در دہان برگِ پانم
غزالانِ ملتان بہ نیرنگ سازی | کہ بندند از غمزہ دست و دہانم
من از جملہ چوں نکہتِ گل گریزاں | کہ خود را بہ بزمِ ہمایوں رسانم

اس زمانہ میں غازی خان وقاری امرای جہانگیری میں نہایت ممتاز تھا اسکا باپ مرزا جانی سنہ ۱۰۰۰ھ ہجری میں اکبر کے حکم سے ٹھٹہ کا صوبیدار مقرر ہوا تھا، سنہ ۱۰۰۸ھ میں جب اسکا انتقال ہوا تو غازی خان باپ کا جانشین ہوا جہانگیر نے اپنے عہد سلطنت میں اسکو قندہار کا گورنر مقرر کیا، اور سندھ کا علاقہ جاگیر میں دیا، وہ نہایت قابل اور دریا دل تھا، اکثر اہل کمال، مثلاً اسد قصہ خوان مرشد بروجردی، میر نعمت اللہ وغیرہ نے اسکے دامن تربیت میں تعلیم پائی ہے ایران سے جو اہل کمال ہندوستان کا رخ کرتے تھے، انکی پہلی منزل اسی کا آستانہ ہوتا تھا،

شاعری میں، مشہور شعرا کا ہم پلہ تھا، وقاری تخلص کرتا تھا، پانچ ہزار شعر دل کا دیوان یادگار میں چھوڑا، میخانہ میں اسکے ساقی نامہ کے بہت سے اشعار

نقل کئے ہیں، غزل کا یہ رنگ ہے،

در عہدِ تو ما را ہمہ با غیر خطاب است ‌‌ سر پنجۂ مژگان و گریبان عتاب است
گریہ ام گر سبب خندۂ او شد چہ عجب ‌‌ ابر ہر چند کہ گرید رخِ گلشن خندد
کجا رفت یک دو سہ ہمدم کہ ہمچو موسیقار ‌‌ نشستہ پہلوے ہم بر کشیم آوازے

غرض اسکی قدر دانی کی شہرت نے طالب کو قندہار جانے پر مجبور کیا، پہلے ایک قصیدہ لکھ کر بھیجا جس میں حاضری کی استدعا کی، تمہید کے بعد اصل مطلب اس طرح ادا کیا،

یکے بلبل بے پر و بالِ شوقم ‌‌ کہ محرومی از طوفِ گلزار دارم
درین خستہ آبادی روے ماندن ‌‌ نہ سامان یک گام رفتار دارم
ندانم چرا یا رب این سان خرابم ‌‌ چو لطف خداوند، معمار دارم
صف آراے تیغ و قلم خان غازی ‌‌ کہ لب در ثنایش گہر بار دارم
بلند آفتابے کہ دور از رکابش ‌‌ برخ کوکب اشکِ سیار دارم
جدا از آستانش ز اشکِ دمادم ‌‌ سر آستین رشکِ گلزار دارم

آگرہ[1] سے لاہور، ملتان ہوا قندہار پہنچا، چونکہ برسات کے دن تھے راستہ میں بہت تکلیف اٹھائی، ملتان میں چار مہینے قیام کرنا پڑا، چنانچہ پہلا قصیدہ جو غازی خاں کے دربار میں پیش کیا ہے، اس میں یہ تمام حالات لکھے ہیں،

خدائے داند و من بندہ کاندریں مدت ‌‌ چہا کشیدہ ام از جادثات دورانی
دریں سفر کہ نصیبم مباد دیگر بار ‌‌ بگو نہ گونہ غمم بود صحبت جانی
تراختلاطی باران برشگالے را ‌‌ ز من مپرس کہ این قصہ نیست پایانی
ز اگرہ تا بخیابان گلشن لاہور ‌‌ رفیق بودم با ابر ہاے بارانی
بعزم ملتان چون رورقے شدم چو ہلال ‌‌ زد از سر شکم نیلاب (دریا کا نام ہے)، کوس عمانی
ز رشک ملتان نزدیک شد بداں کہ مرا ‌‌ بدل شود لقب آملی بہ ملتانی

---

[1] آگرہ کو ایرانی شعرا ہمیشہ اکرہ لکھتے ہیں،

دراں مضیقِ ملالت، چہار سر بودم ۔۔۔ بسانِ مُہرہ بششدر تمام حیرانی

غازی خاں نے خاطر خواہ قدر دانی کی اور مقربانِ خاص میں داخل کیا، طالب نے بہت سے پر زور قصیدے اس کی مدح میں لکھے ہیں، جس میں مداحی سے گذر کر عاشقی کا دعوے کیا ہے،

تکلف نیست معشوقِ من ست اونیست ممدوحم ۔۔۔ ازاں این شعر عشق آمیز، در مدحش سرائیدم

بدقسمتی سے غازی خان ۱۰۲۱ھ میں جبکہ اسکی عمر صرف ۲۵ برس کی تھی اپنے ایک غلام کے ہات سے مسموم ہُوا، طالب کے لئے اب کوئی ٹھکانا نہ رہا، مجبوراً اُس نے پھر ہندوستان کا رخ کیا اور آگرہ میں آیا[1]، خواجہ قاسم دیانت خاں نے جو امرائے جہانگیری میں حضور رس تھا، اسکی قدر دانی کی اور عبد اللہ خاں فیروز جنگ کے نام جو اسی سنہ میں گجرات کا حاکم مقرر ہوا تھا، اسکی سفارش میں خط لکھا، عبد اللہ خاں نے خط بھیجکر بُلایا طالب نے اس واقعہ کو بڑے فخر اور ناز سے لکھا ہے

صبا رفتار پیکے، در طلوعِ صبحِ نورانی ۔۔۔ بگوشم زد صدائے زنگ[2] چوں بانگِ سلیمانی

زسیر آہنگی آں نغمہ مست از جائے بر جستم ۔۔۔ بہر جانب نگاہے تاختم از روے حیرانی

یکے باد غبار آلودہ بر در، جلوہ گر دیدم ۔۔۔ عرق ریزاں چو مروارید اش از اطرافِ پیشانی

(یعنی قاصد)

دویدم پیش و گفتم خیر مقدم، وانگہ افشاندم ۔۔۔ بپایش مشتے از ناسفتہ گوہر ہائے مژگانی

گلاب آوردم و پیشانیش از گرد رہ شستم ۔۔۔ دریغا کاش بودے قدرتم بر آبِ حیوانی

بپایش آشنا کردم لبے وز گرد نعلینش ۔۔۔ نمودم سرمہ دانِ دیدہ بر کُحلِ صفاہانی

پس از وے باہزاراں شوق ہیتا بانہ پرسیدم ۔۔۔ کہ اے جاروبِ راہت شہپر مرغِ سلیمانی

لبت آبستنِ رمزے ست گویا مژدہ داری ۔۔۔ کہ می بارد ز رویت ہمچو گل آثار خندانی

چو بشنید این سخن بکشود لب ناگاہ چوں طوطی ۔۔۔ زبان را چاشنی داد از ادائے شکر افشانی

بگفت ای عندلیبِ گلشنِ معنی کہ بربادت ۔۔۔ قدح نوشند خوش طبعانِ ایرانی و تورانی

---

[1] آگرہ میں آنے اور قاسم خاں کی سفارش کا حال میخانہ میں لکھا ہے،

[2] زنگ گھونگرو کو کہتے ہیں اس زمانے میں ڈاک کے ہرکارے گھونگرو باندھ کر چلتے تھے یہ اُسکی طرف اشارہ ہے،

بشارت باد کا نیک با ہزاراں مژدہ آوردم | خطِ آزادیِ مرغِ دولت از دامِ حیرانی
درِ اثنائے تکلم کاغذیں دُرجے پُر از گوہر | ہوس دید و بدستم داد از بردے ردش دانی
من آں منشور دولت چوں بدست خویشتن دیدم | شدم سرتا قدم بہر سجود شکر پیشانی
بسوئے قبلۂ گجرات رو تسلیم ہا کردم | بہ آدابے کہ برہمن کردگردوں آفریں خوانی
پس از تسلیم بکشودم زعنوان مہر مشکینش | چو دیدم آفتابے چند در جلباب ظلمانی
شدم شاداب تر چوں مہر عنوان را رقم دیدم | بنام نامیِ سرچشمۂ توفیق یزدانی
سحاب فیض عبداللہ خاں آں مظہر احساں | کہ نے بحرے ز دست ہمتش جاں برد، نی کانی

طبیعتوں کا اختلاف دیکھو! عرفی کو خود جہانگیر نے قاصد بھیجکر بلایا تھا لیکن وہ قاصد کی نسبت اس قدر کہہ کر رہ گیا،

کہ ناگہاں ز درم در رسید مژدہ دہے | چناں کہ از چمن طالعم بہ مغز شمیم

بخلاف اسکے طالب ایک معمولی امیر کے ہرکارے کے پاؤں چومتا ہے اسکی پیشانی کی گرد گلاب سے دھوتا ہے، اور حسرت کرتا ہے کہ آبحیات کہاں سے لاؤں

عبداللہ خاں نے حد سے زیادہ طالب کی عزت کی، اور انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا[1]، طالب نے عبداللہ خاں سے درخواست کی کہ آپ دربار میں جائیں تو مجھکو بھی ساتھ لیتے چلیں، چنانچہ ایک قصیدہ میں کہتا ہے،

آسمان قدرا چو داری در خیال | عزم درگاہِ شہنشاہِ زمان
وز جوان مردانِ ایرانی سپاہ | برگزیدہ ستی چہل شیر ژیان
گرچہ من در جرگۂ شیران نیم | لیک از اخلاص دارم چشم آں
کز نظر چوں بگذرد تفصیل اسم | نام طالب نیز باشد در میان

غالباً عبداللہ خاں سے یہ خدمت انجام نہ ہو سکی اس لئے طالب نے اور تدبیریں اختیار کیں،

شاپور طہرانی ایک مشہور شاعر تھا، وہ نورجہاں بیگم سے قریبی قرابت رکھتا

---

[1] میخانہ: ۱۳۰

تھا، یعنی اسکا باپ اعتماد الدولہ کا جو نور جہان بیگم کا باپ تھا، حقیقی چچا تھا، وہ تجارت کرتا تھا اور اکثر اعتماد الدولہ کے ہاں اس تقریب سے آمد و رفت تھی، طالب نے شاپور سے راہ و رسم پیدا کی، لاہور میں اس سے جا کر ملا، ایک غزل میں اس واقعہ کا ذکر بھی کیا ہے،

بحمد اللہ کہ در ملک سخن دستور را دیدم ۔۔۔ ہماں رشک عطار و شاعر مشہور را دیدم
بخسرو داشتم روے نیاز ے در سخن طالب ۔۔۔ از و در سوختم چوں صنعت شاپور را دیدم
چہ خوش حالم کہ بعد از مدت یکسالہ مہجوری ۔۔۔ خوش و خوشوقت او را دیدم و لاہور را دیدم

غرض شاپور کے ذریعہ یا کسی اور تحریک سے اعتماد الدولہ کے دربار میں رسائی ہوئی اعتماد الدولہ نے اسکو دامن تربیت میں لیا اور خاص توجہ مبذول کی، تذکرہ میخانہ میں لکھا ہے، کہ جہانگیر کے دربار میں اعتماد الدولہ ہی نے اس کی تقریب کی، لیکن اور تذکروں اور دیگر قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ اول اول اسکو دیانت خان نے دربار میں پیش کیا، جو جہانگیر کی خدمت میں خاص تقرب رکھتا تھا، جہانگیر کے سامنے اس نے طالب کی اس قدر تعریف کی کہ جہانگیر نہایت مشتاق ہوا، دیانت خاں خود ساتھ لیکر گیا، لیکن طالب نے حماقت سے چلتے ہوئے مفرح[1] کا استعمال کیا، جس سے اسکے حواس جاتے رہے،

جہانگیر نے مہربانی سے باتیں چاہیں، لیکن طالب پتھر کی تصویر تھا، دیانت خاں کو سخت ندامت ہوئی، طالب گھر پر واپس آیا تو اسکی معذرت میں فی البدیہ ۵۷ شعروں کا ایک قطعہ لکھ کر دیانت خان کی خدمت میں بھیجا مدح کے بعد جہاں سے اصل مطلب شروع کیا ہے اس موقع کے چند اشعار یہ ہیں،

---

[1] یہ ایک معجون تھا جو شراب کے بجائے استعمال کیا جاتا تھا اور محتاط اسکو شراب کے بجاے کام میں لاتے تھے، کلیم نے اسی کی طرف اس قطعہ میں اشارہ کیا ہے،

بلند قدر امہ گشتگان وادی غم ۔۔۔ مفرحے پے دفع ملال می خواہند
چو بادہ بے تو حرام است زاں نمی طلبند ۔۔۔ حرام عیشان کیف حلال میخواہند

چہ لطفہا کہ نمودی و می نمائی نیز بہر غریب و مسافر علی الخصوص بمن
نخست آں کہ چو در غربتم نظر کردی بہ مہر بردی از خاطرم ہوائے وطن
چہارم آں کہ بہ بزم شہنشہم بردی چو دل بہ پہلوی، خود ساختی مرا مسکن
بپادشاہم سرگرم گفت و گو کردی بہر دیدمی خفاش، را حریف سخن
تو آنچہ باید کردی ولیک طالع شوم بدستیاری گردوں نفاق زد با من
بہ نسبت نطق مرا بخت بد وزاں بستن کشود بر من، ہم دوست طعنہ ہمہ دشمن
گر امکان کہ چو من استعارہ پردازی بصد زبان فصاحت بیان شود اللہ الکن
گر اگمان کہ فتد رشتۂ کلام مرا چو تارِ زلفِ عروسان شکن بروے شکن
ازیں قیاس نما، غور کن، کہ قدرت کیست؟ بیک دو لحظہ چنیں قطعہ ادا کردن
دو چیز مُہر زبان سخنوری گردید مرا بہ بزم شہنشاہ خوش عیار سخن
یکے زبونی طالع کہ دایم از اثرش بہر دیار قریبم بہ گونہ گونہ محن
دگر زیادتی نشۂ کہ نامشس را نمی توانم از شرم برلب آوردن
ادا صریح کنم تا گمان مے نبری چرا کہ شُستہ ام از دی بہفت آب دہن
مفرحے زدہ بودم بہ قصد گفتن شعر عروج نشۂ آں کرد ہرچہ کرد بمن
بہ بزم بادشہم زاں زباں نمی گردید کہ گشتہ بود مرا خشک از زبان و دہن
سخن شناسا! پیش تو چوں برآرم سر کز انفعال سرم غوطہ خورد در گردن
نہ کردہ جرم مرا عفو کن بہ لطف عمیم کہ خوش نما است خطای نکردہ بخشیدن
من ارچہ بیگنہم بخت من گنہگار است گناہ بخت مرا لطف کن، بہ بخشش بمن

اعتماد الدولہ نے طالب کو مُہر داری کی خدمت سپرد کی، یہ خدمت اگرچہ ایک معزز خدمت تھی، لیکن طالب شاعری کے سوا اور کسی کام کا نہ تھا۔ چونکہ بیدلی سے اس کام کو انجام دیتا تھا اس لئے ایسی بے عنوانیاں اس سے سرزد ہو جاتی تھیں کہ اسکو شرمندہ ہونا پڑتا تھا، آخر اس نے ایک قصیدہ لکھ کر اعتماد الدولہ کی خدمت میں پیش کیا، اور اس خدمت سے مستعفی ہو گیا، قصیدہ کے چند اشعار

یہ ہیں،

دو زہرست در ساغرم ہر دو قاتل — دو زخم است بر سینہ ام ہر دو کاری

یکی آنکہ بیخواہش نفس، دکوشش — بر ویم شگفت این گل شرمساری

دگر آں کہ شد رنجہ یارے کہ با من — زدے مو بموئیش دم از دوستداری

نیم از اہل دیوان بدفتر چہ کارم — مرا شاعری زیبد و می گساری

بمن خدمت مدح فرمودن اولے — کہ بس عاشقم بر جواہر نثاری

نہ چسپد بر اہل سخن، شغل دنیا — چو بر پیر میخانہ پرہیز گاری

زشاعر ثنا سنجی آید نہ خدمت — کہ بلبل نواخوان بود نہ شکاری

خصوصاً چو من شاعرے کز تجرد — بہ روحانیان زیبدم ہم قطاری

منت بندۂ داغدار قدیم — بخادم کنون مُہر خود می سپاری

چو مہر تو دارم چہ حاجت بمُہرم — مرا مِہر داری بہ از مُہر داری

حق این است اما ز جرمی کہ رفتہ — ہمہ انفعالم، ہمہ شرمساری

ہمیں خجلتم دور دارد ز خدمت — چو ابلیس مجرم ز درگاہ باری

دگرنہ ہماں طالب حق شناسم — ز سر تا قدم شوق خدمتگذاری

اعتماد الدولہ نے اس کی تقریب دربار شاہی میں کی، جہانگیر نے بلا کر زمرۂ شعرا میں داخل کیا۔ اور سنہ ۱۰۲۰ھ میں ملک الشعرائی کا خطاب عنایت کیا، چنانچہ خود تزک میں لکھتا ہے،

دریں تاریخ طالب آملی بخطاب ملک الشعرائی خلعت امتیاز پوشیدہ اصل او از آمل ست، یک چندے بہ اعتماد الدولہ می بود، چوں رتبہ سخنش از ہمگنان درگذشت در سلک شعرائے پایۂ تخت منتظم گشت، این چند بیت از وست،

اس کے بعد طالب کے چند اشعار نقل کئے ہیں، جو آگے مناسب موقع پر درج کئے جائیں گے۔

جہانگیر کے دربار میں اس نے اخیر زندگی تک نہایت عزت و احترام سے بسر کی صرف ایک موقع ایسا پیش آیا کہ کسی بات پر جہانگیر ناراض ہو گیا، اور طالب چند روز تک شرف حضور سے محروم رہا، ایک قصیدہ میں اس واقعہ کو نہایت لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے،

بہ نسبت گہرم دادہ بودی از کف خویش
مجھ کو موتی سمجھ کر تو نے پھینک دیا تھا

تراز جود زیانے چنیں ہزار افتاد
سخاوت کیوجہ سے تو نے ایسے نقصان بہت اُٹھائے ہیں

چو دور شدم زکفت چرخم از ہوا بربود
جب تو نے مجھکو پھینکدیا، تو آسمان نے اٹھالیا

بہ گرمے کہ ز بانم بزینہار افتاد
اس گرمجوشی کے ساتھ کہ خود میں پناہ مانگنے لگا،

یکے مقابل خورشید داشت آئینہ ام
تھوڑی دیر تک آسمان نے میرے آئینہ کو آفتاب کے سامنے رکھا

بدید کز عرقش موج بر عذار افتاد
اور دیکھا کہ آفتاب کے چہرے پر پسینہ آگیا

چو پیش مشعل مہ بر دشب چراغ مرا
پھر چاند کے مشعل کے سامنے کیا،

بچہرہ گونہ کاہیش شمع دار افتاد
اس کا چہرہ شمع کی طرح زرد پڑ گیا،

ازیں نشاط مگر دست آسمان لرزید
اس خوشی سے آسمان کا ہات کانپا

کہ باز در کف خاقان کامگار افتاد
اور دوبارہ میں بادشاہ کے ہات میں آکر گرا

کنوں برشتہ مہرش بدار کز تقدیر
اے بادشاہ! اب مجھکو محبت کی لڑی میں پرُوئیے

دو بار در کف ایں دُر شاہوار افتاد
کیونکہ دو دفعہ یہ موتی تیرے ہات سے گر چکا،

طالب نے ۱۰۳۶ھ میں یعنی جہانگیر کے مرنے سے ایک برس پہلے عین شباب میں وفات پائی،

عزیزہ و اولاد طالب کی بہن تھی جسکا نام ستی النسا تھا جسکو طالب ماں کی برابر سمجھتا تھا، اسکو طالب کے ساتھ اس قدر محبت تھی کہ صرف اس سے ملنے کے لئے ایران سے آگرہ میں آئی۔ طالب اسوقت جہانگیر کے ساتھ دورہ میں تھا، بہن سے ملنے کے لئے اجازت طلب کی اور یہ قطعہ لکھ کر پیش کیا،

صاحبا! ذرہ پرورا! عرضے — بزبان سخن وراست مرا

پیر ہمشیرہ الیست غم خوارم | کہ بادمہر مادر است مرا
چاردہ سال بلکہ بیش گذشت | کز نظر دور منظر است مرا
دور گشتم ز خدمتش بعراق | وین گنہ جرم منکر است مرا
او نیاورد تاب دوری من | کہ بہ مادر برابر است مرا
آمد اینک بہ آگرہ وز شوقش | دل طپاں چوں کبوتر است مرا
می کند دل بسوئے او آہنگ | چہ کنم شوق رہبر است مرا
گر شود رخصت زیارت او | بہ جہانے برابر است مرا

اس کی شادی نصیرای کاشی سے ہوئی تھی جو میرزا صائب کے استاد مسیح کاشی کا حقیقی بھائی تھا۔ نصیرا کی وفات کے بعد ستی النساء ممتاز محل (زوجہ شاہجہان) کی پیش خدمت مقرر ہوئی، چونکہ نہایت قابل، خوش تقریر، اور خانہ داری کا خاص سلیقہ رکھتی تھی، اسکے ساتھ علم طب میں اسکو مہارت تھی ممتاز محل نے اسکو مہرداری کی خدمت سپرد کی، فارسیت اور فن قرأت کی واقفیت کی وجہ سے جہاں آرا بیگم کی تعلیم بھی اسکے متعلق کی گئی، ممتاز محل کے مرنے کے بعد شاہجہان نے اسکو حرم شاہی کا صدر کل یعنی مدار المہام مقرر کردیا طالب کے اولاد ذکور نہ تھی، دو لڑکیاں تھیں، ستی النسا نے ماں کی حیثیت سے پالا، بڑی کی شادی عاقل خاں اور چھوٹی کی ضیاء الدین خاں سے کی، ستی النسا چھوٹی لڑکی کو بہت چاہتی تھی، ۲۰ سنہ جلوس مطابق ۱۰۵۶ھ شاہجہانی میں اس نے بمقام لاہور وفات پائی، ستی النساء اس کے ماتم میں سوگ نشین ہوئی، شاہجہان نے خود اسکے پاس جاکر ماتم پرسی کی اور محل میں ساتھ لایا، لیکن ستی النسا کو ایسا سخت صدمہ پہنچا تھا کہ حرم سے واپس آکر اسی دن مرگئی، شاہجہان نے دس ہزار روپے تجہیز و تکفین کے لئے عطا کئے اور حکم دیا کہ لاش محفوظ رکھی جائے، تاج محل کی قبر کے پچھم جانب جلوخانہ سے متصل تیس ہزار روپے کی لاگت سے مقبرہ کی تیاری کا حکم دیا، جو سال

بھر ہیں بن کر تیار ہوا، کچھ اوپر ایک سال کے بعد لاہور سے لاش منگوا کر مقبرہ میں دفن کی اور مقبرہ کے اخراجات کے لئے ایک گاؤں عطا کیا، جس کی سالانہ آمدنی تیس ہزار روپے[1] تھی،

تیموریوں کی یہی شاہانہ قدردانیاں تھیں جنھوں نے انکے آستانے کو دنیا کے اہل کمال کا قبلۂ حاجت بنا دیا تھا،

عام حالات و اخلاق و عادات

عبدالنبی فخر الزمانی جو تذکرہ میکدہ کا مصنف اور طالب آملی کا معاصر تھا، اسکے حالات میں لکھتا ہے،

آں بلبل دستان سرا، درہماں سال کہ ۱۰۲۰ھ بود بدار الخلافت آگرہ آمد ایں ضعیف را مرتبۂ اول در ہند دراں ایام باو ملاقات واقع شد جوانی دید، بہ انواع ہنر آراستہ، چناں خلیق و زود آشنا کہ دریں فن نیز عدیل نداشت در مثنوی دو سہ بیت در دوست آشنائی خود بیان فرمودہ حقاکہ حالی اوست و دراں تکلفے نہ کردہ، آں ابیات این است،

کتب طے کردہ ام در دوستداری	یکے علامہ ام در علم یاری
سزد آناں کہ علم مہر دارند	دریں فنم وحید الدہر خوانند
نباشد بیوفائی در بساطم	دفا یک گل بود از اختلاطم

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ طالب نہایت دوست پرور، دفا شعار اور خوش اخلاق تھا، زمانہ کی ضرورتوں نے اگرچہ اُس سے در در کی خاک چھنوائی یہانتک کہ شیدا نے اسکی ہجو میں کہا،

شب و روز مخدوم نا طالبا	پے جیفۂ دنیوی در تگ است
مگر قول پیغمبرش یاد نیست	کہ دنیا است مردار طالب[2] سگ است

---

[1] یہ پوری تفصیل مآثر الامرا جلد دوم صفحہ (۹۱) و (۹۲) میں ہے،

[2] الدنیا جیفۃ وطالبھا کلاب، کی طرف اشارہ ہے،

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرتاً غیور اور خود دار تھا، غازی خان کے دربار میں پہنچ کر اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ پھر کسی کے آگے کبھی ہاتھ نہ پھیلائیگا لیکن اسکی بدقسمتی تھی کہ غازی خان جوانا مرگ ہو گیا،

عبد اللہ خاں ناظم گجرات نے اسکی قدردانی میں کمی نہیں کی، لیکن صحبت بے میل تھی، عبد اللہ خاں کو شعر و شاعری سے کچھ لگاؤ نہ تھا، اسلئے وہ طالب کی سرپرستی لازمۂ امارت کی حیثیت سے کرتا تھا، اور طالب اسکو پسند نہیں کرتا تھا، اعتماد الدولہ نے خود جہانگیر کے دربار میں پہنچایا اور بہت سے چکر کھا کر اب وہ اصلی مرکز پر آیا،

طالب نے ہر موقع پر اپنی آن قائم رکھی، اعتماد الدولہ کے نام اس نے ایک منظوم خط لکھا ہے، اس میں لکھتا ہے کہ شاعری دو قسم کے لوگ اختیار کرتے ہیں، ایک وہ پست ہمت جو پیشہ کی حیثیت سے اس کام کو کرتے ہیں، دوسرے وہ عالی طبع جنکو فطرتاً خدا نے شاعر بنایا ہے،

دو صنف اند اہل طبیعت کہ ہر یک — ندارند باہم سر سازگاری
یکے را فرومائگی کرد شاعر — یکے را بزرگی و عالی تباری
یکے اضطراری است انشای نظمش — یکے راست شغل سخن اختیاری
یکے را علو طبیعت بجائے — کہ دزدد، سراز سایۂ تاجداری
یکے آنچناں پست فطرت کہ بالد — بخود از خطاب فصاحت شعاری
یکے راطمع گشتہ ہادی ایں راہ — یکے را جوانی وہنگامہ داری

ان دونوں قسموں کی تفصیل لکھ کر پوچھتا ہے،

گدا شاعر و میرزا شاعرے ہست — ندانم مرا بر چہ ہنجار داری

یعنی دو قسم کے شاعر ہوتے ہیں "گدا" اور "میرزا" فرمائیے آپ مجھکو کس قسم میں شمار کرتے ہیں؟ پھر خود جواب دیتا ہے،

من از شاعری شکر للہ کہ دارم — بہ بخت بلند تو امیدواری

کہ گر ہر یک دانہ یاقوت گردد
درو بینم از چشم بے اعتباری

بہ گلزار معنی ہزار فصیحم
بہ منصب چہ شد نیستم گر ہزاری

ز آزادگانم تعلق ندانم
مرا نیست با اہل شیوہ کاری

جہانگیر نے ایک دفعہ نشہ کے ترنگ میں حکم دیدیا تھا کہ مقربان خاص ڈاڑھی ترشوا کر شریک صحبت ہوں، طالب اس حکم کی تعمیل سے سرتابی کی اور گھر میں بیٹھ رہا، پھر ایک قطعہ لکھ کر بھیجا جس میں غیر حاضری کی یہ معذرت کی،

تراشید گانند یک سر سپاہ
کسے را چو من تیرہ پُر کاہ نیست

بہ بزمے کہ موے نہ گنجد درد
شدن با دو گز ریش دلخواہ نیست

بہشت است بزم تو و در بہشت
من ناتراشیدہ را راہ نیست

یعنی ایسی محفل میں جہاں ایک بال کی گنجائش نہیں، دو گز کی ڈاڑھی لیکر جانا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا، آپ کی محفل بہشت ہے، اور بہشت میں مجھ ناتراشیدہ کا گذر نہیں ہو سکتا، پھر ایک اور قطعہ لکھا،

سفر می کنم صاحبا[۱] ورنہ من
چہ سرو رنہ گردن تراشیدمی

بنا خن نہ از تیغ، از روے خویش
من ایں مشت سوزن تراشیدمی

سر و ریش وابرو بروت و مژہ
برسم برہمن تراشیدمی

ہر آں کو تراشید پیش از ہمہ
از و پیشتر من تراشیدمی

چو من راہیم خارج از رسم تو
کہ مو وقت رفتن تراشیدمی

---

[۱] مولوی غلام علی آزاد نے خزانۂ عامرہ میں لکھا ہے، کہ اکبر نے ہندوؤں کی طرح آتش پرستی اور ریش تراشی اختیار کرلی تھی، جہانگیر نے بھی باپ کی تقلید کی، اور اسی حیثیت سے طالب کو بھی داڑھی ترشوانے کا حکم دیا لیکن جہانتک ہمکو معلوم ہے، اکبر اور جہانگیر کسی عزیز کے مرنے کے وقت ڈاڑھی کا صفایا کراتے تھے، جسکو ہندی زبان میں بھدرا کہتے ہیں، دربار کے خوشامدی بھی اس موقع پر بادشاہ کی تقلید کرتے تھے، طالب کو بھی اسی موقع پر حکم ہوا ہوگا، ورنہ ڈاڑھی ترشوانا تو خود ایرانیوں کا عام شعار تھا، جو آج بھی تمام ایران میں جاری ہے شیعہ لوگ ہندوستان میں بھی خشخاشی داڑھی رکھتے ہیں، طالب اس سے کیوں انکار کرتا،

منشی فیروز ۱۰۲۹ھ میں طالب سے ملا تھا اس نے ملاقات کے جو واقعات لکھے ہیں ان سے طالب کی طرز زندگی کی دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں، اس لئے ہم اُسکا خلاصہ لکھتے ہیں،

۱۰۲۹ھ میں جب بادشاہ فتح پور میں آیا تو مجھکو طالب کی ملاقات کا شوق پیدا ہوا، تالاب کے کنارے ایک خیمہ تھا، طالب اس میں مقیم تھا، میں گیا تو دیکھا کہ گویا اعتکاف میں ہے، سامنے دیوان کے اجزا ہیں، مصافحہ و معانقہ کے بعد پوچھا کیونکر تشریف لانا ہُوا میں نے کہا آپکے چند شعر سُنے تھے، اُن کو سُن کر ملاقات کا شوق ہُوا پوچھا کیا شعر تھے، میں نے یہ شعر پڑھے،

ع لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی ع مژہ در جہاں نمی بینم

جب یہ شعر پڑھا،

مردُم زرشک چند بہ بینم کہ جام مے لب بر لبش گذارد و طالب تہی کند

تو اُچھل پڑا۔ اُٹھ کر گلے لگایا، میرے ذوق سخن کی نہایت تعریف کی، میری کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا کمر بند کھول ڈالئے اور آرام سے تشریف رکھیئے کہ ایک دو دن لطف سے گذریں،

عین اسی حالت میں ایک مغل آگیا، جسکے ہاتھ میں خاقانی کا دیوان تھا، اور طالب سے پڑھنا چاہتا تھا، طالب نے کہا آج معاف رکھو، مدت کے بعد ایک درد آشنا ملا ہے، اس سے لطف صحبت اُٹھائینگے لیکن مُغل کب مانتا تھا، دیوان کھول کر یہ قصیدہ پڑھنا شروع کیا،

در پردۂ دل آمد آہن کشاں خیالش جاں شد خیالبازی در پردۂ وصالش
در مرکز مثلث بگرفتہ ربع مسکوں فریاد اوج مریخ از تیغ مہ صقالش

طالب نے اس شعر کے معنی بیان کئے تو چونکہ علمی استعداد نہ تھی، اناپ شناپ باتیں کہنی شروع کیں، مجھ کو بے اختیار ہنسی آگئی، طالب نے جھلا کر کہا کہ اس

قسم کے اشعار کو تم لوگ ہندوستان میں درس کے قابل سمجھتے ہو، میں ایسے شعر ناخن پا سے لکھتا ہوں، میں نے کہا شاعری اور چیز ہے اور سخن فہمی اور چیز، طالب مکدر ہو کر چُپ ہو گیا، مجھکو بھی ملال ہُوا کہ ناحق میں نے اسکا دل دکھایا، اُسکے خوش کرنے کو میں نے اور سلسلہ چھیڑ دیا اور کہا کہ کل دربار میں آپکے کس شعر پر لوگ معترض تھے، طالب نے کہا یہ شعر تھا،

عنبر افسردہ ام در پردہ دارم بوی خوش،

اسپر آصف خان نے اعتراض کیا کہ عنبر کو افسردہ نہیں کہہ سکتے، اور لوگوں نے بھی اسکی تصدیق کی، میں نے کہا کہ خاقانی نے پتھر کو افسردہ کہا ہے پھر عنبر نے کیا قصور کیا ہے، خاقانی کا شعر یہ ہے،

کز فیض او بہ سنگ فسردہ رسد نما،

طالب نہایت خوش ہوا، اور مجھ سے کہا کہ اس شعر کو ایک پرچہ پر لکھد یجئے[1]

شاعری اس امر میں طالب تمام شعرا سے ممتاز ہے کہ وہ فطرتاً شاعر تھا، یعنی جب نہایت کمسن تھا، اسوقت سے شعر کہتا تھا، ایک قصیدہ جو کلیات میں موجود ہے اسوقت کا ہے جب تقریباً اس کی عمر ۱۲-۱۳ برس کی تھی، خود اس بات پر فخر کرتا ہے، اور کہتا ہے،

غیر کلک من نشان ندہد کسے کز آب شعر دفتر اسلاف شوید کو دکے دی پریر

یعنی میرے قلم کے سوا اسکی کوئی مثال نہیں مل سکتی، کہ کل کا لونڈا پچھلوں (کل پرسوں) کے کارناموں پر پانی پھیر دے،

وہ نہایت جلد شعر کہہ سکتا تھا۔ اکثر ایسا ہُوا ہے کہ اُس نے قلم ہاتھ میں لیا اور بے تکلف لکھتا گیا، دو تین گھنٹے میں ۵۰، ۶۰ شعروں کا قصیدہ تیار ہو گیا، قلیچ خان ناظم لاہور کی شان میں ۴۰ شعروں کا قصیدہ ایک

[1] تذکرہ شعرا از احمد علی سندیلوی ذکر طالب آملی،

رات میں لکھا، چنانچہ خود کہتا ہے،

منم کہ نیست چومن شاعرے زاہل سخن | منم کہ نیست چومن قابلے ز اہل کلام
گواہ ایں دو سخن ہمیں قصیدہ بس است | کہ یافت از سر شب تا سپیدہ دم اتمام

جہانگیر کی مدح میں اسکا ایک بڑا پر زور قصیدہ ہے جس میں ۵۰، ۶۰ شعر ہیں،

چو شہسوار مرا چشم بر شکار افتاد | بزخم تیر نگہ، صید بے شمار افتاد

یہ بھی صرف رات بھر کی کمائی ہے، چنانچہ خود کہتا ہے،

بہ خام دستیم اے شہریار خردہ مگیر | کہ یک شب ایں ہمہ نقشم بروے کار افتاد

پہلی دفعہ جہانگیر کے دربار میں ناکامی کے بعد جو قطعہ دیانت خان کو لکھا تھا، وہ بھی بالکل قلم برداشتہ تھا۔ خود کہتا ہے،

ازیں قیاس نما غور کن کہ قدرت کیست | بیک دو لحظہ چنیں قطعۂ ادا کردن

شاعری میں طالب کا امتیازی وصف صرف دو چیزیں ہیں، ندرت تشبیہ، لطف استعارہ، استعارات کی نزاکت اسکے دور سے پہلے شروع ہو چکی تھی لیکن اُس نے اور زیادہ لطافت اور ندرت پیدا کر دی، اسکا کلام کہیں سے اُٹھا کر دیکھو، ہر جگہ نئے نئے استعارے نظر آئیں گے، ان میں سے اکثر لطیف اور نازک ہیں اور بعض بعض معما سازی اور چھوٹے طلسم ہیں،

اس موقع پر ہم اسکے چند منتخب اشعار درج کرتے ہیں، ان میں ابتدا کے چار شعر وہ ہیں جو جہانگیر نے تزک جہانگیری میں ملک الشعرائی کے خطاب دینے کے وقت انتخاباً درج کئے ہیں، باقی مرزا صائب کے انتخاب ہیں،

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی | دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد
عشق در اول و آخر ہمہ جہد است و سماع | ایں شرابیست کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است
دو لب خواہم یکے در مے پرستی | یکے در عذر خواہی ہائے مستی
ز غارت چمنت بر بہار منت ہاست | کہ گل بہ دست تو از شاخ تازہ تر ماند

دشنام خلق را ندهم جز دعا جواب — ابرم که تلخ گیرم و شیریں عوض دهم

بے نیازانه ز ارباب کرم می گذرم — چوں سیه چشم که بر سرمه فروشاں گذرد

مرد بے برگ و نوا را سبک از جاے بگیر — کوزه بے دسته چو بینی بدر و دستش بردار

مژهٔ در جهاں نمے بینم — دهر گوئی دهان بیمار است

نظارهٔ ترا دو جهان جز دو چشم نیست — یک چشم باز مانده و یک چشم برهم است

خانه شرع خراب است که ارباب صلاح — در عمارت گری گنبد دستار خودند

ما را زباں شکوه ز بیداد چرخ نیست — از ما خطے بمهر خموشی گرفته اند

دریں انجمن غیر لبهاے یار — دو مے را بیک نشئهٔ کم دیده ام

باصد کرشمه آں بُت بدمست می رود — خود می کند خرام و خود از دست می رود

میرزا صائب اصفہانی

ایران کی شاعری رودکی سے شروع ہوئی اور میرزا صائب پر ختم ہو گئی، رودکی سے پہلے بھی شعرا گذرے ہیں، اور میرزا صائب کے بعد بھی لوگوں نے طبع آزمائیاں کیں، لیکن یہ دونوں دور شمار کے قابل نہیں، اخیر دور میں قاآنی بے شبہ ایسا شخص پیدا ہوا جس نے دفعۃً شاعری کی کایا پلٹ کر دی، لیکن اُسکی شاعری کوئی نئی شاعری نہیں، بلکہ اس نے سات سو برس کے بھولے ہوے خواب کو یاد دلایا اور یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ فرخی اور منوچہری نے قاآنی کا قالب اختیار کر لیا،

شاعری ابتدا سے جس انداز پر چلی آتی تھی، اکبری اور صفوی دَور نے دفعتاً اُسکی روش بدل دی، عرفی، نظیری، وحشی یزدی، شفائی نے ہزاروں گوناگوں خیالات پیدا کر کے شاعری کے میدان کو نہایت وسیع کر دیا، بالخصوص عشق و عاشقی کے رموز و اسرار اور فلسفۂ زندگی کے ایسے سیکڑوں ہزاروں نکتے بیان کئے، جو قدما کے خواب و خیال میں بھی نہ آئے تھے، لیکن یہ جو کچھ تھا اکبر و عباس صفوی کا فیض تھا، جہانگیر و شاہجہان نے شاہانہ فیاضیاں اکبر سے بھی زیادہ دکھائیں لیکن تمام پُرزور قوتیں کام میں آچکی تھیں، جہانگیر اور شاہجہان کے لئے فطرت کی فیاضی کا بہت کم سرمایہ رہ گیا تھا، اس عہد میں بھی جو کچھ ہوا وہ اکبر ہی کی تحریک دادہ قوت تھی، قدسی، طالب آملی، طالب کلیم، گو جہانگیری و شاہجہانی شعرا ہیں، لیکن یہ بھی اکبر ہی کے نہال فیض کے برگ و بار ہیں،

میرزا صائب بھی اسی عہد کے یادگار ہیں، اور سچ یہ ہے کہ کلیم کے سوا اس دور کا کوئی شخص اُسکی ہمسری کا دعوے نہیں کر سکتا، اور اسکے بعد تو عالمگیر کے زہد خشک نے شاعری کا چراغ ہی گل کر دیا،

صائب ایک معزز خاندان کا آدمی تھا، اسکا باپ مشہور تاجر تھا، اس کی ولادت تبریز میں[1] ہوئی لیکن نشو و نما اور تعلیم و تربیت اصفہان میں حاصل کی اسی بنا پر اسکو تبریزی اور اصفہانی دونوں کہتے ہیں، شعر و شاعری سے اسکو قدرتی مناسبت تھی، آغاز سن شعور میں جب اسکی شاعری کے چرچے ہونے لگے تو ایک شخص نے امتحان کے طور پر ایک مہمل مصرع پیش کیا۔ کہ اُس پر مصرع لگا دیجئے، مصرع یہ تھا،

شمع گر خاموش باشد، آتش از مینا گرفت

صائب نے پیش مصرع کہہ کر مصرع کو بامعنی کر دیا،

امشب از ساقی ز بس گرم ست محفل میتواں　　شمع گر خاموش باشد، آتش از مینا گرفت

یعنی آج محفل ایسی گرم ہے کہ اگر شمع بجھ جائے تو بوتل سے آگ روشن کی جا سکتی ہے باوجود شاعری، کے صائب پر مذہبی خیالات بہت غالب تھے آغاز شباب میں حرمین کا سفر کیا، واپسی کے بعد مشہد مبارک کی زیارت کی، اور اظہار عقیدت کے طور پر ایک قصیدہ لکھا، جسکا ایک شعر یہ تھا،

للہ الحمد کہ بعد از سفر حج صائب　　عہد خود تازہ بسلطان خراسان کردم

صائب نے شاعری کی باقاعدہ تعلیم، حکیم رکنا مسیح کاشی اور حکیم شفائی سے حاصل کی، حکیم رکنا مشہور شاعر گذرا ہے، شاہ عباس صفوی اُسکے گھر پر اُس سے ملنے آتا تھا، شاہ عباس کو حاسدوں نے اُسکی طرف سے رنجیدہ کر دیا، تو حکیم رکنا نے دربار سے قطع تعلق کیا، اور یہ مطلع لکھا،

گر فلک یک صبحدم با من گراں باشد سرش　　شام بیروں میروم چوں آفتاب از کشورش

اسکے بعد ہندوستان چلا آیا اور اکبر و جہانگیر کے دربار میں رسائی پائی، شاہجہان جب تخت پر بیٹھا تو قطعہ تاریخ لکھ کر بارہ ہزار روپے صلے میں حاصل کئے، اسلئے ج

---

[1] آتشکدہ میں لکھا ہے کہ اسکے خاندان کو عباس صفوی نے اصفہان میں لیجا کر آباد کرایا تھا اور صائب یہیں پیدا ہوا، ۵۲ ید بیضا،

میں مشہد مقدس کی اجازت لی، شاہجہان نے زادسفر کے لئے پانچہزار روپے عنایت کئے، ۱۰۶۶ھ میں انتقال کیا،

ہندوستان کی فیاضیوں کے غلغلہ سے تمام ایران گونج رہا تھا، صائب کے دل میں بھی تحریک پیدا ہوئی، چنانچہ خود کہتا ہے،

ہمچو عزم سفر ہند، کہ در ہر دل ہست ‏ ‏ رقص سودائے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

زادسفر کے لئے اگرچہ شاعری سے بہتر کوئی چیز نہ تھی لیکن صائب چونکہ ایک معزز تاجر کے گھر میں پیدا ہوا تھا، اس نے یہ تبذل طریقہ پسند نہ کیا اور تجارت کے ذریعہ سے دلی میں آیا، شاہجہان کے دربار میں رسائی حاصل کی، اور ہزاری منصب اور مستعد خان خطاب عطا ہوا۔ یہیں ظفر خان سے ملاقات ہوئی، اور اس قدر تعلقات بڑھے، کہ صائب اور ظفر خان کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے

ظفر خان مشہور امرائے تیموری میں سے ہے، اسکا باپ خواجہ ابوالحسن، اکبر کے زمانے میں ایران سے آکر دکن کا دیوان مقرر ہوا تھا، جہانگیر نے اپنے زمانے میں وزیر اعظم مقرر کیا ۱۰۳۲ھ میں وزارت کے ساتھ کابل کی حکومت بھی عطا کی، لیکن چونکہ وزارت کے تعلق سے پائے تخت سے جدا نہیں ہوسکتا تھا، اسکے بیٹے ظفر خان کو باپ کی قائم مقامی کے طور پر کابل کی حکومت ملی، ظفر خان نہایت فیاض اور قدردان علم و فن تھا، خود بھی شعر کہتا تھا اور احسن تخلص کرتا تھا، مرزا صائب کی شاگردی نے اسکی استعداد کو اور ترقی دی، چنانچہ خود کہتا ہے،

طرز یاران پیش احسن بعد ازیں مقبول نیست ‏ ‏ تازہ گوئیہای او از فیض طبع صائب است

مرزا صائب نے ظفر خان کی مدح میں متعدد قصائد لکھے، اور چونکہ ممدوح درحقیقت

۱؎ صائب کے سفر ہندوستان کے متعلق نہایت مختلف و متناقض روایتیں ہیں میں نے سرو آزاد، ید بیضا ریاض الشعراکو چھوڑ کر مرآۃ الخیال کی روایت اسلئے اختیار کی ہے، کہ اسکا مصنف صائب کا گویا ہمعصر تھا،

مدح و ثنا کا سزاوار تھا، میرزا کو اُسکی مداحی پر ناز تھا، ایک قصیدہ میں لکھتا ہے،

کلاہ گوشہ بخورشید و ماہ می شکنم ۔۔۔ بہ این غرور کہ مدحت گر ظفر خانم
زنو بہار ستایش چو قطرہ ریزہ شوم ۔۔۔ قسم خورد بسیر کلک ابر نیسانم
بلند بخت نہالا! بہار تربیتا! ۔۔۔ کہ از نسیم ہوا داریت گلستانم
حقوق تربیتت راہ کہ در ترقی باد ۔۔۔ زباں کجاست؟ کہ در حضرتت فرو خوانم
تو پائے تخت سخن را بدست من دادی ۔۔۔ تو تاج مدح نہادی، بفرق دیوانم
ز روئے گرم تو جوشید، خون معنیِ من ۔۔۔ کشید جذبِ تو، این لعل از رگِ کانم
تو جانِ زدخل بجا مصرع مرادادی ۔۔۔ تو در فصاحت دادی خطاب سحبانم
زدقتِ تو بمعنی شدم چناں باریک ۔۔۔ کہ می توان بدلِ مور، کرد پنہانم
چو زلف سنبل ابیات من پریشاں بود ۔۔۔ نداشت طرۂ شیرازۂ روئے دیوانم
تو غنچہ ساختی اوراق باد بردہ من ۔۔۔ دگرنہ خار نمے ماند از گلستانم

ان اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ میرزا صائب نے اپنے دیوان کو ظفر خان کی فرمایش سے مرتب کیا تھا اشعار سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ظفر خان میرزا صاحب کے کلام پر اُستادانہ نکتہ چینیاں کرتا تھا، اور اس قسم کی روک ٹوک سے میرزا کا کلام اور زیادہ ترقی کرتا جاتا تھا،

سنہ ۱۰۳۹ ہجری میں شاہجہان نے دکن کا رخ کیا، ظفر خان بھی اس سفر میں ہمرکاب تھا، اور میرزا صائب اسکے ساتھ تھا، جب برہانپور میں پہنچا تو چونکہ یہاں کی زمین نہایت غبار انگیز تھی میرزا صائب نے کہا،

توتیا ساز و غبار آگرہ و لاہور را ۔۔۔ چشم من تا خاکمال گرد برہانپور خورد

صائب کے باپ کو صائب سے نہایت محبت تھی اس زمانے میں ہندوستان کا سفر ایک معمولی بات تھی اور ایران اور ہندوستان ایک مکان کے دو صحن بن گئے تھے، تاہم محبت کا یہ جوش تھا کہ میرزا کے باپ نے ستر برس کی عمر میں ہندوستان

سلہ ید بیضا و سرو آزاد بلگرامی،

کا سفر اختیار کیا اور پیارے بیٹے کو ساتھ لیجانا چاہا، میرزا صائب کو مجبوراً ظفر خان سے رخصت کی استدعا کرنی پڑی ایک مدحیہ قصیدہ لکھا۔ اور اور اس میں اس طرح اظہار مطلب کیا،

شش سال بیش رفت کہ از اصفہان بہند | اُفتادہ است توسنِ عزم مرا گذار
آوردہ است جذبۂ گستاخ شوق من | از اصفہان بہ اگرہ ولاہورش اشکبار
ہفتاد سالہ، والد پیرست بندہ را | کز تربیت بود بمنش حق بے شمار
زاں پیشتر کز اگرہ بہ معمورۂ دکن | آید عنان گسستہ تر، از سیلِ بیقرار
ایں راہ دور را از سر شوق، طے کند | با قامت خمیدہ، و باپیکرِ نزار
دارم امید رخصتے، از آستانِ تو | اے آستانت، کعبۂ امیدِ روزگار
مقصود اُو ز آمدنش بُردن من ست | لب را بحرف رخصتِ من کُن گہر نثار
با جبہۂ گشادہ تر از آفتاب صبح | دست دعا بہ بدرقۂ راہِ من برآر

حُسن اتفاق یہ کہ اسی زمانہ میں یعنی ۱۰۴۱ھ ہجری میں شاہجہان نے دکن سے آگرہ کا قصد کیا اور آغاز ۱۰۴۲ھ میں ظفر خان کشمیر کی صوبہ داری پر ممتاز ہوا میرزا صائب ظفر خان کے ساتھ کشمیر میں آیا اور اس بہشت بریں کی سیر کر کے باپ کے ساتھ وطن کو واپس گیا، ایران میں ایسے جوہر قابل کے لئے قدردانی کی کیا کمی تھی، سلاطین صفویہ نے بڑی عزت واحترام سے لیا، میرزا نے بھی اُن کی مدح میں پُر زور قصائد لکھے، شاہ عباس ثانی نے اسکو ملک الشعراء کا خطاب دیا، لیکن جب اسکے بعد سلیمان صفوی تخت نشین ہوا، اور میرزا صائب نے قصیدہ لکھ کر پیش کیا، جسکا یہ مطلع تھا،

احاطہ کرد خط آں آفتابِ تاباں را | گرفت خیل پری، درمیاں سلیماں را

تو سلیمان صفوی چونکہ نوخیز اور نوخط تھا، نہایت رنجیدہ ہوا اور تمام

لہ سرو آزاد،

عم میرزا سے خطاب نہ کیا[1]،

میرزا نے اگرچہ اخیر زندگی تک ایران سے قدم باہر نہیں نکالا تاہم ہندوستان کی فیاضیاں رہ رہکر یاد آتی تھیں، جب نواب جعفر خان آغاز عہد عالمگیری میں وزیر اعظم مقرر ہُوا تو میرزا نے یہ شعر لکھ کر بھیجا،

دوردستان را باحسان یاد کردن ہمت ست — ورنہ ہر نخلے بپائے خود ثمر می افگند

جعفر خان نے پانچ ہزار روپیہ، وبقول بعض پانچہزار اشرفیاں بھیجیں[2]،

۱۰۸۰؁ ہجری میں بمقام اصفہان وفات پائی، "صائب وفات یافت" مادہ تاریخ ہے،

میرزا کا ایک مطلع ہے،

در ہیچ پردہ نیست نباشد نوائے تو — عالم پُرست از تو و خالی ست جائے تو

میرزا نے وصیت کی تھی کہ یہ مطلع اسکے مزار پر کندہ کیا جائے، چنانچہ سنگ مرمر کے لوح پر کندہ کیا گیا،

عام حالات وعادات | مرزا نہایت خود دار، پابند وضع، پاکیزہ خو، اور منکسر المزاج تھا، شعراے ایران کی عام عادت ہے کہ ہندوستانی شعرا کو مطلق خاطر میں نہیں لاتے امیر خسرو اور حسن کے سوا، کسی ایرانی مستند شاعر نے کبھی کسی ہندوستانی شاعر کا نام نہیں لیا، لیکن میرزا صائب اپنے ہمعصر ہندوستانیوں کا نام بھی، غزل کے مقطعوں میں لاتا ہے، اور اُن کی غزلوں پر غزل لکھنا گوارا کرتا ہے، ایک غزل غنی کے جواب میں لکھی ہے، اسکا مقطع یہ ہے،

ایں جواب آں غزل صائب کہ میگوید غنی — یاد ایامیکہ دیگِ شوق باسرپوش داشت

میرزا کی عادت ہے کہ اکثر شعرا کی غزلوں پر غزل لکھتا ہے اور مقطع میں ان شعرا کے غزلوں کے پورے مصرعے نقل کر دیتا ہے اس سے اسکی صحت مذاق اور خوبی انتخاب کا اندازہ ہو سکتا ہے،

---

[1] ریاض الشعرا، [2] خزانہ عامرہ،

این آں غزل کہ فیضی شیریں کلام گفت
"دُر دیدہ ام خلیدہ و در دل نشستہ"

این جواب آں غزل صائب کہ میگوید ملک
"چشم بنشیں باز کن تا ہر چہ خواہی بنگری"

بطرز تازہ قسم یاد می کنم صائب
کہ جائے طالب آمل، در اصفہان پیدا است

این جواب مصرع نوعی کہ خاکش سبز باد
"سایہ ابر بہاری کشت را سیراب کرد"

این آں غزل کہ اوحدی خوش کلام گفت
"اے روشن از رخ تو زمین و زماں ہمہ"

جواب آں غزل ست اینکہ میر شوقی گفت
"چو شیر از دو طرف می کشند زنجیرم"

این جواب آں غزل صائب کہ فتحی گفتہ است
از فراموشاں مباد، آنکس کہ ما را یاد کرد

صائب این تازہ غزل آں غزل شاپور ست
"کہ گراں می رود آں کس کہ توکل دارد"

جواب آں غزل ست اینکہ گفتہ است مطیع
"کلید کعبہ و بت خانہ در بغل دارم"

این جواب مصرع اوجی کہ دقتے گفتہ است
"بادشاہی عالم طفلی ست یا دیوانگی"

این جواب آں غزل صائب کہ او ہم گفتہ است
"گر نش دہن بگیرم خون من خود مردہ نیست"

جواب آں غزل حاذق ست این صائب
"بہار دیدم و گل دیدم و خزاں دیدم"

این جواب آں غزل صائب کہ راقم گفتہ است
"تیغ دایم آب در جو دارد و خون می خورد"

شعرا میں ہمیشہ باہم رقابت اور حسد ہوتی ہے لیکن میرزا صائب اسکو نہایت ناپسند کرتا تھا، چنانچہ ایک نظم میں باہمی محبت اور اعانت کی ترغیب دی ہے[1]،

خوش آں گروہ کہ مست بیان یکدگر اند
ز جوش فکر مئے ارغواں یک دگر اند

نمی زنند بسنگ شکست، گوہر ہم
پے رواج متاع دکان یک دگر اند

زنند بر سر ہم، گل ز مصرع رنگین
ز فکر تازہ، گل بوستان یکدگر اند

سخن تراش چو گردند، تیغ الماسند
زند چو طبع بکندی فساں یکدگر اند

بغیر صائب و معصوم نکتہ سنج و کلیم
دگر کہ ز اہل سخن مہرباں یک دگر اند

صائب اگرچہ تمام اساتذہ بلکہ ہمعصروں کو ادب سے یاد کرتا تھا، لیکن خاص خاص اساتذہ کا نہایت معتقد تھا، سب سے زیادہ خواجہ حافظ کا معترف تھا

[1] سرو آزاد ذکر معصوم شاعر،

اور یہ اسکی صحیح المذاقی کی بہت بڑی دلیل ہے، لوگوں کے اصرار سے ایک غزل خواجہ حافظ کی غزل پر لکھی لیکن مقطع میں یہ عذر کیا،

صائب چہ تواں کرد بہ تکلیف عزیزاں　　　ورنہ طرفِ خواجہ شدن بے بصری بو

ایک غزل میں کہتا ہے،

رواست صائب اگر نیست از رہ دعوے　　　تتبّع غزل خواجہ گرچہ بے ادبی ست

حکیم رکنا اور شفائی کا شاگرد تھا، اس لئے ان دونوں کا نام نہایت ادب سے لیتا ہے،

ایں آں غزل حضرت رکناست کہ فرمود　　　"پائے ملخے پیش سلیماں چہ نماید"

در اصفہان کہ بدردِ سخن رسد، صائب!　　　کنوں کہ نبض شناس سخن شفائی نیست

نظیری کو عرفی سے زیادہ مانتا تھا، چنانچہ کہتا ہے،

صائب چہ خیال ست شوی ہمچو نظیری　　　عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

یہانتک مضائقہ نہیں، لیکن افسوس ہے کہ عام خوش اعتقادی یا شہرت عام کی بناپر ظہوری اور جلال اسیر کی بھی مداحی کرتا ہے،

صائب نداشتیم سر و برگ ایں غزل　　　ایں فیض از کلام ظہوری بما رسید

خوشا کسی کہ چو صائب ز صاحبان کمال　　　تتبع غزل میرزا جلال کند

بد مذاقی کا یہ پہلا قدم تھا، جس نے آخر ایک شاہراہ قائم کردی، اور نوبت یہ پہنچی کہ آج لوگ ناصر علی، بیدل، شوکت بخاری وغیرہ کے کلام پر سر دھنتے ہیں" بنیاد ظلم درجہان اندک بود، ہر کہ آمد برآں مزید کرد،

میرزا صائب نے ہر قسم کی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، قصائد متعدد ہیں ایک چھوٹی سی رزمیہ مثنوی بھی ہے اور غزل تو اسکا خاص فن ہے، قصائد اور مثنویاں کم رتبہ ہیں، یہ دونوں چیزیں اس دور سے پہلے ابتر ہو چکی تھیں اور مرزا بھی اسکی کچھ تلافی نہ کرسکا، رزمیہ مثنوی کا ایک شعر یاد رکھنے کے قابل ہے"

چناں لرزہ در دشت کیں اوفتاد　　　کہ فارد دل بروں از زمین اوفتاد

میرزا نہایت پُرگو اور بدیہ گو تھا، جس زمانے میں وہ برہانپور دکن میں تھا، ایک قصیدہ ساٹھ شعروں کا صرف دوپہر میں لکھا، اس قادر الکلامی کے نشہ میں خود کہتا ہے،

ہزار حیف کہ عرفی و نوعی و سنجر — نیند جمع بدار العیار برہان پور
کہ قوتِ سخن ولطف طبع می دیدند — نمی شدند بطبع بلند خود مغرور
ہمیں قصیدہ کہ یک چاشت روے داد مرا — ز اہل نظم کہ گفت ست؟ در سنین و شہور

ایک دفعہ اسکے ایک شاگرد نے ایک مہمل مصرع پیش کیا کہ اس پر طرح لگا دیجئے، مصرع یہ تھا،

از شیشۂ بے مے ۔ مئے بے شیشہ طلب کن

صائب نے فوراً کہا،

حق را ز دلِ خالی از اندیشہ طلب کن

ایک دفعہ راہ میں چلا جارہا تھا، ایک کُتّے کو بیٹھا ہوا دیکھا، چونکہ کتا جب بیٹھتا ہے تو گردن اونچی کرکے بیٹھتا ہے، فوراً یہ مضمون خیال میں آیا،

شود زگوشہ نشینی فزوں رعونت نفس — سگ نشستہ ز استادہ سرفراز ترست

فغانی کا مشہور مطلع ہے،

بہ بوییت صبحدم نالاں بگلگشت چمن رفتم — نہادم روے بر روے گل و از خویشتن رفتم

میرزا نے اسکو یوں بدل دیا،

ببوییت صبحدم گریاں چو شبنم در چمن رفتم — نہادم روے بر روے گل و از خویشتن رفتم

شبنم کی تشبیہ نے شعر میں جان ڈالدی اور دعوے کو پورا ثابت کردیا،

میرزا خاضع، میرزا صائب کے شاگرد اور عبد الجلیل بلگرامی کے ہمنشین تھے ان کی زبانی منقول ہے کہ ایک دفعہ میں نے میرزا صائب کے سامنے یہ مصرع پڑھا، ع

دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن،

۱؎ کلمات الشعراء سرخوش، ۲؎ کلمات الشعراء،

مصرع بالکل مہمل تھا، یعنی چند چیزیں بے مناسبت جمع کر دی تھیں، میرزا نے پیش مصرع لگا کر عجیب فلسفیانہ مضمون پیدا کر دیا[1]،

بقدر ہر سکون راحت بود، بنگر تفاوت را · دویدن رفتن استادن نشستن خفتن و مردن

میرزا کی زندگی ہی میں اسکے کلام کو یہ حُسن قبول حاصل ہو چکا تھا، کہ سلاطین اور امراء، شاہ ایران سے اسکے کلام کی استدعا کرتے تھے اور تحفہ اور سوغات کی طرح اسکی غزلیں بھیجی جاتی تھیں[2]،

میرزا نے فن سخن کے متعلق ایک بڑا کام یہ کیا، کہ قدما اور متاخرین کا کلام انتخاب کر کے ایک بیاض مرتب کی جو سخندانوں کے لئے دلیل راہ کا کام دیتی ہے، میرزا کا اپنا انداز گو خاص ہے اور وہ شاعری کا معمولی درجہ ہے، لیکن چونکہ اسکا مذاق نہایت صحیح تھا، اس لئے بلند اور نادر اشعار انتخاب کئے ہیں، شعراے عرب میں ابو تمام ایک مشہور شاعر گذرا ہے جو متنبی کا ہم پلہ خیال کیا جاتا ہے، اس نے ایک مجموعہ انتخاب کیا تھا جو حماسہ کے نام سے مشہور ہے اور فن ادب کی جان ہے، اہل فن کا بیان ہے کہ ابو تمام کی شاعری کا کمال جس قدر اس انتخاب سے معلوم ہوتا ہے، خود اسکے دیوان سے ظاہر نہیں ہوتا،

میرزا صائب کے انتخاب کا بھی بعینہ یہی حال ہے، جس شاعر کے جتنے اشعار انتخاب کر دئے ہیں، وہی اُسکے تمام دیوان کا عطر ہے،

میں نے اس کتاب کا ایک نسخہ حیدر آباد میں دیکھا تھا، جو خود میرزا کے ایک شوقین شاگرد نے ایران میں نہایت اہتمام سے تیار کرایا تھا، ہر شاعر کے نام کے ساتھ اسکے اشعار کی تعداد بھی ہندسوں میں لکھ دی ہے، اخیر میں مختصر سی عبارت ہے، جس میں انتخاب کا حال لکھا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اہل فن اس بیاض کی نقلیں لیتے تھے، اور اس سے فائدہ اُٹھاتے تھے، والہ داغستانی نے ریاض الشعرا میں جابجا اسکے حوالے دئے ہیں، میں نے

---

[1] ید بیضا، [2] کلمات الشعراء سرخوش،

اس بیاض کے تین نسخے دیکھے ہیں، جن میں سے ایک خود میرے کتبخانے میں موجود ہے،

میرزا کے لطائف و ظرائف بہت مشہور ہیں، جس زمانے میں وہ کشمیر میں تھا، ایک دن ظفر خاں کے دربار میں اشعار پڑھ رہا تھا، اور ہر طرف سے تحسین و آفرین کی صدا بلند تھی، ایک نو خیز نے حسد سے کہا کہ تمام مضامین قدما کے بہاں بندھ چکے ہیں، موجودہ شاعروں کا یہ کام رہ گیا ہے کہ صرف لفظوں کو الٹ پلٹ کر دیتے ہیں، صائب نے برجستہ کہا،

اہل دانش جملہ مضمونہاے رنگین بستہ اند ہست مضمون نہ بستہ .... شما

چونکہ اتفاقاً شعر حسب حال تھا ظفر خان بے اختیار ہنس پڑا اور میرزا کو انعام دیا، میرزا نے ایک غزل لکھی تھی جسکا مطلع تھا،

سر دمن طرح نو انداختہ یعنی چہ جامہ را فاختہ ساختہ، یعنی چہ

ایک مولوی صاحب نے سنا تو فرمایا کہ ردیف غلط ہے، یعنی چہ غائب کا صیغہ ہے اور مخاطب کے لئے استعمال کیا گیا ہے، میرزا کے سامنے کسی نے تذکرہ کیا، اُس نے کہا شعر مرا بمدرسہ کہ بُرد،

ایک صاحب محمد مراد متخلص بہ لائق جونپور کے رہنے والے تھے، عالمگیر کے زمانے میں لاہور کی سوانح نگاری پر مامور تھے، آغاز شباب میں انکو شاعری کا شوق پیدا ہوا، میرزا صائب کی شہرت سُن کر ایران کا قصد کیا، اور جوش اعتقاد میں جونپور سے اصفہان تک پا پیادہ گئے، میرزا نے بھی انکے خلوص و ارادت کی بڑی قدر کی، خود اپنے گھر میں مہمان اُتارا اور ہر طرح کی مہمان نوازی کی، اُنکا بیان ہے کہ میں نے کبھی مرزا کو شعر کے لئے غور و فکر کرتے نہیں دیکھا، لیکن ایک دن خلاف عادت باغ کی روشوں پر متفکرانہ ٹہل رہے تھے، میں نے سبب پوچھا فرمایا کہ فردوسی کا مشہور شعر ہے،

بفرمود تا رخش را زین کنند دم اندر دم نا ے زریں کنند

شفائی نے اس شعر کا جواب لکھا ہے،

بفرمود تا زین بر ابرش نہند　　چہ زین ہمہ بالائے آتش نہند

میں بھی اسکا جواب لکھنا چاہتا ہوں، انہوں نے کہا کہ اجازت ہو تو میں اس کام کو انجام دوں، تمام رات کی غور و فکر کے بعد صبح کو یہ شعر لکھ کر میرزا کی خدمت میں پیش کیا،

بفرمود تا زین بر آدہم نہند　　بہ پشت صبا، مسند جم نہند

میرزا نے بہت تعریف کی یہ واقعہ غلام علی آزاد نے ید بیضا[1] میں خود لائق جونپوری کی زبان سے نقل کیا ہے، لیکن قیاس میں نہیں آتا کہ صائب شفائی کے شعر کو فردوسی کے مقابلہ میں لائے، اور پھر خود جواب لکھنے کا ارادہ کرے،

کلام پر رائے: میرزا صائب کا خاص انداز تمثیل ہے، تمثیل کا طریقہ پہلے بھی تھا، لیکن صائب نے اس کثرت سے اسکو برتا کہ اسکی خاص چیز ہوگئی اسکے علاوہ اور شعرا، عام مضامین میں تمثیل سے کام لیتے تھے، صائب نے اخلاقی مضامین کے لئے خاص کر دیا،

جا بجا خیال بندی اور مضمون آفرینی بھی پائی جاتی ہے اور یہ خاص متاخرین کا انداز ہے اگرچہ صائب کے ہاں وہ لطیف خیالات اور عشق و محبت کے اسرار نہیں پائے جاتے جو عرفی و نظیری کے ہاں نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں، تاہم زبان کی فصاحت ترکیب کی بندش، محاورات کا استعمال ہاتھ سے نہیں جانے پاتا، بخلاف اور متاخرین کے جن کے کلام کو پڑھ کر زبان کی خوبیوں کی طرف مطلق ذہن متوجہ نہیں ہوتا،

اشعار ذیل ملاحظہ ہوں،

خود مگر از در انصاف در آئی ورنہ　　جذبہ شوق حریف دل خود کام تو نیست
قمریان پاس غلط کردہ خود می دارند　　ورنہ یک سرو دریں باغ بہ اندام تو نیست

---

[1] ید بیضا،

یعنی قمریوں کو اپنی غلط بات کی پچ آن پڑی ہے ورنہ ایک سرو بھی تیرے قد و قامت کا ہمسر نہیں،

شب، کہ صحبت بحدیث سر زلف تو گذشت … ہر کہ برخاست زجا سلسلہ برپا برخواست

یادگار جگر سوختۂ مجنون ست … لالۂ چند کہ از دامنِ صحرا برخاست

نہ شبنم ست چمن را برُوے آتشناک … عرق زروے تو کردہ است گل بدامن پاک

تو فکر نامۂ خود کن کہ می پرستان را … سیاہ نامہ نخواہد گذاشت گریۂ تاک

دلم بپاکیِ دامان غنچہ می لرزد … کہ بلبلان، ہمہ مستند و باغبان تنہا

چشم عاشق زتماشاے تو چوں سیر شود … ہر نگہ سلسلہ جنبانِ نگاہ دگر ست

کہ گذشت ست ازیں بادیہ دیگر کامروز … نبض رہ می طپد و سینۂ صحرا گرم ست

طوفان گل و جوشِ بہار ست بہ بینید … اکنوں کہ جہاں بر سر کار ست بہ بینید

عالم بیخبری طرفہ بہشتے بودہ است … حیف صد حیف کہ ما دیر خبردار شدیم

ہم ایں جا صلح کن با ما چہ لازم … کہ در محشر زما شرمندہ باشی

دریں دو ہفتہ کہ چوں گل دریں گلستانی … کشادہ روے ترا رازہاے مستان باش

تمیز نیک و بد روزگار کار تو نیست … چو چشم آئینہ در خوب و زشت حیران باش

دردن خانۂ خود ہر گدا شہنشاہ است … قدم بروں منہ از حد خویش سلطان باش

میان نور و ظلمت عالمے دارم نمے دانم … کہ شامم صبح، یا صبح امیدم، شام می گردد

ایں قدر کز تو دلے چند شود شاد بس ست … زندگانی، بمراد ہمہ کس نتواں کرد

صائب کے تمثیلیہ اشعار چونکہ عام طور پر زبانوں پر ہیں، اس لئے ہم انکو قلم انداز کرتے ہیں،،

ابوطالب کلیم

ملک الشعراے شاہجہانی

یہ یگانۂ فن، صحیفۂ شاعری کا اخیر ورق ہے، اور اسی کے نام پر شعر العجم حصۂ سوم، کا خاتمہ ہے،

ہمدان میں پیدا ہوا، لیکن کاشان میں زیادہ قیام رہا، آغاز جوانی میں شیراز جاکر علوم درسیہ کی تحصیل کی[1]

جہانگیر کے عہد حکومت میں ہندوستان آیا، امراے جہانگیری میں شاہنواز خاں صفوی، ابن مرزا رستم صفوی ایک مشہور امیر تھا، عالمگیر اور مرزا شجاع اسکے داماد تھے، کلیم نے اول اس کے دربار میں رسائی پیدا کی، لیکن ۱۰۲۸ھ ہجری میں وطن کی یاد نے بیچین کیا، اس زمانے کا ہندوستان وہ چیز تھی کہ کلیم گو وطن کو جاتا تھا، لیکن حسرتوں کا انبار لئے جاتا تھا، اسی حالت میں غزل لکھی جسکے چند شعر یہ ہیں،[2]

زشوق ہندزاں ساں چشم حسرت بر قفا دارم　　کہ رو ہم گر براہ آرم نہ بینم مقابل را

ہندوستان کے شوق میں میری آنکھیں اسطرح پشت کی طرف لگی ہوئی ہیں کہ سامنے کے رخ پر نظر بھی ڈالتا ہوں تو سامنے کا آدمی نظر نہیں آتا:

اسیر ہندم و زیں رفتن بیجا پشیمانم　　کجا خواہد رساندن پرفشانی مرغ بسمل را

بایران میرود نالاں کلیم از شوق ہمراہان　　بپاے دیگراں ہمچوں جرس طے کردہ منزل را

اس حالت کے ساتھ وطن میں کیا جی لگتا، دو برس بھی گذرنے نہ

---

[1] شاہجہان نامہ جلد ثانی صفحہ ۳۵۳،

[2] خزانہ عامرہ و سرو آزاد،

پائے تھے کہ پھر ہندوستان واپس آیا، اب کی اس نے میر جملہ شہرستانی کا دامن[1] پکڑا، میر جملہ کو جہانگیر نے دست خاص سے خط لکھ کر اصفہان سے بلایا تھا چنانچہ ۱۰۲۷ھ ہجری میں باریاب ہوا، اور دو دنیم ہزاری کا منصب ملا، شاہجہان کے زمانے میں پنجہزاری تک پہنچا کلیم کی شاعری کا اگرچہ سکہ جمتا جاتا تھا، اسکے سرپرست بھی دربار شاہی میں خاص اعزاز رکھتے تھے، لیکن جہانگیر تک اسکی رسائی نہ ہوسکی جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دربار کا ملک الشعرا طالب آملی تھا اور اسکے سامنے کلیم کا فروغ پانا ممکن نہ تھا، اسی سلسلہ میں یہ بات بھی کہنے کے قابل ہے کہ جس سال یعنی ۱۰۲۹ھ میں طالب آملی کو ملک الشعرائی کا خطاب ملا ہے، اسی سال کلیم ایران کو واپس گیا ہے[2] اس سے بدگمان طبیعتیں نتیجہ نکال سکتی ہیں کہ کلیم کو رشک نے ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا ہوگا،

کلیم کی ناکامیابی کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ نورجہاں بیگم اسکی شاعری کی معتقد نہ تھی اور اکثر اسکے اشعار پر حرف گیری کیا کرتی تھی، ایک دفعہ کلیم نے ایک شعر کہا اور خوب دیکھ لیا کہ کہیں حرف رکھنے کی جگہ نہیں شعر یہ تھا،

ز شرم آب شدم کاب را شکستی نیست — بحیرتم کہ مرا روزگار چوں بشکست

میں شرم سے پانی ہوگیا، حیرت ہے کہ زمانہ مجھکو کیونکر توڑ سکا، پانی توٹنے کی چیز نہیں،

کلیم نے یہ شعر نورجہاں بیگم کے پاس بھیجا، نورجہاں فوراً بول اٹھی کہ "یخ بست و پس شکست" یعنی پانی کو پہلے یخ بنادیا پھر توڑا[3]

معلوم ہوتا ہے کہ کلیم نے دربار میں پہنچنے سے پہلے جا بجا خاک چھانی شاہجہان نامہ میں لکھا ہے کہ وہ دکن میں مارا مارا پھرا، اسکی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ کلیم کا ایک قصیدہ ابراہیم عادل شاہ کی مدح

---

[1] خزانہ عامرہ، [2] سرو آزاد تذکرہ طالب آملی، [3] مرآۃ الخیال بعض تذکروں میں یہ واقعہ طالب آملی کی طرف منسوب ہے،

میں بھی ہے، ایک اور قصیدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیجاپور کے ارادہ سے چلا تھا کہ راہ میں جاسوسی کے شبہہ میں پکڑا گیا اور قلعہ شاہدرک میں قید رکھا گیا،

چنانچہ کہتا ہے،

فلک قدرا! نمی پرسی کہ گردوں
چرا آزرد یار ا بے محابا

چرا آزرد بیمار غمے را
کہ مے آمد بدرگاہ مسیحا

بعزم سیر بیجا پور گشتم
رہے با اخترے چوں دشت پیما

بچنگ راہداران او فتادیم
چہ گویم تا چہا کردند بہ ما

ہمہ اندر تجسس موشگافان
ہمہ در کنج کاوے ذہن دانا

یکے گوید کہ دز دانند باشند
بزندان چند کہ زنجیر فرسا

دگر گوید کہ جاسوس فلانند
کہ از تفتیش ہا گشتند بینا

یکے می گوید اینان را بکاوید
کہ شاید نامۂ گردد ہویدا

زبس تفتیش از ہم می کشودند
اگر در بار ما بود ے معمّا

کنون در چنگ ایشان مبتلائیم
نمی دانیم چارہ جز مدارا

زبہر پاس ہندو ہا ے با تیغ
چو موا استادہ دائم بر سر ما

عجب دارم کہ با ایں منع جادہ
چساں بے خواست آمد تا باینجا

یہ قصیدہ شاہ نواز خان کے نام لکھا ہے اور اخیر میں لکھا ہے،

اشارت کن کہ چوں اقبال گردیم
بخاک آستانت جبہہ فرسا

بہرحال رفتہ رفتہ شاہجہان کے دربار میں رسائی ہوئی اور ملک الشعرا کا خطاب ملا ۱۰۴۷ھ میں جب شاہجہان نے کرڈر روپے کی لاگت سے تخت طاؤسی طیار کرایا اور آگرہ میں جشن نوروز کے دن اس جلوس کی رسم ادا کی تو کلیم نے قصیدہ لکھا،

خجستہ مقدم نوروز و غرۂ شوال
فشاندہ اند چہ گلہاے عیش بر سر سال

شاہجہان نے اسکے صلے میں روپے کے برابر تلوایا چنانچہ ۵۵۰۰ روپے وزن میں آئے اور اسکو عطا کیئے،

کلیم شاہجہان کے ساتھ کشمیر گیا تو وہاں کی رنگینی اور آب وہوا کی دلاویزی کا اس قدر شیفتہ ہوا کہ وہیں کا ہورہا، بادشاہ سے درخواست کی کہ مجھ کو یہیں رہنے کی اجازت دی جائے، میں یہاں بیٹھ کر اطمینان سے فتوحات شاہی نظم کرونگا، یہ درخواست منظور ہوئی ۱۰۵۵ھ ہجری میں جب شاہجہان پھر کشمیر گیا تو کلیم نے قصیدہ تہنیت لکھ کر پیش کیا، اور خلعت اور دو سو اشرفیاں انعام میں پائیں، ۱۰۶۱ھ ہجری میں وفات پائی، غنی نے سال تاریخ لکھا ع

طور معنی بود روشن از کلیم

عام حالات | کلیم بخلاف اور شعرا کے نہایت صاف دل، سیر چشم، فیاض طبع تھا معاصر اور حریف شعرا کی عزت کرتا تھا اور گرمجوشی سے ملتا تھا، میرزا صائب اور میر معصوم (ابن میر حیدر معمای)، سے خاص محبت تھی، چنانچہ میرزا صائب نے ایک غزل میں اس کا ذکر کیا ہے[۱]،

بغیر صائب و معصوم نکتہ سنج کلیم — دگر کہ ز اہل سخن مہربان یک دگر اند؟

جلال اسیر کا بہت معتقد تھا، چنانچہ کہتا ہے[۲]،

میرزای ما جلال الدین بس ست — از سخن سنجاں طلبگار سخن
راستی طبعش استاد من ست — کج نہم بر فرق دستار سخن

ملک قمی نے جب انتقال کیا تو کلیم نے قطعہ تاریخ لکھا جسکے چند شعر یہ ہیں.

ملک آں بادشاہ ملک معنی — کہ نامش سکۂ نقد سخن بود
چناں آفاق گیر از ملک معنی — کہ حد ملکش از قم تا دکن بود
بجستم سال تاریخش ز ایام — بگفتا او سر اہل سخن بود

اکثر شعرائے ایران باوجود اسکے کہ ہندوستان میں آکر خاک سے آسمان پر پہنچے لیکن

---

(۱) سرو آزاد تذکرۂ میر معصوم، (۲) سرو آزاد تذکرۂ جلالی اسیر،

ہندوستان کو گالیاں دیتے ہیں، بخلاف ان کے کلیم ہندوستان کا مداح اور افسانہ خوان ہے، ایک قصیدہ کی پوری تمہید ہندوستان کی مدح ہے، اُسکا ایک شعر یہ ہے،

توان بہشت دوم گفتنش بایں معنی　　کہ ہر کہ رفت ازیں بوستاں پشیمان شد

کلیم نہایت حاضر جواب اور مضمون یاب تھا، قیصر روم نے شاہ جہان کو خط لکھا کہ آپ صرف ہندوستان کے بادشاہ ہیں، شاہ جہان کا لقب کیوں اختیار کیا ہے؟ شاہجہان کو بھی خیال ہوا کہ یہ غلط بیانی ہے، یمین الدولہ سے کہا کہ کوئی اور خطاب اختیار کرنا چاہیئے، کلیم کو خبر ہوئی، اُسی وقت قصیدہ لکھ کر پیش کیا، جس میں لقب کی یہ توجیہ کی[1]،

ہند و جہان ز روے عدد ہر دو چون یکی ست　　شہ را خطاب شاہ جہانی مبرہن ست

یعنی ہند اور جہان دونوں لفظ کے عدد ایک ہیں (۵۹) اسلئے شاہ جہان اور شاہ ہند دونوں کہہ سکتے ہیں،

خان جہان لودی نے جسکا اصلی نام پیرا تھا جب بغاوت کی اور شکست کھا کر مقتول ہوا تو اُسکا اور اُسکے شریک بغاوت دریا خاں کا سر ایک ساتھ دربار میں آیا کلیم نے برجستہ رباعی کہی۔

ایں مژدہ فتح از پے ہم زیبا بود　　ایں کیف دوبالا چہ نشاط افزا بود

از کشتن دریا سر پیرا ہم رفت　　گویا سر او حباب ایں دریا بود

شاعری کلیم نے شاعری کی تمام صنفوں کو لیا ہے، قصائد کثرت سے ہیں کئی مثنویاں ہیں، غزلوں کا دیوان الگ ہے، مثنوی مدت سے اپنے پایہ سے گر چکی تھی کلیم کی مثنویاں بھی کم رتبہ بلکہ عامیانہ ہیں، اتنی بات ہے کہ وہ نہایت چھوٹی چھوٹی چیزوں پر نظم لکھتا ہے اکثر شعرا کے نزدیک یہ بھی ابتذال

---

[1] کلمات الشعرا سرخوش، لیکن سرخوش نے دوسرا مصرع جس طرح نقل کیا ہے دیوان میں نہیں ہے اس لئے میں نے دیوان کے مطابق نقل کیا ہے،

میں داخل ہے، مثلاً انگوٹھی، قلمدان، کشتی، بندوق وغیرہ وغیرہ سب کی شان میں قطعات اور رباعیاں لکھی ہیں،

ایک دفعہ گرمی دانے نکلے اس پر ایک بڑا قطعہ لکھا، تپ آگئی، اس پر بھی نظم لکھدی، اسی جزئی واقعہ نگاری کا اثر ہے کہ اور ایرانیوں کے برخلاف ہندوستان کے بہت سے پیشوں صنعتوں، پھولوں اور پھلوں کے نام لکھدیے ہیں جن کا نام بھی زبان قلم پر لانا اور شعرا گناہ سمجھتے تھے، عرفی عمر بھر ہندوستان میں رہا لیکن عمر بھر میں صرف ایک ہندی لفظ جھگڑہ زبان سے نکلا، وہ بھی اس طرح بدل کر کہ گویا فارسی ہے، طالب آملی نے رام رنگی ایک شعر میں باندھ دیا، اسکو لوگوں نے تعجب سے دیکھا، لیکن کلیم سیکڑوں ہندی الفاظ بولتا چلا جاتا ہے، مثلاً

منه بر وعدهٔ تنبولیان دل	که جز خون خوردن از وی نیست حاصل
زحسن شستهٔ دھوبی چسگویم	ازاں بے پردہ محبوبی چسگویم
غرور حسن با جهل سپھانی	چو گردد جمع نتوان زندگانی
بتنانِ راجپوت و شیخ زاده	شکیب عاشقان برباد داده
چه چنبه شعلهٔ شمع ست بے دود	که آتش می زند در خرمن عود
زموزونان نظر در یوزه دارم	که وصف مولسری را بر نگارم
گل گڑھل نه فهمید ست موسم	شگفته چوں رخ یار ست دایم
نهال نیمش از بس خوش نسیم ست	دل طوبی ز رشک آں دو نیم ست

جو قابل ذکر واقعات اسکے زمانے میں پیش آئے، سب پر اس نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے،

عالمگیر شہزادگی کے زمانے میں جب اسکی عمر ۱۴ برس کی تھی، مست ہاتھی سے لڑا تھا، جس کی کیفیت یہ ہے کہ شاہجہان ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشا دیکھ رہا تھا، شہزادے بھی گھوڑوں پر سوار تماشے میں مصروف تھے عالمگیر قریب

سے دیکھنے کے لئے جوش شجاعت میں گھوڑے کو آگے بڑھائے جاتا تھا ایک ہاتھی حریف کو چھوڑ کر عالمگیر پر جھکا، عالمگیر نے پیشانی کو تاک کر برچھا مارا ہاتھی نے غصہ میں آکر گھوڑے کو دانتوں میں دبالیا، عالمگیر زمین پر آیا، لیکن جھٹ پٹ اٹھ کر ہاتھی پر حملہ آور ہوا، ادھر راجہ جے سنگھ نے بڑھ کر پے درپے برچھے کے وار کئے، ساتھ ہی مقابل کا ہاتھی آپہنچا اور یہ ہاتھی بھاگ نکلا، شاہجہان نے عالمگیر کو گود میں لیکر پیار کیا اور اشرفیوں میں تلوا کر اشرفیاں خیرات کیں [1]،

کلیم بھی اس واقعہ میں موجود تھا، چنانچہ ایک قطعہ اور ایک مثنوی میں اس واقعہ کی پوری کیفیت لکھی، مثنوی یہ ہے،

بمہمانی گوش ارباب ہوش
یکے قصہ دارم بمن دار گوش

حدیثے سراسر بیان وقوع
بگویم بتو از زبان وقوع

زہر دم من ایں نقل نشنیدہ ام
من از دل شنیدم دل از دیدہ ام

ابتدائی واقعات لکھ کر کہتا ہے،

دو دیدا ز قضا آں دو فیل مہیب
یکے سوے شہزادہ اورنگ زیب

بمردی زجا، یک سر مو نہ شد
زراہ چنیں پیل یک سو نہ شد

یکے نیزہ برق ساں تافتہ
نظر از رگ غیرتش بافتہ

ز قدرت چناں زد بہ پیشانیش
کہ جست از قفا برق رخشانیش

دراں کوہ پیکر نہاں شد سنان
دگر بار ورفت آہن بہ کان

زخرطوم انداخت پیچان کمند
فتاد اسپ شہزادہ در پیل بند

گرفت اسپ و شہزادہ بروے سوار
زبیم آب شد زہرۂ روزگار

چو و راسپ سامان جولان ندید
چو شہبازے از خانۂ زیں پرید

ہماں دم کہ برخاک پا را فشرد
رواں دست جرأت بشمشیر برد

---

[1] شاہجہان نامہ، واقعات ۱۰۴۳ ہجری،

علم کردہ شمشیر بروے دوید | کزاں سوے فیل غنیمش رسید
دریں بین اگر بوے افراسیاب | ہمی گشت از دیدن فیل آب
در آغاز و انجام آں گیر و دار | ہمی دید شاہنشۂ کامگار
ازاں شیر دل چوں بدید آں جگر | بفرقش بیفشاند گنج وگہر
نظر کردۂ شاہ آفاق شد | بمردانگی در جہاں طاق شد

قصائد | قصیدہ میں حاجی محمد جان قدسی کا انداز ہے، یعنی عرفی اور نظیری کی پیچدار اور مشکل بندشیں صاف کردیں اور مبالغہ اور حسن تعلیل کو وسعت دی، لیکن اسکے ساتھ قصیدہ کی متانت، زور اور بلندی کم ہوگئی اور غزلیت کا رنگ غالب آگیا،

جس چیز کو لوگ مضمون آفرینی کہتے ہیں، **کلیم** کے یہاں اسکی اسقدر بہتات ہے کہ ہر قصیدہ گویا مضامین کا ایک انبار ہے قصائد کی تمہید اکثر اصلی واقعات سے شروع کرتا ہے، مثلاً موسم کی گرمی اور سردی، یا سفر کی سختی پہاڑوں کی دشوار گذاری، لیکن خیالی مضمون آفرینیاں کرکے ایک طلسم بنا دیتا ہے، جسکو واقعیت سے کچھ علاقہ نہیں ہوتا، تاہم جستہ جستہ انہیں میں ایسے شعر بھی نکل آتے ہیں جو شاعری کی جان ہیں، مثلاً ابر و بہار،

سحاب از تیر باران بہاری | بہ بستان جملہ گلہا را نشان کرد
بنوعے آتش گل درگرفت ست | کہ بلبل رفت و در آب آشیاں کرد

دگر بہار جہاں را چناں گلستان کرد | کہ شوق سیر چمن سرو را خراماں کرد
چو دام وار تہیدست از خجالت ابر | بزیر سبزہ زمیں روے خویش پنہاں کرد
مفرو شکن
زناز کی نتوان غنچہ راز گلبن چید | گل حباب بیارد کسے بداماں کرد
نازکی کیوجہ سے کوئی شخص کلی کو توڑ نہیں سکتا | جس طرح حباب کا پھول دامن میں نہیں لیا جاسکتا
چراغ روز مگو بے فروغ می باشد | بہ بیں کہ لالہ در و دشت را فروزاں کرد

یہ نہ کہو کہ دن کے چراغ میں روشنی نہیں ہوتی　　دیکھو لالہ نے کس طرح صحرا کو روشن کر دیا ہے

اگرز عالم بالا نوید رحمت نیست　　بخاک این ہمہ باران چہ می برد پیغام
سرود محفل مستان مگر دمے بشنود　　نہادہ ابر بہر خانہ، سینہ بر لب بام
شگوفہ، پیرہن تر بشاخ اگرچہ فگند　　ندید پرتو خورشید را دریں ایام

سردی کی شدت،

خورشید دگر نقاب دارست　　منقل، معشوق در کنار ست
محراب جہانیاں بخاری ست　　تسبیح خلائق از شرارست
چوں آئینہ بستہ شد نفسہا　　دل از دم سرد سنگسارست
یخ بر سر کوچہ بندی آمد　　نہ راہ پیادہ نے سوار ست
گوئی تو، کہ پنبہ اش زبرف است　　پوشش برتن اگر ہزار ست،
مرغابی ہمچو نقش ابرے　　بر کاغذ یخ بہ یک قرار ست
ماہی در یخ میان جدول　　چوں موج بہ تختۂ چنار ست

اس زمانے میں قصائد کا کمال صرف مبالغہ، تشبیہ، حسن تعلیل، اور مغالطہ شعری پر محدود تھا اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ اوصاف کلیم کے قصیدوں میں نہایت افراط، اور نہایت وسعت کے ساتھ پائے جاتے ہیں، اسکے یہاں ترکیبوں کا سلجھاؤ، روزمرہ کی صفائی محاورات کی برجستگی، شستگی اور روانی بھی اس حد تک ہے کہ اسکے ہمعصروں میں نہیں ہے، طالب آملی سے وہ جدت استعارات اور شوخی میں کم ہے، لیکن اور اوصاف میں اُس سے بہت آگے ہے، بعض بعض قصیدوں کے مسلسل اشعار ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں، جس سے اسکا اندازہ ہوگا،

در آستان جلالش عصاے دربان را　　فلک زسدرۂ رضوان زشاخ طوبیٰ داد
کف سخائش غلط بخش نیست ہمچو سحاب　　سحاب ہر چہ بدریا فشاند بیجا داد

فراستش بخبرگیری ممالک رفت | چو باز گشت خبر ز آشیانِ عنقا داد
بہ تیرِ امرش حکم نفاذ داد آں کس | کہ دلبری بکمانِ ابروانِ رعنا داد
نمود خاکِ درش را کہ توتیا این ست | خدا نخست بہر کس کہ چشم بینا داد
چو خسروان کہ اسیرِ غنیم باز دہند | کفِ عطاشِ گہر را دگر بدریا داد

یعنی جس طرح بادشاہ دشمن کے قیدیوں کو واپس کر دیتے ہیں، ممدوح نے موتی دریا کو واپس دے دئے،

گردوں نشاط کودکے از سر چناں گرفت | کانگشتر کواکبش از سر تواں گرفت

آسمان اس قدر طفلانہ خوشی میں مصروف ہے کہ چاہیں تو اُسکے ہاتھ سے ستاروں کے چھلے اُتار لیں اور اُسکو خبر نہ ہو،

از شیشہ، استفاضہ انوار می کنند | عالم تمام مذہب اشراقیاں گرفت
اکنوں ہجوم کام بود مانع وصال | گُل پُر شد آنچناں کہ در بوستان گرفت

اب مقصد کا ہجوم ہی وصال کا مانع ہے | پھول اسقدر پھوٹ پڑے ہیں کہ باغ کا دروازہ رک گیا

زیں سان کہ روزگار ہو انمرد خوش ادا است | تا دامنِ عمرِ رفتہ تواں از جہاں گرفت
ایں روے تازہ کہ جہاں را نمود رُو | گوئی ز گردِ موکب شاہجہاں گرفت

مدحیہ مضامین ہزاروں دفعہ پامال ہو چکے ہیں اسلئے کسی شاعر کی زورِ طبع اور جدّت آفرینی کا اندازہ کرنا ہو تو خاص ان موقعوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے، کلیم اگرچہ مدح سے بیچتا ہے یعنی طبیعت کا اصلی زور، بہار وغیرہ کی تمہید میں صرف کر دیتا ہے تاہم اسکی جدت آفرینیاں استعجاب کے قابل ہیں،

بعہدش آنچناں در خواب امن است | کہ باید پاسبانے پاسباں را

اُسکے زمانہ میں لوگ اس قدر چین سے پڑے سوتے ہیں کہ خود، پاسبان کے لئے ایک پاسبان درکار ہے،

بملکش راہ زن مانند جادہ | بمنزل می رساند کاروان را

اسکی سلطنت میں خود راہزن، راستہ کی طرح قافلہ کو منزل تک پہنچا دیتا ہے،

بعہد عدل او دو اپس ستاند ۔۔۔ چمن از خاک زرہاے خزان را
کفش پرداخت کانِ گوہر و زر ۔۔۔ فلک برچید آخر این دکان را
درون شیشۂ افلاک بیند ۔۔۔ بسانِ مے، فضائے آسمان را

زحرف رفعتِ شانش قلم بخود لرزد ۔۔۔ بہ احتیاط، قدم می نہند در کہسار
دلش غبار خلائق نکردہ است قبول ۔۔۔ نگیرد آئینۂ آفتاب را زنگار
سخن بگفتن اول بہ نزد فطرت او ۔۔۔ عجب مدار کہ معیوب گردد از تکرار
بروزگارش، ناراستی برافتادہ است ۔۔۔ بغیر سیل نیابی بہ دہر کج رفتار
گناہ عالمیان گر ہمہ صدا گردد ۔۔۔ زکوہ حلمش آواز نشنوی یکبار

غزل | کلیم کا اصلی کمال غزل گوئی ہے، غزل میں اسکے پیشروؤں نے خاص خاص باتیں پیدا کی تھیں، مثلاً، عرفی نے فلسفہ نظیری نے تغزل طالب آملی نے شوخی استعارات، وحشی اور میلی نے معاملہ بندی کلیم کے ہاں گو تغزل کے سوا اور سب کچھ ہے لیکن اسکا خاص رنگ مضمون بندی اور خیال آفرینی ہے، مثالیہ جو صائب کا خاص انداز ہے اسکی ابتدا بھی کلیم ہی نے کی، فلسفہ میں وہ بہت دقیق باتیں پیدا نہیں کرتا، لیکن اس عنوان پر اس نے جو کچھ لکھا ہے، جمع کیا جائے تو اچھا خاصہ فلسفہ ہو جائیگا غزل میں اسکے خصوصیات کو ہم الگ الگ عنوان کے ذیل میں لکھتے ہیں،

مضمون آفرینی اور خیال بندی | جس چیز کو لوگ مضمون آفرینی کہتے ہیں اسکی تحلیل کیجائے تو وہ یا کوئی نیا استعارہ یا تشبیہ ہوتی ہے، یا کوئی انوکھا مبالغہ ہوتا ہے، یا کوئی شاعرانہ دعوے ہوتا ہے جو در اصل صحیح نہیں ہوتا لیکن شاعر اس کا مدعی ہوتا ہے اور شاعرانہ استدلال سے ثابت کرتا ہے اسی کو حسن تعلیل بھی کہتے ہیں، یہ سب باتیں کلیم کے ہاں نہایت اعلیٰ درجہ پر پائی

جاتی ہیں مثلاً

بسکہ زدیدہ ریختم خون دل خراب را	گریہ گرفت در حنا پنجۂ آفتاب را

میں نے اسقدر خون آنکھوں سے بہایا کہ میرے آنسوؤں نے آفتاب کے پنجہ میں مہندی لگادی،

می نہم در زیر پائے فکر کرسی از سپہر	تابکف می آورم یک معنی برجستہ را

فکر کے پاؤں کے نیچے آسمان کی کرسی رکھ لیتا ہوں، تب ایک برجستہ مضمون ہاتھ میں آتا ہے،

سپہر زدل در فیض آنچنان بست است درعالم	کہ سیلاب بہاری تر نمی سازد لب جو را

آسمان نے فیض کا دروازہ اس طرح بند کرلیا ہے، کہ بہار کا سیلاب نہر کے لب کو بھی تر نہیں کرسکتا،

حدیث بحر فراموش شد کہ دور از تو	زبس گریستہ ام، آب برد دریا را

لوگ دریا کی کہانی بھول گئے اس لئے کہ میں اس قدر رویا کہ دریا کو پانی بہالے گیا،

شعلہ برمیخواست از بیطاقتی و می نشست	من نہ جنبیدم زجا تا جا بہ گلخن داشتم

شعلۂ بے صبری کی وجہ سے اُٹھ اُٹھ کر بیٹھ جاتا تھا، لیکن میں جب تک آگ میں

رہا ذرا جنبش نہیں کی،

خون دل روبکمی کرد ز سوز تپ ہجر	آنقدر نیست کہ یک آبلہ را آب دہد
شراب کہنہ می نوشم بہ بزم او چو بنشینم	بمن تا نوبت آید دختر رز پیر می گردد
زان برق حسن کافت ہر گوشہ گیر شد	آتش درآشیانۂ عنقا گرفتہ است
یک رہبرم دریں شب تاریک برنخورد	چوں آفتاب دست بدیوار میکشم

اس شب تاریک میں مجھکو کوئی رہنما نہیں ملا، آفتاب کی طرح میں دیوار پکڑ کر چلتا ہوں،

مثالیہ | مثالیہ مضامین پہلے بھی خال خال پائے جاتے تھے امیر خسرو کا مشہور قصیدہ، سرتاپا اسی صنعت میں ہے لیکن کلیم، میرزا صائب اور غنی نے گویا اسکو ایک خاص فن بنادیا، چونکہ یہ تینوں شاعر کشمیر میں مدت تک ساتھ ہمدم و ہم قلم رہے تھے اور باہم مشاعرے رہتے تھے اس لئے قیاس یہ ہے کہ ہم صحبتی کے اثر نے اس طرز کو مشترک جولانگاہ بنادیا، علی قلی سلیم بھی مثالیہ میں کمال رکھتا ہے اور اسکی بھی وجہ شاید یہی ہو کہ سلیم بھی یہیں (کشمیر) میں مدفون ہے،

بہرحال کلیم نے اس صنعت کو بہت ترقی دی، اسکے اکثر دعوے فی نفسہ صحیح ہوتے ہیں لیکن استدلال شاعرانہ ہوتا ہے، بعض جگہ دعوے اور دلیل دونوں خیالی ہوتے ہیں اور وہاں شاعرانہ تخئیل زیادہ پائی جاتی ہے مثلاً،

جز سوز عشق نیست سراسر بیان ما — چو شمع یک سخن گذر و بر زبان ما
مرا مسوز کہ نازت ز کبر یا افتد — چوں خس تمام شود شعلہ ہم ز پا افتد

مجکو نہ جلاؤ ورنہ تمہارا غرور بھی جاتا رہیگا جب خس جل چکتا ہے تو شعلہ بھی بجھ جاتا ہے،

روشن دلاں خوشامد شاہاں نگفتہ اند — آئینہ عیب پوش سکندر نمی شود
مدعی گر طرفِ ما نشود، صرفۂ اوست — زشت آں بہ کہ بہ آئینہ برابر نشود

دشمن اگر ہمارا مقابلہ نہ کرے تو اس میں اسی کا فائدہ ہے، بدصورت کے حق میں یہی بہتر ہے کہ آئینہ کے سامنے نہ آئے،

مقبول روزگار نگشتیم و ایمنیم — مارا کہ بر نداشتہ، چوں بر زمین زند
در محفلے کہ تازہ درآئی گرفتہ[1] باش — اوّل بہ باغ، غنچہ گرہ بر جبیں زند
در روزگار دیدم از راستی نشان نیست — صبحش کہ صادق آمد، در شیر آب دارد

زمانہ میں سچائی کہیں نہیں پائی جاتی، صبح صادق کو، صادق کہتے ہیں لیکن وہ بھی دودھ میں پانی ملاتا ہے، صبح کی روشنی کو پانی سے تشبیہ دی ہے،

قطع امید کردہ، نخواہد نعیم دہر — شاخ بریدہ را نظرے بر بہار نیست
روشندلاں، حباب صفت دیدہ بستہ اند — روزن چہ احتیاج، اگر خانہ تار نیست
روزگار اند کمین بخت ماست — دزد دایم در پے خوابیدہ است
پامال حوادث، نتوانم کہ نباشم — چوں نقش قدم، خانۂ من بر سر راہ است
دارد اگر صفائے دل از شراب دارد — روشن تر است شیشہ دمیکہ آب دارد

دل میں صفائی آتی ہے تو شراب سے آتی ہے، شیشہ میں جب پانی ہوتا ہے تو زیادہ چمکتا ہے،

صبر گوارا کند ہر چہ ترا ناخوش است — ساعتے از لعب بنہ، آب گل آلود را

---

[1] گرفتہ، یعنی اپنے آپ کو لئے ہوئے جس سے بظاہر رکھائی محسوس ہو،

ناگوار چیز بھی صبر کرنے سے گوارا ہوجاتی ہے، پانی گرد آلود ہو تو ذرا ٹھہر جاؤ گرد نیچے بیٹھ جائیگی،

کیسہ بر وعدہائے بخت نتواں دوختن / خفتہ گر در خواب حرفی گفت ازاں آگاہ نیست

دل گماں دارد کہ پوشیدہ است راز عشق را / شمع را فانوس پندارد کہ پنہاں کردہ است

دل آگاہ مے باید وگر نہ / گدا ایک لحظہ بے نام خدا نیست

می پذیرند بداں را بطفیل نیکاں / رشتہ را پس نہد آں کہ گہر می گیرد

چوں خس و خاشاک سیلاب ایمنیم از گمرہی / پا بدوش راہبر دائم بمنزل میرسم

ہمکو سیلاب کے خس و خاشاک کی طرح گمرہی کا ڈر نہیں، اس لئے کہ ہم خود رہنما کے کندھوں پر سوار ہوکر سفر کرتے ہیں، یہ ظاہر ہے کہ خس و خاشاک کا رہنما سیلاب ہی ہے اور خس و خاشاک سیلاب ہی کے کاندھے پر سوار ہیں،

نام و نشان ز عشق بغیر از ہوس نماند / از سیل رفتہ خار و خسے یادگار ماند

از خاک برگرفتۂ دوراں چو نے سوار / دائم پیادہ رفت اگرچہ سوار شد

از ہنر حال خرابم نشد اصلاح پذیر / ہمچو ویرانہ کہ از گنج خود آباد نشد

ہنر اور علم نے میری حالت کی اصلاح نہ کی، جس طرح ویرانہ کو خزانے نے اس کو آباد نہ کیا،

اقلیم دل بہ زور مسخر نمے شود / ایں فتح بے شکست میسر نمی شود

چرخ از بہر تو در کار بود حرص تو چیست / آسیا از پے رزق دگراں بر گردد

سفلہ از قرب بزرگاں نکند کسب شرف / رشتہ پر قیمت از آمیزش گوہر نشود

دست ہر کس را لبساں سبحہ بوسیدم چہ سود / ہیچ کس نکشود آخر عقدۂ کار مرا

با من آمیزش او الفت موج ست و کنار / دمبدم با من و پیوستہ گریزاں از من

چو ہست قدرت دست دل توانگر نیست / صدف کشادہ کف است آں زماں کہ گوہر نیست

وضع زمانہ قابل دیدن دوبارہ نیست / رو پس نکرد ہر کہ ازیں خاکداں گذشت

بخضرم احتیاجے نیست گر این است گمراہی / کہ کوراں را عصا ہم می تواند راہبر باشد

نہ ہر کہ صدر نشین شد عزیز شد کہ غبار / اگر بدیدہ رسد، توتیا نخواہد شد

۱؎ پس دادن واپس دینا، ۲؎ یعنی جس کو زمانہ نے بلند کیا ہو،

واصلےٴ زحرف چون و چرا بستہ است لب | چوں رہ تمام گشت جرس بے زباں شود
شیطان چہ تمتع برد از اہل تجرد | رہزن چہ دریں بادیہ از ریگ رواں یافت
تمام نسل بزرگان اگر نکو باشند | زبحر زادہ، تنک ظرفی حباب چراست
گر بقسمت قانعی، بیش و کم دنیا یکے است | تشنہ چوں یک جرعہ خواہد کوزہ و دریا یکیست
پست فطرت، ہوس گوشہ عزلت نکند | تا گدا بر سر رہ نیست دلش خرم نیست
امروز چراغ اہل فقرم | چوں فانوسم، وو پیرہن نیست
خاکساران بیشتر از فیض قسمت می برند | کلبہٴ دیوار کوتاہان پر از مہتاب بود
چشم از جہان بہ بستم نور دلم فزود | روشن شدہ است خانہ چو روزن گرفتہ ام

اکثر لوگوں کے نزدیک شاعری صرف قوت تخئیل کا نام ہے اور اگر یہ صحیح ہے، تو کلیم ہمہ تن شاعری ہے: اس کا ہر شعر قوت تخئیل کا ایک منظر ہے، شاعر کو تمام عالم اور عالم کے تمام واقعات قوت تخئیل کی وجہ سے ایک اور ہی صورت میں نظر آتے ہیں مثلاً ہوا کے زور سے پھول کا ایک پتہ ٹہنی سے ٹوٹ کر پانی میں گر پڑا، یہ ایک معمولی واقعہ ہے لیکن شاعر کو قوت تخئیل سے نظر آتا ہے کہ یہ بہار کے حسن کا دفتر ہے اور چونکہ معشوق کے حسن کے سامنے اسکی قدر نہیں ہو سکتی اس لئے بہار نے اس دفتر کو پانی سے دھوڈالنا چاہا ہے،

دفتر حسن بہارست کہ در عہد تو شست | برگ گل نیست کہ از باد، در آب افتادہ است

کلیم کے کلام کو دیکھو تو صاف نظر آتا ہے کہ مناظر عالم کی ایک ایک چیز پر اسکی نظر پڑتی رہتی ہے اور قوت تخئیل سے یہ چیزیں اسکے سامنے نئے نئے رنگ میں جلوہ گر ہوتی رہتی ہیں،

وہ اندھیری راتوں میں گھبراتا ہے اور اس کو نظر آتا ہے کہ ستاروں کے چراغ میں روغن نہیں رہا،

بعد ازیں تاریکی شبہا بخود خوش کن کلیم | شکوہ کم کن، چراغ اختراں روغن نماند

لے یعنی جو شخص مدارج معرفت طے کر کے منزل تک پہنچ گیا ہے ؎ یہاں گرفتن کے معنی بند کرنے کے ہیں،

حکما کہتے ہیں کہ عالم کا آغاز اور انجام معلوم نہیں کلیم کی نظر میں قوتِ تخیل سے عالم ایک پُرانی کتاب بن کر نظر آتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے اول و آخر کے ورق گر گئے ہیں،

ما ز آغاز و ز انجام جہاں بیخبریم — اول و آخر ایں کہنہ کتاب افتادہ است

محتسب کی دار و گیر نے میخانے برباد کر دئے، لیکن کلیم یہ کہتا ہے کہ معشوق کی آنکھیں میکدہ ہیں اور انکی مستی کے آگے شراب کی قدر نہیں اس لئے کوئی شخص میخانوں کی طرف رُخ نہیں کرتا اور وہاں خاک اُڑنے لگی، اسکے نزدیک یہ محتسب کی کارگذاری نہیں، بلکہ محتسب معشوق کی آنکھ کا ممنون ہے،

شکر چشم تو کند، محتسب شہر کزد — ہر کجا میکدۂ ہست خراب افتادہ است

بہار میں ہر شخص چاہتا ہے کہ سب سے پہلے پہنچکر لب جو پر قبضہ کرلے کلیم کی وسعتِ تخیل دیکھو وہ سبزہ سے بھی پہلے لب جو پر قبضہ کرنا چاہتا ہے،

در بہاران جا نمی افتد بدست کس بباغ — پیشتر از سبزہ می باید کنارِ جو گرفت

بہار میں کسی کو جگہ باغ میں نہیں ملتی، اس لئے سبزہ سے بھی پہلے چل کر لب جو پر قبضہ کر لینا چاہیئے،

صبح کے وقت گلبدوں کی شگفتگی ہر شخص کو لطف دیتی ہے، لیکن دیکھو کلیم اس کو کس نظر سے دیکھتا ہے،

شیرینی تبسم ہر غنچہ را مپرس — در شیر صبح، خندۂ گل ہا شکر گذاشت

کلیوں کی شیرینی تبسم کا لُطف نہ پوچھو، پھُولوں کی ہنسی نے صبح کے دودھ میں شکر گھولدی

سب لوگ کہتے آئے ہیں کہ آسمان قابل آدمیوں کا دشمن ہے، کلیم کو اس پر تعجب ہوتا ہے کہ آسمان کو قابل اور ناقابل کی تو تمیز ہی نہیں، قابل آدمیوں کو پہچانتا کیونکر ہے کہ خاص انہی کو ستاتا ہے۔

حیرتے دارم کہ گردوں چو بداندیشان بدست — او کہ نتواند میان نیک و بد تمییز کرد

آگ کی لَو اکثر اونچی ہو ہو کر کم ہو جاتی ہے کلیم کو نظر آتا ہے کہ شعلہ میں ضبط کی طاقت نہیں اسلئے بیقراری کی وجہ سے اٹھ اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے، اسکے مقابلہ میں اپنے سکون اور استقلال پر فخر کرتا ہے

شعلہ بر بیخواست از بے طاقتی دہی نشست — من نہ جنبیدم زجا تا جا بہ گلخن داشتم

مرکر کوئی زندہ نہیں ہوتا، کلیم کو اس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا ایسی چیز ہے
کہ کوئی شخص دوبارہ اسکے دیکھنے کی طرف رُخ نہیں کرتا،

وضع زمانہ قابل دیدن دوبارہ نیست — رُو پس نہ کرد ہر کہ ازیں خاکدان گذشت

رہ نوردی میں پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں انہیں میں کانٹے بھی چبھ جاتے ہیں کلیم سمجھتا
ہے کہ یہ انگلیاں ہیں اور راستہ ان انگلیوں سے میرے چھالوں کا حساب لے رہا ہے،

دارم رہے بہ پیش کہ انگشت خار را — از حساب آبلۂ پا گرفتہ است

کلیم اُن مضامین میں جو مدتوں سے جولانگاہ خیال ہیں ایسے نکتے پیدا کرتا ہے جن کی
طرف کسی کا خیال نہیں گیا،

مثلاً یہ عام اعتقاد ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے تقدیر سے ہوتا ہے، کلیم کہتا ہے،

ایں قدر فرق میانِ خطِ یک کاتب چیست — سرنوشتِ ہمہ گر از قلمِ تقدیر است

اگر سب کی سرنوشت تقدیر ہی نے لکھی ہے تو ایک کاتب کے خط میں اس قدر فرق کیوں ہے
کہ ہر شخص کی تقدیر الگ الگ ہے،

جنون اور صحرا نوردی کا مضمون سب باندھتے آئے ہیں کلیم باوجود دعائے جنون
کے صحرا نوردی اختیار نہیں کرتا اور اس سے جنون کا زیادہ زور ثابت کرتا ہے،

اگر بہ بادیہ گردی نمی روم، چہ عجب — جنون من نہ شناسد ز شہر صحرا را

میں اگر صحرا میں نہیں جاتا تو تعجب کیا ہے، میرا جنون شہر اور صحرا میں تمیز نہیں کر سکتا

اس میں صحرا نوردوں پر چوٹ بھی ہے کہ پورا جنون ہوتا تو انکو شہر او صحرا
کی تمیز کیونکر ہوتی کہ جب بھاگتے تو صحرا ہی کی طرف بھاگتے،

عنقا کا تجرد اور ترکِ تعلقات عام مضمون ہے، کلیم اسکے تجرد کو ناتمام سمجھتا ہے،

درکیشِ ما تجرد عنقا تمام نیست — در فکرِ نام ماند، اگر از نشان گذشت

زمانہ کے انقلاب پسندی کے سب مدعی ہیں، کلیم کو اس پر تعجب ہے، کہ
پھر میری حالت کیوں نہیں بدلتی،

ز انقلاب سپہر دو رو، عجب دارم کہ بیقراری ما را بہ یک قرار گذاشت

باغبان اور گلچین ہمیشہ پھول توڑتے ہیں، کلیم کلیوں کا توڑنا ثابت کرتا ہے اور اس کی کس قدر عمدہ توجیہ کرتا ہے،

در گلستان بہ یاد دہانِ تو غنچہ را امسال باغبان ہمہ نشگفتہ چیدہ بود

باغبان کو تیرا دہن یاد آیا، تو اُس نے اکبے سال تمام پھول بن کھلے توڑ لئے

حسنِ اخلاق کی بڑی دلیل، لوگوں کے نزدیک قبول عام ہے، یعنی جب آدمی کے اخلاق عمدہ ہوتے ہیں جب ہی مقبول عام ہوتا ہے، کلیم کہتا ہے نہیں بلکہ نفاق سے یہ درجہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ ظاہرداری کے بغیر حسن قبول نہیں حاصل ہوسکتا، اور ظاہرداری درحقیقت نفاق ہے،

پسند خاطر یک تن نیم چہ چارہ کنم کہ بے نفاق بہ یک دل نمی تواں جا کرد

جو لوگ بے قاعدہ کام کرتے ہیں اُنکی بے قاعدگی اس قدر پختہ ہوتی ہے کہ کبھی بھول کر بھی کوئی کام باقاعدہ نہیں کرتے، کلیم اس سے یہ نتیجہ پیدا کرتا ہے کہ وہ بے قاعدہ نہیں کیونکہ اُنکی بے قاعدگی باقاعدہ ہے، اس خیال کو ایک شاعرانہ پیرایہ میں ادا کرتا ہے،

گامے بہ غلط ہم سوئے مقصود نہ رفتیم گویا رہِ آوارگیم، راہبرے داشت

ہم بھول کر بھی کبھی مقصد کی طرف ایک قدم نہیں گئے معلوم ہوتا ہے کہ آوارگی کے راستہ میں ہمارا کوئی رہبر تھا

زاہد کی صد دانہ تسبیح پر شعرا اعتراض کیا کرتے ہیں، لیکن کلیم اُسکی ضرورت ثابت کرتا ہے

دانۂ بسیار درکار است، بہرِ صید خلق حق بدست زاہد ست از سبحہ دا صد دانہ خرخت

راہ طلب میں منزل مقصود کے رخ پر چلا جانا اور ادھر اُدھر مڑ کر نہ دیکھنا مستحسن خیال کیا جاتا ہے لیکن کلیم کہتا ہے،

طلب شاہد مقصود ز ہر سو شرط است ہر قدم در رہِ او، رو بقفا باید کرد

شاہد مقصود کو ہر رخ سے ڈھونڈنا ضروری ہے اسلئے اس راہ میں ہر قدم پر مڑ کر بھی دیکھنا چاہیئے،

روزمرہ اور محاورہ

اس زمانہ میں اگرچہ مضمون آفرینی اور خیال بندی کے استیلائی زبان اور محاورہ بندی

کی طرف سے شعرا کو غافل کر دیا تھا، چنانچہ ناصر علی، غنی، بیدل اسی چکر میں پڑ کر لطف زبان سے بیگانہ ہو گئے، لیکن کلیم باوجود انتہا درجہ کی نازک خیالی کے یہ سر رشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتا وہ ہمیشہ نئے مضامین پیدا کرنیکی فکر میں مصروف رہتا ہے لیکن یہ نہیں بھولتا کہ وہ ایرانی ہے، ہندی نہیں، اسلئے روزمرہ کے علاوہ، اکثر ٹھیٹ محاورے برتتا ہے، جنکو عام آدمی فرہنگ کے بغیر سمجھ بھی نہیں سکتے مثلاً

باعارض تو چہرہ شدن حد شمع نیست	چہرہ شدن، مقابل ہونا، حد نیست یعنی مجال نہیں،
گریان ز بزم رفت و سر خویشتن گرفت	سر خویشتن گرفت، اپنی راہ لی
از دبستان برد ہر کہ سبق روشن کرد	سبق روشن کرد، سبق یاد کر لیا،
ع، دشمن خود را چرا کس این قدر پہلو دہد	پہلو دادن، پہلو بچانا،
رو نخواہم ساخت ہر صورت کہ خواہد رو دہد	رو ساختن، منہ بگاڑنا، رو دہد، پیش آئے،
امید بوسہ ات چہ نمک داشت اے کلیم	چہ نمک داشت، یعنی اس میں کیا لطف تھا،
این شربت کم بہر دو بیمار نباشد	بہر حصہ یعنی ایسا نہ ہو کہ یہ تھوڑا سا شربت دو بیماروں کے لئے کافی نہ ہو،
کہ کاہ ہم طرف کہربا نمی گیرد	طرف کسے گرفتن، اس کی جانب داری کرنا،
ع، بچشم روشنی داغہائے کہنہ روم	چشم روشنی، مبارکباد،
ع، شام خود شد روزہ امید را وا میکنم	روزہ وا کردن، روزہ کھولنا،
چوں حباب از دام ہستی پس ہم خندان شوم	دام واپس دادن، قرضہ ادا کر دینا،
عجب پیرے کہ می مالد جوان را	مالیدن، پچھاڑنا،
یک زبانم من، و نمی گویم، سخنے را کہ پشت در رو دارد،	پشت در رو داشتن سخن، یعنے دو رخی بات،
پیالہ بچشم تو روشن کہ بادہ پیدا شد	چشم تو روشن، دعا کے موقع پر استعمال کرتے ہیں،

اب ہم کلیم کی دو تین غزلیں پوری پوری اس موقع پر درج کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ اسکا اکثر کلام یکدست اور ہموار ہوتا ہے اسکے ساتھ اسکے عام لطف بندش

جدت ادا اور خوبی زبان کا اندازہ ہو گا،

پیری رسید و مستی طبع جوان گذشت
ضعفِ تن از تحمّلِ رطلِ گران گذشت

وضعِ زمانہ قابلِ دیدن دوبارہ نیست
رُو پس نکرد، ہر کہ ازین خاکدان گذشت

از دستبردِ حسنِ تو بر لشکرِ بہار
یک نیزہ خونِ گل ز سرِ ارغوان گذشت

طبعی بہم رسان کہ بسازی بعالمے
یا ہمتے کہ از سرِ عالم، توان گذشت

در کیشِ ما تجردِ عنقا تمام نیست
در فکرِ نام ماند اگر از نشان گذشت

بے دیدہ راہ اگر نتوان رفت، پس چرا
چشم از جہان چو بستی از و می توان گذشت

بدنامیِ حیات دو روزی نبود بیش
آن ہم کلیم با تو بگویم، چسان گذشت

یک روز صرفِ بستنِ دل شد باین و آن
روز دگر، بہ کندنِ دل زین و آن گذشت

نہ ہمین می رمد آن نوگلِ خندان از من
میکشد خار درین بادیہ دامان از من

با من آمیزشِ او الفتِ موج ست و کنار
دمبدم با من و ہر لحظہ گریزان از من

گرچہ مورم ولے آن حوصلہ با خود دارم
کہ ببخشم بود ار ملکِ سلیمان از من

بہ تکلم بخموشی بہ اشارت، بہ نگاہ
میتوان برد بہر شیوہ دل آسان از من

قمریِ ریختہ بالم، بہ پناہِ کہ روم؟
تا بہ کے سرکشی اے سروِ خرامان از من

نیست پرہیزِ من از زہد کہ خاکم بر سر
ترسم آلودہ شود دامنِ عصیان از من

اشک بیہودہ مریز این ہمہ از دیدہ کلیم
گردِ غم را نتوان شست بطوفان از من

از ثباتِ عشق دایم پا بدامن داشتم
ہمچو داغِ لالہ در آتش نشیمن داشتم

شعلہ برمی خاست از بیطاقتی و می نشست
من نہ جنبیدم ز جا تا جا بگلخن داشتم

کے بناخن رخنۂ چاکِ جگر خواہم نمود
من کہ زخمش را نہان از زخمِ سوزن داشتم

ہیچ گہ ذوقِ طلب باز از جستجو بازم نداشت
دانہ می چیدم من آن روزے کہ خرمن داشتم

روشنی از بزمِ من دریوزہ می کرد آفتاب
در چراغِ عیش تا از بادہ روغن داشتم

ہمچو ماہی غیرِ داغم پوشش دیگر نبود
تا کفن آمد ہمین یک جامہ بر تن داشتم

داغ را جز بر کنارِ زخم ننہادم کلیم
دیدہ را بر رخنۂ دیوارِ گلشن داشتم